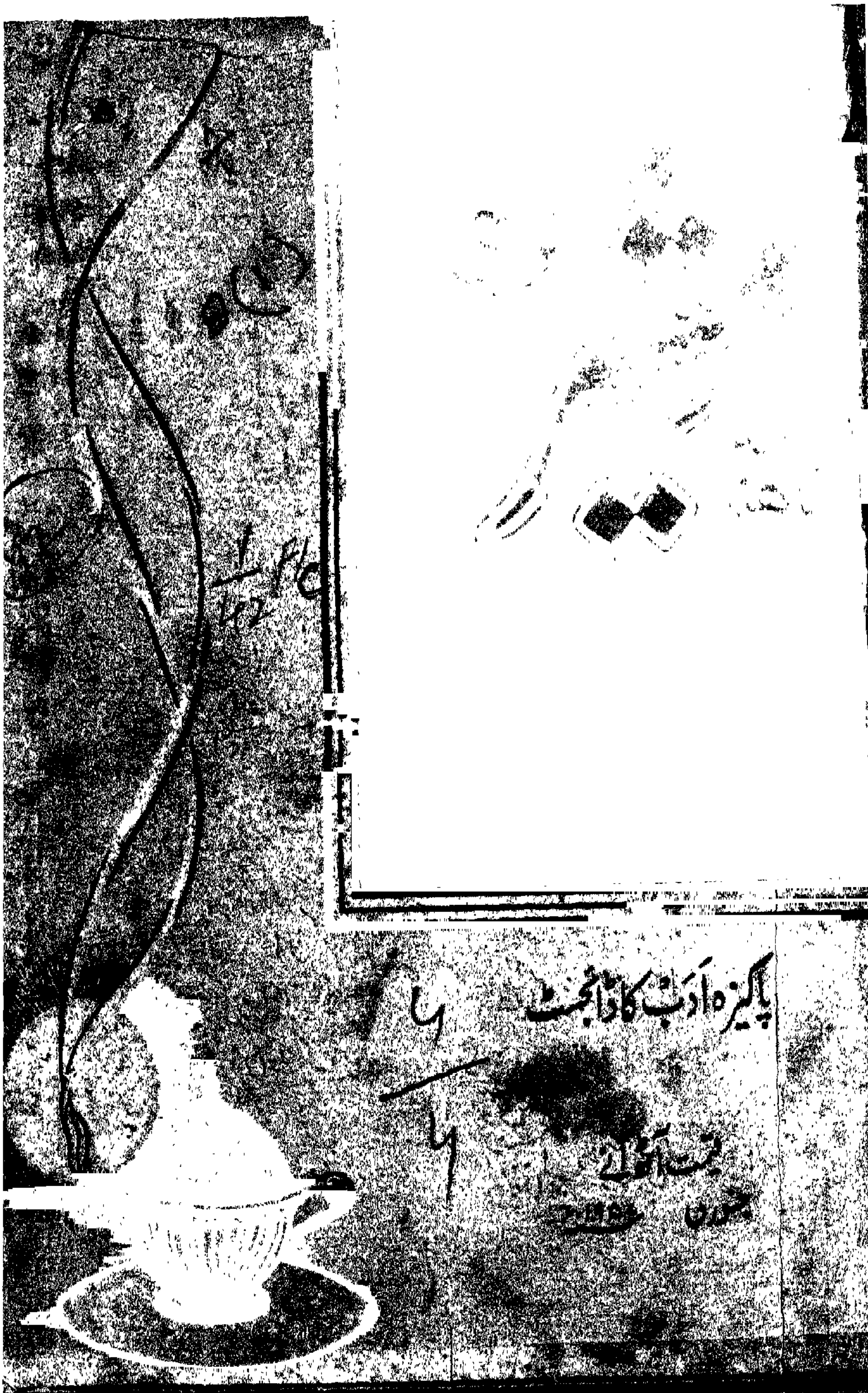

پاکیزہ ادب کا ڈائجسٹ

باہمی بچت کی ایک پرائیویٹ سکیم ہے

جس میں حصہ لینے والا ہر ممبر پانچ روپے ماہانہ ادا کر کے اقساط میں پانچ صد روپے کی کثیر رقم یکمشت حاصل کرتا ہے اور اس کے علاوہ وہ اپنی بچت کا بھی حقدار رہتا ہے مرکزی فنڈ اپنے منافع سے اس سکیم میں باقاعدگی سے حصہ لینے والے ممبران کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔

اس سکیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی ممبر کا ادا کیا ہوا روپیہ کسی حالت میں ضائع نہیں ہوتا خواہ اس نے ایک ہی قسط ادا کی ہو۔

عبدالشکور

منیجنگ ڈائریکٹر

فاطر صدیقی •

بھیک

(فاطر صدیقی کا یہ افسانہ "تعمیر انسانیت" میں تقریباً ڈیڑھ صفحہ پر پھیلا ہوا تھا، جسے یہاں مختصر کر کے پیش کیا جا رہا ہے ——— ایڈیٹر)

اسکی حالت زار دیکھکر میری بیوی کو رحم آگیا اور اس نے اس کی ہتھیلی پر ایک چونی رکھتے ہوئے کہا "یہ لو ——— اور جاؤ یہاں سے" ——— مگر وہ پھر بھی نہ ٹلا۔

بیوی نے سوچا "شاید یہ کچھ اور مانگتا ہے" اور اس نے تھوڑے سے چاول بھی لاکر اسے دیا اور کہا "اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں دے سکتے ——— بابا کوئی دوسرا گھر دیکھو" ——— مگر بابا اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔

مجھ سے یہ دیکھا نہ گیا اور میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، "بابا تمہیں چونّی دی گئی، چاول دیئے گئے ——— جاؤ اب دوسرے گھر کی راہ لو ——— میرا منہ کیا تک رہے ہو ——— جاؤ یہاں سے ——— دفان ہو ——— آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"ووٹ" بابا نے کہا اور دھرنا مار کر وہیں بیٹھ گیا۔

(ایک بنگالی خیال)

اصلاحی ادب کا ڈائجسٹ
(مسعود انجمن ادبی ...)

ماہنامہ
مشیر
کراچی

فون

جلد : ۸
شمارہ : ۱

جنوری ۱۹۵۷ء

نگران : عبدالغفور بیگ
مرتب : منظر حسین

فی پرچہ :
سالانہ :

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ :-
پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور (یو۔پی)

ترتیب

جیتی جاگتی زندگی	طیب عثمانی	۳
مولانا ظفر علی خاں		
علامہ ظہور الحق اور طٰہٰ یٰسین	ادارہ	۵
کمی	زکی زاکانی	۶
غزل	چندر پرکاش جوہر	۷
اردو ناول کی عہد بعہد ترقی	شمیم جاوید ایم۔ اے	۹
غزل	شفیق جونپوری	۱۵
غزل	فاروق بانسپاری	۱۶
کیمیائی تناسل	نعیم صدیقی	۱۷
غزل	محمد یعقوب طاہر	۲۶
غزل	ابو محمد امام الدین (رام نگری)	۲۶
خلا	الیاس فرحت	۲۷
غزل	بیدل میرٹھی	۳۱
قطعات	افتخار اعظمی	۳۱
شاعر کی محبوبہ کا ایک خط	محمد ارشاد خاں	۳۲
جذب و جنوں	محشر رسول نگری	۳۴
غزل	نور العین قیصر	۳۴
جدید اردو ادب اور مسلمان	ابو الخطیب	۳۵
لمحۂ فکر	ظفر احمد صدیقی	۳۸
اک شمع بجھی۔ اک شمع جلی	آثم میرزا	۳۹
غزل	آتش لدھیانوی	۴۴
غزل	قتیل شفائی	۴۴
مولانا ظفر علی خاں	نصر اللہ خاں عزیز	۴۵
غزل	انوار ظہوری	۴۸
غزل	مسرور قریشی	۴۸
غزلیں	ریاض قمر، رشید ارشد	۴۹
با مقصد تنظیم	....	۵۰
ماں	ظفر عالمگیر	۵۸
ایک خط	نغماں	۶۴

(پرنٹر و پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مشیر" ... کراچی سے شائع کیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعمیری ادب اور زندگی

ہمارا یہ ادبی کاروان "پیہم رواں ہر دم جواں" کے مصداق جس طرح آگے بڑھ رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ یہ ادبی قافلہ نہ صرف یہ کہ زندگی کے قافلہ سے ہم آہنگ ہے بلکہ یہی عین حیات ہے اور اسی سے مشاہدۂ حیات ہو سکتا ہے۔

ادب اور زندگی کا آپس میں گہرا ربط اور چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زندگی کے بغیر ادب ایک بے جان ڈھانچہ اور ظاہری خول ہے، ایسے ادب کی مثال کاغذ کے اس پھول کی سی ہے جو خوش رنگ تو ہے لیکن اپنے اندر کوئی خوشبو نہ رکھتا ہو جس کو گلدستہ میں سجا کر میزوں کی زینت تو بنایا جا سکتا ہے ماحول اور فضا میں اس سے خوشبو کی لپٹیں نہ آسکتی ہوں۔ ایسا ادب صرف دیکھنے کے لئے ہو اس سے دماغ کو فرحت اور قلب کو سرور نہیں حاصل ہو سکتا اور نہ ذہن و فکر میں روشنی و تابندگی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم ایسے ادب کے قائل ہیں کہ اگر ایک طرف وہ ادب خوش رنگ و خوشنما اور اپنے اندر حسن اور دلکشی رکھتا ہو تو دوسری طرف اس سے فکر و خیال میں روشنی اور قلب و جگر میں یقین کی گرمی حاصل ہوتی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس میں فنی معنویت، ادبی لطافت اور فکری بالیدگی پائی جاتی ہو۔ ایسا ہی ادب "پیہم رواں اور ہر دم جواں" رہ سکتا ہے اور ایسے ہی ادب کے لئے بقائے دوام ہے اور یہی ادب حقیقتاً تعمیری ادب ہے، تعمیری ادب کا مقصد چونکہ زندگی کی تعمیر و تہذیب، اس کا بناؤ سنوار اور اس میں رنگ آمیزی، دل آویزی حسن و دلکشی پیدا کرتا ہے، اس لئے ایسے ادب کا تعلق زندگی سے نہایت عمیق جیسن اور قریب ہوگا اور ہے۔

ادب اور زندگی کے اس باہمی ربط، تعلق اور ہم آہنگی پر قدر تفصیل سے روشنی ڈالنے سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ادب کیا ہے؟ اور ادب انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ حیات کیا ہے؟ اور حقیقی زندگی کسے کہتے ہیں؟ ان مسائل پر ہم ایک نظر ڈال لیں، جب تک یہ مسائل ہمارے سامنے نہیں آجاتے۔ اس وقت تک ادب و زندگی کے حقیقی خد و خال نمایاں نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد ہی یہ بات بھی واضح ہو سکے گی کہ تعمیری ادب کس قسم کی زندگی کو ادب و شعر میں پیش کر کے انسانیت کے لئے ایک خوشنما ہار بنانا چاہتا ہے۔

حیات کیا ہے؟ اور حقیقی زندگی کسے کہتے ہیں؟ اس سوال کے حل کرنے سے پہلے ادب کیا ہے؟ کا جواب دینا مناسب ہو۔ ہمارے خیال میں ادب کی کوئی منطقی تعریف نہیں کی جا سکتی، اگر ایک طرف ادب کو وقت اور زمانے کا آئینہ کہا جا سکتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ ہم اسے "حسن کلام اور تاثیر کلام" کے نام سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ بہر نوع ادب انسانی زندگی کا حسین ترجمان، اس کے افکار کا پرتو، اور اس کے خیالات کا عکس ہوتا ہے۔ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے، زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اور زندگی ہی کے کام آتا ہے اور ہمیشہ زندگی کے بناؤ سنوار میں مشغول رہتا ہے۔ ادب کا وجود موقوف ہے زندگی کے وجود پر، اگر کائنات ہے انسان موجود اور زندہ ہے تو ادب بھی زندہ و پائندہ رہے گا۔

ادب و زندگی کے اس تعلق اور ربط باہم سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ ہم بھی اسی "ادب برائے زندگی" کی ترجمانی کر رہے ہیں جس کا نعرہ ہمارے ترقی پسند نسٹ ادیب لگایا کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کسی لفظ کی معنویت اس کے استعمال کرنے والے کے محل استعمال اور اس کے ذہنی و فکری پس منظر پر موقوف ہے کمیونسٹ ادیب زندگی کا لفظ بول کر اس سے ایک طبقہ کی زندگی مراد لیتے ہیں، اسی طرح ان کے نزدیک "عوام" کا لفظ بھی اس خاص طبقہ کے لئے بولا جاتا ہے اور اس طرح وہ زندگی کا بالکل تنگ اور مادی تصور رکھتے ہیں جس کے پیچھے نہ کوئی روحانی تصور ہے اور نہ اخلاقی قدریں، حالانکہ ایسا نہیں ہے ہمارے نزدیک اول تو زندگی کسی "طبقہ" کی مخصوص نہیں ہے۔ جب ہم زندگی کا لفظ بولتے ہیں تو پوری انسانی زندگی سمٹ کر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور کسی ایک طبقہ یا گروہ کا مفاد ہمارے پیش نظر نہیں بلکہ ہم پوری انسانیت اور اس کائنات میں بسنے والے تمام انسانوں کی زندگی کی ترجمانی کرتے

ادب میں کرنا چاہتے ہیں جس میں رنگ و نسل فرقہ اور طبقہ کی کوئی قید نہیں، ہر انسان بحیثیت انسان برابر ہے اور ایک کا مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ ہمارے نزدیک زندگی کا ایک کائناتی تصور ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کائنات اور اس کی بوقلمونی آفتاب کی تیز و تند شعاعیں، مہتاب کی ٹھنڈی اور حسین روشنی، ستاروں کی چمک دمک، کوہ و صحرا، دشت و دریا، یہ سب کے سب ایک قادر مطلق اور حاکم و غالب ہستی کی قوت تخلیق کا نتیجہ ہیں اور اس کائنات میں سب سے زیادہ باشعور اور ذی علم مخلوق "انسان" ہے جو اس پوری کائنات پر چھایا ہوا ہے، کائنات کی ساری ہمہ ہمی اور تگ و دو انسان ہی کے حرکت و عمل کا نام ہے اور جب ہم اپنے ادب میں زندگی کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں تو لازماً ہمیں پوری انسانی زندگی کی ترجمانی کرنی چاہیئے۔ انسان کی کثرت و وحدت، اس کو طبقوں فرقوں اور رنگ و نسل میں تقسیم کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔ تعمیری ادب قطعاً اس زندگی کا ترجمان نہیں ہے جس میں انسان کو مختلف طبقوں اور خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔

جس طرح ہم پوری انسانیت کی ترجمانی اپنے ادب میں کرنا چاہتے ہیں اور انسانوں کے کسی طبقہ اور چھوٹے سے گروہ کا مفاد ہمارے پیش نظر نہیں ہوتا ٹھیک اسی طرح زندگی کے بارے میں بھی ہمارا ایک خاص تصور اور نقطۂ نظر ہے ہم زندگی کا کوئی مادی (Materialistic) تصور نہیں رکھتے اور نہ ہم تاریخ کی اس مادی تعبیر کے قائل ہیں جسے "جدلیاتی عمل" (Dialectical Process) کہا جاتا ہے۔ بلکہ ہمارا خیال اور عقیدہ یہ ہے کہ یہ کائنات نہ تو بے خدا ہے اور نہ اس کی تخلیق بیکار و عبث ہے۔ اس کائنات کا ایک خالق، مالک اور حاکم ہے۔

خدا کا تصور، در اصل حیات و کائنات کا سب سے اونچا تصور ہے۔ ہر عظیم ادب کا سوتا حیات و کائنات کے کسی عظیم تصور ہی سے پھوٹتا ہے اس نقطۂ نظر سے خدا کا تصور زندگی اور کائنات کا سب سے اعلیٰ تصور ہے اور جس ادب کی آبیاری اس عظیم تصور سے ہو وہی ادب عظیم ہے۔ ہم مسائل حیات کا حل طبقوں، فرقوں اور مختلف خانوں میں نہیں تلاش کرتے بلکہ ایک عالمگیر عقیدہ اور کائناتی تصور ہی میں زندگی کے سارے مسائل کا حل ڈھونڈتے ہیں اور یہ عالمگیر عقیدہ اور کائناتی تصور وہی ہے جو اسلام ہمیں بتاتا ہے اس لحاظ سے ہم اپنے ادب کو "اسلامی ادب" بھی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ زندگی کی تعمیر اور اس کی بقا ہمارے نزدیک صرف اسلام ہی میں پوشیدہ ہے۔ اسلام کوئی جامد عقیدہ اور بے جان و بے روح مذہب نہیں ہے بلکہ ایک زندہ اور متحرک نظام حیات ہے جو انسانی زندگی کے سارے شعبوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ زندگی کا یہ مادی تصور جو آج کائنات میں کارفرما ہے ہم یہ سمجھتے ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ آج انسانیت کی پریشان حالی، جنگ کا خطرہ اور اٹیم و ہائیڈروجن بموں کی موجودگی میں نسل انسانی کے خاتمہ کا خوف صرف اسی وجہ سے ہے کہ آج کا انسان ایک معاشی حیوان بن کر رہ گیا ہے۔ مادہ پرستانہ زندگی اور ارضیت نے انسان میں بہیمیت اور درندگیت پیدا کر دی ہے اخلاق اور روحانیت کے سانچے ٹوٹ چکے ہیں، ایمان کے شعلے بجھ چکے ہیں، عشق کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ انسانیت راکھ کا ڈھیر ہے اور کائنات میں ایک اندھیرا ہے اسی لئے آج ایک ایسے ادب کی تخلیق کی ضرورت ہے جو باخدا اور آخرت پسند ہو اور وہ ادب اگر ایک طرف اپنے اندر فکر و خیال کی روشنی رکھتا ہو تو دوسری طرف ہمیں ایمان و یقین کی حرارت بخش سکے۔ ع

یقیں سے ضمیر حیات ہے پرسوز

حیات میں گرمی اور اس میں شعلہ نفسی یقین ہی سے پیدا ہوتی ہے اور یقین ہی کی گرمی قلب میں روشنی اور فکر میں ضیا کا باعث ہے۔ اور جب "سینہ روشن" اور قلب ضیا بار ہو تو "سوز سخن عین حیات" بن جاتا ہے، پھر ادب اور حیات ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہو جاتے ہیں اور ادب کے نقوش میں زندگی کی توانائیاں ابھری ہوئی دکھائی دینے لگتی ہیں۔

تعمیری ادب ایسی ہی پرسوز صالح حیات کا ترجمان ہے جس میں یقین کی گرمی اور فکر کی روشنی کی کارفرمائی ہے اور جس میں حیات و کائنات کا سب سے اونچا تصور موجود ہے۔

(طیّب عثمانی)

مولانا ظفر علی خاں مرحوم

مولانا ظفر علی خاں نے کئی سال کی مسلسل علالت کے بعد ۲۷ نومبر کو اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ظفر علیخاں ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور چھیاسی سال کی عمر میں انھوں نے وفات پائی۔ ان ۸۶ برسوں میں سے اگر ۲۶ برس الگ کرلئے جائیں جو عنفوان شباب اور موت و حیات کی کشمکش کے آخری دور میں صرف ہوئے تو ساٹھ برس اس حال میں گزرے کہ ملک کی زندگی کا ہر شعبہ ان کے فکر و عمل سے متاثر رہا۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر، ایک شیوہ بیان مقرر، ایک نادرہ کار نثر نگار اور بلند ہمت سیاستداں ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ دینی جذبات کی حرارت، ولولہ حریت کی گرمی اور قوت عمل کی بے پناہی کا ایک طوفان تھے۔ اور جب تک زندہ رہے عرصہ حیات میں ان کی ذات سے ایک ہنگامہ برپا رہا۔

انکی فطرت کے دو پہلو سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کی پرجوش دینداری اور بے تاب حریت پرستی دین اور اس کے اظہار اور اعلان میں وہ کسی قسم کی مداہنت گوارا نہیں کرتے تھے اور آزادی کے معاملے میں کسی طاقت سے نہیں دبتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق اور برطانیہ سے عناد و عداوت میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں تھا۔ اور یہ دو شعلے تھے جو ان کو زندگی بھر متحرک کئے رہے اول الذکر جذبے کی وجہ سے وہ قادیانیوں سے برسرپیکار رہے اور موخر الذکر جذبے کے باعث وہ برطانیہ اور اس کے پٹھوؤں سے آمادہ جنگ اور نظم و نثر کے ذریعہ انھوں نے ان دونوں پر اس طرح گولہ باری کی کہ اس کی گھن گرج سے فضا آج تک معمور ہے۔

مولانا ظفر علیخاں نے اردو زبان کو ایک نیا اسلوب، صحافت کو ایک نئی زندگی تحریک آزادی کو نیا ولولہ اور ملک و قوم کو نیا جوش عطا کیا۔ ان کی ساری زندگی مصروف اور پرخروش رہی اور انھوں نے گرد و پیش کو بھی مصروف اور پرخروش رکھا۔ وہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں قومی ولولوں کی تکمیل اپنی آنکھوں سے دیکھی اور انکی روح اس تصور سے ضرور آسودہ ہوگی کہ ان کی موت سے قبل برطانیہ کا نیر اقبال غروب ہو چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ بخشے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسائگی عطا کرے جن سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ اور ایکے پسماندگان ہجور کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم ان کے فرزند مولانا اختر علیخاں کی خدمت میں دلی تعزیت پیش کرتے ہیں۔ (ایشیا)

علامہ ظہور الحق اور طٰہٰ یٰسین

اس ماہ دو اور پیاری ہستیاں ہم سے رخصت ہوگئیں علامہ الحاج ظہور الحق صاحب اور طٰہٰ یاسین صاحب انا للہ وانا الیہ راجعون۔ علامہ ظہور الحق دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کے صدر مہتمم تھے اور اس ادارے میں ۴۰ سال تک انھوں نے بے بہا علمی کارنامے انجام دیئے انھوں نے مسلمانوں کے قیمتی علمی سرمایہ کی فراہمی، یکجائی اور بلاد اسلامیہ میں تعلقات کی استواری کے لئے جد و جہد کی۔ علامہ مرحوم ۱۸۷۷ء میں مکن پور شریف میں پیدا ہوئے اور ۲۲ سال کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہوکر "پیسہ اخبار" لاہور کے ایڈیٹر مقرر ہوئے پھر الہ آباد کے ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ بعد ازاں نظام دکن نواب میر محبوب علی خاں کی دعوت پر نواب عماد الملک کی ایما سے حیدرآباد دکن پہنچے اور "دائرۃ المعارف" کا انتظام سنبھالا مرحوم سلطان عبدالحمید کے ذاتی دوستوں میں شامل تھے اور انھوں نے استنبول کے جامعہ میں کچھ عرصہ تک درس بھی دیا تھا۔ علاوہ ازیں جامعہ ازہر میں بھی کم عمری میں درس دینے کا شرف حاصل ہوا تھا جو بغیر مزید دیکھے کسی شخص کو نہیں ملتا قبل نصیب نہیں ہوا تھا۔ اوصاف حمیدہ کا یہ عالم تھا کہ سات برس کی عمر سے کوئی نماز ناغہ نہ ہوئی حتیٰ کہ ان کی اہلیہ محترمہ کے بیان کے مطابق پچاس سالہ رفاقت کے دوران میں تہجد کی نماز بھی ناغہ نہیں ہوئی۔ علامہ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ محترمہ، چار صاحبزادیاں اور چار صاحبزادے بفضل خدا بقید حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

طٰہٰ یٰسین صاحب کا بھی تعلق حیدرآباد دکن سے تھا مرحوم عربی کے اچھے خاصے عالم تھے اور جماعت اسلامی پاکستان کے کارکن۔ شیخ حسن البنا شہید کی کتاب مجموعۃ ... المسلمون اور مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی کتاب (جو دمشق میں چھپ رہی ہے) تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند وپاکستان کے تراجم اردو میں کئے جس میں سے پہلا ترجمہ چھپ چکا ہے اور دوسرا زیر طبع ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے پسماندگان اور مولانا تاب کو صبر جمیل عطا کرے اور جماعت اسلامی کو ان کا نعم البدل۔

ذکی عزا کانی ●

"کمی"

مے بھی ہے مینا بھی ہے گردش بھی پیمانے کی ہے — تیری محفل میں کمی بس ایک دیوانے کی ہے

ایک دیوانہ غمِ رندی سے جو سرشار ہو — ایک میکش جس کا دل مئے خانۂ اسرار ہو
جس کے فیضِ چشم سے ہو گردشِ ہفت آسماں — جس کی چشمِ فیض ہو اسرارِ باقی کا جہاں
جس کے دستِ بیخودی میں زندگی کا جام ہو — جس کا لب اک پرتوِ آئینۂ الہام ہو
ہو بچھونا جس کی خودداری کا فرشِ خاک پر — نقشِ پا جس کا ہو خنداں رفعتِ افلاک پر
جس کا انداز نظر ہو حسن کی جوئے رواں — جس کا قلبِ شوق ہو رشکِ حریر و پرنیاں
جس کے داغِ عشق سے ہو روشنی تدبیر کی — جس کے ہاتھوں میں عناں ہو شہبِ تقدیر کی
جس کی رندی پر عیاں ہو رازِ تسخیرِ حیات — جس کا عزمِ زندگی ہو عزمِ تعمیرِ حیات
بے خودی میں جو طلسمِ جام و مستی توڑ دے — جو زمانے کو جدھر چاہے اُدھر کو موڑ دے
دامنِ صد چاک جس کا لے بہاروں سے خراج — جس کی خاکِ پا کے آگے گرد ہوں شاہوں کے تاج
جو بکھیرے گلشنِ عالم میں تنویریں نئی — جو بنائے خاک کے ذرّوں پہ تصویریں نئی
جس کے دورِ جام میں گردش ہو صبح و شام کی — جس کے دل کی دھڑکنیں ہوں شورشیں الہام کی
جو بنائے ساغرِ نو دل کے ٹکڑے جوڑ کر — پھینک دے جو سب پرانے جام و مینا توڑ کر
جو گدائے راہ ہو لیکن جہانبانی کرے — جو لباسِ فقر میں دنیا پہ سلطانی کرے

یوں تو ذوقِ مے بھی ہے صہبا بھی پیمانہ بھی ہے — دیکھ تیرے میکدے میں کوئی دیوانہ بھی ہے

کوئی دیوانہ بہاریں جس کے قدموں پر نثار　　کوئی میکش جس کے چہرے پہ ستاروں کا نکھار
کوئی بیخود جس کی مستی ہستیٔ ابرِ بہار　　کوئی نالہ کش نوائے شوق جس کی دلفگار
روشنی تاروں کو بخشیں جس کی آہوں کے شرار　　رختِ ہستی پارہ پارہ جس کا دامن تارتار
جس کے ہاتھوں میں زمامِ عالمِ تقدیر ہو　　جو سراپا عشق ہو جو حسن کی تصویر ہو
آہ تیرے میکدے میں کوئی دیوانہ نہیں　　آہ ان رندوں میں کوئی جانِ مے خانہ نہیں
ہاں پلا مجھ کو پلا اک بادۂ مستی کا جام　　ہاں دکھا مجھ کو دکھا تنویرِ حسنِ شادکام
مجھ کو دیوانہ بنا ہاں مجھ کو دیوانہ بنا　　مجھ کو دے اک جام مجھ کو جانِ میخانہ بنا
اے خدائے بیخودی! رندی و ہشیاری سکھا　　مجھ کو دے ساغر مجھے اندازِ میخواری سکھا

تاکہ جامِ زندگی میں خونِ دل اپنا بھروں
تیری محفل کی کمی کو آج میں پورا کروں

(بشکریہ چراغِ راہ)

چندر پرکاش جوہر

مرا ذوقِ دید شاید ابھی کارگر نہیں ہے
کہ وہ روبرو ہیں لیکن مجھے کچھ خبر نہیں ہے

یہ کمالِ ضبطِ غم ہے کہ سلیقۂ محبت
میرا دل تو رو رہا ہے مگر آنکھ تر نہیں ہے

غمِ جستجو کے صدقے وہ مقام دل بھی آیا!
کہ بجز خیالِ جاناں کوئی ہم سفر نہیں ہے

جو نہ کر سکے نظارہ وہ ہے آنکھ ننگِ جلوہ
نہ ہو تابِ دید جس میں وہ نظر نظر نہیں ہے

نہیں یہ جنوں سمجھ تو پھر اور کیا ہے جوہرؔ
کہ وہاں بھی رکھ دیا سر جہاں آستاں نہیں ہے

(بشکریہ "بیسویں صدی")

ماہنامہ "مشیر" کراچی

اپریل سنہ ۱۹۵۷ء میں

اسلامی ادب نمبر

پیش کر رہا ہے

جس میں قدیم و جدید فنکاروں کی وہ تخلیقات شامل ہیں جو صحت مندانہ تہذیبی اقدار کی ترجمانی کرتی ہیں

اس کاروانِ ادب میں صرف حالی، شبلی اور اقبال ہی شامل نہیں

بلکہ

میر و غالب، حسرت و جگر، حسن عسکری سے شوکت سبزواری، جمیس جوائس، ایرک رائی، ٹالسٹائی اور دوستوسکی وغیرہ

نے بھی ایسے فن پارے پیش کئے ہیں جو زندگی کی اعلیٰ اور صحت مندانہ اقدار کے حامل ہیں

حلقۂ ادبِ اسلامی کراچی کی یہ گرانقدر پیش کش اس کا بیّن ثبوت ہے

اور جدید اردو ادب میں ایک نئی صبح کی تمہید

• ضخامت تقریباً ڈھائی سو صفحات • قیمت فی کاپی دو روپے آٹھ آ

• نفیس کتابت و طباعت • خوبصورت سرورق

- جنوری سنہ ۱۹۵۷ء سے سالانہ خریداری قبول کرنے والے اصحاب کو یہ نمبر مفت پیش کیا جائے گا۔
- ایجنٹ حضرات اپنے اپنے آرڈر قبل از قبل بک کرادیں کیونکہ کاغذ کے کوٹے کی وجہ سے یہ پرچہ محدود تعداد میں شائع کیا
- خریدار صاحبان رجسٹری کے لئے چار آنے کے ٹکٹ ارسال فرمادیں تاکہ ان کو پرچہ بذریعہ رجسٹری بھیجا جائے ورنہ ان کو چھ آنے کا وی۔ پی کیا جائے گا۔

منیجر، ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر ا

شمیم جاوید ایم اے

اُردو ناول کی عہد بعہد ترقّی (منشی پریم چند تک)

زندگی ایک مسلسل داستان ہے اور ہر انسان ایک چلتا پھرتا ناول ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ قصہ کہنے اور قصہ سننے کا ذوق انسانی خمیر میں داخل ہے۔ اگر سڑک پر کوئی بچہ لڑکے گر پڑے، کوئی کنوئیں میں گر کر خودکشی کرے، کوئی ننگی دھڑنگی پگلی عورت سامنے سے گزر جائے، تو ہماری نگاہیں خود بخود ٹھٹھک جاتی ہیں کہیں بھیڑ نظر آتی ہے تو ہم فوراً پوچھتے ہیں: "بھئی کیا قصہ ہے؟" پھر قصوں کی طرح قصہ سنانے والے بھی متنوع ہوتے ہیں۔ کوئی مزے لے کر سناتا ہے اور کوئی یونہی۔ ہمارے احباب میں سے بعض اس فن کے ماہر ہوتے ہیں اور ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سے کسی خاص واقعہ کا ذکر سننا چاہتے ہیں۔ اور یہ ذوق قدرت نے ہمیں ہی ودیعت نہیں کیا بلکہ آج سے صدہا سال پہلے جب انسان کا مسکن جنگل تھا اور ان کی خوراک جنگلی جانور تھے۔ چاروں طرف دہشتناک جنگل تھے، ہوائیں چیختی تھیں اور سمندر چنگھاڑتا تھا انسان قدرت کا طابع تھا ــــــ اس وقت بھی اس وحشی دور کا انسان قصوں اور کہانیوں میں اتنی ہی دلچسپی لیتا تھا جتنی ہم لیتے ہیں۔ جب چودھویں کا چاند آسمان پر نمودار ہوتا۔ فضا میں اک پراسرار خاموشی ہوتی۔ آس پاس گھنے جنگل خاموش سانس لیتے اس وقت بھی کہیں دور الاؤ کے گرد بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں جمع ہو جاتے اور کوئی داستان گو داستان شروع کر دیتا۔ مگر ان داستانوں میں پریاں ہوتی تھیں جو فضاؤں میں اڑتی تھیں اور سمندروں میں تیرتی تھیں۔ دیو ہوتے جو انسانوں کو اپنی جھولی میں ڈال کر چل دیتے تھے۔ یاقوت اور پکھراج کے محلات ہوتے اور وہ سب باتیں ہوتیں جو اس دور کے انسانوں کے شعور میں داخل تھیں زمانہ دیکھتے دیکھتے بدل گیا۔ انسان قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم ہونے لگے۔ زمین پر چھوٹی چھوٹی بستیاں ابھرنے لگیں اور پھر یہ جگمگاتے شہروں میں تبدیل ہو گئیں ــــــ انسان قدرت کے خزانوں کا رازداں ہوتا گیا۔ سائنس ارتقائی منازل طے کرتی رہی۔ زندگی میں سادگی کی بجائے تصنع رچتا گیا ــــــ سمندروں کے سینے پر جہاز تیرنے لگے۔ فضاؤں میں اڑن کھٹولو کی بجائے ہوائی جہاز پرواز کرنے لگے اور سکون نایاب ہو گیا جیسا کہ آرنلڈ نے کہا ہے:-

And we say that repose has fled
Forever from the course of the River of
Time.

مگر تخلیقات ذہنی و مادی برابر ارتقا پذیر رہیں اور آج بھی ہم ان داستانوں سے اپنے آبا و اجداد کے عقیدوں اور واہموں چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور ننھے ننھے غموں کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

جب ہم اُردو ادب میں داستانوں، قصوں اور ناولوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کی وجہ یہ کہ اردو ادب نام خدا خود ہی کمسن ہے اس کے قصے کیسے بوڑھے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اک داستان نما چیز سب سے پہلے ہمیں ملا وجہی کی کتاب "سب رس" میں نظر آتی ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۴۵ھ ہجری ہے اور یہ کتاب قلی قطب شاہ کے زمانہ میں لکھی گئی ــــــ ملا وجہی نے اس کتاب میں استعاروں ہی استعاروں میں حسن و عشق کے متعلق ایک فرضی داستان لکھی ہے مگر مذہبی رنگ اس پر غالب ہے، اور مصنف کا بنیادی مقصد مذہبی اور صوفیانہ مسائل سمجھانا ہے۔ بہرحال منتہیٰ (*Climax*) کا تصور اس میں بھی پایا جاتا

ہے اور کردار نگاری کا بھی ہلکا سا پرتو حسن، دل، نظر، رقیب غیرہ ہمت، قامت، زلف، صبر وغیرہ میں نظر آتا ہے۔ "سب رس" کے فوراً بعد ہی ہمیں اس قسم کی مذہبی داستانوں کا اک سلسلہ کبھی نظم اور کبھی نثر کی صورت میں نظر آتا ہے جن میں زیادہ تر یہی خصوصیات ہیں۔ اور یہ سلسلہ تحسین کی "نوطرز مرصع" پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ کسی ملک کے ادب کو نئے سانچوں میں ڈھالنے میں سب سے بڑا ہاتھ اس ملک کے فرمانرواؤں کا ہوتا ہے عوام بھیڑوں کے گلے کی مانند ہیں جنھیں کسی سمت میں بھی ہنکایا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے اردو ادب کا آغاز اور ملتِ اسلامیہ کے زوال کا آغاز ایک ہی وقت میں شروع ہوا۔ یہ دور تعیش پسند اور تن آسان فرمانرواؤں کا دور تھا۔ جو اپنے غم کو عرقِ مے ناب کر دینا ہی زندگی کا اولیں مقصد سمجھتے تھے اور ان کی دلبستگی کے لئے جو داستانیں لکھی گئیں۔ ان میں ان ہی کی زندگی کا عکس ملتا ہے۔ دہی محلات کی چہل پہل، بازاروں کی رونق، خواصوں کے ہجوم سخاوت اور دریا دلی کے معجزے، جن، پریوں اور ایک انہونی ([illegible]) تخیلی دنیا کی تلاش ـــــ اور یہ اثر ان داستانوں میں معنوی حیثیت سے ہی نہیں ظاہری اور لفظی حیثیت سے بھی رچا ہوا ہے۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے آغاز کے بعد ہمیں داستانوں کا ایک سلسلہ ملتا ہے مگر یہ داستانیں پرانی داستانوں سے اس حیثیت سے مختلف ہیں کہ ان میں عوام کی زبان کا خیال رکھا گیا ہے۔ ان میں زیادہ تر ترجمے ہیں۔ اس سلسلے میں میر امن کی "باغ و بہار" بقائے دوام کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے اور میر امن کا یہ کہنا صحیح ثابت ہوا؂

مجھے بھول جاویں گے سب بعد مرگ
رہے گا مگر یہ سخن یادگار
خزاں کا نہیں اس میں آسیب کچھ
ہمیشہ ترو تازہ ہے یہ بہار

میر امن نے "باغ و بہار" میں شعوری طور سے عوام کی زبان استعمال کی ہے اور [illegible] اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس داستان کو ایسا دلچسپ بنا دیا ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

میر امن کو اپنے "دلی کے روڑے" ہونے پر [illegible] فخر ہے۔ آج بھی "باغ و بہار" کی زبان [illegible] اور الفاظ کے جوڑ توڑ کر [illegible] ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے باہر بھی اس صدی میں داستانوں کی تخلیق ہوتی رہی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انشاء اللہ خاں انشا کی "رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی" اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ یہ قصہ تو معمولی سا ہے مگر ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس داستان میں شروع سے آخیر تک عربی یا فارسی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا ہے۔ ۱۸۲۴ء میں رجب علی بیگ صاحب سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھ کر ان داستانوں میں اضافہ کیا۔ سرور کا طرزِ تحریر مسجع اور مقفی ہے قصہ بھی ان کا اپنا نہیں ہے۔ مختلف داستانوں جیسے "پھول بن"، "نل دمن"، "مثنوی سحر البیان"، "گلزار نسیم"، "بہار دانش" وغیرہ سے مختلف واقعات کو لے کر یکجا ترتیب دے دیا ہے۔ دوسری قدیم داستانوں کا تھیم (Theme) ان میں بھی موجود ہے یعنی کسی بادشاہ کو ریش میں اک سفید بال دیکھ کر احساسِ پیری۔ رمال اور نجومیوں سے مشورہ۔ شہزادہ کی پیدائش کی خوشیاں۔ شہزادہ کا جوان ہو کر عاشق ہو جانا۔ محبوبہ کی تلاش میں جنگلوں جنگلوں مارے پھرنا۔ دیووں سے جنگیں۔ طلسمات کے کھیل، اسمِ اعظم کی برکتیں وغیرہ ـــــ غرضیکہ زندگی سے فرار تخیلی دنیا کا [illegible] ـــــ دراصل یہ دور اودھ کے زوال کا دور ہے نوابانِ اودھ عیش امروز کو راحتِ فردا پر ترجیح دے کر [illegible] آلام کو بھولے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے "فسانۂ عجائب" [illegible] اودھ کی زندہ تصویر ہے۔ خصوصاً لکھنؤ کے [illegible] سترہ صفحات سرور نے لکھے ہیں۔ ان صفحات میں [illegible]

[illegible] اور سرسید کا قلم [illegible] بول اٹھا ہے۔
شاہ جہاں کا لال قلعہ ۱۸۵۷ء میں پاش پاش
ہوگیا۔ تو محلات اور آثار بھی یکجا نہیں رہ سکتیں۔ تو ایوانِ ادب
کی سلامتی [illegible] زبان زنگ لائیں اور سفید فام تاجر
جو سترھویں صدی کے آغاز میں محض تجارت کی خاطر ساحلِ ہند
پر خیمہ زن ہوتے تھے پورے ہندوستان میں اقامت گزیں
ہوگئے۔ چند سر پھروں نے آزادی کی آخری جنگ لڑی اور
پسپا ہوگئے .... ایک آخری صدا دے کر خاموش
ہوگئے۔ دلی اجڑ گئی۔ لکھنؤ پامال ہوگیا۔ سرزمینِ ہند پر خاک
اور خون کا دریا بہنے لگا ـــــ پرانی تہذیب اس نئی آگ میں
جل کر راکھ ہوگئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ بھیانک اندھیرا۔
پرانی ادبی اقدار ختم ہوگئیں اور زندگی نئی راہوں پر
گامزن ہوگئی۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اہلِ ہند اور خصوصاً مسلمانوں
کا مستقبل غیر یقینی اور مبہم سا ہوگیا۔ جہالت کی تہیں برابر چڑھتی
رہیں اور آنے والی نسلیں جاہل ماؤں کی آغوش میں سیہ دودھ
پی پی کر جوان ہونے لگیں۔ دلی کے کسی کوچہ میں ایک مولوی صاحب
نے اپنے بچوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ان کے لئے دلچسپ کہانیاں
بطور سبق کے لکھنا شروع کیں۔ مگر یہی دلچسپ کہانیاں مستقبل
کے لئے سنگِ میل ثابت ہوئیں جو ۱۸۶۹ء میں "مراۃ العروس"
اور "منتخب الحکایات" کے عنوانوں سے شائع ہوئیں۔ چونکہ
ان کہانیوں سے ڈپٹی نذیر احمد کو مالی منفعت بھی حاصل ہوئی اسلئے
ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق مولانا نے کہانیوں اور قصوں کا
ایک باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا اور یکے بعد دیگرے ـــــ
"توبۃ النصوح" "رویائے صادقہ" "ابن الوقت" وغیرہ
کئی قصے لکھ ڈالے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ان قصے نما ناولوں کو ناول ہی کہا جا سکتا
ہے [illegible] داستانوں کی طرح کرداروں کا جائزہ لیا جاتا تھا
انکے یہاں صرف نیکیوں ہی نیکیوں کا ہونا۔ یا [illegible]
جیسی اصلاح اور شخصیت [illegible] کا شاندار حال رہا سب کچھ پایا جاتا ہے
اور ناول سے یہ اس لئے قریب ہیں کہ ان میں جن، دیو اور پریوں کی
بجائے انسانوں کا ذکر ہے، جانا پہچانا ماحول ہے اور عوامی زبان
ہے مگر بقول سرور صاحب:

"نذیر احمد کے کردار یا تو شیطان ہوتے ہیں یا رحمان"

ان کے یہاں عورت ماں، بہن، بیوی ہو سکتی ہے مگر محبوبہ نہیں۔
پھر بعض مرتبہ مولانا عربی یا انگریزی الفاظ کی کثرت سے عبارت
میں کھٹک پیدا کر دیتے ہیں۔ نذیر احمد زبان داں ہیں مگر بعض
اوقات محاوروں کا بے جا استعمال ان کی تحریر کو داغدار بنا دیتا
ہے۔ نذیر احمد کے کردار صرف دماغ سے کام لیتے ہیں۔ شاید دل
ان کے پہلو میں ہوتا ہی نہیں یا اگر کہیں دل کی ہلکی سی
جھلک نظر بھی آتی ہے تو نذیر احمد اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا
گھونٹ دیتے ہیں۔ پلاٹ میں نذیر احمد انجام کو پہلے ہی سے
پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے کسی ناول کے بھی ایک دو باب پڑھنے
کے بعد آپ ناول کے انجام کا پتہ لگا سکتے ہیں اور اس انجام
کو زیادہ واضح اور یقینی بنانے کے لئے وہ اپنے کرداروں سے جا بجا
لمبی چوڑی تقریریں کراتے ہیں اور اس پر بھی اطمینان نہیں ہوتا
تو بذاتِ خود صیغۂ واحد متکلم بن کر کود پڑتے ہیں۔ بہرحال ان
معائب اور محاسن کے باوجود وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے
فرضی قصوں کی بجائے اسی خاکی اور مجبوری زمین پر بسنے والوں
کے حالات لکھے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے خاکی
انسان کو نوری یا ناری بنا دیا۔

نذیر احمد کی ان خامیوں کو پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے
"فسانۂ آزاد" میں بالکل دور کر دیا۔ مگر پنڈت جی صرف کردار
نگاری کے ماہر تھے۔ واقعات کی ترتیب اور قصہ کا تسلسل ان
کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اسی لئے "فسانۂ آزاد" شیطان کی
آنت کی طرح طویل ہے۔ پلاٹ کے لحاظ سے یہ پرانی داستانوں
سے قریب ہے اور کردار نگاری کے لحاظ سے یہ بیسویں صدی
کے بڑے سے بڑے ناول کے کرداروں سے ٹکر لے سکتا ہے۔ سرشار کا

خوجی شیکسپیر کے "فالسٹاف" اور ڈکنز کے "پکوک" سے کسی طرح کم نہیں۔ زندگی اس کے روئیں روئیں سے پھوٹی پڑتی ہے۔ اسکی سنجیدگی میں شوخی اور شوخی میں سنجیدگی ہے۔ وہ مشرقیت کا (Symbol) نشان ہے۔ وہی بات بات پر ہیکڑی دکھانا " نہ ہوئی میری قرولی ورنہ بتا دیتا" ہر لمحہ افیم میں غرق ، مغرب سے نالاں۔ خوجی کا کردار تخلیق کرنے کے بعد سرشار خود ہمیشہ کے لئے زندہ ہوگئے۔ کاش وہ قصہ کے پلاٹ کی طرف بھی توجہ دیتے ، کاش وہ اختصار سے کام لیتے ——— دراصل سرشار مشرقیت اور مغربیت کے دوراہے پر کھڑے تھے۔ جب انھوں نے یہ ناول تخلیق کیا تو ایک دنیا مر رہی تھی اور دوسری ...... پیدا ہونے والی تھی اور یہ تذبذب جابجا ان کی تحریر میں نمایاں ہے اور کہیں کہیں تو ان کے لہجہ میں تلخی بھی آگئی ہے مگر یہ تلخی طنز کی شکر میں لپٹی ہوئی ہے اس لئے زود ہضم ہے۔

صحیح معنوں میں اردو میں ناول کی ابتدا شرر سے ہوئی۔

شرر کو اردو ناول نگاری میں وہی درجہ دیا جاتا ہے جو انگریزی ادب میں رچرڈسن اور فیلڈنگ کو ——— وہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے لفظ "ناول" کو اردو میں استعمال کیا۔ شرر نے شعوری طور سے انگریزی ناولوں کے اسلوب کو اپنایا اور وہ ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ شرر کو عربی ادب کے مطالعہ اور انگریزی اسلوب نے بہت متاثر کیا۔ اُنکے ناول ٹیکنک ، مواد ، ہیئت کے لحاظ سے مکمل ناول ہیں۔ وہ پلاٹ کی تعمیر میں نہایت صناعی سے کام لیتے ہیں۔ مقصدیت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مگر یہ مقصدیت اپنے بیان سے نہیں بلکہ کرداروں کی زبان سے واضح کراتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح شرر میں بھی وہی جلانے پھلانے اور سوچے سمجھے کردار تراشنے کا عیب ہے اُن کے ہر کردار میں یکسانیت ہے۔ منصور، عزیز، احسن، وغیرہ سب بہادر اور خوبصورت ہیں۔ سب پُرخلوص ہیں اور سب جان دینے پر آمادہ ——— اس طرح ان کی ہیروئن ورجینا، موہنا، زہرہ، حسین، عصمت پروردگار کا اعلیٰ نمونہ خلیق اور پاکدامن ہیں

کہیں کہیں شرر نے اپنے ناولوں میں مبالغہ سے بھی کام لیا ہے اور تعصب کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ دراصل یہ عیسائیت سے منتقمانہ جذبہ اس رنگ میں آشکار ہوا ہے۔ اس کے علاوہ شرر انیسویں صدی میں بیٹھے ہوئے آٹھویں صدی کے مسلمانوں کا ماحول پیش کرتے ہیں اور عرب کی سرزمین پر ہندوستان کی معاشرت اور سیرت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ یہ سب متضاد باتیں اُن کے ناولوں کو کچھ عجیب سی شکل دے دیتی ہیں۔ پھر اُن کی بسیار نویسی بھی ان کے ناولوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ شرر نذیر احمد کی طرح مزاح کی چاشنی بھی نہیں دیتے۔ وہ شروع سے آخیر تک بالکل سنجیدہ رہتے ہیں مگر ان کے مکالمے نہایت موزوں اور دلچسپ ہوتے ہیں شرر نے بہت سے ناول لکھے مگر "فردوسِ بریں" انکا مثالی ناول ہے۔ شرر کے معاصرین میں اودھ پنچ اسکول کے مصنفین کے تراجم بھی اُردو ناول میں اضافہ ہیں۔ مگر اُن میں ظرافت کا عنصر زیادہ ہے جیسے منشی سجاد حسین کا "حاجی بغلول" ——— ——— نواب آزاد اور پنڈت جوالا پرشاد برق نے بھی انگریزی ترجمے کئے ——— حکیم محمد علی نے شرر کی تقلید میں تاریخی ناول لکھے مگر تاریخ ادب میں ان کی کوئی خاص حیثیت اس لئے نہیں کہ یہ ناول کو آگے نہ بڑھا سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے نامکمل کام کی تکمیل مولانا راشد الخیری کے مقدر میں تھی۔ وہ عورتوں کے سرسید ہیں۔ غم و الم کی مصوری میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ دراصل قدرت نے انھیں سوز و گداز سے بھرا ہوا دل دیا تھا۔ ان کو مسلمان عورتوں کی پستی کا احساس تھا اور انھوں نے اپنی انگلیوں کو خونِ دل میں ڈبو ڈبو کر ہماری خانگی سماجی زندگی کی عکاسی کی۔ "نوحۂ زندگی"۔ "شامِ زندگی"۔ "صبحِ زندگی"۔ "ویڈیا کی سرگذشت"۔ "بچہ کا کرتا" وغیرہ وغیرہ انکے غم و آلام کے مرقعے ہیں۔ "ولایتی ننھی" اور "نانی عشو" میں انھوں نے زندگی سے بھرپور کرداروں کی تخلیق کی ہے کاش اُن کی بھی بھری طبیعت اس میدان میں اور اپنی جولانی دکھا سکتی۔

ادھر راشد الخیری دہلی کی مٹتی ہوئی تہذیب پر آنسو بہا رہے تھے ادھر مرزا محمد ہادی رسوا اپنے مخصوص انداز میں لکھنؤ کی ملمع کاری کو تیز تیز ناخنوں سے کھرچ رہے تھے۔ یوں تو مرزا رسوا نے "ذاتِ شریف"۔ "شریف زادہ" اور چند اور کتابیں بھی لکھیں۔ مگر ان کا شاہکار ناول "امراؤ جان ادا" ہے۔ درحقیقت امراؤ جان ادا کا کمرہ صرف امراؤ جان ادا کا ہی کمرہ نہیں بلکہ اودھ کا دل ہے۔ رسوا نے اس ناول میں کئی کرداروں مثلاً بسم اللہ، خانم، فیضو، امراؤ جان کو زندگی عطا کر دی ہے۔ مرزا رسوا کے ریاضی اور سائنس کے عشق اور غمِ روزگار نے اتنی فرصت نہیں دی کہ وہ اور ناول لکھ سکتے۔ ورنہ وہ یقیناً اس دور کے سب سے بڑے ناول نگار ہوتے۔ گو ان کی عظمت میں اب بھی کلام نہیں۔

بیسویں صدی کے اولین دور ہی میں ہمارے یہاں ایسے ناول نگار بھی پیدا ہوتے جو بڑھتے ہوئے مادی مسائل سے گھبرا کر رومانیت میں پناہ ڈھونڈھنے لگے۔ ان کے مشیر و نیاز فتحپوری ہیں نیاز صاحب شروع سے ہی چونکا دینے والی باتیں کہنے کے عادی ہیں۔ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ادب کا اس طرح فراری ہونا بظاہر تعجب انگیز نظر آتا ہے۔ مگر نیاز فتحپوری اسی تعجب اور حیرت کے دلدادہ ہیں۔ وہ ملحدوں میں خدا پرست اور خدا پرستوں میں ملحد بن جاتے ہیں۔ کبھی ان کا دل کافر ہو جاتا ہے اور دماغ مومن اور کبھی دماغ مومن اور دل کافر ——— اور یہی چیز ان کے ناولوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ "شہاب کی سرگذشت" پڑھئے آپ کو اس سماجی اصلاح کے عناصر بھی ملیں گے۔ زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینے کا جذبہ بھی ——— مگر ساتھ ساتھ زندگی سے فرار بھی ——! ایک (Utopian) انہونی تخیلی دنیا کی تلاش بھی ——— بہرحال نیاز فتحپوری کے ناول زبان کے لحاظ سے پڑھنے کے لائق ہیں چونکہ ان کی زبان "اردوئے معلّا" کی زبان ہے۔

پھیلتی، بڑھتی اور ارتقا پذیر زندگی کا جتنا نقشہ پریم چند نے دیا ہے اتنا اس دور کے شاید ہی کسی ادیب نے دیا ہو۔ پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانوں سے کیا اور رفتہ رفتہ وہ ناولوں کی دنیا میں آ گئے۔ پریم چند کا سب سے بڑا جوہر ان کی انسانی فطرت کی نبّاضی ہے۔ ان کے کردار ہوری، سورداس، دھنیا، گوبر، گیان شنکر ہمیں نہیں بھولتے۔ پریم چند ہندوستانی معاشرت اور ماحول کا پورا پورا اثر اپنے کرداروں میں بھر دیتے ہیں، وہ غلامی سے نالاں ہیں اور شاید یہی غلامی سے نفرت اس طرح ان کے لاشعور میں داخل ہو گئی کہ وہ پیچیدگی (Complex) بن گئی ان کے ناولوں میں باوجود اس قدر روحانیت اور وسعت ہونے کے ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ وہ ملحد اور دہریئے ہیں۔ درحقیقت یہ الحاد ان کا ذہنی مرض ہے۔ کاش وہ کلامِ اقبال سے استفادہ کرتے، تو اقبال ان کو سمجھا سکتا کہ "مقامِ کبریا" کیا ہے ——— ان کے ناول "غبن"۔ "نرملا"۔ "چوگانِ ہستی" ہمارے ناولوں میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ خصوصاً "گئودان" ان کا شاہکار ناول ہے۔

منشی پریم چند کے بعد سے لے کر اب تک اردو ناول نے اور بھی ارتقا کی کئی منازل طے کیں ہیں۔ جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک متعدد ناول لکھے گئے ہیں۔ یہ ناول صرف موضوعات اور فلسفۂ خیال کے لحاظ سے ہی گزشتہ ناولوں سے مختلف نہیں ہیں بلکہ نئے ناول نگاروں نے اسلوب اور ٹیکنک میں بھی نئی نئی تبدیلیاں کیں ہیں۔ زبان کے لحاظ سے یہ ناول پست ہیں مگر تفہیم اور موضوع کے لحاظ سے بلند ہیں ——— پھر ناول نگاروں نے بھی اپنے لئے مخصوص راہیں متعین کی ہیں کسی نے محض کردار نگاری پر زور دیا ہے۔ کوئی پلاٹ ہی میں نیا رنگ پیدا کر سکا ہے اور جو کچھ اور آگے بڑھے ہیں۔ انھوں نے صرف ایک خاص فضا پیدا کر کے ہی ناول کے کرداروں اور پلاٹ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں کرشن چندر، عزیز احمد، علی عباس حسینی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، احمد شجاع پاشا، رئیس احمد جعفری، رشید اختر ندوی، نسیم حجازی، اسعد گیلانی ——— .... اور ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد محسن، اے حمید، محمود ریاض، حسن مثنیٰ ندوی، محمود فاروقی، ابوالخطیب اور

بہت سے دوسرے نئے ناول نگار...... ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔

ان سب کے ناولوں کا جائزہ تفصیل طلب ہے۔ انشاءاللہ "شمع" کی آئندہ اشاعت میں "اردو ناول کی عہد بعہد ترقی" — پریم چند سے لیکر اس دور تک پیش کی جائیگی —

"شمیم" "الف" "تبسم" "تصویر" جیسے ضخیم ناول جو لکھے تو نئے دور میں گئے ہیں مگر ان کا انداز نگارش پرانا ہے۔ اس لئے ان کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اسکے علاوہ انکے موضوعات اس قدر گھسے پٹے ہیں کہ اردو ناول کے ارتقا میں ان کا ذکر کچھ اتنا ضروری بھی نہیں۔

البتہ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کے ناولوں کا تذکرہ ضروری تھا۔ مگر "تفریحی ادب" کے عنوان سے ایک مقالہ میں اُن کا ذکر کر دیا جائے گا۔

شفیق جونپوری

دینا ہے تو دے حسنِ ابدی آفاق کے زینت خانے کو
کیوں شمع جلے بجھنے کیلئے، کیوں پھول کھلے مرجھانے کو

مے نوش وہی ہے اے ساقی جو عام کرے پیمانے کو
سائل ہے جو تھوڑی سی پی کر دیتا ہے دعا مے خانے کو

تعمیرِ نشیمن کرنا تھی کیوں بیٹھ گئے پچھتانے کو
آندھی نے چمن کو بھی لوٹا روتے ہی رہے ویرانے کو

نکہت پہ ہے اتنا ہی بہتان آوارگی و رسوائی کا
جتنا ہی چمن سے دور گئی فیضانِ چمن پہنچانے کو

کشتی کی یہی رفتار ہے تو کشتی پہ بھروسا کیا ہوگا
موجوں سے تو ٹکرا نہ سکی ساحل سے چلی ٹکرانے کو

اس وقت نہیں ہے قدرِ جنوں لیکن وہ زمانہ آئے گا
بستی سے نکلوانے والے ڈھونڈیں گے ترے دیوانے کو

تلوار کی قوت سے بھی شفیق آئین بدل سکتے ہیں کہیں
اخلاق کی طاقت کیا کم تھی تہذیب پہ ایماں لانے کو

(بشکریہ تعمیر انسانیت)

فاروق بانسپاری

بایں فیضانِ بیداری بایں لطفِ گراں خوابی
اُدھر مہتاب سازی ہے اِدھر تعمیرِ مہتابی

مجھے افسانۂ خونِ تمنّا کیا سُناتا ہے
کہ آنکھیں ہیں تری نا آشنائے اشکِ عنابی

جو ہمّت کے دھنی تھے تیر کر اُس پار جا پہونچے
تجھے ساحل پہ لے ڈوبی ہوائے خوفِ غرقابی

جراحت خود مداوا ہے قلوبِ زخم خوردہ کا
نہ پہنچے اس حقیقت تک ترے سینا و فارابی

شکارِ گرگ بندی ہو گیا فرزانۂ مشرق
بالآخر دشمنِ جاں بن گئے اندازِ سیمابی

غلط فہمی سے تو جس کو نشانِ صبحِ نو سمجھا
شبِ مہ کا نتیجہ تھی وہ انجم کی سُبک تابی

مجھے ڈر ہے کہ میرِ کارواں کی کم نگاہی سے
بدل جائے نہ آخر منزلِ افکارِ اعرابی!

یدِ بیضا کے دیوانو کہیں دھوکا نہ کھا جانا
کہ اکثر آستینوں میں چھپی رہتی ہے محرابی

مثالِ آب جو مخرج سے اپنا ربط پیدا کر
کہ شبنم سے نہیں ہوتا علاجِ دردِ پایابی

سکوں فاروق کیسا بحرِ بے پایانِ ہستی میں
وہی طوفاں کے ہنگامے وہی موجوں کی بیتابی

نعیم صدیقی •

کیمیائی تناسل

(نعیم صدیقی کی یہ عظیم کہانی، جو اُن کے پہلے افسانوی مجموعے "ذہنی زلزلے" کی زینت ہے، جنگ عظیم ثانی کے زمانہ ـــــ ۱۹۴۴ء ـــــ کی پیداوار ہے، لیکن اتنا طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود اس کی پائیداری میں کوئی فرق نہیں آیا، البتہ لُطف کو دوبالا کرنے کے لئے "جرمنی" کی جگہ "روس" یا کوئی اور ملک پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ معاملہ بہرحال قارئین کرام کے ذوق پر چھوڑا جاتا ہے۔ (ایڈیٹر)

سنہ ۲۲۵۸ء کے امریکہ کی سیاحت کرنے والے
فکری مسافر کی ڈائری کے چند اوراق ـــــ

۵ جولائی :-

ریڈیو کے ذریعہ کل پروفیسر ویلار کی ایک اہم تقریر براڈ کاسٹ
کی گئی۔ آپ نے کئی لائبریریاں کھنگالنے کے بعد یہ تحقیق پیش کی ہے کہ
بیسویں صدی ہی سے عورتوں میں بچے پیدا کرنے کے خلاف رجحانات
پھیل گئے تھے اور ان رجحانات کا اظہار مختلف ریزولیوشن سے ہوتا ہے
جو اس زمانہ کی زنانہ انجمنوں نے پاس کئے۔ نیز اس عہد کا لٹریچر بھی بتاتا
ہے کہ عورت ارتقاء کے فطری راستہ پہ پڑ چکی تھی۔ پروفیسر مذکور نے
برتھ کنٹرول کے قدیم آلات اور مروجہ دواؤں اور طریقوں پر جو بصیرت افروز
بحث کی ہے اسے سن کر آدمی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر موصوف نے
جس محنت سے بچہ کُشی کے واقعات دو تین سو سال پہلے کے لٹریچر سے
تلاش کیا ہے وہ قابل رشک ہے۔

پیٹ میں بچوں کو پرورش دینا بھی کتنی مضحکہ انگیز حماقت تھی
انسان کی مادہ اس عہد میں اسی مصیبت کا شکار تھی جو آج تک ہر
مرغی اور ہر کتیا کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ پروفیسر مذکور نے بتایا ہے
کہ دور جاہلیت میں بچے پیدا کرنے کا جو حیوانی طریقہ رائج تھا اس سے
عورتوں کے چہرے زرد ہو جاتے تھے، وہ سوا نو مہینہ کا عرصہ محض
ایک بچہ کی وجہ سے مستقل بیماری کی حالت میں کاٹتی تھیں۔ پھر دو سال
تک چھاتیوں سے دودھ پلانے کا گھناؤنا کام کرتی تھیں۔ ان مشاغل
کثیفہ کی وجہ سے وہ تمدن کی کوئی دوسری بہتر خدمت سرانجام نہیں
دے سکتی تھیں اور اس کا معاوضہ کیا ہوتا تھا؟ ایک لفظ۔ "ماں"
اور عورت اسی سے سرشار تھی۔

۷ جولائی :-

آج ایک فلم دیکھنے میں آیا سینما ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ
تھی اس میں دکھایا گیا تھا کہ پرانے زمانے کا انسان کس طرح پیدا
ہوتا تھا۔ استقرار حمل جنین کا مختلف مدارج ارتقاء طے کرنا، وضع حمل
بچے کی ابتدائی زندگی چپ چپ کر کے دودھ پینا، جونک کی طرح
ماں سے لپٹے رہنا، گندگی پھیلاتے پھرنا، یہ سارے مناظر بہت
منظم طریقے سے دکھلائے گئے۔ اس سلسلے میں عورت اور بچہ کی
زندگی جس طرح بسر ہوتی تھی اسے عبرت کے لئے پیش کیا گیا

۱۵ اگست :-

آج ٹاؤن لائبریری سے حاصل کی ہوئی کتاب "انسان کی
پیدائش" پڑھنے سے معلوم ہوا کہ دور حیوانی اور موجودہ دور انسانی کی

درمیانی کڑی سنہ ۲۰۲۰ء سے سنہ ۲۰۲۵ء تک کا وہ زمانہ جب کہ دنیا کی سب سے بڑی عورت ایلاسکا نے ایک عالمگیر زنانہ تنظیم کے بل پر عورتوں کو مردوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ ان چند سالوں میں صرف دنیا کے تاریک حصص اور جرمن علاقہ کی عورتوں نے بچے جنے جن کی عالمگیر شرح پچھلے سالوں کے مقابلہ میں ۸۰ فیصدی کم تھی۔ آخر ۲ فروری سنہ ۲۰۲۶ء کو عالمگیر انجمن ذکور اور "مجلس اناث" کے درمیان ایک عہد نامہ قرار پایا جس کی رو سے عورتوں نے عمر بھر میں ایک بچہ پیدا کرنے کی ذمہ داری ان شرائط پر قبول کر لی :-

۱۔ بچوں کی پرورش، نگہداشت اور تربیت کا کام حکومت سرانجام دے گی اور عورت بچہ پیدا کرنے کے بعد اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے گی۔

۲۔ عورت استقرار حمل سے لیکر زچگی کی حالت سے نکلنے تک حکومت سے اتنا وظیفہ حاصل کرنے کی حق دار ہوگی جس سے وہ اپنے معیار زندگی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ضروریات فراہم کر سکے اور اپنی صحت کی نگہداشت کر سکے۔

۳۔ ایک سے زیادہ بچہ پیدا کرنے والی عورت کے لئے شرط نمبر ۱ و نمبر ۲ ساقط ہوگی۔

ان شرائط کے طے ہو جانے سے توالد و تناسل کا سلسلہ تو چل نکلا لیکن یہ اتنا مہنگا پڑا اور اس کے باوجود صرف زر کثیر اتنی کم نسل حاصل ہو سکی کہ اقوام کی عددیت کا دیوالہ نکلنے لگا اور مختلف اداروں کو چلانے کے لئے کارندے نایاب ہونے لگے۔ سائنس کی توجہات اس مسئلہ پر مرتکز تو تھیں ہی۔ سنہ ۲۰۵۰ء امریکن پروفیسر مسٹر الیفاری نے تیلشے کے مرتبان میں انسانی نطفہ کو بچہ کی شکل میں تبدیل کرنے کا کامیاب طریقہ دریافت کر لیا اور سنہ ۲۰۷۰ء میں پہلا باقاعدہ کارخانہ انسان سازی امریکہ میں قائم ہوا۔ کارخانہ کے ساتھ ایک عالمگیر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد رکھی گئی جس کی تحقیقاتوں نے کیمیائی توالد و تناسل کے فن کو موجودہ منزل پر پہنچایا ہے۔ اس فن کو دنیا کے تمام آزاد ممالک میں فروغ حاصل ہو چکا ہے بجز جرمنی کے جو دور وحشت کو آج بھی دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے۔

۲۹ اگست :-

آج ہم وٹیل کے عظیم ترین کارخانہ بچہ گری کی سیر کو گئے۔ سب سے پہلے ہمیں وہ ہال دکھایا گیا جہاں امتحانی نلیوں اور رنگین بوتلوں میں قسم قسم کے انسانی نطفے محفوظ تھے اور نمبروں کے ساتھ ان کے متعلق ضروری کوائف ایک رجسٹر میں درج تھے کہ یہ فلاں آدمی سے حاصل کیا گیا ہے وہ فلاں نسل سے ہے۔ اس کی دماغی حالت ایسی ہے اس کا قد اور وزن اتنا ہے اس کی ریکارڈ بک میں فلاں فلاں بیماریوں کا اندراج ہے وغیرہ۔ کسے معلوم ہے کہ ان ٹیوبوں میں دو ٹانگے جانوروں کا ایک سیلاب کا سیلاب بھرا ہوا ہے کیونکہ ایک مرد کے ...... نطفہ میں کئی لاکھ کیڑے ہوتے ہیں جو "آدمی بننے" کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کیڑوں کو فراہم کرنے کے لئے ایک مستقل سرکاری محکمہ موجود ہے شہروں میں جگہ جگہ ان کو خریدنے والی دکانیں کھلی ہیں۔ یہ دکانیں دوہرا کاروبار کرتی ہیں ایک تو صنفی خواہش کو بجھانے کے لئے مرد و عورت دونوں کے لئے ان کے پاس سائنٹیفک آلات ہوتے ہیں ان آلات کے ذریعہ انسان نہایت مہذب طریقہ سے اپنی فطری ضرورت پوری کرتا ہے۔ آج کل مرد و عورت کے درمیان وہ جانوروں کا سا عمل واقع نہیں ہوتا جس سے دور جاہلیت کی طرح بچے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ دوسری طرف یہ دکانیں انسان پیدا کرنے والے کارخانوں کو مادۂ تولید فراہم کرتی ہیں۔ نیز عورتوں کا اپریشن کر کے ان کے "بیضے" بھاری قیمتوں پر خریدتی ہیں۔

خیر تو پھر ہم نے وٹیل کا دوسرا ہال دیکھا جہاں مرتبانوں میں مختلف مدارج کے جنین چپکے چپکے زندگی کا سفر طے کر رہے تھے انھیں ربڑ کی باریک نلیوں کے ذریعہ ضروری کیمیاوی اجزاء بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ پھر ہمیں تربیت گاہ میں لیجایا گیا۔ جہاں ہر بچہ کو (مرتبان سے نکلنے کے بعد) پہلے دو سال بسر کرنے ہوتے ہیں۔ یہاں بچے کو ایسی سیال غذا خارجی طور پر دی جاتی ہے کہ فضلہ پیدا نہیں ہوتا معدے اور آنتوں کو برسر عمل رکھنے کے لئے جو دوائیں اندر دی جاتی ہیں وہ ایک مشین کے ذریعہ خارج کر لی جاتی ہیں بہرحال پرورش کنندہ

کو کسی طرح بھی گندگیوں کا سامنا کرنا نہیں پڑتا ۔

پھر دکھایا گیا ہے کہ کس طرح تربیت گاہ سے نکل کر بچہ تعلیم گاہ میں جوان ہوتا ہے تعلیم گاہ کئی حصوں میں منقسم ہے اور بجائے خود ایک شہر ہے ۔ ہر حصے میں ایک نطفہ کی پیدائش کی تربیت کی جاتی ہے ۔ پھر مختلف کاموں کے لئے ایک ایک کیمپ کو کئی ٹولیوں میں بانٹ دیا جاتا ہے ۔ ۱۶ سال کی عمر میں بچہ تعلیم گاہ سے فارغ ہو کر تمدن کی خدمت انجام دینے میں لگ جاتا ہے ۔

اس کارخانہ سے ہر روز اوسطاً ۵ انسان خریداروں کے ہاتھ بیچ دیے جاتے ہیں اور شاید اسی کارخانہ کی جنس سب سے گراں ہے کیونکہ یہ پائدار ثابت ہوئی ہے فی انسان ... ۵ ڈالر چارج کئے جاتے ہیں ۔ اس کارخانہ کی کمیشن ایجنسیاں ہر شہر میں اور ہر ملک میں موجود ہیں ۔

ناقص پیدائش کے انسانوں کی ہر مہینہ میں ایک دفعہ نیلامی ہوتی ہے اور عموماً ایک ہزار سے زیادہ قیمت نہیں ملتی حکومت غور کر رہی ہے کہ ایسے بچوں کو اوائل ہی میں ہلاک کر دینا چاہیئے کیونکہ کارخانے یہ نقصان برداشت کرنے پر تیار نہیں ہیں ۔

کتنی دلچسپ سیر تھی ۔

۲ ر ستمبر :-

امریکہ کے انسانی پیداآوری کے تحقیقی ادارے نے اپنے سہ ماہی پرچہ " رابٹ " میں امریکن " انسان زا " کارخانوں کے متعلق نہایت دلچسپ معلومات پیش کی ہیں اور بعض کیمپوں کے عجیب حالات ایک نقشہ میں پیش کئے ہیں جو ذیل میں درج ہے

نام کارخانہ	نمبر کیمپ	کیفیت
۱ ۔ کراؤن	1۳۳A / C.	اس پوری کیمپ کے افراد کی ایک ٹانگ زیادہ لمبی ہے اور ان کو بالکل ہنسی نہیں آتی ۔ کوشش کی جارہی ہے کہ ٹانگ اگر چھوٹی نہیں ہوسکتی تو کم از کم انھیں ہنسی تو سکھادی جائے ۔
۲ ۔ وینٹل	۱۷۰۳ / ۷۰Q	اس کیمپ کے افراد پیہم چھینکتے رہتے تھے ۔ آخر ماہرین کی مسلسل کوششوں سے یہ بیماری دور ہوگئی تھی لیکن اب مختلف خریداروں کی طرف سے پھر چھینکوں کی شکایات آرہی ہیں ۔
۳ ۔ کالیرا	۳۱ / ۵۴۰۵۵	اس کیمپ کے افراد میں مرد اور عورت کے دوہرے اعضا موجود ہیں ۔
۴ ۔ ٹاکولی	F.۳۱۰X۰	اس کیمپ کے افراد کے دل دائیں طرف ہیں ، جگر ناپید ہے اور خون کی جگہ رگوں میں زرد سا ایک سیال رواں ہے یہ لوگ غصہ کی صفت سے محروم ہیں ۔

" رابٹ " نے یہ بھی لکھا ہے کہ عمل تقلیم سے انسانوں میں بعض حیوانات کے حواس جمع کرنے کی کوشش ہو رہی ہے ۔ قد کی کمی بیشی ، جلد کے نئے رنگین ڈیزائن بنانے انگلیوں کی تعداد کو گھٹانے بڑھانے اور مختلف اعضا کو چھوٹا بڑا کرنے کے تجربات بہت کامیاب رہے ہیں ۔

۲۴ ر ستمبر :-

" لائٹ " نے آج کے ایڈیشن میں بتایا ہے کہ کالیرا کے بین الاقوامی کارخانے نے اس سال کے عرصہ میں ۳ ۷ ۵ ... ۴ ۵ ۹ ڈالر کے انسانی بیج اور بیضے غیر ممالک سے خریدے ہیں اور اس کے مقابل میں ۳۱۱۰۴۶۹۰۸۶۱ ڈالر کے انسان غیر ممالک کو بھیجے ہیں مختلف ممالک کی خریداری کا تناسب یہ ہے :-

حبش	۱۰ فیصدی	عرب	۳۱ فیصدی
ہندوستان	۴۷ "	چین	۹ "
فلسطین	۲ "	افغانستان	۱ "

مغرب کے باقی حصص میں برطانیہ غالب ہے لیکن اب جاپان کامیاب ہو رہا ہے۔ مختلف انسان ساز ممالک میں قیمتوں کا تناسب حسب ذیل ہے:

امریکہ	۵۷	باقی ممالک میں ابھی (بین الاقوامی) کاروبار شروع نہیں ہوا۔
برطانیہ	۴۰	
جاپان	۱۲	

جاپان پر برطانیہ اور امریکہ کی نوآبادیات میں سو فیصدی کسٹم ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ پھر بھی اس کے انسان سستے بکتے ہیں۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ جاپانی انسان خوشنما رنگوں کے اچھے ڈیزائنوں والی چمڑی سے مزین ہونے کے باوجود سب سے کم عمر ہوتا ہے۔ مختلف ممالک کے انسانوں کی اوسط عمر یہ ہے:-

امریکہ	۳۴ سال	برطانیہ	۳۲½ سال
جاپان	۲۵ "		

امریکن پیداوار کے دانت عموماً جلد گرتے ہیں۔ برطانیہ والوں کا دل ذرا سے صدمہ سے فیل ہو جاتا ہے اور جاپانیوں کے اعضا بہت جلدی ٹوٹتے ہیں۔ بینائی جواب دے جاتی ہے اور کمر ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔

۱ر اکتوبر

مشینی نانا کی ایک دوکان کا سائن بورڈ یہاں نقل کیا جاتا ہے

> نہایت درجہ ترقی یافتہ آلات، نازک اور نرم بجلی سے ان میں معتدل حرارت اور حسب منشاد باؤ پیدا کیا جا سکتا ہے۔
>
> آپ کی فطری ضرورت کے لئے
>
> (نوٹ) انڈے بچے اور مادۂ تولید اچھے نرخوں پر خریدے جاتے ہیں۔
>
> —— کیراب اینڈ کمپنی

ہاں یہ یاد رہے کہ موجودہ دور میں عورت اور مرد کا اختلاط قانونی جرم ہے کیونکہ اس طرح بچے پیدا کرنا سخت خطرناک ہر عورت کی صحت کے لئے اور خود بچے کی شرافت نفس کے لئے نیز اس تعلق سے انسان حیوان کی سطح پر گر جاتا ہے۔ امراض خبیثہ پھیل نکلتی ہیں اور مادۂ تولید کا کثیر حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لئے اکثر سرمایہ دار لوگ تو ضرورت کے آلات خود خرید لیتے ہیں لیکن عوام دوکانوں سے اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں جو عموماً ہوٹلوں، قہوہ خانوں اور حماموں کی دوکان کا ضمیمہ ہوتی ہے۔

۲ر اکتوبر:-

آج لیراکے کارخانے کو دیکھنے کی حسرت بھی پوری ہوئی۔ اس کارخانہ سے اندرون ملک کی ہر طرح کی مانگیں پوری کی جاتی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ یہاں مختلف جانوروں کے جرثومۂ نسلی پر انسانی جرثومہ کے قلم لگانے میں کامیابی حاصل کی جا رہی ہے۔ چند خاص جوڑ یہ ہیں:-

۱۔ بندر + انسان - ۲۔ گدھا + انسان - ۳۔ کوا + انسان

پہلی قسم ریلوے، محکمۂ تار، محکمہ برق اور سرکس وغیرہ کے لئے دوسری قسم گھریلو ملازمتوں اور کارخانوں کی خدمات کے لئے، اور تیسری قسم مقرر، گوئیے اور جھاڑی فروش بنانے کے لئے تیار کی جا رہی ہے۔

یہاں پرورش اور تغذیہ کا سلسلہ جدید تحقیقاتوں کی بنیاد پر چلتا ہے اور بے شمار قسموں کے انسان تیار ہو رہے ہیں۔ تنوع جتنا اس کارخانہ نے پیدا کیا اتنا کسی اور سے نہیں ہو سکا۔

آج بیچارہ منیجر بہت پریشان تھا۔ کیونکہ تعلیم گاہ سے ۲۱ نفر رات کو کہیں بھاگ گئے ہیں۔ اتفاق سے کمرہ رات کو کھلا رہ گیا اور چوکیدار سو گئے۔ اب تلاش ہو رہی ہے۔ ملے ملے نہ ملے تو ان کا بیمہ تو کارخانے نے کرا ہی رکھا ہے۔ قیمت مل جائے گی —— خیر پریشانی کے باوجود منیجر نے کمال مہربانی سے خود ساتھ ہو کر کارخانہ کی سیر کرائی۔

خاص حصہ وہ ہے جہاں عجیب نوعیت کے جاندار تعلیم پا رہے ہیں۔ ان میں وہ بھی تھے جن کی آنکھیں گدی پر لگی تھیں۔ وہ بھی تھے جو چار ٹانگیں رکھتے تھے، وہ بھی تھے جن کے بازو معمولی انسانوں سے

تھے۔ وہ بھی تھے جن کا قد عام انسانوں سے سوایا تھا، کچھ دُمدار ے مینیجر نے بتایا کہ اس نوعیت کے جانوروں کی قیمت کچھ زیادہ پاتی ہے کیونکہ کچھ ایسے ہیں جو معمولی انسانوں سے زیادہ مفید خدمات ے سکتے ہیں۔ بقیہ کو تھیٹریکل کمپنیاں اور سرکس والے خرید لیتے

واپسی پر مینیجر صاحب کی میز پر خطوط کا فائل جو دیکھا تو بہت پایا بعض کے اقتباس ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

۱۔ افسوس سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ آپ کے بھیجے ہوئے مزدوروں کے پورے گروپ نے یک آہنگی کے ساتھ ہڑتال کر دی ہے اب ہمارا کام رُکا پڑا ہے پندرہ روز سے کام کی رفتار آدھی ہو گئی ہے حالانکہ موقت آرڈر ہم نے لے رکھے ہیں۔ آپ ہمارے آرڈر فارم نمبر ۱، ۲۴۴ کو دیکھئے اس میں ہم نے لکھا تھا کہ جو کارندے آپ سپلائی کریں وہ آپس میں تعاون پیدا کرنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔ اب مہربانی کر کے یہ گروپ واپس کر لیجئے اور کوئی نیا گروپ بھیجئے ورنہ ہم عدالت سے چارہ جوئی کرنے پر مجبور ہوں گے۔

۲۔ ہمیں ایک ایسا ایڈیٹر درکار ہے جو فن مزاح نویسی کا ماہر ہو۔ اس کا کل وزن ۲۵ سیر ہونا چاہیئے اور اس کی جلد پر زیبرے کی سی دھاریاں ہوں۔

۳۔ ٹائپ کرنے کے لئے کوئی ایسی عورت چاہیئے جس کی انگلیاں بہت نازک ہوں اگر بیس انگلیوں والی کوئی عورت ہو تو خوب رہے۔ قیمت کا اندازہ لکھ بھیجئے۔

۴۔ ہمیں اپنے کارخانہ شیشہ سازی کے لئے بیس مزدور درکار ہیں حسب ذیل خصوصیات ان میں ہونی چاہئیں

۱۔ معدے چھوٹے ہوں اور بھوک کم لگتی ہو۔
۲۔ احساس کو کیمیاوی طریقہ سے کند کر دیا گیا ہو۔
۳۔ اگر گدھے کے جرثومہ پر انسانی جرثومہ کا قلم لگا کر نسل حاصل کی گئی ہو تو ترجیح دی جائے گی۔

۵۔ کل بذریعہ ریل آپ کا بھیجا ہوا کارندہ واپس کر دیا جائے گا اس کی ساخت میں کوئی عجیب کوتاہی رہ گئی ہے۔ جب کبھی لال رنگ کو دیکھتا ہے تو ہنسنے لگتا ہے اور سب کام چھوڑ دیتا ہے۔ ویسے نہایت شریف آدمی ہے آپ کو کوئی نہ کوئی گاہک مل جائے گا ہمیں دوسرا بھیج دیجئے۔ خیال رہے کہ ہمارا مینیجر ایسے آدمی کو پسند کرتا ہے جس کی ناک لٹکی ہوئی ہو۔

۶۔ محکمۂ پولیس کے آرڈر ۲۱۳/۴۴ (A A A) کے ماتحت بہت سے سپاہی بھرتی کرنے مطلوب ہیں ان میں حسب ذیل خصوصیات ہونی چاہییں۔

۱۔ چھاتی	۵۰ انچ
۲۔ قد	۷ فٹ
۳۔ ٹانگوں کی لمبائی	۴ فٹ
۴۔ بازوؤں کی لمبائی	۴ فٹ
۵۔ دماغ	نہایت معمولی درجہ کا

۶۔ آپریشن سے ان کے سینوں میں شکاری کتوں کے دل فٹ کئے گئے ہوں۔

ٹنڈر ۱۵ اکتوبر کو لازماً سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر میں پہنچ جانے چاہئیں۔

۷۔ کیا ہمارے ریڈیو اسٹیشن کو آئندہ دس دن میں آپ ایک ایسا آدمی سپلائی کر سکیں گے جو جرمن زبان جانتا ہو اور خرگوش کی سی قوت سماعت رکھتا ہو قیمت سے اطلاع دیجئے۔

۸۔ کارخانے کے مال کی مفصل فہرست اور ایجنسی کے شرائط سے اطلاع دیجئے۔

۹۔ آپ کے فرم نے گمشدہ گروپ کا جو اشتہار ستمبر میں دیا تھا اس کی اجرت میں سے ۸۰ ڈالر آپ کے ذمہ ہیں کب تک نوازش کیجئے گا۔

۳ر اکتوبر:۔

کیا خوب لڑائی تھی۔ سر بازار دو نوجوانوں کی جھڑپ ہوگئی۔ ایک کہتا تھا کہ تجھے معلوم ہے میں "برٹش میڈ" ہوں اور دوسرا آنکھیں دکھا رہا تھا۔ گاؤدی میں ہوں "اٹالین میڈ" میری ماں امتحانی نلی تھی جس میں لامثال انسانوں نے پرورش پائی ہے۔ بھلا بولا تجھے خبر ہے کہ میرا مادہ تولید جرمنی سے آیا تھا۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے انھیں الگ کیا۔

۶ر اکتوبر:۔

ڈیٹل کا ایک اشتہار نقل کرتا ہوں جو آج ہی کے پرچہ میں نکلا ہے:۔

> ہر کام کے لئے بہتر کارندے
> ڈی
> مضبوط، کم خور،
> پائدار اور پھر سستے حسب منشا حاصل کرنے کے لئے ڈیٹل کو یاد رکھیے۔ اور لیتے وقت پشت پر ڈیٹل کا نشان ضرور دیکھ لیجئے۔

لیجئے لیرا کا اشتہار بھی ہے اور خوب ہے

> حیوانی اور انسانی خوبیوں کو جمع کرنے کی سائنس کو لیرا نے اوج کمال پر پہنچا دیا ہے
> تیئسویں صدی کی عجیب و غریب مخلوقات!
> لیرا بہم پہنچا رہا ہے۔

۱۴ر اکتوبر:۔

عدالت میں آج صنفی مقدمہ بڑی مدت کے بعد پیش ہوا! مدعیہ کہتی تھی کہ ملزم نے مجھ پر جبر کیا ہے اور میری مرضی کے خلاف مجھے حمل قرار پاگیا ہے مرد نے اقبال جرم کر لیا کہ میں تنہائی میں اس پر نظر ڈالتے ہی بے بس ہوگیا۔ اس پر ہر طرف سے شیم شیم کی آوازیں بلند ہوئیں اور اس جوڑے کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ ظالموں نے تہذیب کی ناک کاٹ ڈالی عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ عورت فوراً سرکاری ہسپتال میں جا کر اپنا حمل ساقط کرائے اور بطور جرمانہ اپنے اسی بیضے حکومت کے حوالے کردے۔ اس جرم میں کہ اس نے اپنی حفاظت میں کوتاہی کی۔ مرد کو پانچ سال قید کی سزا دی جاتی ہے۔

۱۵ر نومبر:۔

لیجئے ہولناک خبر۔ ہندوستان میں خفیہ کارخانۂ پیدائش پکڑا گیا ڈیموکریٹک پارٹی خلاف قانون قرار دی گئی۔ خبر کا پس منظر یہ ہے کہ ایک سو سال پیشتر ہندوستان نے برطانیہ کو تولید کا مادہ بھیجنا شروع کیا اور اس مادۂ تولید سے انسان تیار کروا کر ان کی خریداری شروع کی۔ ۵۰ سال بعد ہندوستانیوں کو معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا ہے انھیں جو انسان دیئے گئے ہیں ان کی ساخت میں نہ معلوم کس حکمت سے کام لیا گیا کہ ایک تو وہ بیماری کو جلد قبول کرتے ہیں دوسرے .... ان کے دماغ تو کام کرتے ہیں لیکن دل گیدڑوں کے ہیں باتیں بہت بناتے ہیں اور کرتے کچھ نہیں آپس میں لڑتے جھگڑتے بہت ہیں اور کسی نقطہ پر متفق نہیں ہو سکتے۔ نیز دشمن کے لئے وفادار ثابت ہوتے ہیں اور اپنوں کے لئے ناقابلِ اعتماد۔

جب اس دھوکے کا حال کھلا تو لوگوں نے برطانیہ سے معاملہ بند کرنے کا الٹی میٹم دیدیا۔ اس پر برطانیہ نے دھاوا بول دیا۔ ہندوستان کو شکست ہوئی اور اسے بہ جبر "بردی نسل" خریدنے پر مجبور کر دیا گیا۔ بلکہ برطانیہ کے کارخانوں سے جو ناقص الاعضا مال نکلتا تھا وہ بھی منہ مانگے داموں ہندوستان کے سر منڈھا جانے لگا اور یہاں حیوانی طریق پیدائش کو روکنے کے علاوہ پرائیویٹ کارخانہ ہائے پیدائش کا اجرا بھی ہمیشہ کے لئے قانوناً روک دیا گیا لیکن ڈیموکریٹک پارٹی نے ہمالیہ کے غاروں میں کہیں ایک خفیہ کارخانہ پیدائش قائم کر دیا ان لوگوں نے مشینیں غیر قانونی طریقے سے روس سے درآمد کرلیں مشینیں ہی نہیں بلکہ حیوانی ذہنیت کے مردوں اور عورتوں کو جمع کرکے پرانے جاہلی طریقے سے بھی پیدائش کا سلسلہ شروع کر دیا۔

پچھلے اگست میں اچانک سیاحوں کی ایک پارٹی اس طرف جا نکلی۔ انھوں نے کہیں جنگل میں کچھ مشتبہ آدمیوں کو دیکھ پایا۔ اور

والیں آکر پولیس کو اطلاع کردی۔ حکومت فوج لیکر موقع پر پہنچی۔ کارخانہ
اور تربیت گاہ پر دھاوا بول دیا گیا۔ یہ مخلوق قانون کی رو سے
ناجائز قرار دی گئی۔ اس کے حقوق پر برٹش پارلیمنٹ میں بحث ہو
رہی ہے اور کارخانہ چلانے والوں کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے

۱۶ نومبر۔۔۔

"بیسویں صدی کا ادب" کیسا تحقیقی مضمون ہے مقالہ نگار
نے بیشمار اقتباسات جمع کئے ہیں اور ادب کے ارتقائی وضاحت
کی ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

"ابتدائی دور میں شاعری و افسانہ کا مرکز و محور
صنفی جذبہ تھا اور ہر شخص کے اعصاب پر عورت
سوار تھی اس دور کے ماحول میں یہی ہونا چاہیئے
تھا اب کہ ہماری تہذیب اس دور کو پیچھے چھوڑ
آئی ہے ہمارا ادب عین فطری راستہ پر پڑ گیا ہے
اور اس میں حسن و عشق کے افسانوں کا سراغ
نہیں ملتا۔"

موجودہ ادب کی تشکیل میں "مشینی پیدائش" نے بہت بڑھ
چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اب ادیبوں کی تمام فکری قوتوں کا مرکز
عورت کے بجائے مشین ہے کیا خوب کہا ہے لیلا رسے نے:۔

اس مشینی دور میں
آدمی کے فکر نے
لی ہے کروٹ اس طرح شرما گئے ہیں زلزلے
ہیں دلوں میں موجزن
کچھ مشینی سے نرالے ولولے۔

پروفیسر گامل نے "امتحانی نلی کی کہانی" لکھتے ہوئے کتنا
پاکیزہ فلسفہ پیش کیا ہے۔ وہ دکھاتا ہے کہ کس طرح افریقہ کی ایک
عورت سے عشق جیسا مکروہ ربط پیدا کیا جاتا ہے۔ بھلے انسان اپنے
آپ کو دھوکا دینے کے لئے اس ربط کو بڑی حسین نقاب پہناتا ہے
پھر عورت کے ہاں اس ربط کے نتیجے میں بچہ پیدا ہوتا ہی یہاں
پہنچ کر وہ لکھتا ہے۔۔

"بھائی اس عورت کی جسمانی تکلیف کا
خیال کرو جو اس نے پورے ایک سال برداشت
کی ہے اور دو سال مزید برداشت کرے گی۔ یہ
ماں ہے۔ اسے ماں بننے کا جنون ہے کیونکہ ماں
کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ ہاں اے
ماں آ اور ہمارے کارخانے میں شیشے کی ماؤں
کا بے پناہ ذخیرہ دیکھ۔ ان سب کے قدموں کے
نیچے جنتیں آباد ہیں لیکن یہ مائیں انسان کو گندے
طریقے سے جن کر ہمیشہ کے لئے ذلیل نہیں کر دیتیں"
خواب نامی کہانی میں جو ڈیکے یوں اپنے نتائج افکار پیش
کرتی ہے:۔

"میں نے خواب دیکھا کہ میرے یہاں بچہ پیدا
ہوا ہے۔ میرا رواں رواں قانون کے خوف سے
نہیں بلکہ انسانیت کی نفرین سے لرز گیا۔ کیا پھر
وہی ماں اور باپ کا چکر چلے گا جس نے عورت کو
مرد کا اور مرد کو عورت کا محکوم بنائے رکھا ہے؟ کیا
سوسائٹی کی وحدت پھر خاندانوں میں تقسیم ہو جائے گی!
کیا پھر نسلی تفاخر کا دیو سر اٹھائے گا؟ کیا پھر قدیم ژولیدہ
دماغ انسان اس سرزمین پر قبضہ جمالے گا؟ اور پھر
میرے پیٹ سے؟ کیا میں تخلیقی مرتبان ہوں؟ نہیں
میں اپنے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے کا گلا
گھونٹ دوں گی۔ یہ کہتے ہی میرے ہاتھ بچہ کی طرف
بڑھے۔ بچے کی گردن کو میں نے دبوچ لیا چھوٹی چھوٹی
خوں خوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک نومولود جسم میں
چند بے قاعدہ سی جنبشیں نمودار ہوئیں اور ڈراپ سین
ہو گیا ۔۔۔ میں اب کتنی قابل فخر ہستی تھی میں نے
ایک کارنامہ سر انجام دیا تھا۔ ایک لاثانی کارنامہ میں
نے ثابت کر دیا تھا کہ میں عہد قدیم کی "ماں" نہیں ہوں
بلکہ عورت ہوں۔ کتنا بھیانک خواب تھا۔ مگر اپنے

انجام کی وجہ سے کتنا دلچسپ ہے۔ میں تنہائی میں تصور کی گرفت سے بارہا اس خواب کو لوٹا چکی ہوں"۔

گیلرا مشہور مشینی ادیب لکھتا ہے :۔

"تہذیب ماتم کرتی ہے ان لڑائیوں کا جو قرون مظلمہ میں خدا کے نام پر لڑی گئی ہیں۔ خدا، پیدائش کے سلسلہ کو چلانے والا ——— کہاں ہے وہ آج؟ ——— بس اس کی بساط اتنی ہی تھی کہ اسے انسان نے معزول کر کے دکھا دیا۔ خدا کا پجاری پیدائش کے سلسلے کو خدا کی ہستی کا سب سے بڑا مظہر سمجھتا تھا اور یہ آج صرف انسان کی ہستی کا مظہر ہے۔ آج تمام ترقی یافتہ ممالک میں بے شمار خدا ہیں جنہوں نے پیدائش کے کارخانے کھول رکھے ہیں لیکن ان کے لئے کوئی عبادت گاہ نہیں بنائی جاتی اور یہ کوئی مذہب ایجاد نہیں کرتے"

قاغی جس کی شاعری کا ڈنکا دنیا میں بج رہا ہے، جدید شاعری کا محسن ہے اس کا شاہکار درج ذیل ہے

مشینی دور کی اولاد ہیں ہم ——— نسب کی قید سے آزاد ہیں ہم
ہیں اپنی فطرت کہنہ کے باغی ——— خود اپنی فکر کی ایجاد ہیں ہم

اس ادب کے پیٹ میں ایک باغیانہ ادب پرورش پا رہا ہے اور یہ نتیجہ ہے ان فکری جراثیم کی درآمد کا جو ہزار بندشوں کے باوجود جرمنی کے دقیانوسی خطے سے چلے آرہے ہیں۔ ان باغی ادیبوں کا خیال یہ ہے کہ کیمیائی تناسل سے پیدا ہونے والے انسانوں کے بل پر ملک کسی بڑی چوٹ کو نہیں سہہ سکتا۔

۱۷ر نومبر :۔

نہیں معلوم کیا ہونے والا ہے۔ مجھ غریب سیاح کے لئے سخت پریشانی کے اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔ ہمارے امریکہ کا جرمن سفیر واپس بلا لیا گیا ہے اور حکومت جرمنی کی طرف سے ایک مراسلہ حکومت امریکہ کو موصول ہوا ہے جس میں حکومت امریکہ پر دو الزامات عائد کئے گئے ہیں :۔

(ل) حکومت امریکہ نے اپنی شرح پیدائش شرح اموات کے مقابلہ میں پچیس سال سے خفیہ طور پر دوگنا کر دی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ امریکہ کو ان سالوں میں اپنی درآمد مسلسل بڑھانی پڑی ہے

(ب) یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امریکہ بعض فوجی دستے ایسے تیار کر رہا ہے جن کے ہر سپاہی کے بدن میں چیتوں اور بھیڑیوں کے دل، جگر اور گردے فٹ کئے جاتے ہیں۔ ان حرکات کے متعلق گورنمنٹ برلن کی رائے یہ ہے کہ یہ خاموش سا اعلان جنگ ہے ہمارے خلاف اور ہم اس کا معقول جواب جلد از جلد دینا چاہتے ہیں۔

۲۳ر نومبر :۔

لیجئے جرمن سفیر واپس آگیا۔ حکومت امریکہ نے شرح پیدائش کی تجدید جرمنی کے منشا کے مطابق کر دی ہے

۲۲ر جنوری :۔

مختلف صوبوں میں دبا دبا سا قحط رونما ہے۔

۲۸ر جنوری :۔

خودکشی اور ڈاکہ زنی کی وارداتوں کا جو سالانہ نقشہ اعداد و شمار چھپا ہے اس نے ملک بھر میں اضطراب کی ایک لہر دوڑا دی ہے۔

۳۱ر جنوری :۔

آج پارلیمنٹ میں اس سوال پر بحث ہوئی کہ بھوک کیوں پھیل رہی ہے۔ وزیر اعظم پر سوالات کی بوچھار ہوتی رہی۔ خلاصہ بحث یہ ہے۔

سوال ——— درآمد بدستور ہے۔ زرعی پیداوار کم نہیں ہوئی۔ پھر بھوک کیوں ہے؟"

وزیر اعظم ——— حکومت اس بات پر غور کر رہی ہے

سوال ——— ملک کی موجودہ آبادی کتنی ہے

وزیر اعظم ——— نئی مردم شماری دو سال بعد ہوگی۔

سوال ——— ملک کی شرح اموات کیا ہے؟

وزیر اعظم ——— ۳۴ فی ہزار

سوال ——— اور شرح پیدائش؟

وزیر اعظم ـــــ ۳۵،۵ فی ہزار

سوال ـــــ کیا آپ مختلف کارخانوں کی پیداوار کا یست سالہ گراف ہاؤس کے سامنے پیش کرسکتے ہیں

وزیر اعظم ـــــ ایسا کرنا مفاد عامہ کے منافی ہے

سوال ـــــ یعنی؟

وزیر اعظم ـــــ یعنی اس کا جواب دینے کے لئے ضروری معلومات موجود نہیں ہیں۔

آخر اس سلسلہ میں ہاؤس کے زائد از نصف ارکان نے واک آؤٹ کردیا۔

۲۹ راپریل :-

قحط کی شکایت امریکہ ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک کا یہی حال ہے۔ ہر ملک کی شرح برآمد گر رہی ہے اور شرح درآمد چڑھ رہی ہے۔ نوآبادیات کا حال پتلا ہو رہا ہے یہ راز کیا ہے؟ اخبارات کی رائے یہی ہے کہ مختلف ...... ممالک میں شرح پیدائش کو بڑھانے کے لئے خفیہ طور پر جو غیر محسوس مسابقت ہوتی رہی ہے اس نے گل کھلانے شروع کئے ہیں۔

۲۹ رجون :-

لیجئے جناب، جرمنی نے امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر ہی دیا۔ ریڈیو بتا رہا ہے، الزام یہ ہے کہ امریکہ نے اپنی نوآبادیات کا خون زرعی اجناس کی صورت میں نچوڑنے کا جو ذلیل اقدام شروع کر رکھا ہے اب اسے زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا جا سکتا اس سامان خورد و نوش سے وہ درندہ صفت سپاہی پالے جا رہے ہیں۔ جن کے رحم و کرم پر امن عالم کا انحصار ہوگا اور حال یہ ہے کہ جدید سائنٹفک طریق پیدائش و تربیت اور عمل جراحی سے ان میں رحم و کرم کی صفت رہنے ہی نہیں دی گئی۔

۳۰ رجون :-

آج پہلی بمباری سے نیویارک کی تواضع کی گئی۔ جہاؤنی اور ہوائی اڈے پر چند بم گرے۔ پیدائش کا ایک کارخانہ بالکل تباہ ہوگیا۔

۴ رجولائی :-

امریکہ کے ہائی کمانڈ کو سخت مشکلات کا سامنا ہے آ مختلف شعبے احکام کی شیلنی سا اتباع تو کر لیتے ہیں لیکن ان میں کی کارفرمائی بالکل برائے نام ہے اس وجہ سے جرمنی کا د رہا ہے۔

۲۶ رجولائی :-

ادارۂ تحقیقات تناسلی کے ہال میں آج ایک جرمن کی تقریر جو حیوانی طریقہ سے پیدا ہوا تھا۔ یہ پندرہ سال قبل یہاں آیا تھا امریکہ کا باشندہ ہونے کے حقوق حاصل تھے۔ تقریر میں بتایا گیا شخص نے انسان کی آلاتی پیدائش کا طریقہ ایجاد کیا اس نے بڑا ظلم کیا ہے۔ کارخانوں میں پیدا ہونے اور مشینوں میں پلنے بچے میں وہ جذبات کیسے پیدا ہو سکتے ہیں جو فطری طریقہ سے پیدا والے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ ماں کی گود اور خاندان کا گہوارہ کے دل میں ماضی کی روایات کا خزانہ بھر دیتا ہے۔ یہ کام مشینوں کے بس کا نہیں۔ امریکہ کے سپاہی کے جذبات کو نہ وطن کا نام ا ہے نہ نسل کا نہ ماضی کی تاریخ اسے سرگرم عمل کر سکتی ہے۔ نہ مستقبل فکر تعمیر ابھار ان میں پیدائشی نقائص کی اتنی کثرت ہے کہ امریکہ بل پر جرمنی کی چوٹ نہ سہہ سکے گا۔ اب ایک ہی راستہ ہے جس اور یہ راستہ میں امریکہ کو اس لئے بتا رہا ہوں ... کہ میں اس کی میں پندرہ سال تک امن کا سانس لیتا رہا ہوں۔ اسی حق کو ادا کر کے لئے میں یہ مشورہ پیش کرتا ہوں کہ آسٹریلیا سے مدد طلب کی جا۔ اگر وہ رضامند ہو گیا تو جرمنی کا سیلاب جنگ رک سکتا ہے۔ کیو فطری انسان کا مقابلہ فطری انسان ہی سے ممکن ہے

۳۱ رجولائی :-

امریکہ کے ساحل پر جرمن فوج بلا مزاحمت اتر گئی، امریکہ پیچھے ہٹ گئی۔ معلوم ہوا ہے کہ امریکن سپاہ ہائی کمان کی مرضی خلاف لڑنے پر آمادہ نہیں ہے تقریباً ... ۳ ہزار سپاہی تو جا گر جرمنوں کی قید میں چلے گئے۔

(باقی صفحہ ۳۳ پر دیکھئے)

محمد یعقوب طاہر

ترے گلشن میں رہوں یا ترے ویرانوں میں
زندگی ختم ہوئی انہی دو ارمانوں میں

آہ بھٹکے ہوئے منزل سے مری قوم کے لوگ
ڈھونڈتے ہیں جو بہاروں کو بیابانوں میں

کہیں اللہ کہیں نفس کہیں زر کہیں زن !
دلِ مسلم ہوا تقسیم عجب خانوں میں

گوشے گوشے پہ خزاں چھائی چلی جاتی ہے
باغباں دست و گریباں ہیں گلستانوں میں

تند موجوں کے تھپیڑوں سے تو بیکار نہ چھوڑ
کوئی موتی بھی اُبھر آئے گا طوفانوں میں

نہیں واللہ وہ اک بندۂ مومن کی نگہ
زلزلہ جس سے نہ برپا ہو صنم خانوں میں

یہاں تکفیر کے ساماں وہاں غدّاری کے
آدمیت ہے نہ منبر پہ نہ ایوانوں میں

ایک زہراب ہے رگ رگ پہ حکومت جس کی
ایک تریاق نظر بند ہے جُزدانوں میں

آہ وہ قطرہ کہ جی اُٹھتی ہیں قومیں جس سے
ڈھونڈتا پھرتا ہوں ساقی ترے پیمانوں میں

غمِ انساں نے بنایا مجھے حق بیں طاہر
ورنہ گم تھا گل و بلبل کے میں افسانوں میں

ابو محمد امام الدین رامنگری

تری نگاہِ کرم کا ہوں منتظر کب سے
مری طرف بھی ذرا التفات اے ساقی!

نہ سوز ہے، نہ تپش ہے، نہ روشنی، نہ گ
بجھی بجھی سی ہے شمعِ حیات اے ساق

اس ایک جامِ طرب خیز کی طلب ہے مجھے
غمِ جہاں سے جو دیدے نجات اے ساقی!

جو تیرے ہاتھ سے مل جائے ایک سا
مرے لئے ہے وہ نقدِ حیات اے س

جو روز و شب ہیں مشرف تری حضوری سے
انھیں کا دن ہے، انھیں کی ہے رات اے ساقی!

مری نظر نہیں صہبا و جام د
مری نگاہ میں ہے تیری ذات ا

سرورِ بادہ ہے دل میں، نہ کیف آنکھوں میں
اُجڑ گئی ہے مری کائنات اے ساقی!

اٹھے گا کب کوئی محمود تیرے زند
بجا ہے غلغلۂ سومنات اے س

الیاس فرحت

خلا

جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی سارے گھر پر مکمل خاموشی چھا چکی تھی ـــــــ اسے خیال تھا ابھی ابھی وہ اسکول سے واپسی پر دروازے سے باہر جب تانگے سے اتر رہی تھی سارے گھر میں کھیل مچا ہوا تھا۔ روحی کی چیخنے کی آواز آ رہی تھی اور کوئی فلمی گیت بڑے بے ڈھنگے پن سے گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہا تھا۔ انیسہ، خدیجہ کسی بات پر زور زور سے بحث کر رہی تھیں ـــــــ لیکن اس کے داخل ہوتے ہی سب اک دم خاموش ہو گئے۔ سب کے چہرے یک لخت اتر گئے۔ انیسہ، خدیجہ اٹھ کر باورچی خانہ میں چلی گئیں۔ اختر کا منھ ایک دم بند ہو گیا جیسے کسی نے گلا دبا دیا اور سب سے چھوٹی روحی بھی فق ہو کر کونا ڈھونڈھنے لگی ـــــــ کیوں؟ اس نے سوچا۔ آخر یہ گھر کے تمام لوگ اسے کیا سمجھتے ہیں۔ کیا وہ کوئی آسیب ہو گئی ہے جو...

...... جو بھی اسے دیکھتا ہے خاموش ہو جاتا ہے ـــــــ وہ بہت زیادہ تھک گئی تھی۔ صبح دس بجے سے لیکر چار بجے تک بڑبڑ کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے کتابیں میز پر پھینکیں اور آرام کرسی پر لیٹ گئی۔ آج اس کا دماغ بہت بھاری ہو گیا تھا۔ جیسے کسی نے منوں بوجھ رکھ دیا ہو۔ سر میں بھی ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا۔ اس نے خود ہی ہتھیلیوں سے سر کو دبایا تو اسے ہتھیلیاں جلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سامنے ہی نصف قد کا آئینہ رکھا تھا۔ اس نے خود کو دیکھا اور جھٹ پلٹا دیا۔ وہ پھر نیم دراز ہو گئی ـــــــ آج اس کی طبیعت کچھ عجیب ہو گئی۔ وہ یہ خاموشی نہیں چاہتی تھی۔ آج اس کا ہنگامہ کرنے کو جی چاہ رہا تھا سب مل کر خوب چیخیں، خوب پکاریں۔ ایک دوسرے پر جھپٹیں۔ لوٹ لوٹ جائیں۔ وہ اٹھ کر باہر کی طرف آنے لگی ـــــــ دالان میں کچھ کھسر پھسر چل رہی تھی۔ وہ ہلکے قدموں سے بڑھی ـــــــ انیسہ، خدیجہ کانوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ آہستہ سے گئی اور زور سے "ہاؤ" کہہ کر ڈرا دیا ـــــــ دونوں ڈر تو گئیں لیکن بڑی حیرت اور پریشانی کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔ ـــــــ وہ خواہ مخواہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی ـــــــ لیکن پھر بھی اس کی ہنسی کھوکھلی تھی ـــــــ جیسے کوئی پرانے ڈبے میں پتھر کا ٹکڑا ڈال کر بجا رہا ہو۔ دونوں بہنیں ذرا مسکرا کر خاموش ہو گئیں لیکن ان کی حیرت بدستور تھی۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ بے جان ہنسی ہنس رہی ہے اور اسے اس پر سخت شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ ٹالنے کی خاطر اس نے گڑیا کھیلتی ہوئی روحی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور عجیب عجیب آوازیں نکالنے لگی۔ روحی بھی فق ہو کر اسے گھور رہی تھی ـــــــ آنکھوں میں بلا کا استعجاب تھا جیسے وہ ایک تجزیہ کر رہی ہو ـــــــ اس کا جی روحی کو پٹک دینے کو چاہا لیکن کڑھ کر رہ گئی ـــــــ اسے چھوڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگی ـــــــ ماں باورچی خانے میں روٹی پکاتے پکاتے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ باپ کونے میں بیٹھا موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ لیکن اس کی حیرت بھی شیشوں سے باہر نکل رہی تھی ـــــــ وہ پاؤں پٹکتی ہوئی پھر کمرے میں آ گئی۔ کتابیں اٹھا کر پھینک دیں اور سر کو مٹی سے پیٹنے لگی۔ لوگ اسے بدمزاج، چڑچڑی اور خشک قسم کی عورت کہتے ہیں ـــــــ ابھی ابھی چار گھنٹے قبل جب وہ کلاس سے نکل کر کیاری سے گزر رہی تھی دو لڑکیاں جو اسی کی کلاس کی تھیں اسے دیکھ کر ٹھٹک گئیں ـــــــ اس نے راستہ بدل دیا اور کیاری کے اس جانب سے جانے لگی ـــــــ لڑکیاں سرگوشی کرنے لگیں ـــــــ وہ اپنے متعلق سننا چاہتی تھی ـــــــ وہ وہیں کھڑی رہی۔ ایک لڑکی کہہ رہی تھی "کس قدر خشک لیکچرر ہے۔ میں تو اس کی صورت ہی سے بور ہوتی ہوں۔"

دوسری بھی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔ "کیا وہ پہلے ایسی نہیں تھی؟" دوسری نے تائید کی ــــ "پہلے تو اس طرح لہک لہک کر پڑھاتی تھیں کہ گھنٹہ گذرنے کا پتہ نہیں چلتا تھا ــــ معلوم نہیں اب وہ اس قدر خشک کیوں ہوگئی ہیں ــــ شاید عمر کا تقاضہ؟"

پہلی نے حیرت سے کہا "تو کیا وہ بوڑھی ہو چکی ہیں"۔ "قریب قریب" دوسری کی آواز میں کسی قدر گھبراہٹ تھی۔

"مگر وہ تو کنواری ہیں!"

"تو کیا ہوا ــــ اسی لئے تو خشکی آگئی ہے۔"

"پھر اب"

"اب کیا ــــ"

اور وہ تیزی سے نکل آئی تھی ــــ واقعی اسے چاروں طرف خشکی نظر آرہی تھی۔ وہ خشک تھی۔ کمرہ خشک تھا۔ میز کرسی پلنگ سب خشک تھے۔ آج تک اس کمرے میں کچھ گڑبڑ نہیں ہوئی تھی سب بے جان تھے ــــ وہ بھی بے جان تھی ــــ اس نے آئینہ میں پھر چہرہ دیکھا۔ "خشکی" ــــ آئینہ بول اٹھا اور اس نے جھلا کر پھینک دیا۔ کم بخت آنسو بھی نہیں نکلتے ــــ اس نے رونا چاہا۔ لیکن اُس کے سینے میں بھی خشکی تھی ــــ وہ پھر نیم دراز ہوگئی۔ دھیرے دھیرے اس کا تنفس بڑھ رہا تھا۔

چند دنوں کے بعد گھر میں ایک دم گڑبڑ ہوگئی ــــ مکان کی صفائی۔ لیپائی، پوتائی ــــ دیواروں پر سفیدی سارے کام ہونے لگے ــــ اسے معلوم تھا یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ لیکن اُسے کچھ زیادہ خوشی نہ تھی وہ دل سے خوش ہونا چاہتی تھی لیکن نہیں معلوم اس کا دل کیوں خوش نہیں تھا۔ پھر بھی اُس نے خوشی کا اظہار کرنا ہی بہتر سمجھا اور گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی۔ لیکن جہاں وہ کسی قسم کا مشورہ دیتی سب مرعوب ہو جاتے وہ بار بار سوچتی اُسے احساس بھی ہوتا۔ اب اُس کے الفاظ میں عجیب قسم کی حکومت آگئی ہے۔ تمکنت آگئی ہے۔ گھر کے لوگ اس سے دبتے ہیں۔ ماں باپ بھائی بہن سب اُسے بڑا رتبہ دیتے ہیں۔ کیوں ــــ؟ کیا اسلئے کہ وہ کما رہی ہے۔ گھر والوں کو کھلا رہی ہے۔ کھلانے پلانے کا یہ مقصد تو نہیں کہ وہ حاکم ہوگئی۔ وہ تو اب بھی اپنے والدین کی بیٹی ہے۔ پھر یہ غلط جذبہ گھر والوں میں کیوں پیدا ہوا ــــ؟ باپ کیوں اسکی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ ماں اس کے سامنے کیوں بجھ بجھ جاتی ہے وہ ایک شفیق ماں کی طرح کیوں اسے نصیحتیں نہیں کرتی۔ اسے کیوں نہیں ٹوکتی۔ وہ جہاں چاہے جس سے چاہے کیوں مل سکتی ہے ــــ گھر کے لوگ کیوں اس بارے میں بات نہیں کرتے۔ وہ جھنا گئی ــــ سامنے ہی روحی کھڑی زور زور سے چلا رہی تھی اسے یہ چلانا ناگوار گذرا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے ڈانٹ دیا۔ اسکی آنکھوں میں خود بخود غصّہ کی لکیریں چمک اُٹھیں اور پورے گھر پر پھر خاموشی چھا گئی۔

نینی تال سے مہمان آئے تھے۔ خدیجہ انیسہ کو جھٹ چھپا دیا گیا لیکن اُسے مکمل آزادی تھی وہ روز کی طرح برابر چل پھر رہی تھی کسی نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ جیسے وہ لڑکی نہیں لڑکا تھی۔

دو تین ہفتوں میں ہی گھر میں باجے بجنے لگے۔ گھر میں کافی چہل پہل شروع ہوگئی۔ دُور دُور سے مہمان آگئے تھے اور اتنے لوگوں میں کسی کو بھی فرصت نہیں تھی ــــ اُسے تو کچھ کام ہی نہیں تھا۔ اسی لئے اُس نے اسکول سے رخصت بھی نہیں لی تھی ــــ گھر کے تمام افراد مصروف تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب کیا کام کر رہے ہیں سوائے اس کے اسے اور کچھ نظر نہیں آیا کہ سب اِدھر سے اُدھر جا رہے ہیں ــــ وہ کمرے میں آگئی باہر ہنگامے جاری تھے۔ عورتیں زور زور سے آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ مرد دنادن ہاتھی کے قدموں کی طرح چل پھر رہے تھے ــــ بچے بیکار چلا رہے تھے۔ اُس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ تب بھی آوازیں بند نہیں ہوئیں۔ وہ اُٹھ کر تیزی سے دروازے کے پاس آگئی ایک دم اس کا جی چاہا کہ چلا کر سب کو روک دے لیکن مہمان ــــ؟ وہ خاموش ہوگئی ــــ دروازے کے باہر ہی چند عورتیں بیٹھی پان کھا رہی تھیں۔ سب نے اُسے غور سے دیکھا۔ اُس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔ عورتیں اسکے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔

"کیا یہ دلہن کی بہن ہے؟"

"ہاں بڑی بہن ہے"

"کنواری ہے"

"ابھی شادی نہیں ہوئی؟"

"ارے بڑی ابھی بیٹھی ہے اور چھوٹی کی شادی!"

"ہاں دہی ذرا ٹھیک ہے"

"اس میں کیا خرابی ہے؟"

"ذرا پکی عمر.............!!"

اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اس قدر زور دانتوں کو بھینچ لیا کہ اُس کے ہونٹ پھٹ پڑے اور خون پھوٹ پڑا تر پھر گر پڑی۔ اسے انگ انگ سے خون کے فوارے پھوٹتے ہوئے ں ہوتے لے۔

خدیجہ کو اُس نے دلہن بنایا۔ پھول پہنائے، مہندی لگائی میں افشاں بھری اور آخر میں گلے لگالیا۔ خدیجہ نے ایک بار یں کھول کر دیکھا اور باجی کہہ کر لپٹ گئی۔ خدیجہ کے جسم سے بو پھوٹ رہی تھی۔ گھر میں ہنگامے ہو رہے تھے لیکن اسے اپنا بالکل ویران محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کھنڈر ہو۔ سالہا سال سے اور جس کی دیکھ بھال کوئی نہیں کرتا۔ جس کی مرمت کی کسی کو بھی ہیں۔

خدیجہ نینی تال چلی گئی۔ کئی دن تک گھر میں اُسکے متعلق باتیں رہیں۔ اُس کے شوہر کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ بڑا اچھا لڑکا ی پاور ہاؤس میں انجینیر ہے۔ سات سو روپے ماہوار کماتا ہے ے لوگ سلیقہ والے ہیں۔ خدیجہ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی وغیرہ ولیکن اس نے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی ——— وہ پھر بھی ایک خلاء اُس کی زندگی میں عرصے سے چلا آرہا تھا جو ابھی پر نہیں ہوا تھا۔ اب تک اُس نے کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ اُسے ے زیادہ ماں باپ کا خیال تھا۔ بھائی بہنوں کی تعلیم کا احساس اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ لیکن اُس سے کوئی اُمید نہیں وہ اس طرح لاابالی تھا کہ ہفتوں گھر کی خبر نہیں لیتا تھا۔ اُسے انیسہ کی تعلیم کا احساس تھا وہ اسے گریجویٹ بنانا چاہتی تھی۔ اُسے باپ کا خیال تھا جو بوڑھا ہو چکا تھا۔ جس کے منہ میں وہی لقمے ڈال سکتی تھی۔ اس گھر کی وہی رکھوالی تھی۔ لیکن وہ کب تک اس طرح رہ سکے گی، کب تک؟ ——— وہ یہی سوچتی رہی۔ وہ خلا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب تو اُسے حدیں اتنی بڑی نظر آرہی تھیں کہ پار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی زندگی گھسا ہوا ریکارڈ بن گئی تھی جو کانوں کو قطعی بھلا نہیں لگتا۔ اس کی زندگی میں ٹھہراہٹ آگئی تھی۔ چند دن سے وہ کچھ چاہنے لگی تھی۔ چند عجیب قسم کے احساسات اُس کے خیالوں میں منڈلانے لگے تھے۔ ساکن جھیل میں جیسے خود بخود ایک پتھر گر گیا ہو

صبح کی ڈاک میں ایک خط اُس کے نام بھی تھا۔ اس نے کھول کر پڑھا۔ انصار آرہا تھا۔ انصار ——— اس نے سوچا ——— وہ انصار کو بھی بھول گئی تھی۔ گھر آکر اس نے والدہ سے پوچھا ——— تو معلوم ہوا اور اسے یاد بھی آگیا۔ انصار اس کا دور کا رشتہ دار تھا جو ایک زمانے سے علی گڑھ چلا گیا تھا ——— وہ خط لیکر کمرے میں آگئی وہ تو اسکے بچپن کا ساتھی تھا۔ دونوں مل کر برسات میں کودتے پھرتے اور سارے کپڑے بھگو لیتے تھے۔ محلے بھر کو تنگ کرنا اُن کی عادت تھی اسے خوشی بھی ہوئی اور کچھ کچھ احساس بھی۔ لیکن اُس نے خوش ہونا بہتر سمجھا اور انصار کے آنے کی تاریخ نوٹ بک میں لکھ کر رکھ لی۔

ایک ہفتہ بعد انصار آرہا تھا اور ان دنوں اُس نے کافی تبدیلیاں کر لی تھیں۔ اب وہ دلچسپی سے سنگھار بھی کرتی اور ایک خوبصورت رسٹ واچ بھی خرید لی تھی۔ بالوں کو بھی دھیان سے سنوارتی اور کپڑوں کو روز تبدیل کرنا معمول بنالیا تھا۔ گو ان سب باتوں کو کرتے ہوئے وہ بڑی کوفت اور اُلجھن محسوس کرتی۔ پھر وہ کر رہی تھی چاہے دل سے ہو یا نہ ہو ——— ورنہ اُس کا دل بجھ چکا تھا چنگاری سرد پڑ چکی تھی۔ راکھ کی گرمی بھی اسے حرارت نہیں پہنچا رہی تھی ——— !

انصار آتے ہی سب سے پہلے اُس کے کمرے میں گھسا۔ وہ کمرے میں چھپی بیٹھی تھی۔ نہیں معلوم وہ کیوں شرما رہی تھی۔

"شفو" ——— وہ زور سے چیخا اور اسے ہنستے ہوئے دیکھنے لگا

"شفو" لیکن پھر اس کی آواز بے جان ہونے لگی اور چہرے کی وہ شوخی جیسے آہستہ آہستہ مٹنے لگی۔

انصار نے پھر قہقہہ لگایا ——— "شفو" ———

لیکن اسے یاد آیا ایک بار اس نے بھی ایسا ہی قہقہہ لگایا تھا جس میں سے ڈبے کی آواز آئی تھی ——— وہ گم سم بیٹھی رہی انصار قریب آکر بیٹھ گیا۔ اتنے میں گھر کے سارے لوگ بھی آگئے۔ وہ سب کو جھک جھک کر آداب کرنے لگا۔ سب اس کی بلائیں لینے لگے،

ماں نے ہزاروں دعائیں دیں۔ باپ نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ روحی اچھل اچھل کر تالیاں بجانے لگی ——— اور ——— اور انصار نے جاتے جاتے اسے بھی جھک کر آداب کیا ——— اور اس کا سر جھک گیا لیکن وہ ٹبت بنی رہی!

رات سب نے مل کر کھانا کھایا۔ انصار زور زور سے اپنے واقعات سنا رہا تھا۔ کالج کے واقعات علی گڑھ کے ہنگامے اور نہیں معلوم کیا کیا۔ سب جی کھول کر ہنس رہے تھے لیکن وہ بالکل خاموش تھی جیسے وہ یہاں نہیں ہے۔ کبھی کبھی اس کی اور انصار کی نظریں ٹکرا جاتیں تو انصار نظریں چرا لیتا۔ اس نے غور کیا۔ انصار ساری باتیں انیسہ کو دیکھ کر سنا رہا تھا۔

دوسرے دن اس نے رخصت لے رکھی تھی۔ چپ یونہی اسے کوئی کام نہیں تھا۔ آج صبح اٹھتے اسے یہ خواہش ہوئی تھی ——— ناشتہ کرتے ہی وہ کمرے میں آگئی اور کسی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی۔ انصار ابھی تک سو کر نہیں اٹھا تھا۔ وہ ادھر چھت پر سو رہا تھا وہ یونہی ٹہلتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ انصار بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے۔ اور داڑھی بھی ہلکی ہلکی نکل آئی تھی۔ اسے قریب جاتے ہوئے ڈر محسوس ہوا اور وہ دور ہی سے اسے دیکھتی رہی انصار نے کروٹ بدلی اور وہ تیزی سے نیچے آگئی ——— وہ پسینہ پسینہ ہو گئی تھی ——— خواہ مخواہ اسے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ سامنے ہی انیسہ نئے کپڑے پہن کر بالوں کو سنوار رہی تھی۔ اسکے جسم سے بڑی تیز خوشبو پھوٹ رہی تھی ——— اسے اس خوشبو سے چکر محسوس ہوا اور وہ کمرے میں آکر لیٹ گئی۔

وہ کیا چاہتی ہے۔ اس نے پھر سوچنا چاہا۔ اسے کچھ بھی نہیں آیا۔ اسے ساری چیزیں حماقت محسوس ہونے لگیں۔ گھر بار باپ، انیسہ، روحی جیسے حماقتوں کے پلندے ہیں۔ وہ خود بہت بڑی حماقت ہے ——— حماقت! ——— اس نے سو مسکرا دی۔

انصار نیند میں ڈوبا ہوا نیچے اترا اور سیدھا اس کے کم میں آگیا پھر 'ارے' کہہ کر پلٹنے لگا۔

وہ برداشت نہیں کر سکی ——— اس نے پکار لیا ———
"انصار" ——— مگر وہ ایسے نہیں پکارنا چاہتی
"جی" ——— وہ قریب آگیا۔

"کیا بات ہے؟ تم کو ...... کیا تم ناراض ہو" اس الفاظ میں پھر سختی آگئی۔ اسے اپنی اس عجیب مجبوری پر سچ مچ غصہ آ

"بات یہ ہے ..... باجی ....." وہ کچھ ہچکچانے لگا لیکن ہی اس کی بشاشت لوٹ آئی ——— "اجی آپ سے بھلا کون ناراض ہوگا باجی" ——— ہنس کر وہ بولا ——— "کیا میری شامت آئی ہے"

"پھر کیوں کمرے سے بھاگے جا رہے ہو؟" ——— وہ اس کی بات کو پی کر بولی

"کیا اس کمرے سے؟ ——— واہ بھلا یہاں بیٹھ کر کروں کیا! ادھر ادھر دیکھ کر اس نے پھر کہا "آپ نہ معلوم کیسا کمرہ رکھتی ہیں اپنا کوئی بھی تو دلچسپی کی چیز نہیں!"

وہ چیخ کر جواب دینے ہی والی تھی کہ اسے کچھ خیال آگیا..... پھر بھی بے زاری کے انداز میں اس نے کہا ——— "مجھے یہ نت نئی چیزیں پسند نہیں ہیں"

انصار نے ایک لمحہ اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں طنز کی جھلک تھی ——— پھر وہ مسکرا کر بولا ——— "اور مجھے آؤٹ آف ڈیٹ چیزیں پسند نہیں" ——— اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا

(نئی نسلیں)

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے

بیدل میرٹھی •

زندگی بیقرار ہے اب تک … ہر نفس شعلہ بار ہے اب تک
دیکھے آئینۂ درخشاں میں … رنگ لیل و نہار ہے اب تک
کیا یہ سچ ہے قفس نصیبوں کو … انتظارِ بہار ہے اب تک
دن اٹھا ہے بزم گیتی سے … چاندنی سوگوار ہے اب تک
وقت کی یہ بھی چال ہے یارو … وقت جو سازگار ہے ابتک
عہدِ رفتہ کی چند یادوں سے … زندگی ہمکنار ہے اب تک
ں گلستاں کے باغباں ہم ہیں … جس چمن میں بہار ہے اب تک
لی زلفوں میں کس قدر تھی مہک … سانس بھی مشکبار ہے ابتک
ں فشاں چشمِ آدمیت ہو … زندگی سوگوار ہے اب تک
مکمل ہے داستانِ جنوں … عقل نا پختہ کار ہے ابتک
ت کیا ہے غریب سے ہم … نگہ شہریار ہے اب تک
شم میگوں کی یہ عنایت ہے … یہ جو رنگیں خمار ہے ابتک

دل کے داغوں کے فیض سے بیدل
ہر قدم پہ بہار ہے اب تک

افقر اعظمی •

قطعات

محبت دو دلوں کے ربطِ باہم کا ہی نام انور
نہ ہو یہ شے تو کیسی دوستی کیسی شناسائی
رفیقِ باخلوص و باوفا میں نے بہت ڈھونڈھا
یہ جنسِ بے بہا لیکن کہیں ابتک نہیں پائی

ٹمٹماتی ہوئی شمعوں کو بجھاؤ نہ ابھی
گامزن قافلۂ شوق ہے منزل کے قریب
اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو بچا لو کچھ دیر
ہے کوئی دم میں پہنچنے کو یہ ساحل کے قریب

خونِ گل سے بھر رہے ہیں باغباں اپنے سبو
تابکے جاری رہے گی آہ یہ رسم چمن
رخصتِ پرواز کیا، اذنِ فغاں تک بھی نہیں
ہم کو بھی معلوم ہے یہ آپ کا طرزِ سخن

محمد ارشاد خاں •

شاعر کی محبوبہ کا ایک خط

میرے شاعر!

سلامت رہو۔

تمہارے پانچ منظوم خطوط موصول ہوئے جواب دینے میں اس لئے تاخیر ہوگئی کہ میں پندرہ بیس روز سے اس بات کی متواتر کوشش کرتی رہی کہ کسی طرح سے میں بھی آپ کی طرح اپنے خیالات کا اظہار نظم میں کروں۔ لیکن نہ تو آپ جیسی تشبیہات و استعارات استعمال کر سکی اور نہ آپ جیسی سلاست و روانی پیدا کر سکی۔ آخر بے انتہا مایوس ہو کر اب نثر میں ہی اپنے خیالات کا اظہار کر رہی ہوں۔ اگرچہ آپ نے پچھلے کئی خطوط میں اپنے اس ارادے کا کنایتاً اشارہ فرمایا ہے کہ میں آپ سے تلمذ حاصل کرنے کے بعد بہت بڑی شاعرہ بن سکتی ہوں۔ اور آپ نے کئی مرتبہ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ میری نثر پڑھنے میں بھی نظم کی سی لذت محسوس کرتے ہیں اور شاید آپ نے اس وجہ سے مجھے "شیریں بیاں" جیسے میٹھے لفظ سے مخاطب کیا ہے۔

لیکن میرے شاعر! میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب میری طبیعت کا رجحان شعر کہنے کی طرف راغب ہی نہیں ہے تو میں شعر کیسے کہہ سکتی ہوں؟ میں نے جہاں تک مطالعہ کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ شعر میں اس شخص کو قدم رکھنا چاہیئے جو موزوں طبع ہو۔ اگر تلمذ حاصل کرنے سے ہی کوئی شاعر بن جاتا تو نظامی اپنے ساجزادے کو ہرگز یہ نصیحت نہ کرتے کہ۔

ـــ درشعر مجو بلند نامی — کایں ختم شد بر نظامی

لیکن میں نہیں سمجھ سکتی کہ آپ جیسے تعلیم یافتہ حضرات بھی شعر کی نفسیات سے ناواقف ہیں۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ مجھے "شاعرہ" بنانے کی دعوت دے رہے ہیں دوسرے یہ کہ آپ اپنی ہر نظم اور غزل میں میرے حسن کی تعریف میں تنی مبالغہ آمیزی فرماتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مجھے بیوقوف بنا رہے ہوں کبھی میری صورت کو حور سے تشبیہ دیجاتی ہے کبھی پری سے اور کبھی چاند سورج اور گل لالہ سے۔ کبھی میرے بالوں کو سنبل، مشک اور عنبر کی طرح بیان کیا جاتا ہے اور کبھی ظلمات دام اور زنجیر سے اور اگر کہیں زلف کی درازی بیان کرنے کے "موڈ" میں آ گئے تو اسے عمرِ خضر سے بھی زیادہ لمبا کر دیا۔ اور اگر کمر کی نزاکت بیان کرنے بیٹھے تو اسے بال سے بھی باریک بیان کر دیا۔ کیا اس صریحاً جھوٹ بولنے کا نام ہی شاعری ہے؟ اور کیا اب شاعری صرف عشق فرمانے ہی کے لئے رہ گئی ہے۔ آپ نے جتنی بھی غزلیں مجھے بھیجی ہیں ان میں ایک غزل بھی ایسی نہیں جس میں اظہارِ عشق نہ فرمایا گیا ہو کسی غزل میں اپنے دیوانہ ہونے کا اعلان ظاہر کیا گیا ہے اور کسی میں جدائی کے غم سے سوکھ سوکھ کر مر جانے کے خطرے سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اگر کبھی مجھے خط بھیجنے میں دیر ہو گئی تو آپ نے اپنی غزل میں مجھے بیوفا، بیرحم، ظالم اور جلّاد قرار دیدیا۔ اگر آپ کے دل میں ذرا بھی خدا کا خوف ہو تو سچ سچ بتا دیجئے کہ میرا خط دیر میں بھیجنا کیا مجھے ظالم اور بیرحم ٹھہرا سکتا ہے؟ جی ہاں آپ تو کہہ دیجئے "بالکل" ـــ لیکن حضور آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں آپ کی طرح ہر وقت اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے نوٹ بک اور پنسل لئے نہیں بیٹھی رہتی ہوں۔ مجھے دن بھر گھر میں کھانا پکانا پڑتا ہے کپڑے دھونے پڑتے ہیں۔ گھر کی صفائی کرنا ہوتی ہے اور اس کے بعد اگر کبھی فرصت ملتی ہے تو کچھ رسائل و کتب کا مطالعہ کرتی ہوں آپ کی طرح نہیں کہ شیروانی کے پانچ بٹنوں میں سے چار ندارد۔ کالر گرد و میل سے اس قدر کالا ہو چکا ہے کہ کلوا تیلی کی ہنڈی بھی اس سے کچھ زیادہ ہی صاف ہوگی۔ پان کھا کھا کر دانتوں پر زرد پیڑی جمالی ہے، نہ کھانے کی فکر نہ کمانے کی بس شام ہوئی اور ... سنبھالی اپنی نوٹ بک اور چلدیئے ادھر ادھر سے دو تین دوست جمع کئے اور انھیں کسی "ٹی ہاؤس" "ہوٹل" میں لیکر بیٹھ گئے اور شروع کر دیئے اپنے اشعار سنانا۔ بیوی بچے گھر میں فاقہ کر رہے ہیں۔ لیکن حضرتِ شاعر شراب کے سرور میں بیٹھے اپنا کلام سنا رہے ہیں اور زبردستی داد وصول کر رہے ہیں۔ اور اگر کہیں "موڈ" میں آ گئے ذرا

زیادہ پی گئے تو نے آپ کو حافظ، سعدی اور انوری سے بھی افضل سمجھنے لگے۔ مومن اور زندیق کو گالیاں دی جانے لگیں۔

خدارا اپنے ضمیر کو جھنجوڑیئے، آپ کی زندگی کا دوسرا نام شعر نہیں ہونا چاہیے بلکہ جدوجہد ہونا چاہیئے، اور یہ جدوجہد معاشرہ کی اصلاح کے لئے ہو۔ بداخلاقی کو دور کرنے کے لئے ہو۔ انسان میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے لئے ہو۔ اور یہ جدوجہد خواہ شعر کا جامہ پہن کر ہی کیوں نہ کی جائے۔

تمہاری........

(بشکریہ "نمکدان")

بقیہ "کیمیائی تناسل" صفحہ ۲۵ سے آگے :-

۲ اگست :-

حکومت امریکہ نے میری درخواست پر بین الاقوامی قانون کے ماتحت مجھے وطن میں واپس پہنچانے کا انتظام مکمل کردیا ہے

۶ اگست :-

۲۲۵۹ئہ کے امریکہ ! الوداع !!!

۸ اگست :-

۱۹۴۲ئہ میں اپنے زمانہ حال کے وطن میں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے سوکر اٹھا ہوں۔ دماغ سخت تھکا ہوا ہے۔ اب میں ڈاکٹر احتشام کے ہاں جا رہا ہوں تاکہ بروقت کوئی دوا پی لوں۔

محشر رسول نگری •

"جذبۂ جنوں"

(۱)

ترے جہان کے صحرا بھی دشت بھی دیکھے
مرے جنون کو نہ کوئی یہاں سنبھال سکا
نکال دے صفِ زنداں سے اسکو اے ساقی!
مری طرح نہ زمانے کو جو اچھال سکا

(۲)

جنونِ عشق میں صحراؤں سے بھی گزرا تھا
تمہاری نذر کو لالے کے داغ لایا ہوں
یہ زندگی کا سفر کچھ نیا سفر تو نہیں
پرانی رہگذروں کے سراغ لایا ہوں

(۳)

ہو آفتاب حقیقت سے مستنیر نہ کیوں
مہِ تمام کے سینے کا داغ لایا ہوں
سراغِ منزلِ گم گشتہ ڈھونڈ لو اٹھکر
ہوا کی زد میں جلا کر چراغ لایا ہوں

(۴)

پوشیدہ تھا جو مجھ میں وہ انسان مل گیا
اس کفرِ عشق سے مجھے ایمان مل گیا
اُن سے زہے نصیب رہ و رسم ہو گئی
اس زندگی کا اک نیا عنوان مل گیا۔

نورالعین نوید •

نئی سحر ہے نئی شام، دیکھئے کیا ہو
جنونِ عشق کا انجام، دیکھئے کیا ہو
میں چھیڑتا تو ہوں بربط پہ اپنے نغموں کو
سرود و نغمہ ہیں بدنام، دیکھئے کیا ہو
حریمِ حسن میں نظریں جھکی رہیں ابتک
مری نگاہ پہ الزام، دیکھئے کیا ہو
ابھی ہے وقت کہ ساقی لُٹا دے اپنے ایاغ
وہ آ رہے ہیں تہی جام، دیکھئے کیا ہو
چلا ہی سوئے حرم لیکے مجھ کو شوقِ سجود
قدم قدم پہ ہیں اصنام، دیکھئے کیا ہو
نوید پہلی غزل سن کے لوگ کہتے ہیں
یہ ابتدا ہے تو انجام، دیکھئے کیا ہو

ابو الخطیب

جدید اُردو اَدب اور مُسلمان

جدت پسندی یا ترقی پسندی مغربی حکمرانوں کے ساتھ مشرق میں آئی، اور کسی واضح نصب العین کے بجائے صرف رومانی نعروں اور سیاسی طاقت کے سہارے محکوموں کے دل و دماغ پر چھا کر مغربی نوآبادکاروں کے اقتدار کے استحکام کے لئے یہاں ایک مزاج تخلیق کرنے میں مصروف ہوگئی

اس ترقی پسندی نے مغرب کی نشاۃ ثانیہ میں جو کچھ کیا اس وقت ان کارناموں کی تفصیل سے ہمیں بحث نہیں بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ سیاسی اور عقلی روحانیت کسی واضح تصورِ حیات کے بجائے صرف نعروں کے توسط سے مغرب کے مادہ پرستانہ نظریات کو ہماری رگ و پے میں سرایت کرتی رہی تاکہ ہمارا ذہن ہمارے جسم سے جدا ہو کر انکا غلام بن جائے

اس جدت پسندی نے ہمارے ادب میں ایک تحریک کی صورت اختیار کی جس نے مسلمان قوم اس کے نصب العین اور اس کی تہذیبی روایات کے خلاف اُسی قسم کی معرکہ آرائی کا آغاز کیا جیسی کہ وہ مغرب کی کلیسائی قوتوں کے خلاف کر چکی تھی۔

فرنگی اپنے سیاسی استحکام کے بعد ہماری معاشرت اور مزاج کو جس انداز پر دیکھنا چاہتا تھا، ہمارے بعض فنکاروں نے (نوکر شاہی کے بعد) اس فریضہ کو بڑی تن دہی سے انجام دیا، حالانکہ مسلمان من حیث القوم اس جبر کے خلاف صف آرا تھے لیکن ہمارے جدت پسند فنکاروں نے ساری قومی ضرورتوں اور امنگوں کو ٹھکرا کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔

اور موجودہ صدی کے تہائی حصے میں ہماری معاشرت کے اندر طرح طرح کے بے چینیاں پیدا کیں اور کبھی انھوں نے مغرب سے متاثر ہو کر ہماری ہیئت اجتماعی کی روح کو مسخ کرنے کے لئے اس کے مختلف پہلوؤں پر جذباتی انداز میں حملے کئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ بیس پچیس برس کے طویل عرصے میں بھی یہ جھکڑ ہماری کسی تناور تہذیبی قدر کو جڑ سے نہ اکھاڑ سکا۔ البتہ اس کی تندی سے کچھ کونپلیں اور پتے ضرور جھڑ گئے۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ تحریک وقت اور قوم کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ متلون مزاج مغرب زدہ طبقہ اس تحریک کے ذریعہ اپنے نظریات کے لئے اپنے ماحول کو ذرا سازگار بنانا چاہتا تھا۔ لیکن جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ — یہ آواز ہمارے سماج میں صدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی اور مسلمان قوم کسی رُومانی انقلاب کے لئے تیار نہ ہو سکی۔

جدت پسندی نے شکست قبول نہ کی بلکہ اس نے کمیونزم سے سمجھوتہ کیا اور سنہ ۱۹۳۶ء میں اس نے کمیونسٹ ترقی پسندی کا رُوپ دھارا اس کے بعد جیسے جیسے متحدہ ہندوستان میں کمیونزم کے اثرات بڑھتے گئے اس رُومانی حقیقت نے طبقی حقیقت نگاری اور اس کے بعد اشتراکی حقیقت نگاری کا بہروپ اختیار کیا۔

مسلمان نے اس تحریک کو تماشائی کی حیثیت سے اس لئے دیکھا کہ یہ جدت پسندی کبھی اس کے کام نہ آئی۔ اس جدت پسندی نے ایک نسل کی عمر پا کر طرح طرح کے رُوپ اختیار کئے۔ لیکن وہ کبھی مسلمان کے کام نہ آئی۔ وہ ابتلاؤں سے گزرا۔ اُس نے اس کی کبھی پروا نہ کی۔ اس نے برطانوی سامراج کے خلاف جنگ آزادی شروع کی۔ اس نے اسے بھی نظر انداز کیا۔ مسلمان نے بین الملی جذبے کے تحت ترکوں کی حمایت کے لئے ہاتھ پیر مارے۔ اس نے اُدھر بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ قیامِ پاکستان کے لئے جدوجہد شروع ہوئی تو اس تحریک والوں نے اسے فرقہ وارانہ

قرار دیکر مسلمانوں کی کسی قسم کی جدوجہد میں حصہ نہ لیا۔ ....

....

لیکن اس تحریک کے ترکِ تعلق سے کیا ہُوا — اور ہوا بھی کیا؟ کیا قیام پاکستان کے بعد اس نے حقیقت پسندی سے کام لیا؟ نہیں بلکہ اس نئی سرزمین میں بھی وہ اپنی پچھلی روش پر گامزن رہی اور ان نو برسوں میں جدت پسند فنکاروں نے ایسے ایسے نعرے لگائے کہ جس میں ہماری آزادی کو "داغ داغ اجالے" ہی سے تعبیر نہیں کیا گیا بلکہ ہمارے قومی وجود کو بھی تسلیم نہیں کیا اور پاکستان میں رہ کر ان حضرات نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا جس میں ہمارے ملّی عزائم اور عقائد کا شائبہ تک نہ تھا۔ اور اس عدم تعاون نے ان جدت پسند فنکاروں کو اس قدر غافل کر دیا کہ ملک میں دل ہلا دینے والے سیلاب آئے اور بنگال و پنجاب تباہ ہوئے، غیر ملکیوں نے انسانی جذبے کے تحت ہماری مقدور بھر مدد کی لیکن ان کی فنی تخلیقات میں ان مصیبت زدوں کے لئے دو آنسو بھی نہ بہائے گئے بلکہ اس وقت سے اب تک یہ بحث کرتے رہے کہ اُردو ادب میں جمود کے اسباب کیا ہیں اور اعلیٰ درجے کے فنی شہ پارے کیوں وجود میں نہیں آرہے۔ لیکن انہی سوالات کے ساتھ ساتھ ہمارے ادب میں اعصابی تجربوں کو روشناس کرایا جا رہا ہے۔ ایک لطف کی بات اور ہے کہ اس قابل ماتم تجزیئے میں مسلمان قوم کو حسبِ عادت ناقدری، مذہبی دیوانگی، جاگیردارانہ مزاج کی حامل قرار دیا جا رہا ہے مگر عمرانیات کا ایک غیر جانبدار طالب علم جدید اردو ادب کے پچیس برسوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر بھی اس حقیقت کو پا سکتا ہے کہ مسلمان قوم نے اس تحریک سے کسی حد تک علیحدگی کا رویہ کیوں اختیار کیا۔ اس کے اسباب صرف دو ہیں :-

۱۔ یہ تحریک مسلمان کی تمدنی روح کی ضد تھی۔

۲۔ اس کی سرگرمیاں ایک حد تک ملت کے مفاد اور ضروریات کے خلاف تھیں۔

قوم کے ساتھ اس تحریک کا جو سلوک رہا اس کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیے جو مسلمان قوم نے اختیار کیا۔ اور یہ رویہ کچھ مسلمانوں سے ہی مخصوص نہیں بلکہ جب بھی کچھ من چلوں نے اپنے سماج کی ذہنی اور تہذیبی سطح سے الگ کر اصلاح و انقلاب کی کوششیں کی ہیں تو انھیں مُنھ کی کھانا پڑی ہے۔

اس تصادم کو آپ روس کے گیتھرائن عہد میں بڑا نمایاں دیکھ سکتے ہیں کہ سلاف دوستوں اور یورپ دوستوں کی رسہ کشی کا نتیجہ کیا ہوا؟ سلاف دوست روس کی نجات اپنی روایات میں پاتے تھے لیکن یورپ دوست روس کی نجات یورپ کی تقلید میں پاتے تھے۔ ان رجحانات نے فن کاروں کو آگے بڑھایا، لیکن روس کا معمولی کسان ان رجحانات سے ذرا بھی متاثر نہ ہو سکا۔ اور روسی ڈگر پر چلتا رہا جو اس کے اسلاف نے بنائی تھی لیکن اس تجزیئے میں کلی طور پر میں مسلمان کی جانب داری نہیں کر رہا۔ بلکہ علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان قوم کے کٹرپن کے غلط نکاس کی بھی نشاندہی کرتا چلوں جدت پسندی لاکھ برائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر لائی لیکن اس کے ساتھ تھوڑی بہت صداقت بھی تھی۔ اور وہ تھی مغرب کی خارجیت دوستی جو مشرقی قوموں کے اندرونی مکاشفات میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اور انھوں نے اپنے باہر کی دنیا سے آنکھیں بند کر کے اندر کی بھول بھلیّوں میں بھٹکنا شروع کر دیا تھا۔

مشرقیوں کے نقطۂ نظر میں خارجیت کا ثبات بہت کمزور تھا۔ اور اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ یکسر نہ تھا مغرب کی نشاۃ ثانیہ باہر کی دنیا کی اہمیت کو لے کر آگے بڑھی اور روحی حقیقت پسندی کی وجہ سے یورپی کلیسا نے اس سے شکست کھائی۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمان بھی اس عام بیماری میں مبتلا رہے — اسی بیماری کی وجہ سے پہلے سیاسی اقتدار ان کے ہاتھ سے گیا۔ پھر دھیرے دھیرے زندگی کے دوسرے گوشے اس زوال آمادگی سے

متاثر ہونے لگے لیکن جب وہ پورے طور پر برطانوی سامراج کی گرفت میں آگئے تو پھر انھیں اپنے تہذیبی بقا کی سوجھی! اسی احتیاط کی وجہ سے انھوں نے ہر نئی چیز کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا۔ اسی احتیاط میں پھر اس حقیقت کو نہ پاسکے جس کی وجہ سے وہ زوال آمادگی کے گڑھے میں گر رہے تھے۔ مسلمان اس وقت یورپ کی خارجیت دوستی سے کیوں بدکتا رہا اس کے بھی اسباب ہیں اور وہ وہی اسباب ہیں جو اپنی تہذیب کا احساس رکھنے والی ہر قوم میں رونما ہوا کرتے ہیں۔ فرنگی کے اقتدار میں مسلمان اپنے وجود کو بچانا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے جدت پسندی کے سیلاب میں سے اپنے مطلب کی چیز نہ لی۔

لیکن آج حالات کل سے مختلف ہیں کل ہمیں صرف اپنے تہذیبی وجود کی بقا کا خیال تھا لیکن اب ہمارے سامنے اس کی پرورش ... کا سوال ہے۔

اس لئے اس مطالبے کو آج پھر سامنے رکھکر ہمیں غور کرنا ... چاہیئے کہ ہماری نجات کس میں ہے :-

۱۔ یورپ کی مکمل تقلید میں ۔ یا

۲۔ اپنے اس تصورِ حیات کے اپنانے میں جو نہ صرف ہماری اجتماعی تشکیل کا باعث ہے بلکہ ہمارا یقین بھی ہے۔

اسی ضمن میں ایک بات لگے ہاتھوں اور سن لیجئے کہ پوری معاشرتی زندگی کو اسلام کے سپرد کرنے کے معنے قطعی یہ نہیں ہیں کہ ہم دنیا کی دوسری اقوام اور خصوصاً اپنی ہم عصر مغربی اقوام کے عملی اور فنی کارناموں سے نظریں بچا کر صرف کنوئیں کے مینڈک بن کر زندگی گزار دیں۔

دنیا کی دوسری اقوام اور ان کے صحت مند تجربوں سے ترکِ تعلق غیر مناسب ہی نہیں بلکہ یہ ترکِ موالات اسلام کی اجتماعی رُوح کے قطعاً خلاف ہے اور پھر آپ خود بھی غور فرمائیے جو دین زندگی کو سنوارنے کا دعویٰ کرے وہ انسانوں کے ساتھ ایسا تعلق کیسے گوارا کر سکتا ہے؟

(بشکریہ "ہمایوں")

ظفر احمد صدیقی ۰

لمحۂ فکر

آپ اللہ کی ہستی کے نہیں ہیں قائل!
آپ کہتے ہیں جہاں کا کوئی خالق ہی نہیں
- مادّہ کی ہے یہ سب جلوہ گری!!!
یہ دُنیا
رنگ و بُو کا یہ تماشا یہ عناصر کی مشین
خود بخود چلتی ہے اور خود ہی چلے جاتی ہے
آپ ہر چند کہ انکار کئے جائیں....

مگر
آپ کی فطرت اِس الحاد کی تکذیب ہے خود
ظلم اور جور سے یہ آپ کا نفرت کرنا!
اور مزدوروں غریبوں کی حمایت کرنا!
بے غرض خدمتِ انسان کا یہ جذبہ
جو کبھی
آپ کے نطق کے ساغر سے چھلک جاتا ہے
آدمیت کی یہ قدریں یہ مساوات کا رنگ
جو کبھی آپ کے شعروں میں جھلک جاتا ہے
اپنے حق ہونے کا ناقابلِ تردید یقین!
اور یہ ایمان کہ حق حاملِ نصرت ہوگا
اک نئی صبح سے ہونگے کبھی روشن در و بام
بزمِ انساں سے اندھیرا کبھی رخصت ہوگا
کبھی اس بات کو سوچا بھی ہے تُم نے اے دوست
اندھی طاقت کے تصور سے ہم آہنگ نہیں
سازِ فطرت میں یہ آواز کہاں سے آئی
کوئی اس ساز کے پردوں میں نوا پیرا ہے!

(بشکریہ "میلاد")

اُمِّ منیزہ

اک شمع بجھی۔ اک شمع جلی

پانچ سال بعد ماجد کی خالہ ملنے کے لئے آئیں تھیں فریدہ بھی ساتھ تھی بچپن کی معصوم بھولی بھالی ہمجولی کو اک نئی شان اور نئے انداز سے اپنے سامنے دیکھ کر ماجد کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی دبیل لڑکی ہے جسے تنگ کرنے میں اسے خاص لطف حاصل ہوتا تھا جس کے بالوں کو بگاڑنا اور اسکول کے کاموں میں مداخلت کرنا وہ اپنا پیدائشی حق سمجھے ہوئے تھا۔ اور جو روہانسی ہو کر شکایت بھرے لہجے میں خالہ کو اسکی شرارتوں کا حال سُنا کر اس سے ہمیشہ کے لئے کلام نہ کرنے کی قسمیں کھایا کرتی تھی ——— فریدہ کو جوانی کا حسین ماڈل بنے دیکھ کر اسے تعجب بھی ہوا تھا اور خوشی بھی۔ اور پھر اسے اپنی جوانی کا خیال آگیا۔ اس میں بھی تو بہت تغیر ہو چکا تھا۔ اسکول کی زندگی کو خیرباد کہہ کر اس نے نئی زندگی میں عجیب طریقے سے قدم رکھا تھا اور بچپن کی شرارتوں کی جگہ اب اس میں جہاندیدگی اور پختہ پن پیدا ہو چکا تھا پچھلے ایک سال سے اس کی زندگی جس ڈگر پر چل رہی تھی۔ وہاں تو تجربات کے بیسیوں الاؤ دہک رہے تھے اور ہر ٹیڑھی لکیر سیدھی نظر آرہی تھی اور اسکے جاننے والے لوگوں کا حلقہ ہر لمحہ وسیع ہو رہا تھا اور وہ خود کو بہت اونچی فضا میں پرواز کرتا محسوس کر رہا تھا ——— فریدہ کو نظر بھر کر دیکھنے کے بعد اگرچہ وہ ظاہری طور پر خالہ کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا مگر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ فریدہ کی طرف دیکھتے ہوئے تمام عمر گذار دے یا وقت کی رفتار تھم جائے اور وہ یونہی اسکے سامنے بیٹھا رہے ——— بھولی بھالی دبیل لڑکی ایک حسین دوشیزہ کے روپ میں اس کی ماضی کی تمام شرارتوں کا جواب بنی بیٹھی تھی۔ اس کے حسن میں ایک وقار تھا ایک کشش تھی اور ماجد میں اب اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اس کے خاص اسٹائل سے بنے ہوئے بالوں کو بگاڑ دے یا اس کے سر پر چپت رسید کر کے قہقہہ لگا سکے۔ اب تو وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے آج تک وہ خود ہی دبیل بنا رہا ہو اور فریدہ کے سامنے اسے آنکھ اٹھانے کی بھی اجازت نہ ہو ———

خالہ اسے پانچ سالہ جُدائی کے اہم واقعات بتا رہی تھیں کہ کس مپرسی کی حالت میں جب انہوں نے لاہور چھوڑا تھا۔ تو کراچی پہنچ کر ان کی حالت اور زیادہ خستہ ہو گئی تھی۔ چند دن کی دوڑ دھوپ کے بعد اس کے خالو کو ایک پرائیویٹ فرم میں جگہ مل گئی۔ آہستہ آہستہ ان کی ایماندارانہ جانفشانی اور پُرخلوص خدمت نے اپنے لئے ایک مقام پیدا کر لیا۔ فرم کا مالک اُن پر بے حد مہربان ہو گیا۔ ہر کام میں ان کا مشورہ ضروری سمجھا جانے لگا۔ فرم نے خوب ترقی کی اور اس کے خالو نے اب مینجر کی جگہ حاصل کر لی ہے اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں۔ ماضی کی تکالیف کو اب فراموش کر بیٹھے ہیں ——— اور آخر میں اسکی خالہ نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا:

"بیٹا! کئی مرتبہ تمہیں لکھا ہے کہ لاہور میں کیا رکھا ہے، یہاں تمہارے ابا کی وفات کے بعد ہمارا اب کون ہے۔ کراچی چلے آؤ تمہارے خالو کسی اچھی جگہ پر تمہیں لگا دیں گے مگر تم نے اوّل تو خط کا جواب ہی نہیں دیا اور کبھی بھولے سے خط لکھا بھی تو ایسے جیسے کسی اجنبی کا حال پوچھ رہے ہوں۔ نہ جانے تمہیں یہاں کونسا خزانہ مل گیا ہے۔"

ماجد خفت سی محسوس کرنے لگا کہ واقعی اس نے خطوط کا جواب نہ دیکر اچھا نہیں کیا۔ نہ جانے فریدہ دل میں کیا خیال کرتی ہوگی۔ اور پھر اسے خیال گذرا کہ ہوٹل کی نوکری ملنے کے بعد ہی تو اس نے ایسا رویہ اختیار کیا تھا۔ پہلے تو وہ باقاعدگی سے جواب دیا کرتا تھا اور اس وقت خالو بھی مینجر نہ بنے تھے اور جب انہیں مینجر کی جگہ ملی تو اُس وقت وہ بھی تو ہوٹل کا مینجر بن چکا تھا اور اس نوکری کے نشیب و فراز میں جو حسین جوانیاں شعلوں کی مانند جل رہی تھیں۔ اُن کی موجودگی میں لاہور چھوڑنا ایسا ہی تھا جیسے محفلِ رقص و سرود میں سے کسی کو زبردستی باہر نکال دیا جائے ——— وہ خالہ کو اپنی مصروفیت کا حال

سنانا نہ چاہتا تھا ورنہ اگر کوئی دوست یوں مدت کے بعد ملنے پر اس سے خط نہ لکھنے کا شکوہ کرتا تو وہ مزے لے لے کر خفیہ خزانوں کا حال سناتا اور اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ کر تاریک تہہ خانوں میں لیجاتا ــــــ

شروع میں تو ہوٹل کی نوکری بڑی پریشان کن ثابت ہوئی تھی مگر آہستہ آہستہ وہ ہوٹل کے ماحول سے مانوس ہوتا گیا ــــــ تعلیم سے فارغ ہو کر باپ کی وفات کے بعد سے تمام گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ اسی پر آپڑا تھا۔ بیکاری کے روایاتی اثرات سے اُسے مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ دن تو دفتروں کی خاک چھانتے گزرتے تھے اور راتیں تصورات کے شیش محل بناتے اور ڈھاتے گزرتی تھیں۔ ایک دن اچانک ہوٹل کے مالک اکبر خاں سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اکبر کو بھی ایسے پڑھے لکھے خوبرو نوجوان کی ضرورت تھی جو اس کی نئی پالیسی کا ہمنوا ہو۔ اس کے اشاروں پر ناچے اور اسکے کاروبار کو وسعت دینے کی خاطر صحیح معنوں میں اس کا دست راست ثابت ہو۔ پہلے منیجر سے اسے سب سے بڑی شکایت یہی تھی کہ وہ اس کی نئی پالیسی کا مخالف تھا۔ وہ اس ہوٹل کی شریفانہ فضا کو متعفن ہونے سے بچانا چاہتا تھا اور اسے کسی قیمت پر بھی گوارا نہ تھا کہ اس کی موجودگی میں ہوٹل جسموں کی تجارت کا اڈہ بن جائے۔

ماجد کو جینے کا سہارا چاہیئے تھا اور اکبر خاں کو ایک کٹھ پتلی منیجر ماجد کے اندر سے ایک آواز ابھری تھی کہ یہ سمجھوتہ اسکی انسانیت کی موت ہے، اس کی جوانی کے لئے ایک ذلت آمیز طعنہ ہے اس کے گھریلو ماحول کیلئے ایک غلیظ گالی ہے ــــــ اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اس نئے دور ا ہے پر وہ کونسا راستہ اختیار کرے۔ اکبر خاں نے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا تھا ــــــ "زندہ رہنا چاہتے ہو تو زمانے کا ساتھ دو۔ وقت کے سامنے جھکنے ہی سے زندگی مسرتوں سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ معقول تنخواہ اور کھانا مفت آج کل جس خوش نصیب کو حاصل ہو۔ وہ کسی شہزادے سے کم نہیں، آؤ میرے ساتھ۔ خوش بختی تمہیں خوش آمدید کہنے کے لئے بیقرار ہے۔"

ــــــ اور ماجد نے اندر سے اٹھتی ہوئی آواز کو دبا دیا تھا۔ یہ آواز اسکے بعد بھی کئی بار ملتجی انداز میں اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ مگر نئی جوانیوں کی چمک اور بھرے پیٹ کے خمار نے اس کی طاقت کو زائل کر دیا تھا مگر نحیف آواز اتنی ڈھیٹ ثابت ہوئی تھی کہ اب بھی موقع پا کر اس کے دل کے مقفل کواڑوں کو کھٹکھٹانے لگتی تھی ــــــ نئے ماحول کی سطحی جاذبیت نے ماجد کو اپنے سنہری جال میں جکڑ لیا تھا۔ اس کی جوانی کے ولولوں کا رُخ موڑ دیا تھا اور اب جس ڈھنگ سے وہ زندگی بسر کر رہا تھا اس پر اسے غرور بھی تھا اور خوشی بھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے دنیا کو اپنے سامنے جھکا لیا ہے۔ دنیا اسی طرح جھکی رہے گی اور وہ اس کی تنگی پیٹھ پر کوڑے برسا کر فاتحانہ قہقہے لگاتا رہے گا ــــــ اس کی نظریں جو حسن کو پرکھنے کی خوگر ہو چکی تھیں۔ فریدہ کو دیکھکر یوں متحیر رہ گئی تھیں جیسے آپریشن کی وجہ سے ایک مدت کے بعد اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی ہو ــــــ فریدہ نے ابھی تک اس سے کھل کر باتیں نہ کی تھیں۔ ماجد کی کسی بات کا جواب دینے کی بجائے وہ صرف زیر لب مسکرا کر رہ جاتی تھی۔ اور ماجد کا جی چاہتا تھا کہ وہ فریدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے باتیں کرتا رہے۔ ایسی باتیں جو معطر کنجوں اور چاندنی راتوں میں دو پیار بھرے دلوں کی دھڑکنوں میں جنم لیتی ہیں ــــــ اس وقت وہ بھول گیا تھا کہ ایسی باتوں کی عظمت کو مٹانے کی خاطر تو وہ دن رات ایک جلاد کا کام سر انجام دے رہا ہے ــــــ فریدہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ سفر کی تکان بھی دور نہ ہوئی تھی وہ سونے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور ماجد کو محسوس ہوا کہ بجلی کا بلب فیوز ہو گیا اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر روشنی کی کسی بھٹکی ہوئی کرن کو تلاش کر رہا ہو ــــــ وہ بھی سونے کا بہانہ کر کے لیٹ گیا۔ نیند اسکی آنکھوں سے اڑ گئی تھی بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے وہ سورج کے جلد طلوع ہونے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ بے قراری کی حالت میں وہ اٹھکر بیٹھ گیا۔ اور پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔ فریدہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی اور خالہ اس کی امی کے ساتھ ابھی تک باتوں میں مشغول تھی۔ ان کی باتوں کا موضوع ماجد اور فریدہ کی شادی تھا۔ وہ دونوں رضامند تھیں ماجد کو محسوس ہوا جیسے وہ اڑن کھٹولے پر بیٹھا کسی ایسے طلسمی رنگ محل کی طرف جا رہا ہو جس کے رو پہلی دریچے میں فریدہ کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی ہو۔ کمرے میں آکر وہ پھر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے نوجوان خوبصورت لڑکیوں کی ٹولی کمرے میں گھس آئی ہو۔ اور اس کے پلنگ کے گرد گھیرا ڈالکر وہ سب کھڑی ہو گئی ہوں۔ اندھیرے

…جود وہ انھیں اچھی طرح پہچان رہا تھا۔ ان میں نرگس تھی۔ بینا تھی۔ صبیحہ
…ی مسرت تھی ——— اور وہ سب لڑکیاں تھیں جنھوں نے
…شہور ایکٹرسوں کے نام پر اپنے نام رکھ لیے تھے اور جو انھیں کی طرح
…ہو بہو آگ کے شعلے نظر آتی تھیں اور جب کوئی ان پر عارضی تسلط
…الیتا تو برف کی قاشیں بن جاتی تھیں۔

"یہ سب یہاں کیوں آگئی ہیں؟" اس نے متعجب ہو کر سوچا
…ور جیسے سب لڑکیوں نے اس کی سوچ کا مفہوم پا لیا ہو۔ کھلکھلا کر
…ہنسنے کے بعد وہ بولیں۔

"ہم سب آپ کو مبارکباد دینے آئی ہیں۔ کیونکہ ہماری ہی طرح
…ایک لڑکی آپ کی رفیقِ حیات بننے والی ہے۔ آپ اس انتخاب پر بہت
…وش ہیں اور ہم بھی اس خوشی میں شامل ہونا چاہتی ہیں۔"

"نہیں" اس کا دل چیخ اٹھا۔ "وہ تم میں سے نہیں ہے۔ تم
…سکے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے!"

ایک چنچل لڑکی نے ذرا آگے کو جھک کر کہا۔ "آپ کے پاس اس کا
…کیا ثبوت ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں۔ ہمارے عزیز و اقارب بھی دوسروں
…کے سامنے ہماری ایسی ہی تعریفیں کیا کرتے ہیں۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔"

ماجد اٹھ کر بیٹھ گیا اور دہشت زدہ نظروں سے تاریکی کو گھورنے
لگا۔ پرچھائیاں ہٹ گئی تھیں۔ مسکراہٹیں تاریکی میں جذب ہو گئی
تھیں لیکن وہ اب بھی ریشمی آنچلوں کی سرسراہٹ محسوس کر رہا تھا...

"یہ کیا مذاق ہے؟" وہ ایکدم مسکرا پڑا۔ اسے اپنے تصورات
کی اس سازش پر خفت سی محسوس ہوئی اور وہ چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ
…کے پھر کر پھر لیٹ گیا۔ "میں بھی کس قدر احمق ہوں کہ فریدہ کا ان لڑکیوں
سے موازنہ کرنے لگا تھا۔ بھلا فریدہ کو ان سے کیا نسبت!" وہ ایک
…مسرت سی محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کا انتخاب ہر لحاظ سے اعلیٰ و ارفع
…اور فریدہ واقعی ایک ایسا پاکیزہ پھول ہے۔ جس تک ابھی کسی کا ہاتھ
…نہیں پہنچ سکا ——— کئی بار اس کی آنکھ لگی اور کئی بار وہ جاگا۔ اور
…کی محبت کے نقوش اسکے دل پر گہرے ہوتے گئے ——— صبح
…ہو کر اس نے غسل کیا، نیا سوٹ زیبِ تن کیا اور بن سنور کر
…کے پاس بیٹھ گیا۔ فریدہ نے بھی نیا لباس پہنا تھا۔ اسکے حسن میں
[illegible] کی معصومیت اور پاکیزگی کی
لہریں پھیلتی جا رہی تھیں اور ان لہروں پر ماجد خود کو کنول کی مانند
تیرتے ہوئے پا رہا تھا۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر اس کی خالہ نے کہا۔

"فریدہ بہت عرصے بعد لاہور آئی ہے پہلے بھی تو لاہور میں
رہتے ہوئے اس نے لاہور کی کبھی سیر نہ کی تھی۔ اب یہ لاہور کے مشہور
مقامات کی سیر کرنے کی خاطر ہی میرے ساتھ آئی ہے۔ میں اسے کہاں کہاں
گھماتی پھروں۔ ماجد بیٹا! یہ کام میں تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ تمہارے
ساتھ یہ اچھی طرح سب کچھ دیکھ سکے گی۔"

ماجد تو خود چاہ رہا تھا کہ فریدہ کو ساتھ لیکر باہر نکلے۔ لوگ
اسکی طرف رشک بھری نظروں سے دیکھیں اور وہ فخریہ انداز سے گزر
جائے ——— فریدہ کی جھجک اب کم ہو گئی تھی۔ دونوں
نے ملکر سیر کا پروگرام بنایا۔ فریدہ برقع اوڑھنے لگی تو ماجد کو اس کی حرکت
ناگوار سی گزری۔ اگر خالہ کی موجودگی کا پاس نہ ہوتا تو وہ ضرور برقع کہیں
چھپا دیتا ——— سیاہ برقع میں لپٹی ہوئی فریدہ پر ایک بھرپور نظر ڈالکر
وہ مطمئن ہو گیا کہ اس کی جاذبیت میں اب بھی کوئی خاص فرق نہیں
پڑا تھا۔ گھر سے باہر نکل کر وہ بے پناہ خوش نظر آ رہا تھا۔ جیسے اسے
کسی شاہی تقریب میں مدعو کیا گیا ہو۔ تانگہ اسٹینڈ پر پہنچکر اس
نے ایک خوبصورت تانگہ کرایہ پر لیا۔ فریدہ کے سوار ہونے کے بعد ابھی
اس نے پائیدان پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ اسے ایک جانی پہچانی آواز
سنائی دی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کا ایک گہرا دوست انور اسکی
طرف آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ انور تانگہ کے پاس پہنچے۔ ماجد نے آگے
بڑھ کر اسے دُور ہی روک لیا۔ انور نے شرارتاً پوچھا۔

"صبح ہی صبح کس جگہ مال سپلائی کرنے جا رہے ہو؟" اور
ماجد کے دماغ پر جیسے اینٹ گر پڑی ہو۔ اس سوال نے اس کی شریانوں
تک کو جھنجھوڑ دیا۔ اس نے بمشکل تمام اپنے خون کے کھولاؤ پر قابو پاتے ہوئے
کہا۔ "انور! موقع محل تو دیکھ لیا کرو۔ یہ میری خالہ کی لڑکی ہے۔"

"ایں ——— کیا کہا ——— ؟" ——— اور انور بے ساختہ
مسکرا پڑا ——— "کیا بکواس کر رہے ہو۔ بیٹا ہمیں ہی الو بنانے لگے

تمہاری خالہ کہاں سے ٹپک پڑی تھی؟" اور ماجد کو یوں سنائی دیا جیسے انور کہہ رہا ہو۔ "اگر تمہاری کوئی بہن ہوتی تو کیا تم ہوٹل کی ذلیل نوکری قبول کر سکتے تھے" ——— اس نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

"یقین کرو انور! یہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو قسم خدا کی" انور بات کاٹ کر بولا۔ "رہنے دو یہ بہانے ——— ذرا ایک جھلک دکھا دو ہمارا بھی دن اچھا گذر جائے گا۔ مال نیا معلوم ہوتا ہے۔"

ماجد کے خون کا کھولاؤ بڑھ گیا۔ بغیر جواب دیئے وہ تیز قدم اٹھاتا فریدہ کے پاس آگیا۔ تانگہ چل پڑا۔ اور انور کا قہقہہ اسکے ذہن میں گونجنے لگا۔ اس نے چور نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھا اور اسے ایک تسلی ہوئی کہ فریدہ نے برقع اوڑھ کر باہر نکلنے میں بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر یہ بے پردہ ہوتی تو انور کبھی بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ اور اسکی خوشیاں غارت ہو جاتیں اور محبت کا جو تاج محل اس نے تعمیر کیا تھا دھماکے سے اُڑ جاتا۔

شاہی قلعہ کی سیر کرتے ہوئے ٹھیکیدار حیات سے اس کا سامنا ہو گیا۔ اس نے بچ کر نکل جانے کی کوشش کی مگر حیات نے اسے روک ہی لیا۔ فریدہ نے نقاب ذرا سرکا کر تھوکا اور اس کے دلکش چہرے کی جھلک نے حیات کی رگ ہوس کو پھڑکا دیا۔ ماجد کا ہاتھ دبا کر اس نے سرگوشی کی۔

"یہ اپسرا کہاں سے اُڑا لائے۔ خدا کی قسم ایسی حسین صورت تو میں نے آجتک نہیں دیکھی۔ اسے شام تک گندے ہاتھوں سے ضرور بچائے رکھنا۔ رات کو میں ضرور آؤنگا۔"

ماجد سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ اپنے جواب کی رُسوائی کا مظاہرہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ فریدہ ان سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی۔ ماجد کو غصہ آ رہا تھا کہ فریدہ کو اسکے ساتھ دیکھکر لوگ غلط مطلب کیوں نکال رہے ہیں۔ اور اسکے اندر نحیف آواز یوں قہقہے میں بدل گئی جیسے چنگاری ایک دم شعلہ بن گئی ہو۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ابتدا ہی میں گھبرا گئے۔ انتہا تک پہنچکر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

قلعہ سے باہر نکل کر اب اس کا جی کہیں اور جانے کو نہ چاہ رہا تھا ابتدائی حملے ہی سے اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ مگر فریدہ کے ساتھ تو اس نے بہت لمبا چوڑا پروگرام بنایا تھا۔ اسے کیسے واپس چلنے کی ترغیب دلائے۔ کیا کہے۔ کیا اپنے کردار کے متعلق بتا دے ——— وہ کیا کہے گی ——— کیسے وہ پھر مل سکیں گے !!! ——— سر کو جھٹک کر اس نے تانگہ کرائے پر لیا۔ فریدہ کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے وہ انور اور حیات کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کتنے کمینے ہیں یہ لوگ کسی کی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ——— آخر انھوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے ——— "وہی جو کچھ تم ہو" ایک چبھتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور غصے سے اس کی رگیں تن گئیں ——— "میں کہاں ہوں؟ ——— کون ہوں بتاؤ ——— جلد بتاؤ" ——— "ہی۔ ہی۔ ہی۔ یہ ہوٹل کے ان قہقہوں سے پوچھو جو روشنی کی بجائے سیاہی اُگلتے ہیں"

اور ماجد کنپٹیوں کو دبا کر تیز تیز سانس لینے لگا۔

"کیا بات ہے مینجر صاحب؟ کوچوان نے اسے مخاطب کیا "طبیعت تو ٹھیک ہے نا"

اور ماجد نے چونک کر غور سے اس کی طرف دیکھا اور خوف کے شدید احساس نے اسے لرزا دیا۔ یہ کوچوان تو اس کا جانا پہچانا آدمی تھا۔ اس کے ساتھ تو وہ کئی معاملے طے کر چکا تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ تانگہ پر سوار ہوتے وقت وہ کیسے اسے پہچان نہ سکا تھا۔ کوچوان۔ اسے خاموش دیکھکر بولا۔ "مینجر صاحب! رات کو میجر ضیاء واپس لوٹتے وقت آپ کو بہت گالیاں دے رہا تھا۔ اسے جو مال دکھایا گیا تھا اس کی بجائے اسے گھٹیا مال سپلائی کیا گیا تھا اور اس نے دھمکی دی تھی کہ ہوٹل کے مالک کو اس دھوکا بازی کا ضرور مزہ چکھائیگا۔"

ایک اذیت ناک لہر ماجد کے سینے میں اُبھری اور اس نے جلدی سے کوچوان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا کیلئے خاموش رہو!" اور کوچوان حیران کن نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگا۔ ماجد کو محسوس ہوا کہ صرف کوچوان کا منہ بند کر کے اس نے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ ابھی تو ایسے ہی ہزاروں منہ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ کس کس کی زبان پکڑ سکتا ہے۔ اگر

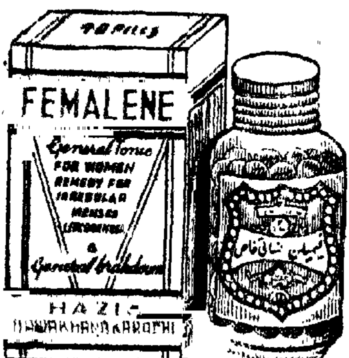
لسی نے زبردستی اس کے سامنے فریدہ کو بازوؤں میں جکڑ لیا تو ــــــ
ہ آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کے شعور میں کانٹے بکھر گئے۔ اس کے
ل کو مٹھی میں لیکر کوئی زور سے بھینچنے لگا ــــــ اس نے سہمی ہوئی
نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن انداز سے بیٹھی تھی کوچوان
کو ماجد نے عجائب گھر کی بجائے گھر کی طرف چلنے کو کہا۔ گلی کے سرے پر اتر کر

فریدہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "ابھی پروگرام ختم تو نہیں ہوا آپ نے تو
اور بہت سی جگہیں دکھانے کا وعدہ کیا تھا" ماجد نے چاہا کہہ دے اگر
تمہارے ساتھ کہیں اور گیا تو میری دنیا اُجڑ جائے گی۔ میں نے پہلے ہی اپنی
زندگی کی عمارت کو کھنڈر بنا دیا ہے۔ آؤ گھر بیٹھ کر نئی تعمیر کا منصوبہ بنائیں۔ مگر وہ کچھ بھی
نہ کہہ سکا اور فریدہ کا بازو پکڑ کر یوں گھر میں داخل ہوا جیسے ہوائی حملہ سے بچاؤ کی
خاطر کسی ٹرینچ میں پناہ لے رہا ہو

فیمیلن (نسائی خاص)

یہ گولیاں عورتوں کی پوشیدہ شکایتوں کے لئے اکسیر ہیں۔
سیلان ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں
سے پیدا شدہ جملہ نقائص کو دور کرنے میں لاثانی ہیں۔ استقرار حمل کو
رو دیتی ہیں گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے جن کا متواتر
استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے جن عورتوں کو اسقاط
حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہے ان کے لئے بے حد مفید ہے۔

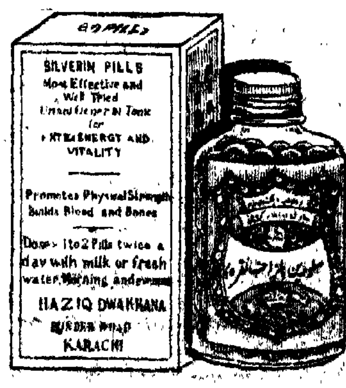
قیمت:۔ چالیس گولی برائے بیس یوم:
تین روپے چھ آنے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر ۱



سلورین پلز

مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اور آج کل کا
آزمودہ جنرل ٹانک ہے ــــــ جو بھوک
بڑھاتا ہے ــــــ جسم میں سرخ خون
پیدا کرتا ہے ــــــ اور طاقت بڑھاتا ہے۔
سلورین پلز پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں

قیمت:۔ چالیس گولی پانچ روپے دس آنے
اسی گولی:۔ دس روپے
ساختہ:۔ حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی ۱



آتش لدھیانوی

گلفشاں گذری ہے یا اشک فشاں گذری ہے
آپ کے ساتھ مری عمر جہاں گذری ہے

آپ کیا جانیں مقاماتِ غمِ شوق کا حال!
آپ کی عمر کہاں، میری کہاں گذری ہے

کیا خبر مجھ کو تبسم کے جنازے کیا ہیں
پوچھ اُس گل سے کہ جس گل پہ خزاں گذری ہے

محوِ یک رنگیٔ گلشن ہوں مجھے کیا معلوم
کب بہار آئی تھی کس روز خزاں گذری ہے

پھر وہ اس راہ سے گذرے ہیں کہ پھر گردِ سفر
گل فشاں، نغمہ فشاں، جلوہ فشاں گذری ہے

ابھی موقع ہے اڑالو مری وحشت کا مذاق
مجھ پہ جو گذری ہے وہ تم پہ کہاں گذری ہے

یادگار اہلِ زمانہ نے انھیں سمجھا آتش
جن منازل سے مری عمرِ رواں گذری ہے

(گلِ خنداں)

قتیل شفائی

اُداس اُداس چاندنی کے زرد زرد رنگ سے
بلا کشانِ انتظار بھی ہیں دنگ دنگ سے

چمن چمن گلاب و یاسمن کی یہ کٹوریاں!
نظر کے آس پاس بج رہے ہیں جلترنگ سے

ترے جمال کی پھوار پڑ رہی ہے ذہن پر
لہک رہی ہے فکر تیرے پیرہن کے رنگ سے

غرورِ حسن سے نہیں سرورِ دلبری سے ہے
یہ پھوٹتا ہوا شباب تیرے انگ انگ سے

فسردگی نے رنگ ہی بدل دیا مزاج کا
چلا کچھ اور آ گئی اس آئینے پہ زنگ سے

یہ برق حادثوں کی [illegible]
مشابہت ہے کس قدر [illegible] سے

قتیل اپنی ٹھوکروں [illegible]
ملی ضیائے رہگذر مجھے شرارِ سنگ سے!

([illegible])

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں کو مرحوم لکھنے کے لئے قلم کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک صدی سے کم وقت سے لئے اپنی عمر اور صلاحیتوں سے ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ پورے عالم اسلام پر چھا گئے اور نہ صرف عالم اسلام بلکہ برطانوی سلطنت کے در و بام پر بھی ان کی قلم و زبان سے دہشت طاری ہو گیا۔ ہندوستان اور ملت اسلامیہ ہندیہ کی زندگی پر انہوں نے اپنے جوش و خروش، قوت عمل اور تحریر و تقریر سے اتنا اثر ڈالا ہے کہ کسی ایک شخص کو ان امور میں ان کا سہیم قرار نہیں دیا جا سکتا افسوس کہ زندگی اور حرارت کا یہ پیکر بالآخر اس کارگاہ عمل سے منہ موڑ کر اس دنیا کی طرف روانہ ہو گیا جہاں سے پھر کوئی لوٹ کر نہیں آیا اور جہاں سے اس کی آواز پھر نہیں سنی گئی۔

مجھے مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے سوانح حیات قلمبند نہیں کرنا ہیں ان کے سوانح حیات تاریخ انسانی کا ایک مفصل باب ہیں اور اخبارات میں ان کی تفصیل شائع ہو چکی ہے۔ عام سوانح حیات سے زیادہ دلکش وہ یادیں ہیں جو انسان کی اپنی زندگی سے وابستہ ہوتی ہیں۔

میں اسلامیہ کالج کا ایک خاموش طالب علم تھا مگر اس خاموش طالب علم کے دل میں اس وقت بھی جذبۂ آزادی کا ایک خروش پوشیدہ تھا اور وہ عہد کر چکا تھا کہ انگریز کی غلامی پر قناعت نہیں کرے گا بلکہ اس کی زنجیروں کو اپنے مقدس وطن کے پاؤں سے نکال کر دم لے گا۔ غلامی اس کے لئے ایک عذاب تھی اور اس پر قناعت مسلمانوں کی غیرت کے منافی پر بڑے خطرے کی بات ہے۔ اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں نے لاہور سے اپنا روزنامہ اخبار ستارۂ صبح نکالا اس کی پیشانی پر یہ شعر لکھا ہوتا تھا۔

س

من آں ستارۂ صبحم کہ در محل طلوع
ہمیشہ پیش رو آفتاب مے باشم

اس زمانے میں خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی جو دارالعلوم دیوبند کی تحریک آزادی کے ایک رکن مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد اور ان کے فکر قرآنی کے مبلغ تھے۔ لاہور میں نظر بند اور اکھاڑہ ہوٹل کے پاس ایک مکان میں مقیم تھے۔ وہ اپنے مکان میں صرف درس قرآن دیا کرتے تھے اور ہم چند طالب علم اس درس میں التزام سے شریک ہوتے تھے۔ درس قرآن کے علاوہ وہ کوئی سیاسی بات نہیں کرتے تھے۔ خفیہ پولیس سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہتی تھی۔ انہوں نے اپنے درس کے طلبہ کے سامنے کبھی تلقین جہاد نہ کی۔ مگر درس قرآن کا انداز خود بخود طالب علموں کے اندر روح جہاد پھونکتا جاتا تھا اور ہم لوگ فیصلہ کرتے جاتے تھے کہ ہم اپنی زندگی جہاد کے لئے وقف کریں گے۔ انگریزی حکومت کی ملازمت ہمارے لئے حرام ہے۔ اس وقت فکر اسلامی کا جو کلی تصور تحریک اسلامی کے داعی نے ۱۵ برس بعد پیش کیا، وہ تو ہمارے سامنے نہیں تھا مگر ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ انگریز کی غلامی کے باعث ہندوستان میں مسلمان مظلوم ہے۔ دنیا میں مسلمان مظلوم ہیں اور ایک مسلمان کی حیثیت میں ہمارا فرض زندگی یہ ہے کہ اس کی غلامی کا تختہ الٹ دیں تاکہ اسلام آزاد ہو اور ہم اللہ کے حضور سرخرو ہوں۔

خواجہ عبدالحی صاحب ستارہ صبح میں اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی تھے۔

ایک روز اسلامیہ کالج کے بورڈنگ ہوسٹل میں قوالی کی محفل منعقد ہوئی۔ ہم لوگوں کو کالج کی اس قسم کی سرگرمیوں سے سخت اجتناب تھا۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ہنری مارٹن تھے۔ جو ہمارے نزدیک علامت ...... امپیریلزم کے نمائندے اور اسلامیہ کالج کے طلبہ میں وفاداری انگریز کا بیج بونے کا خاص اہتمام رکھتے تھے۔ طلبہ میں صفان بہادروں کے اوصاف پیدا کرنے اور آزادی وحریت کے جذبات کو دبانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ہماری اور پرنسپل کی ایک دن بھی نہ بنی وہ ہمارے در پے آزار تھا اور ہم اس کی تعلیمی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے باوجود اس کی برطانوی روایات کے سخت مخالف تھے۔

قوالی میں کچھ ایسے گیت گائے گئے جو آج کی موسیقی کے لغویات کے اعتبار سے تو معصوم تھے۔ مگر اس وقت فحش سمجھے جاتے تھے ہم نے اس قوالی کا حال خواجہ عبدالحی صاحب سے جاکر کہا اور اگلے ہی روز ستارۂ صبح میں ایک نوٹ درج تھا۔

رات کی بات

الہٰی توبہ

اور اس عنوان کے تحت اس امر پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا کہ اسلامیہ کالج جیسے اہم اسلامی تعلیمی اداروں میں اب فحش گیت گائے جا رہے ہیں۔

اس نوٹ کا شائع ہونا تھا کہ مسٹر ہنری مارٹن کی بارگاہِ جلال میں زلزلہ آگیا۔ اسی وقت پروفیسر سید عبدالقادر صاحب مرحوم کو مولانا ظفر علیخاں کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا گیا کہ یہ اطلاع کس نے دی؟ اور وہ کون گستاخ طالبعلم ہے جس نے ہمیں یوں بدنام کیا ہے۔؟

مولانا نے سید صاحب کو بتایا۔ کہ نوٹ خواجہ صاحب نے لکھا ہے انہی کو معلوم ہوگا۔ سید صاحب نے خواجہ صاحب سے پوچھا۔ مگر انہوں نے ٹکا سا جواب دیدیا اور پوچھا کہ کیا واقعہ غلط ہے۔ سید صاحب نے کہا واقعہ تو صحیح ہے۔ اس پر خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اگر واقعہ صحیح ہے تو اطلاع دہندہ کا نام معلوم کرنے کی بجائے کارپردازان کالج کو اپنی غلطی کی اصلاح کرنی چاہئیے۔

سید عبدالقادر صاحب مرحوم نے سارا ماجرا پرنسپل کو کہہ اور فوراً قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند راقم الحروف اور اس کے ایک دوست ریاض حسین کی طرف گمان گیا۔ اور پرنسپل کے کمرے میں طلب فرمالیا گیا۔ ہمارے ساتھ اور ایک طالب علم شفاعت اللہ خاں بھی دھر لئے گئے کہ وہ بھی آزادی وحریت کے جذبات کے لئے کالج میں معروف تھے۔

یہ ۱۹۱۸ء کا زمانہ تھا۔ انگریز کا طوطی اقبال چار دانگ عالم میں بولتا تھا۔ آزادی وحریت کا نام لینا جرم تھا۔ پرنسپل سے ٹکر لیتے ہوئے روح فنا ہوتی تھی۔ اور پرنسپل بھی انگریز جو اس لحاظ سے سرکاری حلقوں میں خاص وقار رکھتا تھا کہ وہ مسلمان قوم کی نئی نسل کے ہاسو نوجوانوں کے قلب وذہن کو برطانوی وفاداری کے سانچے میں ڈھالنے کا ذمہ دار تھا۔ ہم لوگوں نے صاف انکار کردیا کہ ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں۔ کون سنتا ہے فغان درویش۔ تینوں کو بورڈنگ ہاؤس اور کالج سے دس دن کے لئے معطل کرکے نکال باہر کیا گیا۔ بعد میں اتنی اجازت دی گئی کہ ہم کھانا کھانے ایوان ہوسٹل میں آسکتے ہیں۔ مگر ہمیں ہر گز اس کی اجازت نہیں تھی کہ اس دوران میں ہم کسی طالب علم سے بات کرسکیں ہم نے بستر اٹھائے اور سیدھے خواجہ عبدالحی صاحب کے مکان پر چلے گئے۔

مسٹر مارٹن نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس وقت کے فرعون مزاج لفٹنٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر سے مولانا ظفر علیخاں کی شکایت کردی۔ مولانا کو حکام نے اطلاع دی کہ حضور لفٹنٹ گورنر بہادر آپ کے اس تنقیدی شذرے پر بے حد خفا ہیں۔ اگلے روز ستارۂ صبح نکلا تو اس میں صفحہ اول پر پہلے کالم میں جلی قلم برجستہ پھڑکتی ہوئی اور دشوار گزار زمین اور قوافی میں ایک نظم درج تھی جس کا پہلا شعر تھا ؎

دانۂ بارود میری نکتہ چینی ہوگئی ✦ اوڈیری تحریر ہنری مارٹنی ہوگئی

(دہیری مادھیں ایک ماتقل کا نام بھی تھا)

مولانا نے سید عبد القادر صاحب مرحوم کو بھی معاف نہ کیا۔ ان کی تشریف آوری اور پوچھ گچھ کا حال لکھتے ہوئے آخر میں یہ شعر لکھا۔

چمک ماتھوں کی دکھلاتے ہیں اور بجلی گراتے ہیں
قیامت بن کے وہ ہر فتنہ ما محشر بسانے آتے ہیں

سید صاحب نے یہ مضمون اور شعر پڑھا تو حسب عادت ہنس کر اور مسکرا کر فرمایا "مولانا نے میرے دانتوں پر بھی چوٹ کر دی"

دس روز کے بعد ہم لوگوں نے ایک ایسی تدبیر کی کہ مسٹر ہری مارشن کو اور میری اور ریاض حسین کی بیگناہی کا یقین ہو گیا۔ بیچارے شفاعت منت میں رگڑے گئے ان کو دس روپے جرمانہ ہو گیا جو مولانا اصغر علی زدی مرحوم کی سفارش سے معاف ہوا۔

میری زندگی کا یہ پہلا واقعہ تھا جبکہ مولانا سے براہ راست واسطہ ہوا اس کے بعد تحریک خلافت تحریک آزادی اور تحریک شہید گنج کے سلسلے میں بے شمار موقعے مولانا سے ملنے اور ان کے ملی اور سیاسی قلمی اور دینی کمالات دیکھنے کے ملے۔

(بشکریہ "ایشیا")

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری جنوری ۱۹۵۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہِ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم :- منیجر "مشیر" کراچی۔

۹ منشی اللہ بخش صاحب، مظفر گڈھ۔
۲۲ جناب عطاء اللہ صاحب، کراچی۔
۲۴ جناب شیخ محمد یوسف صاحب کراچی۔
۲۲ محترمہ بیگم ہیڈ ماسٹر طاہر قریشی صاحب، لاہور۔
۲۱ جناب بشیر احمد صاحب، رحیم یار خاں۔
۲۵ محترمہ مسز ریاض الرحمن، جہلم۔
۲۵۲۷ جناب عبد الجبار خاں صاحب، بہادل نگر۔
۲۵۲۸ جناب محمد انور صاحب صدیقی۔ پونچھ۔
۲۵۳۲ جناب منظور علی خانصاحب، بنارس۔
۲۵۳۵ جناب چوہدری محمد نعیم صاحب، بارہ بنکی
۲۵۳۶ جناب محمد صدیق صاحب کالپوری لاہور۔

انوار ظہوری •

بات دل کی رہے دل میں نہ زباں تک پہنچے
دامنِ غم نہ گریبانِ فغاں تک پہنچے

کیوں نہ اُٹھ اُٹھ کے دھواں کاہکشاں تک پہنچے
دل اگر مرحلۂ آہ و فغاں تک پہنچے

سانس لیتے ہیں تو اب دل پہ اثر ہوتا ہے
دیکھئے دردِ محبت میں کہاں تک پہنچے

کیا انھیں بادہ گساری کا سلیقہ آئے
آج بھی جو نہ رہ و رسمِ جہاں تک پہنچے

کہہ رہے ہو کہ فسانہ نہ سنائیں اپنا
ہم جو آغازِ محبت کے بیاں تک پہنچے

کھل گئی شاہدِ رنگیں کی حقیقت دل پر
جلوے جب دیدۂ خونابہ فشاں تک پہنچے

بجھ نہ جائیں شبِ غم میری امیدوں کے چراغ
دل جو ظلمت کدۂ وہم و گماں تک پہنچے

لالہ و گل و چمن افروز بہار و مئے ناب
حسنِ آغاز یہ — انجام خزاں تک پہنچے

منزلِ شوق ہے خود رفتگیٔ دل کا مقام
آپ ہی آپ نظر آئے جہاں تک پہنچے

اک زمانے سے زمانے میں مچی ہیں دھومیں
دیکھئے کب یہ درِ امن و اماں تک پہنچے

جم سکے گی نہ رُخِ کاہکشاں پر اے دوست
گرد اڑ اڑ کے اگر کاہکشاں تک پہنچے

دیکھئے اور کہاں جائے گی لیکر قسمت
حیدرآباد دکن سے تو یہاں تک پہنچے

تذکرہ ہے یہی ہر ایک زباں پر انوار
دیکھیں اب آپ کا افسانہ کہاں تک پہنچے

مسرور قریشی •

گفتار سے مطلب ہے نہ کردار سے مطلب
محبوب کی ہے زُلفِ طرح دار سے مطلب

مانا کہ ستم رانیاں اُن کی ہیں مسلّم
ہے طالبِ دیدار کو دیدار سے مطلب

منزل کا نشاں مجھ کو اسی رہ سے ملا تھا
اب تک ہے مجھے وادیٔ پرخار سے مطلب

طالب کی اگر جان بھی چلی جائے طلب میں
مطلوب کو کیا ہوگا طلبگار سے مطلب

ہر ایک ادا تیری زمانہ کے لئے ہے
مجھ کو ہے فقط شوخیٔ گفتار سے مطلب

لکھی تھی تباہی مری قسمت میں ازل سے
گلچیں سے شکایت ہے نہ گلزار سے مطلب

ہر حال میں مسرور میں مسرور رہا ہوں
اقرار سے مطلب ہے نہ انکار سے مطلب

ریاض قمر

ہجر کی رات بے کراں سی ہے
ہر گھڑی ایک امتحاں سی ہے

دُور تک ایک ہُو کا عالم ہے
دور تک روشنی دھواں سی ہے

جانے، یہ کس کی یاد آئی ہے
ہر نظر ایک داستاں سی ہے

ایک تم ہو۔ تو احتجاج کریں
ہم سے دنیا ہی سرگراں سی ہے

آہ بھی سن نہ لے کوئی اے دوست!
ہم نے اس واسطے زباں سی ہے"

آپ کے بعد، زندگی اپنی
دہر میں گردِ کارواں... سی ہے

اے قمر، داستانِ غم سن کے
اُن کی پلکوں پہ کہکشاں سی ہے

رشید ارشد

آپ کا انتظار کب سے ہے!
قلب کو اضطرار کب سے ہے!!

تنگیٔ داماں، انتظار ابھی سے
باغ میں انتشار کب سے ہے

میری جانب بھی ہو نگاہِ کرم!
بندہ امیدوار کب سے ہے!

آزمائش ہے ہر گھڑی ورنہ
موسم خوشگوار کب سے ہے!

جیب و داماں کے چاک سل نہ سکے!
انتظارِ بہار کب سے ہے!

یہ زوالِ خرد ہے اے ارشد
دہر میں انتشار کب سے ہے!

باوقار تنظیم

کے متعلق چند وضاحتی سوالات اور اُنکے جوابات

باوقار تنظیم کے متعلق "مشیر" کے گزشتہ شمارے میں ہم نے چند وضاحتی سوالات کے جوابات شائع کئے تھے جو بڑی دلچسپی سے پڑھے گئے اور اس سلسلے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس سلسلے کا سب سے مفید پہلو یہ ہے کہ اس طرح کے تبادلہ خیالات سے اس سکیم کے اچھے اور برے پہلو نمایاں ہو رہے ہیں جو ہماری رہنمائی کے لئے بڑے مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ ہم انشاءاللہ اس سلسلے کو "مشیر" میں جاری رکھیں گے۔

گزشتہ ماہ کی طرح اس ماہ بھی مختلف اطراف سے بہت سے سوالات آئے جن کے فرداً فرداً جوابات دیئے گئے۔ ان میں بعض اُصولی بھی تھے اور اکثر جزوی اور فروعی نوعیت کے تھے۔ تقسیم "بونس" کے متعلق اکثر احباب نے اعتراض کیا ہے کہ قواعد و ضوابط میں "بونس" والا پیراگراف واضح نہیں ہے اس کی تشریح ضروری ہے۔ ان اعتراضات کے پیش نظر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس پیراگراف کو واضح کر دیا جائے تاکہ کوئی ابہام نہ رہے اسلئے قواعد و ضوابط میں "بونس" والے پیراگراف کو ہم نے مندرجہ ذیل طور پر واضح کر دیا ہے۔ قواعد و ضوابط کا نیا ایڈیشن چھپ کر آیا ہے۔ اس میں "بونس" والا پیراگراف حسب ذیل ہے:۔

> "اس سکیم کے سلسلے میں وصول شدہ رقومات کو کمپنی ھذا کے نفع بخش تجارتی اور صنعتی ذیلی ادارہ جات میں لگایا جائیگا۔ ان ادارہ جات سے حاصل شدہ منافع میں سے اُن کے جملہ اخراجات مع انکم ٹیکس وضع کرکے باقی منافع کو سرمایہ کے تناسب سے پرافٹ شیئرنگ کے اُصول پر کمپنی ھذا اور باوقار تنظیم کے درمیان تقسیم کیا جائیگا۔ کمپنی ھذا اپنے اخراجات منافع کے اپنے حصے سے پورا کریگی۔ باوقار تنظیم کے اخراجات اسکے منافع کے حصہ سے پورا کرکے باقی منافع باوقار تنظیم کے مختلف گروپوں کے درمیان ان کے سرمایہ کے تناسب سے تقسیم ہوگا۔ ہر گروپ کا منافع اس کے ممبروں کے درمیان بطور بونس تقسیم ہوگا۔ بونس کی تقسیم سرمایہ اور وقت کے معروف اصول پر ہوگی جس کا معیار پانچ روپیہ فی ماہ فی یونٹ ہوگا۔ بونس کی تقسیم ہر دوسرے سال یا جس طرح ڈائریکٹران کمپنی ھذا کمپنی کے کاروباری حالات کے پیش نظر مناسب تجویز کریں ہوگی۔ کمپنی ھذا کی سالانہ آڈٹ شدہ بیلنس شیٹ میں دکھایا ہوا منافع قانونی منافع متصور ہوگا اور ہر حالت میں "غیر متنازع فیہ" ہوگا۔"

جن حضرات کو نئے قواعد و ضوابط کی ضرورت ہو وہ صدر دفتر سے طلب کر سکتے ہیں۔

اسکے علاوہ حسب ذیل سوالات موصول ہوئے تھے جن کے جوابات دیدیئے گئے ہیں۔

سوال نمبر ۱ :۔ باوقار تنظیم کا جماعت اسلامی سے کیا تعلق ہے؟ اور جماعت کے کون کونسے افراد اس میں حصہ لے رہے ہیں؟

جواب :۔ باوقار تنظیم کا جماعت اسلامی یا کسی بھی مذہبی، اصلاحی یا سیاسی ادارہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تنظیم باوقار کمپنی لمیٹڈ کے ذیلی ادارہ جات میں سے ایک ادارہ ہے جو کہ ایک کاروباری ادارہ ہے۔ یہ اعلان باوقار تنظیم کے قواعد و ضوابط کے کتابچہ میں واضح طور پر

موجود ہے۔ جماعت اسلامی کے کچھ اراکین اس تنظیم کے ممبر ضرور ہیں مگر ان کا یہ فعل ان کی انفرادی حیثیت سے ہے جماعت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اگر آپ اس سکیم میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو یہ دیکھ کر حصہ لیں کہ اول اس کے چلانے والے آپ کی نظر میں قابل اعتماد ہیں۔ دوئم وہ کاروباری صلاحیت رکھتے ہیں۔ سوئم وہ اس کاروبار کو اسلامی حدود کے اندر چلائیں گے۔ اگر آپ ہر سہ طور پر مطمئن ہوں تو اس میں ضرور حصہ لیں، اگر نہیں تو کوئی مجبوری نہیں ہے۔ آپ اس طرح کیوں سوچتے ہیں کہ اگر اس سکیم کا تعلق جماعت اسلامی سے ہو یا نہ ہو، تب ہی اس میں حصہ لیا جائے۔

ایک صاحب نے جو کسی "امدادی کمیٹی" میں دو سال تک کمیشن ایجنٹ رہ چکے ہیں اور تین سال تک اس کے ڈائریکٹر بھی رہ چکے ہیں اپنے عملی تجربہ کے پیش نظر حسب ذیل اعتراضات کئے تھے، جن کے جوابات حسب ذیل طور پر دیئے گئے۔

سوال نمبر ۱ :- میرا خیال ہے کہ ابتدائی دو سال میں آپ کسی قسم کا کوئی منافع بطور بونس تقسیم نہ کر سکیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی کام کو شروع کرنے کے لئے کراچی میں کم از کم بیس ہزار روپیہ تو دفتر اور تجارت گاہ حاصل کرنے کے لئے چاہیئے اور دس ہزار روپیہ دیگر اخراجات کے لئے بھی۔ اور اگر بس وغیرہ کا کاروبار کرنا چاہا تو نئی بس چالیس ہزار روپیہ ضرورت ہوگی۔ ایسی حالت میں کافی عرصہ تک آپ اعتدال پر نہ آسکیں گے اس کا بھی انتظام ضروری ہے۔ خدا کرے آپ کو ابتدائی ایام میں ہی منافع حاصل ہو۔

جواب :- آپ کے مشورہ کا شکریہ۔ عرض ہے کہ باوقار کمپنی لمیٹڈ کراچی کے پاس اپنے ذیلی ادارے موجود ہیں جن کے پاس تجارت گاہ بھی ہے اور دفتر وغیرہ بھی اور دوسرا ضروری سامان اور عملہ بھی، اور وہ کاروباری حیثیت سے چل رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس سلسلے میں ابتدائی اخراجات کے لئے اتنی بڑی رقومات صرف کرنے کی .... ضرورت پیش نہیں آئے گی تنظیم کا سرمایہ فوراً ہی کاروبار میں لگتا جائیگا۔ ہم بس وغیرہ کا کام فی الحال نہیں کر رہے۔ فی الحال یہ سرمایہ چلتے ہوئے کاروبار میں بتدریج لگتا جائیگا۔

سوال نمبر ۲ :- اقساط کی وصولی پر آپ کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اسلئے کہ دیگر امدادی کمیٹیاں یہ اصول پیش کرتی ہیں کہ رکن کو صرف اس وقت تک اقساط ادا کرنی پڑیں گی جب تک کہ رکن کا رول نمبر نہ نکل آئے اور اگر پہلی قسط بند ہونے کے بعد نام نکلا تو ۲۵ فیصدی۔ دوسری قسط وصول نہ ہونے پر ۵۰ فیصدی اور ۳ ماہ کی قسط ادا نہ کرنے پر ۷۵ فیصدی اور ۴ قسطیں نہ آنے پر اگر نام نکل آیا تو ۵۰۰/- روپیہ کی پوری رقم ضبط کر لی جائے گی اور جمع شدہ رقم میں سے ۲۵ فیصدی اخراجات کاٹ کر قسطیں واپس کر دی جائیں گی۔ ایسی سخت پابندی پر بھی لوگ دو، دو اور چار، چار ماہ تک قسط ادا نہیں کرتے ہیں۔ بار بار یاد دہانی کے باوجود کوئی نوٹس نہیں لیتے۔ ایجنٹ جا جا کر تھک جاتے ہیں تو آپ کی تنظیم میں جبکہ پورے سنو ماہ تک اقساط ادا کرنی پڑیں گی کس طرح قسطیں ادا کی جا سکیں گی آپ کی تنظیم میں کتنے ہی صالح لوگ شامل ہوں مگر اپنے حالات انسان کو مجبور کرتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ کی تنظیم میں صرف وہی لوگ شامل ہونگے جو آپ کے ہم خیال ہوں گے۔ اور وہ لوگ محدود آمدنی والے ہونگے۔ اس طرح قسطوں کی عدم وصولی پر ادارے کو کافی نقصان ہوگا۔ ایسی حالت میں آپ نے اقساط کی وصولی کا کیا بندوبست کیا ہے؟

جواب :- دوسری "امدادی کمیٹیوں" میں اقساط کی وصولی میں دقت کی وجہ وہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھی ہے بلکہ اس کے اسباب میں ان اصولوں

گورکھ دھندا ہے جن پر وہ چل رہی ہیں مثلاً ان کا یہ اصول کہ ممبر اس وقت تک قسط ادا کریگا جب تک اس کے نام امدادی کمیٹی نکلے۔ اس کے بعد وہ فارغ ہو جاتا ہے۔ اس کا پہلا نفسیاتی اثر یہ ہے کہ ہر شخص جوان کمیٹیوں کا ممبر بننے کا ارادہ کرتا ہے۔ اس کے تحت الشعور میں یہی توقع اور امید ہوتی ہے کہ دو چار قسطیں ادا کرنے کے بعد اسے پانچ صد روپیہ مل جائیگا یعنی اسے دس بیس روپیہ دیکر پانچ صد روپیہ حاصل کر لینے کا نادر موقع حاصل ہے اور جب یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو وہ جھنجھلا کر قسط ادا کرنا بند کر دیتا ہے؛ یا پھر ان کمیٹیوں کے ایجنٹ ممبر سازی کے وقت طرح طرح سے لوگوں کو غلط توقعات دلا کر پھانستے ہیں کہ تم دو چار قسطیں ادا کرنا۔ پھر ہم کوشش کر کے تمہیں کمیٹی دلوا دیں گے۔ جب اس کے خلاف ہوتا ہے تو اس کا رد عمل بھی ممبر کے ذہن پر یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے اور وہ بھی جھنجھلا کر قسط ادا کرنا بند کر دیتا ہے۔ پھر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک کمپنی کھڑی ہوئی۔ اس نے لوگوں سے چار چار، پانچ پانچ ماہ تک اقساط وصول کیں پھر وہ کھاپی کر بند ہوگئی اور اس طرح کر اس کے کرتا دھرتوں کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ ہوٹل کا کمرہ اس کا دفتر تھا۔ اب وہاں کوئی اور مسافر براجمان ہے۔ اس کا اثر بھی دوسری کمیٹیوں کے ممبروں پر ہوا۔ کہ بڑے بڑے دعووں کیساتھ یہ کمپنی شروع ہوئی تھی۔ مگر لوگوں کا روپیہ ہضم کر کے بند ہوگئی کہیں ہماری کمپنی کا بھی یہی حشر نہ ہو۔ وہ ڈر کر قسطیں بند کر دیتے ہیں۔ جب انھیں بار بار یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ نہیں یہ کمپنی مضبوط ہے یہ نہیں ٹوٹے گی اور وہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہمارے دو چار قسطیں بند کرنے کے بعد بھی یہ کمپنی چل رہی ہے تو پھر ڈھارس باندھ کر وہ دوبارہ قسطیں ادا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کے اور بہت سے عوامل ہیں جو ان کمیٹیوں میں کام کر رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہاں قسطوں کی ادائیگی میں خلل پڑتا رہتا ہے۔ اور مزید ممبر سازی بھی جاری رہتی ہے۔ پھر وہاں کی ایجنٹ بازی نے بھی ایک پیشہ ورانہ صورت اختیار کر لی ہے۔ چونکہ کمپنی کا دارومدار ممبر ساز ایجنٹوں پر ہوتا ہے اس لئے ان کے ایجنٹوں نے بھی اپنی اہمیت کو محسوس کر لیا ہے اور ان کے دو دو چار چار کے گروپ بنے ہوتے ہیں۔ جب ایک کمپنی سے ان کی کسی بات پر ناچاقی ہوتی ہے تو وہ دوسری کمپنی کی راہ لیتے ہیں اور اپنے بنائے ہوئے ممبروں کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں، ان کے کھاتے وہاں تبدیل کراتے ہیں۔ دوسری کمپنیاں ان کے کھاتے اپنے ہاں تبدیل کر لیتی ہیں۔ اور انھیں کہتی ہیں کہ آپ کی ادا کی ہوئی اقساط کا روپیہ ہم وصول کر لیں گے۔ حالانکہ نہ کوئی وصول کرتا ہے نہ کوئی ادا کرتا ہے۔ مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ پانچ صد روپیہ ملنے کی اُمید پر پانچ پانچ روپیہ دینے والے کچھ ممبر اور مل گئے۔ جو کچھ دے ہی جائیں گے۔ اب یہ کمپنیاں حقیقی معنوں میں کبوتر بازوں کے اڈے بن گئی ہیں۔ جہاں کبوتروں کے ڈار اڑ کر جس اڈے پر سبز باغ دیکھتے ہیں جا بیٹھتے ہیں اور جب مایوس ہوتے ہیں تو دوسرے اڈے کی راہ لیتے ہیں۔ اب آپ غور فرمائیں کہ ایسی فضا میں قسطوں کی ادائیگی میں باقاعدگی کیسے رہ سکتی ہے۔ اس کے برعکس انشورنس کمپنیوں کو اپنے بیمہ شدہ ممبران سے اقساط وصول کرنے میں ایسی دقت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ ایک متعین شرائط نامہ کے تحت بیمہ سازی کرتی ہیں۔ وہ ان واضح شرائط کے ساتھ بیمہ کرتی ہیں کہ بیمہ کرانے والے کو دس سال پندرہ سال یا بیس سال تک ایک خاص رقم ماہانہ یا سالانہ ادا کرنا ہوگی۔ اس کے عوض اگر وہ شخص اس مقررہ مدت میں وفات پا جائے تو کمپنی اس کے وارثوں کو ایک خاص رقم ادا کریگی ورنہ مقررہ مدت ختم ہونے پر وہ اسے اس کا ادا کیا ہوا نقد کچھ شرح سود کے اضافہ کیساتھ واپس کر دے گی۔ ان کے ہاں اقساط کی وصولی کے لئے دقت اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ بیمہ کرانے والا شخص اس شعور کے ساتھ ممبر بنتا ہے کہ اسے اس مدت تک بہرحال اتنی رقم ماہانہ یا سالانہ پس انداز کرنی ہے اور وہ کرتا ہے وہاں نہ تو کوئی تذبذب کی حالت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا انتشار ہوتا ہے جیسا کہ ان "امدادی کمیٹیوں" کے ماحول میں ہے۔ اس لئے وہاں کوئی ایسی دقت نہیں ہوتی۔ ویسے وہاں پیڈاپ “Paid [illegible]” ہونے والے کھاتے ایک تناسب سے ہوتے ہیں جو محض مجبوریوں کے تحت ہوتے ہیں۔ اور وہ تناسب بہرحال ان کی سکیم کے تخمینہ کے مطابق ہی ہوتا ہے ہم نے یہ سکیم مندرجہ بالا دونوں صورتوں سے ہٹ کر شرکتِ نفع و نقصان (پرافٹ شیئرنگ) کے اصول پر چلائی ہے اور ہم ممبر سازی ان واضح قواعد و ضوابط کے تحت کر رہے ہیں کہ ہر ممبر کو اپنی ممبری قائم رکھنے کے لئے ہر حالت میں اقساط پوری مدت تک ادا کرنی ہیں۔ اس کے عوض اس مدت میں اسے ایک دفعہ پانچ صد روپیہ کی امدادی رقم بھی ملے گی اور منافع میں اسے بطور بونس حصہ بھی ملے گا۔ جس کا تعین ہم نے نہیں کیا بلکہ جو منافع حساب کتاب سے آئیگا اسی سے حصہ ملیگا۔ چاہے زیادہ ہو یا تھوڑا۔ اب جب کہ ہم ان واضح شرائط کے ساتھ ممبر سازی کر رہے ہیں اور ممبر بھی اس شعور کے ساتھ ممبر ہو رہے ہیں

ہیں کہ انھیں اپنی ممبری کے حقوق قائم رکھنے کے لئے ہر حالت میں پوری مدت تک قسطیں ادا کرنی ہیں تو ایسی صورت میں ہمیں اُمید ہے کہ قسطوں کی ادائیگی میں ہمارے ہاں وہ دقتیں نہیں ہوں گی جو ان امدادی کمیٹیوں میں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہمارا ہر ممبر اس شعور کے ساتھ فارم ممبری پُر کرتا ہے کہ اسے پوری مدت تک اقساط ہر حالت میں ادا کرنی ہیں۔ ہم نے اپنے ایجنٹوں کو اس کے متعلق واضح ہدایات دے رکھی ہیں۔ اب ہماری تنظیم میں شامل ہو کر اگر کوئی ممبر قسطوں کی ادائیگی بند کریگا تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود ہی کسی ناگزیر درپیش حالات کی بنا پر مجبور ہو جائے کہ قسط ادا نہ کر سکے یا پھر وہ امدادی رقم حاصل کرنے کے بعد بے ایمان ہو جائے۔ یہ دونوں صورتیں تناسب کے ساتھ متوقع ہیں۔ اگر صورت حال تناسب سے زیادہ ہوئی تو اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور سوچا جائیگا۔ پھر اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ اس قسم کے اجتماعی کاموں میں نظم و نسق کو قائم رکھنے کے لئے تنظیمی تحفظات کی تو ضرورت ہوتی ہے مگر بے جا قسم کی پابندیاں اور جکڑ بندیاں جذبۂ تعاون پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت نہیں ہوتیں بلکہ الٹا معاندانہ جذبہ پیدا کرتی ہیں جو کام رضا و رغبت کے جذبے سے آسانی سے سرانجام پا سکتا ہے اسے سخت قسم کی پابندیوں سے صحیح طور پر سرانجام نہیں دلوایا جا سکتا ـــــ ان "امدادی کمیٹیوں" میں ان کے ممبروں کی کیفیت کچھ اسی طرح کی ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک بھولا بھالا پرندہ دانۂ تہہ دام کے لالچ میں آکر پھنس تو جائے مگر حقیقت حال کے واضح ہونے پر پھڑپھڑائے اور حلقۂ دام کی مضبوطی اسے بے بس کردے۔ اس لئے ان "امدادی کمیٹیوں" کی جن سخت پابندیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے وہی ان کے ہاں فراہمی اقساط میں سد راہ ثابت ہو رہی ہیں۔

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ ہماری تنظیم میں کتنے ہی "صالح" لوگ شامل ہوں مگر وہ اپنے حالات سے مجبور ہوں گے اور وہ لوگ محدود آمدنی والے ہونگے اس لئے قسطوں کی عدم ادائیگی پر ادارے کو نقصان ہوگا۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ جہاں "صالح" لوگ حالات سے مجبور ہوتے ہیں وہاں وہ اپنی قوت ایمانی سے بھی مجبور ہوتے ہیں کہ وہ جو معاہدہ اور عہد کریں اسے حتی الوسع پورا کریں الا یہ کہ حالات ناگزیر ہوں۔ وہاں بے ایمانی کا سوال نہیں ہوتا۔ ان کی آمدنیاں بیشک محدود ہوں گی مگر ان کے ایمان اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے محدود نہیں ہیں جتنے کہ آپ نے سمجھ رکھے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہمارے ہاں اقساط کی وصولی کے لئے وہ دقتیں پیش نہیں آئیں گی جن کا تجربہ آپ کو ان "امدادی کمیٹیوں" کے ماحول میں ہوا ہے۔

ایک اور صاحب کی طرف سے چند سوالات موصول ہوئے تھے جن میں سے ایک یہ تھا۔

سوال :- اس ماحول میں کمپنی کو ایسا کاروبار روپیہ لگانے کے لئے کہاں سے ملے گا جس کو سودی لین دین سے بالکل منزہ مان لیا جائے۔ براہ راست اگر کمپنی سود کا لینا اور دینا نہ بھی کریگی تو بہر حال ایسے کاروباری اداروں کے ساتھ کمپنی کو اشتراک عمل کرنا ہی پڑیگا جو سود سے پرہیز نہیں رکھتے تو گویا سودی کاروبار کیساتھ بالواسطہ تعاون ہو گیا جو بہر حال نادرست ہے۔ مثلاً روپیہ رکھنے کے لئے اگر بنک کی خدمات حاصل کی جائیں گی جو کہ بظاہر ضروری معلوم ہوتا ہے تو آجکل کونسا ایسا بنک ہے جو سودی کاروبار نہیں کرتا۔ تو گویا کمپنی نے اگر خود بنک سے سود کا لین دین نہ بھی کیا تو بہر حال اپنا روپیہ بنک کے پاس جمع کر کے بنک کے سودی کاروبار میں اس کی امداد کر ڈالی۔ یہ تعاون بھی شرعاً ناجائز ہوگا۔

جواب :- اس میں تو کوئی شک نہیں کہ دورِ حاضر میں جس کا سارا اقتصادی اور معاشی نظام بنکنگ کے سودی نظامِ معیشت پر ہی چل رہا ہے۔ اس نظام سے ہٹ کر بلا سود کاروبار کرنے کا ارادہ کرنا یا دعویٰ کرنا بڑی جسارت ہے اور پھر اس کو کامیابی کے ساتھ چلا لینا ایک کٹھن کام ضرور ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایسا کرنے کا ارادہ کرنا یا کوشش کرنا ہی ناممکن العمل ہے۔ اگر کوئی بغیر سودی لین دین کا کوئی کاروبار کرنا چاہے تو اس کے لئے بے شمار کاروبار ایسے ضرور ہیں جو وہ کر سکتا ہے۔ باقی رہا آپ کے سوال کا دوسرا پہلو تو اس کے متعلق عرض ہے کہ اشتراک اور تعاون میں بڑا فرق ہے۔ اشتراک اصول چھوڑے بغیر نہیں ہو سکتا مگر تعاون اپنے اصولوں پر قائم رہ کر بھی ہو سکتا ہے ـــــ بنکوں یا ایسے اداروں کے حصے خریدنا جو سودی لین دین

کا کاروبار کر رہے ہیں یقیناً ان کے گناہ اشتراک ہے جو کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ مگر ان اداروں کے ساتھ خرید و فروخت کرنا یا ان کی معرفت رقم کا لین دین کرنا اشتراک نہیں کہلا سکتا۔ البتہ تعاون کہلا سکتا ہے۔ اس نوعیت کا تعاون اس معاشرے میں حرکت کے لئے ناگزیر ہے ورنہ پھر ہمیں گوشہ نشینی اختیار کر لینی چاہیئے جب تک معاشرے میں پورا انقلاب نہ آجائے اسی اضطرار سے گزرنا ہوگا۔

مندرجہ بالا جواب پر ان ہی صاحب نے یہ اعتراض لکھ کر بھیجا تھا:-

> موجودہ معاشرے میں سودی لین دین کرنیوالے اداروں سے تعاون کرنا آپ نے ناگزیر تسلیم فرمالیا ہے ورنہ جناب کا خیال ہے کہ گوشہ نشینی کے سوا چارہ نہ رہے گا۔ نیز آپ نے اس مجبوری کو اختیار کرنا ایک اضطراری کیفیت بتایا ہے۔ اضطراری کیفیت میں یقیناً حرام چیز کو بھی اختیار کرنے کا جواز نکل آتا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ اضطرار کس درجہ کا ہے جہاں تک ممبروں کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شخص کو اتنی سخت مجبوری نہیں ہے کہ وہ پانچ روپیہ ماہوار بچا رکھنے کی سوماہ تک اگر تجویز منظور نہ کرے تو اس کی جان کو یا اسکے ایمان کو کوئی مہلک خطرہ لاحق ہو جائیگا۔ کفایت شعاری اور فکر فردا کی انفرادی طور پر بھی انسان سعی کر سکتا ہے۔ اگر کسی اسی قسم کی اجتماعی صورت میں دینی نقصان کا پہلو سامنے ہو تو کیا ضرور ہے کہ آدمی جان بوجھ کر یہ موہوم سا منافع کمانے کے درپے ہو اور پھر اپنے نفس کو اس بات سے تھپکی دے کہ معاشرے کے فساد زدہ حالات میں ناجائز قسم کے کاروبار سے تعاون ایک اضطراری کیفیت ہے۔

جواب: کسی بنک میں حساب کھولنے کو اگر آپ ایسی اضطراری کیفیت تصور کرتے ہیں جس سے حرام کو اختیار کرنے کا جواز نکلتا ہے۔ تو پھر یقین کیجئے اس ہمہ گیر سیلابی کیفیت کے اثرات سے بچا ہوا شاید ہی کوئی دامن آپ کو خشک ملے۔ یہاں اضطراری کیفیت سے حرام کو اختیار کرنے کا جواز نکالنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے مراد محض اس دور کی کاروباری رکاوٹوں کا ناگزیر حد تک سد باب ہے۔ کسی بنک میں اس نیت سے حساب کھولے رکھنا کہ اس چیکوں کی ادائیگی میں سہولت رہے یا بڑی رقموں کی ادائیگی سہولت سے ہو جائے' یا اس نیت سے بنک میں روپیہ ڈال دینا کہ گھر میں بیکار پڑا رہنے سے بہتر ہے کچھ "منافع" ہی لے آئیگا۔ ان دونوں صورتوں کی اضطراری کیفیت میں بڑا فرق ہے پہلی صورت حرام کو اختیار کرنے کا جواز نکالنے کی زد میں نہیں آتی ہے ایسی کیفیت میں تو بڑے بڑے دینی ادارے جو شرعی حدود کے سختی سے پابند ہیں بھی مبتلا ہیں۔ انھوں نے بھی بنکوں میں اپنے اپنے حسابات محض اسلئے کھول رکھے ہیں کہ ان چیکوں کے ذریعے عطیہ جات کی رقوم آسانی سے وصول ہو جائیں پھر اس کیفیت کو بنک میں حساب کھولنے تک ہی محدود کیوں سمجھا جائے۔ یہ کیفیت کاروباری زندگی میں تو قدم قدم پر پیدا ہوگی۔ مثلاً ہم مشرقی پاکستان چالیس پچاس من تجارتی سامان بھیجنا چاہتے ہیں۔ اب کیوں کسی باربرداری کمپنی کی خدمات حاصل کی جائیں لنکے کاروبار کا مدار بھی سودی لین دین پر ہے ہم انھیں سامان کا کرایہ دیکر انکے کاروبار میں مدد کرتے ہیں۔ اسلئے یہ سامان اونٹوں اور گدھوں پر بھیجنا چاہیئے۔ موٹر ٹرک بھی تو قابل استعمال نہیں کیونکہ انکے خریدنے پر بھی ان کی بنانے والی کمپنیوں کی امداد ہوتی ہے جو کہ خود سودی کاروبار کرتی ہیں پھر جب مشرقی پاکستان میں وہ سامان فروخت ہو اس کی قیمت کے بیس تیس ہزار روپیہ بنک ڈرافٹ کی معرفت بھی ہم نہیں لا سکتے کیونکہ یہ بالواسطہ اسے تعاون ہے جو کہ ناجائز ہے۔ اب تو ہمیں اسکے عوض بھی اونٹوں اور گدھوں پر سونا لاد کر لانا چاہیئے۔ اشرفیاں نہیں لا سکتے کیونکہ وہ اب مستعمل نہیں۔ نوٹ نہیں یہ خطرہ لاحق ہے کہ یہ سٹیٹ بنک آف پاکستان کے پرامیسری نوٹ ہیں جو خود سودی کاروبار کرتا ہے۔ پھر اس کیفیت کو کاروبار ہی تک کیوں محدود کریں، انفرادی زندگی میں اگر دیکھیں ہم یہ خط آپ کو ڈاک سے نہیں بھیج سکتے کیونکہ اس پر ڈاکخانہ سے ٹکٹ خرید کر لگانے پڑیں گے جو کہ اس محکمہ سے عملی تعاون ہو گیا یہ ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ محکمہ آپ جانتے ہیں سب سے بڑا بنک ہے۔ سیونگ بنک اس کے ہیں۔ سیونگ سرٹیفکیٹوں پر ½ ۱۲ فیصدی منافع دیتا ہے۔ اب تو ملاقاتی ہرکارے کے ذریعے بھیجنا پڑیگا۔ اور وہ بیچارہ ہرکارہ ریل گاڑی پر سفر کیسے کر سکتا ہے۔ ریلوے کا محکمہ خود اسی دور کے سودی نظام پر کام چلاتا ہے اسے ریل کا

کرایہ دیکر کیوں اس کی مدد کی جائے۔ اب تو یہ ہرکارہ خط لیکر پیدل ہی آپ کے پاس آئیگا اور اگر راستہ پربت سے اٹا ہوا ہو، تو پھر توقع رکھئے کہ یہ خط آپ کو آئندہ سال تک ضرور مل جائیگا جب تک اس سکیم کا کیا حال ہوگا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کوتاہ نظری کی یہی عینک لگا کر جب ہم اس دور میں زندگی گزارنے نکلیں گے تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کی بجائے کیا عافیت اسی میں نہیں ہے کہ گوشہ نشینی اختیار کرلی جائے۔

مندرجہ بالا نقطہ نظر سے آپکا یہ فرمانا بجا ہے کہ اگر کوئی شخص سو ماہ تک پانچ روپیہ ماہوار بچا رکھنے کی تجویز قبول نہیں کرتا تو اس کی جان گویا اس کے ایمان کو کوئی مہلک خطرہ لاحق نہیں ہوجاتا۔ اور نہ ہی اس کے لئے کوئی سخت مجبوری ہے کہ وہ ضرور ہی ایسا کرے، کیونکہ کفایت شعاری اور فکر فردا کی سعی انفرادی طور پر بھی ہوسکتی ہے۔ مگر کیا اس دور میں جب کہ "امدادی کمیٹیوں" اور "انشورنس کمپنیوں" کے شیش محل اجتماعی طور پر نوع انسانی کو اس طاغوتی نظام معیشت کے پھندوں میں مضبوطی سے جکڑنے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں اور اس طرح نوع انسانی کے پس اندازی اور فکر فردا کے فطری اور جائز جذبہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں برگشتہ بھی کر رہے ہیں۔ اور اس نظام معیشت کی جڑیں بھی مضبوط کر رہے ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی عملی اقدام سے اس خوشنما جادو کا پردہ چاک کیا جائے۔ کیا ایسا اقدام جو یہ ثابت کرنے کے لئے اٹھایا جائے کہ اس انسانیت سوز نظام معیشت کی بجائے ایک ایسا حیات افروز نظام معیشت بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ جو ان مفاسد سے پاک اور نوع انسانی کی فلاح و بہبودی کا موجب ہے کسی تعاون کا مستحق نہیں ہے؟ یا ایسے اقدام کو محض "موہوم سا منافع کمانے کا فریب نفس" قرار دیکر نظر انداز کردینا چاہیئے؟

ان ہی صاحب نے ایک تجویز یہ پیش کی ہے کہ:-

> میرے ایسے کوتاہ علم لوگوں کے خدشات کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہل سنت و الجماعت مسلک کے اکابر علما کے سامنے اصل سکیم اور اس قسم کے موصول شدہ سوالات یا شبہات رکھکر کوئی متفقہ "فتوی" لے لیا جائے مگر اس کی بجائے اگر ایسے بعض علما سکیم میں خود ممبر بن جائیں تو ان کا یہ عمل اُمت کے لئے دلیل نہیں کہلا سکتا۔

جواب:- ایسے کاروباری مسئلہ کے متعلق "فتوی" لینا ہمارے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ کاروباری معاملات کو بھی فتوؤں کی زد میں لانے سے کونسے اچھے نتائج کی توقع ہوسکتی ہے یہی کہ فتوے بازی کے طعنوں میں ایک کا اور اضافہ ہوجائیگا۔ بھائی صاحب جب سے اُمت نے علما کے عمل کو دلیل ماننے کی بجائے صرف ان کے قول کو ہی حجت ماننے کی راہ اختیار کی ہے، ساری خرابیاں جب ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔

خدا کرے ہم قول سے زیادہ عمل کے قائل ہوجائیں کہ راہ نجات اسی میں ہے۔ ویسے ہم آپ کے ان اعتراضات اور اپنے جوابات کو شائع ہی اس لئے کر رہے ہیں کہ انھیں سب ہی پڑھ لیں۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے؟

(باقی آئندہ)

ایک ضروری اعلان

باوقار تنظیم کی ایک کچی رسید بک جس کا نمبر 601 — 700 ہے، کسی حادثہ کی وجہ سے کراچی میں گم ہوگئی ہے۔ کسی صاحب کو اس رسید بک پر باوقار تنظیم کے سلسلے میں اقساط وغیرہ وصول کرنیکی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی صاحب مذکورہ بالا رسید بک پر کسی شخص کو باوقار تنظیم کے سلسلے میں کوئی روپیہ ادا کرینگے تو وہ خود اسکے ذمہ دار ہوں گے

مینجر، باوقار کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی

اعلان

باوقار تنظیم

باوقار تنظیم کا جماعت اسلامی یا کسی بھی مذہبی اصلاحی یا سیاسی ادارہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تنظیم باوقار کمپنی لمیٹڈ، کراچی کے ذیلی ادارہ جات میں سے ایک ادارہ ہے جو کہ ایک کاروباری ادارہ ہے۔ جماعت اسلامی کے کچھ ارکین یا دیگر حضرات جو اس سکیم کے ممبر ہیں اُنکا یہ فعل ان کی انفرادی حیثیت سے ہے جماعتی حیثیت سے نہیں۔

باوقار تنظیم کے کمیشن ایجنٹس

مختلف مقامات پر مندرجہ ذیل حضرات باوقار تنظیم کے منظور شدہ کمیشن ایجنٹ ہیں۔ ان مقامات کے لوگوں کو ان کی معرفت ممبر بننے میں سہولت رہے گی۔

(۱) صاحبزادہ جناب عبدالرحمٰن صاحب معرفت شاہین بکڈپو ساوتھر سرکلر روڈ۔ پشاور صدر

(۲) جناب عبدالستار صاحب۔ مدینہ ہوٹل میران پور روڈ۔ موسےلین۔ کراچی

(۳) جناب عبدالستار صاحب لگرین مرچنٹ۔ نزد ریلوے کراسنگ۔ ٹنڈو آدم

(۴) جناب محمد شریف صاحب معلیکم ٹریننگ کالج۔ ہری پور۔ ہزارہ

(۵) جناب حافظ محمد حیات صاحب۔ شاہی بازار۔ ٹالی۔ حیدرآباد (پاکستان)

(۶) جناب ضیاء الحق صاحب صدیقی کمیشن ایجنٹ اینڈ آرڈر سپلائر شاہی بازار سکھر

(۷) جناب احمد نور صاحب۔ فیصلی لائن۔ جیکب آباد

(۸) جناب محمد منشا صاحب۔ نیوز ایجنٹ۔ رحیم یار خان

(۹) جناب عابد سعید صاحب (خوشنویس)، مکان نمبر: 2/870.A نزد نیگ سینما۔ لالوکھیت، کراچی ۱۹

(۱۰) جناب مولوی محمد امین صاحب کھوکھر۔ پلاٹ نمبر: C. 38/1 متصل مسجد غریب نواز۔ لالوکھیت ڈاکخانہ۔ کراچی ۱۹

(۱۱) جناب ڈاکٹر غلام رسول اکرم صاحب بمقام و ڈاکخانہ جھول ضلع سانگھڑ

(۱۲) جناب محمد انور صاحب علوی 852۔ بزاز محلہ۔ صدر بازار۔ لاہور چھاؤنی

(۱۳) جناب محمد عبدالصادق صاحب۔ رانی بازار۔ ڈاکخانہ گھوڑامارا۔ راجشاہی

(۱۴) جناب اسلام الحق صاحب اسلامی کتب خانہ نیم کی ٹہالی۔ سکھر

(۱۵) جناب محمد جلیل خاں صاحب۔ پلاٹ ۱۴/۷۔ بشمال کوٹھی پیر صاحب پی۔ آئی۔ بی کالونی۔ کراچی

(۱۶) جناب بشیر احمد صاحب۔ مکتبہ تعمیر ملت۔ چوک بازار، ملتان (شہر)

(۱۷) جناب محمد عبداللہ صاحب علوی معرفت دفتر جماعت اسلامی صدر بازار میانوالی

(۱۸) جناب ابوالخطیب صاحب B-85 بلاک۔ محمود آباد۔ کراچی ۵

(۱۹) جناب محمد ناصر حسن صاحب صدیقی۔ 250۔ آگرہ تاج کالونی۔ کراچی ۲

(۲۰) جناب جمیل احمد صاحب فاروقی۔ نزد عثمانیہ مسجد بہادر کوٹ۔ بلیر شہر (کراچی)

(۲۱) جناب محمد نواز صاحب سائل۔ مسجد ہرن روڈ۔ نزد سوری بلڈنگ کرشن نگر۔ لاہور

(۲۲) جناب عبدالستار صاحب دوکاندار۔ فرنٹیئر شوگر مل تخت بھائی۔ ضلع مردان۔

(۲۳) جناب خالد احمد صاحب صدیقی (بی۔ کام) 48۔ چوبرجی پارک۔ لاہور

(۲۴) جناب عبدالحفیظ صاحب ہاشمی۔ ویلکم ہوٹل چوک بازار۔ بہاولپور

باوقار کمپنی لمیٹڈ، بندر روڈ، کراچی ۱

ظفر عالمگیر

ماں

"تمہارے سفید بالوں سے لے کیا، وہ تو تمہارے سفید رنگ پر مرتا ہے۔"

"قدر کرو اپنے عاشق کی، اس عمر میں کون ملے گا تمہیں؟"

"نصیب جاگے ہیں تمہارے!"

"چند دنوں کا مہمان ہے، دل بہلا دو غریب کا۔"

"ہم لوگوں کو وہ پوچھتا تک نہیں۔"

"دل تو آیا ہوا اس گڑیا پر، ہمیں کیوں پوچھنے چلا۔"

"ہم پر کیوں دیدے نکال رہی ہو کیا وہ تم پر نہیں مرتا؟"

"کل ڈاکٹر سے کہنے لگا۔ مسز سلیمان بہترین نرس ہیں۔"

"چلو سفارش کر دی اس نے۔ اب تنخواہ بڑھ جائے گی۔"

"کام کا عاشق ہے۔"

ساتھ کام کرنے والی نرسیں طرح طرح جملے برساتی رہیں اور مسز سلیمان سب کو تکتی رہیں۔ لوگ کہتے ہیں عورتوں کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ لیکن نرسیں بھی جب بولنے پر تل جاتی ہیں تو بغیر فل اسٹاپ اور کومے کے زبان دوڑاتی ہیں۔ بھلا مسز سلیمان ان نوجوان نرسوں کی باتوں کا کیا جواب دے سکتیں؟ اگرچہ وہ بھی نرس تھیں اور ان سب کے مقابلہ میں ان کی سروس کہیں زیادہ تھی، لیکن انہیں طرح طرح کی باتیں بنانا نہ آیا۔ وہ انتہائی سنجیدہ واقع ہوئی تھیں۔ اور انہیں نرسنگ سے اگر کچھ تعلق تھا تو صرف اتنا کہ وہ اس کے سہارے زندگی گزار رہی تھیں اگر ان کے شوہر کا انتقال نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی نرسوں کی دنیا میں آنا بھی گوارا نہ کرتیں۔ وقت کے دیوتا نے ان کی مانگ سے افشاں ہی نہیں چرالی تھی، ہاتھوں سے حنا کی سرخی ہی نہیں چھین لی تھی۔ صدمات نے ان کے کچھ بالوں کی سیاہی بھی چوس لی تھی۔ ورنہ ان کی عمر اتنی نہ تھی کہ بال پکتے یا چہرہ مرجھاتا۔

نوجوان نرسیں مسز سلیمان کی سنجیدگی سے بیحد متاثر تھیں لیکن جب ان کا ٹرانسفر وارڈ نمبر ۹ پر ہوا تو ان نرسوں کو جیسے مذاق کا موضوع ہاتھ لگا۔ اور اس کا سبب ایک مریض تھا۔ جو وارڈ نمبر ۹ میں دو سال سے پڑا کھانس رہا تھا۔ موت سے لڑ رہا تھا!

پہلی بار جب مسز سلیمان اس کے بستر پر دوا لئے پہنچیں تو وہ پڑا چھت کو تک رہا تھا۔

"دوا پی لو!"

مسز سلیمان نے کہا۔ لیکن وہ چھت کو تکتا رہا۔ جیسے وہ انسان نہ تھا جو سن سکتا ہو۔ مجسمہ تھا جو کچھ کر نہیں سکتا۔ مسز سلیمان نے دو تین بار اسے پکارا، لیکن وہ تکتا ہی رہا۔ آخر انہوں نے اسے جھنجھوڑا

"کیا سوچ رہے ہو، دوا نہیں پیو گے؟"

"ہاں پیوں گا۔"

وہ سنبھل کر اٹھ بیٹھا اور مسز سلیمان پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

"آپ نئی آئی ہیں؟" نوجوان مریض نے انہیں تکتے ہوئے کہا۔

"ہاں!"

"خدا کا شکر ہے۔" مریض نے لمبی سانس لی۔

"یہ بتائیے آپ دودھ میں کتنا پانی ملائیں گی؟ کتنے انجکشن اڑا لے جائیں گی؟ اور بیچ ڈالیں گی۔ کتنی ڈبل روٹیاں آپ کے گھر جائیں گی؟" مریض پوچھ بیٹھا۔ مسز سلیمان اسے تکتی رہ گئیں۔

"کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟"

"لو دوا پی لو۔"

"بس دوا مل جاتی ہے ٹھیک سی۔ اگر یہ بھی اچھی چیز ہوتی تو دودھ کی طرح نرسیں اسے بھی پی جاتیں۔"

مریض نے دوا لی اور پی گیا۔

مسز سلیمان نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں۔ لیکن یہ باتیں انھیں بے حد محتاط بنا گئیں مسز سلیمان نہ مریضوں کا دودھ بچا کر کبھی اپنے گھر لے گئی تھیں۔ نہ انھوں نے مریضوں کے انجکشن کبھی کسی کو بیچے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مریض کی باتیں انھیں متاثر کر گئیں، وہ اس کا خاص خیال رکھتیں، یوں بھی وہ اس وارڈ میں سب سے پرانا مریض تھا اور سارے مریضوں سے مہذب اور کافی پڑھا لکھا بھی تھا۔

"آپ کو کوئی شکایت تو نہیں ہے؟" چار پانچ دن بعد وہ اسے دودھ دیتے ہوئے پوچھ بیٹھیں

"دو سال میں پہلی بار آپ جیسی نرس آئی ہے۔ نہ ایسا دودھ مجھے آج تک ملا اور نہ اتنی ڈبل روٹی ہاتھ میں آئی" مریض نے کہا۔

"آپ کے لئے دودھ ڈبل روٹی ہی کافی نہیں ہے۔ پھل وغیرہ کھایا کیجئے نا؟" مسز سلیمان نے ہمدردی سے کہا۔

"ارے نرس! اپنا کون ہے جو پھل لا کر دے۔ ماں ہوتی تو فکر کرتی۔ کوئی بہن ہوتی تو تڑپتی۔ باپ آج تک دیکھنے نہ آیا۔ پھل کون لا کر دے گا؟ ڈاکٹر ٹانک کے لئے کہتا ہے لیکن کون لا دے مجھے؟ کس کے پاس پیسے فضول پڑے ہیں؟"

مسز سلیمان کا دل کانپ اٹھا۔ مریض کے الفاظ ان کے دل میں گونج اٹھے۔

"ماں ہوتی تو فکر کرتی، بہن ہوتی تو تڑپتی"

انھیں اپنا بچہ یاد آ گیا جو کم عمری میں لاری سے کچل کر دم نہ توڑ جاتا تو اس کی عمر اتنی ہی ہوتی۔ جتنی اس مریض کی تھی۔ وہ اتنا ہی بڑا ہوتا۔ دودھ پلا کر وہ چپکے سے چل دیں۔

دوسرے دن وہ بیگ لئے اس مریض کے پاس آئیں۔

"یہ لو، اطمینان سے کھاؤ۔ ختم ہو جائیں تو میں اور لا دوں گی۔" انھوں نے کہا۔ بیگ پھلوں سے بھرا ہوا تھا۔

"آپ!"

مریض کی زبان پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ وہ سوچ تک نہ سکتا تھا کہ دودھ، ڈبل روٹی اور انجکشن ہڑپ کر جانے والیوں میں کوئی نرس اتنی پرخلوص، بے غرض اور ہمدرد بھی ہو سکتی ہے!

وہ دوپہر کو دودھ کی پیالی لئے آ پہنچی۔ اور مریض بول نہ سکا۔

"ابھی سے دودھ آ گیا شام کا؟"

"نہیں شام کو اور ملے گا۔ یہ بھی پی لو" مسز سلیمان نے کہا۔ اور مریض کی آنکھیں ان پر جم کر رہ گئیں۔

اسے پھل ملنے لگے۔ دوپہر کو بھی دودھ ملنے لگا جو وہ اصل مسز سلیمان خود نہ پیتیں اور اس کے لئے لا دیتیں۔ اس لئے وہ مشکل سے تھوڑی بہت غذا کھا سکتا تھا۔ مریض ان نوازشوں پہ حیران تھا۔

"آپ کتنی اچھی ہیں نرس! آپ کا نام کیا ہے؟" مریض ایک دن پوچھ بیٹھا۔ مسز سلیمان کو کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ اور وہ چپ ہو رہیں۔

نام نہیں بتاؤ گی نرس؟ کیا نام ہے آپ کا؟" وہ اصرار کرنے لگا۔

"تم یہاں رہتی ہو تو مجھے کتنا سکون ملتا ہے! تم انسان نہیں ہو، فرشتہ ہو نرس!"

اس نے ایک سانس میں کہہ دیا اور مسز سلیمان بوکھلا کر گئیں۔ مریض کے الفاظ سے انھیں عجیب سی بو آ رہی تھی۔

"تم کہاں رہتی ہو نرس؟ بات کیوں نہیں کر رہی ہو؟"

مسز سلیمان خاموش رہیں اور دودھ پلا کر چل دیں۔

دوپہر کو جب بوائے نرس روم میں انھیں دودھ دے گیا تو ان کا دل نہ چاہا کہ مریض کو دے آئیں۔

"نوجوانوں کی نیت بہت گندی ہوتی ہے۔ ان سے ہنس کر بات کرنا مصیبت مول لینا ہے" انھوں نے دل ہی دل میں کہا۔ اور دودھ پینے لگیں۔ لیکن ——— ایک ——— دو ——— تین ——— چوتھا گھونٹ ان سے پیا نہ گیا۔ انھیں اس مریض پر رحم بھی آ رہا تھا، غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ جانے کیا کیا سوچنے لگیں۔ مریض کی باتوں نے انھیں ماضی کے مزاروں کی طرف لوٹا دیا تھا شوہر کی یادیں ———!

"تم اتنی اچھی کیوں ہو اسماء؟ تم میرا کتنا خیال رکھتی ہو۔"
"تم مجھ سے روٹھ کیوں گئی تھیں اسماء؟ تم میری زندگی ہو۔ غصے میں کچھ کہہ دوں تو برا نہ مانا کرو۔"
"اسماء! ہم دونوں نہ ملتے تو میری زندگی ادھوری رہ جاتی۔"
شوہر کی باتیں مسز سلیمان کو یاد آتی رہیں۔ اور وہ کڑھتی رہیں۔ کہ اس مریض نے اسی طرح کی باتیں کیوں کہیں۔
شام کو جب وہ دودھ لئے پہنچیں تو مریض جیسے ان کا منتظر تھا۔
"دوپہر کو آپ نہ آئیں نرس؟"
"تمہارا دودھ بلی پی گئی تھی۔"
مسز سلیمان سے جواب نہ بن پڑا۔
"میں نے دودھ نہیں پوچھا ہے۔ آپ دوپہر میں نہ آئیں مجھے فکر تھی ابھی تک انتظار کر رہا تھا۔" مریض نے وضاحت کی۔
"تمہیں دودھ سے غرض ہے یا مجھ سے؟"
"نرس! میں بدنصیب انسان ہوں نرس! محبت کا بھوکا ہوں۔ ماں بچپن میں مر گئی۔ مجھے جب ہوش بھی نہ آیا تھا۔ بیوی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ باپ کی طرح۔ نہ جانے اب کہاں ہو؟ ہو گی کسی نہ کسی کے گھر........."
مریض ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ مسز سلیمان دوسرے مریض کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ مریض بستر پر بیٹھا انہیں پکارتا رہا۔ روزانہ مسز سلیمان سارے مریضوں کے پاس سے ہوتی ہوئی اس کے پاس آتیں اور کافی دیر اس کے پاس رک جاتیں۔ لیکن آج وہ سب سے پہلے اس غریب کے پاس آئیں۔ اور مریضوں کو دودھ تقسیم کر کے وارڈ سے نکل گئیں۔
دوسرے دن صبح جب وہ دودھ تقسیم کرنے چلیں تو پھر سب سے پہلے اس مریض کے پاس پہنچیں۔......
....
.... ان کے دل کو دھچکا سا لگا۔
شام کا دیا ہوا دودھ اس کے کپ میں ابھی تک اسی طرح پڑا تھا اور وہ بہت اداس تھا۔
"دودھ نہیں پیا کل؟" انہوں نے پوچھا۔
"پیا نہ گیا مجھ سے۔"
"کیوں؟"
"تم ناراض کیوں ہو گئیں نرس؟"
"دودھ لو گے یا...؟"
"اتنی ناراض کیوں ہو نرس؟ مجھ سے کیا قصور ہوا؟ معاف کر دو مجھے۔"
مسز سلیمان اس کے الفاظ برداشت نہ کر سکیں اور دوسرے مریضوں کی طرف نکل گئیں۔ ان کی عجیب حالت تھی۔ اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکیں کہ وہ کس قسم کا انسان ہے، اس کی ذہنیت، اس کے الفاظ پر انہیں غصہ آ رہا تھا تو دوسری طرف انھیں اس کی باتوں میں انتہائی تڑپ نظر آ رہی تھی۔ وہ دق کا مریض تھا اور مسز سلیمان کو خوف تھا کہ مرض شدید نہ ہو جائے۔ دوپہر کو جب نرس روم میں بولنے نے انھیں دودھ لا کر دیا تو ان کا جی نہ چاہا کہ بیٹھیں۔ وہ پیالی لئے اس مریض کے پاس گئیں۔ وہ بستر پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ گہری سوچ میں مسز سلیمان نے اسے چونکایا اور اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ پیالی بستر پر آ رہی۔
"خدا کے لئے بتاؤ کیوں ناراض ہو۔ مجھے نہ ستاؤ نرس! ایسے انجان ہی بننا تھا تو اتنی ہمدردی کیوں کی؟"
وہ چیخ اٹھا۔ سارا وارڈ اسے تکنے لگا۔ مریض دونوں کو گھورنے لگے۔ مسز سلیمان فوراً وارڈ سے چل پڑیں۔ اور وارڈ بوائے کو بھیج دیا کہ بستر صاف کر دے۔ مسز سلیمان کے خیالات دھاگے کی طرح الجھتے رہے دوسرے دن انھوں نے چھٹی لے لی اور جب وہ چھٹی گزار کر ہسپتال آئیں تو دوسری نرسوں نے مریض کے متعلق عجیب عجیب باتیں سنائیں، اس نے صبح سے شام تک کچھ کھایا نہ پیا۔ بار بار وارڈ بوائے سے پوچھتا رہا کہ مسز سلیمان کہاں ہیں؟ وہ کیوں نہ آئیں؟ ان کی طبیعت کیسی ہے؟ مسز سلیمان کے دل میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔
"وہ مجھے کیا سمجھتا ہے کمینہ کہیں کا!"

بڑبڑاتی ہوئی وہ میڈیکل آفیسر کے پاس پہنچیں۔

"مجھے کسی دوسرے وارڈ کو ٹرانسفر کر دیجئے۔ میں وارڈ نمبر ۸ پر کام نہیں کر سکتی" مسز سلیمان نے کہا۔

"جی ــــــ!"

میڈیکل آفیسر نے سگار کو ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے کہا "میں خود بھی سوچ رہا ہوں۔ کل تمام نرسیں کسی مریض کا ذکر کر رہی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ مسز سلیمان وارڈ ۸ ٹھیک ہو جائے اس کا انتظام بہت خراب ہے۔ نرسیں بے پرواہی سے کام کرتی ہیں۔ انہیں مریضوں کی فکر نہیں ہے اسی لئے میں نے تمہیں وہاں بھیجا تھا مگر آج سے تم وارڈ نمبر ۱ پر چلی جاؤ۔ اور مس جوزف سے کہو کہ وہ نمبر ۸ پر کام کریں"

میڈیکل آفیسر نے مسز سلیمان کا ٹرانسفر کر دیا۔ اور مس جوزف نے نمبر ۸ کا چارج سنبھالا۔

دودھ تقسیم کرتی ہوئی مس جوزف اس مریض کے پاس پہنچیں

"تمہارا کپ کہاں ہے؟"

"مسز سلیمان کہاں ہیں؟"

"ان کا ٹرانسفر ہو چکا ہے"

"کون سے وارڈ پر؟"

"نمبر ۱"

"نرس جاؤ۔ ڈاکٹر سے کہو مجھے بھی وہاں بھیج دیں جاؤ ابھی جا کر کہو"

"اچھا میں کہہ دوں گی، دودھ تو پی لو، تم نے کل سے . . . ."

"نہیں تم پہلے کہہ آؤ، میں اس وارڈ میں رہنا نہیں چاہتا"

"ڈاکٹر صاحب ابھی نہیں آئے ہیں۔ وہ آجائیں تو کہہ دوں گی دودھ پی لو"

میں وارڈ نمبر ۱ ہی میں جا کر پیوں گا"

مریض مایوس ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ مس جوزف نے بہت سمجھایا بہتیرا سمجھایا۔ لیکن وہ نہ مانا۔

بات ڈاکٹروں تک پہنچی اور میڈیکل آفیسر کو جو خبر لگی ــــ وہ برہم ہو گیا۔

"مسٹر! یہ بزنس ادھر نہیں چلے گا۔ ہم تمہیں ڈسچارج کر دیں گے۔ تمہارا ٹرانسفر نہیں ہو سکتا۔ تم یہیں رہو گے"

میڈیکل آفیسر نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا اور میڈیکل آفیسر کو تکتا رہا جیسے وہ زندہ نہ تھا، مر چکا تھا۔

میڈیکل آفیسر چلا گیا اور مریض پھوٹ پڑا۔ بچے کی طرح اس کی سسکیاں اور لمبی لمبی سانسیں مس جوزف نے سن لیں۔ بہت دیر تک وہ اسے سمجھاتی اور مناتی رہیں اور وہ چپکا بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے جیسے گوشت پوست کا مجسمہ رو رہا ہو اور کچھ کہہ نہ سکتا ہو۔ وہ کسی سے کچھ کہنا نہ چاہتا تھا۔ وہ بار بار پوچھتا

"مسز سلیمان مجھ سے ناراض کیوں ہو گئیں، وہ میرے پاس آتی کیوں نہیں؟"

لیکن کسی نرس نے اسے یہ بتانے کی جرأت نہ کی کہ مسز سلیمان کو اس کی باتیں گراں گزریں۔ وہ اس قسم کی باتیں برداشت نہیں کر سکتیں۔

باتیں افسانہ بن گئیں۔ ڈاکٹر، نرسیں، وارڈ بوائز، باورچی کمپاؤنڈر، یہاں تک کہ مریض تک جان گئے کہ دواخانے کی ــــ ہیبت ناک فضاؤں میں ایک بدنصیب مریض کے دل سے محبت نے جنم لیا ہے۔ لیکن اسے کسی کا سہارا نہ مل سکا۔ مریض مسز سلیمان کو آتے جاتے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ ڈاکٹر ٹھٹھا کر کے ہنس پڑتے، نرسیں مسز سلیمان پر چٹکلے چست کرتیں، اور وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں۔ جلتی رہتیں۔ کبھی جی چاہتا کہ دیوت بن کر اس کمینے کا گلا دبا دیں۔ اور کبھی رحم آتا کہ اس نازک حالت میں جب کہ دق کے زہریلے جراثیم اس کے پھیپھڑوں کو کھوکھلا کر چکے ہیں اسے کیوں یہ جنون سوار ہوگا؟ ایک بار تو وہ سوچتے سوچتے آبدیدہ ہو گئیں مس جوزف سے سن کر انہیں بہت دکھ ہوتا کہ وہ مریض اچھی طرح کچھ کھاتا ہے اور نہ کچھ پیتا ہے۔ پڑا پڑا جانے کیا سوچتا رہتا ہو مسز سلیمان کے ٹرانسفر کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ذات کانی

بیت چکی تھی۔ مسز سلیمان اس رات ڈیوٹی پر تھیں۔ کسی کام کو وہ وارڈ نمبر ۲ میں آئیں اور مریض نے انہیں دیکھ لیا۔

"مسز سلیمان! نرس! نرس!"

وہ چیخ پڑا۔ مسز سلیمان تو نکل گئیں لیکن سارا وارڈ جاگ اٹھا مس جوزف گھبرا گئیں، بہت مشکل سے منا سمجھا کر مریض کو انہوں نے بستر پر لٹا دیا۔ اسے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ بے حد کمزور تھا، اتنا کمزور کہ ڈاکٹروں کو اندیشہ تھا کہ کچھ دور چل پڑے تو اس کی سانس اکھڑ جائے گی، اور پھیپھڑے ناکارہ ہو کر اس کے دل کا گلا گھونٹ دیں گے۔ وہ سو نہ سکا اور بستر پر پڑا پڑا جاگتا رہا کچھ دیر بعد سارے مریض سو گئے۔ وارڈ بوائز چلے گئے۔ مس جوزف اپنے کمرے میں جا پہنچیں اور ناول پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگیں۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاند کے سینہ سے نور برس رہا تھا۔ اور برف کی طرح دواخانے کی عمارت پر برس رہا تھا۔

دو بجے ریذیڈنٹ میڈیکل آفیسر دواخانے کا چکر لگاتا ہوا نکل گیا اور مریض نے اطمینان کا سانس لیا۔ چادر ہٹائی اور بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ پلنگ کا سہارا لئے وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا۔ اور کچھ دیر بعد دیوار کے سہارے وارڈ سے نکل گیا۔ دیواروں کے سہارے وہ لمبے چوڑے وارڈس اور برآمدوں سے گزرتا ہوا سیڑھیوں تک جا پہنچا۔ اس کی سانس بھاگتے بھاگتے تھکے ہوئے بچے کی طرح پھول رہی تھی۔ پاؤں پتلی پتلی ٹہنیوں کی طرح کانپ رہے تھے۔ وہ سنبھلتے ہوئے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اور کچھ دیر بعد وارڈ نمبر ۱ میں جا پہنچا۔ مسز سلیمان کے روم پر، اندر لائٹ جل رہی تھی اور وہ گنگنا رہی تھیں۔ مریض جھوم اٹھا۔ اس کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ اس نے لمبی سانس لی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے قدم تھم گئے۔ اس کا خون سوکھ گیا۔ وہ چور کی طرح بوکھلا گیا۔

"کون ——— ؟"

میڈیکل آفیسر گرجا۔ وہ ادھر آ نکلا تھا۔ مسز سلیمان فوراً کمرے سے نکل آئیں۔ اس مریض کو پاس کھڑا دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئیں کہ وہ اتنی دور چل کیسے سکا۔ لیکن فوراً کمرے میں واپس چلی گئیں۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" میڈیکل آفیسر گرج اٹھا۔

"مسز سلیمان۔ مسز سلیمان ....."

مریض مجرم کی طرح گھبرایا ہوا تھا۔

"کیا کام ہے ان سے تم کو؟"

"ملنا ہے۔"

"چلنے پھرنے سے تمہیں منع نہیں کیا گیا؟"

"مسز سلیمان مجھ سے ناراض ہیں۔"

"ناراض ہیں تو ...."

"ڈاکٹر صاحب! جب سے مسز سلیمان یہاں آئیں میرا دل نہیں لگتا۔ مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیوں ناراض ہو گئیں۔ ان سے مجھے کتنا آرام تھا۔ کتنی ہمدردی سے وہ بات کرتی تھیں۔ وہ بہت رحمدل ہیں۔"

مریض لڑکھڑاتے اور سانس سنبھالتے کہہ رہا تھا۔ اور میڈیکل آفیسر پریشان تھا کہ کیا کرے، اسے مریض پر رحم آ رہا تھا۔ اس کا مصنوعی غصہ کافور ہو چکا تھا۔ مریض جاگ اٹھے تھے۔ کئی نرسیں وہاں آ دھمکی تھیں اور اسے تک رہی تھیں۔ کمرے میں مسز سلیمان کھڑی ابل رہی تھیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ سینڈل اتار کر اسے اتنا ماریں کہ دم ہی نکل جائے۔

"ان کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں ڈاکٹر۔" مریض نے بہت مشکل سے کہا۔

"یہاں کیوں آئے ہو بھائی؟ کیا ان احسانات کا بدلہ چکانے آئے ہو؟"

میڈیکل آفیسر نے جھنجلا کر کہا۔ وہ اس کی سانسوں کا شمار کر رہا تھا۔

"نہیں ڈاکٹر ——— نہیں ———"

مریض کی آواز ڈوبنے لگی۔ مسز سلیمان پسینے میں ڈوب رہی تھیں۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھیں۔

"ماں کے احسانات کا بدلہ نہیں ہوتا ڈاکٹر ——— ماں

کے احسانات کا بدلہ نہیں ہوتا" مریض نے گھٹتی ہوئی آواز میں کہا اور لڑکھڑا گیا۔ مسز سلیمان تک اس کے الفاظ پانی کی لہریں بن کر پہنچے۔ وہ سرد پڑ گئیں دماغ کے افق سے گھٹائیں اڑ گئیں۔

دل کا غبار ڈوب گیا۔

"ماں ——!"

"ماں کے احسانات ——!"

وہ تڑپ کر کمرے سے نکلیں۔ مریض فرش پر گر چکا تھا اور نرسیں اسے سنبھال رہی تھیں۔ میڈیکل آفیسر اس کی نبض ٹٹول رہا تھا —— مسز سلیمان سے نہ رہا گیا —— وہ اس سے لپٹ گئیں —— اس کی ہڈیوں سے ——!

لیکن وہ سرد پڑ چکا تھا —— زندگی نے اسے موت کے ہاتھوں سونپ دیا تھا۔

مسز سلیمان تڑپ اٹھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے کھوکھلے پھیپھڑے ہزاروں زہریلے جراثیم سے بھرے پڑے ہیں، انھوں نے اسے کئی بار چوم لیا۔ —— جھنجھوڑ دیا —— ان کے گرم گرم آنسو اس کے زرد، پچکے ہوئے گالوں پر بہہ نکلے —— لیکن وہ اسے زندہ نہ کر سکیں!

نرسوں نے انھیں بہت مشکل سے سنبھالا ——

میڈیکل آفیسر نے اپنے آنسو رومال میں چھپا لئے ——

اپنی تیس سال کی سروس میں پہلی بار کسی مریض کی موت پر اس کے آنسو بہہ نکلے تھے ——!

(بشکریہ "بیسویں صدی")

نعمان ●

ایک خط

(ماہنامہ عفت" لاہور کے "سالگرہ نمبر" پر محترمہ صابرہ شیریں صاحبہ نے تبصرہ کرتے ہوئے محترمہ نعمان صاحبہ کے افسانے "فرشتہ" کے متعلق لکھا تھا کہ یہ افسانہ ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کے مشہور ناول "پتھر سے ہیرا" کی تلخیص ہے، جس کا حوالہ دینا ضروری تھا۔ اس سلسلہ میں محترمہ نعمان کا ایک وضاحتی خط موصول ہوا ہے جسے ہم یہاں شائع کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ اس وضاحت کے بعد کسی مزید وضاحت کی ضرورت نہ ہوگی۔ ایڈیٹر)

محترم بھائی! سلام مسنون

"مشیر" میں "عفت" پر تبصرہ کرتے ہوئے ص۔ش۔ صاحبہ کو افسانہ "فرشتہ" کے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے، اسکے ازالہ کیلئے یہ چند سطور اُن کی خدمت میں گوش گزار کرنا مطلوب ہیں۔ اگر آپ "مشیر" کی اس اشاعت میں ص۔ش۔ صاحبہ کے نام اس خط کو بھی شائع کر دیں تو نہایت مہربانی ہوگی۔

والسلام نعمان (لاہور)

ص۔ش۔ صاحبہ کے نام:-

محترمہ! سلام مسنون

"عفت" کے سالنامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک افسانہ بعنوان "فرشتہ" پر آپنے جو اعتراض کیا ہے، اسکے جواب میں عرض ہے کہ جہاں تک اس افسانے کے مرکزی تخیل کا تعلق ہے، اس میں شک نہیں کہ اسکے مفید اصلاحی ہونے کی بنا پر مذکورہ ناول سے ہی اپنایا گیا تھا جس کا حوالہ بھی افسانہ میں دیدیا گیا تھا۔ اگر آپنے افسانے کو بغور پڑھا ہوتا یا اب دوبارہ پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو اس بیان کی تصدیق میں سالنامہ کے صفحہ ۱۳۰، پہلے کالم کی آخری سطور ملاحظہ کر سکتی ہیں جن سے یہ بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ افسانے میں پیش کردہ کردار کی اصلاح جس ترکیب و طریق سے کی گئی ہے وہ پیش کرنیوالے کے اپنے ذہن کی اپج نہیں۔ افسانہ اگر ناول سے کہیں ٹکراتا ہے تو اسی سنگم پر؛ ورنہ ان دونوں میں کوئی مطابقت نہیں۔ لیکن اب جو آپ یہ اعتراض کریں کہ حوالہ افسانے کے آغاز میں ہی واضح طور پر کیوں نہیں دیا گیا؟ تو عرض ہے کہ ایک تو چونکہ مرکزی خیال ہی اپنایا گیا تھا جسے ایک ایسے ڈھانچے میں سمو دیا گیا تھا جو اصل ناول سے قطعاً مَس نہیں کرتا تھا۔ مگر ادارہ "عفت" نے نہ معلوم کیوں افسانے میں اس حد تک قطع و برید کر کے شائع کیا کہ وہ ایک مختلف صورت کا ہی بن کر رہ گیا۔ علاوہ ازیں آپ مانیں نہ مانیں لیکن ہے یہ حقیقت ہی کہ "پتھر سے ہیرا" ناول کو پڑھنے کا آج تک مجھے ایک بار بھی اتفاق نہیں ہوا ہے۔ البتہ اب سے کوئی آٹھ دس سال قبل کسی نے اس ناول کی تعریف کرتے ہوئے مختصر طور پر اسٹوری سنائی تھی۔ قصہ چونکہ نہایت موثر تھا، لہٰذا اس کا نقش ذہن میں باقی رہ گیا۔ اُسی پر اس افسانے کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ ایسی صورت میں اسے تلخیص کہنا ——— یا "تلخیص" ہونے کا حوالہ دینا میرے خیال میں کچھ درست نہیں۔

والسلام نعمان



ماہنامہ

مشیر

کراچی

پاکیزہ ادب کا ڈائجسٹ

قیمت آٹھ آنے

فروری ۱۹۵۷ء

THE MUSHIR KARACHI

اصلاحی ادب کا ڈائجسٹ

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

فون نمبر ۷۹۲۳

جلد : ۸

شمارہ : ۲

فروری سنہ ۱۹۵۷ء

مرتبہ

عبدالغفور بیگ

فی پرچہ : آٹھ آنے

سالانہ : پانچ روپے

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ :

پندرہ روزہ "الحسنات" رامپور (یوپی) بھارت

ترتیب

فلسفۂ حیات (اقبال کی نظر میں)	اسد الحق شیدائی	۳
اے خطۂ کشمیر	ک - ا	۴
ساتھیو	منظر اعظمی	۷
آج کا ادب اور اسلام	اصغر علی عابدی	۸
غزل	جگن ناتھ آزاد	۱۶
غزل	شاکر عروجی	۱۶
شذری	غازی صلاح الدین	۱۷
اندھیرے اجالے	عارف عبدالمتین	۲۴
غزل	درد سعیدی	۲۵
غزل	حبیب کیفوی	۲۵
دیوان ذوق، مرتبہ آزاد	نظر خورجوی	۲۶
ابھی سویرا نہیں ہوا ہے	فضا ابن فیضی	۳۰
دو غزلیں	افتخار اعظمی	۳۲
چاچا	علی احمد شاہدی	۳۳
غزل	محسن بھوپالی	۴۰
غزل	رئیس باغی	۴۰
ترانۂ مسلم	راغب مرادآبادی	۴۱
آخری دن	حمید اللہ صدیقی	۴۲
غزل	عالم اکبرآبادی	۴۷
غزل	شبی فاروقی	۴۷
آج	صبا جائسی	۴۸
تسلی	صبا جائسی	۴۸
کارروائی ڈرائنگ یادگار تنظیم		۵۰

پرنٹر و پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ التصویر پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ، کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔ کاتب عابد حمید

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

فلسفۂ حیات

(اقبال کی نظر میں)

حیات در اصل ایک آگے بڑھنے والی اور کائنات کو اپنے اندر جذب کر لینے والی حرکت کا نام ہے، زندگی نام ہے حرکت کا، ذوقِ نمود کا مسلسل کش مکش کا، زندگی کی بقا و ارتقا کا راز عملِ پیہم اور سعیٔ ناتمام میں پنہاں ہے۔ زندگی کی لذت سوزِ ناتمامی اور راہ پیمائی میں ہی ملتی ہے' زندگی کا مسافر جب ذوقِ سفر سے آشنا ہو جاتا ہے تو وہ پھر اپنی کمر کسی جگہ نہیں کھولتا، راہ کی دل فریبیاں' اور دلکشیاں اسے روک کر پابندِ مقام نہیں کر سکتیں۔ وہ ہر پھول کی خوشبو سونگھتا، ہر چشمے کا پانی پیتا اور ہر دلچسپ منظر پر نگاہیں ڈالتا آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے' راستے کے گڑھے کو ہموار کرتا، چٹیل میدانوں میں آبِ شیریں کے چشمے بہاتا اور جنگلوں کو رشکِ جناں بناتا جاتا ہے، ایک دور کا نصب العین اس کے سامنے ہوتا ہے' وہ جتنا اس کے قریب پہونچتا ہے' اتنا ہی وہ اس سے دور ہو کر اس کے ذوقِ سفر کو تیز کرتا رہتا ہے ؎

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی

یعنی دورانِ سفر میں اس کو مختلف منزلیں ملتی ہیں بلکہ ہر منزل کو ایک نئی منزل کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس راز سے بخوبی آشنا ہے کہ جمود و تعطل اور قیام و آرام موت کا دوسرا نام ہے۔ اس کا تمام سکون اور اس کی تمام راحت' اس کی مسلسل حرکت' اور پیہم عمل میں ہے' اور اس کی منزل قطعِ مراحل ہی میں ملتی ہے۔ وہ جب تک چل رہا ہے' مر نہیں سکتا' وہ مر کر بھی زندہ رہتا ہے اور اس کی خاک سے ہزاروں زندگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

لہٰذا ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حیات سعیٔ مسلسل اور کوششِ ناتمام کا نام ہے' اور موت سکون و جمود اور تعطل میں پوشیدہ ہے ؎

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

اب ذرا اس حقیقت پر نظرِ عمیق ڈالئے کہ جفا طلبی اور سخت کوشی کا مادّہ ہم میں کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے، کہ جفا طلبی اور سخت کوشی کا مادّہ ہم میں قوت و طاقت اور تاب و توانائی کے وجود سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم میں قوت و شوکت نہ ہو تو ہم خاکِ آلام و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں گے۔ لہٰذا قوت و شوکت سے ہم میں جفا طلبی اور صعوبتوں کے جھیلنے کا مادہ پیدا ہوا' اور اسی سخت کوشی کا دوسرا نام ہے زندگی یا حیات۔ جیسا کہ اصغر گونڈوی کہتے ہیں ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے اگر آسانیاں ہوں' زندگی دشوار ہو جائے

کمزوری اور بزدلی کا دوسرا نام موت ہے' جیسا کہ ایک انگریز اہلِ قلم لکھتا ہے:

"LIFE IS ALL BATTLE AND WEAKNESS IS DEATH."

اور اسی لئے اقبال کو کہنا پڑا ؎

نہ فقر کے لئے موزوں' نہ سلطنت کے لئے وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری

طاقت اور تہذیب کا اگر مقابلہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ تہذیب کسی طاقت پر غالب نہیں آئی بلکہ طاقت جہاں جہاں گئی وہاں کی تہذیب کو اس نے خس و خاشاک بنا کر ہواؤں کے دوش پر اڑا دیا۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب کی محافظ و نگہبان طاقت ہے۔ مثلاً مغلیہ خاندان کے بادشاہوں میں جب تک قوت و شوکت باقی رہی ان کی تہذیب باقی و قائم رہی لیکن جب ان میں قوت و شوکت کا فقدان ہو گیا، جب وہ چنگ و رباب کے تلاطمِ نغمات اور شراب و شعر کے پیمانوں کی جھنکاروں میں غرق ہو گئے اور جب ان کی حالت یہ ہو گئی کہ ع

سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کر

تو وہ خود ہی نیست و نابود ہو گئے اور ان کی عروسِ تہذیب نے بھی چند ہچکیوں کے ساتھ دم توڑ دیا۔ اسی لئے تو اقبال کہتے ہیں ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

ایک اور شعر ہے ؎

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

بلکہ اقبال تو اس مذہب اور نبوّت کو بھی ایک برگِ حشیش سے تعبیر کرتے ہیں جس میں قوت و شوکت کا پیام نہیں ؎

وہ نبوّت بھی ہے امّت کیلئے برگِ حشیش
جس نبوّت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

اپنی نظم "جلال و جمال" میں وہ فلاطون کی تیزیٔ ادراک پر زورِ حیدری کو ترجیح دیتے ہیں اور جمال و زیبائی کا مفہوم ان کی نظر میں یہی ہے کہ قوت کے سامنے افلاک سر بسجدہ ہوں ؎

میرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہوں قوت کے سامنے افلاک

اور اپنی سزا کے لئے وہ اس آگ کو بھی قبول نہیں کرتے جس کا شعلہ تند و سرکش و بیباک نہ ہو ؎

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

یہ دنیا "جہدِ بقا" ہے، یہاں کچھ چیزیں کھانے کے لئے پیدا ہوئی ہیں اور کچھ کھائے جانے کے لئے یعنی یہاں جو طاقت ور ہیں وہ کمزوروں کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور جو ان سے بھی زیادہ قوت و توانائی کے مالک ہیں وہ انھیں بھی اپنے وجود سے ہم آغوش کر لیتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ وسیع تر اور وسیع تر سے وسیع ترین ہوتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ زندگی نام ہے قوت و شوکت کا اور موت ضعیفی کو کہتے ہیں۔ یہ حقیقت دونوں صورتوں میں یکساں طور پر ثابت ہوتی ہے چاہے وہ صورت انفرادی ہو یا اجتماعی ؎

یہ زور دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

اسد الحق شیدائی

●

ک۔ا۔

اے خطۂ کشمیر!

اے خطۂ کشمیر! غم و یاس کی تصویر
اے کشتۂ آلام اے دلگیر، اے نخچیر
پامالِ ستم، مشقِ جفا، بستۂ زنجیر
صد حیف ابھی تک ہے لٹیروں کی تو جاگیر
اے خطۂ کشمیر!

★

اُف جنتِ ارضی میں بھڑکتے ہیں شرارے
افسوس لٹیرے یہاں بھرتے ہیں طرارے
باعالِ تبہ پھرتے ہیں جمہور بچارے
ہر فرد کے سر پر ہے تنا خنجرِ تعزیر
اے خطۂ کشمیر!

★

لالی سی زمیں پر ہے شہیدوں کے لہو سے
ہر ذرّہ ترا تر ہے شہیدوں کے لہو سے
رنگین ہر اک گھر ہے شہیدوں کے لہو سے
آشاؤں کے نینوں سے بہے کیوں نہ بلا نیر
اے خطۂ کشمیر!

★

اے نہرو ذی ہوش ارے او صاحبِ تدبیر!
رہوارِ سیاست کے او مشّاق عناں گیر
پیشانیٔ کشمیر پہ یہ خون کی تحریر
معلوم بھی ہے کس کی جفاؤں کی ہے تشہیر!!
اے خطۂ کشمیر!

★

آسان سہی وعدہ و پیماں کا بھلانا
اخلاق و شرافت کی ہر اک شان گنوانا
آسان سہی عظمتِ انساں کا مٹانا
آساں پہ مٹانا تو نہیں ہے خطِ تقدیر
اے خطۂ کشمیر!

★

بربادیٔ عالم کا نمایاں ہے قرینہ
گردابِ سیاست میں ہے بھارت کا سفینہ
آیا ہے جواہر کے بھی چہرے پہ پسینہ
اب سامنے آئی ہے وہ ناکامیٔ تدبیر
اے خطۂ کشمیر!

★

اب یونہی سہی اور بھی طوفان اٹھاؤ
کچھ اور بھی برگیڈیر عثمان بلاؤ
کچھ اور یزیدانِ ستم راں کو جگاؤ
بیدار جوانوں میں ہے پھر جرأتِ شبیرؓ
اے خطۂ کشمیر!

★

وہ وادیٔ گلمرگ کا رنگین نظارا
ولر کی حسیں جھیل حسیں ڈل کا کنارا
کشمیر کا ہر چپہ ہمارا ہے ہمارا
واپس تجھے ہم لیں گے بہ از جوہرِ شمشیر
اے خطۂ کشمیر!

★

کیا غم کہ، اُٹھے پھر وہ ترے چاہنے والے
جانباز و جوانمرد و جواں عزم جیالے
آزادیٔ ملت کے نشاں کو وہ سنبھالے
دنیا میں بڑھائیں گے تری عظمت و توقیر
اے خطۂ کشمیر!

★

پھر فوجِ ظفر بن کے چلے تیرے سپاہی
با عزمِ جہانگیری و با شعلہ نگاہی
ہر گام میں اعدا کے لئے سیلِ تباہی
تھرائی زمیں گونج اٹھا نعرۂ تکبیر
اے خطۂ کشمیر!

★

کیا شانِ جنوں لیکے بڑھے ترے دوانے
دھبّہ ترے دامن سے غلامی کا چھڑانے
پھر خونِ جگر سے وہ ترا دیپ جلانے
پھیلے گی ترے حسن کی پھر چادرِ تنویر
اے خطۂ کشمیر!

★

دیوانے اٹھے ہیں تجھے آزاد کریں گے
تیرے دلِ ناشاد کو پھر شاد کریں گے
بربادِ چمن کو ترے آباد کریں گے
پنہاں تری تخریب میں ہے جوہرِ تعمیر
اے خطۂ کشمیر!

★

ہم عزم کے پورے ہیں تو ہٹ کے دھنی بھی
جیدار بھی ہیں، ماہرِ شمشیر زنی بھی
آتی ہے بہر طور ہمیں کوہ کنی بھی
پھیلائے نہ بخشی سے کہو حلقۂ تزویر*
اے خطۂ کشمیر!

★

اُلجھی وہ مجاہد کی نظر رقصِ شرر سے
ٹپکا وہ لہو اور کسی دیدۂ تر سے
لو اور بھی نزدیک ہوئی آہ اثر سے
نکلی، یہ ترے خوابِ سحر کی حسیں تعبیر
اے خطۂ کشمیر!

★

محروم و سائل نے وہ تلوار سنبھالی
ہر زخمی و گھائل نے وہ تلوار سنبھالی
شیرانِ قبائل نے وہ تلوار سنبھالی
اب کٹ کے رہیگی یہ ترے پاؤں کی زنجیر
اے خطۂ کشمیر!

★

* سری نگر اسمبلی کا نام نہاد مجوزہ دستور جس کے ذریعہ بخشی نے کشمیر کو ہندوستان میں ضم کرنے کی سازش کر رکھی ہے (ک۔ا)

منظر اعظمی

ساتھیو!

بڑی گھنی ہے سیاہی یقیں کی شمع جلاؤ
توہمات کے پردے ابھی مزید اٹھاؤ
شبِ حیات کہاں بے نیازِ جہدِ سحر
عمل کے نغمے الاپو، قدم کو تیز بڑھاؤ

ستارے ڈوب تو جائیں سحر کا رنگ بھی لاؤ
سموم ختم تو ہولے، صبا کے ڈھنگ دکھاؤ

ابھی دماغوں کی وہم و گمان سے بنتی ہے
ابھی نگاہوں سے کم مائگی نتھرتی ہے
ابھی دلوں میں قیاسات رقص فرما ہیں
حقیقتوں سے فسانوں کی روح جلتی ہے

تصورِ وہم و گماں میں خرد کی شمع جلاؤ
نئی حیات کی ہر سو تجلیاں برساؤ

خیال و فکر کے دامن پہ داغ اب بھی ہیں
خزاں پسند حضورانِ باغ اب بھی ہیں
دل و دماغ کی آبادیوں میں رقص کناں
قیاس و وہم کے بوم اور زاغ اب بھی ہیں

بجھی بجھی سی نگاہوں میں حق کا جادو جگاؤ
عروسِ زیست ابھی اور ابھی اور سجاؤ

سمٹ ہی جائیں گی زلفیں مہیب شاموں کی
بساط لُٹے گی تاریک تر نظاموں کی
سحر حیات کی تابانیاں لٹائے گی!
رہیں گی سازشیں دانوں کی اور نہ داموں کی

سناؤ مژدہ تہی مایہ شب زدوں کو سناؤ
ستارے ڈوب رہیں گے سحر کی مانگ سجاؤ

(بشکریہ "دعوت")

اصغر علی عابدی ●

آج کا ادب اور اسلام

اگر ہم اسلامی نظام حیات کا تفصیلی مطالعہ کریں اور اس عظیم عمارت کو دیکھیں جس میں زندگی کی ہر احتیاج کی تکمیل کا سامان موجود ہو تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ صرف اسلام ہی انسانی قدروں کا محافظ ہے — صرف اسلام ہی انہیں پروان چڑھاتا ہے اور صرف اسلام ہی ان کی صحیح تعبیر کرتا ہے۔ جب بھی دنیا میں اسلام آیا ہے اس نے ان قدروں کی آبیاری کی ہے۔ انھیں آگے بڑھایا ہے۔ اور انہیں قائم کیا ہے اس نے ایسے کردار پیش کئے ہیں اور ایسا سماج بنایا ہے جس پر انسان بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ یہ ایک بھاری غلطی ہے کہ "اسلام" کا آغاز محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا ہے۔ اور اس سے بھی بھاری غلطی یہ ہے کہ "اسلام" مسلمان کہلانے والی ایک قوم کا دھرم ہے۔ "اسلام" دراصل ایک مستقل تاریخی حقیقت ہے۔ جو انسان کے ساتھ ساتھ ہر زمانے اور ہر دور میں موجود رہی ہے۔ اسلام کسی خاص طبقہ، قوم یا گروہ کا دھرم اور مذہب نہیں۔ اسلام ایک عظیم آئیڈیالوجی، ایک مکمل نظام اور جامع تہذیب ہے۔ جس میں ہر انسان کے لئے گنجائش ہے۔ آنحضرتؐ یقیناً وہ آخری نقیب ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اسلامی تحریک کو مکمل کیا اور اس کی صحیح اور مستند شکل پیش کی۔ لیکن جس طرح آنحضرتؐ نے یہ دعوت دی اسی طرح تاریخ کے ہر دور میں اور ہر زمانے میں انسانی زندگی کی ابدی قدروں کو اجاگر کرنے اور انھیں پروان چڑھانے کے لئے خدا کے بھیجے ہوئے برگزیدہ بندے آتے رہے قرآن کہتا ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا
اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی عبادت (اطاعت) کرو اور طاغوت (خدا کی باغی طاقتوں) کی اطاعت سے پرہیز کرو۔

اس لئے یہ پیغام جب بھی بر سر کار آیا اس نے زندگی کی رکے ہوئے پانی میں ہلچل مچا دی۔ اور ایسے چشمے ابل پڑے جن سے انسانیت سر سبز و شاداب ہو گئی۔ زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو میں ایک خوشگوار انقلاب آگیا۔ یہ پیغام جس ادب کے ذریعہ آیا اس نے وقت کے ادبی دھاروں کا رخ ایک نئی سمت موڑ دیا وہ مستقل کے لئے ایک سنگ میل بن گیا۔ اس کی دی ہوئی تعبیر پر ادب نے نئے انداز پر ایک نئی عمارت تعمیر کی جو اس وقت تک پرانی نہیں ہوئی۔ جب تک یہ پیغام بھلا نہیں دیا گیا۔ لیکن جب ہی انداز کا دوسرا پیغام آیا تو ابدی قدروں کی پھر تجدید ہوئی اگر ہم تاریخ کی سرزمین پر بکھرے وسیع انسانی سماج کو الگ الگ ادوار کے خطوں میں کاٹ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان چمنستانوں میں جب بھی کوئی پھول کھلا تو اس کو گدگدانے والا جذبہ اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہٗ[1] (اللہ کی بندگی کرو جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں) ہی رہا ہے۔ اسی جذبہ نے انسان کو اپنی فطرت کی حفاظت کا گر سکھایا اور اسی نے ایک اعلیٰ درجہ کا تعمیری ادب تخلیق کیا۔ خود ہمارے ملک بھارت کے ویدک دور کی کتاب "پنچ تنتر"[2] "حکمت و دانش" کی ایسی کہانیوں سے لبریز ہے جس میں انسان دوستی، خدا پرستی، اور آخرت پسندی کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ کوئی الہامی کتاب نہیں لیکن اس کی کہانیاں ایسے ماحول میں بنی ہیں جو خدا پرستانہ حکمت کا مرہون منت ہے۔ ایک کہانی "دوستوں کی جدائی" (THE LOSS OF FRIENDS.) میں ایک کوا کہتا ہے :—

"زندگی میں سب سے زیادہ مسرت ان کو حاصل ہوتی ہے۔
جو محبت کرنیوالے دوستوں میں رہتے ہیں جہاں خوشی اگتی
ہے اور مسرت پروان چڑھتی ہے"

ایک اور جگہ وہ کہتا ہے:—

---

[1] معبود سے مراد۔ حاکم، فرمانروا، التجا کی سننے والا، اور وہ جس کی پرستش کی جاتی ہے۔
[2] یہ وہی کتاب جو فارسی میں "انوار سہیلی" کے نام سے مشہور ہے اور عربی میں مقفع کی کلیلہ و دمنہ اس کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔

"اگر اچھے دماغ برائی اور بھلائی میں تمیز نہ سکھاتے۔
اگر مذہب خواہش پرستی کے خلاف نہ اکساتا اور۔
صرف ہوا وہوس ہی مادی فذاؤں کے لوٹ پڑنے کے
لئے موجود رہتے تو ایسے حیوان نما انسانوں اور حیوانوں
میں فرق کس طرح ہوتا ـــــــ"

"پنچ تنتر" انسان کی کم نظری اور مشاہدے کی غلطی پر یوں ٹوکتا ہے:۔
"جگنو آگ کی چنگاری معلوم ہوتا ہے اور آسمان ایک ہموار میدان۔ حالانکہ نہ جگنو ایسا ہے ـــــــ اور نہ آسمان ویسا"
مہابھارت میں "گیتا" جیسا ہدایت نامہ ہے۔ جس میں نصیحت کی ایسی باتیں ہیں جن کا تعلق اکثر مقامات پر ان "قدروں" سے جوڑا جا سکتا ہے جو انسانیت کا دائمی ورثہ ہیں! ـــــــ کرشن جی ایک موقع پر ارجن سے کہتے ہیں:۔

"غذا بارش سے پیدا ہوتی ہے۔ بارش قربانی کا
نتیجہ ہے۔ اور عمل کی حقیقت ویدوں سے معلوم
ہو سکتی ہے"
اور ویدھی دقیوم (خدا) کے پاس سے آتے ہیں"[۱]

عمل کی قدر متعین کرنے کے لئے خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت پر زور دینا ہر زمانے کے الہامی ادب کی خصوصیت رہی ہے۔ بائیبل حضرت مسیح کے فرمودات کا ایک شاہکار ہے تمثیل، استعارہ اور تشبیہہ کو جو بلندی بائیبل نے عطا کی ہے۔ وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ایک موقع پر انمل اور بے جوڑ کاموں کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

"کورے کپڑے کا پیوند پرانی پوشاک پر کوئی نہیں لگاتا
نہیں تو وہ پیوند اس پوشاک میں سے کچھ اور کھینچ لے
گا......... اور نئی مے کو پرانی مشکوں میں کوئی
نہیں بھرتا۔ نہیں تو مشکیں مے سے پھٹ جائیں گی
اور مے اور مشکیں دونوں برباد ہو جائیں گی۔ بلکہ نئی
مے کو نئی مشکوں میں بھرتے ہیں"[۲]

دوسری جگہ انسانوں کو آخرت کی دائمی نعمتوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے مسیح کہتے ہیں:۔

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور
زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور
چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ
کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب
لگاتے اور چراتے ہیں"[۳]

سماج کو جنسی بے راہ روی کی غلاظتوں سے پاک دیکھنا بھی الہامی ادب کا ہمیشہ سے خاصہ ہے۔ حضرت مسیح کہتے ہیں:۔

"بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ پس اگر تیری آنکھ درست ہو تو
تیرا سارا بدن روشن ہوگا اور اگر تیری آنکھ خراب ہو
تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو
تجھ میں ہے تاریکی ہو تو تاریکی کیسی بڑی ہوگی"[۴]

یہاں آنکھ کی خرابی کو جسم کی تمام خرابیوں کی جڑ بنایا گیا ہو۔ کون ہے جو حکمت و دانش کے ان موتیوں کو لینے سے انکار کردے۔ حضرت مسیح کی شیریں بیانی میں اعلیٰ مقصدیت اور اعلیٰ ادبیت اس قدر گھلی ملی ہو کہ ان میں سے کسی کو بھی الگ نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ یہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہے کہ اعلیٰ ادبیت ہمیشہ اعلیٰ مقصدیت کی مرہون منت رہی ہے اور اعلیٰ مقصدیت کا سرچشمہ صرف وہ ادب ہو جو خدا کے برگزیدہ بندوں نے انسانی سماج کے وسیع چمنستان میں ہر اس موقع پر پیش کیا ہے جب اس باغ میں بہار کا کوئی پھول کھلا۔ جب زندگی کی کلی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے۔ لہٰذا تاریخ کی ایسی شہادت کو رد کرنا ان لوگوں کے لئے بھی مشکل ہے جو اسے ہر آن اور ہر لمحہ بدلتا ہوا فرض کر لیتے ہیں! ـــــــ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ ہر دفعہ جب بہار آئی تو وہ دائم و قائم نہیں رہی بلکہ کچھ دنوں کے بعد انسان کی غفلت سے بہار کا موسم گذر گیا اور پھر ان جنگلی پودوں کے سوکھے ڈنٹھل نمایاں ہوگئے جو نیچے دب گئے تھے اب ان کے پھلنے پھولنے کا وقت تھا۔ لوگوں نے خیال کیا شاید یہ بھی اسی بہار کا حصہ ہیں چنانچہ کچھ مکار آدمیوں نے سوکھے اور گلے سڑے پودوں کے ساتھ آکھ اور دھتورے کو شامل کر کے پیش کیا تو اس سے اور زیادہ دھوکا ہوا لیکن پھر بہار آئی تو ساری حقیقت کھل گئی

THE BHRGKAD GITA GITA PRESS GORAKHPUR.
[۱] [۲] مرقس ۲-۲۱-۲۲ [۳] متی ۶-۱۹-۰ [۴] متی ۶-۲۲-۲۳-۲۴

آنحضرت صلعم کے عہد میں اسلامی آئیڈیالوجی کی تجدید ہوئی آپ نے ایک معجزنما کلام کے ذریعہ سارے عرب کو چیلنج کیا۔ اس عرب کو جو اپنے سوا دوسروں کو گونگا سمجھتا تھا لیکن یہی عرب اس چیلنج کے آگے خود گونگا بن گیا۔ قرآن نے نہ صرف زندگی کی عام قدروں کی حفاظت کے اصول بتائے بلکہ آگے بڑھ کر زندگی کے ایک ایک گوشے اور پہلو کو سنوارا اس نے جاہلی شعراء کے بارے میں کہا۔

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

ترجمہ:۔ اور شاعروں کی بات پر چلیں وہ جو بے راہ ہیں
کیا تم نے دیکھا نہیں، وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے
ہیں ـــــ اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو نہیں کرتے ہیں
ہاں؛ مگر وہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح
کو اختیار کیا۔

ادب میں شاعری کی صنف ہی ایسی ہے جس میں فن کی خاطر مقصد بار بار مجروح ہوتا ہے اور ایک خاص وزن ردیف قافیہ اور محاورے کی خاطر شاعر فکر و خیال کی ہر وادی میں بھٹکنا گوارہ کر لیتا ہے۔ چنانچہ شاعری جہاں سب سے اونچا فن پیش کر سکتی ہے وہیں سب سے زیادہ پوچ خیالات کے لئے بھی اس میں گنجائش موجود ہے۔ اسی لئے قرآن نے شاعری کو رہنمائی کے منصب سے ہٹا دیا۔ پھر اس کی بنیادی خامی "فی کل واد یہیمون" بتائی شاعروں کے کرداروں پر تنقید کی۔ اور ایک اساسی اصول "ایمان باللہ" اور "عمل صالح" کا تعین کیا مگر ہمیں آج تک اس کے ظاہری ڈھانچے کا تذکرہ ہی ہوتا رہا ہے۔ ان شعر کی جتنی خصوصیات گنائی جاتی ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شعر کی ظاہری بناوٹ (STRUCTURE) سے ہے۔ اس کی قدروں (VALUES) کا ذکر ابھی ابھی چھڑا ہے۔ اسلام نے شعر کی اساس ایمانیات اور کردار پر رکھی ہے۔ وہ شعر کو اعتقاد۔ نظریہ حیات اور تصور کائنات کے تحت رکھنا چاہتا ہے اور اس کے مواد کو خیالی اور ناقابل عمل کے بجائے حقیقی اور قابل عمل دیکھنا چاہتا ہے وہ شعر کو عملی جدوجہد کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ فن شعر پر سوچنے والوں کے لئے یہ ایک نیا موضوع ہے۔ اور سخن گویوں اور سخن سازوں کے لئے ایک نیا معیار فن!

ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عرب جاہلیت کے مشہور شاعر امراء القیس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا "اشعر الشعراء وقائدھم الی النار" (یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے لیکن جہنم کے راستے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں:۔

"اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کون سی باتیں ہیں جنہوں نے ـــــ حضور سرور کائنات صلعم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شراب ارغوانی کے دور عشق و حسن کی ہوشربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں، سنسان رتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دور جاہلیت کی کل تخیلی کائنات ہے۔ امراء القیس قوت ارادی کو جنبش میں لانے کے بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنون لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن کچھ ضروری نہیں کہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کے بجائے اسفل السافلین کا تماشہ دکھائے۔"

قرآن میں سورۂ یوسف کو احسن القصص کہا گیا ہے جس سے قصہ کا تصور ہی بدل جاتا ہے۔ سورۂ یوسف ایک تاریخی حقیقت اور ایک نصیحت اور ذکر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک مثالی اور مقصدی کہانی ہے۔ جس سے کہانی کے فن پر ایک زبردست اثر پڑتا ہے خود آنحضرت صلعم نے ایسی مقصدی کہانیاں کہی ہیں جو انسانی جذبات پر ایک خاص اثر ڈالتی ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ:۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا

کہ تم سے پہلے تین آدمی کہیں روانہ ہوئے راستہ میں شام ہو گئی انھوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ جب اس میں داخل ہوئے تو پتھر گر پڑا اور غار کا منہ بند ہو گیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ اس پتھر سے کوئی نجات نہیں دے سکتا ہاں یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی عمل کی یاد دلاتے ہوئے پکارو۔ تو ان میں سے ایک نے کہا۔

"اے اللہ تعالیٰ میرے ماں باپ بوڑھے تھے اور میں ان سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو دودھ نہیں پلاتا تھا۔ ایک دن میں چارے کی فکر میں دور تک چلا گیا اور راہ میں مجھ کو شام ہو گئی۔ جب گھر پلٹا تو ان کو سوتا پایا۔ میں نے برا سمجھا کہ ان کو بے آرام کروں یا ان سے پہلے بیوی بچوں کو دودھ پلاؤں۔ پیالہ میرے ہاتھ میں تھا اور میں ان کے جاگنے کے انتظار میں رہا۔ یہاں تک کہ صبح نمودار ہو گئی اور بچے میرے پاؤں پر لوٹ رہے تھے میں نے ان کو دودھ پلایا۔ اے اللہ اگر یہ کام میں نے تیری خوشی کے لئے کیا ہے تو اس پتھر کو ہم سے دور کر پس تھوڑا سا پتھر ہٹ گیا!"

دوسرے نے کہا: "اے اللہ تعالیٰ میری ایک چچازاد بہن تھی وہ مجھ کو بہت محبوب تھی۔ ایک دن میں نے بلایا اس نے انکار کیا۔ یہاں تک کہ قحط سے پریشان ہو کر وہ میرے پاس آئی۔ میں نے اس کو ایک سو بیس دینار اس شرط پر دیئے کہ وہ مجھ سے تخلیہ میں ملے وہ راضی ہو گئی، جب میں نے ارادہ کیا تو اس نے کہا ——— اللہ سے ڈر، میں یہ سن کر باز رہا، حالانکہ وہ مجھے انتہائی محبوب تھی، پھر میں نے اس سے روپیہ بھی واپس نہ لیا ——— اے اللہ! اگر میں نے یہ کام تیری رضا کی خواہش میں کیا ہے تو ہمیں اس مصیبت سے رہائی عطا فرما" ——— تو پتھر کھسک گیا مگر اتنا کہ نکل، نہیں سکے۔

تیسرے نے کہا ——— "اے اللہ میں نے کچھ مزدور کام کے لئے بلائے اور ان کو پوری مزدوری دی، سوائے ایک آدمی کے کہ وہ چلا گیا تھا۔ میں نے اس کی مزدوری سے تجارت کی، کچھ عرصہ میں تجارت خوب نفع لائی۔ ایک دن وہ آیا اور کہا ——— اللہ کے بندے میری مزدوری دے، میں نے کہا یہ جتنی چیزیں دیکھ رہے ہو۔ اونٹ گائے، بکری، غلام سب تمہارے ہیں اور تمہاری مزدوری سے" کہا: "کیوں مجھ سے مذاق کرتے ہو" میں نے کہا: "میں مذاق نہیں کرتا یہ حقیقت ہے" وہ سب لیکر چلا گیا۔ اے اللہ اگر میری یہ بات تجھے پسند آئی ہو تو ہم کو اس تنگی سے نجات عطا فرما" پس وہ پتھر ہٹ گیا اور سب نکل گئے۔ ۵

اس حدیث میں ایک کہانی کی تمام خصوصیات موجود ہیں اور مقصدیت اس کے ایک ایک لفظ میں سموئی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل سچا واقعہ ہو لیکن جدید فن کے لحاظ سے یہ پھر بھی ایک کہانی ہے۔ اس میں کامل زندگی، معاملات اور اختیارات پر خدا پرستانہ تصور کے اثر کو دکھایا گیا ہے۔ قرآن کریم اور حدیث نبوی سے ادب انسانی کی تاریخ میں پھر ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے انھوں نے ادب کے ان تمام دھاروں کو جو توہم، تصنع اور آرٹ کے تخریبی نظریات یا قدروں کی تخریبی تعبیرات کی سمت بہہ رہے تھے یکسر موڑ دیا۔ اس انقلاب کے اثر سے نہ صرف سارا عرب اور وہ تمام علاقے متاثر ہوئے جہاں "اسلام" براہ راست پہنچا۔ بلکہ دنیا کے وہ تمام خطے جن پر ان حقیقت پسندانہ قدروں کا محض سایہ ہی پڑ گیا ایک نئے رخ کی طرف چل پڑے اور آج تک چلے جا رہے ہیں۔ یورپ میں نشاۃ جدیدہ (RAN-AISANCE) کے بعد حقیقت پسندی (REALISM) کا عروج انھیں قدروں کا مرہون منت ہے۔ اس کے بعد مستقبل پسندی (FUTURISM.) اور جدیدیت (MODERNISM) اور ترقی پسندی کا عہد آتا ہے یہ سب تحول اسی ذہنی اور فکری انقلاب کے خوشہ چیں ہیں جو اسپین کے راستہ یورپ میں داخل ہوا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ انقلاب ادھورا انقلاب تھا۔ اس میں زندگی کی ابدی قدروں کا تحفظ کرنے والی خدا پرستانہ آئیڈیالوجی کا مکمل شعور نہیں تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کا انسان جوں جوں آگے بڑھتا گیا زندگی کی اصل حقیقت سے دور تر ہوتا گیا۔ اور آج سوائے نام اور لیبل کے اس کے پاس نہ "حقیقت پسندی" ہے نہ "مستقبل پسندی" اور نہ "ترقی پسندی" یہ تمام الفاظ صرف خیال پرستی، خود پرستی اور خواہش پرستی کے اچھے اور خوب صورت عنوانات ہیں جن سے کھیلا جا سکتا ہے۔ دل کی بھڑاس

---

۵ ریاض الصالحین مشکوٰۃ بحوالہ مسلم

نکالی جاسکتی ہے۔ جلے پھپھولے پھوڑے جا سکتے ہیں۔ مگر انسانی سماج جس نور سے محروم ہوگیا ہے وہ نور اسے نہیں مل سکتا۔

خدا کا شکر ہے کہ ساڑھے تیرہ صدیوں بعد آج زندگی کی حقیقی قدروں کی حفاظت کے لئے اسلام پسند ادب قرآن اور آنحضرت صلعم کی بنائی ہوئی خدا پرستانہ قدروں کو لیکر میدان میں آگیا ہے یہ ادب ہمیشہ کی طرح پچھلے دور کی تمام صالح ادبی کاوشوں کی تائید کرتا اور یہ ادب خود اپنے عہد کی تمام جائز اور مفید کوششوں کو سراہتا ہے۔ یہ ادب "عصر رواں" سے بیزار نہیں۔ یہ عصر رواں کے تمام تعمیری اجزا کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے یہ ادب حیات کے ابدی ورثے کو بدلے ہوئے حالات کے اندر رکھ کر دیکھتا ہے اور ان پر منطبق کرتا ہے اسلامی ادب آج صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ سارے عالم مسلمین اور دنیا کے تمام ملکوں میں کسی نہ کسی حیثیت میں پروان چڑھ رہا ہے اور بھٹکے ہوئے انسانی قافلہ کا سہارا بنتا جا رہا ہے لیکن یہ بات ہمارے لئے باعث صد شکر ہے کہ اس دلی بر اعظم اور اس کی ایک زبان۔ "اردو" میں جس قدر کام ہوا ہے اس کی مثال اور مقامات پر نہیں ملتی۔ اردو زبان پیدا ہی اس ماحول میں ہوئی جو مسلم سوسائٹی نے بنایا تھا اگرچہ مسلم سوسائٹی اس وقت خود زوال پذیر تھی لیکن تمدن کے ترقی یافتہ ذرائع کی تکمیل ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب سوسائٹی زوال کی طرف مائل ہو۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں اردو زبان کے اولین دور میں صرف نحیف و نزار ہندوستانی مسلم سماج کے بے سروپا خیالات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں حزن و ملال ہے یاس ہے۔ دل بہلانے کی باتیں ہیں، زندگی سے فرار ہے۔ بادشاہوں اور نوابوں کی خوشامد ہے۔ چاپلوسی ہے۔ فرضی محبوبوں کی تلاش ہے۔ تاہم اس میں حقیقت کی عکاسی بھی موجود ہے۔ دوام بھی ہے اور ہمہ گیری بھی جو ایک لحاظ سے اسلام کی خصوصیات ہیں اور جو غیر شعوری طور سے مسلم سماج کے ہر فرد کے ذہن میں پائی جاتی تھیں۔ یہ سب کوششیں کلچر اور تہذیب کے توارث سے اردو ادب میں منتقل ہوئی تھیں اس لئے جہاں ان سے فائدہ ہوا وہاں نقصان بھی ہوا پھر جب ہندوستانی انگریزوں سے پوری طرح شکست کھا گئے تو یہ رہا سہا ہوش بھی ختم ہو گیا۔

اب اردو شاعروں نے اپنے بیمار کردار اور خود فراموشی کو تصوف اور ویدانت کے ڈانڈے سے جا کر سراہنا اور اپنی حالت پر مطمئن ہونا شروع کیا سوائے بہادر شاہ ظفر (دلی کے آخری مغل حکمراں) کے، کہ ان کے یہاں یاس اور قنوطیت تو ہے مگر تعمیری اور تخلیقی اور پھر جگہ جگہ بلند مقصدیت بھی پائی جاتی تھی ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

لیکن جلد ہی اس جمود کی فضا کو ایک دھکا لگا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی نے ہندوستان میں صحیح اسلامی فکر کی تجدید کے لئے ایک ذہنی انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدین نے قرآن کریم کا ترجمہ اردو زبان میں کر کے اردو کو ایک گراں بہا دولت دیدی۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ تو آج تک سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے بعد شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی جیسے مقرر اور محرر پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے خیالات سے اردو کو اسلامی فکر دیا۔ مولانا محمود الحسن کے وقت تک تو بڑا کام ہوا۔ خود انھوں نے قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ کیا۔ حواشی لکھے۔ نذیر احمد دہلوی جیسے انشا پردازوں نے قرآن کے ترجمہ کا رخ کیا ان کی توبۃ النصوح مسلم معاشرہ کی اصلاح کی طرف ایک نیا قدم ہے شبلی نعمانی نے اسلامی تاریخ اور سیرت النبی کے ایک اہم حصہ کو اردو کا جامہ پہنا کر اسلامی عہد کے کرداروں کو ہندوستان میں معروف شخصیتوں میں تبدیل کر دیا۔ اس کام کو بعد میں..... مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سنبھال لیا اور دارالمصنفین اعظم گڑھ نے غیر معمولی کام انجام دیا۔ مغربی نیشنلزم سے متاثر ہو کر جس طرح ملک کے عام لوگوں میں انسانی مفاد کے بجائے قومی مفاد اور قومی خودی، کا جذبہ ابھرا اسی طرح مسلمانوں اور اردو کی رہنمائی کرنے والے طبقہ میں بھی قوم پرستانہ خیالات کا دریا جوش مارنے لگا۔ اب انسانی قدروں کو قومی مفاد کا ذریعہ بنانے پر زور دیا جانے لگا۔ اس میں حالی اور سرسید پیش پیش نظر آتے ہیں۔ دونوں حضرات نہایت مخلص اور ہمدرد تھے۔

لیکن اس کے باوجود ان کے مخاطب عام انسان اتنے نہیں تھے جتنے مسلمان حالیؔ نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں تنقید کے جو اصول پیش کئے وہ ایک عظیم کارنامہ ہے اور تنقید پر اسلام کے اثر کا نہایت اہم نتیجہ ہے۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے نہایت بے لاگ راہ اختیار کر کے اپنے دینی لٹریچر کے ذریعہ اسلامی تحریک اور نظامِ حیات کا واضح الفاظ میں تعارف کرایا لیکن ان کے خیالات زیادہ نہ پھیل سکے۔ مولانا محمد علی جوہر نے مسلم قومیت سے اسلامی قومیت کی طرف خاصی پیشقدمی کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان سے بھی بازی لے گئے انھوں نے اسلام خالص کی دعوت پیش کی اور اس دعوت کے ساتھ ساتھ ایک نئے اسلوب نگارش کی بنیاد رکھی۔ انہیں بجا طور پر ہندوستان میں اسلام کے جدید عہد کا پہلا نشان کہا جا سکتا ہے لیکن افسوس ہے کہ جب اسلامی فکر کا قافلہ آگے بڑھ گیا تو نشان مٹ گیا۔ آج ابوالکلام وہاں نہیں جہاں آج سے ۴۶ برس پہلے تھا۔ یہ انقلاب حال غالباً اسلام کے اصلی مقصد اطاعت الٰہی پر عمل کرنے کے بجائے اسلامی آئیڈیالوجی پر صرف علمی آدمی کی طرح غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اسی عہد میں ہمیں اقبالؒ ایسے مقام پر نظر آتا ہے جہاں مسلمان کا مفاد، مسلمان کے مسائل مسلمان کی ضرورتیں اور اسلام کے دائمی، ابدی عالمگیر اور بنی نوع انسان کے بقا اور تحفظ کے لئے اصول اور ایک دوسرے سے مسلسل الگ ہو رہے ہیں۔ بلاشبہ اسلام کے بقا اور تحفظ میں ایک سچے باعمل مسلمان کا بقا اور تحفظ موجود ہے۔ لیکن مسلمان کے مادی مفاد کو آگے کرنا اور اسلام کے مفاد کو پیچھے ڈالنا۔ گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا ہے اور اسلامی طرز فکر کے خلاف ہے۔ اقبالؒ نے کائنات کی سب سے اہم شے انسان کو قرار دیا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اس نے ان تمام خیالات پر ضرب لگائی جو ہندوستانیوں کی غلامی کے سبب ان پر چھاتے چلے جا رہے تھے۔ یورپ سے آئی ہوئی اندھی عقلیت پرستی نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو زندگی کے ابدی حقائق سے بیگانہ کر دیا تھا۔ اقبال نے اس افسوں کو باطل قرار دیا۔ ؎

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے * خرد کیا ہے چراغِ رہ گزر
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا * چراغِ رہ گزر کو کیا خبر
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور * چراغِ راہ ہے منزل نہیں

وہ قرآن کی روشنی میں عقل کو صحیح اس کا مقام دیتا ہے اور انسان سے آگے بڑھنے کے لئے اکساتا ہے۔ وہ کہتا ہے مجرد عقل ایک مادی تو پیدا کر سکتی ہے مگر اس سے وہ تہذیب جنم نہیں لے سکتی جو انسان کی حقیقی منزل ہے ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اقبالؒ کے نزدیک حقیقی نجات ایک صحیح اسلامی سماج کے پروان چڑھنے میں ہے اور یہ کام ہو کے رہے گا کیونکہ ؎

طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثال زمانہ گونا گوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

اقبال "حاضر و موجود" کو معبود بنا لینے کا مخالف تھا۔ وہ اس ضمیر فرنگی کے خلاف بغاوت کا درس دیتا ہے ؎

ہے وہی تیرے زمانہ کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

اس کے نزدیک معبود صرف خدائے بزرگ و برتر ہو۔ وہ ایک خود فراموش انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

اقبال کے نزدیک مومن کی تعریف اس سے بالکل مختلف ہے جو اکثر اس کے ہمعصر مفکر کیا کرتے تھے۔ وہ مومن کو کسی باطل نظام کے تحت مغلوب اور مجبور انسان کے روپ میں دیکھنا پسند نہیں کرتا "مومن" اس کے نزدیک آفاق پر چھا جانے والی طاقت ہو ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

مومن اس کے نزدیک دراصل قرآن کا پرتو ہے جس کی سیرت اور کردار ہر آن ترنمی کرتے ہیں سے

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے "مسلمان"
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

کائناتی قدریں اور مومن کے ارادے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں سے

قدرت کے مقاصد کے عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

ان افکار و خیالات سے اقبالؔ نے نہ صرف اردو ادب میں اسلام پسندی کو سمو دیا بلکہ اپنے آخر دور کے کلام میں اردو کو ایسی انقلابیت سے نوازا جو عصر حاضر کی دوسری زبانوں میں موجود نہیں۔ ارمغان حجاز میں وہ ابلیس کی زبان سے کہلواتا ہے سے

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستین
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشین
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقین
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

یہاں اقبال نے بڑی چابکدستی سے یہ دکھایا ہے کہ اب زمانہ ایسے موڑ پر آپہنچا ہے کہ انسانیت کے تحفظ کے لئے وہ اسلامی آئیڈیالوجی کی طرف پلٹ آئے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب مومن دین کے محدود تصورات سے نکلے اور خدا کی بادشاہی کے تصور کو لیکر اٹھ کھڑا ہو ــــــ! اقبالؔ نے آئین پیغمبرؐ کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہی اس دور جدید دور میں انسانی قدروں کی حفاظت کا واحد ذریعہ ہیں۔

اور یہ واقعہ کتنا عجیب ہے کہ اقبالؔ کے اس پر خلوص جذبہ میں رنگ بھرنے کے لئے انہیں کے زمانہ میں سارے عالم مسلمین میں قومی اور وطنی بنیادوں سے ہٹ کر خالص خدا پرستانہ بنیادوں پر تحریکوں کا آغاز ہوا ـــــــــ اردو ادب کے مشہور نثر نگار سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اقبالؒ ہی کی طرح بلکہ زیادہ واضح متعین اور سائنٹفک طریقہ پر خدا پرستی کی اساس پر ایک جہانی پروگرام پیش کیا اس پروگرام نے نوجوانوں کی رگوں میں بجلیاں بھردیں اور انسانیت کی بقا کے لئے اسلامی انقلاب کی ایک ہمہ گیر تحریک وجود میں آگئی۔ اقبال کی نظم اور ابوالاعلیٰ مودودی کی نثر میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں مولانا مودودی نے اردو زبان میں جو لٹریچر تیار کیا اس نے ہزاروں ذہنوں کو مغرب اور "حاضر و موجود" کی غلامی سے نکالا اور اقبالؒ کی زبان میں انہیں خودی کے "سر نہاں" سے واقف کیا ؎

خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ

پھر ان کے ساتھیوں نے اسی قسم کے اسلامی ادب کی ترویج کی۔ اس طرز خیال کی تحریروں کی مانگ ملک کے مختلف گوشوں میں اسی قدر بڑھی کہ نہ صرف ان کے اردو کے لٹریچر کے ہندی، مرہٹی، کنڑی، ملیالم، گجراتی، بنگالی، عربی، فارسی، انگریزی، ترکی اور

سندھی میں ترجمے ہونے لگے بلکہ غیر اردو داں علاقوں کے باشندوں نے جدید اسلامی لٹریچر کو سمجھنے کے لئے خاطر اردو زبان سیکھی۔ اس طرح اردو ادب میں ایک نئے اور پائدار فکر کا سلسلہ سے آغاز ہوا۔ جس میں یاسیت، قنوطیت اور مریضانہ جدت طبع کے مقابلہ میں خودداری، رجائیت، مقاصدیت "اور انقلابیت سموئی ہوئی ملتی ہے لیکن اس کا رخ تخریب کی طرف نہیں بلکہ سراسر تعمیر کی طرف ہے۔ اردو کے اسلامی ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ صاف سمجھ میں آجاتا ہو کہ انسانیت کی ابدی قدریں اور خدا پرستانہ ——— آئیڈیالوجی مدت کے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی طرح ایک دوسرے سے گلے مل رہی ہیں پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس ادبی تحریک نے نہایت مختصر مدت میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ حتیٰ کہ پرانی چلتی ہوئی تحریکوں نے اس کے انداز بیان اور اصطلاحات کو اپنایا ہے ——— دس بارہ سال کے اندر ایک خطۂ ارض کا ادبی رجحان تو مستقل طور پر بدل گیا ہو اور دوسرے خطۂ ارض میں تیزی سے بدل رہا ہے۔

(بشکریہ "نئی نسلیں")

جگن ناتھ آزاد

گذرے ہوئے دنوں کی شرافت کہاں سے لائیں
اس دور میں دلوں کی محبت کہاں سے لائیں

وہ شے کہ درد و غم کی لطافت ہے جس کا نام
دورِ کثیف میں وہ لطافت کہاں سے لائیں

سینوں میں تھا جو درد کا شعلہ وہ بجھ چکا
لائیں جواب تو سوزِ محبت کہاں سے لائیں

تو جس سے نور بن کے جبیں پر دمک اٹھے
اے زندگی وہ سوز حرارت کہاں سے لائیں

اس دورِ نو میں شانِ محبت کا ذکر کیا
غم ہے تو یہ کہ شانِ عداوت کہاں سے لائیں

مے ہی نہ ہو تو ہم سے گدایانِ میکدہ
اک انتظارِ شوق کی لذت کہاں سے لائیں

جب اُٹھ چکا ہو خلوت و جلوت کا امتیاز
پاکیزگیٔ خلوت و جلوت کہاں سے لائیں

دل دادگانِ عصرِ کہن عصرِ نو میں آج
آزادؔ سوز و ساز کی دولت کہاں سے لائیں

(بشکریہ "ہمایوں")

شاکر عروجی

کسی کی محفل سے شور اٹھا بصد نواہائے عاشقانہ
یہ کون آیا یہ کس سے باتیں ہوئیں باندازِ محرمانہ

جو اک نظر میں جہاں کو پرکھے وہی ہے بینا وہی ہے دانا
کہ بیش از یک نظر نہیں ہے حقیقتِ جلوۂ زمانہ

ہزار دشمن ہو برقِ خاطف ہزار کوندے ہزار لپکے
جو اہلِ ہمت ہیں روک لیتے ہیں بڑھ کے برقِ آشیانہ

سوالِ ناموسِ غنچہ و گل، تو حدِ گلشن سے پار بھی تھا
حدودِ گلشن میں ہم نہ چھوڑیں گے جس کی نیت ہو مجرمانہ

سرورِ ہر جامِ حریت میں بشر نے ایسے ستم بھی ڈھائے
تمام تاریخ نوعِ انساں کی ہنگئی جس سے وحشیانہ

صعوبتِ راہ و رسمِ منزل میں حق اسی کا ہے کامرانی
قدم بڑھائے جو غازیانہ، علم اٹھائے جو فاتحانہ

سخن کی کوتاہیوں نے شاکرؔ عجب مجھے معجزہ دکھایا
کہ طولِ محشر ہی مختصر تھا، سنا گیا جب مرا فسانہ

(بشکریہ "پرچم")

غازی صلاح الدین

شدی

جب میرے باپ کی ساری تمنا کو ختم ہو جائے گی تب شدی اپنے بند کمرے سے نکل کر بے آواز قدموں سے میرے پاس آجائے گا پھر وہ خاندان کی پرانی تصویریں گھورتے ہوئے مجھے کھانے کے لئے کہے گا۔

"پپا......" وہ ہمیشہ بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ کس قدر آہستہ کہا کرتا ہے۔ "پپا...... چلئے کھانا کھا لیتے ہیں۔"

میرے سامنے بیٹھ کر وہ نظریں جھکا کر منہ چلاتا رہے گا۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد وہ مجھے اجنبی نگاہوں سے آنکھیں جھپکا کر دیکھے گا۔ کتنے سالوں سے وہ مجھے اپنی اجنبی نظروں سے دیکھتا آرہا ہے جیسے ہمارے درمیان سارے بلند پہاڑوں کی گہر حائل ہو۔ جیسے وہ میرا سایہ کنارے کے پانیوں میں دیکھ رہا ہو۔ گہر اور دھند میں لپٹی ہوئی اس دنیا میں میں اس کے سب سے زیادہ نزدیک ہوں۔ لیکن اپنی سب سے زیادہ قریبی شخصیت بھی اسے دھندلکوں میں پھیلتا بڑھتا دھبہ دکھائی دیتی ہے۔ اکثر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بانہیں پھیلائے دھندلکوں میں کسی کو تلاش کر رہا ہے کسی ایسی شخصیت کو جو اس کی آنکھوں کی بھیگی ہوئی کہانیاں پڑھے، اسے سہارا دے، اس کے بکھرے ہوئے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرے۔ کوئی ایسی شخصیت شاید اسے کبھی نہیں ملے گی۔ شاید میرا شدی اسی طرح دھندلکوں میں ہاتھ پھیلائے بڑھتا رہے گا، میرے سوا شاید اسے کوئی بھی نظر نہیں آئے گا۔ پھر میں بھی اس کی بانہوں سے کس قدر دور ہوں میں بھی اسے سہارا نہیں دے سکتا۔ میرے سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ مجھے خلاؤں میں ڈھونڈتا ہے۔

مجھے یاد آیا جب وہ بہت چھوٹا تھا۔

"پپا...... پپا تم کہاں ہو......" وہ ہاتھ پھیلائے میرے لئے سارے کمروں میں دوڑتا پھرتا۔ وہی خاموش اور خالی نگاہیں مجھ سے ٹن کھٹولوں کی کہانیاں سنا کرتیں۔ وہی خاموش اور خالی نگاہیں اب میرے ساتھ کھانا کھائیں گی۔ اور مجھے اسی پرانے انداز سے خاموش الوداع کہہ کر اپنے کمرے میں چلی جائیں گی۔

یہ بند کمرہ...... جس میں شدی بیٹھا پڑھ رہا ہوگا اور جس کے دروازے پر ہلکا سبز رنگ ہے۔ دراصل شدی کا سب سے پرانا ساتھی ہے کتنے سارے سالوں سے...... جب شدی اسکول میں تھا۔ یہ کمرہ اسی کا ہے۔ ان دنوں اس نے الگ کمرہ کے لئے کس قدر ضد کی تھی۔ اسے ایک الگ کمرہ میں رہنے کا کتنا شوق تھا۔ ان دنوں اس کی امی بھی زندہ تھیں، دوسرے لوگ بھی تھے۔ اس گھر میں اسے ایک الگ کمرہ دینا بڑا دشوار نظر آرہا تھا۔ وہ روز اس کے لئے ضد کرتا۔ کھانا نہیں کھاتا اور کسی الگ کونے...... میں خاموش جا بیٹھا کرتا۔ ہمیں وہ اس قدر عزیز تھا کہ ہمیں اس کے لئے یہ کمرہ خالی کرنا پڑا۔ تب سے وہ اسی کمرہ میں ہے، اس کمرہ نے اس کی نگاہوں کے سارے پوشیدہ راز پڑھے ہوں گے۔

شدی اسی مکان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش سے پہلے ہمیں بچوں کی کس قدر تمنا تھی۔ آس پڑوس کے سارے بچوں سے ہمیں محبت تھی۔ بچے مسرتوں کی کتنی اچھی امانت ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے! کھیلتے، ہنستے، دوڑتے اور روتے ہوئے بچے......! جب وہ اپنے گھٹنوں چلنا سیکھتے ہیں۔ یا جب وہ پہلے پہل باتیں کرنا شروع کرتے ہیں تو اپنی توتلی زبان سے کتنی پیاری باتیں کیا کرتے ہیں۔ کیسی اچھی اچھی مضحکہ خیز باتیں......!

پھر جب شدی پیدا ہوا تھا تو ہم نے اس کے لئے کتنے طویل پروگرام بنائے تھے۔ اسے ڈاکٹر بنائیں گے۔ اسے باہر کے ملکوں میں تعلیم کے لئے بھجوائیں گے، اسے اتنا بڑا آدمی بنائیں گے......اور وہ پھول جنھیں ہم نے سالوں سے اپنے دلوں میں امانتاً رکھے تھے ہم نے اسکے گلے میں ڈالے لیکن ہمارے ہوا شدی کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ ہمارے

سوائے کہیں سے بھی پیار نہیں ملا۔ اور دراصل بات یہ تھی کہ وہ صورتاً بدشکل تھا۔ اس کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں نے اپنی ناکیں چڑھانا شروع کر دی تھیں۔ کتنے ہی آدمیوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرا لڑکا نہیں لگتا۔ وہ مجھ سے کس قدر مختلف تھا۔ جو بھی اسے دیکھنے آتا۔ ہم سے معذرت کرنے لگ جاتا۔ یہی کہ ہمیں فکر نہیں کرنی چاہیے۔ کہ لڑکا بدشکل ہے کیونکہ لڑکوں کی تو ویسے ہی شادی ہو ہی جاتی ہے۔ کوئی ہمیں یقین دلاتا۔ کہ وہ بڑا ہو کر اتنا بُرا نہیں لگے گا۔ ہمیں یہ باتیں سن کر کس قدر دکھ ہوا کرتا...... کسی نے آکر اسے گود میں لے کر نہیں کھلایا۔ کسی نے اُسے ہاتھ نہیں لگایا۔ سب نے اسے دیکھ کر آنکھیں جھپکائیں۔ یہ سب دیکھ کر ہم اسے اپنی گود میں چھپا لیا کرتے، ہماری آنکھوں میں آنسو آجایا کرتے..... اس میں اس کا کیا قصور تھا..... ؟ ہمارا کیا قصور تھا..... ؟ اس میں کسی کا کیا قصور تھا ؟ وہ بہرحال ہمارا بچہ تھا۔ وہ ہماری زندگیوں کی سب سے بڑی امانت تھا۔ وہ بہرحال ہمارا پھول تھا۔

ہماری زندگیوں کا وہ کھلایا ہوا پھول اب تک بہاروں کا منتظر ہے!

اس بند کمرے کی دیواروں سے لگ کر نہ جانے کتنی ہی بہاریں گزر چکی ہونگی۔ اس کی کھڑکیوں کے نیچے نہ جانے کس قدر پھول کھلے ہونگے لیکن کوئی بہار، کوئی شگوفہ اس دروازہ پر دستک دیکر اندر داخل نہیں ہوا۔ اس لئے کہ یہاں اندر شدی ہے۔ اور شدی بہت بور ہے۔ لوگ اسے نیگرو کہتے ہیں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر میں شدی کی سوانح حیات لکھوں۔ تو میں کیا لکھ سکوں گا ؟ میں کیا لکھوں گا ؟ سالوں پہلے کا پرانا پائپ پیتے ہوئے میں شدی کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ اب میرے پاس رہ بھی کیا گیا ہے۔ دنیا کے دوسرے مصروف لوگوں کے لئے کتنی ایسی دلچسپ باتیں ہوا کرتی ہوں گی۔ جن کے متعلق وہ سوچتے ہوں گے۔ باتیں کرتے ہوں گے لیکن میرے لئے اب تو کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں رہی۔ وہ دن تو کب کے دھندلکوں میں تحلیل ہو گئے۔ جب میں اطمینان بخش انداز میں مسکرایا کرتا تھا۔ وہ دن تو کب کے گزر گئے جب بہاریں تھیں بہاروں کا انتظار تھا۔ بہاروں کا خیال تھا...... اب تو یہاں..... میرے ذہن کے ایوانوں میں صرف شدی ہے...... صرف شدی ہے۔

اب جیسے میں مر گیا ہوں، اور اپنے بیٹے شدی کی شکل میں جی رہا ہوں........ !!

شدی اپنے کمرہ میں پڑھ رہا ہوگا۔ اس نے اب دوبارہ کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ گھٹتے بڑھتے دنوں سے بے نیاز اب وہ صرف خاموش پڑھا کرتا ہے، خاموش سوچا کرتا ہے۔ لیکن اس طرح اتنی جلدی آگے آجانے سے پہلے مجھے ذرا پیچھے جانا پڑے گا۔ مجھے ان دنوں کے متعلق سوچنا پڑے گا جب اس کی زندگی کی ٹریجڈی شروع ہوئی تھی ...... لانزوال المیہ..... !! وہ ٹریجڈی اس کمرہ کی ہواؤں میں رچ بس گئی ہے۔ جسے وہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ کتنے ہی سارے لوگ یہاں سے چلے گئے۔ لیکن یہ ٹریجڈی اسی طرح یہاں رہی...... یہ یہاں اسی طرح اپنے پر پھیلائے رہی...... شدی کی امی بھی یہاں سے چلی گئی۔

مجھے شدی کی امی کا خیال آرہا ہے۔ اندرونی کمرے کی عقبی دیوار پر اس کا فوٹو لگا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ وہ دن یاد آجایا کرتا ہے کہ جب ہم محبت کی شاہراہوں پر کلیاں چنا کرتے تھے۔ ان دنوں کی یاد دن کے جو پھول میرے دل کے خزانوں میں ہیں..... میں انہیں کبھی بھی جلنے نہ دونگا۔ یہ پھول تو زندگی کے سارے قیمتی سرمایوں سے بھی قیمتی ہیں اور اب میں اپنی آرام کرسی پر سر پیچھے ٹکا کر ان پھولوں کے گلدستے بناؤں گا۔ ایک بار پھر مجھے خیال آئے گا۔ کہ شدی ہماری زندگی میں کس قدر عظیم طوفان بن کر آیا...... !!

اس کے پیدا ہوتے ہی ہماری زندگیوں کے کارواں نئی راہوں پر مڑ گئے۔ اس سے پہلے ہماری زندگی قطعاً مختلف تھی۔ آئندہ زندگی کیلئے ہم نے کتنے اچھے پروگرام بنا رکھے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم ہمیشہ مسرور رہیں گے ہمیشہ گیت گاتے رہیں گے۔ وہ زندگی ہم نے بڑی اچھی طرح گزاری۔ سالوں روپے بچا کر ہم نے ایک بڑا اچھا سا مکان بنوایا۔ یہاں ہماری پسند کی ساری چیزیں تھیں۔ مجھے ان دنوں موسیقی سے محبت سی ہو گئی تھی۔ کسی بھی کونے میں ٹوٹا ہوا وائلن اب بھی پڑا ہوگا۔ یہاں اس برآمدے میں میں شدی کی امی کو اس کے پسندیدہ گیت سنایا کرتا تھا۔ تب یہاں اس جگہ اپنا وائلن بجایا کرتا تھا۔ وہ بھولے بھولے سے گیت اب بھی میرے ذہن کے ایوانوں میں بھٹک آتے ہیں۔ وہ شام مجھے اب تک یاد ہے جب میں نے شدی کی

کی امی کا وہ پسندیدہ گیت گایا تھا۔

پت جھڑ جیسا جیون میرا

اپنے پسندیدہ گیت سنتے ہوئے وہ کتنے خوبصورت انداز میں مسکرایا کرتی تھی کچھ گیت تو ایسے بھی تھے جنھیں سن کر اس کی آنکھیں بھیگ جایا کرتیں اپنے پسندیدہ گیتوں...... اپنی پسندیدہ دھنوں...... اپنی ساری پسندیدہ چیزوں سے اسے کس قدر انس تھا۔ اس مکان میں اس کی پسند کا کس قدر خیال رکھا گیا تھا۔ اسے پھول پسند تھے۔ اسے پھولوں سے عشق تھا۔ ہر صبح وہ اپنے کانوں میں موگرے کی کلیاں پہنا کرتی تھی۔ صحن کی کیاریوں میں ہر طرف پھول ہی پھول نظر آیا کرتے تھے۔ گلاب کے پھول.... موتیا کے پھول.... عباس کے پھول..... سُرخ، سفید اور زرد پھول...!
پھر......ان سُرخ و سفید پھولوں میں ایک سیاہ شگوفہ کھلا.....شدی ہماری زندگیوں کی کہانیوں میں داخل ہوا۔

جب شدی پیدا ہوا۔ تو یہاں کتنی دھوم دھام تھی۔ سارے ہی رشتہ دار جمع تھے۔ اس گھر میں بہت کم ایسے موقعے آئے ہیں۔ جب یہاں بہت سے ہنستے مسکراتے چہرے جمع ہوئے ہیں...... (اور اب شاید ایسا کوئی موقع کبھی نہ آئے۔) وہ دن انھیں چند یادگار دنوں میں سے تھا لیکن شدی نے سب کو مایوس کیا۔ وہ کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ کتنے ارمانوں سے ایک کلی کھلی بھی تو کیسی کھلی......!! مجھے یاد ہے کہ گھر کے سارے لوگوں نے سر جوڑ کر سرگوشیاں کی تھیں۔ شدی کی بُرائی کی تھی۔ ہماری بدقسمتی کا تذکرہ بھی کیا ہوگا۔ میں کسی کمرے میں اچانک داخل ہوتا.... لوگ چپکے چپکے پتہ نہیں کیا باتیں کر رہے ہوتے۔ مجھے دیکھتے ہی سب خاموش ہو جاتے۔ ایک دوسرے کو پُر معنی نظروں سے دیکھتے، پھر مجھے پہلے سے ترتیب دیئے ہوئے جملوں میں مبارکباد دیتے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کوشش کرتے......!!

پھر جب سارے لوگ چلے گئے اور جب ہم تنہا رہ گئے تو ہم نے نہایت سنجیدگی سے ایک دوسرے کی نظروں میں نظریں ڈال کر سوچا۔ یہ کیا ہوگا---؟ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کہ شدی بدشکل تھا اس دنیا میں ہزاروں بچے ایسے پیدا ہوتے ہوں گے۔ لیکن ایسا کیوں ہے.....؟ اس خدا پیدائش پر ایک انسان کی، ایک خاندان کی آئندہ زندگی کا کس قدر دارومدار ہوتا ہے۔ یہ بچہ جو اب پیدا ہوا ہے ساری زندگی احساس کمتری میں مبتلا رہے گا...... ساری زندگی اسے احساس رہیگا کہ وہ خوبصورت نہیں۔ اس احساس کے ساتھ اسے کس قدر ذہنی تکلیف ہوگی..... وہ اکثر سوچا کریگا کہ اگر میں ایسا ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ لیکن ایسا کس طرح ہوتا۔؟ اس میں کس کا قصور تھا.....؟

تب ہم نے سوچا تھا کہ ہم اپنے شدی کو جدوجہد کرنا سکھائیں گے۔ اسے خوب پڑھائیں گے، وہ دماغی طور پر دوسروں پر حکومت کریگا۔ ہم اسے زندگی کی جنگ میں چٹانوں کا سا عزم دیں گے۔ وہ ہر جگہ کامیاب رہے گا۔ وہ کبھی حالات سے شکست نہیں کھائے گا۔ ایسا ہوگا...... یہ ہوگا۔

(اور ایسا نہیں ہو پایا)

پھر جب شدی پیدا ہوا تو ہم نے نئی زندگی شروع کی۔ ہم نے اپنی ساری توجہ شدی کی طرف مبذول کر دی۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ ہم خواہ مخواہ اس قدر پریشان ہو گئے تھے۔ ویسے شدی اتنا بُرا بھی نہ تھا ایسے کتنے لوگ بڑے آدمی بنے ہیں۔ عوام کی محبوب شخصیتیں بنے ہیں۔ شدی بھی انھیں کا سا تھا۔ اس سلسلے میں ہمیں اس قدر ہراساں ہونے کی کوئی..... ضرورت نہ تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں ہم پریشان ہو گئے۔ شاید ہمیں پریشان کر دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص شخص کی باتوں نے ہم پر یہ اثر کیا ہو...... یا ہو سکتا ہے کہ ہمارے خوابوں کی غلط تعبیر سے ایسا ہوا ہو۔ دراصل ہم نے بڑے اونچے اونچے خواب دیکھے تھے۔ ہم نے تصور کیا تھا کہ ہمارا بچہ دنیا کے بہترین سپوتوں میں سے ہوگا۔ وہ دوسرے تمام بچوں سے خوبصورت ہوگا۔ دوسرے تمام بچوں سے زیادہ تندرست ہوگا۔ وہ شروع ہی سے اپنے ہمجولیوں پر حکومت کرے گا۔ اس کے سارے ساتھی اسکا کہا مانا کریں گے وہ ایک بہت ہی دلکش شخصیت کا مالک ہوگا۔ لوگ اس کی مسکراہٹ پر قربان ہو جایا کریں گے ہمارے تصور میں جو بچہ تھا۔ وہ ہر لحاظ سے دنیا کا بہترین بچہ تھا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ دنیا میں کتنے سارے لوگ ہیں۔ سب ہی ایسے خوبصورت تندرست اور اچھے بچوں کی تمنا کرتے ہوں گے پھر یہ خواب کس طرح پورے ہو سکتے ہیں۔ پھر جب خواب جھوٹے پڑ جاتے ہیں تو کس قدر ذہنی تکلیف ہوتی ہے، ہمارا دل ٹوٹ جاتا ہے اور ساری دنیا سے نفرت سی ہونے لگتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دنیا سے پیچھے

خوش ہے.... صرف ہم دنیا کے سب سے بدقسمت انسان ہیں. پھر ہم خدا سے شکوے کرتے ہیں. ہمیں ساری دنیا سے نفرت سی ہو جاتی ہے، بغض ہو جاتا ہے. ہم دنیا کو بے ثبات...... خود غرض...... خواب...... اور پتہ نہیں کیا کچھ کہنے لگ جاتے ہیں. ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا.

لیکن ہم نے ہار نہیں مانی...... ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اس ننھے پھول کو مرجھانے نہیں دیں گے.

اس کے بعد کے چند سال بڑے مصروف گزرے. ہم نے شدّی کو بڑے لاڈ سے پالا. وہ شروع ہی سے بڑا خاموش طبیعت تھا اور بچوں کی طرح اس نے اپنی زندگی روتے ہوئے شروع نہ کی. نہ ہی وہ ضدی تھا شور مچانا تو وہ جانتا ہی نہ تھا. بڑی جلدی ہی وہ پاؤں چلنا سیکھ گیا لیکن اور بچوں کی طرح وہ ادھر ادھر کی چیزیں اٹھا کر دوڑتا نہیں پھرا. وہ کبھی ادھر گرد میں نہیں کھیلا. اس نے کبھی کھلونوں کی خواہش نہیں کی وہ بالکل عجیب تھا. ایسا بچہ ہم نے کہیں نہیں دیکھا تھا. ایسی افسردہ اور خاموش نگاہیں ہم نے کہیں نہیں دیکھی تھیں.

جب وہ چھ سال کا ہوا، تب اس کی امّی کا انتقال ہو گیا......

جب وہ چھ سال کا ہوا تب صحن کی کیاریوں کے سارے پھول مرجھا گئے تب میں نے سوچا اب کیا ہوگا؟ اب کون اسے پالے گا؟ اسکے لئے کپڑے سیئے گا؟ اسے اس کی پسندیدہ چیزیں کون پکا کر دے گا؟ اب یہ کسے ممّی کہے گا؟...... مجھے اپنا غم نہیں تھا. مجھے شدّی کا غم تھا. اس پھول کا غم تھا جسے ہم نے خونِ دل سے رنگا تھا مجھے اس بات کا خیال تھا کہ اب شدّی ماں کی شفقت سے محروم ہو جائے گا، پھر وہ کس طرح جیئے گا؟ اب جب وہ بڑا ہوگا تو وہ اس شدّی سے کس قدر مختلف ہوگا. جو اپنی ماں کے زندہ رہنے کے بعد پروان چڑھتا. یہ شدّی کیسا ہوگا؟ مجھے معلوم نہ تھا.

سارے دکھ برداشت کر لینے پڑے. اور میں نے خود شدّی کو پالا. اب جو شدّی پروان چڑھا. اسے صرف باپ کی محبت نے پالا. ماں کی مہربان دھڑکنیں...... اس کی مامتا...... اسے کہیں نہیں ملی. اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شدّی کے ساتھ زمانے اور اس... کی قسمت نے کس قدر ناانصافی سے کام لیا ہے. اسے اس کے حصے کی... محبت تک نہیں ملی. اسے خود اپنے حصے کی مسرتیں تک نہیں ملیں. کتنے سارے طوفان اس کے دل کی کمزور دیواروں میں لاوے کی طرح اُبلتے رہے. وہ خود اپنے متعلق پتہ نہیں کیا سوچتا رہا ہوگا. شروع میں جب وہ اسکول میں داخل ہوا تو اسے مخلص دوست نہ ملے. اسے تنہا رہنا پڑا. اسے دکھ تو ہوتا ہی ہوگا جب وہ دیکھتا ہوگا کہ اس کے دوسرے ساتھی کس طرح آپس میں ہنستے کھیلتے ہیں. نئے نئے پروگرام بناتے ہیں. ساتھ سینما دیکھنے جاتے ہیں. پکنک کے پروگرام بناتے ہیں. اور اس کا کوئی ساتھی نہیں. کسی نے اس کے قریب آکر یہ نہیں پوچھا کہ میرے دوست! تمھیں کیا چاہیئے؟ تم کیا سوچ رہے ہو؟ اسی طرح اس نے ہائی اسکول پاس کیا۔ کالج میں داخلہ لیا. وہاں بھی اسے کوئی مخلص ساتھی نہیں ملا. ساری دنیا میں ایک اکیلا اسکا دوست تھا، اس کا باپ تھا، بھائی تھا اور ہوں...... وہ کالج سے آکر مجھے خاموشی سے سب کچھ بتایا کرتا تھا.

"پپا...... آج ہمارے کالج میں یہ ہوا......"

اس نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی. کبھی مجھے کوئی جھوٹ بات نہیں کہی. وہ بغیر جھجکے اور شرمائے...... مجھ سے کہا کرتا......

"پپا... آج میرے ایک کلاس فیلو نے مجھے نیگرو کہا...... پپا! میں خاموش بیٹھا رہتا ہوں تو لڑکے مجھے چھیڑتے ہیں.... چڑاتے ہیں."

مجھے یاد ہے...... ایک دن میں نے اسے اپنے پاس بلا کر سمجھایا تھا. ایک دوست کی حیثیت سے...... اور ایک باپ کی حیثیت سے بھی.... وہ میرے سامنے والی کرسی پر اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں پر ٹکائے خاموش بیٹھا تھا..............

"شدّی!" میں نے اسے کہنا شروع کیا. لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اسے کیا کہوں؟ جو کچھ میرے دل میں کروٹیں لے رہا تھا. وہ اسے کیونکر کہتا؟ انھیں الفاظ میں کون ڈھال پائیگا؟

"شدّی!..... میرے بیٹے...... تمھیں کیا ہو گیا ہے......؟" ایک باپ نے کہا...... "تم اس قدر اداس رہتے ہو، خاموش رہتے ہو، یہاں اتنی ساری مصروفیتیں ہیں. اتنے مشغلے ہیں. تم کچھ کیا کیوں نہیں کرتے تم کسی نہ کسی چیز میں حصہ کیوں نہیں لیا کرتے. کم از کم کھیلا کرو. لوگوں سے ملا کرو. نئے دوست بناؤ. اس طرح یہاں بسورتے رہو گے تو اتنی ساری

زندگی کیسے گزرے گی......؟"

اور وہ وہیں پڑا سوتا رہا۔ اس کی فطرت میں پتہ نہیں کیا کچھ سما گیا تھا۔ نہایت سعادتمندی سے صبح کالج جاتا۔ اور واپس آکر کمرہ بند کر کے بیٹھ رہتا۔ مجھے کتنا انتظار رہا کرتا کہ اور لڑکوں کی طرح اس کا کوئی دوست اسے گھر پر بلانے آئیگا پھر وہ سر جوڑ کر سینما جانے کا پروگرام بنائیں گے پھر شدی مجھ سے کوئی اچھا سا بہانہ کرے گا۔ اور میں سب کچھ جانتے بوجھتے مسکراؤں گا...... لیکن اسے کبھی کوئی بلانے نہ آتا...... اور وہ خود بھی کسی کے گھر نہ جاتا......

جب اس نے ایف۔ اے پاس کیا تو میں نے اسے کالج سے اٹھا لیا۔ یہی سوچ کر کہ وہ خالی بیٹھنے پر کچھ کرنے کو ترجیح دے۔ شروع میں وہ دن دن بھر گھر میں رہا۔ پھر وہ شام کو کہیں ٹہلنے جانے لگا۔

ہمیشہ کی طرح وہ مجھے اب بھی سب کچھ بتایا کرتا......

"پپا! آج میں تین میل پیدل چلا۔ پارک میں میں نے ایک بڑی خوبصورت ایرانی لڑکی دیکھی — پپا! وہ اتنے اچھے کپڑے پہنے تھی کہ بس......! میرا جی چاہا کہ میں اس سے بات کروں۔ میں نے جب اس سے وقت پوچھا تو اس نے جھڑک دیا۔ کہنے لگی۔" شرم نہیں آتی شریف لڑکیوں کو پریشان کرتے ہوئے۔"

یہ بات اسے شاید مجھ سے نہیں کہنی چاہئیے تھی لیکن وہ اسے کس سے کہتا؟ میں ہی اس کا دوست تھا!!

پھر میں نے اسے کچھ رسالے لا کر دیئے۔ وہ ان میں دلچسپی لینے لگا۔ میں اسے اپنے دوستوں کے چند لڑکوں سے ملایا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش سیکھا۔ دوستوں میں رہ کر اسے نئے تجربات ہوئے۔ اسکے نئے دوستوں نے اپنے کارنامے سنائے ہونگے۔ اسے بتایا ہوگا کہ انھیں کن لڑکیوں سے محبت ہے۔ ان حسین کارناموں کو سن کر وہ کیا سوچا کرتا ہوگا؟ اسے خیال آتا ہوگا کہ اس کی زندگی کس قدر سست ہے، بے مقصد ہے، آخر وہ کیوں جی رہا ہے، کس کے لئے جی رہا ہے؟ وہ کونسی ہستی ہے؟

وہ پتہ نہیں کون تھی...... لیکن ایک دن شدی نے مجھے بتایا کہ اس نے ایک لڑکی کو خط لکھا ہے، وہ لڑکی اسی شہر میں رہتی تھی۔

"اس کا مضمون ایک جگہ میں نے دیکھا تھا۔" میں نے اسکے متعلق بتاتے ہوئے کہا...." پھر مجھے اسکا پتہ مل گیا...... کل رات میں نے اسے خط لکھا ہے......"

"تم نے اسے کیا لکھا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

شاید زندگی میں وہ پہلی بار میرے سامنے شرمایا۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں...."کچھ بھی تو نہیں پپا...... کوئی بھی تو خاص بات نہیں... میں نے بس اتنا لکھا ہے کہ میں تم سے خط و کتابت کرنا چاہتا ہوں اور بس!"

اس رات میں نے خدا کا شکر ادا کیا مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب شدی زندگی کے ہنگاموں میں داخل ہو گیا ہے۔ اب اس کی ایک جیسی گھسٹتی زندگی میں کچھ تغیر نمایاں ہوا تھا۔ اب اس کے پاس بھی سوچنے کے لئے کچھ تھا۔ لیکن یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ مجھے ذرا سا محسوس ہونے لگا کہ آگے کیا ہوگا؟ وہ لڑکی جب شدی سے ملے گی جب اسے دیکھے گی تو شاید یہ سلسلہ بند ہو جائے۔ وہی لڑکی شاید اس کے متعلق سوچنا بھی گوارا نہ کرے۔ لیکن یہ باتیں تو بڑی دور کی باتیں تھیں۔ ابھی تو صرف شدی نے خط لکھا تھا اور ابھی تو اس کا جواب آنا تھا۔

چند دنوں بعد شدی کے نام ایک سبز لفافہ آیا۔ عام طور پر اسکے نام خط نہ آیا کرتے تھے۔ اس سبز لفافے میں، میں نے سوچا اس لڑکی کا خط ہوگا۔ جسے شدی نے اپنے دل کی ساری محبت بھری دھڑکنوں کا سندیسہ بھیجا ہوگا... اس لڑکی کو اس نے اپنے دل کی ساری کہر آلود مملکتوں کی شاہزادی بنایا ہوگا! میرا جی چاہا کہ میں وہ خط پڑھوں۔ مجھ سے پہلے شاید ہی کسی باپ نے یہ خواہش ظاہر کی ہو کہ وہ اپنے بیٹے کے نام آیا ہوا کسی لڑکی کا خط پڑھے۔ لیکن وہ خط اس نے مجھے دکھایا۔ رات کے کھانے پر وہ بظاہر مسرور نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھکر بڑی ہی مسرت ہوئی کہ اس لمحہ اس کے دل میں اداسیاں نہیں ہیں۔ امنگیں ہیں۔ میری طرف دیکھکر وہ مسکرایا۔ میں نے یاد کیا کہ وہ کتنے طویل عرصے کے بعد مجھے دیکھکر اس طرح خوش ہوا تھا۔ اس طرح مسکرا رہا تھا...

(وہ وقفہ بہت سارے سالوں کا طویل وقفہ تھا)

"پپا! اس کا خط آیا ہے۔" اس نے بغیر شرمائے آہستہ سے کہا۔ وہ اتنا معصوم تھا۔ اتنا سیدھا تھا۔ لیکن مجھے خود ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا سا احساس ہوا۔ مجھے اس نے وہ خط دیا۔ پہلے میں نے سوچا مجھے خط نہیں پڑھنا چاہیئے۔ میں نے چاہا کہ میں شدی سے کہہ دوں کہ وہ اس سلسلہ میں

مجھ سے کوئی بات نہ کرے۔ مجھے اس کا کوئی خط نہ دکھائے لیکن آخر وہ ایک انسان تھا۔ ایک سوچنے اور محسوس کرنے والی شخصیت تھا۔ اور سارے... انسانوں کے بہرحال ایسے ساتھی ہوتے ہیں۔ ایسے ہمجولی ہوتے ہیں جن سے وہ اپنے دل کی کہانیاں کہتے ہیں۔ وہ باتیں کہتے ہیں جو کسی کو نہیں بتائی جاتیں۔ آخر کوئی شخص کب تک اپنے دل کے دروازے بند رکھے...... وہ طوفان جو کہ دیواروں میں کروٹیں لیتے ہیں کبھی تو ان سے باہر آجائیں گے اور شندی کا کوئی ساتھی نہیں۔ کوئی دوست نہیں...... تب مجھے ہی اس کا رازداں بننا پڑا........

وہ خط میں نے پڑھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ ان خطوں میں سے نہیں تھا جن میں لڑکیاں چھپے چھپے لفظوں میں محبت کا اظہار کیا کرتی ہیں۔ وہ تو ایک بڑا ہی سیدھا سادا خط تھا۔ بڑا مختصر سا! اس کا نام زبیدہ تھا۔ وہ ایک مقامی کالج میں تھرڈ ایئر میں پڑھتی تھی۔ اس نے بڑے عام سے لفظوں میں لکھا تھا کہ وہ اس سے خط و کتابت کرنا پسند کرے گی......

اس رات شندی نے زبیدہ کے متعلق سوچا ہوگا۔ اس نے پتہ نہیں کیا کیا سوچا ہوگا۔ رہم روشنی کی کسی بھی کرن کو دیکھ کر کتنی جلدی صبح کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ شندی کے کمرے سے رات بڑی دیر تک روشنی کی شعاعیں باہر جھانکتی رہیں۔ وہ رات بڑی دیر تک جاگتا رہا........

صبح صبح وہ میرے پاس آیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ میں نے اس سے پوچھا...... اونچی باہنوں والی کرسی پر بیٹھ کر اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"پپا ___! میں کالج میں داخلہ لینے کو سوچ رہا تھا۔"

مجھے اچانک خیال آیا کہ زبیدہ تھرڈ ایئر میں پڑھتی ہے۔ اور شندی نے ایف اے کر کے کالج چھوڑ دیا ہے اسے شاید احساس کمتری ہوا ہو۔ اسے شاید یہ بتاتے ہوئے شرم آئے کہ وہ اس سے پیچھے ہے۔ تب شندی میں سویا ہوا انسان جاگ اٹھا اور جاگ کر کہنے لگا۔

"پپا...... میں کالج میں داخلہ لینے کو سوچ رہا ہوں۔"

پہلی ٹرم تقریباً ختم ہو رہی تھی۔ داخلہ ملنا ذرا مشکل تھا۔ میں نے اسے بتایا لیکن وہ نہیں مانا۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ میں اپنے چند پرانے دوستوں کے ذریعے اسے داخلہ دلوا سکتا ہوں۔ وہ اتنی نرمی اور اتنے التجایانہ انداز میں بات کر رہا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا۔

میں نے اسے داخلہ دلوا دیا۔ اس نے وہی مضامین لئے جو زبیدہ نے لئے تھے۔ اب شاید اس نے زبیدہ کو یہ لکھتے ہوئے اتنی زیادہ شرم محسوس نہ کی ہو۔ اس نے جب اسے خط لکھا تو مجھے بتایا لیکن اس دفعہ وہ تفصیل سے بتانے سے کترا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ اسے میرا بیٹا ہونے کا احساس ہو جانے۔

یہ پہلا دوراہہ تھا۔ جہاں شندی کی ایک ہی ڈگر پر چلنے والی زندگی کسی موڑ پر مڑی۔ اس نے جیسے نئی زندگی شروع کی۔ اسے اپنی زندگی میں پہلی بار شاید احساس ہوا کہ اس کا کوئی ساتھی ہے۔ کوئی ایسی ہستی ہے جسے وہ اپنا... دوست کہہ سکتا ہے۔ تب اسے مقابلہ کا احساس ہوا۔ زندگی کی دشوار دوڑ کا احساس ہوا۔ تب اس نے سوچا کہ اسے زندہ رہنا ہے اپنے لئے نہ سہی... کسی اور کے لئے ہی سہی......!!

دھندلے خوابوں کا یہ سلسلہ پتہ نہیں کب تک چلے......؟ کب تک میرا شندی تکیہ پر سر رکھ کر نیم وا آنکھوں سے اپنے ترتیب دیئے ہوئے خواب دیکھے

اس کے بعد کہانی زیادہ آگے نہیں بڑھی۔ ان کی خط و کتابت شاید جاری رہی لیکن شندی نے اس کے متعلق مجھے کچھ نہیں بتایا۔ وہ اسی طرح خاموش رہا کرتا۔ اپنا کمرہ بند کر کے پڑھا کرتا۔ ویسے وہ کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اکثر آئینہ دیکھتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یوں احساس ہوا کہ جیسے وہ اپنے آپ کو زیادہ بدصورت نہیں سمجھتا۔ ایک دن میں اس کے کمرے میں گیا۔ اس کی میز پر کئی کاغذات پڑے ہوئے تھے۔ ایک سادے کاغذ کے کونے پر میں نے پڑھا۔

"......کتنا ممکن ہے کہ اسی وقت......اسی لمحے......
میری زندگی کا جھرنا خشک ہو جائے۔ اس طرح مرتے
ہوئے میری سب سے آخری خواہش یہ ہوگی کہ میں مسکرا
سکوں۔ ساری زندگی میں نے اس ایک لمحہ کا انتظار کیا
ہے جب میں صحیح معنوں میں مسکرا سکوں، اور اس ایک
لمحے میں کس قدر میری تمنا ہوگی کہ تم میرے نزدیک ہو۔"

پتہ نہیں اُس نے کسے مخاطب کیا تھا ___؟

یہ سب گزری باتیں ہیں...... مرجھائے پھول ہیں......

یہاں اس گھر میں ایک نیا طوفان آیا ہے......

کل شاذی بہت اداس اداس اور گھبرایا آیا تھا۔ آتے ہی وہ اپنے کمرہ میں بند ہو گیا۔ کھڑکی کی درزوں سے میں نے دیکھا۔ وہ اپنے بستر پر پڑا شاید سسکیاں لے رہا تھا۔ (یہ سب کچھ دیکھکر مجھے کس قدر دکھ ہوا ہوگا؟) شام کی چائے کے لئے وہ باہر نہیں آیا۔ میں نے آہستہ سے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں یونہی واپس چلا آیا۔ میں نے چائے نہیں پی..... میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

رات کے کھانے پر وہ نسبتاً زیادہ اداس چہرہ لئے ہوئے میرے سامنے تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا...... کوئی بات نہیں کی...... (میں اس سے کہہ بھی کیا سکتا تھا......؟) وہ خود ہی مجھ سے کہنے لگا کہ اسکا خیال ہے کہ وہ کالج چھوڑ دے..... وہ مجھے بتلانے لگا کہ اب زیادہ پڑھ کر فائدہ ہی کیا......؟ ضرورت پڑی تو یونہی...... کہیں کلرکی وغیرہ کرکے زندہ رہا جا سکتا ہے۔ اس نے مجھے دو تین اور دلیلیں دیں...... مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا...... لیکن میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ یونہی...... ہاں، ہوں کرتا رہا......

اب وہ پھر اپنے کمرے میں چلا گیا ہے...... وہاں وہ شاید رو رہا ہو...... سسکیاں لے رہا ہو...... اور جب میرا شاذی رو رہا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں کچھ نہیں لکھ سکتا، کچھ نہیں بول سکتا، کچھ نہیں سوچ سکتا۔ میرا باپ بجھ گیا ہے، میرا دماغ بجھ گیا ہے، میری زندگی کی ساری شمعیں بجھ گئی ہیں...... میں بھی رو رہا ہوں......!!

(بشکریہ "اردو سائیکولوجی")

عارف عبدالمتین •

اندھیرے اُجالے

گرد اڑتی ہے خیابانِ تصوّر میں مگر
گرد میں چند شرارے بھی ہیں سرگرم خرام
کس کو معلوم ہے کب انکی حرارت کے طفیل
پھول کھل جائیں خیاباں میں کہ شعلے بھڑکیں

تیرے آنچل کی ہوا تیز ہوئی جاتی ہے
بجھ نہ جائے وہ چراغِ تہِ دامنِ خیال
جس کی لَو اُڑتے شراروں کو جنم دیتی ہے
اور اس حادثۂ روح گسل کے دم سے
جشنِ فردا کے وہ امکاں نہ فنا ہو جائیں
جن کے نادیدہ سہارے کی بدولت اب تک
ہم گرانباریٔ امروز سہے جاتے ہیں

ہم تری بزم کے آداب سے آگاہ تو ہیں
اپنا ادراک مگر ان کا گنہ گار نہیں

تیری پیشانی کے مہتاب کی تیکھی کرنیں
اب بھی سینے کے سمندر کی نہاں وسعت میں
ایسا بپھرا ہوا طوفان اُٹھا سکتی ہیں
جس میں بہ جائیں یہ کونینِ پس و پیش جنو

(بشکریہ "تعمیر انسانیت")

درد سعیدی

○

اللہ اللہ حوادثِ غمِ دل
کتنے طوفان بن گئے ساحل

کچھ تو ہو حاصلِ غمِ منزل
دل ہے اور فکرِ سعئ لاحاصل

اللہ اللہ فریبِ مستقبل،
کتنی آسان ہو گئی منزل

میری درماندگی کا غم نہ کرو
زندگی موج زندگی ساحل

اس یقیں پر بھٹک رہا ہوں ابھی
ڈھونڈ ہی لیں گے راستے منزل

ہر قدم پر یہ فکر ہے اے درد
کل کا جادہ ہے آج کی منزل

حبیب کیفوی

○

میں تو پابندئ تقدیر سے معذور سہی
تیری قدرت تو کسی رنگ میں مجبور نہیں

اب جو شرمندہ ہے فریاد تو کیوں لے کے گئی
اس کی درگاہ میں وہ نالہ جو منظور نہیں

لائقِ سجدہ اگر ہے تو اسی کا در ہے
سر جھکاؤں میں کہیں اور یہ منظور نہیں

گوشۂ چشمِ عنایت کی ضرورت ہے فقط
بات بگڑی ہوئی بن جائے کوئی دور نہیں

پردہ عاجز ہے ترا حسن چھپانے کے لئے
لاکھ پردہ میں سہی پھر بھی تو مستور نہیں

شکوۂ جور ہو کیوں، پرسشِ احوال ہو کیوں
شیوۂ عشق نہیں، حسن کا دستور نہیں

بشکریہ ایشیاء

نظر خورجوی •

دیوانِ ذوق مرتّبہ آزاد، تحقیق کے آئینہ میں

براد رم سلام و نیاز -
کی اشاعت کے لئے شکر گزار ہوں
شیر ماہ دسمبر ۵۶ء آج موصول ہوا۔ نومبر دسمبر کے شماروں میں اپنے مضمون "کلام ذوق میں تصرف"
مجھے اس
جیساکہ آپ کو علم ہے یہ مضمون میں ۔ نے کئی ماہ قبل لکھا تھا اور اس عرصہ میں تحقیق سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔
رہا ہوں
عرصہ میں یہ خیال بھی نہیں رہ گیا تھا کہ آپ کو جو مضمون بھیجا ہے وہ نامکمل تھا بہر حال اب اس کی آخری قسط مختصراً لکھکر بھیج
شاید اس توقف کے سبب ان قسطوں میں خاطر خواہ تسلسل نہ آسکے بہر حال فی الحال ناظرین تک میرے خیالات پہنچا دیں۔
میں نے ذوق کی غزل سہ کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
دسمبر میں شائع شدہ قسط کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔
کے متعلق حافظ ویرآن کے خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ظفر کی معلوم ہوتی ہے لیکن خود حافظ ویرآن نے اس غزل کو دیوانِ
ذوق میں شریک کیا ہے چنانچہ ہمیں شبہ کا حق بھی نہیں رہ جاتا ممکن ہے کہ حافظ صاحب نے کسی وجہ سے لکھدیا ہو۔ یا اسی زمین میں
ظفر کی غزل کے متعلق اشارہ مقصود ہو۔ بہر حال ——— تحقیق کے بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ صحیح شعر یہی ہے ؎

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

اور اس کی وہ صورت جو دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد میں مندرج ہے تصرف شدہ ہے -
امید ہے کہ جناب اس تصحیح کو شائع کر دیں گے اور غلطی پر قابل معذرت خیال کریں گے کیونکہ ذوق کے سلسلہ میں قیاس پر
بکثرت زیادہ کام کرنا ہے واقعات کی کما حقہٗ تحقیق انتہائی دشوار ہے۔ والسّلام :- نیاز کیش نظر خورجوی

---

(۱) مولانا محمد حسین آزاد رقمطراز ہیں۔ "کیٹے بیٹھے اشعار کا پڑھنا
مضمون کا اچھالنا اس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا حالتوں کا تصور باندھنا
بھولے بھالے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا...... دن اندھیرے
ہو گئے جب یہ مہم سرانجام ہوئی (دیوان ذوق ؛ :- (د، ص ۱)
اس تحریر سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس دیوان کی ترتیب میں
مولانا نے اپنے موزوں کو بھی دخل دیا ہے۔
(۲) یہ بیس برس تک اس طرح حضور کی خدمت رہی کہ ہر وقت
پاس بیٹھ کر ظاہر باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔ (د - ۲)
مولانا ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے اور ذوق ۱۸۵۴ء میں فوت
ہوئے جب کہ مولانا کی عمر کل بائیس برس کی تھی۔ حیرت ہے کہ مولانا دو برس
کی عمر سے ہی شعر و شاعری کے نہ صرف ظاہری بلکہ باطنی فوائد کیونکر حاصل
کرنے لگے تھے۔
(۳) حاشیہ پر حافظ غلام رسول شوق کے کلام کا نمونہ درج
ہے سہ "مزا انگور کا ہے رنگترے میں" (د - ۲) دیوان ذوق مطبوعہ علمی
پریس لاہور کے دیباچہ میں یہ شعر ذوق کی طرف منسوب ہے (یہ دیوان
نیا سا کسی قدیم ترتیب کی مطبوعہ صورت ہے) خمخانہ جاوید میں بھی اس شعر
کو شیخ کے بچپن کی کاوش بتایا گیا ہے۔
(۴) "استاد مرحوم فرماتے تھے کہ میری عمر ۱۹ - ۲۰ برس کی تھی۔
وہ (حافظ غلام رسول شوق) ان (ذوق) سے خفا رہتے تھے کہ شاگرد میرا
اور مجھے غزل نہیں دکھاتا" (د - ۸) گویا شیخ ذوق حافظ شوق کے شاگرد

۱۹، ۲۰ برس کی عمر تک ہے۔ یا اس عمر سے ان سے صلاح یعنی ترک کی اور شاہ نصیر سے اصلاح لینی شروع کی تھی۔

(۵) اسی سلسلہ میں مولانا آزاد لکھتے ہیں "ایک دن ایک چوبدار آیا......کہاکہ نواب صاحب نے دعا فرمائی ہے........ اور فرمایا ہے کہ........ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے........ اس دن سے معمول ہوگیا........ ان سے غزل لے آتے اور صلاح کی ہوئی دے آتے"۔ (د۔ ۸، ۹)

یعنی اس زمانہ میں جب کہ شیخ نے حافظ شوق سے صلاح لینی ترک کی تھی وہ (ذوق) نواب الٰہی بخش خاں معروف جیسے کہنہ مشق اور سن رسیدہ بزرگ کو صلاح دینے لگے۔ ذوق کی استادی مسلم لیکن یہ بات گلے سے نہیں اترتی کہ جب وہ خود حافظ شوق کو چھوڑ کر شاہ نصیر کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کر رہے ہیں اس وقت وہ کسی کو صلاح کس طرح دے سکتے تھے؟ اسی سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں:۔ دلی میں آب حیات کو دیکھ کر بعض اشخاص نے مجھ سے کہا کہ ایسا کہنہ مشق صاحب کرامت بزرگ ایک نوجوان کا بزرگ کیونکر ہوا ہوگا.. میں کیا کہوں استاد کی صحبت میں کئی دفعہ ان صحبتوں کا اور اصلاحوں کا ذکر ہو جاتے تھے۔ دو غزلوں کے اصل مسودے اب تک میرے پاس موجود ہیں دکھاؤں کسے........ (د۔ ۱۲)

گویا استاد ذوق اکثر و بیشتر اپنی علمیت جتانے کے لئے ان صحبتوں کا ذکر کرنے بیٹھتے تھے۔ ذوق جیسے فقیر صفت آدمی سے یہ متوقع نہیں۔ پھر مسودات والی بات بھی کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتی ورنہ نواب ضیاءالدین خاں برادر نواب احمد سعید خاں طالب کو مولانا ضرور دکھا سکتے تھے جنہوں نے باقاعدہ مباحثہ کے بعد اس واقعہ کی تردید کی (خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۲۷۱ پر تفصیل دیکھیں)

(۶) شاہ نصیر سے ردیف "آتش و آب و خاک و باد" میں معرکہ ہوا۔ (۴) کی روشنی میں اس وقت ذوق کی عمر بیس برس سے زائد تھی۔ ذوق نے مطلع کیا :۔

مرمرد کوہ میں ہوں اگر آتش و آب و خاک و باد
آج نہ چل سکیں گے پہ آتش و آب و خاک و باد (د۔ ۱۳)

یہی مطلع قصائد کے ساتھ اسی دیوان کے صفحہ ۲۵۲ پر اس طرح سے درج ہے:۔

کوہ اور آندھی میں ہیں گر آتش و آب و خاک و باد
چل نہ سکیں گے آج پر آتش و آب و خاک و باد

اور یہ صورت تصرف شدہ ہے فرق ظاہر ہے۔

(۷) اس واقعہ کے بعد تکمیل علوم و سیر کتب کا شغل واجب ہوگیا (د۔ ۱۴) اور اس کے بعد شیخ نے "ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ سنایا........ اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی" (۱۵، ۱۶) ملاحظہ فرمائیے کئی برس پہلے عمر ۱۹، ۲۰ برس تھی اور اب کل ۱۹ برس رہ گئے۔ گویا یہ عمر کا حساب محض قیاسی ہے اور وہ بھی غلط۔

(۸) میر کلو حقیر نے فرمایا:۔ "بھئی انصاف شرط ہے کلام کو بھی تو دیکھو ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا برا کیا"۔ اس کے جواب میں استاد کا ارشاد ہے کہ: "بے انصافوں ہی میں سے کوئی با انصاف بھی بول اٹھتا ہے"۔ (د۔ ۱۶) یقین نہیں آتا کہ ذوق نے میر حقیر کے متعلق جو ان کے قدیم محسن اور کرمفرما تھے اس قسم کے سخت الفاظ کس طرح کہے ہوں گے؟

(۹) قوت حافظہ کے باب میں ایک ماجرا عالم شیرخواری کا انھوں نے بیان کیا........ "ایک بلی لحاف میں گھس آئی........ جب بڑا ہوا تو میں نے والدہ سے پوچھا انھوں نے یاد کر کے اس واقعہ کی تصدیق کی اور کہا کہ فی الحقیقت اس وقت میری عمر برس دن سے کچھ کم تھی" (د۔ ۱۹، ۲۰) یہ لطیفہ بھی کسی حد تک فرضی سا معلوم ہوتا ہے۔

(۱۰) پنڈت تلسی رام جوتشی نے بتایا کہ:۔ "۶۷، ۶۸ حد ۶۹.. اور خدا کی قدرت کہ ۶۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا"۔ (د۔ ۲۴) لیکن یہ غلط ہے شیخ ذوق ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ اگست ۱۷۹۰ء میں پیدا ہوئے اور صفر ۱۲۷۱ھ نومبر ۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے گویا قمری حساب سے چھیاسٹھ سال کچھ ماہ اور شمسی حساب سے چونسٹھ برس اور تین ماہ کی عمر پائی۔

(۱۱) فرماتے تھے کہ بچپن میں جب کہ ۱۵، ۱۶ برس کی عمر تھی ہم نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا"۔ (د۔ ۲۶) ۴ سے ثابت ہے کہ انیس برس کی

تک حافظ شوق سے صلاح لی گویا بالکل مبتدی تھے چنانچہ ۱۶۰۱۵ برس کی عمر میں دیوان مرتب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۱۲) نواب زینت محل بیگم کے مکان کی تاریخ "استاد نے دہیں بیٹھے بیٹھے کہدی" (د۔ ۳۹) ؎

کر دلے ظفر زینت محل تعمیر نصر بے بدل
تاریخ گفتم بر محل این خانۂ زینت محل

اس میں ظفر کا تخلص موجود ہے چنانچہ بغیر کسی سند کے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ یہ ظفر کی نہیں ذوق کی کاوش ہے۔

(۱۳) دیوان چندو لال نے ان کا کلام سن کر مصرعہ بھیجا اور بلا بھیجا آپ نے غزل بھیجدی اور مقطع میں کہا :۔

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

انھوں نے خلعت اور پانچسو روپے بھیجے مگر یہ نہ گئے۔ (د۔ ۴۰) یہی واقعہ اسی دیوانِ ذوق کے صفحہ ۱۰۸ پر اس طرح درج ہے :" دیوان چندو لال نے کئی ہزار روپے بھیجکر بلایا اور مصرعہ اپنی طرح مشاعرہ کا بھیجا حضرت مرحوم نے زمین مذکور میں دو غزل لکھکر بھیجدیا اور روپیہ نہ لیا" مقطع اس طرح تحریر ہے ؎

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدر سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

نہ جانے کی وجہ دونوں مواقع پر الگ الگ تحریر ہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ مرتب نے تحقیق سے قطعاً سروکار نہیں رکھا اور جہاں جو مناسب سمجھا... لکھدیا۔ ذوقؔ کی غزل ہے :۔ ؎

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلف سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دستِ موسیٰ جس میں اخگر آتش ہو

اس کے متعلق جو دیوانِ ذوق میں مذکور ہے اس سے مختلف حکایت آب حیات میں درج ہے جو مولانا آزاد ہی کی تصنیف ہے غرض یہ کہ اختلافات بہت کافی حد تک ملتا ہے جو دیوان ذوق کو خود بخود مشکوک بنا دیتا ہے۔

(۱۵) شیخ ناسخ کا پہلا دیوان انھیں دنوں ہمارے یہاں آیا تھا اس کی غزلوں میں سے کوئی مصرعہ لے لیتے اور اسی پر استاد غزل کہتے تھے۔ (د۔ ۵۵) اس کے بعد یہ غزل درج ہے :۔

یوں تو خاکی میں دل روشن ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا

لیکن دیوان ناسخ اول میں اس زمین میں غزل نہیں ہے البتہ جلد دوم میں ہے معلوم نہیں کہ مولانا نے "پہلا دیوان" سے کیا مطلب لیا ہے۔ پھر اس مطلع کا مصرعۂ اولیٰ اس طرح ہے ؎

نام یوں پستی میں بالاتر ہمارا ہو گیا۔ اول الذکر صورت غلط ہے

(۱۶) شیخ ناسخ کی زمین میں ذوق نے ایک غزل کہی اس پر ایک مطلع یہ بھی درج ہے :۔ ؎

سرو عاشق ہو گیا اس غیرت شمشاد کا
غل مچایا قمریوں نے ہے مبارکباد کا

حالانکہ یہ مطلع ناسخ کا ہے دیوان ناسخ دوم میں مندرج ہے البتہ مصرعۂ ثانی اس طرح ہے۔ ؎

غل مچایا قمریوں نے بھی مبارکباد کا

(۱۷) کلام میں لفظی و معنوی تصرفات کی مثالیں ہم گذشتہ اقساط میں کافی پیش کر چکے ہیں۔ یہ تصرفات اگر تعرف کی حد تک ہوتے تو بھی خیر تھی۔ یہاں تو پوری غزلیں مولانا آزاد نے خود کہہ کر دیوان ذوق میں داخل کر دی ہیں۔ حسب ذیل چودہ غزلیات کے متعلق اختر شیرانی نے اپنے مقالہ "دیوان ذوق میں مولانا آزاد کا اضافہ" میں ثابت کیا ہو کہ یہ مولانا کی ہیں جو انھوں نے ذوق کی طرف منسوب کر دی ہیں۔

الف مرض عشق جسے ہو اسے کیا یاد رہے۔
ب چشم قاتل ہمیں کیوں کر بھلا یاد رہے۔
ج خدا نے میرے دیا سینۂ لالہ زار مجھے
د تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے۔
س پہ یہ دل سے ستمگر پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
ص حذر قہر سے وصف جبیں ہے صنم پر سے
ط ذکر شرگاں جس کا تیرے روبرو نکلا کرے
ع خم ابرو ترا جب یار نظر آتا ہے۔
ف نہ دیں گواہی جو داغ کہن نہیں دیتے
ک دکھلا نہ خال زلف تو اے گلبدن مجھے

م   مار کر تیرچودہ دلبر جانی ملنگے
ی   ہم سے ظاہر و باطن جو اس غارت گر کے جھگڑے ہیں

آخرالذکر غزل کے متعلق مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ "عالم شباب کی غزل ہے یہ بھی بادشاہ کو پسند آگئی تھی"۔ یہاں کئی باتیں غور طلب ہیں۔ اول یہ کہ ظفر ۱۲۵۳ھ میں تخت نشین ہوئے اس وقت ذوق کی عمر ۴۹ برس کی تھی ظاہر ہے کہ شباب نہ تھا دوم یہ کہ اس غزل میں کوئی ایسی خاص بات نہیں جس کی وجہ سے اسے خصوصاً پسند کیا جائے سوم یہ کہ مقطع میں بادشاہ ظفر کی شکایت ہے نہ تو ذوق اس کو بادشاہ تک پہنچنے دیتے اور نہ بادشاہ اپنی شکایت کو پسند کرتے گویا یہ حکایت کہ یہ بادشاہ کو پسند آگئی تھی اور اس سے یہ ثابت کرنا کہ عموماً بادشاہ استاد کی غزلیں لے لیا کرتے تھے محض گڑھی ہوئی ہے۔ جب یہ غزل ذوق کی ہے ہی نہیں تو اس میں حکایت کے گڑھنے کا مطلب ظاہر ہے کہ ظفر کو بدنام کرنے کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ دیوان میں ان چودہ کے علاوہ اور بھی متعدد غزلیں ہیں جن کے متعلق گمان ہے کہ وہ بھی کلام ذوق میں اضافہ ہو۔

یہ اضافہ بعض اوقات تو نہایت افسوسناک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر ہے :-

عاجزی سے بے آئے نہ ہوا میں کمزور

موت سے جیو | نٹی کی ہو دیں | اگر پر | پیدا
فاعلاتن | فعلاتن | فعلاتن | فعلن

مصرعہ ثانی غیر موزوں ہے تیسرے رکن کا وزن فعلن آتا ہے۔

اسی طرح یہ مصرعہ :-

نگاہ چشم | سر (مہ) آلو | دسے بھی جو | مکدر ہو
مفاعیلن | مفاعیلن | مفاعیلن | مفاعیلن

دوسرے رکن میں "مہ" زائد ہے۔ ہم نہیں کہتے کہ یہ اشعار اصل صورت میں بھی ذوق کے نہ رہے ہونگے لیکن موجودہ صورت میں ان کو ذوق کی طرف منسوب کرنا محض ظلم ہے ذوق سب کچھ کہہ سکتے تھیں لیکن غیر موزوں نہیں کہتے آجتک ان کے کسی دشمن نے بھی ان پر اعتراض نہیں کیا غیر موزوں مصرعے دیوان ذوق میں اور بھی مل سکتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے ذوق کی شاعرانہ حیثیت پر اس طرح کوئی حرف نہیں آتا جس طرح ان تصرفات سے ——— ہمارے ناقدین نے ذوق کے خلاف کیا کیا کچھ نہیں لکھا لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے ان تمام تصرفات کا ذمہ دار کبھی فقط ہی کو ٹھیرایا اور وہ تمام عیوب انھوں نے ذوق کے کلام کی خصوصیات میں شمار کر لیے ہیں جو ان تصرفات کی وجہ سے ان کے کلام میں پیدا ہو گئے تھے۔ ہم نے ذوق کا صحیح کلام بڑی حد تک حاصل کیا ہے ظاہر ہے کہ کسی شاعر پر صحیح تنقید اسی وقت ممکن ہے جب کم از کم اس کا صحیح کلام تو پیش نظر ہو۔

(تمام شد)

فضا ابن فیضی ●

ابھی سویرا ہوا نہیں ہے!

یہ وقت کی "سوگوار جنت" یہاں کوئی آ کے خاک بہلے
یہ اور شے ہے سیاہ خانے کو جلوہ خانہ تو آج کہہ لے
چراغ کس نے اس انجمن کے بجھائے ہیں سحر سے پہلے
ابھی اندھیروں کا داغ مشکیں جبینِ شب سے مٹا نہیں ہے

ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

مری شبوں کے غزل کدے میں کبھی ستارے بھی گنگنائے
تجلیوں کے سلام ہی کب مرے اندھیروں کے نام آئے
سحر کے آثار ہیں افق پر کہ رات کے زرنگار سائے
مرے افق کے اس آئینے میں سحر کا پرتو پڑا نہیں ہے

ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

نسیم کی نرم رہگذر سے تو بوئے گل بدحواس گذری
چمن کے ماحول میں بھی رہکر بہار اکثر اداس گزری
تری نوازش کو کیا کہیں ہم کہ زندگی محوِ یاس گذری
مژہ پہ خوں رنگ آنسوؤں کا چراغ ابھی تک بجھا نہیں ہے

ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

ادا شناسِ ایاز ہو جو وہ عشقِ محمود ڈھونڈھ لاؤں
جو زندگی کا ہو حسن رنگیں وہ حاصلِ سود ڈھونڈ لاؤں
یہ دل کا ہے دیر سے تقاضا نظر کا مقصود ڈھونڈ لاؤں
نظر نے جلوے ہزاروں دیکھے کوئی سراپا ترا نہیں ہے

ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

سنوار لوں شوخیٔ وفا سے محبتوں کی سحر تو آؤں
خطِ گہربار کہکشاں سے تراش لوں رہگذر تو آؤں
نہیں ہے دور اوجِ شاخِ گل بھی کھلیں ذرا بال و پر تو آؤں
ہوائے صحنِ چمن ہی لیکن ذرا ابھی پر کشا نہیں ہے

ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

ترے تدبر نے ناپ ڈالے سوادِ امکاں کے فاصلے تک
مگر نہ تیری نگاہ پہنچی خود اپنی ہستی کے زاویے تک
ترا مذاقِ طلب کبھی لے گیا ترے بت کدے تک
تو اس صدی کا ہر غزنوی سومنات سے آشنا نہیں ہے

ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

مزاجِ غربت کا پوچھتا ہے ابھی غرورِ جہاں پناہی
یہ آفتابوں کے جام زریں انڈیلتے ہیں ابھی سیاہی ۲
خزاں کو آواز دے رہی ہے چمن کے ہر موڑ پہ تباہی
بہار کا یہ "گلِ نخستیں" بہار سے آشنا نہیں ہے
ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

نفس نفس موجِ کجروی ہے نظر نظر گمرہی کا خاکہ
صداقتیں کذب کا تراشہ حقیقتیں ابلہی کا خاکہ
ہر زندگی کا نگار خانہ جنون و کم آگہی کا خاکہ
جنوں کی اس بھیڑ میں تو اب آگہی کا کوسوں پتہ نہیں ہے
ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

غلام و دیبا و پرنیا کے ہیں آج خارا تراش کتنے
جنوں کے اس فرش پر خرد کے ہیں آئینے پاش پاش کتنے
"خلیلِ ملت" کے بھیس میں ہیں ہنوز "آذر قماش" کتنے
نگاہ پاکیزہ، سینہ روشن خرد ہنر ماجرا نہیں ہے
ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

فلاحِ دنیا کا جو ہے ضامن وہ صاف ستھرا سماج دیکر
معاشرت کے الم کدے میں مسرتوں کو رواج دینے
زر و گہر کے خدا اٹھے ہیں سرِ غریبی کو تاج دینے
ابھی گریباں کے چاک سے تو یہ چاکِ داماں ملا نہیں ہے
ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

بہت سے ہیں اور بھی جہاں مہر و ماہ کے اس جہاں سے آگے
مرے نشیمن کی خلوتیں ہیں سوادِ برقِ تپاں سے آگے
جنوں مجھے لے کے چل پڑا ہے مقامِ سود و زیاں سے آگے
مقامِ سود و زیاں سے آگے ترا کوئی راستا نہیں ہے
ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

جہانِ خاشاک خار و خس کو کچھ اور درکار ہے حرارت
ترے نشیمن مرے قفس کو کچھ اور درکار ہے حرارت
ابھی مغنی کے ہر نفس کو کچھ اور درکار ہے حرارت
ابھی سوادِ عجم کا شاعر "پیمبرِ ارتقا" نہیں ہے
ابھی سویرا ہوا نہیں ہے

(بشکریہ "معیار")

افتخار اعظمی

صورتِ گل جو مرا زخمِ جگر آج ہوا
نالۂ درد بھی معمورِ شرر آج ہوا

دلِ محزوں پہ ہے پھر غم کی گھٹاؤں کا ہجوم
امتحاں پھر ترا اے دیدۂ تر آج ہوا

ہر خطِ جادہ ہوا محوِ تماشائے جمال
منزلِ شوق سے تیرا جو گزر آج ہوا

کتنے مرغانِ نوا سنج قفس تک پہنچے
صحنِ گلشن میں عجب فیضِ سحر آج ہوا

سوزِ غم سینے میں جب تک تھا، رہا جبرِ فروغ
بن کے آنسو جو یہ ٹپکا تو گہر آج ہوا

دعوتِ مرگ ہے پابندیٔ ایوانِ چمن
نکہتِ گل سے تقاضائے سفر آج ہوا

خُمِ گردوں سے چھلکتی ہے مئے نابِ نشاط
عشق پھر زینتِ ایوانِ سحر آج ہوا

عندلیبانِ چمن کو دلِ پُر سوز ملا
لالہ و گل کی دعاؤں میں اثر آج ہوا

ذوقِ رم آہوئے تاتار کو جس نے بخشا
نغمہ پیرا وہ باندازِ دگر آج ہوا

تازگی پھول سے لی، حسن بہاروں سے لیا
پھر کہیں جا کے یہ اک نغمۂ تر آج ہوا

پا بہ زنجیر ہوا اور شوریدہ مزاج
یہ تماشا بھی سرِ راہگذر آج ہوا

کوچۂ یار سے آئی ہے جو مستانہ صبا
نکہتِ زلف سے معمور ہوئی ساری فضا

اتنی دلکش ہے تری یاد کہ ہوتا ہے گماں
لوٹ آئے نہ کہیں عہدِ تمنّا میرا

پردۂ حسن ہے خود باعثِ تحریکِ نظر
نہ اٹھا، دوست! نقابِ رخِ زیبا نہ اٹھا

چاہنا انکو اگر جرم ہے اے ناصحِ سُن!
ہم کو منظور ہے اس جُرمِ محبت کی سزا

اب جفا چھوڑ دیں یہ اہلِ جفا، ورنہ انھیں
ڈھونڈھنے سے بھی ملیگی نہ کہیں رسمِ وفا

چند میکش تو پئیں اور رہیں ہم محروم
میکدہ، ساقیٔ محفل! تری میراث ہے کیا

وہ ڈریں دار و رسن سے جنھیں ہو پاسِ حیات
ہم تو جاں دادۂ اُلفت ہیں، سزا ہو کہ جزا

ق
کون آتا ہے نظر یہ سرِ دامانِ بہار
کون دیتا ہے مجھے پردۂ گل سے یہ صدا

ڈھونڈتی ہیں کسے بیتاب نگاہیں میری
شوق میں کس کے میں آوارہ ہوں مانندِ صبا

ساکنانِ حرم و دیر! بتاؤ تو سہی
تم کو معلوم ہے کچھ منزلِ جاناں کا پتہ

گوشِ دل سے کوئی سنتا ہی نہیں!
ورنہ دلکش ہے بہت سازِ محبت

علی احمد شاہدی •

چاچا

آخر کار جب منّو کبا ڑیئے سے بھی نہ رہا گیا تو اس نے چاچا سے پوچھا

" چاچا تو بچوں کو بلا کیوں نہیں لیتا ؟ میں کہتا ہوں چاچا تیری رُوح بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کے تصوّر سے کانپ کیوں نہیں اٹھتی ۔؟ اگر کوئی اور تیری جگہ ہوتا تو بچوں کی ناداری کا حال سن کر کب کا دیوانہ ہوگیا ہوتا، لیکن تیرا دل ہے کہ پسیجتا ہی نہیں "

اور چاچا نے تلخی سے مسکرا کر کہا :۔

" منّو ! تو جانتا ہے، میری بیوی کالی ہے ۔ اس کی آواز بھونڈی اور بھدی ہے اس کے ہونٹ موٹے اور سیاہ ہیں ۔ اور جسم سوکھا اور لانبا "

منّو کے دل پر چوٹ سی لگی اور حیرت سے اس نے چاچا کو دیکھا، اسے چاچا کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا ۔ وہ سوچنے لگا ۔ چاچا اس قدر تبدیل کیوں ہوگیا ہے، اس کے خیالات میں یہ تغیّر کیسا ؟

اور منّو کو غم کیوں نہ ہوتا ۔ چاچا سے اس کے تعلقات کوئی آج کے تھوڑے تھے ۔ چاچا سے اس کا یارانہ برسوں پرانا تھا ۔ سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی منّو وہ دن نہ بھول سکا تھا جب چاچا نے اس کی دستگیری کی تھی ۔ وہ تین دن کا فاقہ زدہ، ماٹھتا ہوا چاچا کی دکان کی طرف آنکلا تھا ۔ چاچا الٰہ آباد کا بہت مشہور قلعی گر تھا ۔ اس کے یہاں برتن بھانڈوں کے انبار لگے رہتے تھے ۔ اس روز چاچا نے اسے پیٹ بھر روٹی کھلائی اور پھر دس رُوپلے ماہوار پر اسے اپنے یہاں ملازم رکھنے کی پیشکش بھی کی ۔ تو اس کی یہ پیشکش منّو نے خوشی سے منظور کرلی تھی ۔ وہ منّو کے بارہ کے دن تھے کوئی پندرہ سولہ کا سن ہوگا ۔ وہ دن اور آج کا دن اس نے چاچا کا ساتھ نہیں چھوڑا ۔

پھر وہ برسوں چاچا کی دکان پر کام کرتا رہا ۔ وہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہوگئے ۔ گھل مل گئے ۔ اتنا کہ کوئی بات ان کے درمیان چھپی ڈھکی نہ رہی ۔ وہ عمر اور بزرگی کا لحاظ کئے بغیر ایک دوسرے کے مذاق میں شریک ہوتے ۔ آنے جانے والوں پر فقرے کستے اور قہقہے لگاتے ۔

بھٹی کے سامنے بیٹھے ہوئے وہ برتنوں کو نئی آب و تاب دینے کے جتن کرتے اور کوئی دیہاتی لڑکی سامنے سے گزر جاتی ۔ مشکی رنگ، بھرے بھرے گال، گٹھیلا جسم، پاؤں میں جھانجن ...... قدم قدم پر بجتی ہوئی چھما چھم ...... چھم ...... چاچا دل پر ہاتھ رکھ لیتا ، منّو ہنس دیتا ۔ وہ چھمچھماتی ہوئی دکان کے پاس آتی اور کوئی برتن دکھا کر پوچھتی :۔

" ای برتن کا قلعی کرائی کیا لیہو مستری جی ؟ "

چاچا برتن لیتے ہوئے اس کی سانولی انگلیوں کا جائزہ لیتا ۔

" چار آنے لے لیں گے مہاراجن، یہ تمھارے واسطے رعایت ہے "

" کاہے سرمندہ کرت ہو " چھم چھم بولتی ۔

" کیسی بات کرت ہو مہاراجن، تہار اپنی دکان ہے، رام جانے "

چھم چھم مسکرا دیتی ۔ چاچا ہنس دیتا ۔ منّو کے ہونٹ کھل اٹھتے دکان جگمگا اٹھتی اور تھکن دور ہو جاتی ۔

وہ میٹھے دن اور میٹھی راتیں بیوہ کے سہاگ کی طرح گزر گئیں ۔ پاکستان و ہند کی علیحدہ علیحدہ سلطنتیں بن گئیں مسلمان آبادی پاکستان کو منتقل ہوگئی ۔ کاروبار مندا پڑگیا ۔ ہندو حلوائیوں نے کہا :۔ " بس ! مٹھائی کا کھانا تو مسلمین جانیں تھے " بزاز دن دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے اور شام کو دکان بند کرتے ہوئے مایوسی سے کہتے ۔ " مسلمان کیا گئے کہ کپڑے کی بکری بھی گئی " ہوٹل ویران ، بازار بھی بے رونق ۔ شہر کی ساری فضا سوئی سوئی سی، ٹھہری ٹھہری سی ۔

ایک شام جب سڑکوں سے ایسے ہی ہوتی پن ٹیک رہا تھا، چاچا نے فکرمندی سے دور تک دکانوں پر نگاہ دوڑائی ۔ اکا دکا گاہک کانوں میں کھڑے نظر آرہے تھے ۔ اس نے منّو سے کہا :۔

" منّو بھائی ! " وہ ہمیشہ اسے پیار سے منّو بھائی ہی کہا کرتا تھا ۔

ب توساری مسلمان آبادی پاکستان کو ڈھلی جارہی ہے پھر ہمارا روبار بھی بول گیا ہے، پاکستان چلنے کی تیاری کرنا ہی پڑے گی۔"

"ہاں چاچا! تیرا خیال بھی ٹھیک ہے۔ میں بھی تجھ سے یہی کہنے لا تھا۔ جب کاروبار ہی نہ ہوگا تو یہاں کھائیں گے کیا؟"

"تو پھر باندھ لے بستر بوریا۔"

یہ کہکر چاچا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور وقت سے پہلے دکان بند کردی۔ چند دنوں کے بعد ہی چاچا نے دکان کا تصفیہ کردیا۔ اور وہاں ایک ہندو بنیئے نے پرچون کی دکان کھول لی۔ چاچا تو جیسے پا بہ رکاب بیٹھا تھا۔ منو کو کوئی عذر نہ تھا۔ نہ کوئی رشتہ نہ ناتا۔ چاچا ہی اس کا سب کچھ تھا۔ وہ چاچا کو کسی شرط پر چھوڑنا نہ چاہتا تھا، اور یوں بھی چاچی اسے اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ چاچی جو ایک اَن پڑھ، سادہ لوح اور فرمانبردار عورت تھی۔ اور منو نے بھی چاچا کی اطاعت اور خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ چاچا کا ایک بیٹا بھی تھا گیارہ بارہ برس کا، اور ایک بیٹی کوئی پانچ چھ برس کی۔

بارے پاکستان روانہ ہونے کی تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ طے پایا کہ چاچی اور بچوں کو فی الحال یہیں چھوڑا جائے۔ کام دھندے سے لگتے ہی انھیں بلالیا جائے گا۔

چاچا اور منو کی روانگی کا دن آپہنچا۔ باہر تانگہ آکر کھڑا ہوگیا۔ اور رخصت ہوتے وقت چاچا کا لڑکا آنکھوں میں آنسو بھر کے سامنے آکھڑا ہوا۔ چاچا نے اسے دیکھکر آنکھیں چرالیں۔ مبادا اس کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں پھر منی بڑھی اور چاچا کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"ابا کہاں جارہے ہو ...... کب آؤگے؟"

اب منی کے آنسو چاچا سے نہ دیکھے گئے اور وہ بھی رو دیا۔ اس نے منی کو اپنے قدموں سے علٰحدہ کیا تو وہ اور بھی بلکنے لگی، اور منو سے لپٹ گئی۔

"بھائی جان تم بھی جارہے ہو ...... کب آؤگے؟"

منو نے بے تاب ہوکر اسے گود میں اٹھالیا اور جیب سے فوراً چاندی کی چار ننھی ننھی چوڑیاں نکال کر منی کے ہاتھ میں پہنا دیں ..... اور منی چوڑیاں دیکھکر مسکرادی۔ اس کے ننھے ننھے معصوم ہونٹوں پر مسکراہٹ یوں پھیل گئی جیسے اندھیری رات میں دور کہیں ٹمٹماتا ہوا دیا نظر آجائے آنسو اس کی آنکھوں میں بہہ نکلنے کے لئے اب بھی مچل رہے تھے۔ اور وہ مسکرائے جارہی تھی۔

پھر وہ یونہی ہونٹوں پر مسکراہٹ کا نور اور آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند لئے ماں کی گود میں چلی گئی ...... "ماں چوڑی ...!" اس نے اپنے دونوں ہاتھ بڑے بھولے پن سے ماں کے سامنے پھیلا دیئے۔

لیکن ماں چوڑی دیکھکر مسکرائی نہیں بلکہ آنسوؤں کے چراغ کو جلانے لگی۔ اور ان چراغوں کی لَویں لئے باہر ڈیوڑھی تک چاچا اور منو کو الوداع کہنے آئی۔ اور ڈیوڑھی ہی میں اس وقت تک خلوص و محبت کا یہ ہی نذرانہ لئے کھڑی رہی، جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئے۔

انھیں پاکستان پہنچ کر بہت دنوں تک در بدر کی خاک نہیں چھاننا پڑی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد چاچا کو کسی کارخانے میں دن کی چوکیداری مل گئی۔ اور منو کو لکڑی کے بنے ہوئے بڑے بڑے کیبنوں میں سے ایک الاٹ ہوگیا، جس میں منو نے کباڑیئے کی دکان کھول لی۔ جس سے اسے بہ صد مشکل ایک وقت کی روٹی میسر آنے لگی۔ مکان کا مسئلہ اب بھی درپیش تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے شہر میں چاچا نے ایک کوٹھڑی کرایے پر لے لی۔ لیکن منو نے اپنے رہنے کا انتظام چاچا کی رضامندی سے اسی کیبن میں کرلیا۔

چاچا کی یار باش طبیعت نے بہت جلد اپنے مذاق کے دوست پیدا کرلیئے۔ شام کو چاچا کی بیٹھک عام طور پر منو کی دکان پر ہوا کرتی، اور اس کے یار دوست بھی وہیں دھڑا دھڑ بیٹھ جاتے۔ چلم یا حقے کا دور چلتا۔ غپ شپ ہوتی، قصے کہانیوں کا تانتا بندھ جاتا۔ نئی فلموں پر رائے زنی کی جاتی اور نصف رات کے قریب یہ لوگ منتشر ہوتے۔

منو کو چاچا کے یہ اوباش اور اجڈ دوست ایک آنکھ نہ بھاتے تھے، وہ ڈرتا تھا کہ چاچا بھی ان مستوں کی صحبت میں رہ کر بگڑ نہ جائے ... لیکن اس خیال سے زبان نہ کھلتی تھی کہ چاچا برا مان جائے گا۔ اور یہ منو کو کسی طرح گوارا نہ تھا۔

آخر جس بات کا خطرہ تھا، وہی ہوئی، چاچا ان کی بے سر و پا اور مہمل گفتگو اور فحش مذاق میں لطف لینے لگا۔ وہ ان بے فکروں کی لمبی چوڑی باتوں میں اتنا محو ہوجاتا کہ اسے کھانے پینے اور سونے تک کا ہوش

نہ رہتا۔ منو کے لئے سچ وہ بات یہ تھی کہ چاچا نے ابھی تک بچوں کو خیریت سے پہنچنے کا ایک کارڈ بھی نہ ڈالا تھا۔ بلکہ یاد دہانی کے باوجود کوئی توجہ نہ کی تھی۔

انہی دنوں چاچا کے دوستوں میں ایک کا اضافہ اور ہوا۔۔۔ وہ یوں کہ ایک شام منو نے دیکھا کہ چاچا کے ہمراہ ایک صوفی جی چلے آ رہے ہیں..... چاچا نے انھیں بڑی عزت سے دکان پر بٹھایا۔ حقہ پیش کیا۔ وہ حقے کے کش پر کش لینے لگے۔ منو خاموش بیٹھا ان کی وضع قطع اور چہرے مہرے کا جائزہ لینے لگا...... شانوں پر بکھرے ہوئے دراز گیسو، دبلا چہرہ، بھاری پلکیں، نشہ آلود سُرخ آنکھیں، جسم پر لمبا کُرتہ، اور تہمد۔ باتوں میں دلاّلوں کی سی بناوٹ ...... چاچا نے مقدور بھر انکی خاطر و تواضع کی۔ اس روز تو شاہ جی زیادہ دیر نہ ٹھہرے، لیکن ۔ پھر بلا ناغہ حاضری دینے لگے۔ شاہ جی اکثر دکان پر بیٹھے ہوئے حقے کے دو چار کش لگاتے ہی "برّی !!" کا زوردار نعرہ لگا دیتے، .... اور منو ایک دم چونک پڑتا۔

صوفیوں اور ملنگوں کی صحبت میں رہکر کس کی کایا نہیں پلٹ جاتی۔ چاچا کی دوستی بھی رنگ لائی۔ اور اس کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ طور سے بے طور ہو گئے۔ شاہ جی کے ساتھ اسے بارہا سینما ہال میں دیکھا گیا۔ راتوں کو اب دوکان پر جمگھٹ نہ رہتا۔ بلکہ چاچا رات گئے تک شاہ جی کے ساتھ غائب رہتا۔ ایک روز تو منو نے خود چاچا کو شہر کی مشہور کنچنی کے کوٹھے پر جاتے دیکھا۔ اس روز سے منو کے دل پر غم کا بوجھ بڑھ گیا۔ اور اسے صورتِ حال کی نزاکت کا شدید احساس ہوا۔ ...... وہ اسی رات چاچا پر برس پڑا۔

"چاچا ۔ ! تو اس چرسی ملنگ کا ساتھ چھوڑ دے ورنہ میں تیرا ساتھ چھوڑ دوں گا۔"

اور چاچا ہنسے :۔

"تو نہیں جانتا منو دنیا کے رنگ ڈھنگ۔"

پھر شاہ جی نے چاچا کی دعوت کی...... منو کی دکان کی، پشت پر چند کوارٹر بنے ہوئے تھے...... کہا جاتا ہے کہ انگریزی عہد میں کسی بڑے انگریز فوجی افسر نے یہ کوارٹر اپنے گھوڑوں کے اصطبل کے لئے تعمیر کرائے تھے۔ اسے پولو اور ریس کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ جب وہ ریٹائر ہو کر ولایت جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ تو اس کا بڑا خانساماں دادو اس کے قدموں پر گر کر رونے لگا۔ "سرکار! ہمارے پیٹ کا تو کچھ انتظام کرتے جائیے....."

افسر کا دل پسیج گیا۔ اور اس نے اطمینان دلایا۔ "تم ورّی نیئں کریں گا۔ دادو یہ سب کوارٹر تمھارا نام کر دیا جائیں گا۔"

چنانچہ دادو ان اصطبلوں کا بلا شرکتِ غیرے مالک بن گیا۔ اب یہی دادو چودھری اللہ داد کے نام سے بھاری سی پگڑی باندھے تانگے پر ہر ماہ ان کوارٹروں کا کرایہ وصول کرنے آتا ہے اور بات بات پر کرایہ داروں کو موٹی موٹی گالیاں دیتا ہے۔

"غلام کا پُوت۔" اس کا تکیہ کلام ہے۔ ایک مرتبہ کسی جیالے، کرایہ دار کی غیرت جاگ اٹھی۔ اور وہ بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"سُن چودھری! اپنی زبان کو لگام دے، ورنہ تیری پگڑی اُچھال دُوں گا۔" اور چودھری نے فوراً اپنے تانگے کا رُخ تھانے کی جانب موڑ دیا..... تھانیدار بخت خان سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ بخت خان نے دو کانسٹیبل بھجوا کر اس کرایہ دار کو پکڑوا لیا۔ اور محلّے میں بدامنی پھیلانے کے جُرم میں دس بید لگوائے۔ اور سامان کوارٹر سے نکلوا کر سڑک پر پھینکوا دیا....... انہی کوارٹروں میں سے ایک میں شاہ جی رہتے تھے۔ لیکن انھیں آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔

شاہ جی چاچا کا بہت دم بھرنے لگے اور ایک رات سینما سے واپسی پر بڑی اپنایت سے چاچا کے گلے بانہہ ڈالکر بولے :۔

"بھائی! اب تو بھی اپنا بیاہ رچالے، یوں کب تک مارا مارا پھرتا رہے گا.....؟"

"کیا کہہ رہے ہو شاہ جی ؟" چاچا چونکا، جیسے دفعتہً اسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو....... "میرے بچّے جو بھارت میں پڑے ہوئے ہیں، ان کا کیا بنے گا ؟"

"تو بڑا نادان ہے یار۔" شاہ جی نے ٹوکا۔ "بچّے ہیں، تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اور پھر یوں سمجھ لے کہ وہ تو چلم کی راکھ ہے، نہ دم نہ خم، تو کہے تو دنوں میں کام ہو جائے گا اور دیکھ، یہ بھی مت بھول کہ

بڈھوں ٹھڈھوں کو روز روز کوئی جوان جوان بیٹیاں نہیں دے دیتا۔ پھر یہ تو دانہ بے دانہ کہ دل پھڑک اٹھے ...... ہاں ۔"

چاچا سوچ میں پڑ گیا اور پھر بولا ۔

"مگر شاہ جی یہ لڑکی ہے کون ؟"

"تجھے آم کھانے سے مطلب، بس تو ہامی بھر لے ..... اور پھر ... بٹ منگنی پٹ بیاہ ......"

چاچا نے اصرار کیا " پھر بھی کچھ معلوم تو ہو ؟ "

شاہ جی نے رازدارانہ کہا : " یار اب تجھ سے کیا چھپانا، بات یہ ہے کہ وہ اپنی بھانجی ہے ۔"

چاچا بھونچکا سا رہ گیا لیکن شاہ جی نے بات جاری رکھی ۔

"بات یہ ہے کہ اس کا باپ ہیضے میں مر گیا ۔ ماں زندہ ہے دونوں اپنے ساتھ ہی رہتے ہیں ۔ کچھ پیسے لڑکی کا باپ چھوڑ مرا تھا ۔ اسی میں تنگی ترشی سے گزارہ ہو رہا ہے اور دیکھ ! گھر کی بات ہے، کہے تو کل ہی لڑکی بھی دکھا دوں گا ۔"

رات کے دس بج رہے تھے ۔ شاہ جی گھر چلے گئے ۔ چاچا دکان پر آکر بیٹھ گیا ۔ منو ابھی جاگ رہا تھا اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا :-

"چاچا ! یہ خط آیا ہے ۔"

"خط ..... ؟"

"ہاں ...... گھر سے آیا ہے ۔"

اور چاچا نے لفافہ اس طرح منو کے ہاتھ سے لیا جیسے ... کوئی بدشکل عورت آئینہ دیکھے ...... اس طرح کہ کہیں اسے اپنی بدصورتی کا یقین نہ ہو جائے ۔ چاچا نے رقعہ لفافہ میں سے نکالا ۔

پیارے ابا جان ! تسلیم

یہ خط امی جان مجھ سے لکھوا رہی ہیں ۔ آپ کو پاکستان گئے ہوئے چھ مہینے ہو گئے مگر آپ نے ایک خط بھی نہ لکھا ۔ ہمیں آپ کا پتا منو بھائی کے خط سے معلوم ہو گیا تھا ۔ ورنہ ہم آپ کے خط کی راہ ہی دیکھا کرتے ۔

امی یہاں میرے پاس بیٹھی خط لکھوا رہی ہیں، اور رو رہی ہیں ۔ وہ کہتی ہیں، گھر میں اناج ختم ہو گیا ہے ۔ پیسے بھیجئے ۔ ہو سکے تو تار کے ذریعے ۔

منی آپ کو بہت یاد کرتی ہے ۔ جلدی جواب دیجئے گا ۔ منو بھائی کو سلام ۔ فقط

آپ کا فرماں بردار بیٹا : خالد

چاچا نے خط پڑھا پڑھ کر مروڑا اور اپنے کرتے کی لمبی جیب میں ڈال لیا

دوسرے دن شاہ جی نے چاچا کو اپنے کوارٹر کے برآمدے میں بٹھایا ۔ تھوڑی دیر غپ شپ کی ...... پھر شاہ جی نے بیٹھے ہی بیٹھے آواز لگائی ..... " ریشماں ! دو پان لگا کے لے آ بیٹی ذرا ۔"

"جی ماما لائی ۔" اندر سے ایک مدھر آواز لہراتی ہوئی آئی ۔ اور چاچا کے کانوں میں رس گھول کر فضا میں تحلیل ہو گئی ۔

پھر پانچ حنائی انگلیوں میں پان کی ایک تھالی کواڑ کی اوٹ سے باہر آئی ۔ "لے آئی ہوں ماما" ــــ چاچا کا دل دھڑکنے لگا ــــ شاہ جی نے کہا ۔ " ذرا بڑھ کے پان کی تھالی لے لینا بھیا ۔" اور چاچا کی بوڑھی کھردری انگلیاں گوری گوری حنائی انگلیوں سے مس کر گئیں اور ان کے سارے بدن میں ایک حلاوت آفریں خنک لہر دوڑ گئی ۔ ......

...... کواڑ کی درز میں سے چہرے کا گورا گورا رنگ بھی دمک رہا تھا ۔

شاہ جی کوارٹر کے برآمدے میں دوپہر بھر بڑے خراٹے بھرا کرتے اور ان کی بھانجی برآمدے کے چکر لگایا کرتی ۔ چھریرے جسم، گورے رنگ اور تیکھے خدوخال کی نوخیز جوانی، جیسے اینڈتی اٹھلاتی ہوئی، پھولوں سے لدی ڈال، بھرے بھرے مجرانی کولھے، ٹھمک ٹھمک کے چلتی ۔ بار بار دوپٹہ سینے پر سنبھالتی ہوئی، چنچل نگاہیں کبھی گوری کلائیوں کا جائزہ لیتیں ۔ کبھی سورج کی تیز شعاعوں کا، دن ڈھلتے ہی وہ برآمدے میں آ کے نخریلی آواز میں پکارتی :-

" اٹھو ماما، دن ڈھل چکا ....."

ماما کروٹ بدل کر پھر سو جاتا ۔ اور وہ انگ انگ کی کسک جیسے آواز میں بھر دیتی ۔ " ہائے ماما، اٹھو جانا ۔"

اور شاہ جی اٹھ بیٹھتے، آس پاس دیکھتے کوئی ہے تو نہیں ۔

"کیا ہے رانی .... ؟"

اور رانی جواب دیتی :- "برف لا دے نا ۔"

چاچا اسی خود فراموشی کی خیالی سیر میں مگن تھا کہ اسے دوسرا خط ملا :-

پیارے ابا جان !

ابھی تک آپ کا کوئی خط نہیں آیا ہے اور نہ آپ نے پیسے ہی بھیجے ہیں۔ امی بہت پریشان ہیں۔ بار بار روتی ہیں۔ مالک مکان کا چھ ماہ کا کرایہ چڑھ گیا ہے کل وہ آیا تھا۔ اس نے امی کو بہت گالیاں دیں اور تانبے کی دو تین دیگچیاں اٹھا کر لے گیا۔ امی کہتی ہیں اب کھانا کاہے میں پکا کرے گا......... منی ہر وقت ابا ابا کر کے رویا کرتی ہے۔ منو بھائی کو سلام ــ دیکھیئے خط کا جواب دینا نہ بھولئے گا ..... فقط

آپ کا بیٹا : خالد

چاچا نے بے دلی سے خط کی صرف چند سطریں پڑھیں اور چاک کر کے سامنے نالی میں بہتے ہوئے گندے دھارے میں پھینک دیا۔

منو نے بھی خط سنا اور ایک آہ سرد بھر کے رہ گیا۔

شاہ جی نے بات پکی کر لی۔ تاریخ مقرر ہو گئی تو جیسے ایک دم بے مروتی لادلی انھوں نے چاچا سے کہا :-

"یار کیا کروں ؟ بڑے شکنجے میں پھنس گیا ہوں "

چاچا گھبرائے " کیا ہوا شاہ جی ؟ "

" بات یہ ہے کہ بھیا ریشماں کی ماں تین جوڑے کپڑے مانگتی ہے اور تین قسم کے سونے کے زیور ..... اب تیرا بھی خیال ہے مجھے اور ان کی پاسداری بھی کرنی ہے "

اس موقع پر چاچا خاموش رہ جاتا تو شاہ جی کی نظر سے گر جانے کا احتمال تھا چھوٹتے ہی بولا :

"سب ہو جائے گا شاہ جی، گھنٹوں میں جوڑے اور زیور لا کر مالے کے قدموں میں ڈال دوں گا آخر یونہی تھوڑی پوسٹ آفس میں رقم جمع کراتا رہا ہوں "

چاچا فرضی پوسٹ آفس کی رقم نکلوانے کے جتن کر رہا تھا کہ تیسرا خط آیا۔

پیارے ابا جان !

آپ کے پاس سے اب تک پیسے نہیں آئے کل رات سے ہم لوگوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لئے امی نے منی کی چاندی کی چوڑیاں بارہ آنے میں بیچ دیں۔ منی مچل مچل کر چوڑیوں کے لئے روتی اور آپ کو پکارتی رہی۔

اور ابا جان آج کل امی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے اب وہ نہ روتی ہیں نہ بات کرتی ہیں۔ بس خاموش بیٹھی ٹکر ٹکر آسمان کی طرف کچھ دیکھا کرتی ہیں.... خط جلدی بھیجئے گا۔ ہم روز آپ کے خط کا انتظار کرتے ہیں فقط

آپ کا : خالد

چاچا پھر بوڑھے کھوسٹ قصائی کی طرح مسکرایا۔ اور خط حقے کی چلم میں دہکتے ہوئے انگاروں پر سلگنے لگا.........

لیکن منو یہ خط سن کر تڑپ اٹھا..... منی کی چوڑیاں ..... وہی چاندی کی چوڑیاں جنھیں میں بھولی بھالی معصوم منی کے ننھے ننھے پیارے ہاتھوں میں ڈال آیا تھا۔ اور وہ مسکرا اٹھی تھی۔ اس کے پیارے پیارے ہونٹوں کے گلاب کھل اٹھے تھے۔ چاندی کی ننھی ننھی چوڑیاں منو کی آنکھوں میں ناچنے لگیں......" چاچا !" منو رونے لگا ...... اور الفاظ آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں چھلک پڑے۔ اور اس دا دطلب نگاہیں جیسے کہہ رہی تھیں۔ چاچا ! منی کی روح بک گئی ہے .... منی کی مسکراہٹ فروخت ہو گئی ہے .... منی کی تمنا..... منی کی آرزو..... اور منو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا جیسے اس کے دل میں کرب والم کی سلگتی ہوئی آگ اسکی آنکھوں میں رقصاں چوڑیوں کی چاندی کو پگھلا پگھلا کر بہا رہی ہو۔ چاچا ایک مرتبہ پھر مسکرایا اور چلم میں بھری ہوئی راکھ کو بے دلی سے کریدنے لگا۔

چاچا نے تمام شرائط منظور کر لی تھیں اور شادی کے انتظامات کے منصوبے باندھ رہا تھا ایکا ایکی اس کے ذہن میں کوئی بہت کارگر تدبیر ابھری... اور وہ گھر سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ منو چوتھا خط لیکر آدھمکا.....

ابا جان !

منی بہت بیمار ہے، وہ اب بات بھی نہیں کرتی بس آنکھیں بند کئے پڑی رہتی ہے اور امی کو نہ جانے کیا ہوا جا رہا ہے جب منی کو خون کی قے ہوتی ہے تو وہ زور زور سے ہنستی ہیں۔ اتنے زور سے کہ میرا دل دہل

جاتا ہے۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ہنستی ہیں۔ ابا جان!
اب مجھے ان سے ڈر لگنے لگا ہے۔ آپ جلدی سے آکر
مجھے لے جائیے۔ خدا کے لئے ...... اور آپ میرے خط
کا جواب کیوں نہیں دیتے ...؟ فقط

آپ کا : خالد

چاچا نے خط پڑھ کر منّو کو واپس کر دیا۔ اور گھر سے باہر چلا گیا۔ چاچا کو تین جوڑے کپڑے اور گہنے حاصل کرنے کے لئے صرف تین دروازوں پر دستک دینا پڑی۔ وہ اپنے کارخانے کے عزیز ترین مصاحب شمّو کے پاس گیا۔ اور اس سے کہا۔

"شمّو! تو اپنی بیوی کا جھومر لا دے اور ایک ریشمی سوٹ نمونے کے لئے چاہیئے۔ تجھے بہت جلد واپس مل جائے گا۔"

اور عیدو سے کہا:

"تیری بیٹی کی بالیاں چاہئیں، ذرا نمونہ اچھا ہے۔"

اور پھر شرفو سے فرمائش کی:—

"شرفو! تیری بہو کی نئی چوڑیاں جن کا تو ذکر کرتا تھا مجھے چاہئیں، میں اسی نمونے کی بنوا لوں گا تو تجھے واپس کر دوں گا۔"

چاچا نے منگے کے زیور اور جوڑے پسند کے لئے سسرال پہنچا دیئے شاہ جی نے چاچا کے لئے جو کپڑے خریدے تھے۔ چاچا کو دکھانے کے لئے دوسرے دن شام کے وقت آنے کو کہا۔

حسب وعدہ چاچا نے حاضری دی۔

شاہ جی کا کوارٹر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ نہ شاہ جی نہ ریشماں نہ ریشماں کی ماں ...... چاچا کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ وہ بوکھلا کے آگے بڑھا۔ ملحقہ کوارٹر کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا:

"یہ شاہ جی کے گھر والے کہاں گئے؟"

اس شخص نے چاچا کو ذرا مشکوک نظروں سے دیکھ کر کہا:

"وہ سب کل رات کی گاڑی سے کہیں باہر چلے گئے ہیں۔"

"اب کب آئیں گے؟"

"اب وہ لوگ نہیں آئیں گے۔ کوارٹر مالک مکان کو سونپ کر گئے ہیں......"

"نہیں آئیں گے۔" یہ الفاظ چاچا کے دل پر نشتر کی طرح لگے اس کا سر چکرا گیا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اور پھر جیسے اسے دور بہت دور سے یہ آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں:

"کمال ہے بھائی! اس بڈھے کو بھی جُل دے گیا۔"

"ہاں صاحب دیکھیئے نا، بڑا صوفی کا سوانگ بھرے پھرتا تھا۔"

"ارے میاں! میں تو پہلے ہی تاڑ گیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ "پرائیویٹ" ہے، لونڈیا کے طور ہی کچھ ایسے تھے۔"

"جناب! میں نے تو راتوں کو یہاں سوٹ بوٹ والے آتے جاتے دیکھے۔"

"ہائے بڑا ظلم ہوا اس بے چارے بوڑھے کے ساتھ۔"

اور جب چاچا منّو کی دکان پر واپس آیا ...... ہلکان ...... مایوس، اُداس نڈھال ...... تو منّو نے چاچا کو دیکھتے ہی ایک خط سامنے رکھ دیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا .... چاچا نے گھبرا کر خط کھولا .....

پیارے ابا جان!
کل رات مُنّی مر گئی۔ آج صبح سے امی بیمار ہیں
وہ اب اور زیادہ ہنسنے لگی ہیں میں نے آج صبح سے کچھ
نہیں کھایا۔ ابا جان خدا کے لئے آپ جلد یہاں آکر مجھے
لے جائیے، ورنہ میں اکیلا یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔
جواب بھیجنے میں دیر نہ کیجئے گا۔ فقط

آپ کا: خالد

"چاچا! مُنّی مر گئی۔" منّو پھر چیخا۔ جیسے وہ اسے ...... جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر احساس دلانا چاہتا ہو۔ کہ مُنّی اس لئے دم توڑ گئی ہے کہ اس کی چوڑیاں تو بارہ آنے میں بک گئیں۔ اور اس کی روح چوڑیوں کی تلاش میں اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی ....

چاچا کے رو پہلے خوابوں کے شیش محل ڈھے گئے تھے اس کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔ دل و دماغ میں شعلے سے بھڑکنے لگے اور تیس سال میں پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں پچھتاوے کے یہ آنسو دکھائی دیئے۔ اور وہ دکان کے تھڑے پر بیٹھا ہوا دو گھنٹے تک مسلسل زار و قطار روتا رہا آخر بولا

"دوستوں کی امانتیں کھو دینے کے بعد میرا اب ہندوستان جانا مشکل ہے پھر نوکری بھی جاتی ہے۔ انکو یہاں لا کر کیا کھلاؤں گا؟"

منّو کو چاچا کی اس حالتِ زار پر ترس آنے لگا۔ اور وہ فخر سے سینہ تان کر چاچا کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"تو ہلکان نہ ہو چاچا! میرا اپنا کام ہے۔ ہندوستان سے میں چاچی کو لے کر آ ؤں گا۔"

لیکن چاچا کی نگاہیں جواب قدرے خشک ہو چلی تھیں، سڑک کے اس پار سامنے کے بڑے میدان میں جمی رہیں، جہاں سرِ شام کے اندھیرے اُجالے باہم دست و گریباں ہو رہے تھے۔

وہ بے حس و حرکت خاموش بیٹھے بیٹھے اچانک سہم کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"منّو......!"

منّو گھبرا کر بولا: "کیا ہے چاچا؟"

"وہ دیکھ...... وہ!" چاچا نے سہمے سہمے سے انداز میں میدان کی جانب اشارہ کیا۔

منّو نے اندھیرے میں نگاہیں کھبو کر دیکھا...... مگر اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا...... لیکن چاچا اب بھی سہما ہوا اسی طرف نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ اسے بڑھتی ہوئی تاریکی میں تین سایے نظر آ رہے تھے۔ بھیانک اور مہیب...... شمّو...... عیدو...... اور شرفو...... "میری بیوی کا جھومر!...... میری بیٹی کی بالیاں...... !"...... اور...... "میری بہو کی نئی چوڑیاں!!"

(بشکریہ "الحمرا")

ہاضمی

(ایک بہترین سفوف معدہ ہی)

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ جسم انسانی کی صحت کا دار و مدار معدہ کے فعل ہضم کی درستی پر ہے بقول شاعر ؎

الٰہی زمن معدہ من مرنجاں
دگر معدہ رنجید، رنجیدہ باشد

یہ اکسیری دوا پیٹ کے درد، قبض، ضعف ہضم، تخمہ، متلی اور اپھار کے لئے بے حد مفید ہے۔ بھوک لگاتی ہے۔ ہر گھر میں اس کا موجود رہنا رحمت ثابت ہوگا

قیمت:۔ دو اونس شیشی: ایک روپیہ آٹھ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی ۱



حاذق نروائن پلز

یہ ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے۔ یہ گولیاں دماغی کام کرنیوالے حضرات یعنی، وکیل، بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم صاحبان کے واسطے آبِ حیات کا کام دیتی ہیں اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال رکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں دواخانہ ہٰذا کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

قیمت:۔ چالیس گولی برائے بیس یوم:۔ چار روپے بارہ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی ۱ سے طلب فرمائیں



مُحسن بھوپالی

مجالِ گلہ اور ہم بندہ پرور
نوازش، عنایت، کرم، بندہ پرور

غلط ہے کہ ویرانگی کا گذر ہو
جہاں آپکے ہوں قدم بندہ پرور

زمانہ ثبوتِ عمل چاہتا ہے
ہیں بے سود قول و قسم بندہ پرور

الجھ جائیں پھر اہلِ دل غیر ممکن
نہیں گیسوؤں میں وہ خم بندہ پرور

چمن میں تمہارا تصرف ہے لیکن
نقیبِ بہاراں ہیں ہم بندہ پرور

کہیں ہم وفاؤں سے توبہ نہ کرلیں
کہاں تک سہیں گے ستم بندہ پرور

رہیں گے سرِ دار بھی حق پہ قائم
کہ منصورِ دوراں ہیں ہم بندہ پرور

تمہاری فضیلت کے ہم معترف ہیں
مگر کیا کریں یہ قلم بندہ پرور

رئیس باغی

ترد کی زلف میں جب تک جنوں کا شانہ تھا
یہ الجھنیں نہ تھیں سلجھا ہوا زمانہ تھا

جنونِ عشق کی شورش تھی وجہ رعنائی
اسی کے خون سے رنگیں رخِ زمانہ تھا

بجھا تو بن گیا تاریکیٔ نگاہِ جہاں
بھڑک اٹھا تو مرا دل چراغِ خانہ تھا

بچا بچا کے نظر دیکھتے تھے جب اُن کو
حریفِ عمرِ بقا بس وہی زمانہ تھا

سرشکِ غم کو بنایا اچھال کر طوفاں
تجھے بھی دیدۂ تر اس میں ڈوب جانا تھا

تو ہی تھا ساز کے پردوں میں چھپ کے روح
ہر ایک نغمۂ رنگیں ترا ترانہ تھا

مجھے وہ جب نظر آئے تو بس وہی وہ تھے
زمیں تھی نہ فلک تھا نہ یہ زمانہ تھا

ہماری قید تو تھی قیدِ محض اے
قفس میں جسم ۔ نگاہوں میں آشیا

راغب مرادآبادی

ترانۂ مسلم

یقیں کا راز دنیا کو بتانا چاہتا ہوں میں
چراغِ خانۂ باطل بجھانا چاہتا ہوں میں

ہزاروں مرتبہ قدموں پہ جنکے سر جھکائے تھے
جہانگیری پھر ان کی آزمانا چاہتا ہوں میں

دکھائے تھے جو پہلے سندھ سے اس کاشغر تک
وہی جوہر زمانے کو دکھانا چاہتا ہوں میں

بحمد اللہ حسین ابن علی کی راہ پر چل کر
یزیدِ عصر کو نیچا دکھانا چاہتا ہوں میں

نظر کی ایک جنبش میں بہ فیضِ قوتِ ایماں
منارے کفر و ظلمت کے گرانا چاہتا ہوں میں

بتا کر فتح کے اسرارِ پنہاں ہر مسلماں کو
جفاکاروں کے پنجے سے چھڑانا چاہتا ہوں میں

بہت کچھ کر چکا بزمِ طرب کی جلوہ آرائی
میانِ کارزار اب مسکرانا چاہتا ہوں میں

یہاں پھر تازہ ہوگا انتم الاعلون کا وعدہ
یہ مژدہ اہلِ ایماں کو سنانا چاہتا ہوں میں

کوئی جھوٹی سیاست کے ہوا خواہوں سے یہ کہدے
کہ ہر جھوٹی سیاست کو مٹانا چاہتا ہوں میں

سنا کر واقعاتِ فاتحانِ ملتِ بیضا
مسلماں کو اسی مرکز پہ لانا چاہتا ہوں میں

غبارِ کفر دامانِ حرم کو چھو نہیں سکتا
یقیں ہر اہلِ باطل کو دلانا چاہتا ہوں میں

مسلماں حکمراں ہو کر رہے گا پھر زمانے کا
کھلے بندوں یہ دنیا کو بتانا چاہتا ہوں میں

خدا کی راہ میں مٹنا ہے راغب جاوداں ہونا
مسلمانوں کو یہ نکتہ بتانا چاہتا ہوں میں

محمد حمید اللہ صدیقی ●

آخری دِن!

یہ اس کا آخری دن تھا۔ دفتر میں آخری دن۔ وہ ریت پر کھڑا تھا سامنے کچھ دور تک گیلی ریت تھی اور پھر سمندر۔ لامتناہی پھیلا سمندر۔ چھوٹی بڑی لہریں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ دوڑ رہی تھیں اور پھر کنارے سے ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں۔ اس نے جوتے اتارے اور پھر موزے اور پتلون کے پائنچے ذرا اوپر چڑھا کر چند قدم آگے بڑھ گیا۔ گیلی ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ریت۔ اسے اپنے تلوؤں میں گدگدی سی محسوس ہوئی اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر ایک ہلکی سی نمی اس کی رگ رگ میں سرایت کرنے لگی۔ کتنی فرحت بخش ہے یہ نمی کتنی لطیف۔ اس نے سوچا کچھ دیر بعد وہ لوٹ آیا اور دور خشک ریت پر لیٹ گیا۔ سہ پہر کا سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا مگر سمندر کی ٹھنڈی ہوا نے اس کی تابناکی کے احساس کو کم کر دیا تھا سامنے کچھ دور پر اس بڑی عمارت کے سرخ کنگرے نظر آ رہے تھے جس میں اس کا دفتر تھا۔ سورج کی کرنیں اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر منہ پر رکھ لیا اور اس کا ایک کونے کو دانتوں میں پکڑ لیا تاکہ ہوا کہیں اسے اڑا نہ لیجائے

چار سال، چار طویل سال گذر گئے۔ اس نے سوچا۔ اب وہ آزاد ہے ایک ایسی زندگی بسر کرنے کے لئے جس کا وہ عرصہ سے متمنی تھا۔ وہ مسکرا پڑا۔ گذرتے ہوئے چار سال کی بیشمار کی یادیں اس کے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ خوشگوار اور ناخوشگوار دونوں۔ اور وہ انہیں دل ہی دل میں الگ کر رہا تھا۔ جیسے وہ ناخوشگوار یادوں کو یہیں چھوڑ جانا چاہتا تھا۔ یہیں سمندر کے حوالے کرنا چاہتا ہو جیسے وہ یہاں آ گیا تھا۔ ہاں چار سال قبل وہ بیکار تھا۔ یونہی پھرا کرتا تھا اور پھر اسے یہاں نوکری مل گئی تھی۔ بیکاری سے نجات۔ اور پھر دفتر کی بس اسے گھر سے آ کے لے جاتی تھی۔ اور اس کے پڑوسی اور دوست جو دوسرے دفتروں میں کام کرتے تھے اس پر رشک کرتے تھے اس کی پیلی سرخ بس پر جو عین اس کے گھر کے قریب آ کر کھڑی ہوتی تھی کتنے مزے میں ہے وہ لوگ کہتے۔ شان سے گھر سے نکلا اور بس میں بیٹھ گیا۔ یہاں قطار میں کھڑے کھڑے دیوالہ ہو جاتا ہے نوکری کرے تو ایسی جگہ کرے اور پھر دفتر دیکھو۔ شہر سے باہر۔ عالیشان عمارت، سمندر کا کنارہ، ذرا دل گھبرایا اور سمندر تک ٹہل آئے۔ مگر وہ، وہ تو جسم کا ناشکرا تھا اسے ان باتوں سے اور کوفت ہوتی۔ سرخ پیلی بس۔ عالیشان عمارت، سمندر کا کنارہ۔ بھلا سمندر کے کنارے کو اس کے آفس سے کیا نسبت۔ سمندر جو اتھاہ اور لامحدود ہے۔ آفس جو تنگ اور گھٹا گھٹا سا۔ کتنا تضاد ہے۔ کتنا فرق۔ اب اگر نوشیرواں کے محل کے بغل میں جھونپڑا تھا تو اس سے جھونپڑے کو کیا فائدہ بلکہ پھر تو جھونپڑے میں رہنے کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے اور سمندر کو دیکھ کر دفتر توبہ۔ مگر لوگ اسے کیا سمجھتے۔ لوگ سمجھتے کہ یا تو بن رہا ہے یا پھر واقعی ناشکرا ہے۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ لئے۔ دفتر میں پہلا دن نئے لوگ، نیا ماحول۔ ایک دوسرے سے تعارف۔ ہنسی مذاق، قہقہے، تھوڑی دیر کے لئے ایک ہنگامہ پھر سکوت۔ جیسا دریا میں کسی نے کنکر پھینک دیا ہو اور بہت سے چھوٹی بڑی لہریں اور بلبلے۔ یکایک ابھر کر پھر غائب ہو جائیں اور دریا پھر اسی طرح ساکت ہو جائے اور کنکر ڈوبتا چلا جائے۔ ڈوبتا چلا جائے۔ اور بہت سے کنکروں سے مل جائے۔ تہہ تک پہنچ کر۔ اسے پھر ایک میز۔ ایک کرسی۔ ایک قلمدان اور بہت سے کاغذات دیدیئے گئے۔ جیسے یہ اس کا سرمایہ تھا اور وہ اس کا مالک اور پھر ایک ساتھی جو کافی عرصہ سے اس دفتر میں تھا اسے کام سکھلانے لگا۔

جمیل صاحب۔ یہ مراسلہ ہے۔ یہ جب آپ کو ملے تو پہلے اسے پڑھئے پھر اسکے بائیں سرے پر کونے میں پنچ سے چھید کیجئے۔ پھر اس میں یہ سلپ لگائیے۔ اس پن سے اور پن اس طرح لگائیے کہ پہلے پن کاغذ میں سے گذر کر سلپ میں جائے پھر نیچے کے سلپ سے گذر کر کاغذ میں آئے اور کاغذ سے اسے گذار کر اس کی نوک سلپ اور کاغذ کے بیچ میں رہنے دیجئے۔ اس طرح اس بات کا احتمال نہ رہ جائے گا کہ وہ کسی آفیسر کے ہاتھ میں چبھ جائے گی پھر اس مراسلے کو فائل میں لگا دیجئے سمجھ گئے۔

وہ بالکل گھبرا گیا تھا اور اس نے پوچھا تھا کہ اگر پہلے سلپ لگا کر پھر سوراخ کریں۔ یا پہلے فائل میں لگا کر پھر۔

اور اسے بتایا گیا کہ بیکار کی باتیں نہیں کرتے۔ یہ دفتر کا معمول (Routine) ہے اور اس میں مہارت حاصل کرنے پر کوئی ترقی ممکن ہے اور وہ دل ہی دل میں اس ترتیب کو یاد کرنے لگا تھا جو اسے بتائی گئی تھی کیونکہ ترقی کی اسے بھی بڑی خواہش تھی ترقی۔ وہ پھر مسکرا پڑا (Routine) اور ترقی اور اس نے سوچا کہ اس کے کتنے ساتھی رفتہ رفتہ آدمی سے صرف (Routine) بنکر ترقی کا انتظار کر رہے ہیں۔

وہ کام سیکھنے لگا۔ وہ سیکھتا رہا۔ وہ کام بالکل سیکھ گیا اور ایک دن اس نے بلا کسی مدد اور مشورے کے ایک مراسلہ لکھا ——

جناب عالی۔ آپ کے خط نمبر —— مورخہ —— کے حوالے سے۔ خاکسار کو یہ عرض کرنا ہے کہ . . . . وغیرہ وغیرہ۔ اور اسے تمام دن بڑی بے چینی سے انتظار رہا تھا کہ اس کا اپنا لکھا ہوا مراسلہ افسر کے پاس جائے گا اور وہاں سے منظور ہو کر آجائے گا مگر شام کو اسے بڑی شدید مایوسی ہوئی جب اس نے دیکھا کہ افسر نے اس کا مراسلہ بالکل کاٹ دیا ہے اور اسے بدل کر یوں کر دیا ہے خاکسار کو آپ کے خط نمبر — مورخہ — کے حوالے سے عرض کرنا ہے . . . . . .

وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا تھا کہ ان دونوں عبارتوں میں فرق کیا ہے۔ معنی و مفہوم کے لحاظ سے (Routine) کے لحاظ سے مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا اور پھر اس نے اپنے انچارج سے یہی بات دریافت کی تھی اور انچارج نے بہت مسکرا کر کہا تھا کہ جمیل صاحب آپ اتنی سی بات کا فرق نہیں سمجھتے۔ فرق یہ ہے کہ وہ آپ نے لکھا تھا اور یہ افسر نے اور آخر افسر کو بھی تو کچھ کام کرنا ہے اپنے سے بڑے افسر کو اپنی کارگذاری دکھانا ہے اور پھر دفتر میں صحیح وہی ہوتا ہے جو افسر کہے اسے ہمیشہ یاد رکھئے گا۔ اور رفتہ رفتہ تجربے نے اسے بتایا کہ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ صحیح بات وہی ہوتی ہے جو افسر کہے۔ اور اس سے زیادہ صحیح وہ بات ہوتی ہے جو اس سے بڑا افسر کہے اور اس سے زیادہ صحیح وہ ہوتی ہے جو افسر سے بڑے افسر سے بڑا افسر کہے اور اس سے زیادہ . . . . . .

اور پھر اسے افسر یاد آنے لگے۔ افسر۔ بڑے بڑے افسر۔ چھوٹے چھوٹے افسر۔ پرانے پرانے افسر۔ نئے نئے افسر۔ اور وہ نہ جانے کیوں ہنس دیا۔ ہاں ہنسی کیوں نہ آئے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ وہ افسر مئی جون کی گرمی میں بھی گرم گرم سوٹ پہن کر آتے تھے۔ جیسے انہیں گرمی نہیں لگتی حالانکہ خود اس کا اپنا یہ حال تھا کہ جی چاہتا تھا کہ قمیص بھی اتار دے اور صرف بنیان پہن کر بیٹھے مگر پھر یہ سوچ کر رہ جاتا کہ یہ بات شائستگی کے خلاف ہوگی۔ مگر یہ افسر اور ان کے سوٹ لیکن پھر یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آگئی۔ اصل میں بات یہ تھی کہ افسر ہوتے ہی سارے بدن کی گرمی صرف دماغ میں چلی جاتی ہے اس لئے گرم سوٹ سے بدن کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس سے بھی وہی مزا آتا ہے جو گرمیوں میں گرم چائے سے۔ اب اسے دماغ کی گرمی نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے ہاں ہاں وہی بات۔ اس کے چھوٹے افسر نے ایک بار ایک ایسی بات لکھ دی تھی جو بڑے افسر کی سمجھ میں نہ آئی کیونکہ اسے سمجھنے کے لئے فائل کے نوے صفحے پڑھنے پڑتے۔ جسے چھوٹے افسر نے کئی دن چھٹی کے بعد بیٹھ بیٹھ کر پڑھا تھا اور پھر سمجھ کر لکھا تھا اور پھر بڑے افسر نے اسے بلا کر یہ کہا تھا:۔

تم نے کیا لکھا ہے ؟

جی۔

جی کے بچے۔ تم جیسے جیسے بڑے ہوتے جا رہے ہو بالکل الو ہوتے جا رہے ہو۔ الو کہیں کے۔ لیجاؤ اسے اس طرح لکھ کر لاؤ کہ بات سمجھ

میں آجائے۔

جی۔ جی بجا ارشاد ہے۔ ابھی لکھ کر لاتا ہوں۔

اور چھوٹا افسر اس دن یہ بات سن کر بہت غمگین تھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ وہ الو ہے یا نہیں۔ اس کے ہاتھ بار بار کانپ رہے تھے اور ہونٹ ہل رہے تھے۔ اسے بھی اس بات پر بڑا غصہ آیا تھا اور پھر ہنسی بھی۔ ہنسی اس بجا ارشاد پر۔ جیسے اسے اپنا الو ہونا تسلیم ہو۔ پھر اس نے اس چھوٹے افسر کی غمگساری کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا ہوا۔ آخر اس طرح کیوں بجھ گئے اور آپ نے یہ چپ چاپ سن لیا کیوں۔ ڈانٹ کیوں نہیں دیا۔ اور چھوٹے افسر نے بڑی روہانسی آواز میں اسے بتایا کہ اسے یہاں آٹھ سو روپے ملتے ہیں۔ وہ ۲۸ سال سے نوکری کر رہا ہے۔ ۲ سال بعد ریٹائر ہوگا تو عمر بھر چار سو روپے پنشن ملتی رہے گی۔ اب دنیا کے کسی بازار میں اس کی اتنی قیمت نہیں لگ سکتی کیونکہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور اس کے تین لڑکے اور چار لڑکیوں میں جن کا اسے پیٹ پالنا ہے۔ شادی بیاہ کرنا ہے پھر وہ بھلا کیا کہتا۔ نوکری تو نوکری ہے۔

اور وہ سوچتا رہ گیا تھا۔ واقعی ۸۰۰ روپے۔ ۴۰۰ روپے پنشن تین لڑکے چار لڑکیاں۔ وہ الو ہے۔ بجا ارشاد ہے۔ اور اس کے دماغ میں جیسے دھماکے ہونے لگے تھے۔ یہ بوڑھا آدمی جس نے ۲۸ سال نوکری کی ہے تو اسے کل کے لونڈے نے الو کہدیا اس لئے کہ وہ بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ سیدھا افسر ہو کر آیا تھا۔ گرمیوں میں گرم سوٹ پہنتا تھا۔ اس نے اسے الو کہدیا حالانکہ اس کی کوئی خطا نہ تھی۔ اس میں صرف اس کی کاہلی اور کام چوری کا دخل تھا اس نے اس کے بڑھاپے کا بھی خیال نہ کیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ یہ اس کے باپ کے برابر ہے کچھ انسانیت ہی کے تقاضے کو پیش نظر رکھتا۔

اور پھر وہ ان افسروں سے بہت بچکر رہنے لگا۔ کیونکہ اسے اپنی آبرو بہرحال عزیز تھی۔ اور ان افسروں کا کیا ٹھکانہ۔ لیکن ایک دن وہ آہی گیا جب افسر نے اس کے متعلق بھی الٹی سیدھی باتیں لکھدیں اور وہ بے حد افسردہ و رنجیدہ ہوا تھا اور وہ دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کہ اگر افسر اس کے منہ پر کہتا تو شاید وہ بھی کچھ مزا چکھاتا لیکن یہ کہا۔ پیٹھ پیچھے۔ کاغذ پر لکھدیا۔ اب وہ کیا کرے۔ کئی بار اس کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ کاغذ لیجا کر افسر کے منہ پر دے مارے۔ اس کا پارہ ہر لحظہ چڑھتا رہا تھا۔ اور چھوٹے افسر نے جو اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا شاید یہی محسوس کر کے کہا تھا۔

جمیل صاحب۔ جانے دیجئے۔ آپئے جانے دیجئے۔ یہ حرکت واقعی بڑی ذلیل ہے۔ جو آپ کے ساتھ ہوئی ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں یہ نوکری ہے۔ کون نہیں ذلیل ہوتا۔

اور وہ ایک دم بھڑک گیا تھا۔ جیسے بارود کو کوئی آگ دکھائے اور بڑی زور سے چیخا تھا۔

اختر صاحب مجھے اس کا افسوس نہیں ہے کہ کسی نے میرے ساتھ ذلالت کی ہے۔ البتہ مجھے اس تصور سے دہشت ضرور ہو رہی ہے کہ بیس سال نوکری کرنے کے بعد میں بھی ایسی ہی ذلیل حرکتیں کرنے لگوں گا۔

اور پھر اس کے اردگرد بالکل سناٹا چھا گیا تھا۔ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اور سب سر جھکا کر کام کرنے لگے تھے۔

اس نے ریت پر لیٹے لیٹے کروٹ بدلی۔ سورج کی ترچھی کرنوں نے اس کا بایاں رخ بالکل جھلسا دیا تھا۔

یاد اسی طرح کے بہت سے واقعات۔ کام کرتے ہوئے افسر کام کرتے ہوئے کلرک۔ کام کرتے ہوئے چپراسی۔ کھڑ کھڑ کرتی ہوئی ٹائپ مشینیں۔ اس کا ذہن جیسے گدلا ہونے لگا۔ ایک گڑھے کی طرح جس میں بہت سا برساتی پانی جمع ہو گیا ہو۔ خاکستری اور گندہ۔ اس نے جیب سے ایک سگریٹ نکالا اور تیز ہوا میں بڑی مشکل سے سلگایا چار سال۔ چار طویل سال اور ان کی یادیں خوشگوار اور ناخوشگوار۔ سگریٹ کے لطیف دھوئیں سے اس کا ذہن کچھ کچھ صاف ہونے لگا کام، مستقل کام۔ اور کس قدر کوفت ہوتی تھی اسے اس کام سے بھلا وہ بھی کوئی کام ہے جسے کرنے میں آدمی کا جی بھی نہ لگے۔ اور جی لگے بھی تو کیسے کوئی ندرت ہو۔ کوئی نیا پن ہو۔ ایک ہی طرح صبح و شام وہی تھکے تھکے چہرے۔ وہی مضمحل مضمحل انسان۔ وہ گھٹی گھٹی فضا۔ وہی لگی بندھی گفتگو۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس کام میں دماغ کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ وہی ایک لکیر جو بہت پہلے بہت پہلے کچھ لوگ کھینچ

بنادی تھی۔ وہ لوگ جنہوں نے بہت دور سے آکر یہاں کے نظم و نسق کو چلانے کے لئے یہ اور اسی طرح کے بہت سے دفاتر قائم کئے تھے اور ان کا درتب کیا تھا۔ وہی سند تھی وہی روایت تھے۔ جیسے وہ کوئی نبی تھے جو اپنی یہ سنت چھوڑ گئے ہیں اور ہم ان کی امت ہیں جس پر ان کی پیروی لازم ہو۔ وہ پرانی فائلوں کی نقلیں۔ پچاس سال اور ساٹھ سال اور ستر سال پرانی۔ جب کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہو۔ جب بھی کوئی نئی بات ہو۔ وہی نکال کر دیکھی جاتی تھیں کہ آخر ہمارے بزرگوں نے اس صورت حالات کے پیش نظر کیا کہا تھا۔ کس طرح سوچا تھا۔ کس طرح لکھا تھا۔ "بزرگوں نے" وہ اپنے خیالات کی اس رو پر خود ہی مسکرا پڑا بزرگوں نے۔ کون تھے یہ بزرگ۔ یہ بزرگ لوگ بہت دور سے آئے صرف تجارت کرنے اور جب انھوں نے دیکھا تھا کہ یہاں لوگوں کو حکومت کرنا نہیں آتا تو انھوں نے دھیرے، دھیرے۔ حکمت سے تدبر سے، حیل و فریب سے قوت سے یہ کام بھی اپنے ذمے لیا تھا۔ وہ ہمیں حکومت کرنے کا سلیقہ سکھاتے رہے۔ ایک سال۔ دو سال دس سال۔ بیس سال۔ پچاس سال۔ سو سال۔ یہ ٹریننگ کورس طویل ہوتا گیا اور ہم سیکھتے رہے اور پھر آخر جو باتیں ہم نے ان بزرگوں کی صحبت میں پورے سو سال تک سیکھی ہیں اب ان پر عمل بھی تو ضروری تھا ورنہ ہم عمل کرنے لگے۔ وہ بزرگ چلے گئے۔ ہم عمل کرتے رہے۔ اسے یاد نہ تھا کہ کبھی اس نے جان بوجھ کر ان روایات کے خلاف عمل کیا یعنی تجربے کی خاطر۔ اسے اس کا انجام معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان بزرگوں کی سنت بڑی جاندار ہے۔ اس سے انحراف ممکن نہیں۔ پھر بھی اسے اس طرح کے تجربوں میں مزا آتا تھا۔ وہ ہمیشہ سوچتا چلو تھوڑی ڈانٹ پڑ جائے گی اور کیا ہوگا۔ اور ہمیشہ یہی ہوا۔ بزرگوں کے جانشینوں نے جنہوں نے براہ راست ان بزرگوں سے استفادہ کیا تھا اسے بلا کر جھڑکا تھا۔ اس سے کہا کہ وہ محنت بالکل نہیں کرتا اس نے یہ جاننے کی بالکل کوشش نہ کی کہ جب ۱۹۲۴ء میں ایسا ہوا تھا تو کیا کہا گیا تھا۔ وہ جھنجھلا رہا تھا۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۶۰ء میں کتنا فرق ہے مگر یہ لوگ کتنے سنت پرست ہیں۔ اس سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے۔ بات یہ کرنا جانتے اس لئے کہ اس ماضی کو بہت شاندار سمجھتے ہیں۔ کون جانے

اور پھر اپنے اپنے وہ بوڑھے کلرک نما افسر یاد آئے جو پنشن کے انتظار میں نوکری چلا رہے تھے۔ جن پر اب بھی اسی شدت کا سرور طاری تھا جسے انھوں نے اس دفتر میں آج سے بیس، پچیس سال پہلے داخل ہو کر پی تھی۔ جب کبھی رات میں بات نکل آتی تو وہ کتنا مزہ لے لے کر کہتے کہ جیل صاحب یہاں کیا رہ گیا ہے۔ اس دفتر میں۔ نوکری کے مزے تو انگریز کے زمانے میں تھے جانتے ہیں۔ اس وقت یہ دفتر لاٹ صاحب کا دفتر کہلاتا تھا۔ ہائے وہ دلی کا سکریٹریٹ، اور وہ گرمیوں میں شملہ کے مزے۔ کیا ٹھاٹھ تھے۔ سنہری پیٹی اور کلغی میں ملبوس چپراسی۔ موڑ سے آنیوالے ہنٹ، وہ میز وہ کرسیاں۔ وہ صفائی، وہ اسٹیشنری، خس کی ٹٹیاں۔ صراحیاں افسری کے مزے تو وہاں تھے۔ آدمی کلرک سے افسر ہوا نہیں کہ رائے صاحب اور خان صاحب کا خطاب مل گیا۔ کبھی کبھار چھٹی لے کر گھر چلے جائیں تو ضلع کا کلکٹر تک عزت کرتا تھا۔ وہ افسر تھے افسر کبھی اپنے کمرے سے نکلتے تک نہ تھے۔ ہم لوگ ان کی شکل تک دیکھنے کو ترس جاتے تھے۔ اور ماتحت کتنا ادب کرتے تھے۔ ہمت نہ ہوتی تھی پاس آنے کی۔ اب یہ بھی کوئی زمانہ ہے۔ چپراسی دفتری سب برابر کرسی پر بیٹھے رہتے ہیں۔ بیڑی سگریٹ پیتے ہیں۔ ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ ایک ہی صراحی گلاس سے پانی پی لیتے ہیں۔ ہائے وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ نوکری کا سارا مزا جاتا رہا۔ اور پھر وہ لوگ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتے اور وہ یہ سب بیٹھا سنتا رہتا۔ دم بخود سنتا رہتا اور پھر سوچتا کہ چند مراعات۔ چند آسائشیں پا کر یہ لوگ غلامی پر کس قدر رضامند تھے۔

سگریٹ جلتا جلتا اس کی انگلیوں تک آگیا تھا۔ اس نے سگریٹ پھینک دیا۔ ان چھوٹے بڑے افسروں کے متعلق سوچتے سوچتے اس کی طبیعت پھر مکدر ہو گئی تھی۔ کتنے اجنبی اجنبی سے لگتے تھے وہ لوگ جیسے بالکل مختلف قسم کے لوگ وہاں اور وہ ہمیشہ ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا گیا۔ دور ہوتا گیا۔ اور اس کے بہت سے ساتھی۔ وہ سینکڑوں ساتھی۔ اس نے سوچا۔ جو ابھی اس ماحول میں اسی کی طرح نئے نئے آئے تھے۔ جن سے وہ ہر طرح قریب تھا جو اس

اجنبی دنیا میں جانے پہچانے معلوم ہوتے تھے۔ شروع شروع میں ان سے مل کر اسے کتنا سکون ہوا تھا۔ اس قدر بے مزا اور پھیکے ماحول میں بھی ساتھی تو تھے جو سب کچھ ... تھے ورنہ اس کا دم گھٹ جاتا۔ وہ کام کرتا رہتا مگر سارا دن اس کا دل انھیں میں لگا رہتا۔ ان سب میں بعض ہی طرح بے چین و مضطرب تھے اور بار بار اپنے پروں کو تول کر پھیلی ہوئی فضا کا جائزہ لیتے جیسے سوچ رہے ہوں کہ پرواز کی طاقت ہے یا نہیں ان کے اندر انسانیت تھی۔ امنگ تھی۔ زندگی تھی۔ وہ کئی کئی گھنٹہ تک ان سے بحث مباحثے۔ مذہب۔ سیاست۔ ادب۔ دفتر۔ وہ کہی ان کمینہ روایات کا مذاق اڑاتے۔ کم تنخواہ ملازمین سے آدمیوں جیسے سلوک کرنے وقت گذرتا رہا۔ ایک سال، دو سال، تین سال، اور اس کا یہ احساس بڑھتا گیا کہ جیسے یہ بھی بدل رہے ہیں دھیرے، دھیرے غیر شعوری طور پر ان کے جذبات۔ ان کے احساسات اور ان کے سوچنے اور رہنا تو انداز سب رفتہ رفتہ بدل رہا تھا۔ اور اس نے سوچا کہ جیسے یہ سنگین ماحول یہ گھٹی گھٹی بے جان فضا کوئی نمک کی کان ہو جس کا نمک ان سب پر چڑھا جا رہا ہو اور رفتہ رفتہ۔ آٹھ سال۔ دس سال۔ بارہ سال۔ اور یہ بھی اسی کان کا جز ہو جائیں گے اس ماحول سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اور پھر کہا .... کچھ بھی نہیں۔

اس نے آنکھوں سے رومال ہٹا کر سورج کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے ہونگے۔ اس نے سوچا۔ وہ ریت پر اٹھ بیٹھا اسے یاد آیا کہ ابھی اسے اپنا ساز و سامان دوسرے ساتھی کے حوالے کرنا ہے اور ہاں وہ پارٹی بھی تو ہے جو اس کے ساتھی اس کے جانے کے غم میں دے رہے ہیں۔ وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک لمبا سانس لیکر سمندر کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ چل پڑا۔ اور وہ اس عظیم الشان عمارت کے سرخ کنگرے نمایاں ہونے لگے قریب آتے گئے۔ قریب آتے گئے۔

عالم اکبرآبادی •

کیا دل ترے ستم کی شکایت بھی چھوڑ دے
اُمیدِ التفات و عنایت بھی چھوڑ دے

ہے عشق میں بھی پاس تجھے ننگ و نام کا
اے دشمنِ وفا تو محبّت بھی چھوڑ دے

عشرت بھی تیرے وصل کی حاصل نہیں جسے
وہ بدنصیب شکوۂ فرقت بھی چھوڑ دے

مانا تجھے نہیں نہ سہی پاسِ دوستی
وہ آدمی ہی کیا جو مروّت بھی چھوڑ دے

اے ناشناسِ درد تغافل ترا بجا —!
دل کچھ نہ کر سکے تو شکایت بھی چھوڑ دے

عالمؔ مری خودی کے تقاضے عجیب ہیں
دل مطمئن نہیں ہے تو جنّت بھی چھوڑ دے

شبی فاروقی •

ہم کو بنا کے خوگرِ حرماں کبھی کبھی
خود ہوگئے ہیں آپ پشیماں کبھی کبھی

چمکا ہے خونِ شب کا چراغاں کبھی کبھی
پیدا ہوئی ہے صبحِ درخشاں کبھی کبھی

ناصح بجا سکوں کی تلقین صحیح مگر
اپنا بھی دیکھ لیتے ہیں داماں کبھی کبھی

کیا ہی خرد کی حد سے گزرنا نہ پوچھئے
دامن میں کھو گیا ہے گریباں کبھی کبھی

منھ زرد پڑ گیا ہے غمِ روزگار کا!
نکھرا ہے اس طرح غمِ جاناں کبھی کبھی

فرصت کبھی کبھی غمِ ہستی سے مل گئی
یاد آ گیا ہے آپ کا احساں کبھی کبھی

میں نے تو لاکھ درد چھپایا مگر شبیؔ
غم ہوگیا خوشی سے نمایاں کبھی کبھی

صہبا جائسی •

آج

سعیٔ پرواز بھی ہے حسرتِ ناکام بھی ہے
سامنے اپنے مۓ تلخ کا اک جام بھی ہے
میرؔ کا سوز بھی ہے نغمۂ خیامؔ بھی ہے

اب بھی چھائی ہے مرے دل پہ وہی گردِ غبار
زندگی آج بھی ہے ایک تبسم کا شکار
اب بھی باقی ہے اسی طرح سے یادوں کا خمار

اب بھی سن لیتا ہوں وہ نغمہ ترا گایا ہوا
اپنے ہاتھوں سے چھلک جاتی ہے کیسے صہبا
کیسے ہر درد پہ ہنس دیتی ہے ظالم دنیا

زخم تازہ ہے تو ہم رہتے ہیں رنجور ابھی
فکرِ ساحل ہمیں لے جائے گی کچھ دور ابھی
وہی احساس کی دنیا وہی دستور ابھی

نلشِ غم شکریہ بیدار ہوا ہے انساں
کس سے رک سکتا ہے ایدوست امنڈتا طوفاں
آج ہر گام پہ اک شمع یقیں ہے رقصاں

تسلّی

اپنے ہاتھوں میں لرزتا ہوا اک جام سہی
زندگی درد کی ماری ہوئی ناکام سہی
اپنے ویرانے پہ چھائی ہوئی اک شام سہی
میں کہ ایدوست اسیرِ غمِ ایام سہی
آج بھی درد میں کروٹ تو بدل سکتا ہوں

اُن حسیں خوابوں کی تعبیر میں سوچا نہ کروں
فکرِ امروز تو کرلوں غمِ فردا نہ کروں
تم ہی بتلاؤ کہ اب دل کو سلاؤں کیسے؟

دے اٹھا لَو جو مرا زخمِ جگر یوں ہی سہی
زندگی میری بنی رقصِ شرر یونہی سہی
کتنا مبہم ہے مرا خوابِ سحر یوں ہی سہی
کوئی لیتا نہیں گر میری خبر یوں ہی سہی
چند آنسو بھی جو مچلے تو بہل سکتا ہوں

تم کو یہ غم ہے کہ رسوا سرِ بازار ہوں میں
تم کو یہ غم ہے کہ ٹوٹی ہوئی تلوار ہوں میں
یہ بھی اک تلخ حقیقت ہے چھپاؤں کیسے!

باوقار تنظیم

باوقار تنظیم کے پہلے گروپ کی افتتاحی ڈرائنگ بتاریخ ۳۰ جنوری ۱۹۵۷ء بروز اتوار بوقت ۴½ بجے سہ پہر بمقام صدر دفتر باوقار کمپنی لمیٹڈ بالمقابل ماما پارسی گرلز ہائی اسکول، بندر روڈ کراچی ۲، جناب حکیم محمد اقبال حسین صاحب، مالک آئی ساکو پاکستان کراچی، کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد صاحب صدر نے حاضرین سے اعداد طلب فرمائے۔ جن حضرات نے جو اعداد دیئے وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱)	گروپ نمبر ۱	رول نمبر	۷۳۰	جناب مستری تاج الدین صاحب کراچی	۷۸۶
(۲)	گروپ نمبر ۱	رول نمبر	۹۳	جناب مولوی محمد امین صاحب کھوکھر، کراچی	۳۱۳
(۳)	گروپ نمبر ۱	رول نمبر	۱۵۷	جناب عبدالصمد صاحب انصاری، کراچی	۱۹۵۷
(۴)	گروپ نمبر ۱	رول نمبر	۴۱	جناب شیخ محمد عثمان صاحب کراچی	۴۷۵
(۵)	گروپ نمبر ۱	رول نمبر	۹۵	جناب قاری فضل الرحمن صاحب کراچی	۳۱۴
(۶)	گروپ نمبر ۱	رول نمبر	۴۷۴	عائشہ بیگم (نابالغہ) بتوسط جناب تمیزالدین صاحب (والد) کراچی	۱۹۲
(۷)	گروپ نمبر ۱	رول نمبر	۱۹۶	جناب شہزادہ نبی صاحب کراچی	۷۲

حاصل جمع ۴۰۰۹

ان سات اعداد کی حاصل جمع ۴۰۰۹ ہوئی اور ۷ کے عدد سے ضرب دی گئی تو حاصل ضرب ۲۸۰۶۳ آئی۔ جب اسے ۵۰۱ سے تقسیم کیا گیا تو عدد ۷ باقی بچا۔ اس لئے گروپ نمبر ۱ کی پہلی ڈرائنگ کی امدادی رقم مبلغ -/۵۰۰ روپے، گروپ نمبر ۱ رول نمبر ۷ جناب رحیم شاہ ولد غلام حیدر شاہ سکنہ موضع وڈاکخانہ تلہٹہ، علاقہ گڑھی حبیب اللہ خاں۔ تحصیل مانسہرہ۔ ضلع ہزارہ۔ حال ساکن کراچی کو جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ بصورت نقد جناب حکیم محمد اقبال حسین صاحب کے دست مبارک سے ادا کر دی گئی۔ اس کے بعد حاضرین کی چائے وغیرہ سے تواضع کی گئی اور افتتاحی تقریب بہ احسن وخوبی اختتام کو پہنچی اور جلسہ حاضرین کے شکریہ کے ساتھ برخاست ہوا۔ ادارہ باوقار تنظیم جناب حکیم محمد اقبال حسین صاحب کا جو کہ خود بھی اس سکیم کے ممبر ہیں بے حد شکر گزار ہے کہ انھوں نے تنظیم کی اس افتتاحی ڈرائنگ کی صدارت کے فرائض سرانجام دیکر کارکنان تنظیم کا ہاتھ بٹایا۔

پہلا گروپ ۶ جنوری ۱۹۵۷ء تک مکمل ہو چکا تھا۔ ۷ جنوری ۱۹۵۷ء سے دوسرے گروپ کی ممبر سازی شروع ہو گئی تھی۔ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے دوسرا گروپ بھی اب مکمل ہو گیا ہے۔ اور تیسرے گروپ کی ممبر سازی شروع کر دی گئی ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ یہ گروپ بھی اسی تیز رفتاری کے ساتھ جلد ہی پورا ہو جائیگا ——— دوسرے گروپ کی پہلی ڈرائنگ ۱۷ فروری ۱۹۵۷ء بروز اتوار، پہلے گروپ کی دوسری ڈرائنگ کے ساتھ ہی کر دی جائے گی۔ انشاءاللہ العزیز۔ ایجنٹ حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اس کی اطلاع اپنے دوسرے گروپ کے ممبران تک پہنچادیں۔

دوسرا گروپ جس رفتار سے پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے اسکے پیش نظر اگر اللہ تعالیٰ کا کرم شامل حال رہا تو ہمیں توقع ہے کہ اپریل ۵۸ء کے آخر تک ہم اپنے پروگرام کے مطابق ۵ گروپ مکمل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اس کے بعد ہی اصل کام شروع ہوگا۔ ممبر سازی کی موجودہ تیز رفتار ان احباب کے مخلصانہ اور ہمدردانہ تعاون کا نتیجہ ہے جو اس سکیم سے پوری دلچسپی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ اس کے لئے ادارہ تنظیم ان کا بے حد شکر گزار ہے۔ پہلے گروپ کی تکمیل پر اس کے ممبران کی پوری فہرست ان کے رول نمبر وغیرہ اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ اگر کسی ممبر کے نام اور پتہ میں کوئی غلطی ہو تو وہ اس کی اصلاح کرا سکے۔

گروپ نمبر ۱ کی پاس بکیں انشاء اللہ تعالیٰ ہم فروری ۵۸ء کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیں گے، وہ حضرات جو ایجنٹس کی معرفت ممبر بنے ہیں ان کی پاس بکیں ہم ایجنٹس ہی کو روانہ کردیں گے اور ایجنٹ حضرات انھیں خود تقسیم کریں گے۔ اگر کوئی ایجنٹ اپنے ممبران کی پاس بکیں براہ راست صدر دفتر ہی سے بھجوانا چاہتا ہو تو اسے فوراً صدر دفتر کو مطلع کرنا چاہیئے۔ جو ممبر براہ راست صدر دفتر میں بُک ہوتے ہیں۔ ان کی پاس بکیں براہ راست صدر دفتر سے روانہ کی جائیں گی۔

دوسرے گروپ کی پاس بکیں بھی فروری ۵۸ء کے دوسرے یا تیسرے ہفتہ تک ضرور تقسیم کردی جائیں گی۔ انشاءاللہ العزیز۔

ایجنٹ صاحبان نوٹ فرمالیں کہ :

انھیں اپنی معرفت بنے ہوئے پہلے گروپ کے ممبران کی دوسری قسط ۱۲ فروری ۵۸ء تک صدر دفتر بھیجدینی چاہئیں اور دوسرے گروپ کے ممبران کی دوسری قساط ۱۲ مارچ ۵۸ء تک صدر دفتر بھیجدینی چاہئیں اور آئندہ کے لئے یہ لائحہ عمل رہے گا کہ ——— مکمل گروپوں کی آئندہ اقساط ہر عیسوی ماہ کی بارہ تاریخ تک صدر دفتر روانہ کردینی چاہئیں۔ علےٰ ھذا القیاس۔

آئندہ مکمل شدہ گروپوں کی ڈرائنگ کا طریقۂ کار یہ رہے گا کہ ہر عیسوی ماہ کی بارہ تاریخ کے بعد آنے والے پہلے اتوار کو بوقت تین بجے سہ پہر صدر دفتر میں ڈرائنگ منعقد ہوا کرے گی۔ اسکے لئے انفرادی اطلاع نامے جاری نہیں ہوا کرینگے

منیجر!

باوقار تنظیم، کراچی نمبر ۱

باوقار تنظیم

باہمی بچت کی پراقمط شیئرنگ سکیم کے گروپ نمبر ۱ کے ممبران کی فہرست

رول نمبر	نام اور پتہ
۱	حکیم سید محمد عبداللہ صاحب ندوی۔ حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
۲	محمد تحسین خانصاحب۔ گولیمار، پیرآباد متصل ۴۰۰ کوارٹر ہاؤس نمبر ۱۷۶۹ کراچی۔
۳	عبادت شاہ ولد نقیہ شاہ موضع تلہٹہ ڈاکخانہ خاص تحصیل مانسہرہ ہزارہ حال کراچی
۴	مظفر حسن صاحب زبیری ۱/۱۲۸ پاپوش نگر، ناظم آباد کراچی
۵	پیر عنایت شاہ موضع ڈاکخانہ خاص تلہٹہ تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ حال کراچی
۶	ملک امان موضع ڈاکخانہ خاص تلہٹہ تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ۔ علاقہ گڑھی حبیب اللہ خان۔ حال ساکن کراچی معرفت ڈاکٹر صدیقی صاحب۔
۷	رحیم شاہ موضع ڈاکخانہ خاص تلہٹہ تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ حال کراچی
۸	سردار بیگم صاحبہ۔ نمبر ۱۸ سچائی والا بلڈنگ، دلنگٹن اسٹریٹ صدر کراچی ۳
۹	محمد اشرف بیّاب صاحب معرفت حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی۔
۱۰	نجمن نرہز بیگم معرفت حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی ۱
۱۱	محمد اصغر ملک صاحب ۱۰/۲۲ مسلم لیگ کوارٹرز۔ ناظم آباد کراچی۔
۱۲	حافظ احمد سعید صاحب ۸۔۸۷/۲ نزد نیرنگ سینما لالوکھیت کراچی
۱۳	عابد سعید صاحب ۸۔۸۷/۲ نزد نیرنگ سینما لالوکھیت کراچی۔
۱۴	خالد محمد فاروقی ۱۳۱ حیدرآباد کالونی کلیٹن روڈ کراچی ۵
۱۵	پی۔ ڈی۔ مصطفےٰ معرفت کھیوڑا سوڈا کمپنی لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۴۷۰۱ کراچی۔
۱۶	پی۔ محمود معرفت الیف۔ براﺋٹ ایجنسی۔ مقابل کسٹم ہاؤس۔ کراچی
۱۷	سی کے۔ احمد معرفت کوکس اینڈ کنگز لمیٹڈ لائیڈز بنک بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی۔
۱۸	پی۔ ابوبکر۔ ربواچند فتح چند بلڈنگ کمرہ نمبر ۸۵۔ نزد تاج محل سینما بندر روڈ کراچی۔
۱۹	پی۔ عثمان۔ ربواچند فتح چند بلڈنگ کمرہ نمبر ۸۷۔ نزد تاج محل سینما بندر روڈ کراچی۔
۲۰	اے۔ سی۔ عبدالرحمان۔ جان محمد بلڈنگ گولی لین نمبر ۱، محمدی ہیری فیکٹری کراچی۔
۲۱	بی بی سارا۔ ولد عبدالرؤف کوارٹر نمبر ۱۲ بلاک نمبر ۱ کرا ہیڑی ۔ پولیس لین کراچی۔
۲۲	خدا بخش۔ کراچی سینڈیکیٹ لمیٹڈ داد ابھیرز۔ بندر روڈ کراچی۔
۲۳	نور جہاں بیگم صاحبہ۔ ۱۲۔ میکی منیشن ہریداس لال جی روڈ کراچی۔
۲۴	محمد ہاشم صاحب نیوز ایجنسی شاہ فاروق آباد۔
۲۵	محمد مظہر الحق خیری ۹/۹ بہار کالونی۔ کراچی نمبر ۵۔
۲۶	سید رفیق احمد صاحب۔ محلہ نمبر ۱۲۶۹۔ بورڈ بلڈر۔ ایم۔ سی۔ ڈی پی۔ این۔ ڈاکیارڈ کراچی۔
۲۷	فرحت علی طالب علم ولد محمود علی صاحب مکان نمبر ۶۵ ہسپتال روڈ نزد پوسٹ آفس۔ مایرسٹی۔ کراچی نمبر ۳۳ سرپرست محمود علی والد
۲۸	عرفان حسین صاحب طالب علم۔ ۱۶ ہارون بلڈنگ ہسپتال روڈ کراچی۔
۲۹	عرفان حسین صاحب طالب العلم۔ ۱۶ ہارون بلڈنگ ہسپتال روڈ کراچی
۳۰	خالد شمیم۔ نابالغ۔ سرپرست والدہ مرتضائی بیگم صاحبہ۔ ۱۶ ہارون بلڈنگ ہسپتال روڈ کراچی۔
۳۱	محمد قدیر معرفت محمد شاہ رنگ پالش والے میٹھادر صرافہ بازار مراد لوہار اسٹریٹ کراچی۔
۳۲	محمد شاہ میٹھادر صرافہ بازار مراد لوہار اسٹریٹ کراچی۔
۳۳	عبدالماجد کرانہ مرچنٹ۔ چاندماری پل متصل پیلس ہوٹل کراچی۔
۳۴	مجیب احمد۔ ارجن سنگھ بلڈنگ۔ سلوجی ڈیوڈ روڈ۔ رامسوامی کراچی نمبر ۳ معرفت دل بہار پان ہاؤس۔
۳۵	صفیہ بیگم۔ ولد مجیب احمد رول نمبر ۳۴ ارجن سنگھ بلڈنگ سلوجی ڈیوڈ روڈ رام سوامی کراچی نمبر ۳۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۳۶	فردوس بیگم۔ زوجہ محمد قدیر۔ رول نمبر ۱۳ معرفت محمد شاہ پالش والے صرافہ بازار۔ مراد لوہار اسٹریٹ۔ میٹھادر۔ صرافہ بازار کراچی۔
۳۷	شیخ بشیر احمد معرفت ڈاکٹر محمد یونس صاحب تلسی اسٹریٹ راسوامی کراچی ۲
۳۸	محمد عاشقین۔ سائیکل والے۔ بورد والا بلڈنگ سرسٹ اسٹریٹ کراچی ۳
۳۹	ڈاکٹر محمد یونس صاحب تلسی اسٹریٹ۔ راسوامی۔ کراچی ۳
۴۰	محمد عرفان ولد ڈاکٹر محمد یونس تلسی اسٹریٹ راسوامی کراچی نمبر ۳۔
۴۱	شیخ محمد عثمان صاحب سکینہ بلڈنگ۔ کاکا اسٹریٹ لارنس روڈ کراچی
۴۲	محمد طارق ولد عبدالحمید خان صاحب، سپرداتنڈ اکاونٹنٹ، اکاونٹس ڈیپارٹمنٹ، کراچی پورٹ ٹرسٹ، کراچی۔
۴۳	عطا محمد صاحب کتاب ہاؤس، پتھر بازار، ڈیرہ غازی خاں۔
۴۴	فاطمہ بیگم صاحبہ فلیٹ نمبر ۱ ہارمونی بلڈنگ فریرروڈ کراچی۔
۴۵	بلقیس بیگم صاحبہ فلیٹ نمبر ۱ فریرروڈ کراچی۔
۴۶	پی۔ کے۔ عبداللہ معرفت مالاباری ٹیکسی رنر روڈ۔ جونا مارکیٹ کراچی
۴۷	این۔ کے۔ احمد نیوپان ہاؤس معرفت کالی کٹ ہوٹل۔ جونا مارکیٹ لارنس روڈ کراچی۔
۴۸	محمد اکبر صاحب ۵۳۲۔ آگرہ تاج کالونی نزد میرپور روڈ بس۔ سٹاپ۔ کراچی نمبر ۲۔
۴۹	پی۔ کے۔ یوسف صاحب۔ ہوٹل نمبر ۴۳۰۔ بلاک نمبر ۶ لالوکھیت۔ کراچی
۵۰	دوست محمد اعوان۔ آئی۔ سی۔ آئی (پاک) لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۴۱۳۱ کراچی
۵۱	جناب محمد نظیر شیخ صاحب دلی کام، ۴۲ چینی فدو ٹرسٹ بلڈنگ۔ کرسنٹ پریچی روڈ۔ نزد دائرہ بریگیڈ اسٹیشن۔ کراچی نمبر ۱۔
۵۲	سمینہ اقبال۔ ۴۹ - F - جیل روڈ کراچی۔
۵۳	آصف علی صاحب معرفت۔ آئی سی۔ آئی۔ (پاک) لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۴۱۳۱۔ ویسٹ وہارف کراچی۔
۵۴	جناب محمد صاحب۔ معرفت آئی۔ سی۔ آئی (پاک) لمیٹڈ۔ فارم ڈیپارٹمنٹ ویسٹ وہارف پی۔ بی نمبر ۴۱۳۱۔ کراچی۔
۵۵	عبدالقیوم صاحب معرفت آزاد ڈیلرز فریرروڈ۔ آرام باغ کراچی۔
۵۶	غلام شبیر احمد صاحب معرفت امپیریل کیمیکل انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ پوسٹ بکس ۴۱۳۱ کراچی۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۵۷	مسٹر کے۔ برہان الدین شیخ معرفت میسرز کالٹکس آئل (پاک) لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۴۷۸۔ کراچی۔
۵۸	مسٹر ایم احمد۔ ۴۲۹/۸ لالوکھیت کراچی۔
۵۹	مسٹر عبدالکریم۔ معرفت اے کے ریسٹورنٹ۔ فریا اسٹریٹ صدر کراچی
۶۰	محمد رشید احمد صاحب۔ معرفت امپیریل کیمیکل انڈسٹریز پاکستان لمیٹڈ پوسٹ بکس ۴۱۳۱ ویسٹ وہارف کراچی۔
۶۱	مسٹر کے۔ اے۔ محمد معرفت برما شیل آئل کمپنی (پاک) لمیٹڈ کاٹن ایکسچینج بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی۔
۶۲	مسٹر اے۔ پی۔ ایم محی الدین معرفت بچوں کا ہسپتال۔ نزد مسافر دواخانہ کراچی
۶۳	قیوم سعادت صاحب ۳-۴۔ زینت منزل، بارنس اسٹریٹ۔ کراچی ۳
۶۴	قیوم سعادت صاحب۔ ۳-۴ زینت منزل، بارنس اسٹریٹ۔ کراچی ۳
۶۵	قیوم سعادت صاحب۔ ۳-۴۔ زینت منزل، بارنس اسٹریٹ کراچی ۳
۶۶	لطافت حسین صاحب ۳-۴ زینت منزل، بارنس اسٹریٹ، معرفت ڈاکٹر قیوم سعادت صاحب، کراچی۔ ۳۔
۶۷	محمد اشرف ادیب۔ جنرل پوسٹ آفس۔ راولپنڈی۔
۶۸	بدر الحسن صاحب معرفت ظفر احمد صاحب انصاری ۱۲/۱۸ بندر روڈ کراچی
۶۹	امتیاز الدین صاحب معرفت ظفر احمد صاحب انصاری ۱۲/۱۸ بندر روڈ کراچی
۷۰	محمد ظفر احمد صاحب انصاری ۱۲/۱۸ بندر روڈ۔ کراچی
۷۱	راجہ غضنفر علی صاحب مقام وڈاکخانہ چک نمبر ۶۶ جنوبی، تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا
۷۲	حکیم محمد شریف صاحب ٹیلیکم ٹریننگ کالج۔ ہری پور ضلع ہزارہ
۷۳	صابر حسین صاحب شرنی ۲/۲۲ جیکب لائن۔ کراچی
۷۴	حکیم محمد اقبال حسین صاحب ۹/۶۲ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی
۷۵	رحمت الٰہی صاحب معرفت آئی سا کو پاکستان، لارنس روڈ۔ کراچی ۳
۷۶	چودہری غلام محمد صاحب ۹۔ لوٹیا بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی
۷۷	مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دارالعلوم کراچی نمبر ۱
۷۸	مولانا محمد متین خطیب صاحب دارالعلوم۔ کراچی نمبر ۱
۷۹	محمد عبداللہ صاحب حلیم کلرک واٹر ماسٹنگ کوارٹر نمبر 285.J ابن ڈبلیو آر۔ کورنگی
۸۰	زبیدہ بیگم صاحبہ اہلیہ محمد عبداللہ صاحب حلیم کوارٹر 285.J۔ کورنگی

رول نمبر	نام اور پتہ
۸۱	محمد سلیم صاحب معرفت پنجاب موٹر ورکشاپ سعید منزل بندر روڈ کراچی
۸۲	محمد عبدالواحد صاحب معرفت محمد سلیم صاحب لکڑی و کوئلہ گودام، نمبر ۴۳۰۔ بالمقابل بلاک نمبر ۱۹۔ مارٹن کوارٹرز۔ کراچی نمبر ۵
۸۳	محمد عبدالواحد صاحب معرفت محمد سلیم صاحب لکڑی و کوئلہ گودام، نمبر ۴۳۰۔ بالمقابل بلاک نمبر ۱۹۔ مارٹن روڈ کوارٹرز۔ کراچی
۸۴	اسلام فاطمہ بیگم صاحبہ ۲۶۸/۱۔ مارٹن روڈ۔ کراچی ۵
۸۵	کے۔ پی۔ الہ صاحب معرفت نولٹی اسٹورز مینسفیلڈ سٹریٹ صدر۔ کراچی
۸۶	ایم۔ جے۔ پی صوفی۔ معرفت اے کے ریسٹورنٹ۔ ایس۔ پی 66/4 فریر اسٹریٹ۔ صدر کراچی
۸۷	مرزا عبدالسلام بیگ صاحب اسٹینوگرافر۔ دفتر پوسٹ ماسٹر جنرل۔ لاہور
۸۸	اسعد خلیل صاحب نمبر C/71 محمود آباد۔ کراچی نمبر ۴
۸۹	عبدالعزیز خان صاحب "رین بسیرا" A/92 محمود آباد کالونی کراچی
۹۰	محمد عمر فاروق صاحب۔ پوسٹل کلرک جی۔ پی۔ او۔ لائل پور
۹۱	محمد عمر فاروق صاحب پوسٹل کلرک جی۔ پی۔ او۔ لائل پور
۹۲	محمد عمر فاروق صاحب پوسٹل کلرک جی پی۔ او۔ لائل پور
۹۳	مولوی محمد امین صاحب کھوکھر۔ پلاٹ نمبر 38/1۔ متصل مسجد غریب نواز۔ لالوکھیت ڈاکخانہ۔ کراچی
۹۴	خلیل الرحمان صاحب کھوکھر۔ پلاٹ نمبر 38/1۔ متصل مسجد غریب نواز۔ لالوکھیت ڈاکخانہ۔ کراچی
۹۵	قاری حافظ فضل الرحمٰن صاحب کھوکھر۔ پلاٹ نمبر 38/1 متصل مسجد غریب نواز۔ لالوکھیت سی ایریا۔ کراچی
۹۶	زاہدہ صاحبہ معرفت محمد سلیم پنجاب موٹر ورکشاپ بندر روڈ۔ کراچی
۹۷	ماہر القادری صاحب مدیر "فاران" کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی
۹۸	احمد نور صاحب مکان نمبر ۸۰۲/K کمیٹی محلہ راولپنڈی شہر
۹۹	حمید الدین صاحب معرفت ادارہ فیض الکتابت آدم خان مارکیٹ، نزد مولوی مسافر خانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی
۱۰۰	خواجہ عبدالغفور صاحب معرفت حافظ اللہ بخش صاحب، پنجاب شوز اسٹور۔ پنڈ دادن خان۔ ضلع جہلم

رول نمبر	نام اور پتہ
۱۰۱	شاہ محمد غوث صاحب ۱۲۔ الیاس عربی بلڈنگ آبیگار احاطہ سلامی روڈ متصل الآنہ مسجد۔ کراچی ۳۔
۱۰۲	صاحبزادہ عبدالرحمان صاحب معرفت شاہین بک ڈپو ساؤتھ سرکلر روڈ۔ پشاور۔ صدر
۱۰۳	مختار احمد صاحب فاضل مدرس گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب ضلع سرگودھا
۱۰۴	خواجہ منظور الحسن صاحب کلاتھ مرچنٹ ٹنڈو آدم
۱۰۵	کرامت علی معرفت بشیر علی ہارڈ ویر مرچنٹ بوہرہ پیر رنچھوڑ لائن کراچی
۱۰۶	محمد سرور حسین کلرک رجسٹری ڈیلیوری برانچ۔ جی پی۔ او۔ کراچی
۱۰۷	عبدالستار صاحب معرفت خان اینڈ کو ہول سیل بائی شوز۔ بندر روڈ کراچی
۱۰۸	زر خان صاحب نیازی میراں پیر روڈ۔ لیاری کوارٹرز۔ کراچی ۲
۱۰۹	محمد ہاشم صاحب گلزار بلڈنگ کمرہ ۶ ٹیری روڈ۔ لیاری کوارٹرز کراچی
۱۱۰	خالد حبیب صاحب چوہان۔ گلی نمبر ۸ منشی محلہ۔ لائل پور
۱۱۱	عبدالقدیر خان صاحب معرفت مکتبہ تعمیر انسانیت۔ سکھر
۱۱۲	عبدالعزیز خان صاحب معرفت مکتبہ تعمیر انسانیت سکھر
۱۱۳	رحمت اللہ خان صاحب چوکیدار رانا موٹر ورکشاپ دی مال روڈ لاہور
۱۱۴	انوار احمد صاحب کوٹری ریلوے اسٹیشن ٹکٹ کلکٹر ضلع دادو
۱۱۵	بتول بیگم صاحبہ مکان نمبر ۱۰۱۲ مغل بنگلی بالمقابل ریڈیو اسٹیشن۔ حیدرآباد۔
۱۱۶	محمد خلیل صاحب معرفت قریشی اسٹور۔ لفنسٹن اسٹریٹ صدر کراچی
۱۱۷	غلام سرور صاحب P.N.S. معرفت الغایم او کراچی
۱۱۸	عبدالشکور خان صاحب۔ ۲۔ ہری چرن رائے روڈ۔ فرید آباد۔ ڈھاکہ (م۔پ)
۱۱۹	عبدالشکور خان صاحب۔ ۲۔ ہری چرن رائے روڈ۔ فرید آباد ڈھاکہ (م۔پ)
۱۲۰	محمد حنیف صاحب ہاشمی ۶۲ شینیش سرکار روڈ پوسٹ فرید آباد۔ ڈھاکہ (م۔پ)
۱۲۱	ہارون الرشید صاحب اکاؤنٹس برانچ صادق سوپ کمپنی۔ رحیم یار خان
۱۲۲	ہارون الرشید صاحب اکاؤنٹس برانچ صادق سوپ کمپنی رحیم یار خان
۱۲۳	عمر خان صاحب۔ میراں پیر روڈ۔ لیاری کوارٹرز۔ کراچی
۱۲۴	شیر علی خان ولد احمد خان صاحب میراں پیر روڈ۔ لیاری کوارٹرز۔ کراچی
۱۲۵	ملک عبدالقیوم فضل الٰہی سوئیڈ روالی۔ مین بازار مین گلی ۵۔ ملک دی ہٹی۔ دکان نمبر ۳۱/۲۴۲ بمقام طارق آباد۔ لائل پور
۱۲۶	سید مسعود حسین مکتبہ فکر اسلامی نزد بس اسٹاپ بسیلہ ہاؤس کراچی

رول نمبر	نام اور پتہ
۱۲۷	توقیر حسن خانصاحب خوجہ کمپاؤنڈ نزد پیر کالونی۔ کراچی
۱۲۸	محمد شفیع خان ۱۳/۳۷۹ ویسٹ گارڈن۔ لارنس روڈ۔ کراچی
۱۲۹	محمد جلیل خانصاحب پلاٹ نمبر ۴۳ بشمال کوٹھی پیر صاحب پیر کالونی۔ کراچی
۱۳۰	حافظ محمد حیات صاحب شاہی بازار ٹالی۔ حیدرآباد سندھ
۱۳۱	محمد نشا صاحب نیوز ایجنٹ رحیم یار خاں
۱۳۲	احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد
۱۳۳	محمد عقیل حسن صاحب ٹرنک ٹیلیفون ایکسچینج۔ رمنا ڈھاکہ (م۔پ)
۱۳۴	عالم خانصاحب شاہین بکڈپو ساؤتھ سرکلر روڈ پشاور صدر
۱۳۵	نذیر احمد صاحب معرفت شاہین بکڈپو ساؤتھ سرکلر روڈ۔ پشاور صدر
۱۳۶	عبدالقدوس صاحب کوچہ تندور سازاں سبزی منڈی پشاور صدر
۱۳۷	عبدالوحید صاحب رتن تالاب۔ اے۔ ایم نمبر ۱۸۔ کراچی
۱۳۸	محمد رمضان صاحب دودھ والا معرفت عبداللہ دوکاندار۔ رتن تالاب اے۔ ایم نمبر ۱۰۔ کراچی
۱۳۹	فیض عالم ہیڈ کانسٹبل۔ اینٹی کرپشن جیل روڈ حیدرآباد سندھ
۱۴۰	فیض عالم ہیڈ کانسٹبل اینٹی کرپشن جیل روڈ۔ حیدرآباد سندھ
۱۴۱	عبدالمجید صاحب بکنگ کلرک این ڈبلیو آر۔ ٹنڈو آدم
۱۴۲	جمعہ ولد قبول کمہار گوٹھ سوئی گند ر پوسٹ ملاں مکھن۔ ضلع سانگھڑ
۱۴۳	محمد ابراہیم صاحب ڈیرہ محمد ابراہیم پنہیڑ پوسٹ عمر سانڈ والا ٹنڈو الہ
۱۴۴	صلاح الدین صاحب گلی منگا معرفت ظہیر حلوائی۔ ٹنڈو آدم
۱۴۵	غیاث الدین صاحب گلی منگا معرفت ظہیر حلوائی۔ ٹنڈو آدم
۱۴۶	امیر نواز خاں صاحب گڈز کلرک سٹیشن ملاں مکھن ڈاکخانہ ٹنڈو آدم سانگھڑ
۱۴۷	عبدالسلام صاحب پھول مشین والا شاہی بازار۔ ٹنڈو آدم
۱۴۸	محمد الستار صاحب گرین مرچنٹ نزد ریلوے کراسنگ۔ ٹنڈو آدم
۱۴۹	محمد عبدالرحیم نمبر ۱۳۹۔ عنایت بازار۔ جیل روڈ چھاگانگ
۱۵۰	محمد حمید اللہ صاحب صدیقی ۲۶/۶. D. III ناظم آباد کراچی
۱۵۱	سید قاسم حسنی صاحب ۲۶۵۔ جاوید منزل حیدرآباد کالونی۔ کراچی ۵
۱۵۲	مسرت جہاں بیگم A ۲/۸۷۰ لالوکھیت۔ کراچی ۱۹
۱۵۳	محمد شریف صاحب نزد گورنمنٹ گرلز ہائی سکول خوشاب ضلع سرگودھا
۱۵۴	شیخ مفیض الرحمان صاحب معرفت محمد حنیف صاحب ہاشمی رمنا ٹیلیفون ٹرنک ایکسچینج۔ ڈھاکہ (م۔پ)
۱۵۵	حبیب اللہ صاحب
۱۵۶	شرافت علی خانصاحب ۹/۱۱ D. III ناظم آباد کراچی۔
۱۵۷	عبدالصمد صاحب ۱۲۲ پرنس اسٹریٹ ٹانک واڑہ کراچی۔
۱۵۸	میر قلم خانصاحب میرین پیر روڈ لیاری کھاڈہ کراچی۔
۱۵۹	محمد سہیل صاحب معرفت آئی۔ سی۔ آئی (پاک) لمیٹڈ ۴۴۔ ۲۴۔ ویسٹ وہارف کراچی۔
۱۶۰	محمد نذیر احمد صاحب ۲۵۴۳ E بنگلہ ایوب شاہ لاہور
۱۶۱	محمد زاہد حسین صدیقی صاحب ۲۵۰ تاج کالونی کراچی ۲۔
۱۶۲	محمد فاضل صاحب معرفت قریشی جنرل سٹور الفنسٹن سٹریٹ صدر کراچی
۱۶۳	امان اللہ خانصاحب نیازی۔ ڈاکخانہ نارک آباد ضلع تھرپارکر (سندھ)
۱۶۴	رانی پروین بیگم صاحبہ۔ ڈاکخانہ نارک آباد تھرپارکر (سندھ)
۱۶۵	محمد عبداللہ علوی دفتر جماعت اسلامی میانوالی (شہر)
۱۶۶	ابوالوفا محمود علوی قلعہ گنگ ضلع کیمبل پور۔
۱۶۷	ابو رضا محمود علوی قلعہ گنگ ضلع کیمبل پور
۱۶۸	سینا بیوی زوجہ محمد عبدالصمد صاحب علوی دفتر جماعت اسلامی میانوالی
۱۶۹	محمد بصیر اللہ صاحب ایل۔ آئی اے۔ ٹی بی شپ بلڈنگ آپریشن ڈیپارٹمنٹ ایئرپورٹ کراچی
۱۷۰	محمد یوسف صاحب۔ یوسف جنرل اسٹور شاہی بازار ٹالی ضلع حیدرآباد
۱۷۱	محمد یونس صاحب۔ شاہی بازار ٹالی ضلع حیدرآباد۔
۱۷۲	غلام رسول خالد معرفت حافظ محمد حیات شاہی بازار ٹالی ضلع حیدرآباد
۱۷۳	غلام نبی عرف نواب۔ نواب کریانہ سٹور ٹالی ضلع حیدرآباد۔
۱۷۴	پیرزادہ محمد میاں مالک محبوب یوپی ہوٹل۔ ٹالی ضلع حیدرآباد۔
۱۷۵	محمد احمد گوٹھ حاجی۔ علی محمد ڈاکخانہ ایضاً براستہ ٹنڈو غلام علی ضلع حیدرآباد
۱۷۶	محمد احمد آرائیں گوٹھ حاجی علی محمد ڈاکخانہ ٹنڈو غلام علی ضلع حیدرآباد
۱۷۷	امین الدین جنرل مرچنٹ۔ شاہی بازار ٹالی ضلع حیدرآباد
۱۷۸	قاضی پیر محمد معرفت قاضی حاجی غلام محمد مینیاری فروش نزد جامع مسجد شاہی بازار ٹالی ضلع حیدرآباد۔
۱۷۹	قاضی حاجی غلام محمد مینیاری فروش نزد جامع مسجد شاہی بازار ٹالی حیدرآباد
۱۸۰	مشتاق احمد گرمفروش نزد محبوب یوپی ہوٹل ٹالی ضلع حیدرآباد۔
۱۸۱	محمد عبداللہ خاں دکان نمبر ۶۰۲ نزد جامع مسجد ٹالی حیدرآباد۔
۱۸۲	حاکم علی خاں اردو ٹیچر گورنمنٹ پرائمری سکول ٹالی حیدرآباد۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۱۸۳	افسر علی اوپریٹر بجلی فیکٹ ماتلی
۱۸۴	محمد بخش پان فروش نزد جامع مسجد شاہی بازار ماتلی۔
۱۸۵	چوہدری محمد فاضل سی۔ آئی۔ ڈی۔ ای۔ چکلالہ چھاؤنی۔
۱۸۶	چوہدری محمد فاضل۔ سی۔ آئی۔ ڈی۔ ای۔ چکلالہ چھاؤنی۔
۱۸۷	چوہدری محمد فاضل۔ سی۔ آئی۔ ڈی۔ ای۔ چکلالہ چھاؤنی
۱۸۸	چوہدری محمد فاضل۔ سی۔ آئی۔ ڈی۔ ای۔ چکلالہ چھاؤنی
۱۸۹	محمد نواز سیال مسجد مرن روڈ نزد سوری بلڈنگ کرشن نگر لاہور
۱۹۰	مولانا عبدالغفار سلفی صاحب مدرسہ دارالعلوم محمدی مسجد نلبس روڈ کراچی
۱۹۱	محمد شعیب سلفی۔ مدرسہ دارالعلوم محمدی مسجد نلبس روڈ کراچی۔
۱۹۲	احسان الہٰی صاحب شمسی معرفت ادارہ تحقیق الکتابت بندر روڈ کراچی
۱۹۳	صالحہ فرحت مکان نمبر ۵۵۰/۵ لالوکھیت کراچی
۱۹۴	ناہید جمال مکان نمبر ۴۸۰/۱ لالوکھیت کراچی۔
۱۹۵	عبدالرزاق مکان نمبر ۵۵۰/۵ لالوکھیت کراچی۔
۱۹۶	شہزاد نبی ۱۲ ہاشمی بھون (مریم منزل) سول شنکر داس روڈ رنچھوڑ لائن
۱۹۷	اعجاز احمد A/۲ محمود آباد متصل جنیسر گوٹ کراچی نمبر ۵
۱۹۸	توکل حسین قدوائی ۲۲/۲ جہانگیر اسٹیٹ کراچی نمبر ۵
۱۹۹	یعقوب النساء ۲۲/۲ جہانگیر اسٹیٹ کراچی نمبر ۵۔
۲۰۰	سراج الدین ابوالخطیب ۸۵ بی بلاک محمود کالونی کراچی نمبر ۲
۲۰۱	ملک محمد طوقی صاحب ۳۳ اسپٹر بچن روڈ کراچی۔
۲۰۲	ارشاد احمد علوی مکان نمبر ۲۴۰ وارڈ نمبر ۲ جھنگ شہر
۲۰۳	اعجاز حسین۔ مکان نمبر ۹ شاہ عالم اسٹریٹ نمبر ۱ دسن پورہ لاہور
۲۰۴	خورشید حیدر صاحب۔ دفتر چیف انجینئر ای۔ بی۔ آر ریلوے چٹاگانگ
۲۰۵	سید شمس الدین صاحب شاہین سٹور شاہی بازار جیکب آباد
۲۰۶	سید تنویر ضیاء صاحب پاک شفاخانہ جیکب آباد
۲۰۷	سید سلیم جاوید پان بازار جیکب آباد۔
۲۰۸	عبدالصمد صاحب۔ بمقام جمشید آباد۔ تعلقہ جیکب آباد
۲۰۹	اعجاز اصغر۔ اعجاز سوئٹ مارٹ قندھاری چوک جیکب آباد
۲۱۰	شاہدہ بیگم۔ اعجاز سوئٹ مارٹ قندھاری چوک جیکب آباد
۲۱۱	زاہدہ بیگم محمد رفیق شیر فروش چوک پیر بخاری جیکب آباد
۲۱۲	رشیدہ خاتون والدہ محمد سہیل اعجاز سوئٹ مارٹ قندھاری چوک جیکب آباد

رول نمبر	نام اور پتہ
۲۱۳	طاہرہ خانم گاندھی نگر کوارٹر نمبر ۲۲۶ گلی نمبر ۱ ہر چند رائے روڈ کراچی
۲۱۴	سید ہاشم شاہ منیجر زراعتی فارم سرائے نورنگ، ضلع بنوں
۲۱۵	سید ہاشم شاہ منیجر زراعتی فارم سرائے نورنگ، ضلع بنوں۔
۲۱۶	محمد انور علوی ۸۵۲ بزاز محلہ لاہور چھاؤنی۔
۲۱۷	محمد عبدالقیوم صاحب، بانس باڑی، سید پور مشرقی پاکستان
۲۱۸	محمد یونس صاحب بزم احباب باؤٹ گوٹ، ملیر (شہر)
۲۱۹	عبدالجبار صاحب بزم احباب باؤٹ گوٹ، ملیر (شہر)
۲۲۰	جمیل احمد فاروقی عثمانیہ مسجد باؤٹ گوٹ ملیر (شہر)
۲۲۱	شوکت علی صاحب ٹنڈو آدم شاہی بازار اصغر علی صاحب شوز مرچنٹ
۲۲۲	دوست محمد معرفت خواجہ منظور الحسن کلاتھ مرچنٹ ٹنڈو آدم۔
۲۲۳	عبدالستار صاحب بیرانی روڈ ٹنڈو آدم (سندھ)
۲۲۴	سید محمد احمد واسطی معرفت مکتبہ فکر اسلامی لسبیلہ شاپ غوری کالونی کراچی
۲۲۵	سید محمد احمد واسطی صاحب معرفت مکتبہ فکر اسلامی لسبیلہ اسٹاپ غوری کالونی کراچی
۲۲۶	سید محمد احمد واسطی صاحب معرفت مکتبہ فکر اسلامی لسبیلہ شاپ غوری کالونی کراچی
۲۲۷	سید محمد احمد واسطی صاحب معرفت مکتبہ فکر اسلامی لسبیلہ شاپ غوری کالونی کراچی
۲۲۸	محمد جلیل خاں صاحب پلاٹ نمبر ۲ الشبلی کوٹھی پیر صابر کالونی کراچی
۲۲۹	محمد سلطان صاحب نعمانی کوٹ رکن الدین خاں قصور شہر ضلع لاہور
۲۳۰	محمد شفیع صاحب نزد برف خانہ ٹنڈو آدم ضلع سانگھڑ۔
۲۳۱	عبدالعزیز صاحب معرفت انجمن محتاں محلہ ٹنڈو آدم
۲۳۲	حافظ عبدالصبور صاحب جنرل مرچنٹ بنگلہ چوک ٹنڈو آدم۔
۲۳۳	جناب اکرم الدین صاحب آلو، پیاز مرچنٹ سبزی مارکیٹ ٹنڈو آدم
۲۳۴	جناب محمد رمضان صاحب معرفت محمد ابراہیم کراین مرچنٹ چاندیا پاڑہ ملیانی روڈ ٹنڈو آدم۔
۲۳۵	فضل احمد صاحب اول مدرس پرائمری اسکول چک ۶۹ جنوبی ضلع سرگودھا
۲۳۶	جناب فخرالدین صاحب حاجی کرنالوی، مکہ کوٹ مومن ڈاکخانہ تحصیل بھلوال، ضلع سرگودھا۔
۲۳۷	جناب ضمیر حسین صاحب بمقام چک نمبر ۶ جنوبی ڈاکخانہ خاص تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔
۲۳۸	ملک غلام حسین صاحب پی ایچ ایڈ گورنمنٹ گوٹ ڈاکخانہ خاص تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔

۲۳۹ [illegible] صاحب [illegible] تحصیل [illegible] ضلع [illegible]

۲۴۰ [illegible] صاحب [illegible] چک نمبر ۱۲ جنوبی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا

۲۴۱ [illegible] صاحب دکاندار ۔ بازار [illegible] پشاور شہر۔

۲۴۲ [illegible] صاحب ۱۲ اشرف روڈ پشاور شہر

۲۴۳ [illegible] صاحب [illegible] معرفت شاہین [illegible] ۔ ایس سی ۔ روڈ
پشاور صدر۔

۲۴۴ [illegible] صاحب کاؤنٹ [illegible] لمیٹڈ [illegible] سٹریٹ رتن تلاؤ کراچی

۲۴۵ [illegible] احمد صاحب ایم ۔ آر ۔ ۴/۳ آسودام بلڈنگ بالائی منزل
ووریجی اسٹریٹ ۔ رامپرٹ روڈ کراچی نمبر ۲

۲۴۶ [illegible] احمد صاحب ۔ ایم ۔ آر ۔ ۴/۳ آسودام بلڈنگ بالائی منزل دوریجی
اسٹریٹ ۔ رامپرٹ روڈ کراچی نمبر ۲

۲۴۷ [illegible] الحق احمد صاحب ۔ ایم ۔ آر ۴/۳ آسودام بلڈنگ بالائی منزل دوریجی
اسٹریٹ ۔ رامپرٹ روڈ کراچی نمبر ۲

۲۴۸ خدا بخش وارلس آپریٹر ڈی ۔ اے ۔ ایف سٹیشن کورنگی کریک ۔ کراچی ۔

۲۴۹ خدا بخش وارلس آپریٹر ڈی ۔ اے ۔ ایف سٹیشن کورنگی کریک کراچی

۲۵۰ بشیر احمد خان صاحب وارلس آپریٹر ڈی ۔ اے ۔ ایف سٹیشن کورنگی کراچی

۲۵۱ بشیر احمد خان صاحب ۔ وارلس آپریٹر ڈی ۔ اے ۔ ایف سٹیشن کورنگی کریک کراچی

۲۵۲ [illegible] احمد صاحب چشتی معرفت ڈی لکس پرنٹنگ پریس رتن تالاب کراچی

۲۵۳ جہانگیر [illegible] صاحب معرفت [illegible] احمد ڈی لکس پرنٹنگ پریس کراچی

۲۵۴ بشیر احمد صاحب مکتبہ تعمیر ملت چونک بازار ملتان شہر

۲۵۵ [illegible] القدیر صاحب سی ۲۹۰ سیٹا بازار راولپنڈی

۲۵۶ حضرت حسین صاحب دکاندار جمعیت رائے روڈ مکان نمبر ۱۰۵۸
[illegible] ڈویژن ۔

۲۵۷ [illegible] محمد صاحب ۔ [illegible] آباد ضلع جیکب آباد

۲۵۸ [illegible] محمد صاحب گلی حکیم قاسم الدین [illegible] بٹ [illegible] جیکب آباد

۲۵۹ [illegible] محمد [illegible] صاحب [illegible] جیکب آباد

۲۶۰ [illegible] صاحب معرفت [illegible] حسین [illegible] بازار
[illegible]

۲۶۱ [illegible] صاحب [illegible] پوسٹ آفس [illegible] تحصیل
[illegible]

۲۶۲ [illegible] صاحب [illegible] جیکب آباد

۲۶۳ مولوی محمد یحییٰ صاحب ۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان [illegible]
پی او ۴۳۶ کراچی ۔

۲۶۴ چاند محمد صاحب پوسٹ بکس ۴۲۵۶ کراچی

۲۶۵ راشد سلیم صاحب معرفت دفتر ماہنامہ مقام صحابہ [illegible]

۲۶۶ محمد علی صاحب ۔ پوسٹ اکاؤنٹس ۔ سی پی آر ۔ چٹاگانگ [illegible]

۲۶۷ محمد علی صاحب ۔ پوسٹ اکاؤنٹس سی آر پی چٹاگانگ

۲۶۸ ریحانہ صاحبہ ۔ ۴/۳۸۲ کوارٹر ۔ لالوکھیت ۔ کراچی

۲۶۹ کاپل عبداللطیف صاحب ۵۶۷۰۴/ ۸۸۲ وائرلیس [illegible]
پی اے ۔ ایف ۔ کورنگی کریک کراچی ۔

۲۷۰ کاپل عبداللطیف صاحب ۵۶۷۰۴/ ۸۸۲ وائرلیس [illegible] پی اے
ایف ۔ کورنگی کریک کراچی ۔

۲۷۱ عزیز الرحمان صاحب معرفت نور حسین صاحب بلاک نمبر [illegible]
کورنگی کریک کراچی ۔

۲۷۲ جناب سکینہ بی بی صاحبہ بلاک نمبر [illegible] ۔ کورنگی کریک کراچی

۲۷۳ ایم عبدالجبار صاحب ۵/۶۴۴ ۔ لالوکھیت کراچی ۔

۲۷۴ چوہدری محمد حسین صاحب نمبر ۲۰۔ آغا بلڈنگ ۔ [illegible] کراچی

۲۷۵ حسن اختر عزیز صاحب معرفت مرزا عبدالعزیز صاحب چیف آفیسر [illegible]
پی این ایس جہلم معرفت فلیٹ میل آفس ۔ کراچی ۔

۲۷۶ اقبال بیگم صاحبہ معرفت مرزا عبدالعزیز چیف آفیسر نمبر [illegible] پی این
ایس جہلم معرفت فلیٹ میل آفس ۔ کراچی ۔

۲۷۷ محمد سعید صاحب معرفت مرزا عبدالعزیز صاحب چیف آفیسر [illegible]
پی این ایس جہلم معرفت فلیٹ میل آفس ۔ کراچی ۔

۲۷۸ مرزا عبدالعزیز صاحب چیف آفیسر نمبر ۳۶۰۰۷ پی این ایس جہلم
معرفت فلیٹ میل آفس ۔ کراچی ۔

۲۷۹ امیر عالم خان صاحب معرفت سید محمود اینڈ کمپنی [illegible]
[illegible] روڈ کراچی ۔

۲۸۰ محمد یوسف [illegible] صاحب اسسٹنٹ [illegible] کورنگی کریک کراچی

۲۸۱ [illegible] صاحبہ معرفت عبدالقدیر صاحب [illegible] کاؤنٹ [illegible]
لمیٹڈ ۔ [illegible] سٹریٹ ۔ رتن تلاؤ کراچی ۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۲۸۲	حمیدہ صاحبہ معرفت محمد رفیق حبشی صاحب ۵۸۲۳۸/PAK کوارٹر نمبر ۴/۶۲۹۔ پاکستان ایئر فورس۔ کورنگی کریک کراچی۔
۲۸۳	عبدالرحمان خانصاحب محمد جلیل خان۔ پلاٹ نمبر ۱۴ شمال کوٹھی پیر الٰہی بخش صاحب۔
۲۸۴	محمد عبدالحمید صاحب، اشاعت القرآن، سیکنڈری سکول ناظم آباد کراچی
۲۸۵	عبدالرحمان جنرل مرچنٹ۔ کوارٹر نمبر ۲۶۵ بلاک نمبر ۵۔ ڈرگ روڈ کالونی
۲۸۶	محمد عبدالصادق صاحب آفس سکریٹری جماعت اسلامی رانی بازار پوسٹ گھوڑا مارا۔ راجشاہی (م۔پ)
۲۸۷	عبدالستار صاحب دکاندار۔ فرانیٹر شوگر مل۔ تخت بھائی۔ ضلع مردان
۲۸۸	جناب عبدالحفیظ صاحب ہاشمی۔ ویلکم ہوٹل۔ چوک بازار، بہاولپور
۲۸۹	مجاہد شمس الرحمن صاحب مکان نمبر ۱۲۰۶ وارڈ نمبر ۸ محلہ درکھاناں والہ براسنگ اندرون۔ بوہڑ گیٹ ملتان شہر
۲۹۰	محمودہ خاتون ۳/۴۹۵ محلہ پیر رمضان غازی جوڑی سرائے ملتان شہر
۲۹۱	ظفر علی خانصاحب مکان نمبر ۲۰۶ وارڈ نمبر ۱۶ اندرون پاک گیٹ ملتان
۲۹۲	محمد صدیق صاحب مکتبہ تعمیر ملت چوک بازار ملتان شہر۔
۲۹۳	رشید احمد صاحب مکہ سلطان ڈاکخانہ سلطان تحصیل ضلع جہلم
۲۹۴	منشی عمرالدین صاحب معرفت سعید ہونڈری بھوانہ بازار لائلپور
۲۹۵	میاں محمد صاحب ادارہ ترویج اسلام اتحاد مارکیٹ خوشاب ضلع سرگودھا
۲۹۶	محمد صدیق صاحب قاضی محلہ مٹیاری ضلع حیدرآباد
۲۹۷	سید نور احمد علی صاحب سرلوال کاٹن فیکٹری۔ ماتلی۔ ضلع حیدرآباد
۲۹۸	برکت علی خانصاحب وائس پریذیڈنٹ میونسپل بورڈ ماتلی حیدرآباد
۲۹۹	فضل الرحمٰن صاحب رومی ۲/۲/۱۱ لیاری آباد گولیمار۔ کراچی
۳۰۰	عبدالرحیم صاحب میران پیر روڈ۔ لیاری کوارٹر۔ کراچی
۳۰۱	محمد صاحب معرفت مدینہ ہوٹل موسیٰ لین۔ لیاری کوارٹر کراچی
۳۰۲	محمد داؤد صاحب اوقی ۲/۱۰۸ گاڈ گلی میٹھادر کراچی
۳۰۳	سعدی خاں صاحب میران پیر روڈ لیاری کوارٹر کراچی
۳۰۴	احمد خاں صاحب K/۳/۴۶ بچر روڈ موسیٰ لین لیاری کوارٹر کراچی
۳۰۵	محمد سلیم صاحب ہائی وڈ ٹیلرنگ ہاؤس۔ البرٹ روڈ موچی گلی صدر کراچی
۳۰۶	محمد منذیر صاحب ہائی وڈ ٹیلرنگ ہاؤس۔ البرٹ روڈ موچی گلی صدر کراچی
۳۰۷	احمد علی صاحب پاک نمبر ۳۲ / ۵۹۱ وائرلیس انجینئرنگ پی سی۔ ایف کورنگی کراچی

رول نمبر	نام اور پتہ
۳۰۸	احمد علی صاحب پاک نمبر ۱۳۲ / ۵۹۱ وائرلیس انجینئرنگ پی سی۔ ایف کورنگی کراچی
۳۰۹	عبدالرسول صاحب کاپل پاک نمبر ۳۰۹۷۵ پی سی۔ ایف کورنگی کراچی
۳۱۰	آصف تنویر معرفت عبدالرسول صاحب پاک نمبر ۳۰۹۷۵ پی اے ایف کراچی
۳۱۱	راجہ عزیز احمد کیانی کاپل انجینئرنگ پاکستانی فضائیہ کورنگی کراچی
۳۱۲	گل بہار شاہ پاک نمبر ۸۵۹۴ انسٹرومنٹ ری پیر پی اے ایف کورنگی کریک کراچی۔
۳۱۳	سید محمد ساجد الرحمان صاحب رانی بازار ڈاکخانہ گھوڑا مارا ضلع راجشاہی
۳۱۴	وارث علی صاحب سپر مل کالونی پوسٹ گھوڑا مارا راجشاہی۔ م۔پ
۳۱۵	صادق حسین صاحب ۱۸۸۹ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی
۳۱۶	عبدالرشید صاحب ارشد اسلامی مدرسہ محمد پورہ لائلپور
۳۱۷	محمد ابراہیم صاحب معرفت الٰہی بخش اینڈ سنز شاہی بازار سکھر
۳۱۸	قاضی محمد عمر صاحب ایمن خار ماسٹیکلز لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر
۳۱۹	وصی اللہ صاحب معرفت ایمن خار ماسٹیکلز لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر
۳۲۰	فاطمہ بیگم معرفت حاجی مصنف خاں مکان نمبر D/۹۳۴ سکھر
۳۲۱	شیر محمد صاحب معرفت اسلامی کتب خانہ سکھر
۳۲۲	عبدالمتین صاحب معرفت ایمن فار ماسٹیکلز لمیٹڈ ۱۳۰۸ اے شور آئی لین پرانا سکھر۔ سکھر۔
۳۲۳	شیخ خورشید انور صاحب ایمن خار ماسٹیکلز لمیٹڈ پوسٹ بکس ۶۴ سکھر
۳۲۴	فضل الرحمن صاحب غریب آباد چوک بیری والا متصل جامع مسجد روڈ مکان نمبر ۹۹ سکھر۔
۳۲۵	محمد ایوب صاحب غریب آباد چوک بیری والا متصل جامع مسجد روڈ مکان نمبر ۹۹ سکھر
۳۲۶	محمد شریف خانصاحب معرفت ایمن فارماسٹیکلز لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر
۳۲۷	حمیدہ نسرین صاحبہ معرفت محمد شریف خاں مکان نمبر D/۹۳۴ غریب آباد سکھر۔
۳۲۸	عبدالقادر صاحب اسلامی کتب خانہ نیم کی چاڑی سکھر
۳۲۹	محمد رفیق صاحب معرفت اسلامی کتب خانہ سکھر
۳۳۰	بشیر علی صاحب معرفت پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر
۳۳۱	منی معرفت بشیر علی صاحب پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر

رول نمبر	نام اور پتہ
۳۳۲	حاجی محمد ہاشم صاحب داروغہ ایریگیشن کنال ٹنڈو آدم سب ڈویژن
۳۳۳	عائشہ بنت محمد اسلام صاحب دکان نمبر ۷، فون نمبر ۴۲۶ شاہی بازار ٹنڈو آدم۔
۳۳۴	ضیاء الحق صاحب صدیقی کمیشن ایجنٹ اینڈ آرڈر سپلائرز شاہی بازار
۳۳۵	مرزا خداداد خان صاحب عقب ٹیلرنگ ہاؤس چکوال ضلع جہلم
۳۳۶	سرداربانو صاحبہ معرفت عقب ٹیلرنگ ہاؤس چکوال ضلع جہلم
۳۳۷	شمیم جاوید صاحب ۲۸۱/۴ مارٹن روڈ کراچی نمبر ۵
۳۳۸	محمد صادق صاحب جگہ نہر جہانیاں تحصیل خانیوال ضلع ملتان
۳۳۹	مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب دواخانہ سلیمانی جہانیاں ضلع ملتان
۳۴۰	محمد سعید خلف مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب دواخانہ سلیمانی جہانیاں ملتان
۳۴۱	حکیم عبدالحمید صاحب سلیمانی مطب دواخانہ سلیمانی جہانیاں ملتان
۳۴۲	مولوی محمد عثمان صاحب معرفت دواخانہ سلیمانی جہانیاں تحصیل خانیوال ضلع ملتان
۳۴۳	عبدالغنی صاحب معرفت مولوی محمد عثمان صاحب دواخانہ سلیمانی جہانیاں تحصیل خانیوال ضلع ملتان۔
۳۴۴	خالد رشید صاحب معرفت حکیم محمد عبداللہ صاحب دواخانہ سلیمانیہ جہانیہ تحصیل خانیوال ضلع ملتان
۳۴۵	میاں علی محمد صاحب معرفت دواخانہ سلیمانی جہانیاں ضلع ملتان
۳۴۶	امام الدین صاحب دواساز معرفت دواخانہ سلیمانی جہانیاں ضلع ملتان
۳۴۷	محمد حنیف صاحب معرفت دواخانہ سلیمانی جہانیاں ضلع ملتان
۳۴۸	مولوی محمود صاحب پرشین ٹیچر این۔ اے۔ سی۔ ہائی اسکول تحصیل خانیوال ضلع ملتان
۳۴۹	مولوی عبدالکریم صاحب عربک ٹیچر این۔ اے۔ سی۔ ہائی اسکول جہانیاں تحصیل خانیوال ضلع ملتان
۳۵۰	ہدایت اللہ صاحب سلیمانی معرفت ہدایت اللہ عبدالغنی پنساریاں صدر بازار جہانیاں تحصیل خانیوال
۳۵۱	عبدالواحد صاحب رحمان واچ ہاؤس صدر بازار جہانیاں
۳۵۲	عبدالغنی صاحب معرفت عبدالغنی پنساریاں صدر بازار جہانیاں تحصیل خانیوال ضلع ملتان۔
۳۵۳	عبدالغنی صاحب معرفت دواخانہ سلیمانیہ جہانیاں تحصیل خانیوال ضلع ملتان
۳۵۴	میاں محمد خان صاحب مسجد عزیز نواز سی ایریا لالوکھیت کراچی
۳۵۵	احمد علی صاحب مکان نمبر L/۸ متصل ڈاکخانہ سی ایریا لالوکھیت
۳۵۶	اقبال بیگم صاحبہ معرفت سید رضا عباس صاحب مکان نمبر سی وی، ۱۵۲ اسٹی گلی، حیدرآباد سندھ
۳۵۷	شفیق احمد صاحب۔ ری گیشن ڈاکس۔ کیماڑی کراچی۔
۳۵۸	سید اقبال احمد صاحب معرفت ڈی لکس پرنٹنگ رتن تالاب کراچی
۳۵۹	انور حسن خان صاحب ہیڈ سٹیٹ بینک پاکستان بولٹن مارکیٹ پوسٹ بکس نمبر ۴۴۵ سی۔ اے ڈیپارٹمنٹ کراچی۔
۳۶۰	قمر النساء بیگم ۲/۶۰۲/۸ لالوکھیت کراچی
۳۶۱	قاضی صلاح الدین صاحب معرفت شمس الدین صاحب ڈی لکس پرنٹنگ پریس کراچی
۳۶۲	محمد اسحٰق صاحب ہیڈ سٹیٹ بینک آف پاکستان سنٹرل ڈائرکٹریٹ پوسٹ بکس نمبر ۴۶۲ کراچی
۳۶۳	محمد قاسم سعید ۲/۸۷ اے نزد ہرنگ سینما لالوکھیت کراچی۔
۳۶۴	سید ندیم اللہ حسینی صاحب معرفت "الوقت" واچ حسینی ٹریڈرز فریر اسٹریٹ۔ ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی۔
۳۶۵	امتیاز خاتون صاحبہ رام سنگھ، کندن سنگھ دھرم شالہ دفتر جماعت اسلامی ملیر سٹی کراچی۔
۳۶۶	عبدالمجید صاحب رام سنگھ، کندن سنگھ دھرم شالہ دفتر جماعت اسلامی ملیر سٹی کراچی۔
۳۶۷	کنیز فاطمہ صاحبہ رام سنگھ، کندن سنگھ دھرم شالہ دفتر جماعت اسلامی ملیر سٹی کراچی
۳۶۸	محمد محمود عالم صاحب دکان نمبر ۱۳، شہاب الدین مارکیٹ کراچی
۳۶۹	محمد ابراہیم صاحب مکان نمبر ۲/اے خداداد کالونی کراچی
۳۷۰	مستری تاج محمد صاحب معرفت محمد ابراہیم اینڈ کمپنی لمیٹڈ [illegible] صدر کراچی۔
۳۷۱	محمد قاسم صاحب معرفت دفتر جماعت اسلامی ملیر سٹی کراچی
۳۷۲	محمد حسین صاحب قریشی "الوقت" واچ حسینی ٹریڈرز ایمپریس مارکیٹ کراچی

رول نمبر	نام اور پتہ
۳۷۳	حکیم قاضی حفیظ عالم صاحب الفاکو میڈیکل ہال اسٹیشن روڈ سکھر
۳۷۴	ظہور الحق صدیقی صاحب فائن سائیکل سٹور فریر روڈ سکھر
۳۷۵	محمد محسن صاحب معرفت ایس ایم وحید اینڈ سنز نیم کی چاڑی سکھر
۳۷۶	اکرام اللہ صاحب قریشی روڈ پرانا سکھر
۳۷۷	منظہر اللہ صاحب ٹوپی میکر سکھر
۳۷۸	نور احمد صاحب اقبال کلاتھ پرنٹنگ ورکس شاپ ۴۵۲/B نزد جناح چوک سکھر
۳۷۹	آفتاب احمد صاحب معرفت حافظا دوست محمد اینڈ سنز فریر روڈ سکھر۔
۳۸۰	افروز خاور معرفت ظہور احمد خانصاحب ۲/۶۶ بہار کالونی، مسان روڈ کراچی۔
۳۸۱	مرجان بیگم معرفت شریف الدین گرام مرچنٹ ڈھک روڈ سکھر
۳۸۲	محمد عطا خاں شیروانی معرفت سن رائز پریڈ ورکس۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۴ سکھر
۳۸۳	محمد رفیق صاحب معرفت عبد الحمید خاں کباڑی بازار، میانی روڈ سکھر۔
۳۸۴	محمد ابراہیم محمد اسمعیل صاحبان دری مرچنٹس شاہی بازار سکھر
۳۸۵	محمد ایوب صاحب کلاتھ مرچنٹ وکٹوریہ مارکیٹ سکھر
۳۸۶	عبد اللطیف صاحب چوڑی بازار بھوانگی مکان نمبر ۶۸۵/B سکھر
۳۸۷	رفیع احمد خاں لودھی ۱۱۶۳/ بے بھاٹیا گلی پرانا سکھر
۳۸۸	سراج احمد خانصاحب معرفت پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر
۳۸۹	جمیل احمد صاحب ارحمن بلڈنگ روم ۱۰ گراؤنڈ فلور مدین روڈ رنچھوڑ لائن کراچی۔
۳۹۰	ڈاکٹر غلام رسول صاحب، جھول، ضلع سانگھڑ۔
۳۹۱	حنیفہ بیگم زوجہ فخر الدین معرفت شیخ فخر الدین پاک جنرل سٹور کوٹ مومن
۳۹۲	میاں رکن الدین نمبردار بمقام وڈاکخانہ للیانی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔
۳۹۳	راجہ محمد ممتاز معرفت راجہ غضنفر علی بمقام وڈاکخانہ چک نمبر ۶۲ جنوبی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔
۳۹۴	محمد اشرف بیگ صاحب معرفت حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ کراچی
۳۹۵	حافظ محمد عبد الکریم صاحب۔ حال ساکن سپاہی پاڑہ پوسٹ راجشاہی
۳۹۶	خوندکار محمد ابراہیم صاحب محلہ رلجاپاتا۔ ضلع راجشاہی
۳۹۷	محمد عبد المنان صاحب معرفت ایم اے صادق آفس سکریٹری جماعت اسلامی راجشاہی۔
۳۹۸	مسٹر سلطان صاحب میرا پاڑا راجشاہی پوسٹ آفس بوئیا ضلع، راجشاہی مشرقی پاکستان
۳۹۹	ڈاکٹر محمد اقبال غیور صاحب ۱۴۱/۲/۵ پی۔ ای۔ سی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹
۴۰۰	عبد الرؤف حبیب ای۔ این۔ ٹی۔ ڈیپارٹمنٹ سول ہاسپٹل کراچی
۴۰۱	قاضی عبد السلام صاحب مقام وڈاکخانہ مان کرائے ہری پور ہزارہ
۴۰۲	چوہدری عبد المجید صاحب کلارک ٹیلیکم ٹریننگ کالج ہری پور
۴۰۳	ایم۔ عبد الغفور صاحب ٹرینی ٹیلیکم ٹریننگ کالج ہری پور
۴۰۴	اسلام الحق صاحب اسلامی کتب خانہ نیم کی چاڑی سکھر
۴۰۵	اصغر حسین خانصاحب ۵/۸۶۵ حبیبیہ آغا خاں کالونی ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔
۴۰۶	اختر حسین خانصاحب ۵/۸۶۵ حبیبیہ آغا خاں کالونی، ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی
۴۰۷	صالحہ بیگم صاحبہ ۵/۸۶۵ حبیبیہ آغا خاں کالونی، ڈرگ روڈ، مہاجر کالونی کراچی
۴۰۸	منظر حسین خانصاحب ۲۷۸ جہانگیر اسٹیٹ کوارٹر کراچی
۴۰۹	حمیدہ خاتون صاحبہ معرفت منظر حسین صاحب ۲۷۸ جہانگیر اسٹیٹ کوارٹر کراچی
۴۱۰	محمد فاروق صاحب سبحانی ۶/اے کاسموپالیٹن کالونی کملا نہرو روڈ کراچی
۴۱۱	شیخ محمد عزیز الدین صاحب ۸/۷ حاجیکب لائن نزد اللہ والی مسجد کراچی
۴۱۲	سید ذوالنون علی احمد صاحب معرفت رضوی برادرس لمیٹڈ، چارٹرڈ بنک چیمبرز، میکلوڈ روڈ کراچی
۴۱۳	فاطمہ نوری صاحبہ معرفت شبیر الحسن آر۔ بی۔ انڈسٹریز لمیٹڈ، چارٹرڈ بنک چیمبرز میکلوڈ روڈ کراچی

نمبر	نام اور پتہ
۴۱	محمد ارشاد خاں صاحب کوارٹر نمبر ۲۲۶ گلی نمبر ۱۰ ہر چند رائے روڈ گاندھی نگر کراچی
۴۱	محمد شریف صاحب نزد گورنمنٹ گرلز ہائی سکول خوشاب ضلع سرگودھا
۴۱	غلام سرور صاحب فلیٹ نمبر ۴ آدمجی عبد العلی بلڈنگ طیب جی روڈ سرائے کوارٹر کراچی
۴۱	مصطفی خانم صاحبہ معرفت غلام سرور فلیٹ نمبر ۴ آدمجی عبد العلی بلڈنگ طیب جی روڈ سرائے کوارٹر کراچی۔
۴۱	گوہر علی شاہ گیلانی صاحب ۱۰۹ ماڈل کالونی کراچی نمبر ۲۷
۴۱	محمد ہاشم صاحب دفتر ایڈیشنل کسٹوڈین جائداد متروکہ کراچی
۴۱	سید منصور علی ہاشمی ۶/۲۴ ناظم آباد کوارٹرز کراچی
۴۱	عبدالباری صاحب ۲۷۸ جہانگیر روڈ ویسٹ کوارٹرز کراچی
۴۱	نور محمد صاحب ۲۷۸ جہانگیر روڈ ویسٹ کوارٹرز کراچی
۴۲	غلام احمد صاحب صدیقی پی۔ ایس۔ بی کوارٹر نمبر ۳ سے لٹن روڈ کوئٹہ
۴۲	عبدالحمید صاحب سندھ سوڈا واٹر فیکٹری شارع مسجد کوئٹہ
۴۲	کنیز فاطمہ صاحبہ معرفت منظر حسین ۲۷۸ جہانگیر ویسٹ کراچی
۴۲	نور شہید حسین صاحب معرفت منظر حسین ۲۷۸ جہانگیر ویسٹ کراچی
۴۲	سید علی اسد اللہ صاحب گیلانی ۲۴ گوردھن بھون نمبر ۴ لیعقوب خاں روڈ کراچی۔
۴۲	اسعدی بیگم صاحبہ ۲۴ گوردھن بھون نمبر ۴ لیعقوب خاں روڈ کراچی
۴۲	ابو الکلام صاحب ۳۹/E قلعہ حیدر آباد
۴۲	پرویز اختر ولد چوہدری محمد حسین مسلم جنرل سٹور شاہی بازار منڈی دادا ہم
۴۲	محمد اسلم صاحب فلیٹ نمبر ۴ آدمجی عبد العلی بلڈنگ طیب جی روڈ سرائے کوارٹر کراچی۔
۴۲	عبدالقدیر صاحب ۸ جہانگلا بلڈنگ۔ یوسف علی علی بھائی رام سوامی کراچی۔
۴۲	محمد صدیق صاحب مکتبہ اسلامی آؤٹ رام روڈ پاکستان چوک کراچی
۴۲	ذکیہ خاتون صاحبہ کوارٹر نمبر ۱۶۶/F پرانا لالوکھیت کراچی
۴۲	سید امیر شاہ صاحب مکان نمبر ۷/۴۳ نزد ایڈوانی بلڈنگ پٹیل پاڑہ کراچی
۴۲	فضل حسن عثمانی صاحب معرفت شبیر حسن عثمانی ۱۶۶/۲ جہانگیر کوارٹر جہانگیر روڈ کراچی۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۴۳۷	سید عبدالملک صاحب معرفت غلام جیلانی خاں صاحب ۲/۱۵۲ لالوکھیت عقب فردوس سینما۔ کراچی
۴۳۸	محمد حسین صاحب، چارپائی فروش جمشید روڈ نمبر ۲ نزد چونگی روبرو کود نور ہوزری کراچی
۴۳۹	نور محمد صاحب طالبعلم ٹریننگ کالج پوسٹ کیمپ ۵۳۔L ہری پور ہزارہ۔
۴۴۰	حکیم محمد عبدالحق لودھی دواخانہ الکوثر ایبٹ آباد
۴۴۱	محمد شفیع صاحب طالبعلم ٹریننگ کالج ہری پور ہزارہ
۴۴۲	سیدہ بیگم صاحبہ معرفت عتیق الرحمن دارالمطالعہ جماعت اسلامی ہری پور ہزارہ۔
۴۴۳	عتیق الرحمن صدیقی صاحب دارالمطالعہ جماعت اسلامی ہری پور ہزارہ
۴۴۴	حکیم محمد شریف صاحب طالبعلم ٹریننگ کالج پوسٹ کیمپ ۵۴۔L ہری پور ہزارہ۔
۴۴۵	چوہدری محمد فاضل صاحب معرفت سی آئی ڈی ای چکلالہ
۴۴۶	چوہدری محمد فاضل صاحب معرفت سی آئی ڈی ای چکلالہ
۴۴۷	حبیب اللہ صاحب دکان نمبر ۲ جامع مسجد ٹنڈو آدم
۴۴۸	حبیب اللہ صاحب دکان نمبر ۲ جامع مسجد ٹنڈو آدم
۴۴۹	ڈاکٹر شہزادہ خاں معرفت حاجی غلام حسین مالک مدینہ ہوٹل دیوہ چین، رتن چند روڈ۔ موسیٰ لین کراچی
۴۵۰	عالم خاں نیازی صاحب معرفت مدینہ ہوٹل موسیٰ لین نمبر ۲ کراچی
۴۵۱	سلیم صاحب سلیم اسٹیشنری مارٹ، ولی محمد حسن علی روڈ۔ جاکیواڑہ کراچی
۴۵۲	شوکت علی صاحب صدیقی ۱/۶ برساتی شیڈ۔ گولیمار۔ کراچی
۴۵۳	سید اللہ صاحب ۲/۱ رام نواس بلڈنگ مقابل جوبلی سینما کراچی
۴۵۴	محمد اعظم صاحب بی۔ اے۔ ایف۔ کوارٹر نمبر ۸/۱۳۰ ڈرگ روڈ کراچی
۴۵۵	چوہدری امام الدین صاحب کوارٹر نمبر ۱۴/۱۸۹ پی اے ایف ڈرگ روڈ کراچی
۴۵۶	خالد حسین صاحب نزمین مین ا۔ بلاک نمبر ۱۲ روم نمبر ۱ پی اے ایف اسٹیشن ڈرگ روڈ کراچی۔
۴۵۷	محمد نظیم صاحب کوارٹر نمبر ۸/۱۳۰ پی اے۔ ایف۔ ڈرگ روڈ کراچی
۴۵۸	عبدالغفور صاحب پی اے ایف۔ ہری پور۔ آر۔ اینڈ سیکشن

رول نمبر	نام اور پتہ
۴۵۹	نور محمد صاحب۔ کوارٹر نمبر ۲/۱۱۹ پی۔ اے۔ ایف ڈرگ روڈ کراچی
۴۶۰	حفیظ الرحمان جون۔ کوارٹر نمبر ۵/۵ پی۔ اے۔ ایف ڈرگ روڈ کراچی
۴۶۱	امان اللہ خان۔ ایئر فورس اسٹیشن۔ ڈرگ روڈ۔ مین گارڈ روم کراچی
۴۶۲	امان اللہ خان۔ ایئر فورس اسٹیشن ڈرگ روڈ کراچی مین گارڈ روم کراچی
۴۶۳	خالد اقبال صاحب ۲۱ پاک مینشن۔ فریرروڈ کراچی۔
۴۶۴	محمود فاروقی صاحب۔ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میونسپل کارپوریشن کراچی
۴۶۵	بیگم پیدین ۲/۱۱ کیو۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی
۴۶۶	اسلم ظہیر صاحب ۲/۱۴۱ کیو۔ پی۔ ای سی ایچ سوسائٹی۔ کراچی
۴۶۷	مسز اقبال فنا ہین معرفت مظفر رضا صاحب ۲/۱۴۱ پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی
۴۶۸	قاضی حمید الحسن صاحب، نیوز سیکشن، ریڈیو پاکستان بندر روڈ کراچی
۴۶۹	طفیل احمد صاحب علوی بلاک نمبر ۴۔ سب بلاک ڈی، روڈ نمبر ۷ پلاٹ نمبر ۱۴۔ ناظم آباد کراچی۔
۴۷۰	خلیل احمد صاحب ۲۷/۱۶ ٹیمپر بیرکس۔ کراچی
۴۷۱	اشفاق حسین خان صاحب ۵/۱۲۰ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی
۴۷۲	حمد النساء صاحبہ ۵/۱۲۰ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔
۴۷۳	قمر النساء صاحبہ ۵/۱۲۰ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔
۴۷۴	عائشہ بیگم صاحبہ ۵/۱۶۹۶ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی
۴۷۵	سید محمد منظور صاحب ۵/۱ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی
۴۷۶	فضل یوسف فاروقی صاحب معرفت اجمل یوسف فاروقی صاحب کوارٹر نمبر ۴/۱۲۶ بلاک نمبر ۵ ڈرگ روڈ کالونی کراچی
۴۷۷	اجمل یوسف فاروقی صاحب کوارٹر نمبر ۴/۱۲۶ بلاک نمبر ۵ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی
۴۷۸	شیخ آفتاب احمد صاحب بی ۸۰۰ المونیم کوارٹرز گورا قبرستان کراچی
۴۷۹	قاسم علی صاحب ۵/۲۶۰ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی بریلی کالونی کراچی
۴۸۰	عبد الرشید صاحب ۵/۸۶۶ ام حبیبہ آغا خاں کالونی ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔
۴۸۱	مجتبیٰ حمید اللہ صاحب معرفت رضوی برادر ترلسٹڈ چارٹرڈ بنک چیمبرز میکلوڈ روڈ کراچی۔
۴۸۲	نثار احمد صاحب مکتبہ اسلامی آؤٹ رام روڈ پاکستان چوک کراچی
۴۸۳	خورشید محمود فاروقی، ۴ آتم نواس بلڈنگ۔ گارڈن ویسٹ۔ کراچی

رول نمبر	نام اور پتہ
۴۸۴	شہزاد الحسن چشتی۔ فلیٹ نمبر ۱۱۔ ناگوری بلڈنگ آؤٹ رام روڈ کراچی
۴۸۵	نور صفی صاحب ۲۹۵/۳ مارٹن روڈ کوارٹرز کراچی
۴۸۶	محمد احترام الدین ۲/۱۳ اے III ناظم آباد کراچی
۴۸۷	محمد کامل صاحب ۴۲۸ گارڈن ایسٹ نزد لسبیلہ ہاؤس کراچی
۴۸۸	ایس اے۔ لطیف صاحب ۴۲۸ گارڈن ایسٹ نزد لسبیلہ ہاؤس کراچی
۴۸۹	عبد المعبود صاحب ۸/۲۷ جہانگیر روڈ کراچی
۴۹۰	محمد حنیف صاحب ۱/۲۶۸ مارٹن روڈ۔ کراچی
۴۹۱	محمد اصغر صاحب ۵/۶۹ کلیٹن کوارٹرز کراچی
۴۹۲	اے۔ بی۔ ایم۔ محی الدین صاحب۔ حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ بجولی۔ اسٹال کراچی
۴۹۳	عفت سیمین۔ کوارٹر ۲ بلاک ۲۸۰۔ مارٹن روڈ کراچی۔
۴۹۴	احمد فرقان محسن صاحب۔ کوارٹر ۲ بلاک ۲۸۰۔ مارٹن روڈ کراچی
۴۹۵	احمد نسیم صاحب ۴/۲۸۱ مارٹن کوارٹرز کراچی
۴۹۶	جمیل الرحمن صاحب نمبر ۲ اسماعیل منزل اے ایم نمبر ۵۸ فریر روڈ کراچی
۴۹۷	رشیدہ خاتون صاحبہ ۱۰۵ پیر کالونی کراچی
۴۹۸	شاہدہ سلطانہ صاحبہ ۱۰۵ پیر کالونی کراچی
۴۹۹	جناب خلیل احمد صاحب ۱۰۵ پیر کالونی کراچی
۵۰۰	سلطان احمد صاحب ۱۰۵ پیر کالونی کراچی

ایک ضروری اعلان

بادقار تنظیم کی ایک کچی رسید بک جس کا نمبر 601 - 700 ہے کسی حادثہ کی وجہ سے کراچی میں گم ہو گئی ہے۔ کسی صاحب کو، اس رسید بک پر بادقار تنظیم کے سلسلے میں اقساط وغیرہ وصول کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی صاحب مذکورہ بالا رسید بک پر کسی شخص کو بادقار تنظیم کے سلسلے میں کوئی روپیہ ادا کریں گے تو وہ خود اس کے ذمہ دار ہوں گے۔

منیجر / بادقار کمپنی لمیٹڈ کراچی

باوقار تنظیم کے کمیشن ایجنٹس

مختلف مقامات پر مندرجہ ذیل حضرات باوقار تعلیم کے منظور شدہ کمیشن ایجنٹ ہیں۔ ان مقامات کے لوگوں کو ان کی معرفت ممبر بننے میں سہولت رہے گی۔

۱ جناب عبدالستار صاحب میران پیر روڈ کراچی ۲

۲ جناب عابد سعید صاحب ۸۷/۲ ۔ اے نزد نیرنگ سینما لالوکھیت کراچی ۱۹

۳ مولوی محمد امین صاحب کھوکھر پلاٹ ۳۸/۱ سی ایریا متصل مسجد غریب نواز لالوکھیت ڈاکخانہ کراچی ۱۹

۴ جناب پی۔ ڈی مصطفٰے صاحب معرفت آئی۔ سی۔ آئی ویسٹ وہارف کراچی۔

۵ جناب محمد جلیل خانصاحب پلاٹ ۲ الشمال کوٹھی پیر صاحب پیر الٰہی بخش کالونی کراچی۔

۶ جناب ابوالخطیب صاحب بی ۸۵ بلاک محمود آباد کراچی ۲

۷ جناب محمد زاہد حسین صاحب صدیقی ۲۵۰ آگرہ تاج کالونی کراچی

۸ جناب جمیل احمد صاحب فاروقی نزد عثمانیہ مسجد بادٹ گوٹ ملیر شہر کراچی

۹ جناب عبدالغفور صاحب بھٹی اکاؤنٹنٹ زینت برادرز رتن تلاؤ، کراچی

۱۰ جناب محمد یونس صاحب تلسی اسٹریٹ کراچی ۲

۱۱ جناب محمد حسین صاحب قریشی۔ الوقت واچ حسینی ٹریڈرز ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی

۱۲ جناب اصغر حسین خانصاحب ۸۶۵/۱۵ ام حبیبیہ آغا خان کالونی ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی ۲۷

۱۳ جناب شوکت علی صاحب صدیقی ۶/۱ برساتی شیڈ گولیمار کراچی

۱۴ جناب نور محمد صاحب کوارٹر نمبر ۲/۱۹ بی ۔ اے۔ ایف ڈرگ روڈ کراچی ۸

۱۵ جناب سید ندیم اللہ حسینی صاحب ۔ حسینی ٹریڈرز فریر اسٹریٹ ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی۔

۱۶ جناب امیر احمد صاحب محلہ خلد آباد معرفت دفتر جماعت اسلامی لانڈھی کراچی

۱۷ جناب محی الدین صاحب ایوبی، ڈرگ روڈ کالونی کراچی ۲۷

۱۸ جناب افضال احمد خانصاحب معرفت سید علی احمد صاحب ۵۵۸/۱ ڈرگ روڈ کالونی کراچی ۲۷

۱۹ جناب سید مسعود حسین صاحب، مکتبہ فکر اسلامی لس بیلہ ہاؤس، بس اسٹاپ، کراچی نمبر ۵

۲۰ جناب محمد سلیم صاحب، سلیم اسٹیشنری مارٹ، چاکیواڑہ ملی محمد حسن علی روڈ۔ کراچی۔

۲۱ جناب صاحب زادہ عبدالرحمٰن صاحب۔ معرفت شاہین بک ڈپو ساؤتھ سرکلر روڈ۔ پشاور صدر

۲۲ جناب خواجہ منظور الحسن صاحب، کلاتھ مرچنٹ، ٹنڈو آدم

۲۳ جناب عبدالستار صاحب، گرین مرچنٹ نزد ریلوے کراسنگ۔ ٹنڈو آدم

۲۴ جناب حکیم محمد شریف صاحب، ٹیلیکم ٹریننگ کالج ہری پور، ہزارہ

۲۵ جمیل احمد صاحب۔ ارجن بلڈنگ۔ گراؤنڈ فلور نمبر ۲ رتن تالاب۔ کراچی

۲۶ جناب حافظ محمد حیات صاحب، شاہی بازار ماتلی ضلع حیدرآباد۔

۲۷ جناب ضیاء الحق صدیقی۔ ضیا کٹلری کمپنی شاہی بازار سکھر

۲۸ جناب احمد نور صاحب، فیملی لائن، جیکب آباد۔

۲۹ جناب محمد منشا صاحب، نیوز ایجنٹ، رحیم یار خاں

۳۰ جناب راجہ غضنفر علی صاحب، چک نمبر ۶۶ جنوبی تحصیل بھلوال، ضلع سرگودھا

۳۱ جناب ڈاکٹر غلام رسول اکرم صاحب مقام و ڈاکخانہ جھول ضلع سانگھڑ

۳۲ جناب محمد انور صاحب علوی ۸۵۲ بزاز محلہ
صدر بازار۔ لاہور چھاؤنی

۳۳ جناب محمد عبدالصادق صاحب، رانی بازار
ڈاک خانہ گھوڑا مارا، راجشاہی (م۔ پ)

۳۴ جناب اسلام الحق صاحب، اسلامی کتب خانہ
نیم کی چاڑی سکھر

۳۵ جناب بشیر احمد صاحب، مکتبہ تعمیر ملت، چوک بازار
ملتان شہر۔

۳۶ جناب محمد عبداللہ صاحب علوی، ناظم مکتبہ علویہ تلہ گنگ
ضلع کیمبل پور

۳۷ جناب محمد نواز صاحب سائل۔ معرفت میاں محمد عنایت سیال
نواں شہر، کبیر والا۔ ضلع ملتان

۳۸ جناب اعجاز حسین صاحب، مکان نمبر ۲، شاہ عالم اسٹریٹ
وسنت پورہ، لاہور

۳۹ جناب سید طالب حسین صاحب ترمذی، کینال کالونی
بہاولپور

۴۰ اورنگ زیب صاحب۔ کھیوڑہ سوڈا کمپنی (بجلی گھر)
کھیوڑہ۔ ضلع جہلم

۴۱ جناب عبدالستار صاحب، دوکاندار، فرنٹیر شوگر مل
تخت بھائی، ضلع مردان

۴۲ جناب خالد احمد صاحب صدیقی، بی کام
۴م چوبرجی پارک، لاہور

۴۳ جناب عبدالحفیظ صاحب ہاشمی ویلکم ہوٹل چوک بازار بہاولپور

۴۴ جناب عبدالقدیر صاحب C/298 مینا بازار راولپنڈی

۴۵ جناب عبدالرشید صاحب ارشد، مدرس اسلامی مدرسہ
محمد پورہ، لائل پور

۴۶ جناب محمد عبدالقیوم صاحب بانس باڑی، ڈاکخانہ سید پور
ضلع رنگپور (مشرقی پاکستان)

۴۷ جناب مشرف حسین صاحب دوکاندار۔ جمیت رائے روڈ
مکان نمبر ۵۸-۱۰، بستی، کوئٹہ ڈویژن

۴۸ جناب محمد نذیر احمد صاحب، F/2544
بنگلہ ایوب شاہ، لاہور

۴۹ جناب عطا محمد صاحب، کتاب ہاؤس، چھسر بازار
ڈیرہ غازی خاں

۵۰ جناب ابوالکلام صاحب E/36 پختہ قلعہ، حیدرآباد

۵۱ جناب محمد دین صاحب۔ معرفت کوثر بکڈپو شاہی بازار حیدرآباد

۵۲ جناب ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ شیخ 71/16 وینکیے روڈ، حافظ آباد
ضلع گوجرانوالہ

۵۳ جناب عزیز الرحمٰن الامین صاحب، گوربنگا
ڈاکخانہ گھوڑا مارا۔ راجشاہی (مشرقی پاکستان)

۵۴ جناب سید اقبال علی پروپرائٹر دہلی ایمبرائڈری ورکس
461/D42 سرسوتی گلی، حیدرآباد۔

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے:-

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری فروری ۵۵ء اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ مہربانی آئندہ کیلئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں یا پھر خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اُسے کرا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم، مینیجر "مشیر" کراچی

۱۰۴۳ مختار الرحمٰن صاحب لودھی۔ ہزارہ
۲۲۸۴ مشتاق احمد صاحب ضلع مظفر گڑھ
۲۲۸۶ سپرنٹنڈنٹ صاحب آدم جی بورڈنگ ہاؤس۔ کراچی
۲۲۷۵ سید کوثر علی صاحب جعفری مالیر کوٹلہ بھابت
۲۴۸۳ دار المطالعہ جماعت اسلامی بھکر (میانوالی)
۲۵۳۳ رائے ظفر اللہ خاں صاحب کمالیہ لائل پور

[illegible] | Phone 7923 | Regd. No. S. 1375

Monthly "MUSHIR" Karachi

ماهنامه

مشیر

کراچی

MUSHIR KARACHI

باوقار تنظیم

باہمی بچت کی ایک پرافٹ شیئرنگ سکیم ہے

جس میں حصّہ لینے والا ہر ممبر پانچ روپیہ ماہانہ ادا کرتا ہوا مقررہ مدّت میں پانچ صد روپے کی کثیر رقم بھی یکمشت حاصِل کرتا ہے، اور اس کے علاوہ وہ اس بونس کا بھی حقدار ہوتا ہے جو کمپنی ھٰذا اپنے منافع سے اس سکیم میں باقاعدگی سے حصّہ لینے والے ممبران کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔

اس سکیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی ممبر کی ادا کی ہوئی اقساط کا روپیہ کسی حالت میں بھی ضبط نہیں ہوتا خواہ اس نے ایک ہی قسط ادا کی ہو۔

عبدالغفور بیگ
مینیجنگ ڈائریکٹر، باوقار کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی
فون نمبر ۷۹۲۳۳

اور گاڑی دوڑ رہی ہے!

شب کے سکوت اور تاریکی کو چیرتی ہوئی ریل گاڑی دوڑ رہی تھی ——— تبھی یکایک ایک بحث سنائی پڑی۔
"گاڑی کو میں چلاتی ہوں" بھاپ کہہ رہی تھی۔
"نہیں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" لوہے کی پٹری نے دلیل پیش کی۔ "گاڑی کا سارا بوجھ تو میں برداشت کرتی ہوں۔ میرے نہ ہونے سے گاڑی چل ہی کیسے سکتی ہے؟"
"میری مرضی کے بغیر گاڑی ایک قدم بھی نہیں چل سکتی!" ہری جھنڈی تکبر سے پھولی نہیں سما رہی تھی
"تم سب فضول باتیں بنا رہے ہو!" سلگتے کوئلے نے کہا "ذرا تو عقل سے کام لو، میرے بغیر بھلا کہیں گاڑی چل سکتی ہے؟"
"کچھ میری بھی تو سنو۔ نہ سنو تمہاری مرضی۔ لیکن یہ ایک حقیقی امر ہے کہ گاڑی کو بس میں ہی چلاتا ہوں!" جھکے ہوئے سگنل نے اکڑ کر کہا۔
کوئلے سے کالا جسم لئے ایک آدمی نے پسینے سے شرابور اپنے جسم کو حسرت سے دیکھا۔ جو کبھی بہت تندرست اور سڈول تھا اور جو اب پانچ سال کی ڈیوٹی میں ہی ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ اب وہ کیسے کہے کہ وہ دن بدن موت کی آغوش میں سماتا جا رہا ہے اور یہ گاڑی دوڑ رہی ہے!

•

گیت

آم کے درخت کی شاخ پر کوئل آکر بیٹھی، تو درخت نے التجا کی۔
"ذرا پنچم سُر میں گاؤ تو"
"گانا تو مجھے آتا نہیں" کوئل نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔
"تم جانتی ہو کہ تمہاری آواز میں شہد گھلا ہوا ہے، اسی لئے خوشامدیں کرواتی ہو، گاؤ نا!"
"سچ کہتی ہوں، گانا تو میں جانتی ہی نہیں"
"اور کل جو ساتھ والے پیڑ پر بیٹھی گیت گا رہی تھیں، وہ کیا تھا؟"
"وہ......!" کوئل نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "وہ تو میرے دل کا درد ہے جو گیت بن کر پھوٹ پڑتا ہے!"
اور درخت ششدر رہ گیا۔

• —— نینا کاش

اصلاحی ادب کا ڈائجسٹ
(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

فون نمبر: ۷۹۲۳۳

جلد: ۸
شمارہ: ۳

مارچ سنہ ۱۹۵۷ء

مرتبہ
عبد الغفور بیگ

فی پرچہ: آٹھ آنے
سالانہ: پانچ روپے

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ:-
ہندرمزۃ الحسنات رامپور۔ یوپی۔ بھارت

سید ...	حمید اللہ صدیقی	۳
مختصر افسانہ، ناولیٹ اور ناول	ڈاکٹر احسن فاروقی	۶
غزل	جگر مراد آبادی	۱۱
غزل	شاد عارفی	۱۱
غزل	اثر لکھنوی	۱۲
غزل	فیض احمد فیض	۱۳
طوفان	راجہ مترجم عباسی حکیم	۱۳
غزل	احسان دانش	۲۰
غزل	حکیم محمد اشرف	۲۰
آنیوالی سحر کا تصور لئے ہوئے	انور صدیقی	۲۱
تخلیق اور تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۲۲
غزل	کوثر نیازی	۲۷
غزل	قابل اجمیری	۲۷
غزلیں	فیروز نظر، اصغر مینائی	۲۸
غنڈہ، دوست، بھائی	زہرہ جمال	۲۹
دانش وہنر کی بزم مشورت	ماہر القادری	۳۵
فیروز نظر	ظہیر عالم	۳۷
معرکۂ معرودِ فرہنگ	فاروق بانسپاری	۴۰
غزل	محمد یعقوب طاہر	۴۰
سودا	عمر صدیقی گردش الہ آبادی	۴۱
ٹھنڈا پسینہ	اقبال احمد انصاری	۴۲
غزل	کوثر اعظمی	۴۷
غزل	رشدی القادری	۴۷
غزل	ساقی فاروقی	۴۸
غزل	ظفر اورنگ آبادی	۴۸
تذکرے اور تبصرے	———	۴۹
کارروائی ڈرائنگ باوقار تنظیم	———	۵۱

پرنٹر و پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ [illegible] پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر [illegible] کراچی [illegible] سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سبدِ گل

ادب کے متعلق ہر دور میں نقطہ ہائے نظر کا اختلاف رہا ہے۔ مختلف فنکاروں، ناقدین اور فلاسفہ نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد بتائے ہیں۔ کبھی یہ محض ایک آلۂ تفریح رہا ہے۔ کبھی اسے محض فنکاری قرار دیا گیا ہے۔ کبھی کسی بے لگام تخیل نے اسے دنیا جہان کی تحقیق کا ذریعہ بنایا، کبھی کسی بیمار اور مریض ذہن نے اسے انسان کی حیوانی خباثتوں کا آئینہ بنایا۔ آج بھی بقدر ظرف و ذوق اس کی توجیہات جاری ہیں اور شاید یہ سلسلہ ابد تک یونہی جاری رہے گا۔ ادب سے متعلق ہمارا بھی ایک نقطۂ نظر ہے۔ کچھ اس سے متفق ہیں کچھ اس سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ اختلاف کی وجوہات اور مصلحتیں متعدد ہو سکتی ہیں۔ ہم اپنا کام صرف یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو سکے، اپنے نقطۂ نظر کو واضح اور واضح تر کرتے رہیں۔ کونسا نقطۂ نظر زیادہ صحیح، زیادہ مفید اور زیادہ توانا ہے۔ اس کا فیصلہ قارئین اور وقت کا کام ہے ہمارا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اجمالاً ہم جس طرح فطرت کی ہر تخلیق کو ایک مفید مقصد کی خاطر سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ادب کیلئے بھی جو انسانی ذہن و دماغ کی تخلیق ہے، کسی نہ کسی مقصد کا پابند ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ ادب انسان کی تخلیق ہے اور اس کے اثرات انسانوں ہی پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ ادیب کو ہمیشہ اس امر کا احساس رہے کہ اس کی نگارشات کا تاثر دوسروں پر صحت مند، پاکیزہ اور حیات افروز ہو۔ اگر ادب کا تاثر اس کے برعکس ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ادیب ادب کے ذریعہ معاشرے میں جراثیم پھیلا رہا ہے جو مضرت بخش ہوں گے۔ یہ کام انسان دشمنی کے مترادف ہوگا۔ ادب کا کام انسان دشمنی نہیں بلکہ انسان دوستی ہے۔ اس کے بعد ایک دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ انسانیت کے لئے کونسی چیز مضر ہے، اور کونسی مفید ہے۔ اس کے لئے ہمارے پاس ایک مکمل نظامِ حیات موجود ہے۔ اس نظام نے حق اور باطل، خیر و شر، مفید اور مضر غرض دونوں کے متعلق واضح ہدایات دی ہیں اور رہنمائی کی ہے۔ جو چیزیں اس نظام کی رو سے حق، خیر اور مفید ہیں، انھیں ہی ہم انسانیت کے لئے صحت مند اور مفید سمجھتے ہیں۔ یہ چیزیں اس نظام کے ماننے والوں میں بھی ملتی ہیں اور اکثر اس کے نہ ماننے والوں میں بھی۔ ہمارا کام انھیں چیزوں کی تلاش اور ان سے استفادہ ہے۔

"مشیر" کی حیثیت ابتدا ہی سے پاکیزہ ادب کے ایک ڈائجسٹ کی رہی ہے لیکن "مشیر" نے کبھی بھی پاکیزگی اور صالحیت کو کسی خاص گروہ، جماعت یا طبقے کی میراث نہیں سمجھا۔ اس لئے کہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شر پر نہیں بلکہ خیر پر پیدا کیا گیا ہے اور اس میں اگر خیر دب جاتا ہے اور شر نمایاں ہو جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری بڑی حد تک اس کی اپنی کوتاہیوں، نشوونما، ماحول، سماج اور حالات زندگی پر ہوتی ہے، لیکن شر کے اس غلبے کے باوجود بیشتر ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی خیر اپنی کوئی جھلک دکھا ہی جاتا ہے۔ اس لئے جہاں تک خیر کا تعلق ہے ہم کسی سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر وقت متوقع رہتے ہیں کہ ان سیاہ خانوں میں بھی کبھی نہ کبھی روشنی کی کوئی کرن ضرور طلوع ہوگی جن میں فی الحال سوائے تاریکی اور سیاہی کے اور کچھ نہیں ملتا۔ یہ بات کہ آج انسانوں کی اکثریت شر کی طرف مائل ہے۔ ہرگز اس بات کے لئے دلیل نہیں بن سکتی کہ انسان فی نفسہٖ شر پر پیدا ہوا ہے کیونکہ انسانیت کے سوادِ اعظم کے مائل بہ شر ہونے کے باوجود ہر دور میں اور آج بھی شر کے خلاف نفرت اور عصبیت، اور خیر کے لئے محبت خود انسانیت کے سوادِ اعظم ہی میں موجود رہی ہے، اور ہے۔ بدترین سے بدترین انسان بھی کبھی اپنی کمزوریوں اور برائیوں پر فخر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے

اور اگر اس نے یہ جرأت کبھی کی ہے تو اس کا معاشرہ اس پر تنگ ہو گیا ہے۔ کم و بیش یہی حال ان انسانوں کا بھی ہے جنھیں ادیب اور فنکار کہتے ہیں۔ ادیب کے تصورات اور عقائد خواہ کتنے ہی ناقص اور مبتذل کیوں نہ ہوں لیکن اس نے انھیں تصورات کو کتنے ہی دبیز آئینہ کیوں نہ دکھلایا ہو کبھی نہ کبھی اس کے اندر کا دبا ہوا انسان سر اٹھا ہی لیتا ہے اور اس کے ذہن پر چڑھے ہوئے تمام مصنوعی حجابات چاک کر کے ابھر ہی آتا ہے۔ اس لئے پہلے بھی اور خاص طور پر اس شمارے میں "منشور" کے لئے افسانوں اور غزلوں وغیرہ کا انتخاب کرتے ہوئے ہم نے فکر و ادب کے ہر گوشے کو چھانا ہے۔

ہمارے ادیبوں میں واضح طور پر اس وقت دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو قطعی طور پر ایک نئے شعور، ایک نئے احساس اور عقیدے کے ماتحت یہ طے کر کے آگے بڑھے ہیں کہ وہ جب بھی کوئی فن پارہ پیش کریں گے ان کی کوشش ہمیشہ یہ رہے گی کہ وہ انسان کے صحت مند اور پاکیزہ خصائص اور اقدار کو ابھار کر پیش کریں گے تاکہ پڑھنے والے کے لئے ان کی نگارش محض وقت کے احساس کو ختم کرنے والی باتیں یا تفنن طبع کا کوئی مشغلہ نہ رہے بلکہ ان کو نیکی اور فلاح کی طرف دعوت بھی دے۔ ان کے سوتے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑے اور اسے پھر اتنی توانائی عطا کرے کہ زندگی کے ہر مرحلے پر جب خیر و شر کے درمیان انتخاب درپیش ہو تو اسے شر کے خلاف ضمیر کی کھٹک محسوس ہو اور خیر کے لئے رغبت۔ یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ اس طرح کی شعوری کوشش، اردو ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے۔ نہیں۔ اردو کے بعض نثر نگار اور شاعر شعوری طور پر اسی مقصد کو اپنے سامنے رکھ کر اپنی نگارشات پیش کر چکے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کل اس مقصد کو پیش نظر رکھنے والا ادیب اور شاعر تنہا اور اکیلا تھا اور آج اس کی وہ لے اکیلی اور تنہا نہیں ہے بلکہ ایک پورے گروہ کی آواز ہے۔ پھر گذشتہ بیس سال کے پس منظر میں یہ آواز کبھی نئی اور اجنبی معلوم ہو رہی تھی اور یہ شعوری کوشش طنز و استہزا، تضحیک و تشنیع کا نشانہ تھی۔ آج بہرحال صورت حال یہ نہیں ہے۔ کئی سال کی کوشش کے بعد آج ان میں سے اکثر اس قابل ہو گئے ہیں کہ مقصد تو مقصد، فن کے اعتبار سے بھی اپنی نگارشات کو مقابلے پر پیش کرتے ہوئے کسی طرح کا تکلف یا جھجک نہ محسوس کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس گروہ کے لکھنے والوں کی خاصی تعداد ابھی تو مشق کی منزلوں میں ہے اور اس لئے ان کی پیش کش فنی نقائص کی بھی حامل ہوتی ہے لیکن فنی پختگی اور چابکدستی اول تو بذات خود بڑی مشق اور تجربے کے بعد آتی ہے اور جب فن کار اس میں مقصدیت کا رچاؤ بھی ناگزیر سمجھے تو ظاہر ہے کہ اس کا کام اور مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارا کام بلکہ فرض ایسے لوگوں کی خاطر خواہ ہمت افزائی کرنا ہے تاکہ آج یہ لوگ جو ڈرتے اور جھجکتے ہوئے میدان میں آ رہے ہیں، کل پورے عزم اور خود اعتمادی کے ساتھ سامنے آ کر یہ بتا سکیں کہ ادب اگر صحت مند اور پاکیزہ نہیں تو ادب نہیں محض زیاں کاری ہے اور ان کا یہ دعویٰ محض ایک کھوکھلا نعرہ نہ ہو بلکہ وہ اور ان کی نگارشات اس دعوے کے زندہ دلائل ہوں۔ اس شمارے میں آپ بعض افسانے اور نظمیں اسی مقصد کے پیش نظر پائیں گے۔

اس کے برعکس ادیبوں کا ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو ادب کے لئے پاکیزگی اور مقصدیت کو قطعی ضروری نہیں سمجھتا۔ اس گروہ کے نزدیک ادیب کبھی محض تفنن طبع (PLEASURE) کے طور پر فن کی تخلیق کرتا ہے اور کبھی اپنے مشاہدات، تجربات و احساسات کے حقیقت پسندانہ اظہار کے لئے۔ خواہ اس کا ردعمل کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ مقصدیت اور پاکیزگی کی اہمیت کے اس انکار کے باوجود اس گروہ کے ادیبوں کے ہاں بھی کبھی کبھی بعض نگارشات ایسی مل جاتی ہیں جو ہمارے مقصد اور نظریات کے لحاظ سے بالکل درست ہوتی ہیں۔ ہم ایسے ادیبوں کو بھی اس حد تک اپنے ساتھ لیکر چلنا چاہتے ہیں جس حد تک ان کی نگارشات ہمارے مقاصد کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ان کا مذہب، مسلک، نظریہ و عقیدہ کیا ہے اس لئے کہ ہمارا کام زیادہ سے زیادہ افراد کو جوڑنا ہے کاٹنا نہیں۔ پھر اس گروہ میں چونکہ اکثر کہنہ مشق اور پختہ کار ادیب ہیں اس لئے جب کبھی ان کی نگارشات مقصدیت لئے ہوئے ہوتی ہیں تو ان کی فنی پختگی کی بدولت فن اور مقصد کا ایک حسین امتزاج بن جاتی ہیں اور یہی درحقیقت ہمارے نزدیک ادب کا مقصد ہے۔ یہ نگارشات اگر ایک طرف ہمارے نو مشق ادیبوں کے لئے نمونہ بن سکتی ہیں تو دوسری طرف ہم انھیں اپنا کر یہ بات اور واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ درحقیقت ادب کے ساتھ اگر ان کا یہی رویہ ایک مستقل رویے کی صورت

اختیار کرے تو زیادہ بہتر اور زیادہ قابلِ قبول اور زیادہ ہمہ گیر ہوگا۔ اسی لئے اس شمارے میں بعض چیزیں ایسے فنکاروں کی ہیں جن کی نگارشات اکثر ہمارے مقصد سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے پسندیدہ نہ تھیں۔ مگر آج انھیں کی یہ نگارشات دیکھ کر ہم نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ بھی ہم ہی میں سے ہیں۔

محمد حمید اللہ صدیقی

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

مختصر افسانہ، ناولیٹ اور ناول

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو کہانی دس پانچ صفحوں کی ہو وہ مختصر انہ، جو بیس پچاس صفحوں کی ہو وہ ناولیت اور جو سو دو سو صفحوں کی ہو ناول ہوتی۔ یہ ان تینوں اصناف میں ظاہرہ فرق ہے اور سطحی نظر سے دیکھنے ون کو اس فرق کے سوا اور کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ ایک حدتک ان ؤں اصناف میں اس سے آگے فرق کرنا مشکل ہے، کیونکہ ادب میں کوئی ن اصناف ایسی نظمیں تھی جو ایک دوسرے سے اس قدر قریب آجاتی ہوں اور اثر لے لحاظ سے اس قدر مناسبت رکھتی ہوں۔ تینوں میں ایک قصہ ہوتا ہے جس کی دلچسپی ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔ کچھ افراد کا ذکر ہوتا ہے جو اپنی طرت ایک ہی دلچسپ طریقے پر نمایاں کرتے ہیں۔ قصہ کی ساخت اور ن کو نمایاں کرنے کے طریقے بھی ایک ہی قسم کے برتے جاتے ہیں... زندگی پر نظر اور فلسفہ حیات کی تلقین بھی ایک ہی طرح کی ہوتی ہے اور جذباتی تاثر بھی ایک قسم کے ہوتے ہیں۔ پھر تینوں کو اس قدر مختلف کیسے سمجھا جائے، جیسے ایک غزل، ایک طویل نظم، اور ایک مکمل مثنوی میں والنت کے علاوہ ہر بات میں ہی نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو بہت سے سینکڑوں صفحوں کے قصے ایسے ملیں گے جن کو مختصر افسانہ ہی کہنا مناسب ہوگا۔ اور اکثر کچھ ہی صفحوں کے قصوں میں ناول کا پورا اثر ملیگا۔ اصل میں فرق محض لمبان ہی کا نہیں ہے۔ بلکہ فن کا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ جگہ کی گنجائش سے فنکاری کی صورت کو بدلنے کی بڑی گنجائش ہوجاتی ہے اور جو اس سے پورا فائدہ اٹھالے وہی ایک طریقہ تعمیر کے دائرے سے نکل کر دوسرے دائرے میں آجاتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان تینوں اصناف میں زماں و مکاں کے حدود کا فرق ہے یعنی مختصر افسانہ کچھ گھنٹوں کا ناولیٹ کچھ دنوں یا مہینوں کا اور ناول سالوں کا قصہ بیان کرے گی۔ اور مختصر افسانے میں محض ایک مقام کا ذکر ہوگا ناولیٹ میں دو تین کا اور ناول میں۔ لاتعداد کا ایک حدتک یہ نظریہ بھی درست ہے کہ اور سطحی طور پر اس کو ان تینوں اصناف میں فرق کرنے کے لئے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ مگر اس نظریہ کو کلیہ کی طرح نہیں استعمال کیا جاسکتا۔ موپساں کے اکثر مختصر افسانے ہیں جن میں پوری زندگی کے حالات ہیں۔ ویلز کے اکثر افسانوں میں دنیا بھر کے مقامات لے آئے گئے ہیں۔ مگر یہ ہیں مختصر افسانے ہی ناول یا ناولیٹ نہیں اور ان کا ہر پڑھنے والا، ان کو مختصر افسانے ہی کہے گا کیونکہ ان کا مکمل اثر وہی ہے جو مختصر افسانوں کا ہوتا۔ لہذا محض اتحاد زمان و مکاں ہی کسی قصے کو مختصر افسانہ نہیں بنا دیتا۔

اصل فرق پیچیدگی کا ہے۔ مختصر افسانہ کہانی کا ایک تار ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ ناول بہت سے تاروں کا بنا ہوا جال پیش کرتی ہے۔ افسانہ کی نوعیت یہ ہے کہ جیسے کسی دھاگے میں ایک گرہ پڑی اور سلجھ گئی۔ ناول کے مختلف دھاگوں میں الگ الگ اور ایک دوسرے میں گتھیاں پڑتی جاتی ہیں اور آخر میں سب سلجھ جاتی ہیں ناولیٹ میں تار تو ایک ہی ہوتا ہے مگر یہ تاروں کا بنا ہوا ایک تار ہوتا ہے اور اس میں گتھی کچھ زیادہ موٹی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر پریم چند کا افسانہ "پنچایت" لے لیجئے۔ گاؤں کی پنچایت سے شیخ جمن اور الگو چودھری کے تعلقات میں پہلے ایک کشیدگی ہوجاتی ہے کیونکہ جمن اور اس کی خالہ کے درمیان ایک معاملہ میں الگو پنچ مقرر ہوتا ہے اور وہ انصاف کرتا ہے جو جمن کے خلاف ہوتا۔ پھر الگو چودھری اور ایک ساہوکار کے درمیان معاملہ کے لئے پنچایت بیٹھتی ہے اور جمن پنچ مقرر ہوتا ہے وہ کشیدگی کے باوجود چودھری کے موافق فیصلہ دیتا ہے یہ دونوں پھر آپس میں دوست ہوجاتے ہیں اور یہ سمجھ جاتے ہیں کہ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر انصاف ہی کرنا پڑتا ہے۔ یہاں دوستوں کے پنچایت کے سلسلے میں تعلقات کی ایک گتھی پڑنا اور اس کا سلجھ جانا ہی تو

ہے ۔ برخلاف اس کے "امراؤجان ادا" کو لیجئے ۔ یہاں قصہ تو جان کے ایک شریف گھرانے فرار کرکے جانے اور رنڈی بن کر . . لف قسم کے تجربہ حاصل کرنے کا ہے مگر اس قصے سے وابستہ کتنے قصے ہیں جو اپنی جگہ پر مکمل ہیں ۔ پہلے امراؤجان کے والدین کے اہی قصہ ہے ۔ پھر دلاور خاں کا قصہ ہے ۔ خانم کے چکلے میں جتنی لڑکیاں ہیں ان سب کے قصے الگ الگ ہیں ۔ امراؤجان سے بھی لوگ آشنائی کرتے ہیں ان سب کے الگ الگ قصے ہیں ۔ پھر دلی کا ایک قصہ الگ ہے جو امراؤجان کے قصہ سے بالکل متوازی ۔ اسی طرح بسم اللہ جان کے قصہ میں کانی قصہ ہے ۔ امراؤجان خری زندگی میں ایک نوچی بٹھانے کا قصہ الگ ہے اور گوہر علی کے دعوے سے اکبر علی خاں کے ساتھ رہنے لگے کا قصہ الگ ہے اور بھی تمام چھوٹے چھوٹے قصے ہیں جن کا ایک پورا جال بنا دیا ہے قصہ اپنی جگہ پہ الگ کرکے ایک مختصر افسانہ بن سکتا ہے اور پوری میں ہر قصہ کی وہی نوعیت ہے جیسی کہ کسی مرکب اجزاء کی ۔ پھر ناولیٹ لے لیجئے جیسے کشن پرشاد کول کی "شاما" یہاں "شاما" کی ش سے ناجائز محبت کا ہے اور تمام سروکار اسی سے ہے ۔ اس محبت پیدا ہونے کی وجہ دکھلانے کے لئے شاما کی سسرال کے حالات سامنے ہ گئے ہیں اس کے میاں کی عیاشی اس کی ساس کی ہٹ دھرمی اور کا میکے میں آ بیٹھنا ، یہاں بیمار پڑ جانا اور پرکاش کا اس کی خدمت اور ان دونوں کے درمیان عشق ہو جانا ۔ کشمیر میں دونوں کا ملنا شاما کا شادی سے انکار کرنا ۔ پرکاش کا دوسری جگہ شادی کر لینا س شادی سے اطمینان نہ حاصل کرکے آشرم میں داخل ہو جانا ، شاما رت کے حقوق جتلاتے ہوئے مر جانا ۔ قصہ محض دو آدمیوں کے کا ہے اور ان کی زندگی کے اس ہی پہلو پر تمام روشنی ڈالی گئی رے لوگ جو یہاں آ جاتے ہیں ان کے اس قصہ سے تعلق کے علاوہ اپنا کوئی قصہ الگ قصہ نہیں ہے ۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ کہانی کے اپنے جال میں سے ایک خاص سکشن کاٹ لیا گیا ہو جو ایک سے ایک ٹکڑا ہی معلوم ہوتا ہے ۔ مگر اس میں معلوم کتنی دھاگے ہے یہاں افسانے کی سادگی اور ناول کی پیچیدگی کے درمیان ایک مصالحت نظر آتی ہے ۔ ناولیٹ نگار ایک سادہ قسم کی پیچیدگی سے سروکار رکھتا ہے اور اس طرح مکمل پیچیدگی میں نہیں پڑتا جیسے کہ ناول نگار!

پھر فرق نفسیاتی وضاحت کا ہے ۔ مختصر افسانے میں عموماً ، ایک یا دو کردار جو لائے جاتے ہیں ان کی محض ایک صفت کے ایک پہلو یا ایک معاملہ میں ایک خواہش کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا جاتا ہے اس سے زیادہ افسانہ نگار کو اپنے کردار کی نفسیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ ناولیٹ نگار بھی ایک ہی دو کردار سے تعلق رکھتا ہے ۔ ان کی ایک ہی صفت کو واضح کرتا ہے ۔ مگر یہ وضاحت بالکل مکمل ہوتی ہے اور متعدد واقعات کے ذریعہ اس صفت پر روشنی پڑتی ہے چنانچہ جہاں تک اس صفت کا تعلق ہے ہم اسی کردار کے بابت سب کچھ جان جاتے ہیں ۔ ناول میں کردار کی کوئی حد نہیں اور جتنی زیادتی ہو اتنا ہی بہتر ہے ۔ پھر ہر کردار کی مکمل نفسیات ہر پہلو سے واضح کر دی جاتی ہیں ۔ اور یہ جتنی مکمل اور جتنے پہلو سے واضح ہوگی اتنا ہی بہتر ہوگا ۔ مثال کے طور پر امریکی افسانہ نگار او ہنری (O. HENRY.) کا افسانہ گفٹ آف دی میجائی (Gift of the Magi) لے لیجئے اس میں ایک میاں اور ایک بیوی ایک دوسرے کو بڑے دن کی تحفہ دینے کے لئے اپنی سب سے زیادہ عزیز چیز بیچ ڈالتے ہیں ۔ یہاں ان دونوں میاں بیوی کی ایک دوسرے سے چاہت اور اس کا بھی ایک پہلو یعنی ایک دوسرے کو بڑے دن کے موقع پر خوشی کرنے کی کوشش میں ایثار ہی واضح ہوتا ہے ۔ اس سے آگے افسانہ نگار کو کوئی سروکار نہیں ہے ۔ ناولیٹ کی مثال اسٹیونسن (Stevenson) کی ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ (Dr. Jackyl & Mr. Hyde) لے لیجئے اس میں ایک عجیب شخص کا قصہ ہے جو مشہور اور ہر دلعزیز ڈاکٹر ہے مگر جو ایک دوا پی کر نہایت بدشکل اور بدمعاش ڈاکو بھی ہو جاتا ہے اور چنانچہ اس ڈاکو کا بھی شہر بھر کو بڑا خوف ہے ۔ ناول کے ہیرو کی یہ دونوں حیثیتیں الگ الگ ہیں مگر وہ اس دوالی (Duality) ایک ہے جو اس کے کردار کی خاص چیز ہے ۔ اور اس کو مکمل طریقہ پر واضح کیا جاتا ہے چنانچہ اس صفت کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے

مثال میں ٹولسٹوئے کی "انّا کارینا" لیجئے۔ اس میں انّا کی زندگی اور
کی نفسیات کا ہر ہر پہلو ہمارے سامنے لایا گیا اور پھر اس سے متعلق جتنے
لوگ ہیں ان سب کی نفسیات ہر پہلو سے واضح ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ
کہ یہ ناول ہمارے سامنے پوری دنیا لاتی ہے۔ ٹولسٹوئے کی اس سے
ناول "وار اینڈ پیس" (War and Peace) جو شاید دنیا
سب سے بہتر ناول ہے۔ ہمارے سامنے پوری کائنات کا آفاقی نقشہ کھینچتی
ہے۔ اور ہر ہر قسم کے لاتعداد افراد سے پورے پورے طور پر واقف کراتی
ہے۔

اسی طرح ان اصناف میں جذبات کی گہرائی، نظر کی وسعت، مقصد
وضاحت کا بھی فرق ہے اور یہاں تک کہ عام طور پر ناول کو افسانے کے
متضاد سمجھ لینا غلطی نہیں ہوگی۔ اصل میں ان دونوں فنون کو برتنے کے لئے
بالکل متضاد قسم کی فطرتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسانہ ایسے دماغ
کے لئے موزوں فن ہے جس کا رجحان (apprehension)
کی طرف ہو۔ ناول ایسے دماغ کے لئے موزوں ہے جس کا رجحان
(comprehension) کی طرف ہو۔ مقصد یہ ہے کہ ایک
وہ ہوتا ہے جس کی نگاہ جزو دعیات کی طرف ہو جاتی ہے اور اسے کلیات سے
زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ دوسرا وہ ہے جو کلیات کی طرف متوجہ ہونے
کی وجہ سے جزو دعیات میں ہی الجھ کر نہیں رہ جاتا۔ یہ امر پریم چند کی ناول
گئودان سے واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پریم چند جزو دعیات کی نہایت عمدہ
عکس کشی کر سکتے ہیں مگر کلیات بنانے سے قاصر ہیں۔ اس ناول کے
قصے کے تین دھارے آپس میں کوئی گہرا تعلق نہیں رکھتے اس کے سب سے
دلچسپ حصے وہی ہیں جو اپنی جگہ بالکل مکمل ہیں اور آگے پیچھے سے بالکل
غیر متعلق ہیں مثلاً مرزا خورشید کا مزدوروں کو کبڈی کھلانا یا رائے صاحب
کے یہاں مسٹر کھنّا کا پٹھان کے روپ میں آنا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ بہت
پھیلے ہوئے تاثرات کو یکجا اور ہم آہنگ تصور کرنے کی پریم چند میں
قابلیت ہی نہ تھی۔ بخلاف اس کے چھوٹے چھوٹے تاثرات کو مناسب جگہ
میں واضح کر دینے کی ان میں تعجب انگیز قوت تھی۔ فطرت نے ان کو افسانہ
نگار ہی بنایا تھا ناول نگار نہیں۔ اسی طرح گالسورتھی (GALSWORTHY)
کو لیجئے۔ اس نے بہت سے افسانے بھی لکھے ہیں اور ناول

میں سے کافی کامیاب بھی ہیں۔ مگر جب ان افسانوں کو پڑھ کر ہم ان کی
ناول کی طرف توجہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرت پریم چند کی
فطرت کے متضاد ہے۔ وہ زندگی کو (comprehend) بہت
بہتر کر سکتا ہے اور (apprehend) کرنے کے لئے اس کی فطرت
زیادہ موزوں نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ چیزوں کو سمیٹ کر ایک
بنانے کے زیادہ قابل ہے۔ جبکہ پریم چند ہر چیز کو الگ الگ خوب دیکھ
سکتے ہیں۔ مختلف چیزوں کو سمیٹ کر ایک کرنے میں ناکامیاب رہتے ہیں
اکثر ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنہوں نے تینوں اصناف میں برابر کامیابی
حاصل کی جیسے اسٹیونسن (Stevenson) مگر اس سے یہ مقصد
نہیں کہ ان سب میں کامیابی کے لئے اسٹیونسن کی صرف ایک ہی قسم
کی دماغی قوت مصرف میں آئی۔ اس میں تینوں فنون کو برتنے کی
الگ الگ قوتیں موجود تھیں۔ یعنی اس کا دماغ ایک حد تک متضاد
قوتوں کا حامل تھا۔ جن کی قوت کو جامع السداد کہا جاتا ہے۔ وہ ہی تینوں
فنون کو برتنے میں کامیاب ہوئے ورنہ یہ مسلم ہے کہ ان کو برتنے کے
لئے متضاد قوتوں کی ضرورت ہے۔

میرا یہ مقصد نہیں کہ ناول نگار کو جزو دعیات سے تعلق ہی نہیں
ہوتا۔ یا افسانہ نگار کو کلیات کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ مقصد یہ ہے کہ
اول الذکر کو جزو دعیات سے تعلق ہے مگر اسی طرح پر کہ وہ جزو دعیات کو
ایک بڑے کل کے حصے دیکھتا ہے اور آخر الذکر کو ایک جزو ہی کو الگ دیکھنے
سے سروکار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک پہاڑ ہے جو بہت سی چٹانوں سے مل
کر بنا ہے۔ ناول نگار ہر چٹان کو بھی اس پہاڑ کو نظر میں رکھتا ہے۔
اور اس طرح کل پہاڑ کا تاثر قائم کرنا اس کا اہم فرض ہوتا ہے۔ بخلاف
اس کے افسانہ نگار ایک چٹان کے ایک رخ ہی پر نظر کرتا ہے
اور یہ امر کہ یہ چٹان اور اس کا وہ پہلو جو ہمارے سامنے ہے ایک بڑے
پہاڑ کا حصہ ہے پس منظر ہی میں رہتا ہے۔ افسانہ نگار معلوم ہوتا
ہے کہ چٹان سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ صرف تھوڑی ہی سی سامنے
کی چیز اسے دکھائی دیتی ہے۔ بخلاف اس کے ناول نگار اس
نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کہ پورا پہاڑ سے دکھائی دیتا ہے اور
چٹان بھی مکمل طور پر دکھائی دیتی ہے [illegible]

افسانہ کا صحیح تصور

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ناول ایک مکمل چیز ہے اور افسانہ نامکمل غلط ہوگا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہوتے ہیں۔ کوئی اچھا افسانہ ایسا نہ ہوگا جس کو پڑھ کر یہ تسکین نہ ہو کہ ایک بات پوری ہو گئی اور کوئی ایسی ناول نہ ہوگی جس کا یہ تاثر نہ ہو کہ کچھ باتیں تکمیل کو پہنچ ہی گئیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کا ذہن دو مختلف طریقوں پر کام کرتا ہے اور یہ طریقے اپنی اپنی جگہ پر الگ الگ ہیں۔ ایک وقت وہ کسی ایک مختصر بات پہلو یا حالت ہی سے دلچسپی لیتا ہے اور دوسرے وقت وہ بہت سی ملی جلی باتوں حالتوں یا پہلوؤں سے مگر دونوں حالتوں میں جب تک ایک مکمل چیز اس کے روبرو نہ ہو وہ مطمئن نہیں ہوتا اس لئے کسی اچھے ناول کے مختلف ابواب وہ اثر پیدا نہیں کرتے جو مختصر افسانہ کا ہو کیونکہ اول الذکر کی نوعیت ہی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں۔ اور آخر الذکر ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہوتے ہیں

اس لئے یہ بھی کہنا غلط ہوگا کہ ناول کی جگہ مختصر افسانہ لے سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آج کل کی زندگی میں مصروفیتوں کی زیادتی اور ادب کے لئے وقت نکالنے کی کمی کی وجہ سے لوگ ناولوں سے زیادہ مختصر افسانوں کو پڑھنا پسند کریں یا یہ کہ ماہناموں میں افسانوں ہی کی گنجائش کی وجہ سے افسانوں ہی کی زیادہ مانگ ہو۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زندگی کے جزو عیات ہی پر انسان کی نظر جم گئی ہے اور وہ بڑے اور وسیع تاثرات کو جذب کرنے سے قاصر ہو گیا ہے۔ اگر غور کیا دیکھا جائے تو آفاقی اور کائناتی باتیں آجکل بہت قریب آتی جا رہی ہیں بدلتی ہوئی حالتیں زیادہ سنجیدہ اور دلچسپ ہوتی جا رہی ہیں۔ اور اس لئے انسان طویل قصوں میں دلچسپی لینے کا کچھ زیادہ اہل ہوتا جا رہا ہے۔ غرضیکہ دونوں فن انسانی فطرت کی دو مختلف قسم کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ اور جب تک یہ ضروریات مختلف اور الگ الگ رہیں گی ان دونوں فنون میں سے کسی ایک کا دوسرے کی جگہ لینا ناممکن ہے۔

کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا مختصر افسانے میں پیش ہونا مشکل ہے۔ ان چیزوں میں سب سے اہم کردار کا ارتقا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ انسان کی فطرت وقت اور واقعات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جو ناول طویل عرصہ پر حاوی ہوگی اس میں جو افراد پیش ہوں گے وہ وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے ضرور دکھائے جائیں گے۔ عام طور پر اردو نقاد یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ناول میں کردار کا ارتقاء دکھانا ضروری ہے اور ایسی ناول پر بھی جس میں وقت کا تعین دو یا تین مہینہ سے زیادہ نہ ہو اعتراض ضرور داغ دیتے ہیں کہ اس میں کردار ارتقاء نہیں کرتے یہ زیادتی ہے۔ ناول میں کردار کا ارتقاء دکھانا ضروری اور لازمی نہیں ناول کردار کے ارتقاء دکھانے کا میدان ضرور ہے۔ افسانے میں یہ ممکن ہے کہ ایک پوری زندگی لے لی جائے اور کسی فرد کو بالکل تبدیل ہوتے ہوئے دکھایا جائے۔ مثلاً موپساں کے افسانے ڈائمنڈ نکلیس (Diamond Neck Lace) میں ہیروئن شروع میں اپنے تئیں بنانے سنوارنے کی طرف متوجہ ہے۔ وہ اپنی ایک دوست کی نکلیس ایک دعوت میں جانے کے لئے مانگ کر پہنتی ہے۔ وہ نکلیس کھو جاتی ہے اور ویسی دوسری کثیر قیمت پر خریدی جاتی۔ اس قیمت کو ادا کرنے کی انتھک کوشش میں وہ بالکل بدل جاتی ہے اور تمام دکھاوے سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ اس سے یہ خیال ضرور گزرتا ہے کہ افسانے میں بھی کردار کا ارتقاء دکھایا جا سکتا ہے۔ مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں ارتقاء نہیں ہے۔ بلکہ محض ایک تبدیلی ہے اور افسانے کا مقصد اس تبدیلی ہی کو دکھانا ہے اس سے زیادہ ارتقاء کی تفصیل میں گنجائش نہیں ہے۔ برخلاف اس کے امراؤ جان ادا کا کردار دیکھئے اپنے ماں باپ کے گھر کی لڑکی امیرن نہایت بھولی اور معمولی چیز ہے خانم کے چکلے میں آکر اس کی نفسیات مکمل ہوتی ہیں۔ گانے کی طرف خاص مناسبت ابھرتی ہے اور انسانی فطرت میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اس کے دل میں محبت جگہ گھیرتی ہے۔ اس کا ادبی مذاق پختہ ہوتا ہے اور وہ آزاد ہونا چاہتی ہے لکھنؤ سے کانپور تک پہنچتے پہنچتے اس میں ایک خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ اور پیشے کو بنا لینے کی ایک صلاحیت آگئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے پیشے کی ذلت کا احساس بھی گھر کر گیا ہے۔ چنانچہ جب وہ پھر لکھنؤ آتی ہے تو کچھ ایسی چیز ہے جس کا پہلے سے کوئی تعلق ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح آخر تک اس کے کچھ احساسات اور نئی قوتیں پرستی ہی چلی جاتی ہیں

یہ ہے ارتقاء کا پورا نقشہ، اور یہ چیز ناول ہی میں دکھائی جا سکتی ہے۔ ناولیٹ میں بھی اس کی گنجائش ہے مگر یہ ارتقاء ایک ہی معاملے کے سلسلے میں دکھایا جا سکتا ہے۔ شاما میں جو ارتقاء ہوتا ہے وہ محض عورت کی زندگی میں مرد سے تعلق کے سلسلے ہی کا ارتقاء ہے یعنی اس کا تجربہ اس کے محبت ہی کے سلسلے میں خیالات تبدیل کرتا ہے اور سوسائٹی میں عورت کو جو مرد کا غلام بنا رکھا گیا ہے اس کے خلاف ہی اس کے اقدام آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اس طرح ناولیٹ میں مکمل کردار کا ارتقاء نہیں دکھایا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز جو مختصر افسانے میں نہیں پیش ہو سکتی وہ ایک پورا ماحول ہے۔ مختصر افسانہ ایک ماحول کے ایک نقطہ ہی پر انگلی رکھ سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی افسانہ نگار مختلف افسانوں میں کبھی ماحول کے مختلف نقطوں کو دکھائے اور یہ سب افسانے مل کر ایک پورے ماحول کا تصور قائم کریں۔ مگر یہ بالکل دوسری بات ہوئی۔ کیونکہ کوئی ایک افسانہ ایک وقت میں یہ نہیں کر سکتا۔ ناول میں ایک ماحول کے تمام پہلو نہ لائیں جائیں مگر متعدد پہلوؤں کا آجانا نہایت ضروری ہے اور ان میں سے ہر پہلو کچھ اس طرح پیش ہوگا کہ ناظرین کو یہ محسوس ہو کہ اس معاملے میں ان کو سب کچھ بتا دیا گیا۔ ناولیٹ میں ایک ہی پہلو کو لے کر مکمل طور پر واضح کر دیا جاتا ہے اسی طرح فلسفہ حیات کو بھی پیش کرنے کے لئے ناولیٹ میں کم اور ناول میں لاحد گنجائش ہے جبکہ مختصر افسانے بس نام چار کی گنجائش ہے۔

فنی نقطہ نظر سے افسانہ اور ناول کے مختلف تاثرات کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ ایک میں اختصار کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ ملتی ہے اور دوسری میں پھیلاؤ کی طرف۔ افسانہ نگار جتنی ہی زیادہ کانٹ چھانٹ کرے گا اتنا ہی اس کا افسانہ بہتر ہوگا۔ یہ مقصد نہیں کہ وہ بالکل پھیکی یکسانیت پر آئے اور تنوع کا خیال ہی چھوڑ دے مگر وہ تنوع بھی پیدا کرے گا تو اس خیال سے کہ واجبی حد تک رہنا ضروری ہے۔ ناول نگار جتنا ہی زیادہ اپنے مواد کو پھیلائے گا اتنی ہی اس کی ناول زیادہ زوردار ہوگی۔ یہ مقصد نہیں کہ وہ اپنے موضوع سے باہر ہو جائے اور ایسے معاملات لے آئے جو بالکل بے تعلق ہیں جیسے مرشار نے "فسانہ آزاد" میں کیا ہے۔ ایک اتحاد کا اثر اور ایک فارم کی جگہ تنہا کا وجود ناول کے لئے ضروری ہو مگر ناول نگار کے لئے تنہا ہے۔ جیسے افسانے میں اتحاد پر تنوع کا بار ہو جانا غلطی ہے ناول میں تنوع کا اتحاد پر حاوی ہو جانا وسعت ہے۔ غرض ناول وہ مختلف اور متضاد راہوں پر جاتا ہے اور ان میں ہر قسم کی چیزوں میں دلچسپی ہے۔

(بشکریہ "ساقی")

جگر مراد آبادی •

بے غمِ عشق و بے دلِ آگاہ
موت بھی جرم، زندگی بھی گناہ

میں چلا جا رہا تھا اپنی راہ
سامنے آپ آ گئے ناگاہ

کس کا شکوہ، کہاں کا حالِ تباہ
اُف وہ نازک سی زیرِ لب اک آہ

مجھ کو راس آ گیا غمِ جانکاہ
آپ زحمت کریں نہ اب لِلّٰہ

میں بہر حال ہوں فراق نصیب
تو بہر رنگ ہے مرے ہمراہ

آپ پھولوں سے جھولیاں بھر لیں
ہم نے کانٹوں کر لیا ہے نباہ

میکدے میں کہاں! جنابِ شیخ
آ ہی نکلے تو خیر بسم اللہ

شاد عارفی •

جس طرف جائیں اُدھر اے کاش میخانہ پڑے
تا کہ دل پینے کو چاہے اور سمجھانا پڑے

آشیاں برباد ہو جائے قفس جانا پڑے
ہر "چمن دشمن" کو لیکن دل میں پچھتانا پڑے

اس تامل میں نہ آ جائے کسی کا فریبِ دل
سینکڑوں پیغامِ "رنگِ رقص" ٹھکرانا پڑے

سو بہانے ہیں ستانے کے اگر چاہیں گے وہ
سو طریقے ہیں اگر ان کو ستم ڈھانا پڑے

ان کو اس نقطے پہ لے آئی ہماری داستاں
جس طرف گذریں سنائی ایک افسانہ پڑے

بحث میں ٹھن کھا کے ہم کو چھوڑ جائے رہنما
اس سے بہتر ہے کہ رستہ سے پلٹ آنا پڑے

وہ پئے قوم و وطن کیا کام آئیں گے جنھیں
اپنی عظمت کے لئے دنیا کو بہکانا پڑے

اپنی تعریفوں کے اب اتنے بھی پل مت باندھئے
آپ کی خاطر مجھے جھوٹی قسم کھانا پڑے

گلستانوں کو بہاروں نے بدل ڈالا تو کیا
ہم تو جب جائیں کوئی صحرا نہ پہچانا پڑے

دیکھنا یہ ہے زوال آئے جو بزمِ عیش پر
کون مینا پائے کس کے ہاتھ پیمانہ پڑے

شادؔ اس ماحولِ غمگیں میں نشاط آور غزل
خوش گلو شاعر کو جیسے مرثیہ گانا پڑے

(بشکریہ ادبِ لطیف)

شں لکھنوی •

یا جانے ایکے بچھڑے ملیں گے بھی یا نہیں
ں ہاں حیا کرو مگر اتنی حیا نہیں

اس زندگی میں موت بھلی ہے ہزار بار
جیتے ہیں اور جینے کا کچھ مدعا نہیں

تنے ہی مرحلوں سے گذرنے کے باوجود
نسان خود شناس کہ حق آشنا نہیں

آشوب گاہ شوق میں کہتے ہیں دل جسے
جو نالہ نارسا ہے وہی نارسا نہیں

صورت کوئی منانے کی نکلے تو کس طرح
ہ شوخ یوں خفا ہے کہ جیسے خفا نہیں

دل کے بھی ساتھ ساتھ ہو مانند بوئے گل
وہ قافلہ کہ جس میں جرس کی صدا نہیں

نیب تک جبیں کا ہوش کہ ہو بندگی کا ہوش
زاہد مذاقِ عشق میں سجدہ روا نہیں

تیرے سوا کسی سے غرض ہے نہ مدّعا
تیرے سوا کسی کا مجھے آسرا نہیں

یں ہمنوائے میر نہ ہوں کس طرح اثر
صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں"

(بشکریہ برگِ گل")

فیض احمد فیض •

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے

جنوں میں جتنی بھی گذری بکار گذری ہے
اگرچہ دل پر خرابی ہزار گذری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گذری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جسکا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

نہ گل کھلے ہیں نہ اُنسے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گذری ہے

چمن میں غارتِ گلچیں سے جانے کیا گذری
قفس سے آج صبا بیقرار گذری ہے

اور کچھ دیر نہ گذرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

(بشکریہ گلِ خنداں")

ترجمہ
منجم عباسی بیگم •

طوفان

یہ راجو کا لکھا ہوا افسانہ ہے۔ ۱۹۵۱ یا ۱۹۵۲ء میں افسانوں کا جو عالمی مقابلہ ہوا تھا اس میں اس افسانے کو تیسرا انعام دیا گیا تھا

موسم بھیانک ہو گیا تھا۔ اور ریل بھی بہت دیر سے پہنچی تھی۔

جب راؤ دوسرے درجہ میں سوار ہوا۔ تو اس کو اپنے سجے سجائے مکان کے سکھ یاد آگئے۔ اس کا کمرہ جس کی ساری چیزیں صاف ستھری تھیں۔ اس کے لکھنے کی میز جو چندن کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے ایک کونے میں رکھا ہوا وہ سبز فانوس کا لیمپ۔ اس کی وہ گدیلی کرسی جس میں اس کے جسم کی انچ انچ کے مطابق آرام دہ گڑھے بن گئے تھے۔ اس کی بیوی جو ایک صوفے پر الگ تھلگ چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ اس کے چار بچے، دو بیٹیاں جن پر وہ بڑا ناز کرتا تھا۔ ڈبے کی تینوں نشستیں پہلے ہی سے بھری ہوئی تھیں جن پر بستر پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھے بغیر ہی بھانپ لیا تھا کہ اس کے آنے سے وہ لوگ چڑچڑے ہو رہے ہیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی دوسرے ڈبے میں جا بیٹھے لیکن قلی اس کا صندوق، بستر اور چھتری برتھ پر رکھ چکا تھا اور گاڑی کوئی دم میں چلنے والی تھی۔ ایک مسافر نے اپنا بستر تھوڑا سا سمیٹ کر راؤ کے بیٹھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ بنا دی۔ دل ہی دل میں شکریہ ادا کرتے ہوئے راؤ وہاں بیٹھ گیا اور اپنے آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔

چاروں مسافر دور جانے والے معلوم ہو رہے تھے۔ اسی لئے جوتے بنچوں کے نیچے ڈال رکھے تھے۔ پتلون کوٹ اور قمیص بے ڈھنگے پن سے کھونٹیوں سے لٹک رہے تھے اور وہ لوگ پاجامے پہنے ہوئے تھے کھڑکی کے پاس کی دو نشستوں پر دو بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے اور دوسری طرف کی نشست پر ایک جوان مرد اور ایک بہت ہی نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی معلوم ہو رہے تھے۔ سامنے

ڈبے میں تمباکو کی ہلکی سی ناگوار بو بسی ہوئی تھی۔ جو راؤ کو بڑی بری لگتی تھی۔

ریل کے ڈبوں میں سگرٹ پینے کی نسبت راؤ کے خاص خیالات تھے۔ بہت ساری چیزوں کے بارے میں اس کے خاص خیالات تھے۔ پچاس برس کی مصروف اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے بعد جب وہ مڑ کر اپنی پچھلی زندگی کو دیکھتا تو اسے بڑی تسلی ہوتی تھی وہ وکیل تھا۔ اس لئے بڑا تیز اور مشاق مقرر بن گیا تھا اور آج ایک انجمن میں تقریر کرنے جا رہا تھا جو "خدا پرستوں کی انجمن" کہلاتی تھی۔

ہوا چلنے لگی تھی جو کھڑکیوں پر تھپیڑے پر تھپیڑے لگا رہی تھی۔ ڈبے کے اندر یکایک اندھیرا پھیل گیا۔ حالانکہ ابھی شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھی نے جو جرائم کی کتاب پڑھ رہا تھا، کتاب سے نظریں ہٹاتے ہوئے راؤ سے وقت پوچھا۔ اگرچہ راؤ کے ہاتھ پر گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

"میرے خیال میں تین بجے ہوں گے"

"کتنا اندھیرا ہو گیا ہے!" اس کا ساتھی کہنے لگا۔ راؤ کچھ نہیں بولا۔ لیکن ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی عمر بھی راؤ کی عمر کے لگ بھگ تھی۔ اس کو تعجب ہو رہا تھا کہ اس عمر میں بھی اس شخص کو جرائم کے قصوں سے دلچسپی ہے۔ اس کے خیال میں یہی وجہ تھی کہ وہ شخص اپنی عمر سے زیادہ بڈھا دکھائی دے رہا تھا۔

راؤ اپنی صحت پر فخر کرنے لگا۔ اس کی بیوی تو عمر میں اس سے بھی بڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ اس سے کہا کرتا تھا کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کی بڑی بہن ہے۔ لیکن اس کی [illegible]

بیٹا یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک پچیس سال کے بیٹے کا باپ ہوگا۔ ہی میں اس کے بیٹے نے اس کی وکالت کا سارا کاروبار اپنے ہاتھوں سنبھال لیا تھا۔ راؤ کی طرح بہت کم لوگ ہوں گے جو اتنی اچھی ی وکالت کے بعد اس عمر کو پہنچ کر اپنے پیشہ سے سبکدوش ہو گئے ہوں۔

اس وقت تک ڈبے کی ساری کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں۔ بے کے باہر ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ اور کچھ پھوار ڈبے کے اندر بھی آنے لگی تھی۔ کچھ سردی وس ہو رہی تھی۔ وہ جوان مرد نوجوان عورت کے پہلو میں گھسنے کی کوشش رہا تھا۔ لیکن عورت ڈبے میں چاروں طرف دیکھنے کے بعد اس سے ی قدر دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔ "موسم بڑا خراب ہو رہا ہے" اس جوان نص نے کہا۔ راؤ کا ساتھی نظر اٹھا کر اس طرح دیکھنے لگا گویا اس سے کچھ بچھا گیا ہے مگر پھر کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

جب نوجوان شخص نے سگریٹ جلایا تو عورت منہ بناتے ہوئے پر اور پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ مرد مسکرا کر سگریٹ پینے لگا۔ عورت کے بال بڑی خوب صورتی سے بنے ہوئے تھے جن میں سے کچھ گھنگریالے بال باہر نکل کر اس کی پیشانی اور گالوں پر جھوم رہے تھے۔ راؤ کو یاد آیا کہ اس نے اپنی بیٹیوں کو بتایا تھا کہ وہ اپنے بال کیسے بنایا کریں۔ ان کی عادتیں، عقیدے، کھانا پکانا، سہیلیاں، پہناوا غرض ان کی ساری باتیں اس کی پسند کے مطابق تھیں۔

اس کے سامنے کونے میں جو بوڑھا بیٹھا ہوا تھا اس نے اپنے بستر کی تہوں میں خاکی فلین کی ایک قمیص باہر نکالی یہ شخص دھاری دار پاجامے اور خاکی فلین قمیص میں راؤ کو ایک مسخرہ دکھائی دے رہا تھا۔ جب بڈھا اپنے تھرماس میں سے تھوڑی گرم گرم کافی ایک پیالی میں ڈالنے لگا تو راؤ کو یاد آیا کہ اس کے صندوق میں بھی تھرماس ہے جن میں چاکولیٹ والا دودھ بھرا ہوا ہے۔ اس نے بھی اپنا تھرماس نکالا۔ یہ چاکولیٹ کا دودھ اسے بہت پسند تھا۔ مگر وہ دن بھر میں دو دفعہ سے زیادہ نہیں لیتا تھا۔ اور وہ بھی ایک وقت میں صرف ایک پیالی

اب موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی ریل کی آواز ہوا کے شور میں گم ہو گئی تھی۔

"کچھ طوفان معلوم ہوتا ہے" نوجوان نے اپنی بیوی سے کہا۔ مگر عورت نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنے اطراف شال کو خوب لپیٹ لیا۔ راؤ کو حقیقت میں موسم کی وجہ سے الجھن ہونے لگی تھی۔

ایک سٹیشن پر ڈبے کا دروازہ ایکا ایک کھل گیا جس کے ساتھ ہی ہوا کا ایک زبردست جھکڑ ڈبے کے اندر گھس آیا۔ ایک عورت اندر داخل ہوئی جس کے کپڑے پھٹے پرانے اور اور بھیگے تھے۔ ڈبے میں احتجاج کا ایک ہمہمہ پیدا ہو گیا۔ لیکن وہ عورت دروازہ بند کر کے چپ چاپ ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ اس کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ بڈھا غصے سے بولنے لگا۔ "جانتی نہیں یہ سیکنڈ کلاس ہے؟"

"اوہ، دیالو، بابوجی تم ایک غریب عورت کو کھڑے رہنے کے لئے تھوڑی جگہ بھی دینا نہیں چاہتے۔ دیالو مائی باپ غریب کو ایک پیسہ دینا۔ بھوکوں مر رہی ہوں آپ سب بڑے اور مالدار لوگ ہیں مجھے معلوم ہے آپ مجھے بھوکوں نہیں مرنے دیں گے۔"

راؤ اسے گھور کر دیکھنے لگا عورت کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جس کو دیکھ کر اسے کچھ غصہ آ رہا تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی وہ سچ مچ کھانے کی محتاج تو معلوم ہو رہی تھی مگر یہ بات یقیناً غلط تھی کہ وہ بھوکوں مر رہی تھی۔ کس مپرسی کے ڈھکوسلوں کے باوجود اس میں ایک خود اعتمادی تھی۔ راؤ کو غریبوں پر اور سماج کے کچلے ہوئے لوگوں پر ترس آتا تھا۔ اصولاً وہ بھیک مانگنے کا مخالف تھا جب وہ عورت اس کے پاس آئی تو اس نے بھیک دینے سے صاف انکار کر دیا وہ مجبوراً وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف پہنچی اور جھک کر بڈھے کے پاؤں پڑنے لگی۔ بڈھے نے بھولے پن سے ہنستے ہوئے اپنا پاؤں ہٹا لیے۔

"اری چل جا جا" اس نے کہا۔

"ایسا مت بولو بابوجی جیسے کھٹور ہیں آپ تو ویسے نہیں ہیں۔ ان میں تو دیا ہی نہیں ہے۔ وہ مجھ جیسی دکھیاری کو بھی جھڑک دیتے ہیں۔"

راؤ نے محسوس کیا کہ عورت نے اس کی ... نہیں ہوگی ...

ہیں بڑا مزہ بھیٹ رہی تھا۔ مگر کیا کرسکتا تھا جو بزہ ہوکر رہ گیا
بتا بیٹھا رہا۔ بڑھا برا الجھا رہا تھا اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا
ایک پیسہ دے کر جان چھڑا لے۔ اور اس کے بدلے اپنے ساتھیو
ناراضی کو چپ چاپ سہہ لے یا اس طرح اسے بکے جانے
نے دوسری دفعہ عورت کو بہت ہی سختی سے دھتکار دیا۔
ن نفرت زدہ گڑگڑانے لگی۔

تو یہ سمجھ کر یہاں آئی تھی کہ مال دار لوگ ہیں مجھے
دل مرتا نہیں دیکھ سکیں گے۔ یہ سمجھی تھی کہ یہاں
دن کا کھانا مل جائے گا تھرڈ کلاس کے غریب آدمی
سے زیادہ دیالو ہوتے ہیں۔ بھیک مانگنے پر
وست کو جھڑکتے نہیں۔ گالی نہیں دیتے۔ وہ لوگ
ابتیا جانتے ہیں۔ ان کے دل میں دیا ہوتی ہے۔"
ران دلچسپی کا مرکز بن گئی تھی راؤ کا ساتھی بھی جو کہ جرائم کا
تھا کتاب بند کرکے اس کو دیکھنے لگا۔ اس کو بھی دلچسپی
"تو کہاں رہتی ہے؟" اس نے عورت سے پوچھا۔
بوجی کہیں بھی نہیں۔ آپ جیسے مالدار لوگ کہیں نہ کہیں
کے بڑے بڑے بنگلے ہوتے ہیں جہاں سے آپ کے
ن کو دھتکار کر بھگا دیتے ہیں۔ مجھ جیسی غریب عورت
ں جسے اپنا کہے۔"
تو بڑی تیز ہے" اس نے راؤ سے انگریزی میں کہا۔
ہ انگریزی میں گالیاں مت دو۔ میں تو ایک غریب

ندھیرا تھا ہوا کا زور بڑھتا ہی جا رہا تھا گاڑی کی
ہو گئی تھی۔ راؤ کے اترنے کی جگہ نزدیک آچکی تھی ان
ہ ستوں کی انجن کا کوئی نہ کوئی آدمی اسٹیشن پر موجود
ڈبے سے باہر نکالنا اس کے لئے ایک مسئلہ بن گیا
چھرے ہوئے سمندر کی طرح چیخ رہی تھی راؤ کو
کے دھماکے صاف سنائی دے رہے تھے۔
ن میاں بیوی کے سامنے بیٹھ کر پھر بک بک کرنے لگی

"یہ میری چھوٹی ماتا جی ہیں یہ چھوٹے باؤجی ہیں۔ چھوٹی ماتی اس غریب عورت پر دیا کرو۔ چھوٹے باؤ کو ایک پیسہ دینے کے لئے کہو۔ ایسا چپ کر کیوں بیٹھی ہو؟ میرے چھوٹے باؤجی سے میری چھوٹی ماتی کا جھگڑا ہو گیا ہے کیا؟ باؤ سگریٹ بہت پیتے ہیں ماتا جی تم انہیں مت پینے دو؟ ادھر ماتی تو ہنسنے لگیں۔"

مرد تو کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ وہ بولا "تو چل کر ہمارے گھر میں نوکر کیوں نہیں ہو جاتی؟ ہم تجھے کھانا کپڑا دیں گے۔"

"اسے کچھ دے دلا کر بڑھا دو۔" نوجوان عورت نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے میری چھوٹی ماتی دیالو ہیں۔ بڑے باؤجی کچھ نہ کچھ دے دیں گے۔ ان کو ستانا اچھا نہیں۔ مجھے معلوم ہے وہ دیالو ہیں۔"

راؤ کے سوا سب نے اسے کچھ نہ کچھ دے دیا۔ اس کی باتوں کا مزہ لے رہے تھے۔ لیکن راؤ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وہ طوفان کے بارے میں اور اپنے اترنے کی جگہ کی نسبت سوچ رہا تھا۔

گاڑی تو رک چکی تھی مگر کچھ دیر تک تو راؤ کو محسوس ہی نہیں ہوا پھر چھتری ہاتھ میں لے کر اس نے دروازہ کھولا تو ہوا نے ایسے زور سے اس کو پیچھے ڈھکیل دیا کہ گرتے گرتے بچا۔ بھکارن نے کہا کہ وہ اس کا سامان نیچے اتار دے گی راؤ نے اس کو منع نہیں کیا اور پلیٹ فارم پر سے بھاگتا ہوا اسٹیشن کے سائبان میں پہنچ گیا۔ بھکارن سامان کے بوجھ سے لڑکھڑاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھی وہاں آکر اس کا سارا سامان ویٹنگ روم میں رکھ دیا۔ اسٹیشن میں کہیں ایک چراغ تک نہیں جل رہا تھا۔ راؤ نے جیب سے کچھ پیسے نکال کر بھکارن کو دے دیئے۔ اگرچہ اس نے پیسے لینے سے پھر بھی انکار کیا تو نہیں لیکن منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ جو راؤ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے لمحہ میں وہ جا چکی تھی۔

راؤ کو پریشانی سی ہو رہی تھی وہ ویٹنگ روم میں چلا گیا اس کا ذہن بالکل خالی تھا ہوا کے اس تیز و تند جھکڑ میں اپنی جگہ کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کے سارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ غیر ارادی طور پر اپنا صندوق کھول کر اس کے اندر ٹٹولنے لگا [illegible] اس کے ہاتھ

ی۔ میں خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کو خیال نہیں تھا
ے کے صندوق میں ٹارچ بھی ہوگی اس کو تو کسی چیز کا بھی خیال نہیں
۔ اس نے گرم کپڑے پہن لئے ایک اونی سوئٹر پہن کر اپنے سر اور کان
ی مفلر لپیٹ لیا۔ اس طرح سردی کا انتظام کرنے کے بعد جاکر کی
ہ گیا لیکن اس کو یہ یاد ہی نہیں رہا کہ صندوق کو قفل لگانا ہے۔ وہ
ش کر رہا تھا کہ جس ناگوار صورت حال سے وہ دوچار ہے اس کو محسوس
نے پائے۔ اب ٹرین کی روشنیاں حرکت کر رہی تھیں اسے یہ خیال
سٹیشن میں کوئی نہ کوئی شخص ضرور موجود ہوگا۔ باہر آ کر دیکھا تو دو
ے سٹیشن کو پار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ راؤ نے انہیں پکارا
دونوں رک گئے۔ ان کے پاس جا کر دیکھا کہ ان میں سے ایک تو
شن ماسٹر ہے اور دوسرا ایک قلی ہے۔

"مجھے بستی میں جانا ہے" راؤ بڑی بے چینی سے بولا "ناممکن
...... درخت گرنے سے سڑک کا چپہ چپہ اٹ گیا ہے۔۔
چیزوں میں گڑبڑ ہے۔۔۔۔ ٹیلیگراف بجلی ہر چیز میں، آپ کو تو رات
ر ویٹنگ روم میں رہنا پڑے گا۔ یہ ریل بھی رات بھر کے لئے اگلے
سٹیشن پر روک لی جائے گی ہم کو اطلاع ملی ہے کہ طوفان بہت بھاری
ہے اور کوئی چھتیس گھنٹوں تک رکنے کا نہیں" "مگر ویٹنگ روم میں
ی دوسرا شخص بھی تو نہیں ہے" "میں کیا کر سکتا ہوں۔ بس اسی
غنیمت سمجھئے"

سٹیشن ماسٹر تو چلتا بنا اور راؤ ویٹنگ روم میں واپس آ کر بڑی
مایوسی سے ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کو یہ خیال تک نہیں رہا کہ کمرے کا
دروازہ جس میں سے بارش اور ہوا کے ریلے اندر آ رہے تھے، بند کر دینا
چاہئے۔ کھڑکیوں کے دو شیشے اب تک اکھڑ چکے تھے ایک نامعلوم خوف
س پر طاری ہو گیا تھا جس کی اذیت برداشت سے باہر تھی۔ آس پاس
ایک متنفس بھی موجود نہیں تھا۔ سٹیشن کے سنسان پن اور طوفان کے۔۔
جوش و خروش کی وجہ سے ایک بھیانک خواب کی سی کیفیت طاری ہو گئی
تھی۔

یکایک اس کو محسوس ہوا کہ کوئی چیز کمرے میں موجود ہے۔ کوئی
دھندلا سا سایہ دروازے سے اندر آتا ہوا دکھائی دیا۔ ٹارچ جلا کر دیکھا تو عورت کی
جھلک نظر آئی۔ پانی میں شرابور ہو جانے سے کپکپا رہی تھی اس کے
گیلے بال چہرے پر چپک گئے تھے۔ چیتھڑوں سے پانی کی دھاریں
بہہ رہی تھیں۔

"دروازہ بند کیوں نہیں کر لیا؟ گرم رہ سکتے تھے نا" جھکاسے
چیخ کر کہا تاکہ راؤ سن سکے۔ راؤ غیر ارادی طور پر اٹھ کر دروازہ بھیڑنے کی
کوشش کرنے لگا۔ وہ عورت بھی اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ مگر ہوا بھی اتنے
جوش سے تھپیڑے لگاتے جا رہی تھی اور دروازے کی چٹخنی تھی کہ کھل کھل
جا رہی تھی۔ پھر ایک دفعہ دونوں نے دروازہ بند کر کے کمرے کا فرنیچر یعنی ایک
خوب چوڑی چکلی میز دو کرسیاں اور ایک لکڑی کی پیٹی کھینچ کر اس سے لگا دی
راؤ کو تعجب ہو رہا تھا کہ اسے دروازہ بند کرنے کا خیال اس سے پہلے ہی
کیوں نہیں آیا۔ اب اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ پہلے کے مقابلے میں وہ
کس قدر محفوظ بھی ہے اور گرم بھی ہے۔ اتنے میں کہیں قریب ایک
ہیبت ناک دھماکہ ہوا۔

"کوئی چیز گری ہے، شاید عمارت کہیں سے گر پڑی ہے۔ کیا طوفان
ہے! ایسا طوفان تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا" وہ عورت کہنے لگی اس کی
آواز میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ راؤ کو اس کی ــــ خود اعتمادی پہ
حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے ٹارچ عورت کی طرف پھیر دی وہ کونے میں
دبک کر بیٹھے ہوئے کپکپا رہی تھی۔ راؤ نے اپنا صندوق کھولا اور اپنی
دھوتیوں میں سے ایک دھوتی نکال کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولا
"یہ باندھ لو" عورت راؤ کی آواز نہیں سن سکی لیکن اس گرم دھوتی کے
لئے اس کی بڑی ممنون تھی۔ وہ دھوتی باندھ کر پھر کونے میں جا بیٹھی۔
راؤ کو بھوک سی معلوم ہو رہی تھی بسکٹ کا پیکٹ نکال کر
کونے میں بیٹھے ہوئے اس دھندلے سایہ کی طرف دیکھنے لگا اسے
خیال ہوا شاید وہ بھی بھوکی ہو۔

"کچھ بسکٹ چاہئیں کیا؟" اس نے عورت سے پوچھا

"کیا کہا" عورت نے چیخ کر پوچھا۔ ان کی آوازیں ہوا کے شور میں
دب گئی تھیں۔ کچھ قریب جا کر اس نے عورت کو تھوڑے سے۔۔
بسکٹ دیئے۔

"میرے پاس کافی ہیں" راؤ نے اس طرح کہا جیسے

معذرت کر رہا ہو۔ وہ واپس آکر اپنے صندوق پر بیٹھ گیا۔ اس عورت کی موجودگی کی بدولت راؤ کو کچھ تسلی ہو رہی تھی۔ اس کی صحت بہت غنیمت تھی اور وہ بھی اپنی جگہ ہر طرح مطمئن نظر آرہی تھی۔ اس عورت کے خیال میں ہر چیز اپنی جگہ صحیح تھی یہاں تک کہ طوفان بھی۔ راؤ سوچ رہا تھا کہ وہ زندگی کی سختی اور اس کی الٹ پلٹ کی عادی ہو گئی۔

اس نے اپنی گھڑی میں دیکھا تو نو بج چکے تھے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں رہتے ہوئے اسے سالہا سال ہو چکے ہیں وہ دل ہی دل میں کہنے لگا کہ اگر دوسرے اسٹیشن کو چلا جاتا تو اچھا ہوتا۔ اسے یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر رہا ہے۔ شہر یہاں سے تقریباً دو میل دور تھا اور دوسرے اسٹیشن سے بھی شہر پہنچ سکتا تھا۔ ایک ناگہانی خوف سے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عمارت بھی گر جائے۔ مگر نکلنے کا جو راستہ ہے اس میں تو فرنیچر اڑا ہوا ہے۔ ہول کے مارے دوڑ کے وہ عورت کے پاس جا کر پوچھنے لگا۔ "کیا تمہارے خیال میں یہ عمارت گر پڑے گی؟"

"کون کہہ سکتا ہے مضبوط تو بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر طوفان بھی اس سے زیادہ زور ہو سکتا ہے۔"

اس کی بات پر بھروسہ تو نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اس کے لہجہ میں ہمدردی اور تسلی تھی۔

وہ واپس جا کر پھر صندوق پر بیٹھ گیا عورت سرک کر ذرا اس کے قریب آ بیٹھی اور کہنے لگی: "میں جہاں بیٹھی تھی وہاں سے ایک دوسرے کی بات نہیں سنائی دیتی تھی۔"

"مجھے معلوم نہیں کہ طوفان اتنا ہیبت ناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"فکر مت کرو" عورت بولی: "ایک کی جگہ ہم دو ہیں جب گاڑی چلنے لگی تھی تو موٹے ٹکٹ کلکٹر نے مجھے بیچ بیچ گاڑی سے باہر دھکیل دیا تھا۔ اس لئے تو میں یہاں ہوں۔ خیر رنج کی کیا بات ہے تم نے گرم کپڑا لو دیا اور پھر کھانے کے لئے بھی دے دیا اگر آگے جاتی تو بڑا اچھا ہوتا جو بھی ہو اس پر صبر کرنا چاہئے پریشان ہونے سے کیا فائدہ؟"

اس کے لہجے میں جس میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا بس یونہی تسلی ہوتی تھی۔ اس کی موجودگی سے راؤ کو الجھن تو ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اس کی عزت کے لئے بڑا شکر گزار تھا۔

"تمہارے کوئی بچے بھی ہیں؟" اس نے پوچھنے کے تو پوچھ لیا مگر سوال کی بے تکلفی کو دیکھ کر اپنے آپ پر جھلانے لگا۔

وہ کسی قدر راؤ کے قریب کھسک آئی تاکہ چیخ چیخ کر بات نہ کرنا پڑے۔

"بچے تو سب کے ہوتے ہیں" مگر اس سے فائدہ کیا میرا باپ ہر وقت پیتا رہتا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اس نے میری ماں کو مار ڈالا ہے۔ میری شادی تو سچ پوچھو کبھی نہیں ہوئی مگر ایک آوارہ بدمعاش آدمی سے میرے دو بچے ہو چکے ہیں۔ یہ شخص کوئی کام کاج نہیں کرتا۔ بس پیتا ہے اور جوا کھیلتا ہے میں اکیلی گھر کا پیٹ پالتی ہوں۔ دونوں بچے ابھی اتنے چھوٹے ہیں کہ بھیک مانگنا نہیں سیکھ سکتے۔ میرا آدمی میری کمائی سے روزانہ چار آنے کی پیتا ہے۔ مگر مجھ سے ڈرتا بہت ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے سامنے آتے ہوئے جو جھینپ جاتا ہے اسی جھینپ کو مٹانے کے لئے پیتا ہوگا۔"

"تم دن میں کتنا کماتی ہو؟"

"کسی دن پانچ روپیہ تک کما لیتی ہوں۔ مگر ہمیشہ نہیں بعض لوگ تو ایک دمڑی تک نہیں دیتے۔ مگر مجھے بھی ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا آتا ہے۔" راؤ نے غیر ارادی طور پر روشنی اس کے منہ پر ڈالی اس نے دیکھا کہ عورت مسکرا رہی ہے۔ وہ اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کو تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ عورت اپنے جسم کو ایک بالکل ہی اجنبی شخص کے حوالے کرتے ہوئے لمحہ بھر کے لئے بھی پس و پیش نہیں کرتی ہوگی۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو" اس نے پوچھا۔ "میں پہلے جتنی اچھی تھی اب نہیں ہوں۔"

اس اشارے پر راؤ کو اس سے بڑی کراہت محسوس ہونے لگی۔ "میں تمہاری صورت نہیں دیکھ رہا تھا، ٹارچ بجھانا بھول گیا تھا۔" یکایک ایک ہیبت ناک دھماکا ہوا۔ فرنیچر کا پشتہ چاروں طرف تتر بتر ہو گیا اور دروازہ کھل گیا۔ دروازے کا ایک تختہ تو چوکھٹ میں سے اکھڑ گیا تھا راؤ نے بھکارن کو اس طرح بھینچ لیا گویا وہی بچنے کا

آخری سہارا تھی دوسرے ہی لمحہ میں اس کے حواس بجا ہوئے تو کچھ جھینپ گیا۔ مگر جب وہ عورت اس کو دمدلنے کے پاس والے کونے میں لے گئی تو وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلا گیا یہاں ہوا اتنی تیز نہ تھی۔ عورت نے اس کو وہاں بٹھایا اور خود بھی اس سے الگ کر بیٹھ گئی اور غیر ارادی طور پر اپنے بازو راؤ کے گرد پھیلا دیتے راؤ کو اس کے جسم کی حرارت سے بڑا آرام محسوس ہو رہا تھا۔

"قریب ہو کر بیٹھو اور اپنے بازو میرے گرد پھیلا دو" وہ بولی:۔ "تمہیں اور گرمی ملے گی" غریب بابو جی! تمہیں تو سر سے پاؤں تک کپکپی چھوٹ رہی ہے"

وہ راؤ کی گود میں گھستی گئی یہاں تک کہ اس کے گرم سینے کا لمس بھی اسے محسوس ہونے لگا۔

وہ باتیں کیے جا رہی تھی "یہ کونا سب سے محفوظ ہے۔۔۔۔۔ ہائے بابو جی کی پیاری پیاری بیٹیاں، بابو جی انہیں کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔۔۔۔۔ میری جھونپڑی تو ہوا میں اڑ گئی ہوگی۔۔۔۔ میرے بچوں کا کیا ہوا ہوگا؟ مجھے تو امید ہے کہ میرے پڑوسی انہیں دیکھ لیں گے۔ میرا آدمی تو اچھا شخص نہیں ہے وہ تو پی کر بے سدھ پڑا ہوگا" راؤ اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا اس کو تو اس عورت کے صرف گرم جسم کا احساس تھا۔ اس نے بڑے ہیجان اور کرب کی حالت میں اسے اپنے آغوش میں گھسیٹ لیا اور اس کے زانو کو نرمی سے تھپک رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ سب کچھ سمجھتی ہے۔ رفتہ رفتہ راؤ کے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا اور اس کے پاؤں بھی سن ہو گئے تھے۔ وہ اپنے ارد گرد کی چیزوں کو پھر محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس عورت کو ہرج کئے بغیر پہلو بدل کر ذرا آرام دہ ڈھب سے بیٹھ گیا اور ٹارچ جلا کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ سو رہی تھی اور نیند میں اس کا چہرہ بہت پاکیزہ اور معصوم دکھائی دے رہا تھا۔

طوفان کا جوش و خروش ابھی تک کم نہیں ہوا تھا لیکن اس کو بڑا آرام اور بڑی تھکن محسوس ہو رہی تھی پھر وہ بھی سو گیا۔

جب وہ جاگا تو بارش ختم ہو چکی تھی لیکن ہوا ابھی اب تیز تھی۔ صبح نمودار ہو رہی تھی اس نے اپنی گھڑی میں دیکھا کہ پانچ بج چکے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تو گھٹنے درد کرنے لگے جب اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں تو دیکھا کہ اس کا پرس غائب ہے۔ اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ بھکارن نے اس کو ٹھگ لیا ہوگا۔ ممکن ہے رات کی گڑبڑ میں کہیں کھو گیا ہو۔ اس نے کمرے میں ڈھونڈ مارا اور پھر پلیٹ فارم پر آیا۔ وہاں ہر طرف توڑ پھوڑ کے آثار تھے اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ شاید وہ شہر سے آ رہے تھے۔ سٹیشن کے دوسرے سرے پر کچھ زخمی آدمی پڑے ہوئے تھے راؤ انہیں دور ہی سے دیکھ کر ایک چونک کر پیچھے ہٹ گیا اس نے اتنے انسانی دکھ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ٹکٹ گھر ڈھ گیا تھا، الماریاں، میزیں، کرسیاں اور دوسرا سارا سامان فرنیچر تتر بتر ہو گیا تھا۔ وہ اس ملبے کو چپ چاپ دیکھتا رہا ابھی ٹکٹ گھر کے اندر اندھیرا تھا۔

جب اس کی نظریں اس دھندلی روشنی کی ذرا عادی ہو گئیں تو اس کو اس ملبے کے نیچے ایک انسانی جسم بے سدھ پڑا ہوا نظر آیا اس طرف اس نے ٹارچ کی روشنی ڈالی یہ تو وہی بھکارن تھی۔

وہ لڑکھڑا گیا جھک کر اس کی پیشانی کو چھوا تو پیشانی ٹھنڈی اور بے جان معلوم ہو رہی تھی۔ بھکارن کا نچلا دھڑ کچل گیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں راؤ کا پرس تھا دوسرے ہاتھ میں کچھ پیسے اور نوٹ تھے اس نے سوچا کہ اس نے یہ پیسہ اور نوٹ یقیناً ٹکٹ بابو کی میز سے نکالے ہوں گے۔ جس کو ٹکٹ بابو جلدی میں چھوڑ کر بھاگ گیا ہوگا۔ وہ جھک کر بار بار اس کی پیشانی کو چومنے لگا۔ رات کی ایک ایک بات اس کو یاد آ رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ پیاری ہستی پڑی ہوئی تھی۔ جس نے اس طوفان میں اس کو اتنا سکھ دیا تھا اور اس کی اتنی ڈھارس بندھائی تھی اور اب وہ اسی طوفان کا شکار ہو کر اس کے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ اپنا بٹوہ چرانے یا ٹکٹ گھر میں چوری کرنے پر اس کو ملامت کرنے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس عورت کو سمجھتا ہے۔ اس عورت نے اس کے دل کے اندر دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا جس سے انسانی محبت کے نغمے پھوٹتے ہیں۔ یہ بھیک مانگنے والی غریب عورت جتنا اس

سے قریب ہوگئی تھی اتنا قریب تو خود اس کی بیوی یا اس کی بہن اور بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

آدازیں کچھ نزدیک آتی جا رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک تو سوچتا کھڑا رہا پھر ایک اچانک ارادے کے ساتھ اس بھکارن کی بند مٹھی کھولی اور پیسے لیکر میز کی کھلی دراز میں ڈال دیئے۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ اپنا پرس واپس لے لے اس عورت کے پاس اس کی کوئی نشانی تو رہنا چاہیئے۔ اس نے احتیاط سے اپنا نام کا کارڈ بٹوے سے نکال لیا اور چلا گیا۔

(بشکریہ "برگ گل")

خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے

احسان دانش

فطرت نے جسے عشق کا غم ساتھ دیا ہے
عرفانِ زر و جاہ و حشم ساتھ دیا ہے
ہر عزم ہے اک قوتِ تخلیق کا اعلان
ہر ضربتِ آذر کو صنم ساتھ دیا ہے
تنہائی گوارا نہیں فطرت کو کسی کی
دل جس کو دیا ہے اسے غم ساتھ دیا ہے
اے قافلہ والو مری ہمت کو سراہو
ہر چند کہ زخمی تھے قدم، ساتھ دیا ہے
چھوڑے ہیں سلگتے ہوئے ناسور نشانی
جس جس نے مرا چند قدم ساتھ دیا ہے
تم رکھ نہ سکے اپنی وفاؤں کا بھرم بھی
تم نے مرا اُمید سے کم ساتھ دیا ہے
احساں خدا جانے کہاں شامِ عدم ہو
ہستی نے تو تا صبحِ عدم ساتھ دیا ہے

(بشکریہ "گلِ خنداں")

حکیم محمد اشرف

عطا کر کے خرد نے تحفۂ دیوانگی مجھ کو
عجب انداز سے بخشا شعورِ آگہی مجھ کو
اگر دینا ہی تھا روزِ ازل ذوقِ خودی مجھ
تو کیوں بخشے گئے یہ سجدہائے بندگی مجھ
نہ جانے کیوں نظر جھک جھک گئی فرطِ ندامت سے
نظر آیا جو ننگِ آدمیت آدمی مجھ کو!
یہ کس ظالم نے کی تنقیہ میری آہِ سوزاں
بدلنی پڑ گئی ہر رسمِ طرزِ عاشقی مجھ
نگارِ زیست کیا شے ہے دکھاتا تجھ کو میں اشرف
بقدرِ ذوق گر ملتا — مذاقِ زندگی مجھ کو

از نسیم صدیقی •

آنے والی سحر کا تصوّر لئے

آنے والی سحر کا تصور لئے
کتنی ویران راہوں سے گذرا ہوں میں
کتنی سنسان راہوں سے گذرا ہوں میں
کتنی راتوں کے دامن پہ خوں ہے مرا
کتنی شمعوں کی لَو پہ جوانی جلی!

★

میں جلاتا رہا آنسوؤں کے دیئے
رات ہنستی رہی مُسکراتی رہی
میں تھکا ہارا راہی تھا چلتا رہا
راستے کتنی زنجیریں لاتے رہے
میری نَے مجھ سے ہر بار چھنتی رہی
میں بہاروں کے خوابوں میں کھویا رہا
خواب جلتے رہے، رات ہنستی رہی!

بارہا میں نے مہتاب کے جام میں
آنے والی سحر کی جبیں دیکھ کر
اپنے خوابیدہ بربط کو آواز دی
خواب پھر جل گئے، رات پھر ہنس پڑی
میرا مشرق اندھیروں میں پھر کھو گیا

★

آنے والی سحر کا تصور لئے
آج بھی اپنے بربط پہ میں گا رہا ہوں
آج بھی میری پلکوں پہ کچھ خواب ہیں
آج بھی غم کی اس رات میں جی رہا ہوں
صبح آنے سے پہلے میں مرنا نہیں چاہتا
صبح آنے سے پہلے میں مرنا نہیں چاہتا
خواب جل جل کے میرے نکھرتے رہیں گے!

★

ڈاکٹر وزیر آغا •

تخلیق اور تنقید

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ تخلیقی ادب اور تنقیدی ادب کے مابین ایک کشادہ خلیج حائل ہے یعنی بنیادی طور پر تخلیقی ادب لاشعوری عمل سے معرض وجود میں آتا ہے اور تنقیدی ادب نقاد کی ذہنی صلاحیت اس کی سوجھ بوجھ اور شعوری عمل کا نتیجہ ہے۔ دوسرے جہاں تخلیقی ادب زندگی سے اپنا مواد حاصل کرتا ہے اور خارجی زندگی اور مصنف کی داخلی دنیا کی کش مکش اور آویزش کا آئینہ دار ہے وہاں تنقیدی ادب اپنی تگ و تاز کے لئے تخلیقی ادب کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ اس لئے تخلیقی ادب کی حیثیت اس فوج کی سی ہے جس کا کام ایک منہ زور جذبے کے تحت کسی نئی سرزمین کو پامال کرتے چلے جانا ہے اور تنقیدی ادب کا منصب اس منتظم کا سا ہے جس کا کام اس فتح کی حدود کا جائزہ لینا اور فوج کے مجموعی کارنامے میں ترتیب اور آہنگ پیدا کرنا ہے ——— لیکن کیا تخلیقی ادب اور تنقیدی ادب کی یہ حد فاصل اتنی ہی واضح اور ناقابلِ عبور ہے؟ اس سوال کا جواب اس صورت میں ممکن ہے کہ تخلیقی ادب اور تنقیدی ادب کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھنے کی سعی کی جائے کہ ان کی تعمیر کن کن عناصر کی رہین منت ہے۔

بادی النظر میں تخلیقی ادب دو چیزوں سے مرتب ہوتا ہے — مواد اور اسلوب! بالعموم یہ کہا گیا ہے کہ اگر مواد میں کوئی نیا پن ہے اور انداز پیش کش میں ندرت تو اس کا نتیجہ تخلیقی ادب کی صورت میں نمودار ہوگا بصورت دیگر ایک ایسی تقلیدی کاوش معرض وجود میں آئے گی جس کا تخلیق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوگا۔ لیکن کیا تخلیقی ادب کی یہ توضیح درست ہے۔ کیونکہ یہ کہنا کہ فنکار کوئی نیا مواد تخلیق کرتا ہے درحقیقت ایک غلط بیانی ہے مواد تو وہ زندگی سے حاصل کرتا ہے۔ چاہے بالواسطہ انداز سے حاصل کرے یا بلاواسطہ انداز سے اور حقیقت یہ ہے کہ مواد وہاں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ رہا اسلوب کا سوال تو یہاں بھی بالعموم

مطالب کے لئے وہ نہ صرف زبان و ادب کی صلاحیتوں سے کما حقہٗ فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ متقدمین اور معاصرین کے انداز تحریر سے بھی متاثر ہوتا ہے غالباً یہ کہنا درست نہیں کہ فنکار کا انداز بیان سراپا ایک تخلیقی عمل ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی صرف اسی کے ذہنی عمل کے مرہون ہیں۔

اگر یہ بات ہے تو پھر تخلیقی عمل کی صورت کیا ہوئی۔ صحیح تخلیقی عمل شاید صرف ایک بار رونما ہوا تھا یعنی جب خدا کائنات کو عدم سے وجود میں لایا تھا۔ اگرچہ اس بارے میں بھی بعض لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں اور ان کا خیال ہے کہ عناصر پہلے سے موجود تھے، خدائے لایزال نے ان عناصر میں صرف ایک ربط پیدا کر دیا اور اس کا یہ عمل تخلیق کائنات کا عمل قرار پایا۔ یہ سوال کہ عناصر کو کس نے پیدا کیا یا یہ کہ خدا کی تخلیق کیونکر ہوئی نہ صرف موجودہ بحث سے خارج ہے بلکہ ہمارے محدود فکر و ادراک کا نتیجہ ہے کیونکہ تخلیقی عمل سے ہم آشنا ہیں اس میں خالق کے وجود کے ساتھ ساتھ تخلیق کے مواد کا پہلے سے موجود ہونا ایک لازمی شرط ہے اور ضروری نہیں کہ یہ اصول کائنات کی لامحدود اور لازوال وسعتوں میں بھی کارآمد ثابت ہو۔

بہرحال جہاں تک انسانی ماحول کا تعلق ہے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہاں تخلیق سے مراد وہ خالص تخلیق نہیں جس کا مواد پہلی بار معرض وجود میں آتا ہے بلکہ یہاں "تخلیق" محض اسی عمل کا نام ہے جس کے ذریعے اشیا یا کیفیات میں ایک ربط پیدا کیا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں یہاں کوئی شخص کسی چیز کو تخلیق نہیں کرتا بلکہ محض دو چیزوں کے مابین ایک ایسا ربط پیدا کرتا ہے جو اس سے قبل پیدا نہیں ہوا تھا۔ مگر شاید یہ کہنا بھی درست نہیں کہ وہ دو چیزوں کے مابین کوئی ربط "پیدا" کرتا ہے کیونکہ درحقیقت یہ ربط تو پہلے ہی سے قائم ہوتا ہے چنانچہ ہمارا تخلیقی عمل ایک قدم اور سمٹ آتا ہے جب ہم

یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں دو اشیا کے مابین کوئی نیا ربط پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ محض اس ربط کو "دریافت" کیا جاتا ہے جو اشیا کے مابین پہلے سے موجود تھا۔ اور یہ "دریافت کرنا" جو اپنے نتیجے کے طور پر حیرت و استعجاب کو جنم دیتا ہے، بحیثیت مجموعی ہمارا تخلیقی عمل قرار پاتا ہے۔

ادب میں تخلیقی عمل کے مزاج سے پوری طرح واقف ہونے کے لئے تخلیق کی سادہ ترین صورت یعنی تشبیہ یا استعارے کا جائزہ ضروری ہے۔ بنیادی طور پر تشبیہ یا استعارے کے اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو پورے تخلیقی عمل میں کارفرما ہوتے ہیں یعنی یہاں بھی دو اشیا کے مابین ایک ایسا ربط دریافت کیا جاتا ہے جو اس سے قبل دریافت نہیں ہوا تھا۔ مثال کے طور پر "آتش گل" کی ترکیب کو لیجئے کہ یہاں آتش اور گل کا ربط باہم دریافت ہوا ہے۔ فنکار کی اس دریافت سے قبل بھی یہ اشیا اپنی اپنی جگہ موجود تھیں اور ان میں ایک مشابہت قائم بھی تھی لیکن یہ فنکار کا کام ہے کہ اس نے سب سے پہلے اس مشابہت کو دریافت کیا۔ چنانچہ اس کا یہ عمل تخلیقی عمل قرار پایا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ فنکار جب پھول کو دیکھ رہا تھا اور اس کے حسن تازگی اور رنگ سے محظوظ ہو رہا تھا تو دراصل ایک محدود ماحول میں مقید تھا اور اس کی حیثیت ایک عام ناظر سے ہرگز مختلف نہیں تھی۔ لیکن جب پھول کو دیکھتے دیکھتے اسے اچانک آگ کا خیال آیا تو اس نے گویا ایک ہی زقند میں اپنے محدود ماحول کی دیواروں کو پھلانگ کر ایک نئے ماحول سے رشتہ استوار کر لیا۔ نتیجۃً ایک ایسی نئی کیفیت معرض وجود میں آئی جو اس سے قبل موجود نہیں تھی۔ غور کریں تو فنکار کی یہ ذہنی زقند ہی وہ لاشعوری عمل تھا جو تخلیق کا باعث ثابت ہوا اور جس کے طفیل اسے خود اور بعد ازاں اس کے ناظر کو خوشگوار حیرت کے قیمتی لمحات ارزانی ہوئے۔

بنیادی طور پر ادب میں تخلیق کا عمل تشبیہ یا استعارے کے تخلیقی عمل سے مختلف نہیں ہوتا لیکن جزئیات کو مدنظر رکھیں تو بات وضاحت طلب ہو جاتی ہے کیونکہ جہاں تشبیہ یا استعارے کی تخلیق دو مختلف اشیا میں ایک ربط باہم سے عبارت ہے وہاں ایک ادب پارہ دو ذہنی منازل کے اتصال کا نام ہے۔ ان منازل میں سے ایک تو وہ ہے جہاں روزمرہ کی زندگی اپنے مخصوص حالات و واقعات کے ساتھ سطحیت میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے اور جس سے ایک عام انسان ہر لحظہ نبرد آزما ہوتا ہے اور دوسری وہ جو سطحی زندگی کے پس پشت ایک بحر بے کنار کی طرح پھیلی ہوتی ہے اور جس طرف عام انسان صرف مخصوص حالات مثلاً شدید غم، موت سے قربت یا شدید ناکامی کی صورت میں رجوع کرتا ہے۔ فنکار کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ اسے ان دونوں منازل کے وجود کا دائم احساس ہوتا ہے اور وہ ایک تخلیقی دباؤ کے تحت ان دونوں منازل کی حدود و انضمام کو دریافت کرنے کی ایک سعی مسلسل میں گرفتار رہتا ہے۔ اپنے اس عمل میں وہ پوری طرح تو کامیاب نہیں ہوتا۔ البتہ اس عمل کے دوران میں تخلیق کے ایسے شرارے ضرور پیدا ہوتے ہیں جو مثلاً بجلی کے دو تاروں کے اچانک مل جانے سے وجود میں آتے ہیں اور جو دراصل اس کے پیش کردہ ادب کے تخلیقی عناصر قرار پاتے ہیں۔

تخلیقی عمل کی مندرجہ بالا توضیح سے اہم ترین نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ فنکار کا عمل ان معنوں میں تخلیقی نہیں جن کے تحت ہم مثلاً خدا ر لایزال کے تخلیقی عمل سے روشناس ہوتے ہیں بلکہ یہاں تخلیقی عمل سے مراد محض اشیا یا کیفیات میں ایک ربط باہم کی دریافت ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو فنکار گویا زندگی میں ربط و تسلسل کا محافظ ہی نہیں بلکہ اس کا مدعی بھی ہے اور وہ شعوری طور پر ماحول کے انتشار کے باوجود یک جہتی اور اتفاق کا علم بردار ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا تخلیقی عمل نفرت کی بجائے محبت کا پرچار کرتا ہے۔ علاوہ ازیں تخلیقی عمل کے دوران میں جب فنکار زمانہ حال کی زندگی کو اپنے باطن کی اس زندگی سے مربوط کرتا ہو جو طبعی رجحانات اور پوشیدہ جبلی محرکات کی صورت میں اس کے نفس لاشعور پر مسلط ہے تو گویا وہ نسل آدم کے آولین علم بردار اور زمانہ حال کے ترقی یافتہ انسان کی احساسی اور جذباتی زندگیوں میں ایک ربط دریافت کر کے نسل آدم کے فطری تسلسل کو بھی نمایاں کرتا ہو ــــــ لیکن اشیا یا کیفیات کا یہ ربط باہم جو کبھی تو منتشر عناصر کی یک جہتی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی زندگی کے مادی اور روحانی تسلسل کا احساس دلاتا ہے، دراصل فن کار کے شخصی ردعمل کا رہین منت ہوتا ہے۔ یہ شخصی ردعمل اس غواصی کا دوسرا نام ہے جس کی مدد سے کوئی فنکار چھلکتی، بل کھاتی ہوئی موجوں اور سمندر کی پُر سکون تہ میں اتر دریافت

کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کرتا ہے یہ سوال کہ شخصی ردِ عمل کن عناصر سے مرتب ہوتا ہے بحث کو غیر ضروری طور پر طول دینے کے مترادف ہو، تاہم اشارتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تشکیل میں ذوقِ نظر کے علاوہ وہ تخلیقی دباؤ بھی حصہ لیتا ہے جس کے وجود سے تو ہم آشنا ہیں لیکن جس کے پر اسرار طریق کار کے بارے میں ہماری معلومات کچھ زیادہ قابلِ فخر نہیں۔

ادب میں تخلیقی عمل کی اس بحث سے ایک اور نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ فنکار نہ صرف اصل مواد کے لئے خارجی زندگی اور سماج کا دست نگر ہے بلکہ اپنے تخلیقی دباؤ کی تسکین کے لئے زبان اور اسلوب کا سہارا لیتا ہے دوسرے لفظوں میں تخلیقی ادب کا ڈھانچہ ان الفاظ سے تعمیر ہوتا ہے، جو سوسائٹی کے اجتماعی عمل سے معرضِ وجود میں آ چکے ہیں اور فنکار کا مخصوص فنی اندازِ پیش کش جو بظاہر ایک خالص اجتہادی کارنامہ ہے، دراصل مختلف ادبی اسالیب کے اجتماع ہی کا نام ہے تخلیقی ادب میں روایت کا یہ اثر ایک ایسی بین حقیقت ہے کہ اسے مثالوں سے واضح کرنے کی ضرورت نہیں

مواد اور اندازِ پیش کش کے علاوہ کسی تخلیقی ادب پارے کی روح بھی اپنے زمانے کی آواز ہوتی ہے گویا ہر زمانے کا ایک مخصوص اندازِ فکر، ایک مخصوص "مزاج" ہوتا ہے جسے افراد کی اجتماعی، روحانی اور احساسی کاوشیں منظرِ عام پر لاتی ہیں۔ فنکار اپنے زمانے کا سچا نمائندہ ہونے کی صورت میں اس اندازِ فکر کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کی تخلیق میں روحِ عصر کروٹیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بے شک بعض فنکار اپنے زمانے سے کئی قدم آگے بھی ہوتے ہیں اور ان کی فکر میں بلندی زمانے کی فکری بلندی سے متمائز اور علیحدہ بھی دکھائی دیتی ہے، تاہم حقیقت یہ ہے کہ اپنے ہی زمانے کی ان پوشیدہ فکری اور احساسی کروٹوں کی ترجمانی کرتے ہیں جو تھوڑی ہی مدت میں ایک نمایاں "تحریک" کی صورت میں نمودار ہوتی اور نئے زمانے کی ایک "نئی آواز" قرار پاتی ہیں۔ ہمارے اپنے ادب میں غالب ایک ایسے شاعر ہیں جو ایک محصوص ماحول میں مقید ہونے کے باوجود اس فکری تموج کے ترجمان ہیں۔ جو ان کے زمانے کی ذہنی سطح کے نیچے ہوتے ہوئے بیدار ہو رہا تھا اور جو درحقیقت آنے والے فکری طوفانوں کا پیش خیمہ تھا۔ دورِ جدید میں غالب کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

ادب میں تخلیقی عمل کے اجزائے ترکیبی سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں تنقیدی ادب کی پرکھ کے سلسلے میں بھی مفید ثابت ہو سکتے ہیں یعنی ان کی روشنی میں یہ دیکھنے کی سعی کی جا سکتی ہے کہ تنقیدی ادب میں کہاں تک تخلیقی عناصر کارفرما ہوتے ہیں، مگر اس سلسلے میں سب سے پہلے تنقیدی عمل کی توضیح ضروری ہے۔ بنیادی طور پر تنقید کا کام جائزہ و تجزیہ ہے اس مقصد کے ساتھ کہ فن پارے کے عیوب و محاسن واضح طور پر ہمارے سامنے آ جائیں اور ہم فن پارے کے ادبی مقام کا تعین کر سکیں۔ دوسرے ادب کا تاریخی جائزہ لیا جائے تاکہ نہ صرف اصنافِ ادب کے تدریجی ارتقا کی داستان پوری طرح پڑھی جا سکے بلکہ مختلف ادبی ادوار کی حدود بھی متعین کی جا سکیں لیکن اگر تنقید کا مقصد اور اس کا طریق کار محض یہی ہو تو پھر نقاد اور مورخ کی کاوشوں میں کوئی نمایاں حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہوگا کیونکہ مورخ بھی نقاد ہی کی طرح نہ صرف کسی خاص دور کے امتیازی نشانات کو واضح کرتا ہے، بلکہ مختلف تاریخی ادوار کی حدود بھی متعین کرتا ہے۔ لیکن نقاد اور مورخ کے طریق کار میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ جہاں مورخ کا کام غیر شخصی انداز سے واقعات و تحریکات کا جائزہ لینا اور حقائق کو مجتمع اور مرتب کرنا ہے اور وہاں نقاد کے طریق کار میں ایک سلجھے ہوئے ذوقِ نظر کے نشانات صاف دکھائی دے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نقاد کے طریق کار میں نقد الادب کے اصول و ضوابط کی پیروی کے باوصف ذوقِ نظر کا عنصر زیادہ اہم ہوتا ہے اور چونکہ ذوقِ نظر ایک خالص انفرادی اور شخصی ردِ عمل ہے اس لئے بحیثیت مجموعی تنقیدی ادب تاریخی جائزے کی بہ نسبت کہیں زیادہ تخلیقی عناصر کا آئینہ دار ہے۔

تنقید میں شخصی ردِ عمل کا یہ عنصر فنکار اور نقاد کو تخلیقِ ادب کے سلسلے میں ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے چنانچہ جس طرح تخلیقی ادب میں مختلف عناصر کے ربطِ باہم کی دریافت ایک تخلیقی رو کی رہینِ منت ہوتی ہے اسی طرح تنقیدی ادب میں ربط و تسلسل کی دریافت کا سلسلہ شخصی ردِ عمل سے بڑی حد تک تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اچھا نقاد نہ صرف مختلف ادوار کی ادبی تخلیقات کے پس پشت ایک ذہنی اور احساسی تسلسل کو نمایاں کرتا اور یوں روایت کے مسلمہ اصول اور تجربے کے باغی عناصر میں ایک ربط دریافت کر کے ادب کے تدریجی ارتقا کو واضح کرتا ہے بلکہ مختلف ادوار کے ادبا کو بھی ذہنی اور احساسی

ہو سکے گی کہ ایک ادبی خدمت سرانجام ہو جاتی ہے۔ بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہا جا سکتا ہے کہ نقاد جب کسی فنکار کی تخلیقات کا جائزہ لیتے وقت اسے ادب کے تسلسل کی ایک کڑی ثابت کرتا ہے تو دراصل ویسا ہی کام سرانجام دیتا ہے جو وہ ذہنی منازل کے اتصال سے کسی فنکار کو ارزانی ہوتا ہے اور جسے ہم ایک تخلیقی کارنامہ قرار دیتے ہیں لیکن شاید اس ضمن میں نقاد کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ یہ ہے کہ وہ فنکار کی تخلیق اور عصر حاضر کی مخفی تحریکات میں ایک ربط دریافت کر کے ناظرین کو ویسا ہی جمالیاتی حظ مہیا کرتا ہے جو اسے تخلیقی ادب کے بعض مقامات پر حاصل ہوتا ہے۔ اردو کے تنقیدی ادب سے اس کی ایک مثال لیجئے۔ خورشید الاسلام اپنے مضمون بعنوان "فسانۂ آزاد" مطبوعہ اردو ادب علی گڑھ ۱۹۵۱ء میں رقم طراز ہیں:-

"اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزاد وہ نیا انسان ہے جو سرشار کے زمانے میں ابھر رہا تھا وہ پرانی تہذیب کو خوجی کے روپ میں دیکھتا تھا اور اسے اپنی تنقید اور ظرافت کا نشانہ بنانے کی اہلیت اور حق رکھتا تھا۔ اس حد تک کہ اس کے ذہنی اور خارجی عمل میں توازن ہے اور اس دائرے میں آزاد کی سیرت اور اس کی ہیئت فنی اعتبار سے زندہ اور کامیاب نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں آزاد کی شخصیت سرشار کی داخلی دنیا اور معاشرت کی حقیقت، دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں لیکن آزاد یعنی اس دور کا ابھرتا ہوا انسان تنقید ہی کی نہیں عمل کی صلاحیت بھی رکھتا تھا، مگر ابھی تک اس کے عمل کی راہیں متعین نہیں ہوئی تھیں ——— اس نئے آدمی نے ماضی کو اچھی طرح نہیں پرکھا تھا۔ اس لئے اپنی زندگی میں چند نئی سچائیاں تو ضرور شامل کر لی تھیں لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ان کا دوسری سچائیوں سے کیا علاقہ ہے اور ماضی حال کے مقابلے میں کیوں بے جان ہے۔ وہ نئی تہذیب پر ایمان تو لے آیا تھا لیکن یہ تہذیب مربوط شکل میں اس کے سامنے نہیں آئی تھی ——— نئے دور کا آدمی آزاد کے روپ میں جس حقیقت کو پیش کرتا ہے وہ سنجیدہ ہے لیکن اس میں وہ مبالغہ ہے جو ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ حقیقت نئی ہے لیکن ماضی کے سامنے سے آزاد نہیں ہوتی ہے۔ یہ عقل کی آزادی پیدا کرتی ہے لیکن عمل کی راہیں متعین کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی ہے یہ ترانہ ہے لیکن ابھی نغمہ اس نے خود کو تنقید کے سہارے منوایا ہے جو پرانی حقیقت سے متصادم ہوتی اور اس کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیتی ہے لیکن ابھی تک گرد و پیش کی فضا میں خود کو اجنبی سا پاتی ہے۔ خوجی پرانی حقیقت کا زندہ پیکر ہیں، آزاد نئی حقیقت کے ترجمان ہیں۔ ماضی اپنی حدود میں واضح ہے وہ ظرافت کا نشانہ ہے۔ نئی حقیقت ابھی اپنے لئے امکانات کی تلاش میں ہے اور اسی لئے پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ خوجی کی سیرت اپنے اخلاقی اور ذہنی محرکات اور سماجی عوامل کے ساتھ نئے زمانے سے متصادم ہو کر فنی خوبیوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے لیکن آزاد ابھی تک شک میں گرفتار ہے وہ متوازی نہیں ہے اور ایک نصب العین کو ماننے کے باوجود اپنے ماحول کے بارے دبا ہوا ہے۔"

مندرجہ بالا نکتے کی ضمن میں یہ اقتباس بہت مفید ہے کیونکہ بظاہر تو یہ ایک اردو تخلیق یعنی فسانۂ آزاد پر محض تنقید ہے۔ تاہم اس تنقید میں خورشید الاسلام صاحب نے سرشار کے دو اہم کرداروں ——— خوجی اور آزاد کو ایک بالکل نئے پس منظر میں پیش کر دیا اور ان کرداروں اور ان کے زمانے کی بعض مخفی تحریکات کے مابین ایک ایسا ربط دریافت کیا ہے جو نہ صرف اس زمانے کے ناظرین کی نگاہوں سے اوجھل تھا بلکہ جس کی طرف دور جدید میں بھی توجہ نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے۔ اگرچہ سرشار کے یہ کردار ان کے اپنے زمانے کے بعض رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ تاہم خود سرشار کے ہاں ان کے کرداروں کو "علامت" کے طور پر پیش کرنے کا کوئی رجحان نہیں تھا اور نہ ان کرداروں کی تخلیق کسی ایسے شعوری مقصد کے تابع ہی تھی۔ سرشار ایک فنکار تھے۔ انھوں نے نہایت قریب سے اپنے ماحول کا مشاہدہ کیا تھا اور ایک فنکارانہ انداز سے اپنے کردار پیش کر دیئے تھے۔ چنانچہ ان کرداروں کی تخلیق سرشار کا ایک ایسا تخلیقی کارنامہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ کارنامہ خورشید الاسلام صاحب ہی کا ہے کہ انھوں نے خوجی کو پرانی حقیقت یعنی ماضی کے زندہ پیکر میں اور آزاد کو اس نئے انسان کے پیکر میں دیکھا جو سرشار کے زمانے میں ابھر رہا تھا اور یوں سرشار کی تخلیق اور اس زمانے کی مخفی تحریکات میں ربط دریافت کر کے خود بھی ایک تخلیقی کام سرانجام دیا۔

اور میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ نقد الادب کا مزاج تخلیقی ادب کے مزاج سے ایک حد تک مطابقت رکھتا ہے اور اس نکتے کی وضاحت کے لئے اردو کے تنقیدی ادب سے ایک مثال بھی دی ہے اب مجھے یہ کہنا ہے کہ تنقید اپنے خالص ادبی اندازِ پیش کش کے طفیل بھی تخلیقی ادب سے ہم آہنگ ہے البتہ اس نکتے پر آرا میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ تنقید کے انداز میں ادبی حسن کی آمیزش ضروری نہیں اور چونکہ تنقید کا مقصد محض صاف اور سیدھے طریق سے نقاد کے مافی الضمیر کو ناظر تک منتقل کرنا ہے لہٰذا اگر یہ سپاٹ اور بے رنگ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس نظریئے سے اختلاف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب ہم "تنقیدی ادب" کے الفاظ لکھتے ہیں تو لامحالہ تنقید کے ساتھ ادب کی شرط بھی لگاتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی تنقیدی مضمون حسین اور ادبی اندازِ پیش کش کا نمونہ ہے تو گویا یہ دوہری خصوصیت کا حامل ہے اور اس کے زندہ رہنے کے نسبتاً زیادہ امکانات ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ تنقیدی نظریات میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ مدت کے بعد کسی نقاد کے نظریات محلِ نظر قرار پائیں۔ ایسی صورت میں جو باتیں اس کے پیش کردہ تنقیدی ادب کو زندہ رکھ سکتی ہیں۔ وہ نقاد کا پُر خلوص شخصی ردِ عمل اور دلکش انداز بیان ہیں کہ دراصل یہی تخلیقی ادب کے زندہ رہنے والے عناصر ہیں۔

میں یہاں تک ہی لکھنے پایا تھا کہ مجھے اپنے کرمفرما مولانا صلاح الدین احمد کا وہ مکتوب موصول ہوا جس میں انھوں نے میرے استفسار پر مسئلہ زیرِ بحث کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے اور جس سے میرے نظریئے کی تائید ہوتی ہے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

> "آپ نے تنقید اور تخلیق کی نسبت میری رائے دریافت کی ہے مجھے اس مسئلے پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا، لیکن آپ نے بے محابا پوچھ لیا ہے اور میں بھی بے محابا یہ جواب دیتا ہوں کہ تنقید اگر تخلیق نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ تنقید عیب جوئی کا نام نہیں ہے بلکہ نکتہ رسی کے ایک وسیع تصور کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ تصور جتنا نادر اور بیکراں ہوگا اپنے اظہار کے لئے ویسا ہی جامہ لباس بھی طلب کرے گا۔ میں یہاں بھی تحریکِ احساس و خیال قدرتِ اظہار کی محتاج ہوتی۔ اور قدرتِ اظہار ہی ادبی تخلیق کی بنیاد ہو۔"

بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پُر خلوص شخصی ردِ عمل اور ندرتِ اظہار ہی تخلیقی ادب کے بنیادی عناصر ہیں۔ لیکن تمام اصناف ادب میں یہ عناصر یکساں انداز سے نمودار نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر شاعری اور خاص طور پر داخلی شاعری ایک نسبتاً زیادہ تخلیقی عمل ہے کہ اس میں نہ صرف شخصی ردِ عمل واضح زیادہ ہوتا ہے بلکہ اس کا تار و پو بھی سرتاپا ندرتِ اظہار کا رہینِ منت ہے۔ شاعری کے مقابلے میں افسانہ یا ڈرامہ ایک نسبتاً کم تخلیقی عمل ہے کہ یہاں کرداروں کی پیش کش، پلاٹ کی تعمیر اور مرکزی نکتہ کی وضاحت ایک حد تک فنکار کے شعوری عمل کی مرہون ہوتی ہے۔ فکشن سے کم تخلیقی عمل تنقید ہے۔ کہ یہاں نقاد کی سوجھ بوجھ ذہنی صلاحیت اور ذہنی مطالعہ ہی استخراجِ نتائج کے لئے معاون ثابت ہوتا ہے۔ تاہم یہ بات واضح ہے۔ کہ ان تمام اصناف میں پُر خلوص شخصی ردِ عمل اور ندرتِ اظہار کے عناصر کسی نہ کسی حد تک موجود ضرور ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ عناصر ہیں جو ادب کو دوسرے علوم سے جدا کرتے ہیں۔

(بشکریہ "ادبِ لطیف")

التماس ہے کہ ــــــ

اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے۔ بغیر پتہ کے کوئی نگارش قابلِ قبول نہ ہوگی۔ نیز ادارۂ "مشیر" ناقابلِ اشاعت ۔۔۔ مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے انکی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ (منیجر)

کوثر نیازی •

کب زمانے کی اداؤں کا گلہ کرتے ہیں
ہم فقط اپنی خطاؤں کا گلہ کرتے ہیں

پرِ پرواز نہیں ہے تو بنام تقدیر
آج شہباز فضاؤں گلہ کرتے ہیں

آگ لگجائے نہ اُن سے کہیں گلشن گلشن
باغباں میری نواؤں کا گلہ کرتے ہیں

نہ ہوئی اُن سے کبھی غیر کی دریوزہ گری
بادشہ تیرے گداؤں کا گلہ کرتے ہیں

شہرِ مادر ہے کہ ہے یہ نئی تہذیب کا زہر
کتنے بچے ہیں جو ماؤں کا گلہ کرتے ہیں

پہلے پیدا تو کریں ذوقِ سفر اے کوثر
لوگ کیوں راہنماؤں کا گلہ کرتے ہیں

قابل اجمیری •

جہانِ آرزو آواز ہی آواز ہوتا ہے
بڑی مشکل سے جہاں شکست ساز ہوتا ہے

ہجوم یاس میں اپنا عجب انداز ہوتا ہے
ہنسی فریاد ہوتی ہے سکوت آواز ہوتا ہے

محبت کی حقیقت کھل گئی چاک گریباں سے
جنوں بھی ایک منزل میں زمانہ ساز ہوتا ہے

ہمیں کیا آپ انجام محبت سے ڈراتے ہیں
ہمارے خون سے ہر دور کا آغاز ہوتا ہے

جنوں کو پیار آجائے خرد قربان ہو جائے
محبت کے گنہگاروں کا وہ انداز ہوتا ہے

تری آواز کے قرباں تری رفتار کے صدقے
کبھی دل کے دھڑکنے کا یہی انداز ہوتا ہے

قفس ہے دام ہے بھڑکی ہوئی ہے آتشِ گل بھی
اسی ماحول میں اندازہ پرواز ہوتا ہے

پگھل جاتی ہیں زنجیریں سلگ اٹھتی ہیں دیواریں
لبِ خاموش میں وہ شعلۂ آواز ہوتا ہے

ہمیں پر منحصر ہے رونقِ بزمِ جہاں قابل
کوئی نغمہ ہو اپنا ہی رہینِ ساز ہوتا ہے

(بشکریہ نئی قدریں)

قیصرہ نظمی

ہو رہا ہے چمن میں یوں محسوس!!
پھول جیسے خزاں سے ہوں مانوس
غم بھی وجہ سکون ہے لیکن،
کر رہا ہوں تری کمی محسوس
ہر طرف بڑھ رہی ہے تاریکی!!
پھر بھی منزل سے میں نہیں مایوس
وہ یقیناً عظیم انساں ہے
دھڑکنِ وقت جو کرے محسوس
یوں اچانک ترا خیال آیا
دور جیسے کہیں جلے فانوس

اصغر مینائی

ہوا برباد ہر لحظہ سکونِ دل تو کیا ہوگا!۔
پریشاں ہو گیا شیرازۂ محفل تو کیا ہوگا

چلا ہی جانبِ مقتل شہادت کا جنوں لیکر
اگر بسمل سے برگشتہ رہا قاتل تو کیا ہوگا

لہو کے سرخ چھینٹے کہہ رہے ہیں خاک میں ملکر
ادھورہ رہ گیا افسانۂ بسمل تو کیا ہوگا

ہمارا ذکر ہی کیا ہم پہ جو گذری ہے گذری ہے
ہوا اُن کو جو احساسِ شکستِ دل تو کیا ہوگا

بھروسہ کر لیا ہی رہبروں کی راہنمائی پر
غلط نکلا اگر اندازۂ منزل تو کیا ہوگا

خزاں کی ظلمتیں لکھی ہیں تقدیرِ گلستاں پر
بہاروں پر اگر دل ہو گیا مائل تو کیا ہوگا

کنارے کے تجسس میں ہے ابتک ناخدا اصغر
بہ آغوشِ تلاطم ہی رہا ساحل تو کیا ہوگا

زہرہ جمال •

غنڈہ، دوست، بھائی!

وہ موٹا تازہ تھا۔ چھ فٹ کا چوڑا چکلا، ہٹا کٹا آدمی، بڑی بڑی مونچھیں میان سے نکلی ہوئی تلواروں کی طرح ہونٹوں کی ہر جنبش پر تن سی جاتیں۔ پان کی سرخی سے رنگے ہوئے دانت اور زبان! وہ قریب ہو اور پورا منہ کھول کر قہقہہ لگائے تو ایسا لگتا تھا جیسے پیک سے بھرے ہوئے اگالدان میں بہت سے کنکر اور مٹی ڈال کر رگڑا جا رہا ہے آنکھوں میں ایک عجیب سی خوفناک چمک، تیزی، تجسس، اور ایک گریز سا بھی گلے تک شیروانی کے بٹن لگائے ہوئے کسی شریف زادے کو دیکھ کر وہ اس بے نیازی سے منہ موڑ لیتا تھا جیسے شرافت ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے لائق بھی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

اس کے موٹے موٹے ہاتھوں کی انگلیاں کھردری چھال والے درخت کی شاخوں کی طرح سخت تھیں۔ کبھی وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے پر مار کر انہیں پورا پھیلا کر کھول کر بڑے فخر سے دیکھتا۔ . . . . یونہی نہیں۔ ان ہاتھوں سے اس نے چھ آدمیوں کا خون کیا تھا ــــــ انہیں ہاتھوں سے۔ پہلا ایک پنواڑی تھا جو اس کے گھر کے پیچھے رہا کرتا تھا۔ اس کی عمر اس وقت مشکل سے اٹھارہ برس کی ہوگی۔ جب اس نے پنواڑی کا گلا مرغی کی طرح مروڑ کر پھینک دیا تھا۔ اس دن پہلی اور آخری دفعہ اسے ایک جھرجھری سی آئی تھی۔ اور اس کے بعد تو دل فولاد کی طرح سخت ہوگیا تھا۔ سال بھر ہوا۔ اس نے دو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ خون آلود کپڑے اتار کر ٹھنڈے پانی سے نہایا، اور ہوٹل میں جا کر چھ پیالیاں گرم چائے کی پیں۔ وہ چائے پیتا رہا۔ اور اس کے سامنے دو آدمیوں کے قتل کا چرچا ہوتا رہا۔ مقتول شہر کے متمول آدمی تھے۔ ایک بار اس نے ساتھ کی میز پر بیٹھے ہوئے بابو سے خود پوچھا تھا۔

کہاں قتل ہوا؟

کیسے؟

قاتل نہیں پکڑا گیا؟

ان سب باتوں کا جواب پا کر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی . . . . . . جس کی پردہ داری اس کی گھنی مونچھوں نے بڑی خوبی سے کر لی۔ اور پھر وہ قہقہے لگانے لگا کسی اور بات پر . . . . . اسی رات اس نے سیکنڈ شو میں فلم دیکھا۔ اور اسی سڑک کو جہاں دو آدمیوں کا خون ہوا تھا پار کیا ــــ

یہ زندگی اسی کی ہے
جو کسی کا ہو گیا

وہ گا رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں بھاری سی پر سوز آواز گونج رہی تھی کوئی کہہ سکتا تھا یہ ایک قاتل کی آواز ہے؟ اس وقت وہ دو لاشیں اس کے تصور سے کوسوں دور تھیں۔ جو پولیس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھیں اخباروں کی سرخیاں بن رہی تھیں . . . . . . اس کے ذہن میں ایک بہت پرانا سا ہلکا ہلکا سا خاکہ ابھر رہا تھا۔ یہ خاکہ ہمیشہ اتنا ہی ہلکا سا خاکہ رہا تھا ــــــ آج بھی، آج سے دس سال پہلے بھی جب وہ سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان تھا . . . . . یہ خاکہ اکثر اسی طرح ابھرتا اور پھر تاریکی میں کھو جاتا . . . . . جب وہ کوئی فلمی گیت گاتا پیار کا! انتظار کا! یا کوئی فلم دیکھتا جس میں ایک خوب صورت آدمی۔ ایک خوب صورت لڑکی سے محبت کرتا دکھائی دیتا!

وہ بدصورت تھا۔ موٹی سی ناک، موٹے موٹے ہونٹ، سیاہ رنگت، . . . . . اس کے تصور میں جو خاکہ ابھرا کرتا تھا؟ وہ بھی کسی خوب صورت لڑکی کا نہیں تھا۔ یوں تو وہ بمبئی کی سڑکوں پر کیسے کیسے ایک خوبصورت چہرے دیکھا کرتا تھا۔ مگر یونہی، بے مطلب . . . . وہ خوب صورت نہ ہوتے ہوئے بھی خوب صورت دکھائی دیتے تھے ڈھلکتی پھسلتی سرسراتی ریشمی ساڑیاں، بھاری میں ڈھکے ہوئے

بھرے کی طرح رنگین ملبوسات، طرح طرح کے جوڑے، بال، سرخ سرخ دہکتے ہونٹ، گلابی گال، ساحر نگاہیں...... مگر اس کے ذہن میں دس سال سے وہی چہرہ ابھرا کرتا تھا۔ وحشی ہرنی کی طرح بڑی بڑی آنکھیں، شام کے دھندلکے کی طرح رنگت، موٹے موٹے سے ہونٹ، بھرے بھرے ہاتھ جو پیتل کی تین کنڈیاں پانی سے لبالب بھرے سر پر سنبھال کر چل سکتے تھے۔ پاؤں میں سوا روپے والی چپل، کنڈیوں کے بار سے پھیلتے ہوئے بازو... اور اس بوجھ میں سے جھانکتی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ......

پہلے تو وہ اسے روز نل پر گھنٹوں پانی بھرنے کے انتظار میں بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔ یونہی! پھر وہ غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ کتنی پیاسی نگاہیں پانی کے نل کے بجائے اس کی طرف جمی رہتی ہیں کتنے برتن اس کے برتنوں سے ٹکراتے ہیں، اور کتنے جسم اس کے جسم سے ٹکرا جاتے ہیں۔ اور پھر نہ معلوم کیوں ایک دن وہ اپنے برتن لیجا کر بیٹھ گیا۔ اور پھر جیسے ہی وہ آتی وہ اپنا برتن رکھ دیتا۔ اور اسے ہٹا کر اس کا برتن بھر دیتا...... اور پھر اپنا برتن یونہی آدھا بھرا بے بھرا لے آتا۔ اس کی ماں چلاتی۔

"جب تجھے پانی بھرنا نہیں تو برتن لیجا کر میرا کام کیوں کھوٹا کرتا ہے؟"

مگر یہ ہوتا رہا...... یہاں تک کہ وہ اسے اس طرح دیکھتی جیسے اس کی آنکھوں میں ایک سوال ہو...... "کیوں جی، تم ہمارا پانی کیوں بھرتے ہو۔؟ یہاں اور بھی تو سب بیٹھے رہتے ہیں۔ جوان لڑکیاں بھی بوڑھی مائیں بھی"......

اور پھر ایک رات اس کے سامنے والی کھول میں بڑا دنگا ہوا۔ پنواڑی شراب پی آیا تھا۔ اور یہ بھول گیا تھا۔ اس کے گھر میں جو عورت ہے وہ اس کی اپنی بھانجی ہے...... اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی...... آنکھوں میں خون اتر آیا...... اتنا گناہ اتنا اندھیر؟ اس کی انگلیوں میں اس وقت تک لاوا سا دوڑتا رہا جب تک وہ پنواڑی کے گلے میں پیوست نہیں ہو گئیں......

پنواڑی کی بھانجی اپنے ماما کی لاش پر گر کر رونے لگی...... اب وہ لاش تھا...... انسان بھی مر گیا اور شیطان بھی......

"تم بھاگ جاؤ" وہ چلائی......

اور وہ بھاگ گیا۔

پورے تین برس بعد وہ گھر لوٹا۔ چوری چھپے۔ اس کے باپ نے اسے موٹی سی گالی دے کر کہا: "بزدل! بھاگ گیا کوئی تیرا کیا لگا ڈالتا۔ رستم دادا کا بیٹا تھا یا کسی گھسیارے کی اولاد؟"

اس دن سے اس نے اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ کس کا بیٹا ہے۔ اور اب تو وہ خود دادا تھا...... ایک خون، ایک چوری، ایک ڈاکہ اس کے بعد ایک راستہ ہوتا ہے دادا...... اور وہ دادا نہ بنتا تو کیا بنتا۔

جب وہ پانچ سال کا تھا۔ ایک شخص کا بٹوہ سڑک پر گر پڑا۔ وہ بٹوا اٹھا کر دوڑا...... "بابو جی...... بابو جی"...... اور بٹوہ دے دیا —— مگر جب اس نے اپنے باپ کو یہ قصہ سنایا تو وہ خوش نہیں ہوا۔ اس نے گالی دے کر کہا: "باپ دادا کی ناک کٹوائے گا"۔

اس کے بعد وہ سمجھ گیا، اس کا پیشہ کیا ہے، چوری، پاکٹ کاٹنا،..... پھر خون مار پیٹ...

اس کا باپ دادا تھا، دادا، دادا تھا۔ جس کے نام سے اب بھی شہر کے اونچے اونچے فلیٹ اور کوٹھیاں تھر تھرا سی جاتی ہیں۔

اس کے باپ کو فخر تھا اس کے بیٹے نے ایک خون کیا ہے

اور اسی شام وہ نل کے پاس سے آ رہا تھا، تو دو عورتیں اسے دیکھ کر راستہ کاٹ گئیں۔

"ہتھیارا...... پاپی...... دشٹ......"

اینٹیں پتھر اس کی چھاتی پہ لگے۔ اور جب اس نے پہچانا، یہ وہی تین برس پہلے والی چھوکری تھی۔ تو چھاتی کے گھاؤ نمک سے بھر گئے۔

اور دوسری صبح اس نے دیکھا۔ وہی لڑکی گود میں بچہ لئے اسے دودھ پلا رہی ہے۔ بس اس کے بعد اس نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ مگر وہی لڑکی وہی خاکہ ہمیشہ اس کے ذہن میں ابھرا کرتا تھا وہ سوچتا...... وہ ذات کی بھنگن تھی اور وہ رستم کا بیٹا شیر علی

دشسٹ پاپی ہتھیارا نہ ہوتا، تو بھی شیر علی تو تھا.....

دو سال بعد اس کا باپ مر گیا۔ مرنے سے پہلے وہ اپنے سارے راز، سارے گر، سارے وسیلوں کا پتہ اسے بتا گیا..... اب وہ سڑکوں پہ اکڑ کر چلتا تھا۔ اس نے مونچھیں رکھ لی تھیں..... اس کے نیفے میں چاقو رہتا تھا..... وہ جانتا تھا..... اسکی طاقت، اس کا اثر کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے.....

سیٹھ، بنیئے، مہاجن اپنے دشمنوں سے جتنے انتقام لیتے ان کا ذریعہ وہ تھا..... نوٹوں کی گڈیاں بکھر جاتیں..... وہ خود کو شریف جانتے تھے..... عزت دار سمجھتے تھے..... پولیس سے سماج سے، اخباروں سے ڈرتے تھے..... گلاب کی ٹہنیوں کی طرح نازک تھے..... وہ انہیں صرف بزدل سمجھتا تھا اور اپنی بہادری سے خریدتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ سارے معززین کا راز داں تھا کتنے ہی روپے کی ضرورت ہو ایک بار اشارہ کیا اور کام پورا ہوا..... پچھلے برسوں اس نے دو خون دس دس ہزار کے عوض کئے تھے۔ بیس میں سے چار ہزار روپیہ تو اس نے خیرات ہی میں بانٹ دیا تھا..... یہ دونوں ایک عورت کے پیچھے پڑے تھے۔ ایک سیٹھ اس عورت کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا شوہر اور دیور بری طرح حائل تھے.....

یہ معاملہ محبت کی رقابت تک ہی محدود نہیں تھا۔ سیاسی اور سماجی رقابتوں میں بھی اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ کسی کو پٹوا دیا..... کسی کو مروا دیا..... کسی کے یہاں چوری کرا دی..... یہی کاروبار پھیلا ہوا تھا..... کئی بڑے بڑے گھرانوں سے اس کی ماہانہ تنخواہ بندھی تھی۔ "داوا" بڑے آدمیوں کے لئے اس سانپ کی طرح ہوتا ہے جسے دودھ پلائے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے..... اور دودھ پلانے کے باوجود یہ خوف نہیں جاتا کہ کب وہ ڈس لے..... اور یہی وہ انسان تھا جو سانپ کا زہر چوس کر زہریلا اژدہا بن جاتا ہے..... دادا..... جس کی پھنکار سے بھی لوگ بچتے ہیں..... دادا..... جن کی رگوں میں سماج کا سارا زہر جمع ہو جاتا ہے..... یہ زہر اسے دادا بنا دیتا ہے خوفناک بنا دیتا ہے..... وہ یہ زہر پیئے رہتا ہے۔ پیئے جاتا ہے..... جس کے اگلنے سے نہ معلوم کتنے بھولے بھالے سفید بگلے اپنے اصلی روپ میں ناگ بن کر آجائیں..... وہ غنڈا نہ کہلائے تو کتنے ہی ایسے ہیں جن کی شرافت خطرے میں پڑ جائے..... اور یہ بات اسے چھاتی پھیلا کر چلنے پر مجبور کرتی..... اسی لئے وہ شریفوں کو ایسی نگاہوں سے دیکھتا ہے جیسے خیرات کرنے والا بھکاری کو.....

رات کو جب ہوا بند ہو جاتی۔ کھولی میں دم گھٹنے لگتا تو وہ مسجد میں جا کر سو جایا کرتا۔ پچھلے سال حاجی کرم علی نے اپنے سیاسی حریف کو پچھاڑنے کے لئے اس کی مدد چاہی اور دو ہزار روپیہ نقد دیا تو اسی سے اس نے مسجد میں بجلی لگوائی۔ جا نمازیں خرید کر دیں۔ اور سو روپے موذن کی تنخواہ کے کئی مہینہ سے چڑھ گئے تھے وہ ادا کئے۔ امام کو بلایا اور پیشگی ملا کر سو روپیہ دیا ——— یہ کام نہ اس نے نیکی کے لئے کیا تھا۔ اور نہ اللہ میاں یا بندوں کو خوش کرنے کے لئے، یہ اس کی عادت تھی۔ اس کے پاس روپیہ جب تک رہتا وہ بے چین رہتا..... جب ایک ایک پائی خرچ ہو جاتی آرام کی نیند سوتا..... بس اسی عادت سے مجبور ہو کر وہ بہت سے کام ایسے بھی کر دیا کرتا تھا۔ جنہیں وہ ضروری نہیں سمجھتا تھا..... اور جب وہ مسجد کے صحن میں ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر چت لیٹ کر آسمان کی طرف تکنے لگتا۔ تو اسے موذن اور امام سے لیکر اللہ میاں تک پر ترس آتا..... جو سب کے سب حاجی کرم علی سیٹھ داوا بھائی کے محتاج ہیں ——— ان کی بلیک کی، جوئے کی آمدنی کے محتاج.....

ایک شام یونہی راستہ چلتے چلتے اس نے ایک نوجوان کی جیب خالی کر دی..... مذاق ہی مذاق میں۔ اسے روپیوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی..... بٹوہ کھولا..... پچاس روپیہ..... ایک خط..... جو ماں نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا..... دوسرے شہر سے...

"سلمٰی بیمار ہے..... اسے دق ہو گئی ہے..... ڈاکٹر نے کہا ہے..... بیٹا تم روپیہ پیسہ نہیں بھیج سکتے میں جانتی ہوں۔ مگر تم لوٹ آؤ کسی طرح میرے بچے وہاں تم فاقے کر کر کے مرجاؤ۔ یہاں یہ دم توڑ دے کیا یہی میرے ماں ہونے کی سزا ہے؟..... اتنی بڑی

خیرات دو ——— کام نہیں ملتا، میں جانتی ہوں
یہ تمہارا قصور نہیں۔ پھر کیوں یوں منہ چھپاتے ہو کہ
خط بھی نہیں لکھتے ...... !

اس سے آگے وہ نہ پڑھ سکا۔ خط ایک ماہ پہلے کا تھا.... یہ روپے
اس نے اسی لئے جمع کئے تھے، یہ منی آرڈر فارم .... اسکی
آنکھیں ہمیشہ تندور کی طرح آگ ہی سے بھری رہی تھیں۔ مگر آج
نہ معلوم کہاں سے دو بوندیں ٹپک پڑیں.... اڑتیس برس سے
دہکتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہو گئی..... تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے
بڑھا گھنٹوں مجمع کو چیرتا پھاڑتا، ایک ایک کو گھور گھور کر نوجوان کو
ڈھونڈتا رہا۔ مگر وہ نہ ملا.... پھر دھیرے دھیرے چلتا آگے
بڑھا، اور ایک ٹیکسی روکی اور سیٹھ عبداللہ بھائی کے ڈرائنگ روم میں
جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں بھائی!" سیٹھ نے پریشان سی کھسیانی سی ہنسی ہنس
کر کہا:-

"روپیہ چاہیے۔"

"روپیہ؟ ...... روپیہ تو..." سیٹھ ہکلانے لگا۔"

"روپیہ تو ملنا ہی چاہیے۔"

سیٹھ نے آنکھیں لال پیلی کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا
چہرہ زرد ہی رہا۔

تیز چمکتا ہوا چاقو سامنے تھا۔ سیٹھ کی آنکھوں کی چمک ماند
ہو گئی... اور سکے چمکنے لگے.... کھن کھن.... چھم چھم....
چاندی کے سکے....

"کتنے چاہئیں......؟" مری سی آواز نے کہا۔

"پانچ سو..... منی آرڈر کے پیسے بھی دو۔"

"پانچ سو دس"... سیٹھ نے روپیہ گن دیا.... وہ تھیلی
جیب میں ڈال کر باہر آیا۔

ٹیکسی جا چکی تھی.... سیٹھ عبداللہ بھائی کی موٹر تیار کھڑی
تھی....

"سنٹرل پوسٹ آفس!"

تیزی سے دوڑتی ہوئی کار ایک چیخ مار کر اچانک رک گئی......
اس کا سر کھڑکی میں جا لگا، شیشہ چور چور ہو گیا۔ ماتھے سے خون بہنے
لگا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اور لپک کر سامنے آیا...... ایک
نوجوان.... پہیوں کے بیچ میں دبا ہوا تھا..... خون ہی خون
بھیڑ جمع ہو گئی۔ نوجوان کو نکالا..... اس نے غور سے دیکھا...
اور اس کے خون آلود کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ کٹی ہوئی تھی۔
اسپتال لے جاتے جاتے نوجوان مر گیا۔

اور اس شام وہ بمبئی سے دور ایک چھوٹے سے انجانے شہر کی
طرف جا رہا تھا...... ایک بوڑھی ماں اور دق زدہ لڑکی کے
پاس... جس کے بارے میں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ
اس نوجوان کی بیوی تھی یا بہن.... اس کی جیب میں پانچسو بچاس
روپے کی تھیلی تھی......

شام نے رات کی چادر اوڑھ لی۔ نئی گلیوں میں بھٹکتے بھٹکتے
اس کے پیر شل ہو گئے۔ اور بڑی مشکل سے جا کر پتہ لگا......
ایک چھوٹے سے کچے مکان کا..... اندر ایک دیا جل رہا ہے،
ایک لڑکی کھانس رہی تھی۔ ایک بچی رو رہی تھی۔ ایک بڑھیا نماز
پڑھ رہی تھی۔

"کون ہے؟" کھانسی رک گئی۔

"میں"..... اور آج سے سوچنا پڑا وہ کون ہے.... او
اس وقت اس نے وہ نہیں ہونا چاہا جو وہ تھا ——— اڑتیس
سال سے "دادا"

"میں..... میں بمبئی سے آیا ہوں بہن"..... آج اس کے
لہجہ میں اتنی مٹھاس گھل گئی کہ اس کی ساری شخصیت۔ سخت
کھردری، بھیانک، خونی، مجرم، شخصیت موم ہو گئی۔

"بمبئی سے......"

ایک سکوت۔ پھر

"آجاؤ دادا"

"دادا؟" وہ ٹھٹھک گیا۔

"اندر آجاؤ دادا"

جیسے کسی نے پیچھے سے لٹھ گھما کر مارا۔

"بیٹھ جاؤ دادا"

مگر یہ تو بھولوں کی چھڑی ہے۔

دادا...... دادا..... یہ کیسا دادا..... اتنا میٹھا.... اتنا نرم.... یہ وہ تلخ، وہ کرخت لفظ تو نہیں تھا جو آج تک اس کی شخصیت کی نمائندگی کرتا آیا تھا۔ وہ بمبئی کی سڑکوں پر سنتا آیا تھا۔ دادا جو اس کا باپ تھا، دادا تھا.....

"منی۔ تیرے ابا نے دادا کو بھیجا ہے سلام کر"

"سلام دادا"

وہ کانپ گیا۔

"ماں نماز پڑھ لی؟ انھوں نے انہیں دادا کو بھیجا ہے"

"دادا" جیسے تسبیح کے دانوں پہ پڑھا جا رہا تھا۔

دادا! ابا نے روپے بھیجے ہیں؟"

"ہاں بیٹی، بہت سارے....." اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا

"بیٹا۔ تم شہامت کو جانتے ہو۔ اس کے دوست ہو گے؟۔ یہاں کیسے آنا ہوا؟..... ٹھیک سے بیٹھو بیٹا..... کھانا لاؤں۔ ہاتھ منہ دھو لو......"

"ہاں دادا۔ تھکے ہوئے آرہے ہو معلوم ہوتا ہے۔ سیدھے اسٹیشن سے آتے ہو یا گھر ہے یہاں؟"

"نہیں بہن۔ یہیں آیا ہوں"

"ماں کھانا کھلاؤ پہلے۔ پھر بات کرنا۔ جا منی، دادا کو پانی دے"

پھر دادا...... مٹھاس بڑھتی گئی، نرمی بڑھتی گئی۔ اب دادا کے اندر دوسرا دادا جنم لے رہا تھا.... پتھر کی چٹان ٹوٹ رہی تھی....

"شہامت کیسا ہے بیٹا..... مہینوں گزر گئے۔ چٹھی بھی نہیں لکھی۔ لاکر لکھا۔ کام نہیں ملتا تو لوٹ آئے بیٹا.... بہو کی لت تم نے دیکھی...... یہ معصوم بچی دیکھتے ہو.... بیٹا لاتی اور بہاری محنت مزدوری سے دو وقت کی روٹی بھی نہیں ہوتی

"ماں شہامت تو نہیں آسکے گا..... اسے کام مل گیا ہے"

وہ رک رک کر کہہ رہا تھا......" یہ پانچسو روپے بھیجے ہیں"

"پانچسو؟" لتنے کہاں سے مل گئے اسے؟"

"پیشگی لے لئے ہیں"

"مگر بھیا، ایسا پیشگی دینے والا بھی کون ہو سکتا ہے؟ تم کچھ چھپاتے ہو۔ کوئی برا کام تو نہیں کیا اس نے؟ قید تو نہیں ہو گیا"

ماں کے ہاتھ ہتھیلی پکڑ کر کانپ رہے تھے.....

"نہیں ماں ایسا کچھ نہیں....."

اور دوسری صبح جب وہ واپس ہو رہا تھا۔ بچی نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا:۔

"دادا، اب تب آؤ گے؟"

ماں نے کہا ——:۔" دو دن رہ جاتے بیٹا۔ روکھی سوکھی کھاتے۔ تم نے بڑا احسان کیا ہے ہم پر۔ شہامت کی خیر خبر رکھنا"

اور بہو نے کہا:۔" ہم نے تو یہی سنا تھا۔ بمبئی میں بڑے بے رحم، بے حس، لوگ ہوتے ہیں۔ آج معلوم ہوا۔ تم جیسے فرشتے بھی رہتے ہیں دادا..... اب ان کی طرف سے فکر نہ ہوگی"

اور جب اس نے تانگے والے کو آواز دی تو اس نے آتے ہی پوچھا:" کہاں جانا ہے دادا؟"

دادا.....؟ کیسی آسانی سے ہر ایک کہہ دیتا ہے۔ دادا اسٹیشن سے قریب آکر اس نے پوچھ ہی لیا:۔کیوں بھائی تمہارے شہر میں، دادا، کسے کہتے ہیں؟"

تانگے والے نے پان کی پیک تھوک کر قہقہہ لگایا۔

"دادا، بمبئی سے آئے ہو؟"

"ہاں"

"بمبئی میں تو دادا غنڈے کو کہا جاتا ہے —— گرامت دادا، ہمارے یہاں دادا غنڈے کو نہیں کہتے۔ اپنے بڑے کو اپنے پیار کو کہتے ہیں۔ دوست کو بھائی کو کہتے ہیں۔"

اور اب تین سال گزر گئے ہیں —— ہر مہینے بمبئی سے پچاس روپے کا منی آرڈر منی کے نام جاتا ہے اور ماں کے نام چٹھی۔

اور کتنی بار وہ ارادہ کر چکا ہے ایک کارڈ میں وہ راز کھول دے جو تین برس سے اس کے سینے میں گھٹ رہا ہے ——— ایک ماں بیوی اور بیٹی کی زندگی کا کبھی پورا نہ ہونے والا انتظار ختم کر دے — لیکن اس کے ہاتھ کانپ جاتے ہیں ——— اور وہ سوچتا ہے۔ پھر یہ پچاس کا منی آرڈر کس طرح جایا کرے گا ——— ؟ کس رشتہ سے ؟

اور اب وہ پرچون کی دکان کرتا ہے ——— اس کے نیفے میں کوئی خنجر، ملنے پر کوئی تیوری نہیں رہتی ——— اس کی پیشانی سی سخت اور کھردری شخصیت موم کی طرح نرم و نازک ہو گئی ہے۔ اب وہ، وہ دادا نہیں جو خوفناک غنڈہ ہوتا ہے ——— اور اب وہ وہ دادا ہے جو بڑا ہوتا ہے۔ اپنا پیارا ہوتا ہے۔ دوست ہوتا ہے۔

(بشکریہ "افکار")

ماہر القادری

دانش و ہنر کی بزم مشورت

مُغنّی

جب یہاں کچھ بھی نہ تھا اس وقت بھی موجود تھی — روحِ موسیقی، جسے انجیل کہتی ہے کلام[1]
شہپرِ جبریلؑ کی پرواز میں نغمہ ہے یہ — لوگ سمجھے ہی نہیں اب تک مغنّی کا مقام
وہ صدائیں آج بھی دیباچۂ اسلام ہیں — جن سے نکلا "اشرق البدرُ علینا" کا پیام
دستِ ماضی میں ہے سازِ ابتدا و انتہا — کاش مڑ کر دیکھ سکتے رہروانِ تیز گام
دل میں جذب و سوز کا طوفان ہونا چاہیے — ساز کی گت پہ بھی ہو سکتی ہیں تیغیں بے نیام
نَے کو سن کر پیر رومی پر وہ محل گرفت — بوعلی بیٹھا ہوا سوچا کیا علم کلام
جو نہ آئے وجد میں دولاب[2] کی آواز پہ — ایسے کافر دل پہ ہے واللہ موسیقی حرام

صور اسرافیل میں ہے زندگی بھی موت بھی
سازِ ہستی کے ہیں دو پردے تمام و ناتمام

مصوّر

پیکرِ آدم بنایا کس نے آب و خاک سے — میں یہ کہتا ہوں کہ قدرت خود ہے پہلا بت تراش
"احسنِ تقویم"[3] کے سانچے میں ڈھل کر آدمی — بن گیا قدسی صفت شبنم فشاں و برق پاش
پھول، کانٹے، بلبل و طاؤس، قمری، زاغ و چرغ — یہ جہاں ہر خوب اور ناخوب تصویروں کا تاش
ڈال سکتی ہے مری صنعت گری ہر شے میں جان — شمع کا رشک چکیدہ ہو کہ پروانہ کی لاش
دم بخود ہیں سب مرے موئے قلم کے سامنے — خوشۂ انگور ہو یا سیب ایرانی کی قاش
یہ جہاں نقاشِ فطرت کا ہے وہ نقشِ عجیب — راز تھا جس کو کیا ذوقِ خود آرائی نے فاش
حسن کی رنگینیوں سے سلب کر سکتا ہے روح — میری نازک انگلیوں کا ایک ذرا سا ارتعاش

میں کہ نقاشِ ازل کا رازدارِ خاص ہوں
میرے رتبہ کو سمجھ سکتا کوئی دنیا میں کاش

فلسفی

میں نے غور و فکر سے کھولے ہیں وہ عقدے تمام — منحصر ہے جن پہ یہ دنیائے اسباب و علل
اس جگہ ہے توسنِ تخئیل میرا گرم رَو — جس جگہ تقدیر کے بازو بھی ہو جاتے ہیں شل

۱؎ مقدس انجیل کی پہلی آیت ۲؎ کسانیکہ یزداں پرستی کنند ٭ بر آوازِ دولاب مستی کنند ۳؎ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم
۴؎ بلداء مشرک کی قسم کیلئے بازیں عربی میں "مستقی" کہتے ہیں۔

مجھ سے پوچھو کس طرح پیدا ہوئی ہے کائنات — بزم ہستی جنبش اوّل کا ہے ردِ عمل
ایک نامعلوم قوت کی ہیں بزم آرائیاں — مہر و مہ کے آشیانے یہ ستاروں کے محل
آدمی کا تجربہ خود ہے فریب وہم و ہوش — کون کہہ سکتا ہے ہر قانون فطرت کو اٹل
کس محکم سے ہے میری قوت نقد و نظر — زندگی تو زندگی ہے کانپ جاتی ہے اجل

فلسفی ہی صرف بن سکتا ہے دنیا کا امام
ہے یہی منشا ابد کا اور تقدیرِ ازل

شاعر

میرا اک شعر ہے نغمہ گر و نغمہ نواز — میں اگر چاہوں تو بج سکتے نہیں چنگ و رباب
وہ مصور جس کی دنیا پھول پتوں کے نقوش — وہ سمجھ سکتا نہیں بے تابیٔ روحِ گلاب
فلسفی اسباب کی ہے بحث میں الجھا ہوا — اس کے ذہن و فکر کی منزل ہے دیوانے کا خواب
سینۂ گیتی کی دھڑکن مجھ کو دیتی ہے پیام — روحِ مستقبل کی لرزش مجھ سے کرتی ہے خطاب
نبضِ ہستی پر ہیں میری انگلیاں رکھی ہوئی — گرمیٔ دل سے مری قائم ہے دنیا کا شباب
مجھ کو کرتے ہیں اشارہ شعر کہنے کے لئے — ڈوبنے والے ستارے، ٹوٹنے والے حباب
کیا کہوں، کیونکر کہوں، کس سے کہوں اے ہمنشیں — میری چشمِ شوق نے دیکھا ہے کس کو بے حجاب

سچ کہا ہے "شاعری جزویست از پیغمبری"
میری فطرت پر ہوئی نازل محبت کی کتاب

(فضا میں پُر جلال لرزش پیدا ہوتی ہے)

غیبی آواز

کیا یہاں آئے ہو تم زور آزمائی کے لئے — خود فروشی، خود فریبی، خود نمائی کے لئے
شعر، نغمہ، فلسفہ اور صنعت صورت گری — صرف ہوتے ہیں جہاں میں خود نمائی کے لئے
اس جہاں کے اہل دانش اور اربابِ ہنر — جھوٹ کا پربت بنا دیتے ہیں رائی کے لئے
دانش و علم و ہنر کی سعیٔ پیہم کا مآل — یا بڑائی کے لئے ہے یا کمائی کے لئے
صرف تقوے ہے ترازو عظمت و کردار کی — ہے یہی معیار انساں کی بڑائی کے لئے
آپ اپنے آرٹ کو تکلیف آرائش نہ دیں — ہم بہت کافی ہیں اپنی اس خدائی کے لئے

آدمی بارِ خداوندی اٹھا سکتے نہیں
بلبلے ساکن سفینوں کو چلا سکتے نہیں

(بشکریہ سوغات)

ظہیر عالم

فیروز نظر

زمانہ کافی ترقی کر چکا ہے اور ابھی مزید ترقی کی طرف مائل ہے بہت سی پرانی باتیں اب متروک ہو چکی ہیں اور بہت سی باتیں اس نئے سائنٹیفک دور میں غلط ثابت ہو رہی ہیں لیکن پھر بھی بزرگوں کی کچھ ایسی کہاوتیں ہیں جن کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان بہت سی کہاوتوں میں سے ایک بہت مشہور کہاوت ہے "شاعری خداداد عطیہ ہے" اور "ایں سعادت بزور بازو نیست"۔ تجربہ اور مشاہدہ آج تک ان کہاوتوں کو غلط ثابت نہ کر سکا۔ اس دنیا میں بے شمار افراد بستے ہیں۔ لیکن کتنے ہیں جو اپنے جذبات کو صحیح طور سے واضح شکل میں احاطۂ تحریر میں لا سکتے ہیں؟ —— ہر وہ آدمی جو اپنے احساسات اور جذبات کو واضح شکل میں الفاظ میں بیان کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ شاعر ہے۔ اور بیان میں یہ سلیقہ خود پیدا کردہ نہیں ہوتا۔

زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے احساسات اور انداز فکر میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ایک دور کی شاعری دوسرے دور کی شاعری سے کافی مختلف ہوتی ہے اور شاعر اسی وجہ سے اپنے دور کے معاشی سیاسی اور اقتصادی حالات کا صحیح ترجمان کہا جاتا ہے آج کی شاعری غالب کے زمانے کی شاعری سے کافی مختلف ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ غالب جن حالات سے دوچار تھے۔ وہ آج کے حالات سے مختلف ہیں۔

فیروز نظر اسی دور کے ایک نومشق شاعر ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے انھیں میدان شاعری میں قدم رکھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہوگا۔ اس تھوڑے سے عرصے میں انہوں نے جو ترقی کی وہ اس بات کی ضامن ہے کہ ہم اگر آج ان کی ذات سے کوئی امید وابستہ کر لیں تو مایوس نہ ہونگے۔ ان کی ارتقا پسند فطرت جب اتنے تھوڑے عرصے میں ؎

نظر ان سے امید بہار آگئی ہے مری ان کی مرضی وہ آئیں نہ آئیں

سے ؎

جو زندگی کی پیامبر ہوں، جو زندگی کا شعور بخشیں
غزل میں ایسی بھی چند باتیں نظر کہو فکر بیش و کم سے

تک آگئی ہے تو آئندہ وہ ضرور اس مقام پر پہونچ جائیں گے۔ جہاں فیض کہتے ہیں ؎

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

شاعری میں آج فیروز نظر جس مقام پر ہیں۔ وہ بھی ان کے نومشق ساتھیوں سے بہت ارفع ہے وہ کافی ذہین حساس اور زمانہ شناس ہیں۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ انھوں نے اپنی نومشقی کے اولین دور میں ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ آج کا ماحول گل و بلبل کے قصے بیان کرنے کا نہیں چنانچہ وہ اس نہج کو چھوڑ کر ماحول کی عکاسی کی طرف مائل ہو گئے۔ اور کہتے ہیں ؎

ابھی آپ رخ پر نہ بکھرائیں گیسو
ابھی رنگ شام و سحر اور کچھ ہے

بہار آکے گزر بھی گئی مگر اے دوست چمن میں پھول ترستے ہے ہنسی کیلئے
کہیں کھنکتے ہیں دن رات ساغر و مینا کہیں یہ لوگ ترستے ہیں زندگی کیلئے

ہم بھی دہرائیں گے فسانۂ عشق مل گیا گر غم جہاں سے فراغ
جل رہا ہے نہ بجھ رہا ہے نظر ان دنوں اپنی زندگی کا چراغ

گلہ ہے رخ دوست تو کیا سے علاج گردش دوراں کسی سے ہو نہ سکا

تمہاری زلف کے خم گر الجھ سی جائیں گے
ہم آج کل گیتی چلے ہیں سلجھانے

اگر گردش دہر سے بھی اپنی شناسائی ہے
ہم نے یوں تجھ سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہے

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ملک کے حالات نے یکدم پلٹا کھایا۔ اور نئی صورت حال کچھ عجیب سی تھی یعنی چند لوگ سر اقتدار رہیں اور باقی گردش حالات، غم حالات، اور فکر معاش میں بری طرح پھنس گئے۔ فیروز نظر کو اس بات کا احساس ہے کیونکہ وہ بھی اسی ملک کے ایک شہری ہیں اور وہ بھی ان تمام باتوں سے دوچار رہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اشعار ان کی الجھنوں کی تفسیر ہیں ؎

وفاؤں کے صلے ہم کو ملے ہیں	تمناؤں کے غنچے ادھ کھلے ہیں
جو خود ناواقف منزل ہیں ابتک	نظر ایسے ہمیں رہبر ملے ہیں
خوشا یہ چارہ سازوں کا تغافل	ہمارے زخم ابتک ادھ سلے ہیں

اے باغباں بہار نہ راس آسکی جنھیں
وہ پھول ان گنت ہیں گلستاں کی گود میں

سنا تو تھا کہ بہار آ رہی ہے گلشن میں
پر اہتمام بہاراں کسی سے ہو نہ سکا

جنھوں نے اپنے لہو سے چمن کو سینچا ہے
انھیں پہ صحن چمن آج تنگ ہے اے دوست

دیکھنا گردش یہ حالات کے لے دوست کہیں
میری بیدار امنگوں کا جنازہ تو نہیں!

لگا دی گئی اُن پہ مہر سکوت
اگر لب ہلے ہیں ترے شہر میں

آج کل لفظ "کمیونسٹ" اس قدر سستا ہو گیا ہے کہ اس آدمی کی پیشانی پر جو سچی بات کہے، "کمیونسٹ" کا لیبل چپکا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فیروز نظر اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں ؎

ستمگرو، تمہیں بخشا ہمیں نے جاہ و حشم
تمہارے تیر ستم کا ہمیں نشانہ ہے

دیتے ہیں ہمیں زیست کا پیغام مری جاں
ٹھہرے ہیں ہمیں مورد الزام مری جاں

فیروز نظر محبوب کی تحقیر کرتے ہیں۔ ان کے شعروں میں محبوب کا ذکر اس شان سے نہیں ہوتا جس طرح ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں جمالیاتی حس کا فقدان ہے بلکہ انھیں محبوب کے مرتبہ کا احساس ہے وہ جانتے ہیں کہ محبوب کا کیا تقاضا ہے۔ مگر حالات کی ناہمواری اور فکر روزگار اور غم زمانہ وغیرہ جیسی حقیقتیں ذہن پر اس طرح چھا گئی ہیں کہ غم حبیب ان کی دیرینہ تمنوں میں بہت نیچے دب گیا ہے، ختم نہیں ہوا۔ جب کبھی حالات ہموار ہوں گے وہ پورے شکوہ سے ظاہر ہوگا ؎

پھر دل پہ حدیث لب و رخسار گراں ہے
پھر چھا گئے دل پر غم و آلام میری جاں

غم زمانہ، غم زندگی، غم جاناں
ہر ایک غم سے ملے ہم بڑے خلوص کیساتھ

حالات کچھ ایسے پیچ در پیچ ہو گئے ہیں کہ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اور زمانہ کس طرف جائے گا۔ زندگی بہت گراں ہے غم کی فراوانی ہے۔ دنیا تاریکی میں لپٹی ہوئی ہے اور عوام سہمے ہوئے ہیں اور حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ "اب کیا ہوگا" فیروز نظر کو یقین ہے کہ کل امن و صلاحتی لیکر آئے گا، لیکن آج حوصلہ شکن ہے۔ اس آج سے گزرنے کے لئے وہ [illegible]

کی تشکیل کر رہے ہیں ؎

جلاؤ، دوا ٹھا کے دل، رفیقو!
چراغوں کی لویں مدھم بہت ہیں

رخ حیات پہ آیا نہیں نکھار ابھی — رفیقو، دور ہے شاید دیارِ یار ابھی
پھر رہے جو فضا میں بھٹکتے گیت نظر — اک ایسے دور کا مجھ کو ہوا انتظار ابھی

ہیں امیدیں نہ توڑ دیں دم، کہیں قدم ڈگمگا نہ جائیں
ذرا سنبھل کر چلو رفیقو کہ راستے میں ہیں پیچ و خم سے

دُور تک کوئی شمع ہے نہ کوئی راہگذر
کس قدر عزم شکن شام ہے ٹھہریں کہ چلیں

زندگی تو بھی ذرا دیکھ پلٹ کر ہم کو
دیکھئے ہم بھی تجھے دار تک آ پہنچے ہیں

ے عزم مسلسل کی کھا رہے ہیں قسم
ں یاد اس سہارے بھٹک بھٹکے سے قدم

وہ زندگی، وہ محبت کے سلسلے، وہ خلوص
میں مطمئن ہوں کبھی دور میں تو ہوں گے ہم

خزینہ عشرت لٹائے گا اک دن — جواہرات اگلنا بھی سیکھ لے گی زمیں
برس رہی ہے کہیں منتظر ہے وقت — مسرتوں کا وہ ابر آ گیا ہے قریں!

(پیغام)

اس مختصر مضمون میں فیروز نظر کی شاعری پہ پوری طرح روشنی ڈالنا نہیں۔ بہرحال فیروز نظر سے ہمیں کافی توقعات ہیں۔ خدا کرے میں مایوس نہ کریں۔

فاروق انصاری ●

معرکۂ مصر و فرنگ

جنگ بازوں کی حقیقت مدتوں سے فاش تھی
دیکھ اب آئینۂ کردارِ "دُز دارالسلام"

الاماں یہ شاہکارِ وحدتِ منکرِ عمل
مصر میں حق کی دہائی ہنگری ہیں قتلِ عام

دی گئی وہ ضرب کاری حکمت تقسیم سے
ہوگیا تنظیم "حزب اللہ" کا قصہ تمام

کچھ ادھر زندانی پیچ و خمِ زلفِ عراق
کچھ اُدھر حلقہ بگوشانِ نگاہِ مصر و شام

مختلف شکلیں ہیں لیکن اصل ہر دونوں کی ایک
مغربی نیزے ہوں یا ناصر کی تیغِ بے نیام

اس سے زیادہ اور کیا ہے جشنکِ مصر و فرنگ
جوش میں ٹکرا گئے دو مختلف باطل نظام

کس قدر عبرت فزا چکر ہے یہ تقدیر کا
مرغِ زیرک شاخ پر ناداں شکاری زیرِ دام

محمد یعقوب ماھسؔ ●

دورِ زبوں میں عشق کا دعویٰ کرینگے ہم
ہر تلخیٔ حیات گوارا کریں گے ہم!

مردانہ جی سکے نہ جو اک دن بھی دہر میں
کس منہ سے جنتوں کی تمنا کرینگے ہم

وعدوں کی تیرے دیکھے دہائی گلی گلی
اے دوست اب تو تجھ کو بھی رسوا کرینگے ہم

اک شوشہ بھی جو تم نے کیا دیں کا پائمال-
میدانِ کربلا کا تقاضا کریں گے ہم

صد عصمتیں جلو میں تو صد غیرتیں رفیق
"اب یوں دیارِ یار سے گذرا کریں گے ہم"[1]

حائل ہے شیخ و رند کا یہ خشک و تر جہاں
کس طرح قربِ حق کی تمنا کریں گے ہم

ہر گھر ہو پُر بہار تو ہر سینہ پُر سکوں
سر دیکے بھی ملے تو یہ سودا کرینگے ہم

کشتی بھنور میں چھوڑ کے ٹکرا کے موج سے
اب رخصتِ جنوں کا نظارا کریں گے ہم

ظاہر ہزار ناک چڑھائیں وہ بوالہوس
ہر انجمن میں دین کا چرچا کریں گے ہم

[1] مصرع طرح

محمد صدیق گردش الہ آبادی •

سودا

کیا شبِ غم میں روشن دلی بیچدوں
تیرگی کے لئے روشنی بیچدوں
دولتِ دیں باذنِ شہی بیچ دوں
فکرِ راحت میں عنمِ پدری بیچدوں
صرف روٹی کی خاطر خودی بیچ دوں
زندگی کے لئے زندگی بیچ دوں

خوف باطل سے شرد شمنی بیچدوں
دہر میں فکر کی برتری بیچ دوں
شیشہ گر! جذبۂ آہنی بیچ دوں
اپنا جوہر بدستِ غنی بیچ دوں
چند سکوں کے بدلے خوشی بیچدوں
زندگی کے لئے زندگی بیچ دوں

سہمی سہمی چمن کی فضائیں سہی
برق و باراں کی پیہم بلائیں سہی
ناموافق وطن کی ہوائیں سہی
چاک پھولوں کی ہر سو قبائیں سہی
کیا برائے رفو نغمگی بیچ دوں
زندگی کے لئے زندگی بیچ دوں

بالیقیں ہر قدم پر ہیں پابندیاں
بزمِ دیر و حرم پر ہیں پابندیاں
نالۂ درد و غم پر ہیں پابندیاں
اضطرابِ قلم پر ہیں پابندیاں
اس لئے جذبۂ سرکشی بیچ دوں
زندگی کے لئے زندگی بیچ دوں

بخششِ ساقیٔ میکدہ عام ہے
ہر طرف بارشِ لطف و اکرام ہے
مجھ پہ شعلہ نوائی کا الزام ہے
مانتا ہوں کہ خالی مرا جام ہے
ہمنشیں! ذوقِ تشنہ لبی بیچدوں
زندگی کے لئے زندگی بیچ دوں

واعظا چھوڑ بھی ذکرِ دار و رسن
مردِ میدانِ حق اتنا بزدل نہ بن
پھینک دستار کو باندھ سر سے کفن
مجھ کو دیتا ہے کیا دعوتِ انجمن
ہوش کے ہاتھ دیوانگی بیچ دوں
زندگی کے لئے زندگی بیچ دوں

اس جہاں سوز تہذیب کی راہ میں
دائمی نور و ظلمت کی جنگاہ میں
ماہِ نخشب سے پیدا شبِ ماہ میں
تیرے جھوٹے خداؤں کی درگاہ میں
کیا کہا عظمتِ بندگی بیچ دوں
زندگی کے لئے زندگی بیچ دوں

اقبال احمد انصاری ●

ٹھنڈا پسینہ

یہ موسم سرما میں آخر جنوری کی ایک رات کی بات ہے۔

جب جمال نے کمرے میں قدم رکھا تو ایک لمحے کے لیے سردی کا احساس بالکل غائب ہو گیا۔ باہر کی ٹھنڈک سے خون تک جما جا رہا تھا چاندنی میدان میں ٹھٹھری پڑی تھی۔ آج ہر شے جیسے جمنے کے قریب تھی یا جم چکی تھی۔ صرف ہوا کے جھونکے ابھی تک آزاد پھر رہے تھے۔ کان کی لوئیں اور ناک ان کے اثر سے سن ہو کر اپنا وجود بھی بھلا چکے تھے۔ بدن کا سارا جسم ان سرد تیروں سے چھلنی ہو کر ایسا بے جان ہو چکا تھا جیسے برف کی چکی میں پیس کر ہڈی ہڈی سرد کر دی گئی ہو۔ جمال موٹے سوئٹر، گرم پتلون اور اوور کوٹ مفلر دستانے سب سے لدا ہوا تھا۔ مگر جسم کی کپکپی ابھی باقی تھی۔ جیسے وہ سردی نہ محسوس ہونے پر اب صرف سردی کے احساس سے لرز رہا ہو۔ لمبے لمبے قدم اٹھاتا وہ آرام کرسی تک آیا اور گرمی کے احساس کا اور لطف لینے کے لیے ایک کمبل اپنے اوپر ڈال کر آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ آتشدان میں ابھی آگ جل رہی تھی۔ اس نے اپنا منہ ادھر ہی کر لیا اور شعلوں کی تابش سے اسے گرمی کی لہریں اپنے اندر اترتی معلوم ہوئیں۔

تھوڑی دیر بعد ایک سگرٹ سلگاتے ہوئے جب ماچس کی لو تھرتھرائی تو اسے یاد آیا کہ کھڑکی ابھی کھلی ہے اور یہ سرد جھونکا ادھر ہی سے آیا ہے۔ لیکن اس آرام دہ حالت سے اٹھ کر کھڑکی بند کرنا اسے قبول نہ ہوا اور خاموشی سے وہ سگرٹ کے کش پر کش لیتا رہا۔

کھڑکی کے باہر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ جیسے کوئی چلتے چلتے رک گیا ہو۔ وہ ٹھٹک گیا [illegible] یہ بھی کوئی راہی ہوگا۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ چند لمحوں بعد [illegible] کی آواز آئی جیسے ننھے بچے گود میں کلبلا کر روتے ہیں۔ تب [illegible] سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب آیا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ [illegible] گود میں ایک بچہ لیے کھڑی تھی۔ بچہ اس کے آنچل کے نیچے [illegible] ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔ بچہ ذرا ذرا دیر بعد زیادہ چیخنے لگتا تھا۔

یہ منظر جمال کے لیے نیا نہ تھا۔ بازار میں معلوم نہیں ایسے کتنے بچے ایسا ہی معلوم [illegible] ماؤں کی گود میں نظر آتے تھے۔ مگر اس وقت وہ اکیلا اس منظر کا شاہد تھا۔ اس وقت بازار میں وہ اکیلا رحم کرنے والا تھا۔ جمال کے دل میں رحم کا جذبہ طوفان کی سی تیزی سے امڈ آیا پہلے اس نے کھڑکی سے آواز دینی چاہی پھر کچھ سوچ کر دروازے سے باہر آیا۔ عورت نے یکایک اسے قریب پا کر کچھ حیرت اور خوف کے ساتھ اسے دیکھا مگر جمال کو اس کی آنکھیں رحم کی بھیک مانگتے [illegible] معلوم ہوئے۔

"تمہارا بچہ بہت رو رہا ہے۔ سردی لگ رہی ہوگی۔ تم نے کچھ نہیں پہن رکھا۔ اگر ٹھیک سمجھو تو کچھ دیر میرے کمرے میں ٹھہر جاؤ۔ ٹھنڈ سے بچہ بے حال ہوا جا رہا ہے۔" جمال کا لہجہ نرم تھا۔ عورت کو اس میں بڑا ہی خلوص معلوم ہوا۔ اس کی بات ایسی تھی جیسے کوئی مشورہ دے رہا ہو مگر عورت کو اس کے تیور ایسے لگے جیسے یہ حکم ہو۔ اگر عورت اسے نہ مانے گی تو وہ بچے کو زبردستی گود سے لے کر اندر چلا [illegible]

وہ چپ چاپ اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔

اندر آتے ہی بچے کے چیخنے میں کچھ فرق آ گیا۔ لیکن رونا بالکل بند نہ ہوا تھا۔ جمال کے کہنے پر چار پائی پر ایک طرف عورت بیٹھ گئی [illegible] نے گرم شال [illegible] عورت کی طرف بڑھائی۔ [illegible] نے شال لی اور بچے کو اس میں بالکل لپیٹ دیا۔ جمال نے [illegible] آرام کرسی آتشدان کے قریب کھسکا کر عورت کو اس پر بیٹھنے کو [illegible] کرسی [illegible] کے اس پر بیٹھ [illegible] سگرٹ [illegible]

عورت [illegible] بچے کا منہ ابھی [illegible] اس

پھر اٹھ کر اس نے کھانا بھی اس کے پاس رکھ دیا [illegible] کر

اپنی گھبراہٹ کم کی۔ جو کوشش کرنے پر بھی چھپ نہیں رہی تھی۔

کھڑکی اب بھی کھلی ہوئی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکے کبھی صرف جھانک کر چلے جاتے اور کبھی اندر چلے آتے۔ جمال نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ مگر بچہ اب بھی چیخ رہا تھا۔ جمال کچھ لمحے تشویش کے ساتھ عورت کی طرف دیکھتا رہا جیسے انتظار کر رہا ہو۔ مگر عورت پہلے کی طرح صرف بچے کو ہلا ہلا کر بہلاتی رہی۔ وہ ضبط نہ کر سکا بے چینی سے بولا: "بچہ اب بھی رو رہا ہے۔ شاید بھوکا ہے ـــــ اسے دودھ پلا دو نا۔" عورت کی آنکھیں نیچے جھک گئیں۔ مگر وہ یہ بات کہتے ہوئے دوسری طرف مڑ گیا تھا۔ اس نے عورت کی گھبراہٹ نہیں دیکھی۔ عورت کے چہرے سے ایک اندرونی کرب جھلک رہا تھا جیسے مادریت کی توہین ہو گئی ہو۔ مگر جمال نے اس کا بہت معمولی مطلب سمجھا: "کیا بات ہے، کوئی تکلف ہو تم کو؟ کمبل دے دوں؟" عورت نے سر ہلا کر نہیں کہا۔ "پھر کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟" عورت نے پھر سر ہلایا "نہیں۔" "تب پھر کیوں اسے بھوکا رلا رہی ہو؟" عورت خاموش رہی۔ البتہ بچے کو بار بار سینے سے لگا کر بھینچ لیتی اور تھپکیاں دے کر چپ کرانا چاہتی تھی۔ جمال نے چڑ کر کہا "بھئی یہ کیوں بے کار اسے ہلکان کر رہی ہو۔ آخر؟" عورت روندھے ہوئے لہجے میں بولی: "کل رات سے کچھ کھایا نہیں ہے دودھ کہاں سے لاؤں۔ ایک دانہ بھی منہ میں نہیں پڑا ہے۔ بچے کو کیا پلا دوں۔"

جمال ٹھٹک گیا۔ پھر اٹھ کر الماری کی طرف بڑھا۔ وہ خالی تھی۔ بس ایک ٹکیہ مکھن اور چھوٹی ڈبل روٹی رکھی تھی۔ اوپر کے تختے پر کچھ بسکٹ اور مل گئے۔ ان سب کو میز پر رکھ کر وہ عورت سے بولا: "اچھا تو اسے کھاؤ۔ میں ابھی چائے تیار کرتا ہوں۔ میں خود بھی پیوں گا۔" دوسرے کمرے میں جا کر وہ اسٹو جلا کر پانی گرم کرنے لگا۔

اس کے بے باک اور بے تکلف رویے سے عورت کچھ نہ بول سکی۔ یہ رویہ شاید اس کے لیے انوکھا بھی تھا اور غیر متوقع تھا۔ جیسے اسے کچھ [illegible] مگر اس نے سوچنے سمجھنے میں وقت نہیں [illegible] آہستہ آہستہ وہ میز کے قریب آئی۔ بچہ گود میں تھا [illegible] رہا تھا ایک ہاتھ سے اسے تھپکاتے ہوئے دوسرے سے کچھ کھانے کی کوشش کرنے لگی۔

جمال چائے تیار کر کے کیتلی لیے اس کے پاس آیا۔ ایک پیالی میں [illegible] ڈال کر اس نے کیتلی ڈھک دی اور پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ بچے کے مسلسل رونے سے عورت کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ جمال اٹھتے ہوئے کہا: "لاؤ بچے کو مجھے دے دو۔ تم آرام سے کھاؤ۔ تب تک میں اسے سنبھال لوں گا۔" بچے کو گود میں لے کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ بچہ اور تیز رونے لگا۔ اس نے اسے چمکارا۔ پھر تھپکیاں دے دے کر بہلانے لگا۔ میز کے قریب آ کر اس نے چمچے سے تھوڑا دودھ اس کے منہ میں ڈالا۔ پہلے تو بچہ ہاتھ پیر مارنے لگا۔ منہ بند کیے رہا۔ مگر دو قطرے منہ میں جانے کے بعد وہ ذرا سا پینے لگا۔ اس کے رونے میں کمی آ گئی۔

عورت چائے میں بسکٹ بھگو کر آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی طمانیت تھی جو بھوک کے ختم ہونے سے پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک ایسا تشکر تھا جو آدمی آنکھوں ہی سے ظاہر کرتا ہے۔ بار بار وہ بچے، اور پھر اس کی جانب دیکھتی۔ اس کی چائے ختم ہوئی تو جمال نے اور چائے ڈال دی۔ اب آرام کرسی پر بیٹھنے سے بچہ رو نہیں رہا تھا۔ وہ غوں غاں قسم کی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی تحیر تھا۔ مگر ماں کی حیرت سے مختلف۔ وہ نرم نرم انگلیوں سے اس کا چہرہ چھوتا۔ جمال اس کے منہ کے سامنے اپنا انگوٹھا لاتا تو وہ لپکتا۔ مگر وہ فوراً انگوٹھا کھینچ لیتا۔ کبھی انگوٹھے کو اپنی نازک گرفت میں لانے میں کامیاب ہو جاتا۔ تب وہ کھلکھلا اٹھتا۔ جمال بھی مسکرا دیتا۔ عورت برابر دیکھ رہی تھی۔ جمال نے اٹھ کر اپنے لیے بھی ایک پیالی بنائی اور آرام کرسی کے بازو پر رکھ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ پینے لگا۔

عورت کھا چکی تھی۔ اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بچے کو جمال سے مانگ کر اپنے آغوش میں بھینچ لے۔ اس کا انگ انگ پکار رہا تھا [illegible] دودھ اترنے لگا ہے [illegible] حالت سے [illegible] مگر اسے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اپنے محسن کی دلچسپی ختم کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ جمال چائے پیتے ہوئے بھی بچے سے کھیل رہا تھا۔ آخر وہ آتشدان کی طرف مڑ کر اپنے آپ کو گرم کرنے لگی۔

چائے ختم کر کے سگرٹ جلاتے ہوئے جمال کی نگاہ عورت پر پڑی وہ سگرٹ کا کش لے کر ادھر ہی دیکھتا رہا۔ کھمبے کی آڑ میں کھڑی کپکپاتی ہوئی عورت اور اس عورت میں، کتنا فرق تھا۔ وہاں جیسے سردی سے اس کی ساری رعنائی ٹھٹھر گئی تھی۔ مگر یہاں خون کی حدت نے اس کے ستے ہوئے چہرے کی رنگت کو پھر پیازی کر دیا تھا۔ ایک گہری بشاشت اس کے بشرے سے روشنی کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ اس کے احساس اور جذبات سب میں اس کا عورت پن نکھر آیا تھا۔ جمال منہ سے دھوئیں کے بادل چھوڑ کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

چند ثانیے تک کمرے میں کوئی آواز پیدا نہ ہوئی سکوت خود چپ چاپ اس مرد اور اس عورت کو تکتا رہا جن میں سے ایک کے خیالوں میں مستقبل کی فکر تھی اور دوسرے کے خیالوں میں عورت کا وجود۔

باہر سرد ہوا کی سائیں سائیں اور کھڑکی کے پٹ پر کبھی کبھی جھونکوں کی دستک فضا کے جمود کو توڑ دیتی تھی۔

سگرٹ کا دھواں مرغولوں کی صورت میں اوپر اٹھ رہا تھا۔ نیا دھواں منہ سے نکلنے پر گہرے ہلکے رنگوں کی لہریں دھوئیں کے بادل میں گھس جاتیں ان میں لچک تھی۔ خم تھا۔ ابھار تھا۔ جمال اس رنگین زیر و بم کو غور سے دیکھتا رہا۔ بچہ گود میں سو گیا تھا۔ سگرٹ ختم ہونے پر وہ کچھ کسمسایا۔ دھوئیں کی لہروں کا تسلسل غائب ہونے لگا۔ مگر چھت کے دائرے، ابھار، لکیریں نقش و نگار آہستہ آہستہ ایک عورت کے روپ میں ڈھلنے لگے۔

بچہ کچھ بے چینی سے ہلا، تو اس نے اٹھا کر اسے عورت کے حوالے کر دیا۔ اس وقت اسے وہ اتنے قریب معلوم ہوئی کہ وہ گھبرا کر جلدی سے واپس اپنی کرسی پر چلا آیا۔ مگر وہاں بیٹھ کر اسے ایسا لگا جیسے وہ خود وہیں رہ گیا ہو صرف اس کا سایہ آ کر کرسی پر بیٹھ گیا ہو۔

بچہ کچھ جاگ کر کنمنایا۔ عورت نے جاگنے کے ڈر سے اپنی گود سے الگ کر کے اسے کمبل پر لٹا دیا اور تھپکیاں دے کر سلانے لگی۔ اس کے جسم پر سے شال کھسک گیا تھا مگر وہ بچے کے وجود میں کھوئی ہوئی تھی

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا یوں رہنا، جمال کی توجہ کو اپنی طرف کھینچے لے رہا ہے ——— اور واقعی اب جمال یہ بھول گیا تھا کہ اس جسم کے وجود کی اس کے گھر میں کیا حیثیت ہے۔ یہ کون ہے؟ یہاں کیسے آئی؟ کہاں جائے گی؟ .... یہ باتیں سہم سہم کر اس کے ذہن سے یوں نکلتی گئیں۔ جیسے کسی جابر ملک کے آنے پر خادمائیں کمرے سے غائب ہو جائیں۔

.........اب اس کے ذہن پر صرف عورت کا قبضہ تھا۔

جمال کو ایسا معلوم ہوا جیسے ایکا ایکی اس کے اندر کسی آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا ہے اس کا وجود لاوا بن کر ابل رہا ہے۔ ایک عظیم طوفان خس و خاشاک سے لے کر سنگ گراں تک سب کو بہانے جانے کے تیور لئے، بڑھا چلا آ رہا ہے۔ ——— کہ کھڑکی کے پٹ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے ادھ ہڑاکے کی آواز کے ساتھ کھل گئے۔

اس آواز نے کمرے کے ہر فرد کو جگا دیا۔ بچہ اپنے شیریں خواب کی دنیا سے اس دکھ بھری زمین پر آ گرا اور جاگ کر رونے لگا۔ عورت مستقبل کی دنیا سے لوٹ آئی اور جلدی سے بچے کو تھپکنے لگی۔ جمال کے اندر کا طوفان ہانڈی کے ابال کی طرح بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے سرد جھونکے سے، اس کا آتش فشاں ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا اور کھڑکی بند کرنے بڑھا۔ پٹ بند کرتے ہوئے اسے ایک گھنٹے پہلے کی۔ کھمبے کی آڑ میں کھڑی ہوئی عورت کا خیال آیا جس کے چہرے پر طمانیت اور سکون کے وہ آثار نہ تھے جو اس وقت کمرے کے اندر کی عورت کی شکل سے نمایاں تھے

اور وہ عورت طمانیت کے باوجود اب بھی یہی سوچ رہی تھی کہ وہ یہاں سے کیسے جائے۔ اس کے بعد اس نے سوچا کہ کہاں جائے مگر پھر اسے یاد آیا کہ وہ ایک اجنبی گھر میں ہے۔ اس بات نے شاید اس کا سارا تامل ختم کر دیا۔ جمال کی طرف مڑ کر وہ بولی، "مجھے اب جانا ہے بابو۔ بہت دور گھر ہے۔ رات زیادہ ہوتی جا رہی ہے ——— آپ نے میرے اوپر رحم کھایا میں آپ کو کیا دعا دوں۔ آپ ایسے لوگ تو ان باتوں سے بہت اونچے ہوتے ہیں ——— اچھا اب جاتی ہوں۔ مالک مہربان ہوا تو اپنی کوٹھری تک پہنچ جاؤں گی۔"

جمال اس کی طرف مڑ کر بولا "لیکن تم جاؤ گی کہاں ——— جب

تمہارے پاس دو وقت کھانے کو نہیں۔ تو رہتی کہاں ہو؟" پھر کچھ رک کر بولا: "آخر تم ادھر سے کیسے آ گئی تھیں؟"

"میں بڑی ابھاگن ہوں بابو۔ میرا مرد جب سے مرا ہے میرا سب کچھ لٹ گیا۔ کارخانے سے اس کے مرنے پر کچھ روپے ملے وہ بھی سب اٹھ گئے۔ بس اس گھڑی سے سارے دکھ میرے پیچھے پھر رہے ہیں۔" اس کی آواز پھر رندھ گئی۔ پھر بچے کو اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے کہا: "مالک آپ کا بھلا کرے بابو۔" اور چٹخنی کھولنے لگی۔

جمال چپ رہا۔ شاید وہ اس بے رحم موسم کا خیال کر کے اسے روک لیتا۔ اگر اسے کچھ دیر پہلے کے طوفان کا سامنا نہ کرنا پڑا ہوتا۔ "اچھا ــــــ دیکھو یہ لیتی جاؤ۔" وہ کمبل دے کر صرف اتنا کہہ سکا۔ عورت نے امڈتے ہوئے آنسوؤں میں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے شکریہ ادا نہیں کیا۔ البتہ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ کمبل لپیٹ کر وہ رخصت ہو گئی۔

اس کے چہرے کی آخری دمک نے جمال کو پھر وہ سب کچھ یاد دلایا جو ابھی اس کے خیال میں آیا تھا۔ جذبات کے سوتوں کو پھر سر نکالنے کا موقع ملا۔ وہ جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ مگر چھت کے ہر دائرے، ہر نقش نے اس کے تصور میں پھر ایک عورت کو لا کھڑا کیا۔ وہ عورت قریب آتی گئی اور آتش نشاں کی حدت بڑھتی گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس طرح جیسے کوئی خواب میں چلتا ہے، وہ دروازے تک گیا۔ اسے کھولا۔ اور باہر نکل گیا۔ اس کے تیز تیز قدم ادھر بڑھنے لگے جدھر ابھی عورت گئی تھی۔ طوفان اسے کھینچے لئے جا رہا تھا اور وہ بہہ رہا تھا۔

ایک بچے کے رونے کی آواز اسے ایک طرف سے سنائی دی وہ خواب سے بیدار ہو گیا مگر غفلت سے نہیں۔ یخ بستہ چاندنی میں سیاہ کمبل کی گٹھری نظر آئی۔ وہ قریب گیا۔ بچہ اس میں لپٹا زور زور سے رو رہا تھا۔ اس نے متحیر ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کسی کا پتہ نہ تھا۔ اس نے مڑ کر پھر اس بچے کو دیکھا جو کچھ دیر پہلے اس کی گود میں .. کلکاریاں مار رہا تھا۔ پھر ہنس رہا تھا۔ پھر سو رہا تھا۔ اور اب یہاں پڑا ہے۔ ایسا بے آسرا جیسے گناہ کی پوٹلی ہو۔ جمال نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ وہ ٹھنڈ سے بالکل یخ ہو رہا تھا۔

اپنے مفلر کو اس کے گرد لپیٹ کر وہ اپنے سینے سے لگائے واپس ہوا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ اندر داخل ہو ہی رہا تھا کہ پیچھے سے تیز قدموں کی چاپ سن کر رک گیا۔

بے حال پھولے ہوئے دم کے ساتھ وہ عورت دوڑتی ہوئی آئی اور دور سے چلا کر بولی: "میرا بچہ مجھے دیدو۔ ہائے بابو میرا لال۔"

جمال اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ پھر چپ چاپ بچے کو لے کر کمرے میں چلا گیا۔ بچہ اتنی دیر میں گرمی پا کر پھر سو گیا تھا۔ آتشدان کے پاس آرام کرسی پر آہستہ سے اسے لٹا کر وہ مڑا۔ وہ عورت ٹوٹی ہوئی ڈال کی طرح دروازے سے لگی، نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ بہتے ہوئے آنسوؤں کی دو لکیریں، کمرے کی روشنی میں اس کے چہرے پر دمک رہی تھیں اور وہ چوکھٹ کا در پکڑے ساکت کھڑی تھی۔

"تم کیسی عورت ہو؟" جمال کچھ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تمہارے اندر ممتا نہیں رہی تو کیا انسانیت بھی نہیں ہے؟ اس معصوم کو سڑک پر اس طرح ڈال کر تم آخر کیا اسے مار ڈالنا چاہتی تھیں؟"

جمال نے غصے میں بہت کچھ کہا۔ اسے خدا کا خوف دلایا۔ اخلاق کی بات کی۔ اور نہ معلوم کس کس کا نام لے کر اسے شرم دلائی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ چپ ہوا تو عورت نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان میں معافی کی طلب بھی تھی اور ہلکی سی ملامت کی جھلک بھی۔ جمال کو اس کے نہ بولنے سے اور بھی غصہ آیا۔

"اس طرح بت بنی میرا منہ کیا دیکھتی ہو۔ کیا تمہارے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے؟"

"ہے تو، بابو۔" وہ کچھ اٹکتے ہوئے بولی: "مگر میں کس کو سناؤں؟ آپ مجھ دکھیاری پر کیوں بگڑتے ہیں۔ میرے نصیب پر بگڑیئے۔ میں نے اسے سڑک پر یوں چھوڑ دیا تھا کہ کوئی دیالو ایسا ہو گا جو اسے راستے میں پڑا دیکھ کر اٹھا لے گا۔ کچھ نہ کچھ پیار تو اسے میرے لال کو دیکھ کر آ ہی جائے گا۔ اور مجھے اس کے لئے اپنی عزت کا سودا نہ کرنا پڑے گا۔" وہ چپ ہو کر پیار بھری نظروں سے بچے کو دیکھنے لگی مگر وہاں سے ہٹی نہیں۔ جمال یہ سب باتیں سنتے سنتے اس کی طرف

لگے رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ عورت بچے کی طرف تکتا ہوئے بولی "میں اکیلی ہوتی تو چار وقت بھی فاقہ کر کے کاٹ لیتی۔ دم ہی تو نکل جاتا۔ لیکن یہ ممتا کیسے مانے کہ بچہ دودھ کی بوندوں کے لئے پھڑک پھڑک کر ادھ موا ہو جائے۔ یہ میرے بس ہوا میں مر جائے تو اس کا کیا بنے گا۔ بس یہی بات سوچ کر میں منہ کو آنے لگتا ہے۔ ممتا سب کچھ کرا لیتی ہے بابو ——— عزت بھی بکوا دیتی ہے ——— اور بچہ بھی سڑک پہ ڈلوا دیتی ہے۔"

"کیا تم اپنے آپ کو بیچا کرتی ہو؟" جمال کے منہ سے بے اختیار نکلا..........

عورت جیسے سہمی بیٹھی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر روتے ہوئے کہا۔ "یہ بات نہ کہئے بابو۔ ایسی بات میں دھیان میں بھی نہیں لا سکتی۔ پر آج ایسے ہی کوئی کسی کی مدد کب کرتا ہے۔ کوئی دنیا سہارا دیتا ہے تو پہلے دام چاہتا ہے۔ میں کیا دام دوں۔ میری عزت آبرو پہلے کو اپنا دام معلوم ہوتی ہے ——— بابو ساری دنیا آپ جیسی نہیں ہے۔ ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر پاپی ہے آپ کو یہ بات عجیب لگتی ہے۔ مگر آپ جیسے پاک آدمی......"

وہ بہت کچھ کہتی رہی مگر جمال اب عورت کی بات نہیں سن رہا تھا۔ وہ فرش کو تک رہا تھا جہاں سے انسانوں کا ایک گروہ اس کے تصور تک بڑھتا آ رہا تھا۔ خوش پوش، شریف کہلانے والے انسان، مکلف پہنے پڑھے لکھے انسان اچھے مرتبے اور حیثیت والے انسان سبھی انسان تھے ——— سب ہی نے اس عورت کو لوٹا تھا۔ اس کی ممتا کی آبرو ریزی کی تھی اور پھر اسے دربدر بھیک ایسے ہی کسی دوسرے انسان کے پاس پہنچنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ حتیٰ کہ دنیا اور اس کے رہنے والوں کی نیکی پر سے اس کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ اور وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو سڑک کے کنارے پھینکنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ جمال کو اس مجمع میں چھپتا ہوا ایک ایسا شخص نظر آیا جسے دیکھ کر وہ خوف سے لرز گیا۔ اس ٹھنڈ میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے اور وہ پریشان نگاہیں اٹھا کر بس عورت کو دیکھنے لگا جس کے لب ہلتے معلوم ہوتے تھے مگر آواز اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

یہ چھپا ہوا شخص خود جمال تھا۔

(انشکریہ "نئی تسلیم")

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہو

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری مارچ ۷۸ء کے اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیج کر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی پی مطلوب ہے... اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم :- منیجر "تشخیر" کراچی۔

۲۲۲۸ میسرز نور اسو ٹا فرشیکری ۔ راولپنڈی۔

۲۲۳۸ جناب ظہور الدین صاحب ناظم آباد۔ کراچی۔

۲۲۳۲ جناب ایم عبدالغنی صاحب ۔ ڈیرہ غازی خاں۔

۲۳۱۷ محترمہ ثروت سلطانہ صاحبہ۔ کراچی۔

۲۴۹۰ جناب تقی علی صاحب۔ اچھرہ لاہور۔

۲۵۵۱ میسرز بسیلے شوکمپنی۔ کمیم پو کیری۔ بھارت۔

کوثر اعظمی

اتنا تو فیض پائے ہیں برق تپاں سے ہم
بے فکر ہو گئے ہیں غمِ آشیاں سے ہم
سرشار و محوِ خواب تھے غفلت شعار تھے
چونکے زہے نصیب کہ بانگِ اذاں سے ہم
حاضر ہیں اب بھی دیدہ و دل جسم و جان بھی
گذرے ہزار بار ہیں یوں بھی آسماں سے ہم
پرواز ہم سے خاک نشینوں کی دیکھئے
آگے بہت گئے ہیں حدِ آسماں سے ہم
کیا کیا نہ ٹھوکروں سے ہمیں واسطہ پڑا
پھر بھی جبیں لگائے رہے آستاں سے ہم
پہنچے ہیں اب تو گامِ طلب تا حدِ یقین
ہوائے کب کے کوچۂ وہم و گماں سے ہم
آتو گئے تھے زد پہ مگر دامنِ نظر
لو ہم بچا ہی لائے ہیں شعلہ فشاں سے ہم

درشہل القادری

اب تو یاد میں ان کی بے خودی سی رہتی ہے
پہلے غم رلاتا تھا، اب خوشی سی رہتی ہے
اک اسیرِ فرقت کی زندگی بڑھانے کو
شمع بجھ نہیں جاتی، پر بجھی سی رہتی ہے
تیری بزم سے اٹھ کر، لطفِ زندگی کھو کر
زندگی تو کیا رہتی، زندگی سی رہتی ہے
تھا کبھی چمن اپنا عشرتوں کا گہوارہ
اب تو لالۂ گل میں دشمنی سی رہتی ہے
زیست سے اماں پائی جب کے فیض سے ہم نے
اب بھی ان کی نگاہوں کی برہمی سی رہتی ہے
جب سے میں نے پائی ہے راہِ آستاں ان کی
دل میں اور حسرت میں بے رخی سی رہتی ہے
پہلے ہر خوشی رشدی، ڈھونڈتی تھی میرا گھر
اور اب یہ عالم ہے ..... اجنبی سی رہتی ہے

ساقی فاروقی •

تخلیق ختم ہوگئی ہے، فنکار تھک گئے ہیں، فن پڑ گئے ہیں پھیکے
ہم کیا کریں گے لیکر مہتاب اور سورج گہنائی روشنی کے
مانا کہ بیکلی تھی، دل تھا تو زندگی تھی، سینے میں روشنی تھی
کیا چیز ہار بیٹھے، پر لوٹ زندگی کے اب کیا کریں گے جی کے
کجلا گئیں شعاعیں، گہنا گئے اجالے، سنولا گئے سویرے
اس روشنی کی خاطر ہم نے لٹا دیئے تھے کتنے سہاگ ٹیکے
مہکیں گی پھول بن کر دہکیں گی آگ بنکر ہیں تو رہیں فضائیں
دنیا سراہتی ہے، ہیں دیکھنے کے قابل تیور کلی کلی کے
اک فیصلہ کیا ہے اب کچھ دنوں سے ہم نے عنواں بدل دئے ہیں
گاتے تھے گیت ہم بھی گاؤں کی روشنی کے ناتھوں کی چاندنی کے

ظفر اورنگ آبادی •

کسی سے ہو نہ سکی جو وہ بات حاصل کی
بنا جہاں سے مٹا ڈالی شرک و باطل کی

نہ کیوں عزیز ہے مجھ کو بے خودی دل کی
اسی نے راہ نکالی جنوں کی منزل کی

جھلک ذرا تو دکھا اپنے حسن کامل کی
تری تلاش میں پھرتی ہے آرزو دل کی

سنا کے قصے بے مہریٔ فریب لقا
کہو تو طرز بدل دوں تمہاری محفل کی

کچھ آبلے بھی ہیں اور آبلوں میں کانٹے بھی
سند ہنوز کف پا میں ہے منازل کی

کہیں وطن سے اسیرِ وطن نکلتے ہیں
چمن سے نعش نکالی گئی عنادل کی

یہ میرا ذوق نظر تھا کچھ اس طرح دیکھا
تجلیاں ہی بدل دیں جمال حاصل کی

اُدھر حجابوں نے تکمیل دی جمالوں کو
جنوں نے بیخودیٔ دل اِدھر مکمل کی

جنونِ قیس نہ جانے جنون کیسا تھا
کہ دھجیاں بھی اڑائی گئیں نہ محمل کی

جمالِ یار کا مسکن تو خانۂ دل ہے
اب آپ ہمیں حقیقت بتائیں محمل کی

ظفر وہ حسن عجب حسن بے نیازی ہے
حجاب کی ہے ضرورت جسے نہ محمل کی

تذکرے اور تبصرے

"انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام"

مصنف :- عبدالحمید صدیقی ایم اے
شائع کردہ :- مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ لاہور۔
قیمت :- تین روپے آٹھ آنے

جناب عبدالحمید صدیقی ایم اے کی کتاب "انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام" جسے مرکزی جماعت اسلامی پاکستان نے شائع کیا ہے۔ اس اعتبار سے ایک قابل مطالعہ کتاب ہے کہ اس میں مصنف نے نہایت علمی انداز میں یورپ کے جدید سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے ردعمل کے طور پر پیدا شدہ اشتراکی نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ان افکار کی بدولت انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا بلکہ سرمایہ دارانہ جمہوریت اور کمیونزم کی نام نہاد مزدور حکومتوں کے نتیجہ میں حالات اور زیادہ ابتر ہو چکے ہیں۔

قابل مصنف نے تہذیب الحاد کے اجزائے ترکیبی پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مادیت اور الحاد کی بنیاد پر جو تہذیب بھی قائم ہوگی وہ ہمارے لئے تباہ کن ثابت ہوگی اور ہمیں اگر اپنی نجات مطلوب ہے تو خدا پرستی اور صحت مند مذہبی تصورات کی اساس پر ایک نیا نظام فکر و عمل تیار کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے یورپ کے مادیت پسند مفکرین کی مذہب بیزاری کے تاریخی اسباب کا بھی ایک جائزہ لیا ہے اور ان مفکرین نے معاشرتی ارتقاء کا جو تصور پیش کیا تھا اس کے نقائص بھی بیان کئے ہیں۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اشتراکیت کی ناکامی کو ظاہر کرنے کے بعد مصنف نے اسلام کو ایک نظامِ حیات کے طور پر پیش کیا ہے مگر کتاب کا یہ پہلو کافی تشنہ ہے اگر اس بارے میں بھی مزید وضاحت اور تفصیل ہوتی تو یقیناً یہ کتاب بہت مفید ہو سکتی تھی۔

مصنف کا انداز بیان بے حد سلجھا ہوا ہے اور زبان بھی کافی اچھی۔ جگہ جگہ مغربی مفکرین کے اقتباسات نے مزید دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ کتابت و طباعت کا معیار بھی بلند ہے، کاغذ اچھا استعمال کیا گیا ہے اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ (ع ۔ ک ۔ ع)

"آدم کے تین بیٹے"

مصنف :- اسعد گیلانی
شائع کردہ :- مکتبہ تعمیرِ انسانیت۔ لاہور۔
قیمت :- ایک روپیہ بارہ آنے

اسعد گیلانی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ "آدم کے تین بیٹے" ان کی حالیہ تصنیف ہے جس میں ان کی پانچ تمثیلات کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ تمثیل ایک طویل استعارہ یا ایک مجازی اور رمزی قسم کا انداز بیان ہے جس میں کسی صفت یا خامی، نیکی یا بدی یا کسی خیال و فکر و نظریہ جیسی غیر مرئی چیز کو شخص (Personify) کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ تمثیل کے لئے اسی وجہ سے تخیل کی بے پناہ بلندی اور زبان و بیان کی بے حد دلکشی اور چاشنی بہت ضروری ہوتی ہے تاکہ قاری فضا، ماحول اور زبان سے اس قدر مسحور ہو جائے کہ کردار کی غیریت اور مصنف کی مقصدیت کو محسوس کئے بغیر اس کا وہی اثر قبول کرے جو مطلوب و مقصود ہو۔ اردو ادب میں محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال اور انگریزی ادب میں بنیان (Bunyan) کی پلگرمس پراگرس (Pilgrims Progress) اور اسپنسر (Spencer) کی فیری کوئین (Faerie Queen) قابل ذکر تمثیلات ہیں۔ آزاد کے بعد اردو میں کسی معقول تمثیل نگار کا نام لینا مشکل ہوگا۔ تمثیل کی حد تک "آدم کے تین بیٹے" کا شمار بھی اسی صنف ادب میں ہوگا

مقصدی نقطۂ نظر سے ان تمثیلات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محض ڈارون، روبل، اشتراکیت، سرمایہ داری یا اسی طرح کی کسی بھی چیز کا پیوند کسی ناخداترس نظام کو انسانیت کے لئے خوش آئند اور صحت مند نہیں بنا سکتا۔ انسانیت کی نجات اور فلاح خالق کے وضع کردہ قوانین کی پابندی ہی میں ہے۔ یہ بات رفتہ رفتہ ایک ایسی حقیقت بنتی جا رہی ہے جس کا احساس اور کبھی کبھی اعتراف ہمیں مغرب کے خدا آزاد مفکرین کے ہاں بھی ملنے لگا ہے۔

فنی نقطۂ نظر سے اسعد کی تمثیلات تخیل کے سپاٹ پن اور زبان و بیان کی بے کیفی کی وجہ سے طنزیہ خاکے بن جاتی ہیں۔ یہاں تحریر کی روانی اور سلاست چاشنی اور شگفتگی کے بجائے تقریر کی گھن گرج اور ہما ہمی زیادہ ہے جس سے نہ تو تمثیل کی مناسب فضا اور ماحول ہی پیدا ہوتا ہے نہ قاری زبان ہی کے چٹخارے محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں نیرنگ خیال کی چاشنی اور شگفتگی کے مقابلہ میں یہاں پھیکا پن اور خشکی زیادہ ملتی ہے۔

طباعت و کتابت معقول ہے۔ (م۔ ح۔ ص)

ماہنامہ "گل خنداں" لاہور کا

"جدید غزل نمبر" ماہ جنوری ۵۷ء

مکتبہ گل خنداں لاہور نے ۱۹۵۷ء کے لئے بارہ نمبروں کا پروگرام بنایا ہے۔ جدید غزل نمبر ماہ جنوری اسی کی پہلی کڑی ہے۔ جدید غزل کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے۔ اس سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے۔ اس لحاظ سے اس نمبر میں حالی سے لیکر زمانۂ حال کے شعراء تک کی منتخب غزلوں کا ایک گلدستہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک قابل قدر کوشش ہے۔ جس کی بدولت یہ مختصر سا مجموعہ گوناگوں مذاق کی تسکین کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات یقیناً قابل ذکر ہے۔ متاخرین کی غزلوں کے انتخاب کے بعد اس مجموعہ میں صرف ان لوگوں کو جگہ دی گئی ہے جو یا تو ترقی پسند ہیں۔ یا کسی بھی ادبی تحریک سے متعلق نہیں ہیں مثلاً جگر، روش وغیرہ۔ اس پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا ہو لیکن ترقی پسندوں کے علاوہ بھی کچھ شعراء ایسے ہیں جو اس مجموعہ کے لئے منتخب کردہ بیشتر ترقی پسند شعراء سے نہ صرف یہ کہ کسی طرح کم نہیں بلکہ بہتوں سے افضل بھی ہیں۔ مثلاً ماہر القادری، نعیم صدیقی، حفیظ میرٹھی، کوثر نیازی، مسعود جاوید، یعقوب طاہر، بنت مجتبیٰ مینا وغیرہ۔ غالباً ان لوگوں کو نظر انداز کرنے کی صرف یہ وجہ ہے کہ یہ اسلام پسندی کے مجرم ہیں۔ ترقی پسند حضرات کے لئے اسلام پسند پہلے تو طنز و استہزاء کے مستحق ٹھہرے تھے۔ مگر اب انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے حالانکہ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اسلام ایک ابدی اور عالمی حقیقت ہے اور جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تحریک اسلامی اور اسلامی ادب بھی ایسی حقیقتیں ہیں جنکی مخالفت تو ممکن ہے مگر اب انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے کچھ حضرات اگر بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھکر دنیا کو اسی گنبد تک محدود سمجھیں تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؎

بہ ایں عقل و دانش بباید گریست

سرورق۔ دیدہ زیب۔ کتابت و طباعت معقول ہے۔
قیمت :۔ ایک روپیہ

(م۔ ح۔ ص)

ماہنامہ سوداگر (اشاعت خاص)

صفحات ۲۳۴

قیمت :۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

ماہنامہ سوداگر کی یہ اشاعت خاص کئی لحاظ سے قابل دید ہے۔ ڈیڑھ روپے میں ۲۳۴ صفحات کی یہ شیرازہ بندی گوناگوں خصوصیات اور خوبیوں کی حامل ہے۔ ادب، سیاست، تجارت، زندگی کے یہ تین پہلو پیش کئے گئے ہیں اور پھر کن عنوانات کے تحت؟ شعلہ و شبنم، قوس قزح، سنگ و خشت اور اپنی باتیں، ان عنوانات کا تعین اور پھر ان کے تحت جمع کیا ہوا مواد مرتب کرنیوالوں کے حسن ذوق اور سلیقے کا پتہ دیتا ہے۔ ہمارے خیال میں جن شعراء اور ادیبوں کے کلام اور افسانے جمع کئے گئے ہیں ان کے نام ہی اس اشاعت کے معیار کی وضاحت کے لئے کافی ہیں۔ حصہ نظم میں ماہر القادری، اسعد ملتانی، نعیم صدیقی، ابو المجاہد زاہد، یعقوب طاہر، بنت مجتبیٰ مینا، افسانوں اور ڈراموں میں لالہ صحرائی، ابن فرید، آثم مرزا، اسلم قریشی وغیرہ کے نام محتاج تعارف نہیں ہیں اور ان کا حصہ لینا ہی اشاعت کے معیار کی بڑی سند ہے۔

(م۔ ح۔ ص)

باوقار تنظیم

باوقار تنظیم کی ماہ فروری کی ڈرائنگ بتاریخ ۱۰ فروری ۱۹۵۷ء بروز اتوار بوقت ساڑھے تین بجے سہ پہر بمقام صدر دفتر باوقار کمپنی لمیٹڈ بالمقابل ملباری ... بانی ہسکول بندر روڈ کراچی منعقد ہوئی۔ اس اجلاس کی صدارت جناب مولانا ماہر القادری صاحب مدیر "فاران" کراچی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں دو ڈرائنگز ہوئیں پہلی گروپ I کی دوسری ڈرائنگ، اور دوسری گروپ II کی پہلی ڈرائنگ۔ تلاوت کلام پاک کے بعد اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ باوقار کمپنی لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائریکٹر نے عمل ڈرائنگ کے متعلق ایک تجویز پیش کی جسے حاضرین جلسہ نے اتفاق رائے سے منظور کیا۔ چنانچہ اس ڈرائنگ کا عمل اس تجویز کے مطابق، حسب ذیل طریقہ پر ہوا۔

کاغذ کی چھوٹی چھوٹی پرچیاں بناکر میز پر رکھدی گئیں ...د حاضرین سے درخواست کی گئی کہ جو صاحب عدد دینا چاہیں وہ ...ک پرچی لے لیں اور اُس پر اپنا نام، رول نمبر، گروپ نمبر اور جو عدد ...دینا چاہیں لکھدیں اور پرچی کو اسطرح تہہ کردیں کہ انکا لکھا ہوا عدد ...د نام وغیرہ اندر چھپ جائے میز پر ایک شیشے کا جار رکھدیا گیا اور اُن سے ...ا گیا کہ اپنی اپنی تہہ شدہ پرچیاں جار میں ڈالتے جائیں۔ جب سب پرچیاں ...چیاں جار میں جمع ہوگئیں اور کوئی مزید عدد دینے والا نہ رہا تو اُن سے ...یافت کیا گیا کہ جار میں جمع شدہ پرچیوں سے کتنی پرچیاں ڈرائنگ کے ...ل میں شمار کرنے کیلئے نکال لی جائیں سب نے اتفاق رائے سے کہا کہ سات ...چیاں نکال لی جائیں چنانچہ جار کے اندر پرچیوں کو اچھی طرح سے ہلاکر ملادیا ...یا اور میز پر الٹ دیا گیا اور ایک کمسن بچے کو کہا گیا کہ وہ کوئی ایک پرچی اٹھاکر ...ماحب صدر کو دیدے۔ بچہ ایک ایک پرچی اٹھاتا تھا اور صاحب صدر کو ...ے دیتا تھا۔ صاحب صدر اسے کھول کر اسکا نام، رول نمبر، گروپ نمبر ...ر مجوزہ عدد باآواز بلند پڑھ کر سناتے تھے جسے حاضرین میں سے عمل کرنیوالے حضرات نوٹ کرتے جاتے تھے، اور صاحب صدر کے پاس بیٹھا ہوا تنظیم کا ایک کارکن بھی نوٹ کرتا جاتا۔ اسطرح جب یکے بعد دیگرے سات پرچیاں اٹھائی گئیں اور ان کے نام نمبر اور عدد نوٹ کرلئے گئے تو باقی ماندہ پرچیوں کو بغیر ان کے پڑھے پھاڑ دیا گیا اور انہی سات پرچیوں ...ے اعداد کو لیکر مجوزہ طریقہ پر عمل کیا گیا۔ اس طرح کے عمل سے کسی قسم کی جانبداری کا کوئی احتمال باقی نہ رہا اور اس لئے حاضرین نتائج سے مطمئن ہوگئے۔ آئندہ بھی ڈرائنگ ...ے لئے یہی طریقہ اختیار کیا جائیگا۔ اس طرح جو عمل کیا گیا اسکے کوائف حسب ذیل ہیں:-

گروپ نمبر I دوسری ڈرائنگ :-

(۱)	گروپ نمبر I	رول نمبر ۱۷	جناب سی کے احمد صاحب	۱۷۰
(۲)	گروپ نمبر I	رول نمبر ۳۶۴	جناب چاند محمد صاحب	۸۷۰۹
(۳)	گروپ نمبر I	رول نمبر ۴۵۱	جناب محمد سلیم صاحب	۳۱۴۷
(۴)	گروپ نمبر I	رول نمبر ۱۲	جناب احمد سعید صاحب	۹۸۷۶۵

اعتذار

"مشیر" فروری ۵۷ء کے شمارہ میں افتتاحی ڈرائنگ کے جو کوائف شائع ہوئے تھے، ان میں کتابت اور سنگسازی کی غلطی سے ایک 'عدد' اور ایک 'رول نمبر' غلط شائع ہوگئے تھے۔ اس کی وجہ سے ڈرائنگ کا نتیجہ اخذ کرنے میں غلط فہمی پیدا ہونے کیلئے ہم ممبران تنظیم سے معذرت خواہ ہیں آئندہ انشاءاللہ تعالیٰ اس سلسلے میں پوری احتیاط برتی جائیگی۔ ڈرائنگ کا اصل چارٹ جس پر اس ڈرائنگ کے صدر جناب حکیم محمد اقبال حسین صاحب مالک آئی سنار پاکستان کراچی کی تصدیق موجود ہے ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اگر کوئی صاحب دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں۔ صحیح اعداد اسطرح ہیں

(۱) گروپ نمبر (۱) رول نمبر ۳۷۰ - جناب مستری تاج محمد صاحب کراچی

(۲) گروپ نمبر (۱) رول نمبر ۴۷۴ - عائشہ بیگم نابالغہ بتوسط (والد) جناب تمیز الدین صاحب کراچی۔ عدد: ۹۲ ——— غلطی یہ ہوئی تھی کہ پہلے نمبر شمار میں ممبر کا رول نمبر ۳۷۰ کی بجائے ۳۰۷ چھپ گیا تھا اور نمبر شمار (۲) میں عدد ۹۲ کی بجائے ۱۹۲ چھپ گیا تھا۔

(ادارہ باوقار تنظیم کراچی)

(۵)	گروپ نمبر II	رول نمبر ۴۷۲	جناب ایس ایم حسین صاحب	۲۴۰
(۶)	گروپ نمبر I	رول نمبر ۲۴۴	جناب عبدالغفور بھٹی صاحب	۹۸۷۸۵
(۷)	گروپ نمبر II	رول نمبر ۴۴۶	جناب رفیق احمد صاحب	۱۱۱۲۲۲

حاصل جمع = ۳۲۲۰۳۸ × ۷ =

حاصل ضرب = ۲۲۵۴۲۶۶ ÷ ۵۰۱ باقی عدد = ۲۶۷

کامیاب رول نمبر ۲۶۷ گروپ نمبر I جناب محمود علی صاحب پورٹ اکاؤنٹس۔ سی۔ آر۔ پی چٹاگانگ (مشرقی پاکستان) اس ماہ کی امدادی رقم کے مستحق پائے۔

گروپ نمبر II پہلی ڈرائنگ :-

(۱)	گروپ نمبر I	رول نمبر ۹	جناب اشرف بیگ صاحب	۷۹۲۳
(۲)	گروپ نمبر II	رول نمبر ۴۹۲	جناب عبدالبشیر خاں صاحب	۱۸۴۶۳
(۳)	گروپ نمبر I	رول نمبر ۵۸	جناب پی ڈی مصطفےٰ صاحب	۱۱۰۰۳
(۴)	گروپ نمبر II	رول نمبر ۴۶۱	جناب عبدالقادر صاحب	۲۶۰
(۵)	گروپ نمبر I	رول نمبر ۳۳۶	جناب فضل حسن عثمانی صاحب	۳۱۵۰۶
(۶)	گروپ نمبر II	رول نمبر ۴۴۴	جناب ملک مختار احمد صاحب	۳۰۲
(۷)	گروپ نمبر II	رول نمبر ۴۴۵	جناب ایم اصغر ملک صاحب	۴۵۱

حاصل جمع = ۶۹۹۱۳ × ۷ =

حاصل ضرب = ۴۸۹۳۹۱ ÷ ۵۰۱ باقی عدد = ۴۱۵

کامیاب رول نمبر ۴۱۵ گروپ نمبر II جناب محمد علی صاحب لٹ بستی، نزد ریڑھی، لانڈھی کراچی

جلسہ صاحب صدر اور حاضرین کے شکریہ کے ساتھ برخواست ہوا۔ ادارہ بادی تنظیم جناب مولانا ماہر القادری صاحب کا جو کہ خود بھی اس تنظیم کے ممبر ہیں بیحد شکر گزار ہے کہ انھوں نے اس ڈرائنگ کی صدارت کے فرائض انجام فرما کر کارکنانِ تنظیم کا ہاتھ بٹایا۔ چونکہ ہر دو کامیاب رول نمبر والے صاحبان اس وقت موجود نہیں تھے اسلئے رول نمبر ۲۶۷ گروپ I جناب محمود علی صاحب چٹاگانگ مشرقی پاکستان کو حبیب بنک چٹاگانگ کی معرفت پانچسو روپے کی امدادی رقم کی ادائیگی کرا دی گئی اور رول نمبر ۴۱۵ گروپ II کو صدر دفتر میں بلا کر پانچسو روپے کی امدادی رقم کی ادائیگی کر دی گئی۔ فروری ۵۷ء کی ڈرائنگ کے نتیجہ کا اعلان "جنگ" اور "انجام" کراچی اور "تسنیم" لاہور مورخہ ۱۲ فروری ۵۷ء میں کر دیا گیا۔

دوسرا گروپ ۲۸ جنوری کو مکمل ہو گیا تھا اور ۲۹ جنوری سے تیسرے گروپ کی بکنگ شروع ہو گئی تھی۔ خیال تھا کہ اگر تیسرا گروپ ۷ فروری سے پہلے پہلے مکمل ہو گیا تو اسکی پہلی ڈرائنگ بھی ۷ فروری ہی کو باقی دونوں گروپوں کے ہمراہ کر دی جائے گی مگر افسوس ہے کہ معاملہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ تیسرے گروپ کا رول نمبر ۴۷۶ تک پہنچا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ تیسرا گروپ بھی ۱۶ فروری ۵۷ء کو مکمل ہو گیا ہے اور چوتھے گروپ کی بکنگ شروع کر دی گئی ہے۔ اگر چوتھا گروپ بھی ۷ مارچ تک مکمل ہو گیا تو انشاءاللہ العزیز ہم ۷ مارچ ۵۷ء کو چاروں گروپوں کی ڈرائنگ کریں گے۔ یعنی پہلے گروپ کی تیسری ڈرائنگ، دوسرے گروپ کی دوسری ڈرائنگ اور تیسرے اور چوتھے گروپ کی پہلی ڈرائنگ۔ مگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر مذکورہ بالا کو صرف تین گروپوں کی ڈرائنگ ہوگی۔

ماہ مارچ کی ڈرائنگ ۱۷ مارچ ۵۷ء کو بروز اتوار حسب سابق ۳ بجے منعقد ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔ ایجنٹ حضرات و دیگر ممبران تنظیم نوٹ فرمالیں۔ دوسرے گروپ کے ممبران کی پوری فہرست اور اُن کے رول نمبر وغیرہ اس شمارے میں شائع ہو رہے ہیں۔ اگر کسی ممبر کے نام یا پتہ میں غلطی ہو تو وہ اس کی اطلاع صدر دفتر کو دیں تاکہ اس کی اصلاح کردی جائے۔

گروپ نمبر ۱ کی پاس بکیں تقسیم ہو چکی ہیں اگر کسی ممبر کو پاس بک نہ ملی ہو یا کسی کی پاس بک میں کوئی غلط اندراج ہو تو وہ بھی صدر دفتر کو مطلع کرے تاکہ اس کی تصحیح کردی جائے۔ دوسرے گروپ کی پاس بکیں بھی تیار ہو رہی ہیں۔ فروری کے آخر تک ممبران تک پہنچادی جائیں گی۔ تیسرے گروپ کی پاس بکیں بھی انشاء اللہ مارچ کی ڈرائنگ سے پہلے پہلے ممبران تک پہنچادی جائیں گی۔

گروپ نمبر ۱ کی ماہ فروری ۵۷ء کی اقساط ۷۵٪ فیصدی وصول ہوئی ہیں اور ۲۵٪ فیصدی تاحال واجب الوصول ہیں۔ ممبران سے درخواست ہے کہ اپنی اقساط باقاعدگی سے ادا کرکے تنظیم کے نظم و نسق کو باقاعدگی سے چلانے میں ہماری مدد کریں۔ اگر ایجنٹ حضرات بروقت اقساط وصول نہ کرسکیں تو براہ راست صدر دفتر کو منی آرڈر فیس وضع کرکے باقی ۶/۱۴/- روپے کا منی آرڈر کردیں۔ منی آرڈر کوپن پر صرف اپنا نام، رول نمبر، گروپ نمبر اور لفظ 'قسط' لکھ دیں۔ اس کی رسید انھیں براہ راست مل جایا کرے گی۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں کہ:

انھیں پہلے گروپ کی تیسری اور دوسرے گروپ کی دوسری اقساط ۱۲ مارچ ۵۷ء تک وصول کرلینی چاہئیں اور انھیں صدر دفتر بھجوا دینا چاہیئے' اور آئندہ کے لئے ہر ماہ کی اقساط اُس ماہ کی ۱۲ تاریخ تک ضرور وصول کرلینی چاہیئے۔

ماہ مارچ ۱۹۵۷ء کی ڈرائنگ

۱۷ مارچ ۱۹۵۷ء بروز اتوار بوقت ساڑھے تین بجے سہ پہر حسب سابق بمقام صدر دفتر باوقار کمپنی لمیٹڈ کراچی منعقد ہوگی

ماہنامہ **مُشیر** کراچی

ایک سال کے لئے مُفت

باوقار تنظیم کا وہ ممبر جو تین نئے ممبر بنا کر اُن کے فارم ممبری فیس داخلہ اور ابتدائی اقساط صدر دفتر بھجوائیگا اُس کے نام ماہنامہ 'مشیر' ایک سال کے لئے مُفت جاری کردیا جائیگا۔

مینیجر ماہنامہ مشیر کراچی

باوقار تنظیم

باہمی بچت کی پرافٹ شیئرنگ سکیم گروپ نمبر ۲ کے ممبران کی فہرست

سیریل نمبر	نام اور پتہ
۱	سید سلام الدین احمد صاحب ۲۲/۸ خداداد کالونی۔ کراچی ۵
۲	سراج الدین صاحب، پلاٹ نمبر ۵۳ء ۸ بلاک نمبر ۱، ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی ۲۵
۳	محمد خواجہ صاحب، فیض آباد، لانڈھی (معین آباد)
۴	بندے علی صاحب، پلاٹ نمبر ۵۵ بلاک ڈرگ روڈ کالونی کراچی ۲۵
۵	آمینہ بی بی، مجوتا کمپاؤنڈ۔ نورالٰہی روڈ۔ نزد نورانی مسجد، لیاری کوارٹر کراچی۔
۶	وزیر خاں صاحب معرفت "مدینہ ہوٹل" موسٰی لین ۲ کراچی
۷	علیم الدین صاحب، جوڑیا بازار بھون اسٹریٹ شیوجی مرادجی بلڈنگ ۲۶۔ کمرہ ۱۹۔ کراچی ۲
۸	محمد منظور احمد صاحب میڈیکل اسسٹنٹ، ایم۔ آئی۔ روم پی اے الیف، لاہور چھاؤنی۔
۹	شہناز، رسولپور جٹاں چک ۱۳۳۔ ضلع شیخوپورہ۔
۱۰	ڈاکٹر سید خورشید علی عبدالحفیظ صاحب۔ سید میڈیکل سٹور۔ بہاولپور شہر۔
۱۱	سید اشتیاق علی صاحب زیدی۔ مچھلی بازار کوچہ خزانچی۔ بہاولپور۔
۱۲	چوہدری چراغ الدین۔ غلہ منڈی۔ بہاولپور۔
۱۳	عبدالحمید صاحب، عبدالحفیظ برادرس۔ غلہ منڈی۔ بہاولپور
۱۴	محمد شفیع صاحب، پاکستان لیدر سٹور۔ چوک بازار۔ بہاولپور۔
۱۵	سید ارشاد علی صاحب بخاری کمپوڈر سول ہسپتال ایچ شریف بہاولپور
۱۶	عبدالٰہی معرفت عبدالمالک دودھ فروش، نزد جامع مسجد چوک چھپرا
۱۷	لے ریاض علیخاں، آغا سٹر۔ مچھلی بازار۔ بہاولپور۔
۱۸	ندیم ہاشمی صاحب، دی حکیم ہوٹل نزد جامع مسجد، بہاولپور۔
۱۹	نذیر احمد صاحب، معرفت رانا منور الٰہی۔ ایڈووکیٹ۔ نزد عدالت بہاولپور
۲۰	عبدالمالک خالد محمدی، معرفت جماعت اسلامی حبیب ہوٹل نزد بیکانیری گیٹ۔ بہاولپور۔
۲۱	عبدالجلیل علوی صاحب، دفتر ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب زراعت بغداد الجدید۔ بہاولپور۔
۲۲	محمد رفیق صاحب، مکان ۲۳۶/۱، کوچہ گل حسن، بہاولپور۔
۲۳	عابدہ معرفت نعمت کباب ہوٹل۔ اندرون بیکانیری گیٹ بہاولپور

رول نمبر	نام اور پتہ
۲۴	خلیل احمد صاحب۔ محلہ اسلام نگر۔ بہاولپور
۲۵	محمد سلیم صاحب پاکستان لیدر سٹور چوک بازار بہاولپور
۲۶	محمد شریف صدیقی صاحب۔ دی صادق سوپ فیکٹری ورکشاپ محمد صدیقی ۸۷۔ رحیم یار خاں۔
۲۷	محمد شریف صاحب صدیقی (محلہ ۸۷) ورکشاپ۔ دی صادق سوپ فیکٹری۔ شہر رحیم یار خاں۔ بہاولپور ڈویژن
۲۸	محمد شریف صاحب صدیقی۔ دی صادق سوپ کمپنی (محلہ ۸۷) شہر رحیم یار خاں (بہاولپور ڈویژن)
۲۹	محمد شریف صاحب صدیقی۔ دی صادق سوپ کمپنی (محلہ ۸۷) شہر رحیم یار خاں (بہاولپور ڈویژن)
۳۰	محمد شریف صاحب صدیقی۔ دی صادق سوپ کمپنی (محلہ ۸۷) شہر رحیم یار خاں (بہاولپور ڈویژن)
۳۱	محمد موسٰی بن الصاحب، صدر مدرس، مدرسہ انوار العلوم جامع مسجد نزد شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ۔
۳۲	عزیز الرحمٰن حیدری صاحب، صدر مدرس مدرسہ انوار العلوم جامع مسجد نزد شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ
۳۳	ایم۔ ایس شیخ صاحب ۱۶۰/۱۷ ریلوے روڈ۔ حافظ آباد۔
۳۴	عبدالعزیز صاحب مکینک ٹیلیکم ٹریننگ کالج ہری پور۔
۳۵	محمد عالم صاحب مکینک ٹیلیکم ٹریننگ کالج ہری پور۔ ہزارہ
۳۶	سید عبدالدیان صاحب۔ ۹۱/۵ مہاجر کالونی۔ شیرشاہ روڈ کراچی
۳۷	منظور احمد صاحب، ولد محمد رمضان صاحب موضع تلمن گوالی کے بسرکلاں۔ تحصیل شکرگڑھ ضلع سیالکوٹ۔
۳۸	نسرین اختر صاحبہ، معرفت محمد اشرف قریشی۔ الیکٹریشن۔ آر۔ اینڈ۔ آئی۔ پی ایس اے۔ الیف۔ ماڑی پور۔ کراچی۔
۳۹	غلام حبیب صاحب، خطیب جامع مسجد کورنگی کریک کراچی
۴۰	مستری ولی محمد صاحب۔ ورکشاپ فورمین۔ نزد جنت برادرز لیٹر بابر سٹریٹ۔ رتن تالاب کراچی ۱۲
۴۱	صلاح احمد صاحب۔ مشین مین۔ لائن آرٹ پریس فریر روڈ کراچی
۴۲	ایم۔ اے خان مکان نمبر ۲۹۶/۱۱۶ لالوکھیت کراچی
۴۳	آفتاب احمد صاحب، مکان نمبر ۲/۷ ۔ C ۔ 9 ۔ سعود آباد

رقم نمبر	نام اور پتہ
	کالونی، کراچی ۳۳
۴۴	محمد دین صاحب، معرفت کوثر بکڈپو صرافہ بازار۔ شاہی بازار حیدرآباد (پاکستان)
۴۵	امام الدین صاحب، مکان ۱۱۱ سی۔ علامہ اقبال کالونی۔ نیو چنیسر گوٹھ۔ کراچی ۵
۴۶	عزیز احمد صاحب، ولد چودہری سلطان احمد صاحب مرحوم مقام ڈاکخانہ کھاریاں ضلع گجرات۔
۴۷	محمد اکرم صاحب داسلینو ٹیکسٹائل مل۔ نی ٹی ڈی اے۔ بھکر ضلع میانوالی (مغربی پاکستان)
۴۸	عزیز احمد صاحب، ولد چودہری سلطان احمد صاحب مرحوم۔ مقام ڈاکخانہ کھاریاں ضلع گجرات۔
۴۹	محمد خلیل اللہ صاحب، مکان ۲۰۱/۸ راٹل روڈ۔ پرانا سکھر۔
۵۰	محمد نجیب اللہ صاحب۔ مکان ۲۰۱/۸ راٹل روڈ پرانا سکھر
۵۱	نیاز الحق صاحب۔ پاکستان ٹیلرنگ ہاؤس۔ نیم کی چاڑی سکھر۔
۵۲	عبدالوحید خانصاحب، کرانہ مرچنٹ۔ دالس روڈ گھاڑی احاطہ سکھر
۵۳	عبدالشاہد خانصاحب، معرفت عبدالوحید خانصاحب کرانہ مرچنٹ، دالس روڈ۔ گھاڑی احاطہ سکھر۔
۵۴	ثریا جہاں آرا بیگم صاحبہ۔ بھاٹیا گلی، پرانا سکھر۔
۵۵	حافظ جان محمد صاحب۔ محراب پور۔ ڈاکخانہ خاص تحصیل کنڈیارو۔ ضلع نواب شاہ۔
۵۶	سید محمد محی الدین حسن صاحب۔ خطیب جامع مسجد غریب آباد سکھر
۵۷	سید عبدالغنی شاہ۔ حاجی بیکری ڈھک روڈ۔ سکھر۔
۵۸	محمد حنیف خانصاحب۔ مکان نمبر ۵/۹۳۲ غریب آباد سکھر
۵۹	سید راشد حسین صاحب۔ مکان ۵/۹۳۲ جھامن داس روڈ غریب آباد سکھر۔
۶۰	محمد یوسف صاحب حیدری۔ بھاٹیہ گلی متصل پوسٹ آفس مکان نمبر ۸/۱۱۲۸۔ پرانا سکھر۔
۶۱	عبدالحی صاحب، معرفت اسلامی کتب خانہ۔ نیم کی چاڑی سکھر
۶۲	کنیز فاطمہ صاحبہ، معرفت اسلامی کتب خانہ۔ نیم کی چاڑی۔ سکھر
۶۳	محمد شریف خانصاحب۔ مکان نمبر ۵/۹۳۲ غریب آباد سکھر۔
۶۴	محمد شریف خانصاحب معرفت حاجی بیکری، ڈھک روڈ سکھر
۶۵	رشید احمد صاحب۔ ڈھک روڈ بالمقابل۔ ڈاکٹر عقیل صاحب سکھر
۶۶	محمد ایوب صاحب۔ اخبار فروش ۔ ایمپائر سینما بالمقابل بارک نمبر ۲۴۔ گلی نمبر ۲ کراچی۔

رقم نمبر	نام اور پتہ
۶۷	سلیم فاطمہ صاحبہ۔ معرفت محمد ایوب اخبار فروش ایمپائر سینما ونٹن۔ بالمقابل بارک نمبر ۲۴۔ گلی نمبر ۲۔ کراچی۔
۶۸	باجرہ سلطان۔ ۲۲۰۳، چاڑی پر بھاپیر حیدرآباد (پاکستان)
۶۹	رابعہ سلطان صاحبہ ۲۲۰۳ چاڑی پر بھاپیر حیدرآباد (پاکستان)
۷۰	فیاضی بیگم صاحبہ۔ ٹیچر میمن انجمن گرلز سکول، اکالی بونگ لین رسالہ روڈ۔ حیدرآباد (پاکستان)
۷۱	صابرہ بیگم سلطان صاحبہ۔ ۲۲۰۳ چاڑی پر بھاپیر حیدرآباد
۷۲	رئیس سلطان صاحبہ۔ ۲۲۰۳ چاڑی پر بھاپیر حیدرآباد (پاکستان)
۷۳	کنیز فاطمہ صاحبہ۔ ٹیچر میمن انجمن گرلز سکول، اکالی بونگ لین، حیدرآباد۔ (پاکستان)
۷۴	سید اشفاق حسین صاحب، مکان نمبر ۱۷۷۵ محلہ طبیلانی گلی۔ حیدرآباد (پاکستان)
۷۵	سعیدہ بیگم صاحبہ۔ معرفت سید اقبال علی۔ دہلی ایمبرائڈری ورکس ۴۲ ۵/۹۲۱ سرسوتی گلی حیدرآباد (پاکستان)
۷۶	سید اقبال علی صاحب، پروپرائٹر دہلی ایمبرائڈری ورکس نمبر ۴۲ ۵/۹۱ سرسوتی گلی حیدرآباد (پاکستان)
۷۷	شرف الدین صاحب، معرفت کوثر بکڈپو صرافہ شاہی بازار حیدرآباد (پاکستان)
۷۸	احسان اللہ خانصاحب، شاہ لطیف آباد۔ یونٹ نمبر ۱ بلاک نمبر ۸ کوارٹر نمبر ۱۶۰۔ حیدرآباد (پاکستان)
۷۹	سید احمد خاں لودھی صاحب۔ خالد میموریل ہائی سکول، حیدرآباد (پاکستان)
۸۰	محمد اکرم صاحب، معرفت حاجی علی محمد۔ محمد طفیل سوت ریشم والے۔ شاہی بازار۔ حیدرآباد (پاکستان)
۸۱	شرفن بیگم۔ معرفت محمد رفیع ہوٹل ریشمی گلی۔ حیدرآباد سندھ
۸۲	زرینہ بیگم صاحبہ۔ معرفت محمد رفیع ہوٹل۔ ریشمی گلی حیدرآباد
۸۳	محمد عظیم صاحب۔ معرفت محمد رفیع ہوٹل۔ ریشمی گلی، حیدرآباد سندھ (پاکستان)
۸۴	محمد رفیع صاحب مکان نمبر ۱۶۱۷۔ ۴۵ F یکسانی بلڈنگ سوسائٹی حیدرآباد سندھ۔
۸۵	نسیم اختر صاحبہ۔ مکان نمبر ۱۶۱۷۔ ۴۵ F یکسانی بلڈنگ سوسائٹی، حیدرآباد سندھ (پاکستان)
۸۶	محمد ابراہیم صاحب مکان نمبر ۱۶۱۷۔ ۴۵ F یکسانی بلڈنگ سوسائٹی، حیدرآباد سندھ (پاکستان)

رول نمبر	نام اور پتہ
۸۷	خواجہ نصیر احمد صاحب کیشئر بجٹ کرپٹی۔ بھیم پورہ کراچی ۲۸
۸۸	عبد المجید صاحب دکان نمبر ۹، ۸۷۔ اسٹیشن روڈ۔ نزد دھرم آئل ملز۔ شہداد پور۔
۸۹	خواجہ محمد شفیق صاحب بفضل آرہ مشین۔ بھیم پورہ۔ کراچی
۹۰	محمد اسماعیل صاحب بفضل آرہ مشین۔ بھیم پورہ رسالدین کراچی
۹۱	ایم جلیل احمد صاحب اسٹیشن ماسٹر ٹنڈو بیٹھ۔ ٹی ٹی بی۔ ریلوے ڈاکخانہ ٹنڈو بیٹھ۔ ضلع میمن سنگھ۔
۹۲	سکینہ بیگم صاحبہ پٹیالہ ٹنڈو بیٹھ۔ ٹی ٹی بی ریلوے ڈاکخانہ ٹنڈو بیٹھ۔ ضلع میمن سنگھ۔
۹۳	روح الامین صاحب بازار عابدین یار حسین ضلع مردان مغربی پاکستان
۹۴	فرخندہ حامد علی صاحبہ ۳۴ رسدوالا غلام حسین قاسم روڈ گارڈن ویسٹ کراچی۔
۹۵	مسز صفیہ آزاد صاحبہ ۳۴ رسدوالا۔ غلام حسین قاسم روڈ گارڈن ویسٹ کراچی۔
۹۶	عائشہ بیگم صاحبہ معرفت پاک ۲۶، ۷۵ خان۔ ایم۔ آر۔ ایم آئی روم۔ پی۔ اے۔ ایف۔ لاہور۔
۹۷	عبد الغفار صاحب، راشن شاپ نمبر ۲۔ پی اے۔ ایف۔ کورنگی کریک۔ کراچی۔
۹۸	محمد نواز صاحب۔ ولد غلام محمد صاحب موضع چک نمبر ۱۲ کوکری ڈاکخانہ چک نمبر ۳ جنوبی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔
۹۹	محمد نواز صاحب۔ ولد غلام محمد صاحب۔ موضع چک نمبر ۱۲ کوکری، ڈاکخانہ چک نمبر ۳ جنوبی تحصیل بھلوال۔ ضلع سرگودھا۔
۱۰۰	خلیل احمد صدیقی صاحب۔ ۴۸۔ چوبرجی پارک۔ لاہور۔
۱۰۱	زیب النساء صاحبہ۔ ۴۸ چوبرجی پارک لاہور۔
۱۰۲	فاروق احمد صدیقی صاحب ۴۷۔ چوبرجی پارک لاہور۔
۱۰۳	اکرم جلیلی صاحب ۱۲۵۸ بیگم پورہ لاہور۔
۱۰۴	شیخ رشید احمد صاحب اسسٹنٹ۔ بورڈ آف ریونیو۔ ویسٹ پاکستان لاہور۔
۱۰۵	ولایت علی صاحب مرزا۔ الیکٹریکل انسٹرکٹر۔ گورنمنٹ کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔ لاہور۔
۱۰۶	فیروزالدین صاحب ورکشاپ انسٹرکٹر گورنمنٹ کالج کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔ لاہور۔
۱۰۷	رفیق احمد صاحب۔ کرم روڈ بھارت نگر لاہور
۱۰۸	رفیق احمد صاحب اکرم روڈ بھارت نگر لاہور

رول نمبر	نام اور پتہ
۱۰۹	احمد خان چوہدری صاحب۔ اکرم روڈ۔ بھارت نگر لاہور
۱۱۰	نرگس خانم صاحبہ۔ ۱۲۵۸۔ بیگم پورہ لاہور
۱۱۱	امت الحفیظ صاحبہ۔ ادھوال۔ ڈی بی۔ ہائی اسکول۔ معرفت محمد شریف انگلش ٹیچر۔ ضلع اٹک۔
۱۱۲	امت الرحمن صاحبہ۔ معرفت انگلش ٹیچر محمد شریف صاحب ڈی بی۔ ہائی اسکول۔ ادھوال ضلع اٹک۔
۱۱۳	عبد الحمید صاحب کھوکھر۔ گوکھووال چک ۵۔ نمبر ۱۲۱/ تحصیل و
۱۱۴	فاطمہ بیگم اہلیہ عبد الحمید کھوکھر۔ گوکھووال چک نمبر ۵ نمبر ۱۲۱/ تحصیل، ضلع لائل پور
۱۱۵	طاہر حمید صاحب پسر عبد الحمید کھوکھر گوکھووال، چک ۵۔ نمبر ۱۲۱/ تحصیل۔ ضلع۔ لائل پور۔
۱۱۶	امت الشکور دختر عبد الحمید کھوکھر گوکھووال، چک نمبر ۵ نمبر ۱۲۱/ تحصیل۔ ضلع لائل پور۔
۱۱۷	عبد العزیز صاحب، معرفت عبد الرشید ارشد مدرس مدرسہ لائل پور۔
۱۱۸	زاہدہ ملقیس صاحبہ اہلیہ عبد العزیز معرفت عبد الرشید مدرس اسلامی مدرسہ۔ محمد پورہ لائل پور۔
۱۱۹	عبد الحمید صاحب۔ معرفت حافظ عبد المجید ہیڈ ماسٹر اسلامی مدرسہ محمد پورہ۔ لائل پور۔
۱۲۰	عبد الحفیظ صاحب معرفت حافظ عبد المجید، ہیڈ ماسٹر۔ اسلامی مدرسہ۔ محمد پورہ۔ لائل پور۔
۱۲۱	حبیب صاحب، ہیڈ ماسٹر اسلامی مدرسہ، کوچہ نمبر ۱ محمد پورہ۔ لائل پور۔
۱۲۲	حافظ عبد المجید صاحب، ہیڈ ماسٹر اسلامی مدرسہ کوچہ لائل پور
۱۲۳	عبد الرشید ارشد صاحب مدرس اسلامی مدرسہ۔ محمد پورہ۔ لائل پور۔
۱۲۴	امت السلام صاحبہ معرفت حافظ عبد المجید، ہیڈ ماسٹر اسلامی مدرسہ محمد پورہ لائل پور۔
۱۲۵	نثار احمد صاحب نائب مدرس اسلامی مدرسہ۔ محمد پورہ لائل پور
۱۲۶	انتخاب جہاں صاحبہ معلمہ معرفت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اسلامی مدرسہ۔ محمد پورہ۔ لائل پور۔
۱۲۷	اشتیاق احمد صدیقی صاحب نیشنل سال اینڈ فلور ملس، مقسم مشن ہسپتال الائنس روڈ۔ کراچی۔
۱۲۸	امیر احمد صاحب محلہ خلیل آباد، توسط دفتر جماعت اسلامی کراچی نمبر ۱۔

نام اور پتہ	نمبر
محی الدین صاحب ہولی، پلاٹ نمبر ۵، بلاک نمبر ۸ ڈرگ روڈ کراچی	۱
محمد حبیب اللہ خان صاحب۔ سیز بلڈنگ فلیٹ نمبر ۲ آکسن مل اوجھا روڈ۔ رتن تلاؤ کراچی	۱۱
محمودہ اختر صاحب۔ سیز بلڈنگ فلیٹ نمبر ۲ آکسن مل اوجھا روڈ رتن تلاؤ۔ کراچی۔	۱۱
عبد الحمید صاحب عقب امین منزل شیر شاہ روڈ میراں ناکہ کراچی	۱۲
خدیجہ بیگم صاحبہ عقب امین منزل شیر شاہ روڈ میراں ناکہ کراچی	۱۳
ظفر اقبال احمد صاحب مکان نمبر ۲۰ ک کرشن محلہ۔ راولپنڈی۔	۱۳
سید محمد اسلام الدین صاحب فائق ۵/۲۸ بہار کالونی جمشید روڈ کراچی	۱۳
سید محمد امام الدین صاحب فائق ۵/۲۸ بہار کالونی جمشید روڈ کراچی	۱۳
علام نصیر الدین قریشی صاحب۔ چیف اکاؤنٹنٹ ڈیپارٹمنٹ کراچی پورٹ ٹرسٹ ڈبل اینڈ بجٹ سیکشن، کراچی۔	۱۳
عطاء الرحمن صاحب پلاٹ نمبر ۵۸، بلاک نمبر ۸ ڈرگ روڈ کراچی	۱۳
عبد القادر صاحب پلاٹ نمبر ۴۹ بلاک نمبر ۸ ڈرگ روڈ کراچی	۱۴
افتخار الاسلام صاحب ۵۸/۱، ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔	۱۴
افضل احمد خان صاحب معرفت سید علی احمد صاحب ۵۸/۵ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔	۱۴
محمد عنایت صاحب معرفت احمد نور صاحب مکان نمبر ۲۰۰/K کمیٹی محلہ، راولپنڈی۔	۱۴
قمر رنی صاحبہ۔ این۔ اے مختار اینڈ کو۔ سکھر۔	۱۴
نورینہ نثار صاحبہ۔ این۔ اے۔ مختار اینڈ کو۔ سکھر۔	۱۴
نثار احمد صاحب این۔ اے مختار اینڈ کمپنی۔ سکھر۔	۱۴
کوکب کلام ناظمی ۳۶/E اندرون قلعہ حیدرآباد (پاکستان)	۱۴
سید منصور علی صاحب۔ مکان ۱۱۷۵/۳۳/۵ طلبا لائنس حیدرآباد سندھ۔	۱۴
محمد میاں صاحب کوارٹر نمبر ۴۹۶ بلاک نمبر سی یونٹ نمبر ۲ لطیف آباد حیدرآباد سندھ	۱۴
عبد الحق صاحب دفتر پندرہ روزہ صدائے طلبہ کراچی	۱۴
محمد رئیس خان صاحب ۳۶/E پختہ قلعہ حیدرآباد سندھ	۱۵
محمد شریف خان صاحب ۳۶/E پختہ قلعہ حیدرآباد سندھ	۱۵
نجمہ پروین صاحبہ معرفت عبد السلام مصری بتاشہ والے میانی روڈ نزد مسجد رنگریز۔ حیدرآباد سندھ	۱۵
عبد الرفیق صاحب معرفت عبد السلام مصری بتاشہ والے میانی روڈ۔ نزد مسجد رنگریز۔ حیدرآباد سندھ	۱۵

نام اور پتہ	رول نمبر
حفیظہ بیگم صاحبہ معرفت رفیق احمد مصری بتاشے والے کا بڑا چوڑی گلی۔ حیدرآباد سندھ۔	۱۵۴
عبد الجبار صاحب روڈ انسپکٹر پراونشل سب ڈویژن ۔۔۔ بھکر ضلع میانوالی۔	۱۵۵
شمس الدین احمد صاحب مجاہد۔ میڈیکل اسسٹنٹ ڈسپنسری سی۔ ایم۔ ایچ۔ لاہور کینٹ۔	۱۵۶
نور احمد رفعت صاحب ۔ے۔ وی مڈل سکول چک نمبر ۱۸ کوٹ قلی خان۔ ڈاکخانہ خاص براستہ صادقیہ ضلع بھاولنگر	۱۵۷
نور احمد رفعت صاحب۔ اے وی مڈل سکول چک نمبر ۱۸ کوٹ قلی خان۔ ڈاکخانہ خاص، براستہ صادقیہ۔ ضلع بھاولنگر۔	۱۵۸
ریحان گل صاحب متصل عمارت میڈیکل ہال سفر شوگر مل نزد تھانہ۔ ڈاکخانہ تخت بائی۔ ضلع مردان۔	۱۵۹
شریں بیگم صاحبہ۔ منزل ریحان گل فرنٹ شوگر مل متصل عمارت میڈیکل ہال۔ نزد تھانہ، ڈاکخانہ تخت بائی۔ ضلع مردان۔	۱۶۰
غلام نبی دہرہ صاحب ٹیلیکم ٹریننگ کالج ہری پور ہزارہ۔	۱۶۱
محمد رفیق صاحب۔ محلہ قاضیاں مقام و ڈاکخانہ مانگل۔ تحصیل ہری پور ضلع ہزارہ۔	۱۶۲
خالد لطیف صاحب۔ معرفت عتیق الرحمن صدیقی۔ دار المطالعہ جماعت اسلامی۔ ہری پور ہزارہ۔	۱۶۳
محمد یعقوب صاحب۔ ساکن درویش آباد۔ ڈاکخانہ ہری پور تحصیل ہزارہ	۱۶۴
سید عبد المالک شاہ صاحب۔ سید بلڈنگ سیلف ہری پور ہزارہ	۱۶۵
سردار احمد بمقام خاص گھر تل کلاں چک نمبر ۱۴۳ رکھ برانچ۔ تحصیل و ضلع لائلپور۔	۱۶۶
نواب الدین۔ بمقام خاص گھر تل کلاں چک نمبر ۱۴۳ رکھ برانچ تحصیل و ضلع لائلپور۔	۱۶۷
محمد علی صاحب بمقام خاص گھر تل کلاں۔ چک نمبر ۱۴۳ رکھ برانچ۔ تحصیل و ضلع لائلپور	۱۶۸
دین جان صاحب۔ مغل خان گل علاقہ گنجی۔ ڈاکخانہ تخت بائی ضلع مردان۔	۱۶۹
بخت احمد صاحب۔ معرفت عبد الستار ٹھکیدار فرنٹ شوگر مل تخت بائی۔ مردان۔	۱۷۰
شیخ منظور صاحب۔ حاجی فقیر خان گلی ساکن شاہ معرفت عبد ... ٹھکیدار فرنٹ شوگر مل۔ تخت بائی۔ ضلع مردان۔	۱۷۱
[illegible]	۱۷۲

سلسلہ نمبر	نام اور پتہ
۱۷۳	علی احمد صاحب معرفت عبدالستار دکاندار فرنیچر شوگر مل تخت بائی ضلع مردان۔
۱۷۴	صفدر اللہ صاحب معرفت عبدالستار دکاندار فرنیچر شوگر مل تخت بائی۔ ضلع مردان۔
۱۷۵	یسین احمد صاحب معرفت عبدالستار۔ دکاندار فرنیچر شوگر مل تخت بائی۔ ضلع مردان۔
۱۷۶	معانی گل صاحب ضلع تحصیل مردان ڈاکخانہ تخت بائی۔ فرنیچر شوگر مل۔ معانی گل الیکٹریشن۔
۱۷۷	عبدالحکیم صاحب بمقام سارو شاہ ڈاکخانہ تخت بائی۔ تحصیل و ضلع مردان۔
۱۷۸	بخت بلند۔ ولد محمد عمر زرگر بکوردنہ۔ تخت بائی ضلع مردان
۱۷۹	محمد ناصر۔ ولد محمد عمر زرگر کوردنہ۔ تخت بائی ضلع مردان۔
۱۸۰	محمد عمر معرفت جلال الدین صاحب چک نمبر ۱۰ جنوبی۔ ڈاکخانہ خاص تحصیل و ضلع سرگودھا۔
۱۸۱	کریم بخش صاحب ولد ملک غلام محمد چاہ تاج والا بستی ... لرکانہ امر ضلع لوہانچ۔ ڈاکخانہ دلیہ۔ تحصیل لیہ ڈسٹرکٹ مظفر گڑھ
۱۸۲	محمد انور صاحب، کوارٹر نمبر ۱۹/۱۱ آئی سنٹ الیف ٹک روڈ کراچی
۱۸۳	محمد یوسف شاہ صاحب، گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۲ پشاور شہر
۱۸۴	عبدالستار صاحب یونیورسٹی ہاسٹل نمبر ۲ پشاور یونیورسٹی پشاور
۱۸۵	محمد اکبر صاحب یونیورسٹی ہاسٹل نمبر ۲ یونیورسٹی آف پشاور
۱۸۶	فضل رزاق صاحب یونیورسٹی ہاسٹل نمبر ۲ یونیورسٹی آف پشاور
۱۸۷	رحیم گل دھوبی۔ پولیس لائنز۔ پشاور چھاؤنی۔
۱۸۸	شیر افضل صاحب، بلڈنگ آف لفضال۔ موضع نو تہیہ پشاور
۱۸۹	عبدالقدوس صاحب۔ پاکستان فلور ملز جی ٹی روڈ پشاور
۱۹۰	سید اہل علی صاحب ٹیچر اسلامیہ ہائی اسکول۔ قطب شاہ۔
۱۹۱	منصور احمد پان فروش۔ شاپ نمبر ۲۴۰ جناح چوک سکھر۔
۱۹۲	الحسن صاحب کاتب کلاتھ ہاؤس ۲۴۷ . E ماچھی بازار سکھر۔
۱۹۳	محمد یحییٰ خان یوسفی۔ اکاؤنٹنٹ۔ سکھر بسکٹ مینوفیکچرنگ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۳۲ سکھر۔
۱۹۴	سلیمان صاحب ولد عبداللطیف کاٹھیاواڑ اسٹیشنری مرچنٹ [illegible] بازار سکھر۔
۱۹۵	[illegible] سلیمان ولد عبداللطیف کاٹھیاواڑ اسٹیشنری مرچنٹ [illegible] مکان نمبر [illegible] سکھر
۱۹۶	[illegible] صاحب [illegible] سکھر۔
۱۹۷	سید عزیز حیدری صاحب۔ لیاقت چوک سکھر۔
۱۹۸	ارشاد علی صاحب الفا کو جوہر بلڈنگ۔ ڈھک روڈ [illegible]
۱۹۹	محمد امین صاحب۔ مکان نمبر ۱۳۳۸ . E ڈھک [illegible]
۲۰۰	محمد عارف صاحب معرفت عزیز اللہ رنگ والے۔ [illegible] علی چوک سکھر۔
۲۰۱	جمیلہ بیگم صاحبہ۔ معرفت پنجاب گی ہاؤس۔ لیاقت علی چوک
۲۰۲	عبدالرشید صاحب سائیکل والے نزد ڈاکخانہ پرانا سکھر
۲۰۳	مشتاق احمد صاحب۔ محمد احمد صاحب۔ سوت گولے والا نشتر روڈ سکھر۔
۲۰۴	محمد موسیٰ صاحب محمد موسیٰ ابراہیم مکان نمبر ۱۰۸۸/۱/۱ میانی روڈ سکھر۔
۲۰۵	محمد سمیع اللہ عباسی صاحب، مکان نمبر ۵۶/۳/۱۸ وارڈ
۲۰۶	احمد سعید صاحب مکان نمبر B/ ۱۰۸۶ میانی روڈ سکھر۔
۲۰۷	فضل مبین احمد صاحب، پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر
۲۰۸	سعیدہ خاتون صاحبہ۔ پوسٹ بکس ۶۴ سکھر۔
۲۰۹	احسان الحق صاحب پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر۔
۲۱۰	محمد صادق صاحب پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر۔
۲۱۱	صادقہ خاتون صاحبہ۔ پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر۔
۲۱۲	ناصرہ خاتون صاحبہ پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر۔
۲۱۳	ارشد مبین صاحب۔ پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر۔
۲۱۴	محمد سلیمان صاحب پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر۔
۲۱۵	محمد افضل صاحب۔ پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر۔
۲۱۶	فہمیدہ خاتون صاحبہ، پوسٹ بکس نمبر ۶۴ سکھر۔
۲۱۷	حافظ صالح محمد صاحب کشتی ——— بھلوال قدیم ڈاکخانہ بھلوال قدیم۔ تحصیل بھلوال۔ ضلع سرگودھا۔
۲۱۸	میاں ظفر علی صاحب۔ ——— چک نمبر ۸ جنوبی ڈاکخانہ چک ۸ جنوبی براستہ بھلوال۔ تحصیل بھلوال۔ ضلع سرگودھا
۲۱۹	چراغ الدین صاحب ۳ سی۔ ڈیلڈ پارک اچھرہ لاہور
۲۲۰	عبدالغفار احمد صاحب ۱۱ لال سٹریٹ۔ نیلا گنبد۔ لاہور
۲۲۱	قاضی محمد رشید الدین صاحب۔ نمبر ۳ رتن باغ اسٹریٹ بیرون فاطمہ روڈ۔ اچھرہ۔ لاہور
۲۲۲	محمودہ بیگم ہاشمی صاحبہ نمبر ۳ رتن باغ [illegible] اچھرہ
۲۲۳	صاحبزادہ سراج الحق صاحب۔ [illegible] بیرون بچکی گیٹ۔ پشاور شہر

نقل نمبر	نام اور پتہ
۲۲۴	عبدالبصیر صاحب۔ بخاری ہوزری فیکٹری بیرون کوہاٹی گیٹ پشاور
۲۲۵	[illegible] صاحب [illegible] آباد [illegible]
۲۲۶	اسد خان صاحب۔ کورنگی کریک بلاک نمبر ۲۲ مکان نمبر ۴ کراچی
۲۲۷	عبدالقیوم صاحب کورنگی کریک بلاک نمبر ۲۲ مکان نمبر ۴ کراچی
۲۲۸	محمد مسعود عالم صاحب۔ دلی منزل۔ لوپتی۔ ڈاکخانہ گھوڑا مارا راجشاہی
۲۲۹	محمد معین الدین صاحب اسٹیشن روڈ گوریندگا۔ کاشانہ کنیز فاطمہ پوسٹ گھوڑا مارا۔ ضلع راجشاہی (مشرقی پاکستان)
۲۳۰	مقبول احمد صاحب پاک رسہا لا گھوڑا مارا راجشاہی (مشرقی پاکستان)
۲۳۱	سید عبدالغنی صاحب آفس سپرنٹنڈنٹ۔ آفس آف ڈپٹی کلکٹر سینٹرل ایکسائیز اینڈ لینڈ کسٹم (راجشاہی)
۲۳۲	بیگم معینہ معصوم صاحب۔ دلی منزل۔ الوپتی۔ ڈاکخانہ گھوڑا مارا راجشاہی (مشرقی پاکستان)
۲۳۳	میاں واصف علی۔ ورکر بمقام ڈاکخانہ رتو کالا تحصیل بھلوال سرگودھا
۲۳۴	ملک غلام حسین صاحب ــــــــ بمقام ڈاکخانہ کوٹ پکوٹ تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔
۲۳۵	میاں واصف علی صاحب بمقام ڈاکخانہ رتو کالا تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا
۲۳۶	راجہ خورشید عالم صاحب بمقام ڈاکخانہ چک نمبر ۶۶ جنوبی ضلع سرگودھا
۲۳۷	راجہ سعادت علی خاں نمبردار ساکن کوٹلی۔ ڈاکخانہ کبڑ مصرال سرگودھا
۲۳۸	آفتاب نذیر۔ ۲۵۴۴ F بنگلہ ایوب شاہ۔ لاہور
۲۳۹	سلیمان نذیر صاحب۔ ۲۵۴۴ F بنگلہ ایوب شاہ۔ لاہور۔
۲۴۰	جاوید نذیر صاحب ۲۵۴۴ F بنگلہ ایوب شاہ۔ لاہور
۲۴۱	نور جہاں صاحبہ۔ ۲۵۴۴ F بنگلہ ایوب شاہ لاہور
۲۴۲	عبدالمجید صاحب مکان نمبر ۲ اشرف منزل نزد ریلوے اسٹیشن مغل پورہ لاہور۔
۲۴۳	اشتیاق احمد صاحب معرفت عبدالستار گرین مرچنٹ ریلوے کراسنگ۔ ٹنڈو آدم۔
۲۴۴	کلیم الدین صاحب معرفت پاکستان ٹریڈنگ کمپنی بمبئی بازار ٹنڈو آدم
۲۴۵	راجہ محمد اشرف صاحب۔ ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول (سیالکوٹ)
۲۴۶	محمد یوسف صاحب۔ مکان نمبر ۱۰۵۔ گلی نمبر ۷۷۔ خراس محلہ صدر بازار۔ لاہور چھاؤنی۔
۲۴۷	چودھری میاں خاں۔ معرفت ماسٹر ولی محمد صاحب۔ حدید بوٹ ہاؤس۔ دہلی روڈ۔ لاہور چھاؤنی۔
۲۴۸	بشیر علی صاحب۔ کوارٹر نمبر ۱۱/۴۵ جہلال کوٹھی نمبر ۹۸۔ ڈنگلش مال روڈ صدر بازار۔ لاہور چھاؤنی۔

نقل نمبر	نام اور پتہ
۲۴۹	امیلہ صاحبہ مکان نمبر ۱۰۵ گلی نمبر ۷۷ صدر بازار خراس محلہ لاہور
۲۵۰	محمد اقبال صاحب مکان نمبر ۱/۱۳۳۱ حبشی احاطہ دہلی روڈ صدر بازار لاہور
۲۵۱	محمد صدیق صاحب معرفت خداداد کلاتھ ہاؤس گول بازار لائلپور
۲۵۲	محمد احمد صاحب معرفت خداداد کلاتھ ہاؤس گول بازار لائلپور
۲۵۳	محمد صدیق صاحب معرفت شفاخانہ جماعت اسلامی روڈ چنیوٹ محمد صدیق صاحب۔
۲۵۴	صوفی محمد صدیق صاحب، راجہ چک ریل بازار لائلپور۔ اسلامی دواخانہ
۲۵۵	صوفی محمد صدیق صاحب اسلامی دواخانہ راجہ چک ریل بازار لائلپور
۲۵۶	سلامت اللہ صاحب سلامت، مدرس، اسلامی مدرسہ [illegible]
۲۵۷	محمد ہاشم صاحب ہنگبی، معرفت یوسف جنرل ہاؤس۔ شاہی بازار۔ ماتلی۔ ضلع حیدرآباد۔
۲۵۸	حاجی احمد صاحب۔ باکرانی کلاتھ مرچنٹ شاہی بازار ضلع حیدرآباد
۲۵۹	عارف صاحب۔ معرفت اللہ ڈنو ہالوکی جنرل مرچنٹ شاہی بازار ماتلی۔ ضلع حیدرآباد
۲۶۰	مرزا محمد صادق صاحب گرین مرچنٹ۔ غلہ مارکیٹ۔ ماتلی۔ ضلع حیدرآباد۔
۲۶۱	زکیہ سلطانہ۔ معرفت شجاع الحق انصاری۔ انصاری کلاتھ مرچنٹ۔ شاہی بازار۔ ماتلی۔ ضلع حیدرآباد۔
۲۶۲	محمد خان صاحب کیمی کلاتھ مرچنٹ۔ شاہی بازار۔ ماتلی ضلع حیدرآباد
۲۶۳	محمد عبدالواحد صاحب معرفت محمد سلیم لکڑی وکوئلہ گودام نمبر ۴۴ بالمقابل بلاک نمبر ۱۹ مارٹن کوارٹرز کراچی۔
۲۶۴	محمد عبدالواحد صاحب معرفت محمد سلیم لکڑی وکوئلہ گودام نمبر ۴۴ بالمقابل بلاک نمبر ۱۹ مارٹن کوارٹرز کراچی۔
۲۶۵	سیدہ بدر النساء صاحبہ بی ۴/۱ ناظم آباد کراچی۔
۲۶۶	خدیجہ خانم صاحبہ ڈرگ روڈ ریلوے کالونی۔ بلاک نمبر ۳ کوارٹر نمبر ۱۴۰۵ ڈرگ روڈ کراچی۔
۲۶۷	سید جمال الدین حسینی صاحب بی ۴/۱ ناظم آباد کراچی۔
۲۶۸	سیدہ مریم صاحبہ جلال الدین تیمور ۳/۱۳۳۶ ڈرگ روڈ کالونی نمبر ۳ کراچی۔
۲۶۹	سید مرتضیٰ حسینی القادری صاحب۔ بی ۴/۱ ناظم آباد کراچی۔
۲۷۰	محمد یوسف قریشی صاحب۔ معرفت غلام حیدر ایم ای ایس پاور ہاؤس کورنگی کریک کراچی۔
۲۷۱	محمد عثمان علی صاحب۔ اسٹور کیپر۔ ٹرسٹ سپیچ فیکٹری لانڈھی کراچی
۲۷۲	محمد عثمان علی صاحب اسٹور کیپر۔ ٹرسٹ سپیچ فیکٹری لانڈھی کراچی

۲۷ محمد ابراہیم صاحب۔ سائیکل ٹیکسی محلہ خلد آباد۔ لانڈھی کراچی۔
۲۷۴ غلام محمد صاحب جاموٹ۔ ریڑی بستی۔ توسط دفتر جماعت اسلامی۔ محلہ خلد آباد۔ لانڈھی کراچی۔
۲۷ … صاحب۔ دفتر … جاموٹ۔ ریڑی بستی توسط دفتر جماعت اسلامی۔ محلہ خلد آباد۔ لانڈھی۔
۲۷ محمد سلیم صاحب، محلہ خلد آباد۔ توسط دفتر جماعت اسلامی لانڈھی
۲۷ محمد عبدالرؤف صاحب مکان نمبر ۱۰ متصل ہڈی مل لانڈھی
۲۷ حاجی محمد صالح صاحب۔ پیش امام مسجد جوسانی۔ قصبہ ریڑھی۔ توسط دفتر جماعت اسلامی۔ لانڈھی۔ کراچی۔
۲۷ ولی محمد صاحب معرفت مولوی عبدالرؤف صاحب مکان نمبر ۱۷۰ متصل ہڈی مل۔ لانڈھی کراچی۔
۲۸ محمد عبدالحی صاحب توسط دفتر جماعت اسلامی خلد آباد لانڈھی کراچی
۲۸ محمد سلیم صاحب محلہ خلد آباد۔ توسط دفتر جماعت اسلامی لانڈھی
۲۸ محمد عثمان خان صاحب کیٹی بندر ضلع ٹھٹھہ۔ ڈاکخانہ کیٹی بندر۔
۲۸ غلام حیدر صاحب توسط محمد عبدالحی صاحب دفتر جماعت اسلامی محلہ خلد آباد۔ لانڈھی کراچی۔
۲۸ مظہر الدین صاحب صدیقی محلہ معین آباد۔ بدکان صدیقی کریانہ سٹور لانڈھی کراچی۔
۲۸ محمد ممتاز صاحب معرفت محترمہ بیگم غلام علی خدہ بلڈنگ کمرہ نمبر ۶ مقابل ماما پارسی گرلز ہائی اسکول۔ کراچی۔
۲ محمد مصلح الدین صاحب محلہ معین آباد۔ عقب ٹرسٹ میچ فیکٹری توسط جماعت اسلامی لانڈھی کراچی۔
۲ جناب نثار احمد قریشی صاحب۔ مالک قریشی سٹور جمعیت رائے روڈ بستی
۲ جناب تجمل سلطانہ صاحبہ۔ قریشی بیکری۔ حلوائی بازار بستی
۲ مرزا عبدالعزیز بیگ معرفت عبدالسعید صاحب۔ قریشی بیکری حلوائی بازار بستی۔
۲ مزمل سلطانہ صاحبہ۔ معرفت قریشی بیکری۔ حلوائی بازار بستی
۲ جاوید اقبال صاحب ۲۹۸ C مینا بازار راولپنڈی۔
۲ وزیر علی صاحب ۱۳۴/۸ موہن پورہ محلہ راولپنڈی۔
۲ محمد صدیق صاحب ۱۰۶ S محلہ چوہدری وارث علی خان راولپنڈی
۲ نذیر احمد صاحب، معرفت میاں غلام نبی صاحب وارڈ نمبر ۲ میانی، تحصیل بھلوال، ضلع سرگودھا۔
۲ نذیر احمد اعوان صاحب معرفت میاں غلام نبی صاحب وارڈ نمبر ۲ میانی۔ تحصیل بھلوال۔ ضلع سرگودھا۔
۱ محمد صادق جعفر صاحب ریلوے … سید پور۔ ضلع رنگپور پاکستان

۲۹۷ حافظ ضیعت حسین … ریلوے بازار سید پور۔ ضلع رنگپور پاکستان
۲۹۸ محمد نصیرالدین صاحب معرفت اسٹار رکی ہاؤس نیا بابو پاڑہ سید پور ضلع رنگپور۔ مشرقی پاکستان۔
۲۹۹ صالح محمد صاحب کلرک ڈی۔ سی۔ آفس۔ ڈیرہ غازی خان۔
۳۰۰ داؤد خان صاحب مقام و ڈاکخانہ جلالیہ۔ تحصیل و ضلع اٹک مغربی پاکستان
۳۰۱ غلام سرور صاحب مقام و ڈاکخانہ جلالیہ۔ محلہ میانہ تحصیل و ضلع اٹک براہ حضرو۔
۳۰۲ محمد مستقیم صاحب، پاکستان جنرل سٹور الوہاب، ملتان شہر
۳۰۳ نصیرالدین صاحب اندرون دہلی دروازہ، کیرمی تیلیاں ملتان
۳۰۴ الطاف احمد صاحب انوار جنرل سٹور۔ غلام بازار لوہاری گیٹ۔ ملتان
۳۰۵ ظفر علی خان صاحب ۲۰۶/۶ اندرون پاک گیٹ ملتان شہر
۳۰۶ زیب النساء صاحبہ۔ بنت محمد انور۔ معرفت مرزا امام الدین کلاتھ مرچنٹ شاہی بازار۔ ماتلی، حیدرآباد سندھ۔
۳۰۷ محمد اصغر حسین صاحب پسر سید غلام محمد شاہ صاحب، ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر۔ محلہ جمعو بیاں، گلی مکھیاں۔ بہاولپور۔
۳۰۸ محمد حسن صاحب، اندرون بیکانیری گیٹ ۱۲ در کھان۔ زنانہ ہسپتال۔ بہاولپور۔
۳۰۹ سعادت علی خان صاحب۔ ماڈل ٹاؤن … بہاولپور
۳۱۰ سید سراج علی صاحب۔ معرفت آغا اینڈ سنز فتح خان بازار بہاولپور
۳۱۱ سید مظفر حسین صاحب، سید میڈیکل سٹور مچھلی بازار بہاولپور
۳۱۲ غلام سرور صاحب، معرفت روشن دین گولڈ سمتھ، مچھلی بازار
۳۱۳ نجم الدین صاحب سگرٹ فروش، بر مکان، سید میڈیکل اسٹور مچھلی بازار بہاولپور۔
۳۱۴ خالدہ پروین صاحبہ معرفت چوہدری عبدالمجید پلاٹ نمبر ۴ تاجر کالونی۔ ماڈل ٹاؤن۔ بہاولپور۔
۳۱۵ امت الرشید بیگم صاحبہ معرفت خالد شہیدی علوی دفتر جماعت اسلامی۔ بہاولپور۔
۳۱۶ اقبال ناظم صاحب، کوارٹر نمبر ۳۳۴ بلاک نمبر ۱ علیگڑھ کالونی، ڈرگ روڈ بہار کالونی کراچی۔
۳۱۷ فیاض الحق صاحب۔ مدرس … مڈل اسکول، بجگیال ڈاکخانہ خاص، براستہ روہتاس۔ ضلع جہلم۔
۳۱۸ پیر فیروز شاہ حکیم۔ بمقام خاص چک نمبر ۱ جنوبی تحصیل بھلوال ضلع شاہ پور سرگودھا۔
۳۱۹ ملک عبدالقیوم صاحب … فضل الٰہی … جنرل مرچنٹ … گلی … ۳۱/۳۴ … آباد … پور

۳۲۰ خان صاحب میر خان صاحب۔ موسیٰ لین نمبر ۱ ریواچند رتن چند روڈ معرفت مدینہ ہوٹل۔ کراچی۔

۳۲۱ نیعن اللہ صاحب موسیٰ لین نمبر ۱ معرفت مدینہ ہوٹل، ریواچند رتن چند روڈ کراچی۔

۳۲۲ عبدالحکیم صاحب ولی محمد حسن علی روڈ، نوران ہوٹل چاکیواڑہ روڈ نمبر ۲۔ لیاری کوارٹر کراچی۔

۳۲۳ علی محمد صاحب ولد محمد حسن علی روڈ معرفت حاجی کا رالکرم والا چاکیواڑہ روڈ نمبر ۲ لیاری کراچی۔

۳۲۴ عبدالرحمٰن صاحب موسیٰ لین نمبر ۱ معرفت مدینہ ہوٹل ریواچند رتن روڈ کراچی۔

۳۲۵ حسینہ بی بی صاحبہ، فادو بلڈنگ، عقب حاذق دواخانہ، بندر روڈ کراچی نمبر ۱

۳۲۶ عبدالمجید صاحب، فادو بلڈنگ، عقب حاذق دواخانہ، بندر روڈ کراچی نمبر ۱

۳۲۷ محمد فصیح الدین صاحب ۶/۴۲ جیل روڈ کراچی۔

۳۲۸ محمد اسلام صاحب پلاٹ نمبر ۹۰۹ بلاک نمبر ۱ ڈرگ روڈ کالونی کراچی

۳۲۹ میر رونق علی صاحب، معرفت ڈاکٹر عثمان علی صاحب کیماڑی کراچی

۳۳۰ محمد لطیف صاحب۔ پروپرائٹر پاکستان ہوٹل، ریلوے روڈ۔ کوٹری۔

۳۳۱ محمد صدیق صاحب معرفت محمد لطیف پروپرائٹر پاکستان ہوٹل ریلوے روڈ۔ کوٹری۔ ضلع دادو

۳۳۲ اقبال حسین صاحب، اقبال حسین آر سی۔ سی۔ معرفت شیخ غلام رسول صاحب۔ ٹکٹ کلکٹر۔ ریلوے سٹیشن کوٹری۔

۳۳۳ اقبال حسین صاحب آر سی سی۔ معرفت شیخ غلام رسول صاحب ٹکٹ کلکٹر۔ ریلوے سٹیشن روڈ کوٹری۔

۳۳۴ محمد عثمان علی صاحب۔ ہیڈ کلرک۔ ٹرسٹ پیچ فیکٹری۔ لانڈھی کراچی

۳۳۵ محمد عثمان علی صاحب ہیڈ کلرک ٹرسٹ پیچ فیکٹری لانڈھی کراچی

۳۳۶ محمد عثمان علی صاحب ہیڈ کلرک ٹرسٹ پیچ فیکٹری لانڈھی۔

۳۳۷ مولوی عبدالقیوم صاحب۔ ہیڈ ماسٹر متصل آدمجی کاٹن ملز لمیٹڈ۔ لانڈھی۔ کراچی۔

۳۳۸ جمیل الرحمٰن صاحب موضع کیہری ڈاکخانہ کلنجر تحصیل ہری پور ہزارہ

۳۳۹ محمد سلیمان صاحب موضع گرھلباری ارگان پوسٹ آفس گانڈو ضلع ٹھٹھہ۔ سندھ۔

۳۴۰ انجد حسین خانصاحب ۶/۳، ۲ شہاب الدین غوری کالونی گارڈن ویسٹ کراچی۔

۳۴۱ انور حسین صاحب ۳/۶ شہاب الدین غوری کالونی گارڈن کراچی

۳۴۲ محمد بدیع الدین صاحب سروے ٹریننگ ... لانڈھی کراچی۔

۳۴۳ عثمان علی صاحب بابراسٹریٹ حامد مرزا موٹر ورکشاپ کے سامنے روم نمبر ۱۲

۳۴۴ بی بی شوکت بیگم صاحبہ معرفت پیر عنایت شاہ ضلع ہزارہ ... مان سہراہ ڈاکخانہ تلہ جید علاقہ گڑھی ضلع حبیب اللہ خان۔

۳۴۵ مقبول شاہ صاحب معرفت پیر عنایت شاہ ضلع ہزارہ ... مان سہرہ ڈاکخانہ تلہ جید علاقہ گڑھی حبیب اللہ خان۔

۳۴۶ مسعود احمد صدیقی صاحب محلہ عام خاص حلقہ نمبر ۱ بہاولپور

۳۴۷ محمد یٰسین خانصاحب انجمنی کالج گورنمنٹ ویسٹ پاکستان جامعہ عباسیہ بہاولپور۔

۳۴۸ محمد یامین صاحب دکان حکیم عبداللہ صاحب شاہی بازار بہاولپور

۳۴۹ عزیز الدین صاحب ڈسٹرکٹ بورڈ آفس۔ بہاولپور۔

۳۵۰ سید ظفر حسین صاحب خلف الرشید جناب سید غلام محمد شاہ صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر بہاولپور۔

۳۵۱ صابرہ خانم صاحبہ پلاٹ نمبر ۲۵۶/۲ بلاک نمبر ۱ ڈرگ روڈ کراچی

۳۵۲ اکبری بیگم صاحبہ پلاٹ نمبر ۱۰/۲ بلاک نمبر ۱ ڈرگ روڈ کراچی۔

۳۵۳ عبدالحفیظ ہاشمی صاحب بے ملیکم ہوٹل چوک بازار بہاولپور شہر

۳۵۴ مصطفیٰ سلطان صاحب مکان ۲۲۶/۱ کوچہ گل حسن بہاولپور۔

۳۵۵ محمد عبدالواحد میاں صاحب رحیم اینڈ برادرس حصہ بازار پوسٹ گھوڑا مارا راجشاہی (مشرقی پاکستان)

۳۵۶ محمد حبیب الرحمٰن صاحب عظیم آباد کالونی پوسٹ آفس گھوڑا مارا مشرقی پاکستان

۳۵۷ پروفیسر حفیظ اللہ انچارج فزیکل ایجوکیشن راجشاہی یونیورسٹی مشرقی پاکستان۔

۳۵۸ محمد منیر حسین صاحب معرفت ایم اے صادق ناظم آفس جماعت اسلامی مشرقی پاکستان

۳۵۹ شیخ محمد ثناء اللہ صاحب حسین گنج پیٹا بازار پوسٹ راجشاہی مشرقی پاکستان۔

۳۶۰ محمد بشیر صاحب مکان نمبر ۲۹/۶۸۰ گلی نمبر ۱ جدید محلہ ...

۳۶۱ صفیہ بی بی مکان نمبر ۸۵ کوچہ نمبر ۲ ... محلہ ... بازار

۳۶۲ سید محمد امیر علی صاحب معرفت گورنمنٹ شپنگ آفس کیماڑی

۳۶۳ حافظ محمد ساجد سعید صاحب ...

۳۶۴ حافظ سعید صاحب ... کراچی

۳۶۵ ...

۳۶۶ مطیع الرحمٰن صاحب معرفت ... پبلیکیشن ... کراچی
۳۶۷ تحسین صاحبہ معرفت ... پبلک اسکول ... کراچی
۳۶۸ سید طالب حسین ترمذی صاحب کینال کالونی بہاولپور
۳۶۹ شیر محمد صاحب منیر ... ڈاکخانہ ... ضلع بہاولپور۔
۳۷۰ غلام اللہ صاحب معرفت سید طالب حسین ترمذی کینال کالونی بہاولپور
۳۷۱ رحیم بخش صاحب کینال کالونی بہاولپور۔
۳۷۲ رحیم بخش صاحب کینال کالونی بہاولپور۔
۳۷۳ محمد سلیم صاحب معرفت رحیم بخش کلرک کینال کالونی بہاولپور۔
۳۷۴ محمد سلیم صاحب معرفت رحیم بخش کلرک کینال کالونی بہاولپور۔
۳۷۵ نور محمد صاحب ورکس کلرک دفتر ... پبلیکیشن اینڈ کنٹرول آفیسر۔
P.W.D برانچ۔ بہاولپور۔
۳۷۶ سید خورشید علی صاحب سید میڈیکل ہال مچھلی بازار بہاولپور۔
۳۷۷ پیر بخش صاحب اور میر محمد صاحبان معرفت رحیم بخش کلرک کینال کالونی بہاولپور
۳۷۸ سید طالب حسین ترمذی صاحب کینال کالونی بہاولپور۔
۳۷۹ محمد فاضل صاحب چپراسی کینال کالونی بہاولپور۔
۳۸۰ غلام مرتضیٰ صاحب کلرک کینال کالونی بہاولپور
۳۸۱ فیض بخش صاحب چپراسی ... سرکل محکمہ انہار بہاولپور
۳۸۲ محمد شیخ خان صاحب لیدر مرچنٹ ۹۷ شاہی بازار بہاولپور
۳۸۳ سلمیٰ بیگم صاحبہ دختر تاج الدین دفتر جماعت اسلامی بہاولپور
۳۸۴ محمد شوکت صاحب کوارٹر نمبر ۶۲ یونٹ نمبر ۷ سی لطیف آباد کالونی،
حیدرآباد سندھ۔
۳۸۵ سید مظہر علی شاہ صاحب معرفت کورنگ ... شاہی بازار حیدرآباد سندھ
۳۸۶ تاج بی بی معرفت محمد رفیق مکان نمبر ... چوہدری بلڈنگ حیدرآباد سندھ
۳۸۷ انجہاں خاتون صاحبہ کوارٹر نمبر ... یونٹ نمبر ۷ سی لطیف آباد حیدرآباد سندھ
۳۸۸ نصیر الدین صاحب ... روڈ متصل گوشت مارکیٹ حیدرآباد سندھ
۳۸۹ حکیم محمد عبدالوہاب صاحب مکان نمبر ۳۳۴۷ ... محلہ ... سندھ
۳۹۰ میر شوکت حسین صاحب معرفت مولوی عبدالمعبود صاحب محلہ ... روہڑی سندھ
۳۹۱ جعفر حسین صاحب شاہی بازار ... چوک روہڑی سندھ
۳۹۲ ... صاحب مکان ... محلہ کھتری گلی روہڑی سندھ
۳۹۳ محمد عثمان صاحب ۳۲-۱۰۳۲/بی شاہی بازار روہڑی سندھ
۳۹۴ حبیب احمد صاحب مکان نمبر ... محمد ... گلی روہڑی۔
۳۹۵ ... النساء صاحبہ معرفت ضیاء الحق صدیقی شاہی بازار سکھر۔
۳۹۶ ... صاحبہ معرفت ظہیر الحق صدیقی ... سائیکل ... سکھر
۳۹۷ ... صاحب ... فارمیسی ڈھک روڈ سکھر۔
۳۹۸ ... صاحب ... فارمیسی ڈھک روڈ سکھر۔
۳۹۹ ... محمد عارف حسین صاحب ماڈرن فارمیسی ڈھک روڈ سکھر۔
۴۰۰ شاہدہ بیگم صاحبہ ماڈرن فارمیسی ڈھک روڈ سکھر۔
۴۰۱ محمد یونس صاحب ماڈرن فارمیسی ڈھک روڈ سکھر
۴۰۲ محمد ... صاحب ماڈرن فارمیسی ڈھک روڈ سکھر۔
۴۰۳ زاہدہ بیگم صاحبہ ماڈرن فارمیسی ڈھک روڈ سکھر۔
۴۰۴ محمد ... صاحب ماڈرن فارمیسی ڈھک روڈ سکھر۔
۴۰۵ عابدہ بیگم صاحبہ ماڈرن فارمیسی ڈھک روڈ سکھر۔
۴۰۶ محمد عمران صاحب ماڈرن فارمیسی ڈھک روڈ سکھر۔
۴۰۷ سید ... احمد صاحب حیدری لیاقت چوک سکھر۔
۴۰۸ سید سیف الرحمٰن صاحب علوی معرفت ضیاء ... کمپنی شاہی بازار سکھر
۴۰۹ فیروز الدین صاحب موتی گلی مکان نمبر ... شاہی بازار سکھر۔
۴۱۰ مہتاب الدین صاحب ... الدین صاحب مکان نمبر ... موتی گلی سکھر۔
۴۱۱ کبیر محمد صاحب قریشی معرفت بنک دولت پاکستان لاہور
۴۱۲ چاند محمد صاحب معرفت پوسٹ بکس نمبر ... کراچی نمبر ۲
۴۱۳ محمد عبداللہ طاہر صاحب ... برادرس فیکٹری ... کوٹھ۔ رحیم یار خان
۴۱۴ صدرالدین صاحب ... جہانگیر روڈ ویسٹ کراچی
۴۱۵ محمد علی صاحب ... بستی نزد ریڑھی لانڈھی کراچی
۴۱۶ زینب صاحبہ ریڑھی بستی لانڈھی کراچی۔
۴۱۷ محمد عثمان صاحب ... بستی ریڑھی لانڈھی کراچی
۴۱۸ جمال محمد صاحب معرفت محمد سلیم ریڑھی لانڈھی کراچی۔
۴۱۹ غلام حیدر صاحب معرفت عبدالقیوم صاحب ... متصل نزد آدمجی کاٹن ملز لانڈھی
۴۲۰ غلام حیدر صاحب دھوبی گھاٹ ... کارڈ نمبر ... آدمجی کاٹن ملز لانڈھی کراچی
۴۲۱ قیوم خان صاحب معرفت عبدالقیوم صاحب ... نزد آدمجی کاٹن ملز لانڈھی کراچی
۴۲۲ محمد یعقوب ... خان صاحب معرفت دفتر جماعت اسلامی لانڈھی کراچی۔
۴۲۳ محمد عبدالعزیز صاحب کمپوڈر دواخانہ جماعت اسلامی محلہ ... کراچی
۴۲۴ محمد عبدالعزیز صاحب کمپوڈر دواخانہ جماعت اسلامی محلہ ... آباد لانڈھی کراچی
۴۲۵ محمد ... الدین صاحب صدیقی نزد مسجد طیبہ محلہ معین آباد ... فیکٹری لانڈھی کراچی۔
۴۲۶ قیوم خان صاحب غلام حیدر صاحب ملازم دھوبی گھاٹ ... کارڈ نمبر ... آدمجی کاٹن ملز لمیٹڈ کراچی۔
۴۲۷ سلیمان صاحب ... متصل گیٹ آدمجی کاٹن ملز لمیٹڈ کراچی۔
۴۲۸ محمد ہارون صاحب ریڑھی بستی لانڈھی کراچی نمبر ۲۲۔
۴۲۹ انیسہ بیگم صاحبہ بنت محمد عبدالحق صاحب معرفت جماعت اسلامی محلہ ... لانڈھی کراچی۔
۴۳۰ ... صاحب معرفت ... کراچی

۴۳۱ غلام قادر صاحب میاں پیر سوسائٹی لین لیاری کوارٹرز کراچی۔
۴۳۲ عبدالحسیب صاحب معرفت اخوین ٹریڈرز لمین خوری روڈ ابراہیم کالونی کراچی
۴۳۳ خواجہ غلام نبی صاحب کوارٹر نمبر ۳ مارٹن روڈ کراچی۔
۴۳۴ محمد صابر احسان الحق صاحب۔ ڈی، بی بلاک نمبر ۵ لالوکھیت کراچی
۴۳۵ یار محمد صاحب ۱۸/۱۲ بندر روڈ کراچی
۴۳۶ توسل حسین صاحب قدوائی ۶۰۲/۱ لالوکھیت کراچی۔
۴۳۷ حبیب النساء صاحبہ ۶۰۲/۱ لالوکھیت کراچی۔
۴۳۸ طلیس احمد خان صاحب عقب پریڈی ہاؤس پریڈی اسٹریٹ صدر کراچی۔
۴۳۹ علاء الدین صاحب قریشی معرفت انسپکٹر آف ورکس این۔ڈبلیو ریلوے سکھر۔
۴۴۰ مشتاق عبدالحق صاحب دالس روڈ گاڑی کھاتہ سکھر۔
۴۴۱ ماسٹر عبدالحق صاحب پاکستان ٹیلرنگ شاپ نیم کیچارڈی سکھر۔
۴۴۲ حفیظ اللہ خان صاحب معرفت حاجی بیکری ڈھک روڈ سکھر۔
۴۴۳ منصور الدین صاحب فردوس کالونی گولی مار نمبر ۲ کراچی۔
۴۴۴ ملک مختار احمد صاحب ۱۰/۲۳ مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی۔
۴۴۵ محمد اصغر ملک صاحب ۱۰/۲۳ مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی
۴۴۶ رفیق احمد صاحب ۱۰/۲۳ مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی۔
۴۴۷ صدیق احمد صاحب ۱۰/۲۳ مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی
۴۴۸ منصور علی صاحب کوارٹر نمبر ۱ بلاک نمبر ۱۰ مارٹن کوارٹرز کراچی۔
۴۴۹ محمد حسین خان صاحب ۱۶۴ شہاب الدین غوری کالونی لسبیلہ ہاؤس کراچی
۴۵۰ محمد صابر صاحب لسبیلہ ہاؤس معرفت مکتبہ فکر اسلامی کراچی۔
۴۵۱ کفیل محمد خان صاحب معرفت مکتبہ فکر اسلامی لسبیلہ ہاؤس کراچی
۴۵۲ شبیر احمد صاحب مکان نمبر ۷۹۹ فاروق آباد گولیمار نمبر ۱ کراچی۔
۴۵۳ محمد اسماعیل صاحب مدینہ ہوٹل موسیٰ لین معرفت خان میر صاحب کراچی
۴۵۴ محمد اسماعیل صاحب معرفت . . صاحب مدینہ ہوٹل موسیٰ لین کراچی
۴۵۵ محمد عرفان خان صاحب رحمان ہوٹل میٹھا پاڑہ کراچی
۴۵۶ عبدالرحمٰن صاحب مکان نمبر ۱/۴۰ محلہ ندی آباد عقب لسبیلہ ہاؤس کراچی
۴۵۷ فقیر محمد صاحب مکان نمبر ۱/۴۱ محلہ ندی آباد عقب لسبیلہ ہاؤس کراچی
۴۵۸ عطاء اللہ صاحب عقب عیسیٰ ایڈوانی بلڈنگ میکلیل پاڑہ کراچی
۴۵۹ محمد عبدالغنی صاحب کلرک لیمپ مینوفیکچرس لمیٹڈ آف پاکستان کراچی۔
۴۶۰ محمد عبدالغنی صاحب الکٹرک لیمپ مینوفیکچرس لمیٹڈ آف پاکستان
۴۶۱ عبدالقادر صاحب برماشیل ہیڈ آفس میکلوڈ روڈ کراچی۔
۴۶۲ سید عبدالرحمان صاحب آرکیٹکٹ ڈیپارٹمنٹ میونسپل کارپوریشن کراچی
۴۶۳ کبیر علی خان صاحب کلاتھ مرچنٹ شیر محمد شاہ ورنگ کا الفریڈ اسٹریٹ کراچی
۴۶۴ حکیم عبدالشکور صاحب مقام و ڈاکخانہ جلالیہ تحصیل ضلع اٹک
۴۶۵ عطا محمد صاحب کمشنر مکان نمبر ۹ ... کرکری ... ملتان

۴۶۶ میاں کریم بخش صاحب معرفت میاں کریم بخش صاحب بلاک نمبر ۷ ...
۴۶۷ ظہور احمد صاحب ٹھیکیدار گرڈ انگورا اکیڈمی بلاک نمبر ۷ ڈیرہ غازی
۴۶۸ محمد امین صاحب ٹھیکیدار گرڈ انگورا اکیڈمی بلاک ۷ ڈیرہ غازی
۴۶۹ شریف النساء بیگم صاحبہ عقب پریڈی اسٹریٹ پریڈی ہاؤس صدر
۴۷۰ ریحانہ انیس صاحبہ عقب پریڈی اسٹریٹ پریڈی ہاؤس صدر
۴۷۱ سید علی احمد صاحب ۱/۵۸ ڈرگ روڈ کالونی کراچی۔
۴۷۲ سید محمد حسین صاحب کوارٹر نمبر ۲ بلاک نمبر ۱۳/۲ فیڈرل ایریا کراچی
۴۷۳ عقیل احمد صاحب ۱/۵۵ ڈرگ کالونی کراچی۔
۴۷۴ ظہیر احمد صدیقی صاحب ۱/۴۸ ڈرگ روڈ کالونی کراچی
۴۷۵ محمد الیاس احمد فاروقی صاحب پلاٹ نمبر ۲۲۸ بلاک نمبر ۱ ڈرگ روڈ
۴۷۶ محمد انیس الحسن ۱۸۱ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی۔
۴۷۷ غلام محمد شریف صاحب پلاٹ نمبر ۸، بلاک نمبر ۱ ڈرگ روڈ کراچی
۴۷۸ اخلاق احمد دلانی صاحب ۳۰۲/جی ایبسینیا لائن کراچی۔
۴۷۹ محمد ظہیر الدین صاحب ۱/۴ بہار کالونی جمشید روڈ کراچی۔
۴۸۰ محمد عبدالحمید صاحب ۔ایس سعود آباد کالونی ڈرگ روڈ کراچی
۴۸۱ ایم۔او۔حمید صاحب کوارٹر نمبر ۶۰ الف عقب جیکب لائن کراچی
۴۸۲ محمد شفیع صاحب حیدری ہیئر کٹنگ سیلون گوٹھ ابراہیم حیدری کراچی
۴۸۳ غلام نبی صاحب معرفت عبدالغفور بھٹی کیبنٹ باتقاز تنظیم کراچی۔
۴۸۴ محمد ابراہیم حنیف صاحب ۱۳۱ حیدرآباد کالونی کراچی۔
۴۸۵ بیا اشرف علی جاوید صاحب ۱۳۱ حیدرآباد کالونی کراچی۔
۴۸۶ قادر النساء بیگم عرف شمیم صاحبہ ۱۳۱ حیدرآباد کالونی کراچی۔
۴۸۷ محمد عبدالحمید عرف اقبال صاحب ۱۳۱ حیدرآباد کالونی کراچی۔
۴۸۸ محمد سمیع اللہ صاحب سی۔ای۔ایس آفس پوسٹ ویسٹ کراچی
۴۸۹ سید مجتبیٰ حسن علی صاحب کوارٹر نمبر ۱۸۵ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی۔
۴۹۰ جنت بی صاحبہ معرفت ندو بلڈنگ کمرہ نمبر ۱۶ لطیف بیگم بندر روڈ کراچی
۴۹۱ حسین خان صاحب . . ڈاکخانہ حضرو۔ ضلع کیمبل پور۔
۴۹۲ عبدالبشیر خان صاحب ۳۳-بی۔سی ساداتی کالونی پوسٹ آفس ملتان
۴۹۳ انور شاہ صاحب مقام و ڈاکخانہ تلہٹہ تحصیل مان سہرہ ضلع ہزارہ۔
۴۹۴ غلام رسول صاحب ہزاروی۔ ای جاوید منزل نو تعمیر روڈ پشاور
۴۹۵ صاحبزادہ عبدالحمید صاحب محلہ معظم خیل بٹہ بیر تحصیل ضلع پشاور
۴۹۶ شاہ جی حبیب الرحمٰن صاحب مقام و ڈاکخانہ تحصیل چھوٹا ضلع مردان۔
۴۹۷ شمس الضحیٰ صاحب معرفت جماعت اسلامی کراچی۔
۴۹۸ سید عبدالسلام صاحب معرفت ہاشمی بک اسٹال فریئر روڈ کراچی
۴۹۹ صاحبزادہ صاحب معرفت ہاشمی بک اسٹال فریئر روڈ کراچی
۵۰۰ محمد ابراہیم صاحب سکھر ... مسان روڈ کراچی۔

1957 Phone 7923 Regd. No. S. 1375

Monthly "MUSHIR" Karachi

Mashhoor Press, Karachi.

ماہنامہ مشیر کراچی

پاکیزہ ادب کا ڈائجسٹ

نگارشے

انسان اور تالاب

برسات کی بہار میں تالاب لبالب بھرا ہوا تھا لیکن وقت نے پلٹا کھایا اور وہ پانی کی کمی کی وجہ سے سوکھ گیا۔ اس کے جسم میں دراڑیں پڑ گئیں۔

کنارے پر کھڑا ایک انسان تالاب کی اس بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر ہنس پڑا، اور طنز سے بولا "ارے، یہ بھی کوئی زندگی ہے! کہاں ہے تمھاری وہ شان، جب تمھارا سینہ ہلوریں لیتا تھا اور راہگیروں کے دل کو خوش کرتا تھا؟"

انسان کے اس طنز کو سُن کر تالاب پہلے تو چُپ رہا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر بولا:

"ٹھیک کہتے ہو انسان! لیکن جب تمھاری جوانی کا پانی ختم ہو جائے گا، تب تمہیں اس سوال کا شاید اور بھی اچھا جواب مل سکے۔"

اور یہ سُنکر انسان سوچ میں ڈوب گیا۔

نینا کاش

ماہنامہ **مشیر** کراچی

پاکستان کا ادبی ڈائجسٹ

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ٹیلی فون: [illegible]

جلد: ۸

شمارہ: ٦

جون ۱۹۸۴ء

کلمۂ حق		
انسان اور انقلاب	نیاز کاوش	۱
سوچ بچار		
ایک سو سال بعد	محمود فاروقی	۳
شہیدوں کا لہو	عالم اکبر آبادی	۵
اسلامی ادب نمبر	ادارہ	۵
تراشے		
کیا قائداعظم مخلوط انتخاب کے حامی تھے؟		٦
انتخابات میں گروہ بندی	سر رضا علی	٦
پسِ پردہ		
اردو میں نماز	کھری	۷
فکر و نظر		
اسلام ایک نظام اجتماعی	علامہ اقبالؒ	۹
قدم بہ قدم		
کوریا میں اسلامی فکر و نظر کی اشاعت	زبیر کوش (کوریا)	۱۱
برگ گل		
زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں	الو صدیقی	۱۳
غزل	بیکش اکبرآبادی	۱۴
غزل	محسن بھوپالی	۱۵
ترغیب	اقبال سیفی	۱٦
غزل	افتخار اعظمی	۱۷
پیام آدمیت	جمیل صدیقی	۱۷
غزل	عشرت فاروقی	۱۸
حسرتِ پرواز	انجم خورشید [illegible]	۱۸
غزل	عزیز حمیدی	۱۹
راولپنڈی	فیروز نظر	۱۹
یادِ رفتگاں		
امیر خسرو	محمود فاروقی	۲۰
بہادر شاہ ظفر		۲۱
حسرت موہانی		۲۳
افسانے		
پھر فضا مسکرانے لگی	ابن فرید	۲۵
چاچی	نعیم قیصر	۲۹
دیس بدیس		
تیسرا دن - بیچیا	(ترجمہ) محمد عبید اللہ مصطفیٰ	۳۵
طنز و مزاح		
غلطی میری ہی تھی!	شوکت حنفی	۳۷
مطالعہ کی میز پر		
مشیر کا اسلامی ادب نمبر	عبدالکریم عابد	۳۹
تذکرے اور تبصرے		
....	ادارہ	۵۰
بلوتلہ تنظیم، کارروائی و فہرست ممبران		۵۷ — [illegible]

نگران: عبدالغفور بیگ

مرتب: محمود فاروقی

بدل اشتراک:-

سالانہ: پانچ روپے، فی پرچہ [illegible]

[illegible] عبدالغفور بیگ [illegible] سے چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک سو سال بعد

——— جشن۔ جلسے۔ یادگاریں!

پچھلے چند برس سے ملک میں تحریک آزادی کا صد سالہ جشن منایا گیا، اخبارات کے باتصویر نمبر شائع ہوئے، جلسے منعقد کئے گئے، مشاعرے ہوئے، اور یادگاریں قائم کی گئیں۔ ان سب باتوں کا منشا یہی تھا کہ ہم ان شہیدوں کی خدمت میں نذر عقیدت پیش کریں جو اس جدوجہد میں ملک و قوم پر قربان ہو گئے، ہم اس جذبۂ آزادی کا احترام کریں جس کی خاطر ہمارے بزرگوں نے جان و مال کی بازی لگا دی تھی تاکہ ہماری قوم اور ہمارے عوام ...... میں حق پرستی کا جذبہ، باطل سے نبرد آزما ہونے، ظلم کے خلاف جدوجہد کرنے اور انصاف کو قائم کرنے کی وہی اسپرٹ اور جذبہ پیدا ہو جائے جو سنہ ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں کے دلوں میں موجود تھا۔ اس جذبہ اور یقین کو پیدا کرنے کے لئے جلسوں، مشاعروں، یادگاروں اور خصوصی نمبروں کی صورت میں کیا کچھ کیا گیا اور تقریروں، بیانوں، مضمونوں، نظموں اور تصویروں کے ذریعہ حریت و آزادی، حق پسندی و باطل شکنی کے لئے جس طرح فکر و ذہن کو بیدار کیا گیا اور نفسیاتی تدبیر سے کام لے کر عوام کے جذبات و احساسات کو جس ڈھنگ کے ساتھ اکسایا اور ابھارا گیا اپنے طور پر نہایت ہی خوش آئند اور اعتبار سے مکمل تھا۔

لیکن ——— !

- کیا ان کوششوں کے ذریعہ وہ مقصد حاصل ہو گیا جس کے لئے ہم نے صد سالہ جدوجہد آزادی کا جشن منایا تھا، پرافشاں کئے تھے اور بلند بانگ دعوے کئے تھے اور جذبات ابھارنے چاہے تھے؟
- کیا ہمارے عوام میں سرفروشی و جانبازی کے جذبات پروان چڑھنے لگے ہیں؟
- کیا تدبیر و انداز فکر و عمل میں واضح کچھ تبدیلیاں نمودار ہونے لگی ہیں؟
- کیا ہم اپنی تعلیم و تربیت کے لئے کسی نئی تیاری میں لگ گئے ہیں؟
- کیا ہمارے لیڈر اور حکومت وقت میں [illegible] ان جذبات کے تحت عوام کی سیرت کو اس کے سانچے میں تیار کرنے لگے ہیں؟
- کوئی تبدیلی! ذرا سی کوئی حرکت!!!!

یہ سوالات ایسے نہیں جن پر سے لوگ سرسری طور پر گزر جائیں، کارنامہ حیات کا ہر گوشہ اور زاویہ نگاہ اپنے پیچھے یہ سوالات چھوڑ جاتا ہے۔ اور ہر گوشہ تغیر و انقلاب ان سوالات کا گن گن کر جواب لیتا ہے۔ جو قوم اپنے فکر و عمل سے [illegible] اس انقلاب کے بیرونی جالوں سے [illegible] اور جس قوم کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں ہوتا وہ [illegible] ہو جاتی ہے کہ اس کا وجود فضا میں گرد و غبار بن کر اڑ جاتا ہے۔

[illegible] جدوجہد آزادی کی [illegible] صد سالہ جشن [illegible]

[illegible]

دیکھے رہتے ہیں رہے، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ کہ ہم تقریباً ہر سال ایسے دو چار جشن مناتے ہی رہتے ہیں لیکن ایک دو گھڑی کی دل لگی کے بعد پھر وہی کا سا عالم چھا جاتا ہے۔ کیا ان مواقع پر فکر و عمل کو متاثر کرنے والے ذرائع اپنے اثر و نفوذ کے لحاظ سے ناقص ہوتے ہیں۔ کیا لوگ واقعی ان سے متاثر نہیں ہوتے۔ کیا ان مواقع پر ہونے والے مظاہروں میں کوئی خاص کمی رہ جاتی ہے۔ یا پھر عوام ہی ایسے کند ذہن اور بدسرشت ہیں کہ ان کے دلوں کے پتھر پر جونک کسی طرح لگتی ہی نہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ وقتی کیفیت و تاثر ہماری قومی زندگی میں دوامی رویہ بن کر دوڑتا نہیں رہتا۔ اور یہ بھڑکائے ہوئے شعلے دبی دبی آنچ کی صورت میں ہمارے قلب و ضمیر کو گرماتے نہیں رہتے؟

ان یادگار مواقع پر عمل میں لائی جانے والی تدابیر ہر طرح مؤثر و مکمل ہوتی ہیں اور اپنے اثر و نفوذ کے لحاظ سے ان میں کوئی نقص و خامی نہیں پائی جاتی۔ دوسری طرف ہمارے عوام بھی اپنے سینوں میں پتھر کے ٹکڑے اور برف کی سلیں نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان کے پہلوؤں میں بھی دھڑکتے ہوئے اور مچلتے ہوئے دل ہیں۔ اور وہ پوری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ ہر کیفیت کو بخوبی ذہنوں میں جذب کرتے ہیں۔ بلکہ وہ اس معاملے میں تو کچھ اتنی زائد از ضرورت جذباتیت کا مظاہرہ کرنے لگ جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، ؎ دیوانہ را ہوئے بس است •

• جب یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو پھر اس بے حسی اور افتادگی کا سبب کیا ہے؟

ذرا توجہ سے غور کیا جائے تو اصل معاملہ کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ اس صورت حال کی بڑی حد تک ذمہ دار وہ خود ساختہ اور خود بیں قیادت ہے جس میں سرکاری غیر سرکاری تمام شخصیتیں شامل ہیں۔ اور بیشتر حکومتی اور عوامی ادارے شریک ہیں۔ اس قیادت کا تمغہ لگانے والے تقریباً تمام سربراہ اور لیڈر اگر کسی مسئلہ پر پورے خلوص، سنجیدگی اور توجہ سے غور کرتے یا اس کے لئے سعی و جہد کرتے ہیں تو وہ صرف ان کی اپنی ذات کا مسئلہ ہوتا ہے، ان کے اپنے رتبہ و اعزاز کا مسئلہ ہوتا ہے، ان کے بنک بیلنس اور ذاتی مفاد کا مسئلہ ہوتا ہے اس ایک مسئلہ کے سوا باقی تمام مسائل پر نہ تو وہ سنجیدگی سے غور کرتے ہیں، اور نہ خلوص سے ان کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک ان مسائل سے ان کی اپنی اغراض تکمیل پاتی ہیں وہاں تک تو وہ ان میں بڑے سرگرم اور رائے عامہ کے علمبردار بنے رہتے ہیں۔ اور جہاں قوم کی بگڑی کو عملاً سدھارنے کی حد آجاتی ہے وہاں وہ رائے عامہ کو اپنے بستر کا گدیلہ بنا کر ستانے کی فکر کرتے ہیں۔ ان کے پاس نہ تو عوام کی تربیت کی کوئی باضابطہ اسکیم ہوتی ہے اور نہ وہ کسی ایسی مسلسل جد و جہد کا پروگرام رکھتے ہیں جو قومی زندگی کو ہر سال ان امتحانی مرحلوں سے گزار کر معیار مطلوب پر پہنچادے ـــــ یہ نہ صرف ان کے حکمت و تدبر کی کمی کا نتیجہ ہے بلکہ اس میں ان کی بدنیتی بھی پوشیدہ ہے وہ عوامی شعور کے بلند ہونے اور عوامی کردار کے سلجھنے سے ڈرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ سنجیدہ جوش و خروش عملی سانچوں میں ڈھل جائے۔ تاکہ ان کے افکار و اعمال عوام کے احتساب سے بچے رہیں۔ اور ان کا وہ سیاسی طلسم کسی طرح نہ ٹوٹنے، جس میں بیٹھ کر وہ ہر آفت سے محفوظ اور ہر نعمت سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے تمام مواقع پر قوم کا وقت، روپیہ اور صلاحیتیں بے دریغ صرف ہوتی ہیں اور ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ الٹا یہ نقصان ہوتا ہے کہ بے لگام اشخاص ان مواقع کو ان کے اپنے صحیح مقاصد سے ہٹا کر نفس پروری، آوارگی اور غنڈہ گردی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اور وہ قوم جو شہیدوں، غازیوں اور مجاہدوں کی یادگار منانے جمع ہوتی ہے۔ بازاروں اور سڑکوں پر سوقیانہ حرکتیں پر اتر آتی ہے۔ اور عین چوراہے پر قومی ناموس و آبرو کا نقاب تار تار ہو کر رہ جاتا ہے ـــــ

اس صد سالہ جشن آزادی کے بعد بھی اگر یہی صورت حال نظر آرہی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ جشن منا کر ان شہیدوں اور مظلوموں کا مذاق اڑایا ہے جو پہلی تحریک آزادی کی جد و جہد میں حق و انصاف کی لڑائی لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے •

(محمود فاروقی)

عالم اکبرآبادی

شہیدوں کا لہو!!

تاکجا عشرتِ بیجا تا کجے عیش و طرب
ایسی باتوں سے کہیں کام کوئی چلتا ہے

جشنِ آزادیٔ جمہور منانے والو!
اِن چراغوں میں شہیدوں کا لہو جلتا ہے

"مشیر" کا "اسلامی ادب نمبر"

مشیر کے اسلامی ادب نمبر سے متعلق ہمارے ناظرین نے بڑی حوصلہ افزائی کے خطوط لکھے ہیں۔ اس کاغذی بحران میں اتنا ضخیم پرچہ نکالنا ادارہ مشیر کے لئے ایک مرحلہ سے کچھ کم نہ تھا لیکن ادھر عرصہ سے اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ تعمیری ادب کے ایسے تمام نمونے ایک مجموعہ کی صورت میں اکٹھا کر دیئے جائیں جو ادب سے لیکر اس دور کے اہلِ قلم کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ کام بلاشبہ بڑی ذمہ داری کا کام تھا اور اس کے لئے ایک بہت بڑے اہتمام کی ضرورت تھی۔ ادارہ مشیر کے محدود وسائل و ذرائع کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بہت مشکل تھا کہ جس خیال کے تحت اس نمبر کو مرتب کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تھا اس کو پوری طرح عملی جامہ پہنا دیا جاتا تاہم جو کچھ امکان میں تھا وہ کیا گیا اگرچہ کہ یہ نمبر اس قدر جامع اور مکمل نہیں ہو سکا کہ اس مجموعہ میں اردو کے علاوہ مختلف زبانوں کے بہتر سے بہتر تعمیری ادب کے نمونے جمع ہو جاتے پھر بھی اس حد تک تو ہم نے ضرور کامیابی حاصل کر لی کہ ہم اپنے پڑھنے والوں کو اس مجموعہ کے ذریعہ تعمیری قدروں کی وسعت و ہمہ گیری کا احساس دلا سکیں یہ قدریں درحقیقت کسی مخصوص حلقۂ فکر کی ساختہ و پرداختہ نہیں ہیں بلکہ یہ درحقیقت انسان کے فطری رجحانات و احساسات کا پرتو ہیں۔ جن کی تلاش ہر دور کے انسان کو رہی ہے جن کی جستجو ہر خطۂ زمین میں رہی ہے اور جن کے بغیر آج کا انسان بھی مضطرب و بے چین ہے۔

اس مجموعہ کی تنقیدوں، افسانوں اور اشعار میں اگر آپ کو حقیقت کی اس تلاش اور جستجو کا ایک گراف (GRAPH) حاصل ہو جائے جس کے ذریعہ آپ اسلامی ادب کی قدروں کی اہمیت اور ان کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ لگا سکیں تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنتیں ٹھکانے لگیں اور ہم نے مالی خسارہ کا نعم البدل پا لیا۔

اپنے تاثرات لکھنے والوں نے مختلف قسم کے اعتراضات بھی کئے ہیں، ہم ان اعتراضات کے سلسلہ میں کوئی صفائی نہیں پیش کرنا چاہتے بلکہ ہم اپنی کوتاہیوں کا دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ اس کام کے لئے جس اہتمام کی ضرورت تھی وہ بہرحال نہ ہو سکا۔ البتہ ان خطوط میں کچھ ایسے سوالات بھی اٹھائے گئے ہیں جن کا تعلق براہِ راست اسلامی ادب کے نظری مباحث سے ہے ہم ایسے سوالات کا جواب ایک نئے کالم "مسائلِ ادب" کے زیر عنوان شائع کر رہے ہیں اور ان پر اظہارِ خیال کی دعوت دیتے ہیں۔

(ادارہ)

کیا قائد اعظم مخلوط انتخاب کے حامی تھے؟

ستمبر سنہ ۴۴ء میں گاندھی کے ساتھ اپنی خط و کتابت میں قائد اعظمؒ نے کہا۔

"..... ہم اس کے قائل ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں۔ جو قوم کی ہر تعریف اور معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ہم دس کروڑ کی ایک قوم ہیں۔ مزید برآں ہم ایک ایسی قوم ہیں، جو ایک مخصوص اور ممتاز تہذیب و تمدن، زبان و ادب، آرٹ اور فن تعمیر، احساس اقتدار، مناسب قانونی احکام و اخلاقی ضوابط، رسم و رواج اور تقویم (کیلنڈر) تاریخ اور روایات، رجحانات اور عزائم کی مالک ہے۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں ہمارا اپنا ایک الگ اور نقطۂ نگاہ ہے اور قانون بین الاقوامی کی ہر دفعہ کے لحاظ سے ہم ایک قوم ہیں......"

نومبر سنہ ۴۵ء میں قائد اعظمؒ نے فرمایا۔

"..... ہم (ہندو اور مسلمان) ہر چیز میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مذہب میں مختلف ہیں، تہذیب و تمدن میں مختلف ہیں، تاریخ میں، زبان میں اور تعمیر میں، موسیقی میں، قانون اور اصول قانون میں، کھانے پینے میں، معاشرت میں، لباس میں غرض ہر چیز میں ان سے مختلف ہیں۔ صرف ووٹ ڈالنے کی صندوقچی میں ہم اور وہ یکجا نہیں ہو سکتے......"

انہوں نے فرمایا :-

"...... پاکستان مسلمان قوم کی وحدت کا مجسم ظہور ہے۔ اور اس کو ایسا ہی رہنا چاہیئے...." (مارچ سنہ ۴۸ء)

انتخابات میں گروہ بندی

ہندوستان کی زمین جمہوریت کے پودے کی نشوونما کے لئے موزوں نہیں ہے۔ جس حلقہ انتخاب میں جس ذات یا طبقہ کی اکثریت ہوتی ہے وہاں اس ذات یا طبقہ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ممبر بھی اسی ذات یا طبقہ کا ہو۔ ہم ہندوستانیوں کا یہ رجحان جو اب ہماری ذہنیت میں داخل ہو گیا ہے نہایت قابل افسوس ہے اور صاف بتا رہا ہے کہ جمہوریت کی بیل ہمارے ملک میں کبھی منڈھے نہ چڑھے گی، سچ پوچھئے تو ہندو بھائیوں کی اسی ذہنیت نے مسلمانوں کو انتخاب جداگانہ کی آواز بلند کرنے پر مجبور کیا۔ غیر مسلم انتخابی حلقوں کی یہ حالت ہے کہ اگر اس ہندو حلقہ کی فہرست میں جاٹوں کی اکثریت ہے تو سوائے جاٹ کے کسی اور ذات کے آدمی کا منتخب ہونا بڑا دشوار کام ہے۔ انتخاب جداگانہ سے مسلمانوں کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ کٹھ پتلی کی طرح ہندو بھائیوں کے ہاتھوں میں نہ رہے۔

—— سر رضا علی

اردو میں نماز!

۱۹۶۸ء میں لکھا ہوا ہو یا نہ ہو البتہ لاہور میں یہ فقرہ ضرور ہوگا کہ اس مرتبہ وہاں کچھ لوگوں نے عید کی نماز اردو میں پڑھی اور اس طرح اپنی اپنی زبانوں میں نماز ادا کرنے کا جواز مہیا کر دیا اور دلیل یہ دی کہ اگر کلام الٰہی کو سمجھ کر نہ پڑھا جائے تو کلام الٰہی کی توہین ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ان مترجم نمازیوں کے سرخیل کوئی مولانا مسعود صاحب [illegible] ہیں۔ بلا کسی بحث کے ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ اپنی اپنی زبانوں میں نماز پڑھنا چاہئے اور احد ضروری ہے اور اس طرح کلام الٰہی کی توقیر میں دن دگنی رات چوگنی ترقی اور برکت ہونے کا امکان ہے۔ لیکن اس فرض کرنے میں کچھ عملی دقتیں بھی پیش آسکتی ہیں۔

مثلاً ہمارے مسعود صاحب مع اپنے دم چھلے آئی ایس کے [illegible] کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے وہاں نماز خالص [illegible] "[illegible]" کی زبان میں ادا کی جا رہی ہے اور مسعود صاحب صرف شیکسپیئر کی زبان سے واقف ہیں بیچارے کیا کریں نماز نہ پڑھیں تو بھی گناہ، پڑھیں بھی تو گناہ ——!

یہی حال ہوگا پنجاب میں نماز "ہیر رانجھا" کی زبان میں ہونے لگی، بنگال میں خدا کا کلام "ٹیگور بھاشا" کا محتاج ہو جائے گا اور بلوچستان میں [illegible] شاہ کی بولی کلام پاک کا جزو بن جائے گی اور مسجد میں پختون [illegible] اللہ کا کلام گنگنانے لگے گا۔ اور ہمارے مسعود صاحب آئی ایس ایس جو بقول مجید لاہوری [illegible] کی جیل [illegible] یقیناً مہاراج [illegible] اس پاک سرزمین کی [illegible] مسجدوں میں احکام الٰہی کو سمجھ لیں گے۔ اب [illegible] ہال میں [illegible] کا انتظار کرنا پڑے گا [illegible] کی زبان میں ان کو پیام خداوندی سے آگاہی بخش سکے یا پھر [illegible] مجید لاہوری صاحب [illegible] سجدے کرنے پڑیں گے۔

خوط پر خوط لکھا رہا ہے اور اپنے ہر خوط میں وزارت و قیادت کے کچھ نئے نئے موتی نکال لاتا ہے کہ ان کی آب و تاب سے پورے ملک کی آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی ہیں۔ صرف مسجد کا ایک گوشہ ایسا بچا ہوا تھا جہاں ان سیاسی ہنگاموں سے بے نیاز ہو کر بنگال کے بھاشانی، سندھ کے سید اور پنجاب کے نون اور سرحد کے غفار خاں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن اب ہمارے "جمیل مہاراج" (آئی سی ایس) کی بدولت لسانی بنیادوں پر مسجدیں بھی اس طرح تقسیم ہو جائیں گی جیسے ون یونٹ سے پہلے ہمارے پنجاب، سندھ، سرحد ایک دوسرے سے بیگانہ اور غیر تھے۔ صرف مثال کے طور پر کراچی پر ہی غور کیجئے کراچی کا شہر ایک ایسی [illegible] ہے جس کے پردوں کے نیچے رنگ برنگ کے جوڑے چھپے ہوئے ہیں۔ اب یہ ضروری ہو جائے گا کہ کراچی کے مختلف بولیاں بولنے والے شہریوں کے لئے الگ الگ مسجدیں بنائی جائیں اور بورڈ لگا دیئے جائیں کہ یہاں بنگلہ بھاشا میں نماز ہوتی ہے۔ یہ پنجابی بولنے والوں کی اور یہ سندھی بولنے والوں کی مسجد ہے۔ یہ بلوچی مسجد ہے، یہ پختونوں اور پھر گجراتی مسجد اور میمن مسجد اور پوربی مسجدوں کے کتنے ہی [illegible] جم جائیں گے اور وہ نماز جسے اللہ نے دلوں کو جوڑنے کے لئے فرض کیا تھا لوگوں کو ایک دوسرے سے توڑنے کا ایسا مقدس ذریعہ بن جائے گی کہ شیطان بھی عش عش کر جائے گا۔ اور [illegible] مسعود کا [illegible] کرنے لگتا کہ [illegible] مبارک انسان تجھ پر سلام کہ تو نے وہ کام کیا جو کروڑوں سال سے مجھ سے بھی نہیں ہو سکا تھا۔

اب ایک اور دقت پر غور کیجئے کہ ہمارے بجائے مجید لاہوری صاحب کو جو خیال آگیا [illegible] آج مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ [illegible] [illegible] لیکن معلوم ہوا کہ [illegible] [illegible]

[illegible] کہا جاتا ہے۔ [illegible]

میں نماز ہو رہی ہے اور مجید لاہوری صاحب اللہ کے فضل سے شرقاً غرباً
شمالاً جنوباً وسیع اور چار گوشہ آدمی ہیں ممکن نہیں کہ دوڑ بھاگ کر
جیکب لائن میں مولانا احتشام الحق کی امامت کو پالیں اب وہ ناچار منہ
لٹکائے بولٹن مارکیٹ پر کھڑے ہوئے ہیں اور بیچارا رمضانی حیران [illegible]
کہ کیا کیا جائے کیونکہ مسجد میں جماعت تو مل جائے گی مگر کلام الٰہی سمجھ
میں نہیں آئے گا اور خدا کے کلام کی توہین ہو جائے گی اب یا تو نماز نہ پڑھی
جائے یا پھر جماعت کے ثواب سے محروم رہ جائیں ۔۔۔ کوئی راہ نہ پا کر مجید
لاہوری رمضانی اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ یار بڑا سٹیک ہو گیا۔ ہمارا
مسلک بھی گیا جو ہم مسعود بھائی کے بھرے میں آ گیا اور اس کی بات پر
ایمان لایا۔"

ادھر پہلے ہی مذہبی جھگڑوں کی وجہ سے بہتر[72] روایتی فرقے بن چکے ہیں اور ہر کوئی اپنے منشا و خیال کے مطابق آیات الٰہی کا ترجمہ کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ترجمہ میں ایسے لفظ اختیار کئے جائیں جو اس کے نقطہ نظر سے زیادہ قریب ہوں۔ اب ایک بریلوی امام اردو نماز پڑھا رہا ہے پیچھے تقریباً فرقوں کے مقتدی کھڑے ہوئے ہیں اور سب کے سب ماشاء اللہ اردو میں نماز کا رواج ہو جانے کی وجہ سے کلام پاک کے رموز آگاہ ہو چکے ہیں اور خوب جاننے لگے ہیں کہ ترجمہ کا انداز لفظوں کی نشست و ترتیب اور جملوں کا قرینہ کس طرح خاص خاص معنوں اور مطلبوں کی طرف ذہن کو منتقل کر دیتا ہے۔ اب جہاں یہ پتہ چلا کہ امام نے اپنے مسلک کی طرف ترجمہ کی ڈنڈی ماردی ہے کہ بس مسجد میں فی سبیل اللہ فساد کے نعرہ تکبیر اور ڈنڈے کھڑکنے لگے اور مقتدیوں نے ایسی شرعی جوتی چلائی کہ امت مسلمہ کے ان ۷۲ فرقوں کا اچھا خاصا "ریختہ" ہو کر رہ گیا۔ اور مذہبی جھگڑوں پر تالیاں بجانے والے تماشائی دل ہی دل میں بھیل مہاراج کو دعائیں دینے لگے گنگا جیلوں کے خداوند تیرے منہ میں گھی شکر تو نے مفت میں اتنا مزہ دار تماشہ دکھایا کہ اب مسجدیں سینما سے زیادہ دلچسپ ہو گئی ہیں۔"

مسجدیں الگ ہو گئیں اور پھر ہر مسجد میں مقتدی الگ الگ ہوئے اور اس اتفاق علی النفاق پر کلام الٰہی کی دل ہی دل میں ہنسنے لگی کہ جیسے

جہاں اللہ کہہ کر صاحب اس صلوٰۃ مع الترجمہ کی بدولت قرآن کے کلام کا احترام کتنا بلند ہو گیا ہے کہ لوگ حرف حرف اور شوشہ شوشہ کے ساتھ چلنے کے استعمال ہونے پر تل گئے ہیں۔ اور ملت مرحومہ میں جہاد کی اسپرٹ بھی کس طرح دوڑنے لگی ہے۔

لیکن صاحب جہاد تو پوری دنیا کے مسلمانوں پر فرض ہے جب پاکستان کے مسلمان اتنی سرگرمی سے جہاد کرنے لگیں گے تو دوسرے اسلامی ملکوں میں یہودی اور نصاریٰ بستے ہیں خود خاموش بیٹھے رہیں وہ بھی اس جہادی [illegible] مع الترجمہ میں شریک ہو کر سنت کا ثواب کیوں نہ حاصل کریں چنانچہ پورے عالم اسلام میں جہاد بین المسلمین کی پرستش شروع ہو جائے گی اور جہاد اکبر اس وقت واقع ہو گا جبکہ حج کے لئے دنیا بھر کے مجاہد اپنے اپنے ترجمہ پڑھتے ہوئے خانہ کعبہ میں جمع ہوں گے۔ خانہ کعبہ میں پہلے چار مصلے تھے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی۔ لیکن ابن سعود مرحوم نے سب مصلے برخواست کر کے صرف ایک ہی مصلیٰ رکھا تھا اور عرصہ سے ایک ہی جماعت ہونے لگی تھی لیکن اب دنیا بھر کی زبانیں بولنے والے شاہ سعود کو مجبور کر کے اپنے...... اپنے لئے الگ مصلے بچھالیں گے۔ اور بیت اللہ اچھا خاصا چڑیا گھر بن جائے گا جہاں طرح طرح کی بولیاں اور قسم قسم کے لہجے سننے میں آئیں گے۔ کیونکہ ایک زبان والے مصلے کے پیچھے دوسری زبان والے نماز پڑھ لیں تو توہین۔ کعبۃ اللہ کے سایہ میں خدا کی اور اس کے کلام کی توہین ہو جائے گی۔ اور اگر یہ لسانی مصلے ایک دوسرے سے الجھے اور الجھ کر لڑ پڑے تو پھر کعبے کے پاس ہی میں ایک ایسا معرکہ خیل برپا ہو جائے گا کہ مسلم دنیا کی ساری باتیں ـــــ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" چاہے کتنی ہی ہم آہنگی کے ساتھ گا گا کر سنائیں غلاف کعبہ دھجیاں ہونے سے بچ نہیں سکے گا۔ اور ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا" تک پہنچتے پہنچتے کعبۃ اللہ کلام اللہ کے احترام میں زمیں بوس ہو جائے گا اور پھر شاید ہمارے حرف [illegible] والے مجید لاہوری جن کا عقیدہ اربعہ چار ستی ہے رمضانی مولوی [illegible] اور نائب جی کی کونسل میں بیٹھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ "بہت بڑا اسٹیک ہو گیا یار۔ بھیل مہاراج کا تو مسلک پورا ہو گیا ہی ہمارا مسلک تو بھی جو باقی رہ گیا تھا ہم اردو میں نماز پڑھنے [illegible] کی بھی بجانے لگا تھا۔ اور ہم [illegible] فل کر شریعت کو حج پڑھنے چلا جائے گا اب [illegible]

فکر و نظر

علامہ اقبالؒ •

اسلام ایک نظامِ اجتماعی

• ـــــــ دین و مذہب کا اصطلاحی فرق

حال ہی میں مولینا مودودی نے ایک بیان میں فرمایا تھا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ زندگی کا ایک نظام اور ایک با ضابطہ اسکیم ہے۔ بات بالکل واضح تھی، کہ مولینا نے " مذہب " اور " دین " کے اصطلاحی مفہوم کو پیش نظر رکھکر یہ فرق واضح کیا تھا۔ " دین " ایک جامع اصطلاح ہے جو " نظام " بلکہ سٹیٹ (STATE) کے مترادف ہے اور " مذہب " اس کے مقابلہ میں محدود ہے جو " طرزِ فکر " (SCHOOL OF THOUGHT) کے مترادف ہے۔ مثلاً ہم فقہ کے مختلف مکاتیب خیال کو فقہی مذاہب کہتے ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک " دین " یعنی " نظام اجتماعی " میں متعدد " مذاہب " یعنی " مکاتیب خیال " ہو سکتے ہیں۔ ان معنوں میں ظاہر ہے اسلام " دین " یعنی " نظام اجتماعی " یا " زندگی کی باضابطہ اسکیم " ہی ہو سکتا ہے۔ کوئی محدود " مذہب " یعنی " مکتب خیال " نہیں ہو سکتا۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے لوگ قلم لیکر دوڑ پڑے کہ مولینا مودودی " اسلام کو مذہب ہی نہیں مانتے " جاہلوں کی زبان سے اس قسم کی نعرہ بازی سن لی جا سکتی ہے لیکن اہل علم جب ایسے اوچھے وار کرنے لگ جاتے ہیں تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ محض دستار فضیلت ہی کے عالم ہیں۔ علم ان کو چھو کر بھی نہیں گیا ہے۔ یا پھر کچھ اور " رموز " ہیں جو اس " لن ترانی " کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ ذیل میں ہم علامہ اقبالؒ کی تقریر کا ایک حصہ پیش کر رہے ہیں، جو اسلام کے اجتماعی نظام ہونے پر دلالت کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ اسلام کن معنوں میں " مذہب " ہے اور کن معنوں میں " دین "۔

(ادارہ)

" میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام، اس کے قانون، ہکے نظام سیاست، اس کے کلچر، اس کی تاریخ اور اس کے لٹریچر کے محتاط مطالعہ ہصرف کیا ہے...... تاریخ مذاہب واضح طور پر بتاتی ہے کہ زمانہ قدیم میں ہب " قومی " تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ایرانیوں کے مذاہب، بعد دہ " نسلی " ہو گیا جیسے یہودیوں کا مذہب، پھر مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ ب ایک انفرادی اور نجی معاملہ ہے...... مگر یہ اسلام اور فقط اسلام بس نے پہلی مرتبہ انسانیت کو یہ پیغام دیا کہ مذہب نہ تو قومی اور نسلی چیز نہ انفرادی اور نجی، بلکہ خالصتہً " انسانی " ہے۔ اور اسکا مقصد یہ ہے کہ ع انسان کی جملہ تفریق فطری اور امتیاز باہمی کے باوجود اس کو متحد اور یا جائے، ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام بجز عقیدہ و ایمان کے اور کسی چیز پہ ونہیں سکتا......

اسلام ایک نظام اجتماعی ہے، ایک قانون ہے معاشرۂ انسانی کا۔ دین قیم ہے اور واحد مذہب ہے کہ جس گروہ انسانی نے بھی اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے حوالے کر دی ہو، وہ اس کی زندگانی حال اور...... زندگانی مستقبال کو قائم و دائم رکھنے کا ذمہ دار ہو جاتا ہے...... اسلام ایک مملکت ہے، اسٹیٹ ہے، وہ اسٹیٹ جو اس سے بھی صدیوں پہلے وجود میں آیا کہ روسو نے اس کا خواب دیکھا۔ اس نظام کے اندر اخلاقی نصب العین کی روح سموئی ہوئی ہے۔ وہ اخلاقی نصب العین جو انسان کو زمین سے اگنے والے پودے کی طرح کی کوئی مخلوق تصور نہیں کرتا جس کی جڑیں کہیں زمین میں نصب ہوں، بلکہ ایک ایسا وجود روحانی تصور کرتا ہے جو اپنے نظام اجتماعی کے ذریعے ہی جانا اور پہچانا جاتا ہے اور پھر یہ وجود روحانی اس نظام کے اندر ایک زندہ اور جاندار حقیقت کی حیثیت سے فرائض و حقوق کا حامل بھی ہے۔ اسلام کوئی کلیسا نہیں ہے، اسی لئے اس کو کسی ٹھکر کی بھی حاجت نہیں، تاریخ انسانی ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہمی تصادم کا، محاربات کا، اور

ہ جنگیوں کا۔ ان حالات میں کیا بنی نوع انسان کے لئے کوئی ایسا آئین و دستور
ن ہے جس کی حیاتِ اجتماعی امن و سکون اور تحفظ و سلامتی پر مبنی ہو؟
ن کا جواب یہ ہے کہ ہاں ممکن ہے بشرطیکہ انسان اپنے اور تمام بنی نوع کے
ار و اعمال میں اجرائے توحید کو اپنا نصب العین بنالے۔

ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت مذہب منزّل من اللہ ہے
ن بحیثیت معاشرہ و نظام اسکا بالکلیہ دار و مدار محمد رسول اللہ صلعم کی شخصیت
ضیت گرامی پر ہے۔ رسالت محمدی کا مقصود آخریں ایک ایسے معاشرے
تخلیق ہے جس کا آئین و دستور اس قانونِ الٰہی کے ماتحت ہو جو رسول اللہ صلعم
خدا تعالیٰ سے ملا ہے۔ بلفظِ دیگر مقصود یہ ہے کہ دنیا کی تمام اقوام و ملل کو
تمام بدعنوانیوں سے پاک صاف کیا جائے جو عصر، مقام، سرزمین، قوم،
ل، علم الحیات اور ملک وغیرہ کے ناموں سے ان میں جاری و ساری ہیں
لام بنیادی طور پر ایک امتِ مذہبی کا نام ہے جس کی چوحدی نہایت ہی
ضح اور متعین ہے ......

(۱) توحید یعنی ایک ذات واجب الوجود پر ایمان، (۲) رسالت یعنی
ام انبیاء و مرسلین پر ایمان، (۳) اختتام نبوت یعنی یہ ایمان کہ محمد رسول اللہ
ری پیغمبر ہیں۔ ان کے بعد پھر کوئی نبی نہیں ہوگا ...... یہ آخری عقیدۂ و ایمان
یہی وہ فیصلہ کن حقیقت ہے جس سے ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان۔۔
رِ فاصل قائم ہوتی ہے۔ اسلام کی سالمیت و استحکام مشتمل ہے انھیں ہم آہنگ
یادی اصولوں پر، جن کے ساتھ پانچ مشہور و معروف "فرائض ایمانی"
بوط ہیں۔ یہ سب ولین لوازم ہیں اسلامی سالمیت و استحکام کے، اور وہ اسی
فہوم و معنی کے ساتھ رسول اکرم صلعم کے زمانے سے برابر چلے آرہے ہیں (تا آنکہ
ل حال میں ان کو درہم برہم کیا جانے لگا) ..... اور یہی ضمانت ہیں، عالم
سلام میں عملی طور پر ایک ہم آہنگ روحانی ماحول پیدا کرنے کے، اور ان ہی سے
مالکِ اسلامیہ کا سیاسی امتزاج مہیا ہو سکتا ہے۔

مذہبی طور پر اسلام کی سالمیت و استحکام میں تزلزل اسی وقت پیدا
وتا ہے جب کوئی مسلمان اسلام کے اساسی عقائد و اعمال میں سے کسی ایک
ے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ اسلام کے لیگل لٹریچر کی بے پایاں قدر و قیمت
عہد جدید کی دنیا میں نہ ابھی مسلمانوں ہی پر بے نقاب ہوئی ہے .... اور نہ
ی غیر مسلموں پر .....

لوگوں کے لئے راستہ کھلا ہوا ہے، وہ اگر چاہیں تو اپنے معاشرتی نظام کے بنیادی اصولوں میں ترمیم کریں، ان کی نئی تعبیریں پیش کریں یا انھیں یکسر مسترد کر دیں۔ لیکن یہ قطعی ضروری ہے کہ کسی نئے تجربے کی آزمائش کا راستہ اختیار کرنے سے پہلے وہ خوب اچھی طرح سوچ لیں کہ کیا کر رہے ہیں؟ ..... اسلام جیسے معاشرے کے قدیم اداروں پر نظر ثانی کرنے کا معاملہ بے حد نازک اور پیچیدہ ہے۔ اور اصلاح پسندوں کی ذمہ داری نہایت ہی مخدوش، اسلام اپنی فطرت کے لحاظ سے "ما ورائے خطّ وحدود" (نان ٹریٹوریل) ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ باہم برسرپیکار و متضاد نسلوں اور قوموں کی تمام تر بوقلمونیوں کو سمیٹ کر وحدتِ انسانی کا ایک آخری تکمیلی نمونہ قائم کر دے اور ایک ایسی امت کے سانچے میں ان کو ڈھال دے جو اپنی خودی کا خصوصی احساس و شعور رکھتی ہو، اس مہم کی تکمیل آسان نہ تھی۔ اس قسم کے معاشرے کی تدریجی نشو و نما میں وہ قواعد و ضوابط بھی جو معاشرتی طور پر ایک گونہ بے ضرر ہوتے ہیں مثلاً کھانے اور پینے کے قواعد، پاکی اور ناپاکی کے اصول، ان کی "تغیر ناپذیری" بھی اپنی جگہ ایک مخصوص قدرِ حیات کی حامل ہوتی ہے۔ معاشرے کا واضح داخلی ماحول بھی انھیں کی بدولت قائم ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے ظاہر و باطن کی وہ ہم رنگی و یکسانی بھی ان ہی سے میسر آتی ہے جو اس قسم کی وضع کردہ سوسائٹی کے اندر ہمہ دم ابھرتی رہنے والی غیر متجانس قوتوں کا توڑ کرتی ہے، لہٰذا ان اداروں پر نکتہ چینی کرنے والوں کیلئے لازم ہے کہ انکو ہاتھ لگانے کا ارادہ کرنے سے پہلے وہ اسلام کے مطلوبہ تجربۂ معاشرتی کی ہیئت آخریں کو سمجھنے کی واضح بصیرت و نگاہ اپنے اندر پیدا کریں۔ ان اداروں پر غور و فکر کرتے وقت نقطۂ نگاہ یہ ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ کہ اس ملک یا اُس ملک کیلئے کوئی اجتماعی موقع و مفاد اس میں ہے کہ نہیں۔ بلکہ پیش نظر صرف وہی مقصد بلند ہونا چاہیئے۔ جو بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان کی حیاتِ ارضی میں تدریجاً روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ زندگی خالصتہً تغیر و تبدل کا نام نہیں ہے ..... کوئی قوم اپنے ماضی کو بالکلیہ مسترد کر کے کبھی جانبر نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کا سارا تشخص و امتیاز اپنے ماضی ہی کی بدولت قائم ہے ......"

(اسپیچیز اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال)

(بشکریہ "مہر نیمروز")

نوٹ: دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا ضرور حوالہ دیجئے۔

زبلیر کوش (کوریا)

کوریا میں اسلامی فکر و نظر کی اشاعت

مکتوب بنام محمد احسان صابر ادغلو نمائندہ "اسلام" (انقرہ)

اسلام علیکم

اگرچہ میں آپ سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں لیکن چونکہ قرآن کی رُو سے سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس لئے میں آپ سے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے خطاب کر رہا ہوں۔

کوریا آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ اس ملک کی دو کروڑ تیس لاکھ کی آبادی میں سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی آبادی ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کا کوئی دین نہیں ہے باقی اسی لاکھ کی آبادی بدھ مت کی پیرو ہے۔ اگرچہ مسیحی کوریائی عوام کی ایک بڑی تعداد کو عیسائی بنا رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے مختلف فرقے ایک دوسرے سے سخت مذہبی اختلاف رکھتے ہیں ...

اس لئے اختلاف نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔ بدھ مت کے پیرو بس نام ہی کے ہیں کیونکہ وہ وہی کچھ جانتے ہیں جو انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملا ہے اس کے علاوہ وہ مذہب کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ جنوبی کوریا میں مجھے حاجی یوسف جنگ کے سوائے کوئی مسلمان نظر نہیں آیا جو چیانگ کائی شیک کے نیشنلسٹ چین کے جنرل یکر ٹری ہیں۔

کوریا کے دو شہریوں کو جو جاپان کے ایک کالج میں تعلیم پا رہے تھے ترکی بریگیڈ کے ذریعے سے اسلام کے متعلق واقفیت حاصل ہوئی اور اس سے بے حد متاثر ہوئے کچھ مزید آگاہی پر انھوں نے اسلام قبول کیا اور کوریا میں اسلام کی اشاعتی تحریک کے لئے اجتماعات وغیرہ منعقد کرنے کی اجازت دی۔

جب ہمارے وزیر اعظم اس پر آمادہ ہو گئے۔ تو میں جنوبی کوریا کے حکومت سیول میں اسلام پر لیکچر دینے اور اجتماعات منعقد کرنے ... یہ لیکچر اور اجتماعات خاطر خواہ پھل لائے۔ چنانچہ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہونے والوں میں سے اکثر نے مجھ سے درخواست کی کہ انہیں مسلمان کیا جائے۔ میں نے اس مقصد کے لئے ایک تقریب منعقد کی جس میں اسّی آدمی مشرف باسلام ہوئے۔

اسلام جس کا نام یہاں کے لوگوں نے پہلی مرتبہ سنا تھا توجہ اور حیرت کا مرکز بن گیا۔ مسیحی مشنری بھی اب ہماری طرح اجتماعات منعقد کرنے لگے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مجھ سے مناظرہ بھی کیا جس میں اللہ کے فضل و کرم سے میں فتحیاب رہا اور ہمارے مشن کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔

اب ہم کوریا کی زبان میں اسلامی کتابیں شائع کرنا چاہتے ہیں لیکن ہماری انجمن کی مالی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ جنگ کی وجہ سے کوریا کے باشندے اقتصادی طور پر زبوں حال ہو چکے ہیں فی الحال ہم چھوٹے چھوٹے کتابچے شائع کر رہے ہیں۔ مگر یہ کافی نہیں ہیں۔

کوریا کے جو لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ ان کے لئے ہمیں اسلامی لٹریچر کی سخت ضرورت ہے کوریا کے حالات اسلام کے لئے بیحد سازگار ہیں کیونکہ یہاں دستور کی رو سے غیر ملکیوں کو اجازت ہے کہ وہ جس مذہب کی چاہیں تبلیغ کر سکتے ہیں۔ اس صورت حال نے ہماری بڑی حوصلہ افزائی کی ہے میں آپ کو یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ ہمارے جن بھائیوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا وہ ہمارے فوجی کیمپ میں آئے۔ انھوں نے بتایا کہ چند دنوں میں کوریا میں یدخلون فی دین اللہ افواجا کا سماں بندھ جائے گا۔

امید ہے کہ ہمیں بہت جلد کوریا ریڈیو سے اسلام کی دعوت نشر کرنے کی اجازت مل جائے گی۔ چونکہ مسلمانوں کی تعداد روز بروز

بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لئے ہم سیول میں ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ جمع ہو کر اللہ کی عبادت کر سکیں۔ اس ہفتہ ترکی بریگیڈ کے کچھ نوجوان زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے ارباب اختیار سے ملاقات کر رہے ہیں۔

مساجد کی تعمیر کے لئے ہم نے پاکستان اور انڈونیشیا کی حکومتوں سے تعاون کی درخواست کی ہے۔

مہربانی فرما کر آپ یہاں کی صورت حال سے اخبارات کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو آگاہ کریں اور ان سے کہیں کہ وہ اخلاقی اور مادی طور پر ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ اگر ہو سکے۔ تو آپ میرا پتہ بھی اخبارات میں شائع کر دیں اور انگریزی میں اسلامی لٹریچر مہیا کرنے کے سلسلے میں ہماری مدد کریں اور ایمان اور توحید سے متعلق لٹریچر کی ہمیں خاص طور پر ضرورت ہے کوریا کے لوگ وحدت الٰہ کے تصور ہی سے آج تک نا آشنا رہے ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے مجھے یقین ہے کہ اگر ان لوگوں کو جنہوں نے آج تک اسلام کا نام نہیں سنا تھا۔ اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے تو یہ بہت بڑی تعداد میں اسلام کی آغوش میں آجائیں گے

میں آپ کی طرف سے حوصلہ افزا خبر سننے کا منتظر رہوں گا

ہمارا سلام برادران اسلام تک پہنچا دیجئے۔

زبیر کوش (کوریا)

۳ نومبر ۱۹۵۷ء

(بشکریہ "دعوت")

انور صدیقی

زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں!

اُٹھو کہ زنجیریں ٹوٹنے کی صدائے پیہم میں سن رہا ہوں
سحر جو ظلمت کی وادیوں میں اسیرِ رنج و محن رہی ہے
سحر وہ جس کی لطیف کرنوں کے رقص پر لگ رہے تھے پہرے
سحر وہ جس کے خرام سے ظلمتوں کے تیور بگڑ رہے تھے
سحر وہ آزاد ہو چکی ہے ——————
وہ کم نگاہی کے تار ٹوٹے
وہ ظلمتِ شب کی سانس اُکھڑی
وہ رنگ و نسل و وطن کے کتنے قفس فضا میں بکھر گئے ہیں
وہ وحدتِ زندگی کے نغمے صبا کے شانوں پہ پر فشاں ہیں
وہ قاہرہ سے جکارتا تک ——————
حیاتِ نو کے نئے تقاضوں کے جل رہے ہیں چراغ کتنے
ہزار ہا قافلے یقیں کی جلائے مشعل گزر رہے ہیں
فرازِ دار و رسن سے ہو کر
ستم کی ہر انجمن سے ہو کر
سکوتِ کوہ و دمن سے ہو کر
ہزار ہا قافلے یقیں کی جلا کے مشعل گزر رہے ہیں!
وہ منزلِ نو کہ جس کا ہر نقش کہکشاں سے حسین تر ہے
امیدِ صد طلعتِ سحر ہے
بہت سی رعنائیوں کا گھر ہے
نگارِ فطرت کی رہگذر ہے
وہ ان کا مقصودِ ذوقِ رم ہے!
خدا پرستی کی شاہراہیں نئے سرے سے چمک اٹھی ہیں
نئے سرے سے سحر کے جلوے فضا کو معمور کر رہے ہیں
سحر وہ جس کی لطیف کرنوں کے رقص پر لگ رہے تھے پہرے
سحر وہ آزاد ہو چکی ہے
اُٹھو کہ زنجیریں ٹوٹنے کی صدائے پیہم میں سن رہا ہوں

میکش اکبرآبادی •

مرے غم کے لئے اس بزم میں فرصت کہاں پیدا
یہاں تو ہو رہی ہے داستاں سے داستاں پیدا

•

یہ مسلک اپنا اپنا ہے یہ فطرت اپنی اپنی ہے
جلاؤ آشیاں تم، ہم کریں گے آشیاں پیدا

•

تو اپنا کارواں لے چل نہ کر غم میرے ذرّوں کا
انھیں ذرّوں سے ہو جائیگا پھر اک کارواں پیدا

•

وہی ہے ایک مستی سی وہاں نظروں میں یاں دل میں
وہی ہے ایک شورش سی وہاں پنہاں یہاں پیدا

•

مری عمریں سمٹ آئی ہیں اُن کے ایک لمحے میں
کبھی مدت میں ہوتی ہے یہ عمرِ جاوداں پیدا

محسن بھوپالی

(زیرِ ترتیب مجموعہ "شکستِ شب" کا ایک ورق)

جو بوالہوس کے تصرف میں لالہ زار آئے
بتاؤ اہلِ چمن کیسے پھر بہار آئے

فریبکار زمانے سے ڈر رہے ہیں ہم
وگرنہ آپ کہیں اور نہ اعتبار آئے

چمن کو مژدۂ فصلِ بہار دے تو دیا
یہ کیا ضرور ہے غنچوں پہ بھی نکھار آئے

کسی کی سحر نگاہی بھی کام آ نہ سکی
جو بے قرار گئے تھے وہ بے قرار آئے

خزاں نصیب تھا جن کے طفیل اپنا چمن
انہی کے حصّے میں گل آئے سبزہ زار آئے

دل و نگاہ ملول و فسردہ ہیں تو رہیں
مگر یہ شرط ہے چہرے پہ بھی نکھار آئے

دیئے ہیں قلب پہ محسن وہ زخم اپنوں نے
کہیں جو غیر سے بھی تو نہ اعتبار آئے

اقبال سیفی •

ترغیب

رفیقِ راہ، ابھی سے یہ ماندگی، یہ تھکن
ابھی سے آبلہ پائی کا ہے تجھے شکوہ
ابھی تو دُور ہے "منزل" بہت ہی دُور اے دوست
ابھی سے ہار دیئے حوصلے، تو کیا ہو گا

قدم قدم پہ "اندھیرے" کی راجدھانی سہی
قدم قدم پہ حوادث کے غار ہیں، تو کیا!
ہر ایک سمت عزائم شکن سہی آفات
قدم قدم پہ مصائب کے خار ہیں تو کیا!

اگرچہ "ظلمتِ شب" ہے محیطِ "راہِ وفا"
ابھی تو دل میں اُمیدوں کے دیپ جلتے ہیں
ابھی تو "آس" کے پھولوں میں "باس" باقی ہے
کچھ اور دُور اسی آسرے پہ چلتے ہیں

کوئی "صدائے جرس" بھی کہیں نہیں، نہ سہی
دلیلِ "راہِ طلب" ہے "صفائے قلب و نظر"
"سکوتِ مرگ" کا عالم سہی ہر ایک طرف
رفیقِ راہ، ابھی تو جواں ہے عزمِ سفر!

ہزار "بادِ مخالف" ہو در پئے آزار
چلو، کہ "مقصدِ ہستی" کو پا کے دم لیں گے
قدم قدم پہ عزائم شکن سہی آفات
بڑھو، کہ دوستو منزل پہ جا کے دم لیں گے

افتخار اعظمی •

جس جگہ بھی گئے، گلبار گئے
ہم لئے زیست کے آثار گئے

آج گلشن سے قفس کی جانب
کتنے مرغانِ گرفتار گئے

دیدیا دل کہ انھیں ہو نہ ملال
جیت کر عشق میں ہم ہار گئے

جب زنداں کی ہوا راس آئی
ہم وفا کیش سرِ دار گئے

بزمِ ساقی میں ہی خلقت کا ہجوم
جتنے تھے طالبِ دیدار گئے

اہلِ دل یوں تو بہت ہیں لیکن
جادۂ عشق پہ دوچار گئے

گوہرِ اشک لئے تیرے حضور
ہم گنہ گار کئی بار گئے

رو لے اے دیدۂ خونبار کہ اب
جو تھے پُرسانِ دلِ زار گئے

اب وطن میں نہیں اقبال[۱] وفصیح[۲]
ہمدم[۳] و مونس و غمخوار گئے

۱ وطن کے ایک نازشاعر علامہ اقبال سہیل مرحوم۔
۲ فصیح الدین قریشی مرحوم۔ ان دونوں شخصیتوں کا وطن اعظم گڑھ تھا۔
۳ یہ میرے عزیز دوست تھے۔

جبریل صدیقی •

پیامِ آدمیت

عرضِ شوق کر چل کر وقت ہے یہ پروانے
اب تو شمع روشن ہے صبح تک خدا جانے

لفظ اور لب و لہجہ مختلف سہی لیکن!
سُن رہا ہوں دنیا سے اپنے ہی کچھ افسانے

یوں تو ہر قدم پر ہیں سرحدیں منازل کی
حوصلہ مسافر کا دیکھتے ہیں دیوانے

یہ خود محبت کا ہم پہ فیض ہے ورنہ!
بار اس امانت کا اور ناتواں شانے

دامنِ بیاباں میں پھر بہار آئے گی
گل نئے کھلائیں گے رنگ و بو کے دیوانے

ہے ترے تصور میں کتنی کیف سامانی
ہر نفس میں ساغر ہیں ہر قدم پہ میخانے

ذرّے جگمگاتے ہیں مہر و ماہ کی صورت
کوچۂ محبت کی خاک تو کوئی چھانے

کوئی آدمیت کا کیا پیام دے جبریل!
آنکھا [illegible]

عشرت قادری بھوپالی •

آنسوؤں میں مگر جب خونِ دل پگھلتا ہے
چاندنی چھلکتی ہے، آفتاب ڈھلتا ہے

بارہا محبت میں جان پر بنی، لیکن!
آج بھی تصوّر سے تیرے دل بہلتا ہے

کاش تم کبھی آؤ، دل میں جھانک کر دیکھو
کتنی آرزوؤں کا اک چراغ جلتا ہے

ذہن پر ابھرتے ہیں نقش عہدِ ماضی کے
دردِ دل مسلسل یوں کروٹیں بدلتا ہے

خون کی لکیریں ہیں گلستاں سے زنداں تک
حادثاتِ رفتہ کا کچھ پتہ تو، چلتا ہے

جانے آج کیا گزری تیری طبعِ نازک پر
کل نہیں کسی صورت، دل بہت مچلتا ہے

زندگی سنورتی ہے جدّ و جہد سے عشرتؔ
بے عمل ہیں جو اُن پر دارا جل کا چلتا ہے

اعجاز خورشید کاشمیری •

حسرتِ پرواز

ادائے حسنِ تصور کرشمہ ساز ہوتی ہے
زبان خاموش رہتی ہے نظر آواز ہوتی ہے

خلوصِ دردِ اُلفت رفتہ رفتہ اُٹھتا جاتا ہے
محبّت اب جسے کہتے ہیں دنیا ساز ہوتی ہے

کبھی دھوکا سا ہو جاتا ہے مجھکو دل کی دھڑکن پہ
تیری آواز سے ملتی ہوئی آواز ہوتی ہے

کبھی بھولے سے اے صیاد یہ بھی تو نے سوچا ہے
قفس کی قید خود ہی حسرتِ پرواز ہوتی ہے

وہاں تک دیکھ لیتے ہیں تماشہ تیرے جلووں کا
جہاں تک بھی نظر کی قوّتِ پرواز ہوتی ہے

ادھر دیکھو نگاہیں سب بتا دیں گی تمھیں خود ہی
محبت کی نظر اعجاز ہی اعجاز ہوتی ہے

عزیز حمیدی

انتظامِ رسن و دار سے بھی کچھ نہ ہوا
لوگ کہتے ہیں کہ سرکار سے بھی کچھ نہ ہوا

میری پرواز نے تو سب توڑ دیئے بندِ گراں
باغباں! آہنی دیوار سے بھی کچھ نہ ہوا

دیکھ لو، بامِ افق پہ ہے وہ ضو ریز کرن
ظلمتِ شب کے پرستار سے بھی کچھ نہ ہوا

آبلہ پاؤں کا جو پھوٹا، بنا نقشِ حیات
راہ کی منزلِ دشوار سے بھی کچھ نہ ہوا

تیرے مقدم کو بڑھی آتی ہے خود ہی منزل
سازشِ قافلہ سالار سے بھی کچھ نہ ہوا

تشنہ لب! جرأتِ بیباک کے ہاتھوں میں ہے جام
پیرِ میخانہ کے انکار سے بھی کچھ نہ ہوا

بیلیِ باغ پہ انگشت نمائی کے سوا
آج تک اہلِ ہوس! خار سے بھی کچھ نہ ہوا

ہم جہاں بیٹھے، ملی صدر نشینوں میں جگہ
فتنہ سامانیِ اغیار سے بھی کچھ نہ ہوا

اٹھو! ورنہ یہی تاریخ پکارے گی عزیزؔ
منزلِ حق کے طلبگار سے بھی کچھ نہ ہوا

(راماچی گوٹھ کے ایک مشاعرہ میں پیش کی گئی)

فیروز نظر

"راولپنڈی"

یہ دل آویز تبسم، یہ اداؤں کا ہجوم
دل دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے اے دوست
یہ فضاؤں میں تعطر، یہ ہواؤں میں سُرور
سوچتا ہوں یہ شہر کتنا حسیں ہے اے دوست

ہر قدم پر یہ نگاہوں کا تصادم اے دوست
جیسے میخانے میں ٹکرائے کوئی جام سے ج...
کتنے مسرور نظر آتے ہیں انسان یہاں
کتنے پُرکیف ہیں اے دوست یہاں صبح و ش...

محوِ حیرت ہوں کہیں خواب کا عالم تو نہیں
ہر قدم پر مجھے جنت کا گماں ہوتا ہے
کتنے دلچسپ ہیں اس شہر کے بسنے والے
غم بھی دیتے ہیں تو راحت کا گماں ہوتا ہے

سوچتا ہوں یہاں سب کچھ ہی سہی لیکن اے دوست
کوئی ہمدم، کوئی غمخوار یہاں ہے کہ نہیں
یہاں شیریں بھی ہے، فرہاد بھی، پرویز بھی ہے
قدرِ فن، عزتِ فنکار یہاں ہے کہ نہیں

جانے کیوں مجھ کو یہ محسوس یہاں ہوتا ہے
اجنبی راہیں مجھے گھور رہی ہیں ایسے!
یاں پہ بھی مل نہ سکے گی مجھے تسکین اے دوست
یہ شہر بھی مجھے راس آ نہ سکے گا جیسے

یادِ رفتگاں •

تین شاعر

ایک درویش، ایک بادشاہ، ایک لیڈر

امیر خسرو
بہادر شاہ ظفر
حسرت موہانی

"مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں"

مرتبہ: محمود فاروقی

• من قبلہ راست کردم بر سمتِ کجکلاہے!

دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ پر ۱۷ سے ۲۱ مئی تک برصغیر پاک و ہند کے مشہور صوفی شاعر، فلسفی موسیقار اور اپنے زمانے کے عظیم فنکار حضرت امیر خسرو کا ۶۵۱ واں عرس منایا گیا اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر ہر شام ۸ بجے کے بعد مشاعرے اور قوالی کی محفلوں کا اہتمام رہا۔

امیر خسروؒ فارسی کے ان باکمال شاعروں میں سے ہیں جنہیں ایرانیوں نے بھی مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار کیا ہے۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں صوفی بھی تھے اور خواجہ نظام الدین علیہ الرحمۃ کے خاص مریدوں میں شامل تھے نسل کے لحاظ سے آپ چلین قبیلے کے ترک تھے لیکن ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے یہیں پرورش پائی اور عمر یہاں گزار دی۔ آپ کی ولادت موضع پٹیالی ضلع ایٹہ میں ۶۵۲ھ میں ہوئی انھوں نے تین خاندانوں کی عروج کا زمانہ دیکھا اور محمد تغلق کے عہد حکومت میں وفات پائی۔ حضرت امیر خسروؒ کی شہرت کا آغاز غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت سے ہوتا ہے۔ وہ سلطان مذکور کے بڑے بیٹے شہزادہ محمد کے رفیقوں میں شامل تھے۔ یہ نوجوان شہزادہ جو خان شہید کے لقب سے مشہور ہوا مغلوں سے شکست کھا کے مارا گیا۔ اس ہنگامے میں خسروؒ پر بڑی آفت پڑی۔ مغل انہیں قید کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ آخر بڑی مشکل سے انھوں نے رہائی پائی۔ بعد کے سلاطین کے زمانہ میں بھی وہ مختلف خدمات پر مامور رہے۔ خواجہ حسن دہلوی جو فارسی زبان کے غزل گو شعراء میں بڑا اونچا درجہ رکھتے تھے انکے خاص دوستوں میں سے تھے۔ غزل میں خسروؒ کو بہت اونچا مقام حاصل ہے شیخ سعدیؒ کے بعد جن شعراء نے غزل گوئی میں نام پیدا کیا ان میں خسروؒ بڑی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزلوں کے پانچ دیوان یادگار چھوڑے جن میں اہل ذوق کو تڑپا دینے والے تیر و نشتر موجود ہیں عام طور پر جو شعرا اچھی غزل کہتے ہیں وہ قصیدہ اور مثنوی میں ...... چمک نہیں پاتے ..... مثلاً نظیری کے قصیدے اچھے نہیں ہیں۔ عرفی

کی مثنوی بے نمک ہے لیکن خسروؒ تنہا ایسے شاعر ہیں جو متنبی الحیثیت کے مالک ہیں خمسہ نظامی کے جواب میں انھوں نے جو مثنویاں لکھی ہیں ان کے متعلق نقادوں کی رائے یہ ہے کہ پنج گنج نظامی کا اس سے بہتر جواب آج تک کسی سے نہیں بن پڑا۔ ان کا ایک قصیدہ جو بحر الابرار کے نام سے مشہور ہے۔ خاقانی کے قصیدوں سے لگا کھاتا ہے غزلوں مثنویوں میں کہیں کہیں وہ بڑی بے تکلفی سے ہندی کے ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں اور بعض مقامات پر تو ہندی کے الفاظ بھی لے آتے ہیں مثلاً ؎

لے دہلی دلے تباں سادہ

پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

انھوں نے ہندی میں بھی بہت سے دوہے کہے ہیں۔ گیت لکھے ہیں کہہ مکرنیاں، دو سخنے اور پہیلیاں وغیرہ بھی انہی کے افادات میں سے ہیں اور یہ چیزیں آجتک زبان زد خاص و عام ہیں۔ اور ان کے گیت اب بھی بیاہ شادی کے موقع پر گائے جاتے ہیں۔ امیر خسروؒ کی شخصیت بھی بڑی دلچسپ اور دلفریب تھی۔ عشقیہ اور صوفیانہ شاعری۔ بچوں کی پہیلیاں، موسیقی نہ نگاری غرضیکہ ان کا ذہن ہر طرف رواں تھا۔ اور انھوں نے فن کے جس رخ پر بھی ہاتھ ڈالا اپنا اثر اور اپنی انفرادیت دکھا کر رہے۔ وہ بڑی بڑی رنگا رنگ شخصیت کے مالک تھے۔ صوفیانہ حالات جذب مستی اور کیف کے معاملے میں بھی انھوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ موسیقی کے سلسلے میں انھوں نے پرانے راگوں میں نئے راگوں کا اضافہ کیا اور اس طرح اس میدان میں بھی اجتہاد سے کام لیا۔ نثر میں اعجاز خسروی ان کی مشہور کتاب ہے جس میں انھوں نے صنائع و بدائع کا طلسم باندھا ہے۔ مگر نثر کی حد تک یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ ان کے تمام کمالات فن کے باوجود ان کی نثر اس بلندی تک نہیں پہنچی جو ان کی نظم کے حصہ میں آئی ہے۔ موسیقی کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ ایران و ترکستان کی موسیقی پر عبور ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں سنگیت و دیا پر بھی عبور حاصل تھا اور ترکی النسل ہونے کے باوجود ہندی کی موسیقی کے اسرار و رموز سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ ترانہ قول اور قلبانہ ان کی ہی ایجادات میں سے ہیں۔ بعض ہندوستانی راگنیوں میں ایرانی "مقامات" کے پیوند لگا کے انھوں نے کچھ نئی راگنیاں بھی ایجاد کی ہیں چنانچہ مشہور راگنی .... کلیان انہی کی مخلوقات فکر میں سے ہے۔ مشہور ہے کہ ستار پر تیسرا تارہ بھی انھوں نے ہی چڑھایا۔

امیر خسروؒ بڑے باکمال اہل قلم اور پرگو شاعر تھے آپ کی ٩٩ کے قریب مختلف تصانیف ہیں اور اشعار کی تعداد پانچ لاکھ سے بھی..... زیادہ بتائی جاتی ہے۔ حضرت امیر خسروؒ نے اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی عقیدتمندی میں سلوک کی بہت سی منزلیں بھی طے کیں اور ان کی وفات کے بعد ٦ ماہ زندہ رہے اور ٧٢ سال کی عمر میں اپنے مرشد سے جا ملے اور انہی کی پائنتی میں دفن ہوئے آپ نے ایک دختر اور ٣ صاحبزادے چھوڑے غیاث الدین بلبن سے محمد شاہ تغلق کے عہد تک گیارہ سلطنتوں کو بنتے اور مٹتے ہوئے دیکھا۔ آپ کا مزار دہلی میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

حضرت امیر خسرو بڑی رنگا رنگ باغ و بہار طبیعت رکھتے تھے لیکن ان کی جو ادا قابل قدر اور لائق مثال ہے وہ یہ کہ انھوں نے دنیاداری کی زندگی پر عشق الٰہی کی سرمستی کو ترجیح دی۔ یہی وہ سرمستی اور کیف ہے جو تحریکی شعور میں ڈھل جائے تو حق ناشناس دنیا کے لئے ناقابل تسخیر طاقت بن جاتا ہے اور مجرد رہے تو نغمہ و رنگ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ؎

خبرم رسیدہ امشب کہ نگار خواہی آمد
سر من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

کششے کہ عشق دارد نگذاردت بدینساں
بجنازہ گر نہ آئی بہ مزار خواہی آمد

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

بیک آمدن ربودی دل و دین و صبر خسروؔ
چہ شود اگر بدینساں دو سہ بار خواہی آمد

● کوئے محبوب راشٹ بہائے گیوں میں تو بکسیم کا مزا رہو رہے!

٧ مئی ١٩٥٧ء جو کو پہلی تحریک آزادی ١٨٥٧ء کی صد سالہ یادگار ملک کے طول و عرض میں منائی گئی۔ ١٨٥٧ء کے تذکرے کے ساتھ بہادر

شاہ ظفر کا تذکرہ بھی وردِ زبان رہا۔ بہادر شاہ ظفر آٹھ سو سالہ مغل سلطنت کے آخری تاجدار تھے ۱۸ ستمبر ۱۸۳۷ء میں ۶۰ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے اور ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد قید کیا۔ ۸۵ سال کی عمر میں ۱۸۵۸ء میں رنگون پہنچے اور چار سال قید و بند میں انتہائی کس مپرسی کے عالم میں زندگی بسر کی اور آخر کار ۲۴ جمادی الاول ۱۲۷۹ھ مطابق ۷ نومبر ۱۸۶۲ء بروز جمعہ عصر کے وقت نواسی سال کی عمر میں فالج کے عارضہ میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور بابر کی جلائی ہوئی شمع ایک آخری جھونکا لیکر ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی۔ ـــــ ظفر اگر ایک بادشاہ ہی ہوتے تو ان کا تذکرہ تاریخ کے صفحات کی زینت بنا رہتا لیکن ان کا چرچا ان کے بادشاہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے برصغیر ہند کو غیر ملکی اقتدار سے بچانے کے لئے اس جدوجہد میں حصہ لیا تھا جو ہندوستان کے عوام نے انگریزوں کے خلاف شروع کی تھی اور ان کی یاد اس حیثیت سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ ایک صاحب کمال شاعر بھی تھے جنہوں نے غزل کی طرزِ ادا میں ایک مخصوص روایت پیدا کی۔ ظفر کے کلام میں جو خلوص، سوز و گداز، ترجمانی، بے بسی، محرومی اور داخلیت موجود ہے۔ وہ خالص ان کی اپنی ہے اور اس کے اشعار میں ان کی شخصیت کی جھلک صاف نمایاں ہے۔ ظفر کی شاعری اصل میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ہندوستان اور خود شاعر کی زندگی کی ترجمان ہے۔ اس دور میں ہندوستان کی بے بسی اور انتشار اور انگریزوں کے مظالم کے رد عمل کی گونج اس شاعری میں بہت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ تصوف کی ہلکی چاشنی اور مذہب کے رنگ نے ظفر کی شاعری کے تاثر میں اضافہ کیا ہے اس کی بعض غزلیں اس وقت کے حالات اور بادشاہ کی دل شکستگی کو پورے طور سے نمایاں کرتی ہیں۔ ظفر کی پوری شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے زیادہ تر اپنے تجربات اور واردات قلب ہی کو پیش کیا ہے اس لئے اس کی شاعری اس کی زندگی کا آئینہ ہے۔ یہی خصوصیت اسے اپنے معاصرین سے ممیز کرتی ہے اور یہی حقیقت پسندی اس نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دیتی ہے کہ ظفر کوئی عیاش، لاپرواہ اور احساس سے خالی حکمران نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک با اخلاق، مذہب پسند، حساس اور دل رکھنے والا بادشاہ تھا اور یہ بات اس کے پورے کلام میں جھلکتی ہے اس نے جو پند و نصائح اپنے اشعار میں پیش کئے ہیں اور جس للٰہیت کا ثبوت دیا ہے وہ اس سے مختص ہے وہ ہندوستان کا بادشاہ بھی تھا لیکن یہ حقیقت اس کی شاعرانہ صلاحیتوں میں کمی کی دلیل نہیں بن سکتی یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ وہ واحد شاعر نہیں ہے جس نے فرمانروائی کے ساتھ ساتھ اقلیم سخن کی بادشاہی بھی کی ہے۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر گولکنڈہ (دکن) کا سلطان قلی قطب شاہ تھا۔ خاندان مغلیہ کے تو اکثر افراد علم و ادب کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ خود بھی تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر آخر اسی خاندان کا فرد تھا۔

ظفر براہ راست ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ دار و گیر کی زد میں تھے جو کچھ ان کا حاصل تھا اس کے چھننے کا غم ان سے بڑھ کر اور کس کو ہو سکتا تھا لیکن ظفر کے نقطۂ نگاہ کی وسعت دیکھئے کہ وہ نہ تو اپنی عشرتِ رفتہ کے ماتم گسار ہیں اور نہ ان کو عظمت پارینہ کا اتنا ملال ہے بلکہ ایک دردمند راعی کی طرح ان کا دل بڑی حد تک خود کو بھول چکا ہے اور رعایا ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے درد میں بے چین و مضطرب نظر آتے ہیں۔ کس دل سوزی اور غم گساری کے ساتھ انہوں نے اپنے غم میں ایک عالم کے غم کو سمو دیا ہے

کوئی بے کس جو ہوا پٹ نہیں اپنے دل کو قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا سینہ غم سے فگار ہے
وہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہوں کیسی ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے
یہ ستم کسی نے بھی ہے سنا دیا پھانسی لاکھوں کو بے گناہ
وہ کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی ان کے دل میں غبار ہے
تجھے خوف حشر ہے کیا ظفر تو خدا کے فضل پہ رکھ نظر
تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہی تیرا حامی کار ہے

ظفر کے نقطۂ نگاہ کی یہ وسعت اور اس کے اظہار بیان کی یہ ندرت اس کے کلام کو مقصدی رنگ میں رنگ دیتی ہے اور وہ حرف و صوت سے کھیلنے والا بازیگر نہیں بلکہ ایک حساس اور دردمند فنکار نظر آتا ہے جس کے فن میں اس کا اپنا درد تمام انسانوں کا مشترکہ درد بن جاتا ہے اور اس کے لئے ہر دل میں ہمدردی و غم گساری کے جذبات

پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس کا بجا طور پر مستحق بھی ہے۔ یقیناً وہ پست ہمت اور بے تدبیر بادشاہ تھا۔ وہ ہمایوں کے مقبرہ میں ہمایوں کے نقش قدم پر چلنے کی جرأت نہیں کر سکا اور حالات کے سامنے بے بسی سے اپنا سر جھکا لیا لیکن وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کا غدار نہیں تھا اس نے شکست تسلیم کر لی لیکن ملت فروشی نہیں کی ۔

● ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی !

۱۳ مئی ۷۵ء کو پاکستان و بھارت کے بڑے بڑے شہروں میں مولانا حسرت موہانی کی چھبیسویں برسی منائی گئی۔ حسرت موہانی ایک تنہا فرد نہیں تھے بلکہ وہ بذات خود ایک انجمن تھے وہ ایک ایسا سنگم تھے جہاں سیاست و ادب کے دھارے مل کر بہتے تھے۔ غالب کے بعد حسرت پہلے شاعر تھے جنہوں نے غزل کے گرتے ہوئے معیار کو اونچا کیا اور غزل کے موضوعات میں ندرت و اضافہ کیا۔ ہماری ملی تاریخ میں حسرت جیسے متقی، مخلص، ایثار پسند غیور سیاست داں بہت ہی کم ملتے ہیں حسرت نے اس بازی میں سب کچھ ہار دیا اور کبھی جیتنے کی کوشش نہیں کی وہ دیتے ہی رہے لیا کچھ نہیں، ان کے کردار کا یہ پہلو اپنے ہمعصروں میں ان کو بہت زیادہ نمایاں اور ممتاز کر دیتا ہے۔

حسرت ایک متحرک اور سیماب پا انسان تھے ان کے پاس سکون و قیام کا کوئی سوال ہی نہیں تھا بغل میں اپنا مخصوص جھولا دبائے وہ ہمیشہ چلتے پھرتے ہی نظر آتے تھے۔ اس حرکت و بے قراری نے افکار و نظریات کی دنیا میں بھی ان کو ایک ساز بنائے رکھا تھا۔ خلافت سے لے کر تحریک پاکستان تک ان کا سیاسی قبلہ ایک نہیں رہا پھر وہ جس جماعت کے ساتھ رہے وہ جماعت بھی ان کے اس اضطراب اور سیاسی مزاج کی وجہ سے بڑی آزمائش میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ یہی گریز پا کیفیت ادب کے میدان میں بھی نظر آتی ہے۔ غزل کی وضعداری چھوڑ چھاڑ ایک دم سے آزاد بیانی کے چوک میں جا کھڑے ہوئے اور آزادی کا مجاہد "غلبہ سوویت" کے نعروں پر اتر آیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حسرت پر ترقی پسندی کا نیا نیا جنون سوار ہوا تھا اسی زمانہ میں حیدرآباد دکن آئے ہوئے تھے مدرسہ انوار العلوم میں ماہر القادری کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا حسرت اور ماہر کو سننے کے لئے کافی مجمع لگ گیا تھا۔ حسرت کا جب نمبر آیا تو انھوں نے ایک آزاد نظم پڑھنے کا اعلان کیا لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی اور سارے مجمع میں سرگوشیاں ہونے لگیں اس کے بعد حسرت نے اس نظم کا عنوان سنایا " انسس ناجائز " عنوان کو سنتے ہی مجمع بے قابو ہو گیا۔ ممکن ہے بہت سوں کو سننے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہو غرض ہر طرف سے لوگ چیخ چیخ کر پوچھنے لگے —— کس سے؟ کس سے ؟—— ماہر القادری نے مختصر سی تقریر کی اور مجمع کو بڑی مشکل سے سننے پر آمادہ کیا۔ لوگوں کو نظم میں بس کوک شاستر کا لطف آ رہا تھا خیال ہی کچھ ایسا عامیانہ اور سوقیانہ سا تھا کہ —— "کسی اور سے نہیں بلکہ اپنی بہن خالہ اور پھوپھی سے بھی عشق ہو تا کیا بلکہ لڑایا جا سکتا ہے" جیسے جیسے وہ مصرع پڑھتے لوگ ان کو بری طرح ... ہراساں کرتے خدا خدا کر کے یہ نظم ختم ہوئی اور ماہر القادری اپنا کلام سنانے اٹھے انھوں نے پہلے ایک قطعہ پڑھا جو مجھے یاد نہیں رہا ہے لیکن اس کا مفہوم بخوبی یاد ہے " یہ بوالہوس عشق کرنا کیا جانیں " اس مفہوم کو ادا کرتے وقت ماہر کا ہاتھ سیدھی طرف جھک جاتا تھا۔ اور ویسے ہی لوگوں کی نظر حسرت پر پڑتی تھی کیونکہ وہ ماہر القادری کے سیدھے ہی جانب بیٹھے ہوئے تھے حسرت کو میں نے بس آخری مرتبہ اس مشاعرہ میں دیکھا اور فطری طور پر حسرت کے متعلق میری رائے بڑی مکدر ہو گئی۔ لیکن اس حسرت کا دل میں ہمیشہ احترام قائم رہا جس نے چکی کی مشقت میں بھی مشق سخن جاری رکھی تھی لیکن توقع نہیں تھی ان کی طبیعت ایسا "طرفہ تماشا" بھی دکھائے گی ۔

مولانا حسرت موہانی کا نام سید فضل الحسن تھا۔ ۱۸۷۵ء میں موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید اظہر حسن موہانی تھا۔ فتحپور (ہسوہ) سے ۱۸۹۹ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ شعر و شاعری کی ابتدا ۱۸۹۲ء سے ہو چکی تھی۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد حسرت علی گڑھ گئے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے عربی اور ریاضی کے اختیاری مضامین کے ساتھ بی اے پاس کیا۔ بی اے پاس کرتے

سے پہلے ہی وہ عملی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے اور تین مرتبہ آزادی کا نعرہ بلند کرنے کی پاداش میں ایم۔ اے۔ او کالج سے نکالے گئے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے اپنا مشہور و معروف رسالہ "اردوئے معلّٰی" علی گڑھ سے جاری کیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے شعرائے اردو کے انتخابات بھی شائع کئے۔ حسرت موہانی کی ساری زندگی انگریزی اقتدار کے خلاف جہاد کرنے اور اردو ادب کی خدمت کرتے گزری ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کانگریس کے ممتاز ترین رہبروں میں سے تھے لیکن اس کی مسلم دشمنی کے پیشِ نظر وہ "مسلم لیگ" میں شامل ہو گئے اس سے پہلے وہ چھ سات بار آزادیِ وطن کی خاطر جیل گئے۔ اس زمانہ میں جیل کی زندگی کے بارے میں حسرت نے ایک کتاب "مشاہداتِ زنداں" بھی لکھی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں حسرت نے یورپ کا سفر کیا اور برطانوی پارلیمنٹ کے ایوانِ عام کے اراکین کے سامنے تین گھنٹے تک "مسلمانانِ ہند کے سیاسی مطالبات" اور "دو قومی نظریہ" پر تقریر کی، ان کی شاعری اگر ایک طرف تغزل کے بلند ترین معیار کی آئینہ دار ہے تو دوسری طرف ان کے سیاسی خیالات کا اندازہ بھی ان کے اشعار سے ہوتا ہے۔

حسرت کے اشعار حسرت کی یاد دلاتے رہیں گے جب تک ان کا کلام باقی ہے حسرت بھی زندہ رہیں گے ؎

نہیں آتی تو ان کی یاد برسوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

شب وہی شب ہے دن وہی دن ہے
جو تری یاد میں گزر جائے

شعر دراصل ہے وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائے

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

سب کا مطلب اسلام ہو گئے ہم ٭ ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

جب ان سے ادب نے کچھ منہ سے مانگا
تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم

تونے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
ورنہ پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

حق سے بعد از مصلحتِ وقت پہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر

مولانا حسرت موہانی ۱۹۵۰ء میں پہلی اور آخری مرتبہ پاکستان تشریف لائے تھے۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو آپ نے لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ اور اپنے مرشد مولانا عبدالوہاب صاحب فرنگی محلی کے پائینتی دفن کئے گئے

ابن فرید صدیقی •

پھر فضا مسکرانے لگی

تاریک اور پُرسکون رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بوندا باندی کی وجہ سے باہر کیچڑ ہو گیا تھا۔ اور بوٹوں کے ساتھ اندر آجانے سے فرش پر پھسلن ہو گئی تھی۔ ہال میں چاروں طرف سگرٹوں کا نیلا نیلا دھواں پھیل رہا تھا۔ وہ ہال، وہ رات اور وہ کیچڑ تمام عمر اسے یاد رہے گا۔ خواب میں بھی وہ انھیں نہیں بھول سکتا۔ اور اس لمحہ بھی جب کہ اس کی نگاہیں ونڈ اسکرین سے گزرتی ہوئی۔ دور بادلوں کو چیرتی ہوئی گذر رہی تھیں اور اس کے ذہن میں خیالات کی فراوانی اس کو اپنے گرد و پیش سے بے نیاز کئے دے رہی تھی۔ گذری ہوئی رات کی یاد اس کے ذہن میں تازہ تھی۔ دریچوں کے چھجوں پر ہلکی ہلکی بوندوں کی وجہ سے آہنگ سے محروم آواز مسلسل پیدا ہو رہی تھی پردے نم ہوا کے جھونکوں سے ہل رہے تھے اور وہ ہوا باز افسروں کی کنٹین میں خلاف معمول ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسکواش کا گلاس اُس کے سامنے بھرا رکھا تھا جس میں گرتی ہوئی عمارت کے شہتیر کی طرح سپر (S) ڈوبا ہوا تھا اور سفید بے داغ میز پوش عجب المیہ جذبہ کو اکسا رہا تھا۔ افسروں کی کثرت کی وجہ سے پاس کی کرسیاں دوسری میزوں کے گرد پہنچ چکی تھیں اور وہ اس تنہائی سے قدرے سکون محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ پورے ہال میں ایک بھنبھناہٹ سی گونج رہی تھی۔ جوتوں کی چرچراہٹ اور وردیوں کی سرسراہٹ اور دبی آوازوں میں سرگوشیاں ایک ایسے اضطراب کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ جو دوسری صبح ہونے والے کسی غیر معمولی واقعہ سے متعلق تھیں اور جس کے نتیجہ میں وہ اس وقت جہازوں کے بازوؤں میں بم نصب کئے ہوئے ایک ایسے مقام کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا جس کا تصور ہی کسے بے چین کئے دے رہا تھا۔

وہ رات بڑی ہی افسردہ سی تھی لیکن ہوا باز اپنے اڑ
کو ان دکھوں کو قہقہوں میں گم کر دینا چاہتے تھے، ان کی زن
تھی، زندگی کا کیا اعتبار؟ صرف ایک رات اور وہی ایک را
اس صبح سے پہلے گذر گئی ان کے لئے یقینی تھی صرف اسی را
جس قدر اپنے آپ کو شادکام رکھنا چاہتے رکھ سکتے تھے۔ و
اُسی ایک رات موت کے تاریک بازوؤں کو اپنے سروں پر
پھڑاتے ہوئے محسوس کرنے کے باوجود وہ اپنی خواہشوں کی
کا ساماں کر سکتے تھے، کل آنے والے دن جب وہ بمباری
لئے روانہ ہوں گے۔ وزنی بم ان کے جہازوں پہروں میں ما
موتوں کا پیغام بنے ہوئے لٹک رہے ہوں گے۔ تو کیا معلوم
میں سے کون ان بموں کی تباہ کاری کے ساتھ خود بھی تباہ ہ
آنے والا یہی خطرہ ان کے دلوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔
مسرتیں، تمام قہقہے، تمام خوش گپیاں، تمام بے اعتنائیاں
اسی ایک خدشہ کی وجہ سے بیکار سی پھیکی سی، دکھاوا محض
ہو رہی تھیں۔ صرف یہی ایک خدشہ جو ان کی اپنی ذات سے تع
رکھتا ان کی حرماں نصیبی کی وجہ تھا۔

ادھیڑ عمر اسکواڈرن لیڈر گلوسٹر اپنی گھنی بھوری، مونچ
کو، گدلیوں سے رخساروں پر چپکاتے ہوئے مضطرب سا ا
ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا، بیرے اس کے پاس سے کسی قدر اد
ساتھ گذر جاتے تھے اور وہ اس وقت تک معلوم کتنے نوج
آفسروں کے ساتھ بیٹھ چکا تھا ان کے ساتھ کتنے جلسوں میں
ہو چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن اس
آنکھوں میں جو یاس سا گھلا ہوا تھا وہ نہ معلوم کس خدشہ
غمازی کر رہا تھا؟ اسکواڈرن لیڈر گلوسٹر! ——— بادو

ٹکڑے ہوائی جہاز کے نیچے سے تیرتے ہوئے گذر رہے تھے، گہرا نیلا اور شفاف آسمان پر چمک رہا تھا۔ انجن کی تیز آواز کانوں میں گونج رہی تھی، ــــــ وہ مسکرایا۔ اس عمر میں بھی ڈنشہ ہی ہے؟ گلوسٹر کنٹین میں اس وقت بھی جذبات کی آسودگی کے لئے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ہر نوجوان افسر سے وہ بڑی جذباتی گفتگو کر رہا تھا، جیسے وہ اس وقت اپنے سارے ارمان نکال لینا چاہتا تھا۔ وہ کنٹین میں داخل ہونے والی دلیفز (waaf) کو بڑی حریص نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"پیارے دوستو، آؤ آج کی رات ہم جی بھر کر عیش منالیں کیا معلوم کل ہم میں سے کس کو آنے والی رات نصیب نہ ہو!" اسکوڈرن لیڈر گلوسٹر نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا، اور تمام افسر مسکرا دئے ان کی مسکراہٹ میں کھوکھلاپن تھا۔ ان کی مسرت ایک ٹریجڈی تھی، ان کے سامنے دنیا اپنے بازو پھیلائے کھڑی تھی۔ لیکن ان کی زندگی کی مہلت بہت مختصر تھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتے تھے، کچھ ایسا کچھ کہ ان کے دل میں کوئی حسرت نہ رہ جائے، لیکن جیسے انکے اندر تشنگی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی اور ان کی روحیں محروم بچوں کی طرح رو رہی تھیں، جس کا اظہار ان کے چہروں پر پھیلی ہوئی مردنی سے ہو رہا تھا جس کو بڑی کوشش سے دبانا چاہتے تھے۔ لیکن وہ ماند نہیں پڑ رہی تھی۔

رات پر سکون تھی لیکن وہ ایکدوسرے سے طویل گفتگو میں لگ رہے تھے، اور دلیفز کے ساتھ زیادہ بے تکلفی برت رہے تھے قہقہوں سے ہال گونج جایا کرتا تھا۔ لیکن باہر ہلکی ہلکی بارش جیسے بین کر رہی تھی نم آلود پردے جب ہوا کے جھونکوں سے ہلتے تھے تو دل کو تھکاوٹ کا احساس ہونے لگتا تھا۔ مگر وہ سب یہ سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ آج زندگی سے نہیں دنیا سے بہت قریب ہونا چاہتے تھے۔ دنیا، دنیا، دنیا ــــــ دور دور سے یہی آوازان کو اپنے کانوں تک آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

پائلٹ افسر نیٹو گھبرایا ہوا سا بار بار بیرے کو بلا رہا تھا اور اس کے ہاتھوں کا اضطراب بالکل نمایاں نظر آرہا تھا۔ نیٹو کے تصور سے ہی جیسے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی اس نے تھراٹل کنٹرول کو ذرا اور آگے کر دیا، بوسٹ کے ڈائل پر سوئی کچھ اور آگے گھوم گئی۔ انجن کے ارتعاش میں تیز رفتاری نے دباؤ سا پیدا کر دیا۔ ونڈ اسکرین سے دور پھیلے ہوئے زمین کے غیر واضح ٹکڑے تیزی کے ساتھ دوسری طرف سرکنے لگے اور وہ پائلٹ افسر نیٹو کے تصور میں گم ہو گیا۔ بے چارہ اب پھر کسی ہوائی حادثہ سے دو چار ہو گا اور افسر کمانڈنگ اظہار ہمدردی کرنے کے بجائے پھر سے جھڑکیاں سنائے گا، اور وہ منہ لٹکائے ہوئے کنٹین کے کسی گوشہ میں میز پر سر ڈال کر بیٹھ جائے گا۔ بیرا اس کے سامنے مشروبات اور دوسری اشیا رکھ دیگا۔ لیکن اس کا دل خوف سے اس قدر دھڑک رہا ہو گا وہ اسی طرح منہ چھپائے پڑا رہے گا۔ وہ آج تک اپنی کسی پرواز میں کامیاب نہیں ہوا، زندگی میں کسی پرواز میں نہیں! ــــــ زندگی کی کسی پرواز میں نہیں۔ وہ مکمل ناکامی تھا۔ جو اپنے احساس کمتری کے ہاتھوں ہمیشہ مات کھاتا رہا اور دوسرے اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ وہ دوسروں کے لئے تفریح کا سامان بنتا رہا۔ مگر اسکوڈرن لیڈر گلوسٹر اس وقت اس کو بھی زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا۔

فلائٹ لفٹننٹ اور فلائنگ افسر کی ایک ٹولی جو اپنے حلقے میں تین دلیفز کو لئے ہوئے تھی ہال کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی بڑے عریاں مذاق کر رہی تھی، ان کے قہقہے بار بار ہال میں گونج رہے تھے اور گلوسٹر اپنی گھنی بھوری مونچھوں کو گدلیوں سے رخساروں پر چپکاتے ہوئے اس طرف نظر چرا کر یوں حسرت سے دیکھ لیتا تھا۔ جیسے وہاں اس کی ان تمناؤں کی تکمیل ہو رہی تھی جن سے وہ خود بھی محروم تھا۔ ہال میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا لیکن زیادہ پر شور نہیں! وہ افسر تھے۔ اگر وہ اودھم مچانے لگیں گے تو گراؤنڈ سروس کے عام ایر مین کیا کہیں گے؟ ان کی نگاہ میں ان آفسرز کی کیا وقعت رہ جائے گی؟ پھر بھی دنیا چھوٹ رہی تھی، آخری بار بالکل آخری بار! وہ اسے کیسے برداشت کر سکتے تھے؟

اس نے تصورات میں گم ہونے کے باوجود محسوس کیا کہ جیسے ہوا کے ثقل کے کم ہونے کی وجہ سے جہاز گر رہا ہے اس نے راڈر کنٹرول کو اپنی طرف کسی قدر کھینچ لیا جہاز بلندیوں پر چڑھنے لگا۔ اور پھر ایک بار جہاز بادلوں سے کافی اوپر پرواز کرنے لگا اور کانوں میں "ڈاں" "ڈڈ" "ڈاں" کے وائرلیس سگنل گونجنے لگے۔ ایک بار پھر اس نے راڈر کنٹرول کو جنبش دی اور گذری ہوئی رات کی یاد کو ذہن کو تازہ کرنے لگا۔ اس وقت کتنے ہی آفیسر کے دلوں میں ایک بے نام سی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ کاش بارش نہ تھمے، مطلع صاف نہ ہو، اور محکمۂ موسمیات پرواز کو ممنوع قرار دے دے ——— لیکن صبح جو کچھ ہوا وہ ان کے سامنے تھا۔ اور خود انہیں بھی یقین تھا کہ ان کی تمنا کا بر آنا قطعی نہیں! اس لئے جیسے جیسے رات گذرتی گئی بیرے مشروبات کے سربستہ بوتل میزوں پر سجانے لگے اور خمار کی وجہ سے ہال میں شور بڑھنے لگا۔ اور فرش پر پھسلن کی وجہ سے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اور اسمارٹ وردیوں میں بے سلیقگی پیدا ہونے لگی۔

فلائنگ آفیسر فرڈیننڈ ایک بیرے سے الجھ پڑا اس نے اپنا بوتل اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ اسکواڈرن لیڈر گلوسٹر نے لپک کر فرڈیننڈ کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا اور تھپتھپاتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ لیکن فلائنگ آفسر ڈیننڈ چیخ رہا تھا: "سر! آپ نہ بولیں۔ میں تو ان لوگوں کے لئے جان دینے جا رہا ہوں اور یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟ اگر میں کل زندہ نہ بچا تو یہ لوگ مجھے یاد کریں گے؟" اور وہ سب مسکرا رہے تھے، یہاں کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا۔ بیکار زندگیاں ٹوٹی ہوئی بوتل کی طرح ہیں جسے کوڑے میں پھینک دیا جاتا ہے۔

فلائنگ آفسر فرڈیننڈ جس چھپی ہوئی حسرت کا اظہار کر رہا تھا، وہ اس کے ذہن میں چبھن سی پیدا کرنے لگی۔ اُف ہم محروم بچوں کی طرح الجھ رہے ہیں! ——— اور واقعی پائلٹ آفسر جانر ولیف رونز نائٹ کے کندھے پر سر ٹیکے ہوئے بچوں کی طرح رو رہا تھا اور نشے کی حالت میں اسے بالکل خیال نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

اس وقت جبکہ وہ زمین سے بہت بلند اڑ رہا تھا نیچے پھیلے ہوئے سبز قطعوں کی شکل نظر آ رہے تھے میدانِ شطرنج کے ٹکڑوں کی طرح، دریا دودھیائی لکیروں کی طرح اور پہاڑیاں چھوٹے چھوٹے بھورے بھورے ڈھیروں کی طرح، تو اس کے دل میں وہ ہراس نہیں تھا جو وقت وہ کنٹین ہال میں محسوس کر رہا تھا۔ اور جب ہال بالکل خالی تھا اور دو چار ہی آفیسر باقی رہ گئے تھے تو فلائنگ آفسر ہیوفورٹ کے قریب آ گیا۔ لیکن اس نے اس سے کوئی بات چیت نہ کی، فلائنگ آفسر پہلے تو اپنے بالوں میں اپنے انگلیوں سے کنگھی کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنی کرسی کو جنبش دی۔ اور گلا صاف کرتے ہوئے بولا: "مسٹر ہماری زندگیاں کتنی ناآسودہ ہیں؟"

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

ہیوفورٹ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر بولا:—

"مسٹر ہم بھی کتنے نادان ہیں ہمیں امن بھی تباہی و بربادی کے بغیر قائم کرنا نہیں آتا۔"

وہ اکتا کر کھڑا ہو گیا: "ہیوفورٹ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

لیکن ہیوفورٹ اس وقت اس کے ساتھ خرابیٔ دماغ کے باوجود کسی جہاز پر پرواز کر رہا ہوگا۔ اور اس کی باتیں اس کے ذہن میں باز گشت کر رہی تھیں۔ وہ ابھی جلتے گا متواتر بم گرائے گا۔ آبادیوں کی آبادیاں تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا؟ تباہی تباہی! ——— ساری رات اپنی تباہی کے ماتم میں گذر گئی۔ اور اب امن کے نام پر پھر تباہی برپا ہونے والی ہے۔ ایک الجھن ایک اضطراب، ایک ہراس مسلسل روح پر چھایا ہوا ہے۔ صرف اس کی روح پر نہیں، تمام انسانیت کی روح پر۔ اس نے کنٹرول کو بالکل ہی آخری حد پر لگا دیا۔ انجن بڑی تیزی سے بھرانے لگا اور بوسٹ کی ڈائل پر سوئی ایک دم گھوم گئی۔ نیچے زمین کے کھلونوں کے چھوٹے چھوٹے قطعے پیچھے سرکنے لگے۔ بادل روئی کے گالوں کی طرح پھیلنے لگے۔ زندگی میں مسرت نہیں۔ زندگی میں آسودگی نہیں۔ لیکن انسان ترقی کر رہا ہے۔ وہ فرنٹ اسکرین میں سے سامنے فضا میں گھورنے لگا جیسے اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ بلندی پر خنکی میں زیادتی کے باوجود وہ پسینہ سا نکلتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ زمین کے ان سرکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قطعوں کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے اسے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ زمین کے ایسے ہی کچھ قطعے ہوں گے جن کو وہ تباہ کر دے گا۔ جہاں سے شادابی اور زندگی کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اور پھر یہی عمل دوسری طرف سے دہرایا جائے گا۔ سکون، امن اور آسودگی کے نام پر انسانیت تباہ ہوتی رہے گی۔ اور اس تباہی کی نذر وہ نہ ہوں گے جو اس کے ذمہ دار ہیں بلکہ نشانہ وہ بنیں گے جنہوں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ پھر یہ تباہی کیوں؟ —— یہ تخریب کیوں؟ اس کا ذہن الجھنے لگا، جہاز پھر ہلکے ثقل کی کمی کی وجہ سے نیچے گرنے لگا۔ بادل امنڈنے لگے سامنے ہر ڈائل پر سوئیاں غیر معمولی حرارت، اسراف اور قوت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس نے جلد جلدی جہاز کو سنبھالا۔ اور اپنے دماغ کو زہر خیالات سے پاک کر دینا چاہا۔ مگر فرڈینینڈ کی حسرت، ٹامرل کی گریہ وزاری اور گلوسٹر کی تشنگی اس کے ذہن کو الجھانے لگی۔ انسان رو رہا ہے اپنی ناکامی پر! اپنی ناآسودگی پر —— اور ہیوفورٹ کے سوالات نے گتھیاں پیدا کرنی شروع کر دیں۔ اس نے راڈر کنٹرول کو پھر جنبش دینا چاہی تاکہ جہاز بلندیوں کا رخ کرے مگر جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایر کنٹرول آفس کے وائرلیس سگنل اس کے کانوں میں گونج رہے تھے ڈاں، ڈاں، ڈاں، ڈڈ۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔ انسان ترقی کر رہا ہے اور تباہی بڑھتی جا رہی ہے ہے کاش کوئی اسے اس غار میں گرنے سے بچا لیتا —— کوئی؟ —— وہ ایک دم چونک پڑا۔ انسانیت کی فلاح تباہی میں نہیں! اس نے بڑے سکون کے ساتھ سوچا۔ گزری ہوئی رات کی دنیا اسے اپنی طرف استعجاب بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ وہ غیر اختیاری طور پر مسکرا دیا۔ پھر اس نے ناگہانی خطرات کے دریچے کو کھول دیا۔ اس کے قدموں کے نیچے زمین کا وسیع خطہ تیزی سے پیچھے کھسک رہا تھا۔ کبھی کبھی بادل کا کوئی ٹکڑا یا کبھی گاڑھی بھاپ کی طرح بیچ میں حائل ہو جایا کرتا تھا۔

اس نے حفاظتی تسموں کے نالے کو نصف گھما کر ڈھا دیا۔ اور جہاز سے چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگاتے ہی اس نے پیراشوٹ کھول دیا۔ وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ گرنے لگا لیکن فوراً ہی پیراشوٹ کے غبارہ نے اس پر سایہ کر لیا۔ جہاز کچھ دور ہوا میں بڑھا اور پھر اس کی نظروں کے سامنے اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پر شکستہ پرندے کی طرح ناچتا ہوا پستیوں میں گر گیا۔

وہ جیسے جیسے نیچے اتر رہا تھا۔ زمین اس سے نزدیک ہو رہی تھی یہاں تک کہ سبز و شاداب فرش زمین کو اس کے قدموں نے مس کر لیا اور وہ دو تین قلابازی کھانے کے بعد کھڑا ہو گیا۔ غبارہ پچک کر بیٹھ گیا اونچے اونچے پیڑوں کی چوٹیوں سے کچھ کافی بلندی پر اجلے اجلے بادل اڑتے چلے جا رہے تھے۔ نیلا نیلا آسمان مسکرا رہا تھا اور پرندوں کی چہکار اس کے دل میں گدگدی کر رہی تھی، اور اس کے سینہ میں ایک نیا عزم کروٹیں لے رہا تھا۔ وہ سچا امن اور ابدی آسودگی کی جستجو کرے گا۔ اور دنیا کو تباہی کے راستے نہیں تعمیر کے راستے ترقی کی منزل تک پہنچائے گا۔

اس نے اپنے گرد و پیش کا بڑے اطمینان کے ساتھ جائزہ لیا اور پھر آبادی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مصنوعی انسانوں کی آبادی کی تلاش میں نہیں!

نعیم نیصر •

چاچی

ندیم سوچنے لگا کہ چاچی کے گھر کے سامنے پوکھرے کے پاس جو پیپل کا درخت ہے اس کے پتے اور چاچی کی زندگی میں کس درجہ مناسبت ہے۔ اس کے پیلے پیلے اور کبھی سبز سبز پتے شاخ سے جدا ہو کر آہستہ آہستہ نیچے کی طرف چلے آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ پوکھرے میں گر گر کر اس کے پانی کو گندا کرتے ہیں اور بقیہ میدان میں بکھر جاتے ہیں۔ جب دیا تو جانور چر جاتے ہیں۔ نہیں تو "کاتن" کے چولہے کے نذر ہو جاتے ہیں ——— لیکن ان پتوں کا کیا ——؟ ان کا وجود تو اس وقت ختم ہو گیا جبکہ وہ شاخ سے جدا ہوئے ——— اب چاہے پوکھرے میں سڑ گل جائیں اور پانی کو بدبودار کریں چاہے کاتن کے چولہے کی آنچ بھڑکائیں۔

چاچی ——— ان کا سہاگ لٹ گیا ——— آرزوؤں کا خون ہو گیا ——— خواہشات نے دم توڑ دیا ——— تمنائیں مر گئیں۔ توازن کھو دیا ——— اور نیچے آنے لگیں ——— آہستہ آہستہ نیچے ——— انتہائی نیچے ——— سماجی سطح کے نیچے گر پڑیں ———

شمیم بھائی کا کہنا تھا کہ اس کی زندگی گناہ آلود ہے اور اس کا اثر گاؤں کی سادہ اور پاک زندگی پر ہوگا۔

ندیم انہی تصورات میں کھویا ہوا تھا آج پورے سات سال بعد وہ گاؤں جا رہا تھا، گاؤں ——— جہاں اس نے جنم لیا پروان چڑھا ——— جہاں آج بھی اس کا بچپن ماضی کے گہوارہ میں مچل رہا ہے ——— آج ہی کے دن تو وہ اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹے چھوٹے بھائیوں کو الوداع کہہ کر تلاش معاش کی خاطر پاکستان چلا آیا تھا ——— پاک استھان ——— بالکل پاک سرزمین ——— جہاں ایک پاک معاشرہ کی تعمیر ہوگی ——— پاک حکومت ہوگی ——— گوروں کا آقا نہ ہوگا ——— خدا کے پاکباز بندے خدا کے نائب مقرر ہوں گے ——— جہاں پیپل کے پتے پوکھرے کو گندا نہیں کرتے ہوں گے چاچی کا وجود نہ ہوگا ——— کتنے پاکیزہ تصورات تھے اس کے انہیں پاک جذبے کے تحت اس نے اور اس کے باپ نے جنگ آزادی لڑی ——— وہ شہید ہو گئے اور یہ پاک سرزمین دیکھنے کے لئے رہ گیا ——— بچ گیا اور دیکھ لیا۔

ندیم بی اے پاس تھا۔ یہاں آکر نوکری کے سلسلہ میں کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اچھی نوکری تک رسائی کے لئے رسوخ حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ اسے حاصل نہ کر سکا۔ بالآخر اس نے ایک سو دس روپیہ ماہوار پر ایک دفتر میں ملازمت کر لی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی ماں اور بھائیوں کو بھی پاکستان دکھا دے گا .... کیونکہ اسی سرزمین کے لئے اسکی ماں نے سہاگ لٹایا ——— سیندور کھو دیا۔ بھائیوں نے مشفق باپ کی قربانی دی۔ لیکن اس سلسلہ میں کچھ مجبوریاں تھیں جو مانع رہیں۔ اس درمیان میں ماں کے بھی کئی بلاوے آچکے تھے تاکہ اس کے سہرے کے پھول کھلتے دیکھیں۔ مگر وہ ابھی اپنے آپ کو اس ذمہ داری کے سنبھالنے کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ برابر ٹالتا رہا ——— بلاوے آتے رہے ——— ٹالتا رہا ——— جواں امنگیں جنم لینے لگیں ——— اور لیتی رہیں ——— وہ انہیں دباتا رہا ——— کچلتا رہا ——— سرکش ہونے لگیں ——— کچلتا رہا ——— دباتا رہا ——— لیکن تا کجے ؟ ——— سرکش ہو گئیں ——— کچل نہ سکا ——— دبا نہ سکا ——— ٹال نہ سکا ——— اور آج وہ سات سال بعد اپنے گاؤں جا رہا تھا۔

پی۔ جی لائین پر ای آر کی گاڑی فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ چاندنی رات میں پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے مناظر جیسے ہی بھلے معلوم ہو رہے تھے مگر ندیم اس سے قطعی بے نیاز دیہات میں اپنی گزشتہ

زندگی کے تصورات میں کھویا ہوا تھا اور اسے اپنا بچپن ماضی کے گھوڑے میں چھلتا نظر آرہا تھا۔ گاڑی کی چھک ... چھک ...... چھک کی صدا اسے تصورات کی دنیا کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی اور وہ غیر شعوری طور پر کھنچا چلا جا رہا تھا ــــ دور ــــ بہت دور ــــ ماضی کے دھندلکے اس پار ــــ مٹی مٹی سی ــــ دھندلی سی ــــ اور کچھ مونہگ سی تصویریں دیکھ رہا تھا ــــ وہ کو ــــ چھک ــــ چھک .. آنا چل جانا۔ چھک ..... چھک کوڑی ــــ چل مسوڑھی کہتا گلیوں کی دھول اڑاتا چلا جا رہا ہو۔ گاؤں کے بچوں کی قطار ایک دوسرے کا دامن پکڑے ڈبوں کی طرح کھینچے چلے جا رہے ہیں۔ گاؤں کی عورتیں اپنے اپنے دروازے سے لگی حسرت آگیں نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ وہ گلیوں کا چکر کاٹتے ہوئے پیپل کے گھنے میں سامنے میں کھڑے ہوگئے۔ سامنے مٹی اور پھونس کے چھوٹے گھر کے دروازے پر کھڑی ایک عورت زرد چہرہ ــــ پیپل کے گرتے ہوئے پتوں کی طرح زرد ــــ خشک اور الجھے ہوئے بال ــــ جیسے پیپل کے آخری سرے پر چیل کا گھونسلا ــــ سفید اور مٹیالے رنگ کی ساڑی میں ملبوس ویران آنکھوں میں عجیب چمک پیدا کر کے ان کی طرف دیکھ رہی ہے۔
کبھی ان ویران آنکھوں میں بھی چمک رہی ہوگی ــــ ایک لطیف چمک ــــ مامتا کی، دلکش چمک ــــ شوہر پرستی کی ــــ لیکن اب ؟ ــــ اب بھی گاہے گاہے پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ جگندر کے لئے مخصوص ہے۔ جگندر ــــ لالہ جی جو چاچی کے تمام اخراجات پورا کرتا ہے اور جس کے متعلق گاؤں میں طرح طرح کے شگوفے کھلے ہیں۔

وہ ماضی کے ان موہوم سے نقوش میں لپٹی لپٹی ــــ سمٹی سمٹی سی اس زرد چہرے والی عورت کے متعلق سوچنے لگا۔ جسے گاؤں کی توہم پرست عورتیں منحوس اور ڈائن کہا کرتی ہیں اور اپنے بچوں کو اس کے سایہ سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہیں اور گاؤں کے بڑے بوڑھے حقے اور گانجے کا دم لگاتے ہوئے جس کی بدچلنی اور گناہ آلود زندگی کے متعلق طرح طرح کے قصے چھیڑا کرتے ہیں ندیم کے کانوں میں اپنی ماں کی باتیں گونجنے لگیں جو قدرے پڑھی لکھی تھیں۔

"بیٹا! وہ زمانے کی ستائی ہوئی ہے۔ تم اس کے پاس جایا کرو وہ تمہارے ابا کے مرحوم دوست کی بیوی ہے۔ اس لئے بیٹے تم اسے چاچی کہنا۔"

"نہیں ماں، میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ جاوید کی امی کہہ رہی تھیں کہ وہ ڈائن ہے۔ مجھے کھا جائے گی تو ــــ؟"

"نہیں بیٹے، ایسا نہیں کہا کرتے، وہ ڈائن نہیں ہے کہیں آدمی بھی آدمی کو کھاتا ہے؟"

"اگر وہ ڈائن نہیں ہے تو اپنی ساس، شوہر اور بیٹی کو کیسے کھا بیٹھی؟"

"نہیں تو ایسا نہیں ہے، ان لوگوں کی موت تھی مر گئے تیری دادی بھی تو میری شادی کے بعد مریں تو تو مجھے بھی ڈائن کہہ دے۔"

اور سوچنے لگا تھا۔ کیا اس کی ماں ڈائن ہے ــــ؟
نہیں! ہرگز نہیں! ــــ تو اس کی دادی ــــ نہیں
ایسا نہیں! ــــ وہ تو ان کی موت ہوگی مر گئیں ــــ تو چاچی
وہ بھی نہیں، وہ تو ان لوگوں کی موت ہوگئی مر گئے ــــ

"نہیں ماں، میں اب چاچی کے یہاں ضرور جاؤں گا" اس نے ماں سے وعدہ کیا تھا۔ جب اس نے شروع شروع چاچی کے پاس جا کہا تھا۔

"چاچی! میں اب سے تمہیں ڈائن نہیں کہوں گا اور ہمیشہ تمہارے یہاں کھیلنے آیا کروں گا" تو چاچی کی مامتا عود کر آئی اور اسے گود میں لیکر خوب بھینچا تھا ــــ چاچی کے اس طرح بھینچنے سے اسے وحشت سی ہونے لگی تھی مگر اسے فوراً ہی یاد آگیا تھا کہ اس کی ماں بھی تو اکثر اسی طرح پیار کیا کرتی ہیں ــــ چاچی کی آنکھوں سے دو آنسو نکل پڑے تھے پتہ نہیں ــــ وہ شفقت کے تھے یا بیتے دنوں کی کسک کے۔ چاچی نے کہا تھا "میری ننھی زندہ رہتی تو ٹھیک اتنی ہی بڑی ہوتی۔ تمہاری شکل بھی کچھ کچھ ننھی سے ملتی جلتی ہے اسی لئے تو میں تمہیں دیکھا کرتی ہوں" پھر بعد میں اسے ماں نے بتایا تھا کہ جس زمانے میں چاچی کی شادی ہوئی تھی ان دنوں گاؤں میں

ہیضہ کی وبا بری طرح پھیلی ہوئی تھی اس کی رخصتی کے چوتھے دن اس کی ساس ہیضہ کی شکار ہو گئی۔ اس کی ساس کے اس موت پر چاچی کو منحوس قدم سمجھا گیا۔ لیکن ساس کی اس موت کا نعم البدل خدا نے ایک ہی سال میں ایک حسین سی بچی دے کر کر دیا۔ لیکن چاچی کی قسمت کا ستارہ پھر اس طرح گردش میں تھا کہ دوسرے سال ایک دوسرا حادثہ در پیش آیا اور رحیم چاچا کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ اس سے جانبر نہ ہو سکے۔ گاؤں کی عورتیں اس کی ساس کی موت پر ہی سے منحوس قدم کہا کرتی تھیں اب جو شوہر مرا تو لوگوں کے وہم کو اور تقویت ملی اور وہ کہنے لگیں کہ یہ ڈائین ہے دراصل سانپ کے روپ میں خود تھی اس طرح اس نے اپنے شوہر کو ڈس لیا۔ ڈھائی سال کے اندر ہی اس کی حسین سی بیٹی بھی اللہ کو سدھاری اب تو گاؤں والیوں کا شبہ یقین میں بدل چکا تھا۔ گاؤں کی عورتیں اپنے بچوں کو اس سے دور رکھنے لگیں۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ ایک دفعہ چاندنی رات میں اس نے کسی طرح ان کے بچوں کو چاچی کے سامنے والے میدان میں آنکھ مچولی کھیلنے پر راضی کیا اور وہ بچے اپنے والدین کے "چہلے" شان بے نیازی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اور چاچی اپنے دروازے سے لگیں کھیل دیکھ رہی تھیں کہ کسی طرح ان کی ماؤں کو انکی عدم موجودگی کی بھنک مل گئی اور ایک دم سے زنانہ فوج آ دھمکی اور چاچی کو برا بھلا کہتے چل دیں تھوڑی دیر بعد ندیم گھر گیا تو دیکھا کہ چاچی کے خلاف آنگن میں باقاعدہ جلسہ منعقد ہے اور سبھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اشتعال انگیز تقریر کر رہی ہیں۔

ایک بی صاحبہ فرما رہی تھیں "بڑی ساس، شوہر اور بیٹی کھا بیٹھی اس پر بھی موئی کا جی نہیں بھرا ہے۔"

دوسری نے آواز ملائی "ہاں بہن سچ اس کا پوڑا بڑا ہی ناہموار جو کہ آئی سارے گھر کا ستیاناس کر دیا۔"

تیسری نے اپنی آواز نمایاں کرتے ہوئے کہا تھا "عجیب کلمہی شادی کر کے آئی اور ساس پر ایسی نظر ڈالی کہ بیچاری اچھی بھلی میں چٹ پٹ ہو گئی۔ ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ اپنے شوہر کو ناگن بن کر ڈس لیا اور پھر دوسرا سال ختم ہوتے ہوتے اپنی چھ ماہ کی بیٹی کو کھا بیٹھی۔"

ندیم کی ماں نے مخالفت کی، "بوا! ایسا نہ کہو، موت تھی، ہو گئے۔ کہیں آدمی آدمی کو کھاتا ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں خدا کا حکم تھا، گئے۔"

اس پر تیسری نے جواب دیا تھا: "ارے لے دیکھ بڑی چلی اس کی دادی نانی بننے بہن کا جان؟ ——— ڈائین کے لچھن ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ یہ تو مثل مشہور ہی ہے کہ ڈائین اپنے پوت کے کلیجہ پر پہنچاتی ہے۔"

ایک نے ندیم کی ماں کو قائل کرنے کے لئے کہا تھا "بہن بڑی چلی ہو ہمدردی بگھارنے تو اس کو بھی جھٹ بتا دو کہ جو گند راس کے یہاں نہیں جاتا ہے۔"

اس کا جواب اس کی ماں سے کچھ بن نہیں پڑا تو وہ خاموش ہو گئی۔

ندیم سوچنے لگا کہ چاچی کے گھر کے سامنے پوکھرے کے پاس جو پیپل کا درخت ہے اس کے پتے اور چاچی کی زندگی میں کس درجہ مناسبت ہے۔ اس کے پیلے پیلے اور کبھی سبز سبز پتے شاخ سے جدا ہو کر آہستہ آہستہ نیچے کی طرف چلے آتے ہیں انہیں سے کچھ پوکھرے میں گر گر کر اس کے پانی کو گندا کرتے ہیں اور بقیہ میدان میں بکھر جاتے ہیں جس کو ہوا تو جا اُڑا لے جاتی ہے نہیں تو بھٹیارن کے چولہے کی نظر ہو جاتے ہیں ——— لیکن ان پتوں کو کیا؟ ——— ان کا وجود تو اس وقت ختم ہو گیا جبکہ وہ شاخ سے جدا ہوئے ——— اب چاہے پوکھرے میں سڑ گل جائیں اور پانی کو بدبودار کر دیں چاہے بھٹیارن کے چولہے کی آنچ بھڑکائیں۔

چاچی ——— ان کا سہاگ لٹ گیا ——— آرزوؤں کا خون ہو گیا ——— خواہشات نے دم توڑ دیا ——— تمنائیں مر گئیں تو ان کو کھو دیا ——— اور نیچے آنے لگیں ——— آہستہ آہستہ ——— نیچے ——— انتہائی نیچے ——— سماجی سطح کے نیچے گر پڑیں۔

شمیم بھائی کا کہنا تھا کہ ان کی زندگی گناہ آلود ہے اور اس کا اثر گاؤں کی سادہ اور پاک زندگی پر ہوگا۔"

لیکن اس کا خیال تھا کہ چاچی "سماج بھٹی" کا ایندھن ہیں خود جل رہی ہیں ——— دہک رہی ہیں ——— "سماج کی بھٹی پیکرم ہے ——— اس کا وجود راکھ ہو جائے گا ——— وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی ——— لیکن سماج کی بھٹی تو سرد نہیں ہو سکتی ——— اس کی جگہ دوسرا ایندھن ——— تیسرا...

ندیم نے ایک بار اپنے چچا زاد بھائی سے دریافت کیا تھا:۔

"بھائی جان! چاچی نے دوسری شادی کیوں نہیں کی جبکہ اسلام نے اس کی اجازت دے رکھی ہے" کیونکہ اس کا خیال تھا کہ باعزت زندگی گزارنے کے لئے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا سہارا لینا ضروری ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو آدم کے لئے حوّا اور حوّا کے لئے آدم کا وجود نہ ہوتا

بھائی جان نے جواب دیا تھا:۔ "ہاں! دی تو ہے مگر اسے ہماری ذہنی غلامی کہہ لو کہ ہم اندھی تقلید کی رو میں کچھ اس تیزی کے ساتھ بہتے چلے جا رہے ہیں کہ ہم خود اپنی ہی بیش بہا تہذیب سے نفرت کرنے لگے ہیں یہی وجہ ہے کہ خود ہمارے یہاں بیوہ کی دوسری شادی عار سمجھی جاتی ہے یہ دراصل ہندو معاشرہ سے مستعار شدہ ہے۔"

اس پر جمیل بھائی نے کہا تھا" یہ مستعار شدہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ہمارے ہندوستانی تہذیب کا زریں نمونہ ہے۔ یہی چیز ہے جو ہمارے ملک کی عورتوں کو دوسرے ممالک کی عورتوں سے بلند تر کر دیتی ہے کسی ملک کی عورتیں اتنی وفا شعار نہیں ہیں کسی ملک کی عورتوں میں اس درجہ ایثار کا مادہ نہیں ہے۔"

اس پر شاہد نے بڑے ہی رومانٹک انداز میں کہا تھا:۔

"یار تم لوگ بھی کیسی باتیں کرتے ہو گنڈے کے ہوتے ہوئے شادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔"

ندیم ابھی انہیں خیالات میں گم تھا کہ وہ یک دم سے چونک پڑا اس کے تصورات کے تانے بانے ٹوٹ گئے۔ اس کے برتھ پر بیٹھا ہوا ایک مسافر اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا:۔ "ابر کیورہ اسٹیشن ہے۔" وہ اٹھا اور اپنا سامان دروازے کے پاس لا رکھا اس لئے کہ یہاں گاڑی بہت ہی معمولی وقفہ کے لئے ٹھہرتی تھی۔ اسٹیشن آگیا وہ ابھی سامان اتار ہی رہا تھا کہ مٹیالے رنگ کی دھوتی میں ملبوس ایک قلی نے آکر دریافت کیا۔

"کولی لاگی سرکار۔" وہ دفعتاً چونک پڑا کیونکہ یہ آواز کچھ جانی پہچانی معلوم ہو رہی تھی۔

"ہاں! ہاں۔ لگے گا اٹھاؤ۔" پھر دماغ پر زور دینے لگا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ اسے یاد آگیا کہ شاید اس کے گھر کا "کمیا" جگیرا تو نہیں ہے اس کے ساتھ چلتے ہوئے ندیم نے دریافت کیا۔

"کون، جگیرا؟"

"ہاں حجور! اپنے کون ندیم بابو۔"

"ہاں! اچھا ہے نا۔"

"ہاں سرکار اپن کیسن ہیں۔"

"اچھا ہوں۔"

وہ اپنے گاؤں کے اس چھوٹے سے اسٹیشن کا جائزہ لیتا ہوا جا رہا تھا اسے بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ سات سال کے اس طویل مدت میں بھی کچھ تو نہیں بدلا تھا۔ وہی مدھم روشنی والا لیمپ کھمبے سے آویزاں تھا۔ وہی ٹکٹ گھر تھا۔ وہی خلاصی۔ البتہ یہاں کا بابو بدلا ہوا تھا

ندیم حیرت اور استعجاب کی نظروں سے گھورتا ہوا کچی سڑک پر آنکلا۔ چاند آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے اور اپنی رو پہلی اور چمک کرنوں کی ضیاء پاشی کر رہا ہے۔ کھیت میں دور دور "آل" پر اکا دکا مسافر مختلف سمت کو جا رہے ہیں۔ لیکن اس کچی سڑک پر صرف جگیرا اور ندیم آگے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ سڑک کے دونوں جانب کھڑے ہوئے لمبے سیاہ تاڑ کے قطاریں ہیں۔ ان پر اونگھتے ہوئے الوان کی قدموں کی چاپ سن کر چونک پڑتے ہیں اور پھڑ پھڑا کر ایک تاڑ سے دوسرے تاڑ پر چلے جاتے ہیں۔

ندیم پھر تصورات کے تانے بانے بننے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ شاید سماج کے پاس چاچی کے خلاف سب سے بڑا ہتھیار نفرت کا ہے نفرت کا ایسا ہتھیار ——— جس کے تین دھار ہیں۔ ——— منحوس ڈائن ——— بدچلن ——— وہ محسوس کرنے لگا کہ اس نے بھی

کبھی چاچی پر نفرت کے تیر لگائے تھے۔ جب وہ بچہ تھا تو اسے منحوس اور ڈائین سمجھا کرتا تھا۔ وہ اکثر گاؤں کے بچوں کے ساتھ ریل کا سوانگ رچاتا ہوا پیپل کے پاس جایا کرتا تھا اور جب سامنے کچے گھر سے جھانکتی ہوئی اس زرد چہرے والی چاچی پر نظر پڑ جاتی تھی تو وہ تمام بچوں کے ساتھ سے "ڈائین" کہہ کر یکدم سے بھاگ نکلتا۔

پھر جب چاچی اور جگندر کے متعلق گاؤں میں اڑتی ہوئی افواہ کو ندیم نے اور ان کے تعلقات کو سمجھنے کے قابل ہوا تو اس کے دل میں بھی عجیب سا شک جنم لینے لگا تھا اور یہ تو اس وقت یقین کی حد تک پہنچ گیا تھا جبکہ جگندر نے چاچی کو ایک نئی ساڑھی لا کر دی تھی اور چاچی نے کہا تھا۔

"جگندر تمہیں مری کتنی فکر رہتی ہے"۔

اور اس نے بھی اسی انداز میں کہا تھا "فکر کیوں نہ ہو۔۔۔؟"

"کیوں نہ ہو۔۔۔؟" بڑا ہی معنی خیز جملہ تھا جس نے یقین کے ساتھ اس کے دل میں جگندر اور چاچی کے خلاف نفرت پیدا کر دیا۔ اور جب بھی وہ چاچی کو جگندر سے لہک لہک کر گفتگو کرتے دیکھتا تو وہ زبان قال سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اس کی حقارت آمیز نظریں کہتیں تو آوارہ ہو آوارہ ہے بدچلن کہیں کی۔ اور پھر اس نے آہستہ آہستہ چاچی کے یہاں جانا آنا کم کر دیا۔ لیکن اس کے دل میں برابر یہ خواہش رہی کہ وہ کسی طرح جگندر اور چاچی کے تعلقات کو صحیح روپ میں دیکھ لے اور اس نے ایک دن دیکھ ہی لیا۔۔۔۔۔ اس پر جگندر اور چاچی کا بہت بڑا راز واضح ہو گیا۔

ہوا یوں کہ ایک دفعہ جب ندیم نے چاچی کے یہاں جانا آنا قریب قریب بند کر دیا تھا۔ اس کی ماں نے بتایا کہ چاچی کی طبیعت ناساز ہے اور جب ماں ہی کے کہنے پر تہہ در دلش بر جان دردیش چاچی کی عیادت کو گیا تو کمرے سے جگندر اور چاچی کی آواز آ رہی تھی بالکل آہستہ آہستہ۔ رازدارانہ طریقہ پر اس کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ اس کے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی ۔۔۔۔۔ اس پر ایک نامعلوم سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ جس سے وہ قطعی ناآشنا تھا ۔۔۔۔۔ ایک لطیف سی کپکپاہٹ محسوس کرنے لگا ۔۔۔۔ دل کی دھڑکن تیز تیز ہونے لگی۔

ویسے ہی جیسے آنکھ مچولی کے موقع پر پکڑے جانے کی ڈر سے۔ اور وہ دروازے کے قریب کھڑا سن رہا تھا۔

چاچی:۔ "تم مجھے کتنا چاہتے ہو جگندر اور تم کو میرا کتنا خیال رہتا ہے"

ورنہ اس دنیا میں کون ہے جو مجھ جیسی کو پوچھتا ہے۔ کاش تم کو معلوم ہوتا کہ تمہاری اس "چاہت" نے تمہیں اس گاؤں میں کس درجہ بدنام کر دیا ہے"

جگندر:۔ "لیکن میں تو پوچھنے چھوڑ پوجتا ہوں۔ تم صبر و استقلال کی دیوی ہو دیوی۔ مجھے اپنی بدنامی کی پرواہ نہیں ہے میں تو تمہاری چرنوں پر سب کچھ بھینٹ چڑھا دوں گا بہن! اس لئے کہ میں نے بیوہ کی ہر دھڑکن میں اٹھتی ہوئی ہوک کو قریب سے محسوس کیا ہے مری بڑی بہن بھی تو بیوہ تھی۔ تمہارے ہی جیسی تھی وہ بھی بہت کم عمر میں بیوہ ہوئی تھی۔ میں نے اسے سسک سسک کر روتے دیکھا تھا بالآخر تلوے رگڑ رگڑ کر مری مگر سماج کا ظلم آخر دم تک قائم رہا سچ کہتا ہوں بہن تمہاری شکل اسی کی طرح ہے اور تمہاری زندگی بھی تو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو تم سے ایک خاص قسم کی انسیت ہو گئی ہے بہن"۔

چاچی: "تم اسی بات کو کتنی بار کہہ چکے ہو مگر گاؤں والے کیا نہیں سمجھتے"۔

"بہن" اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے جگندر نے اس کے گال پر بھرپور طمانچہ مارا ہو یا اس کے منہ پر تھوک دیا ہو ۔۔۔۔۔ وہ تلملا اٹھا ۔۔۔۔۔ اس کے قیاسات کے محل یکدم گر پڑے اس کے آنکھوں کے تلے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ سر گھومنے لگا تھا۔ اس نے وہیں دیوار کا سہارا لے لیا تھا۔ جب قدرے طبیعت سنبھلی تو اندر گیا اور چاچی سے روندھے ہوئے گلے سے صرف اتنا کہہ سکا تھا "مجھے معاف کر دو چاچی میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا"۔ اس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو ڈھلک پڑے تھے اور چاچی کے آنکھوں سے شفقت کے ....

اسے ٹھوکر لگی وہ یکدم سے چونک پڑا۔ وہ دور لے پہ پہنچ گیا تھا۔ جگیرا اس کے گھر کی طرف جانے والے راستہ پہ چلا جا رہا تھا

اس نے لاشعوری طور پر اپنا رخ مخالف سمت چاچی کے طرف جانے والے راستہ کی طرف کر دیا۔

وہ پیپل کے پاس پہنچا۔ حیرت سے کھڑا دیکھ رہا تھا کہ جہاں پر وہ کبھی گاؤں کے بچوں کے ساتھ چاند کے خنک سایے میں آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا وہاں پر چند مٹی کے ٹیلے تھے —— چاچی کا مکان نہ تھا۔ آسمان پر چاند ان لوگوں کے بجائے چند غیر متحرک قسم کے ٹیلے کو دیکھ کر ابر کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ شاید یہ کھیل چاند نے انہیں لوگوں سے سیکھا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بوڑھا پیپل ان ٹیلوں سے اپنا گھنا لمبا سایا ملائے۔ لئے عہد رفتہ کو آواز دے رہا ہے۔ نہ معلوم اس کے کتنے لمبے سائے میں گاؤں کے کتنے المیہ اور فکاہیہ قصوں نے جنم لیا ہوگا اور لیتے رہیں گے۔ اس کے سائے میں باراتیں ٹھہری ہیں —— شہنا ئیاں بجی ہیں ڈھولک کے تھاپ سنے گئے ہیں —— جنازے رکھے گئے ہیں۔ بین پڑھا گیا ہے۔ مانگوں میں سیندور ڈالا گیا ہے —— سہاگیں لٹی ہیں۔ اس نے چاچی کا سہاگ لٹتے اور گود بھرتے دیکھا تھا۔ اسی نے گود خالی ہوتے دیکھا اور سماج کے گھناؤنے رسوم دیکھے۔ اسی نے چاچی کی سسک اور آہیں بھی سنیں۔ اس نے ایک بھائی اور بہن کے پاک جذبے بھی دیکھے اور ان کے خلاف مشکوک نظریں بھی اور یہی ایک نئے عزم کا شاہد بھی بنا —— ایک پاک عزم —— نیا ارادہ لے ساتھ ندیم وہاں سے گھر واپس آیا اور ماں سے پوچھا۔

"ماں! چاچی کہاں ہیں؟"

"مرگئیں" ماں نے کہا۔

"کیسے؟" ندیم نے حیرت کے ملے جلے لہجہ میں پوچھا۔

"منہ سے خون آنے لگا تھا" ماں نے بتایا۔

پھر ماں اور ندیم میں اور دوسری باتیں ہونے لگیں۔ پھر ماں نے اس کے منسوب کے متعلق بتانا شروع کیا۔

"چاند سی حسین ہے بیٹا اور سب سے بڑھ کر سگھڑ من ہے۔"

"لیکن کنواری ہے یا بیوہ؟" ندیم نے سوال کیا۔

"ہائے اللہ! بیوہ کیوں ہونے لگی، کنواری ہے" ماں نے کہا

"مگر میں تو کسی بیوہ سے شادی کروں گا" اس کی ماں حیرت سے منہ کھولے اسے تکنے لگی۔

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے:-

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ماہ جون سنہ ۷۰ء کے اسی شمارہ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ خریداری برقرار رکھنے کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیج کر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعہ اپنی رائے سے مطلع کریں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ "وی۔ پی" مطلوب ہے اور پھر ایسی صورت میں اس "وی۔ پی" کا وصول کرنا آپ کا عین اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم:- مینجر "ماہنامہ مشیر کراچی"

۱۰۸۴ جناب محمد شریف خاں صاحب پی او بکس نمبر ۶۴ سکھر سندھ
۲۱۵۱ جناب شیخ محمد صاحب بلاک ۳ بی او پلاٹ نمبر ۲۰ ناظم آباد کراچی
۲۱۵۶ محترمہ بیگم نگہت طیبہ صاحبہ ۱۰۸۔بی ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
۲۱۶۳ محترمہ ہمشیرہ محمد عرفان صاحب۔ بی ون ۶ پاک کالونی منگھو پیر روڈ کراچی
۲۱۷۵ جناب غازی محمد اشرف صاحب بازار دروش۔ چترال
۲۳۵۶ محترمہ ثریا کشور عبید صاحبہ بنگلہ ۲۳/ڈی محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی
۲۳۶۵ جناب محمد لیقوب صاحب ندوی دفتر جماعت اسلامی۔ شہید روڈ ملگھیا
۲۵۴۷ جناب محب الحسن صاحب ندوی۔ سیکرٹری ادارہ ادب اسلامی نزد جامع مسجد مین روڈ۔ موتی ہاری (بھارت)
۲۵۴۸ محترمہ ہاجرہ اکرام صاحبہ پوسٹ آفس سنگاہی ضلع کھیری (بھارت)

مترجم: محمد حمید اللہ صدیقی

تیسرا دن - پیچھا

ہرمن ملول (HERMAN MELVILLE) کے ناول موبی ڈک (MOBY DICK) کا شمار امریکی ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس ناول میں اگر ایک طرف بعض ناقدین کے خیال میں خیر و شر کی ایک عظیم کشمکش پیش کی گئی ہے جس میں موبی ڈک نامی وہیل خیر کا نشان (SYMBOL) ہے اور جہاز کا کپتان اھاب (AHAB) شر کا نشان ہے تو دوسری طرف دوسرے خیال میں یہ انسان کی بے پناہ عظیم اور انتھک کوششوں کی داستان بھی ہے۔ ذیل میں ناول کے آخری باب کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس میں یہ کشمکش یا انتھک کوشش اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی ہے۔

اگرچہ پس منظر کے بغیر بھی یہ باب خود اپنی جگہ ایک مکمل کہانی ہے پھر بھی مختصراً اس کا پس منظر یہ ہے کہ اھاب کی سرکردگی میں ایک تجارتی کمپنی کا پیکوڈ (PEQUOD) نامی جہاز اس مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں وہیل کا شکار کر کے اس کا تیل حاصل کیا جائے لیکن جہاز کے چلتے ہی اھاب اپنا فیصلہ سنا دیتا ہے کہ اس کا مقصد صرف موبی ڈک (MOBY DICK) نامی وہیل کا شکار کرنا ہے جس نے اس کی ایک ٹانگ اس سے قبل کسی سفر میں اڑا لی تھی۔ جہاز دنیا کے سمندروں میں پیچھا کرتا ہے آخر موبی ڈک کو تلاش کر لیتا ہے۔ دو دن مسلسل جہاز موبی ڈک کا پیچھا کرتا ہے اور اسے برچھے اور نیزے مار مار کر زخموں سے چور کر دیتا ہے مگر اسے پکڑ نہیں پاتا۔ یہ باب تیسرے اور آخری دن کی داستان ہے۔

تیسرے دن کی حسین اور خوشگوار صبح طلوع ہوئی اور ایک بار پھر لے اگلے مستول کا تنہا نگہبان اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوا اور اس کے بعد ہر مستول پر نگہبان متعین ہو گئے۔

"کیا تمہیں وہ نظر آ رہی ہے؟" اھاب چلّایا۔

وہیل کا ابھی تک کوئی پتہ نہ تھا۔

"اس کا پیچھا کرو، مستقل پیچھا کرو، مسلسل پیچھا کرو۔ بس یہی تمہارا کام ہے۔ مستعدی سے، تندہی سے، جیسے تم اب تک کرتے رہے ہو۔ یہ دن کتنا حسین ہے۔ اگر یہ دنیا نو مولود ہوتی جو فرشتوں کی تفریح کے لئے بنائی گئی ہوتی اور آج اس میں ان کے داخلے کا پہلا دن ہوتا تب بھی اس سے زیادہ حسین دن کبھی طلوع نہ ہو سکتا تھا۔ یہ سوچنے کا مقام ہے اگر اھاب کے پاس سوچنے کا وقت ہوتا لیکن اھاب کبھی نہیں سوچتا وہ صرف محسوس کرتا ہے۔ محسوس کرتا ہے۔ محسوس کرتا ہے۔ فانی انسان کے لئے یہی بہت ہے۔ سوچنا گستاخی ہے، بہت بڑی بے باکی ہے۔ یہ حق صرف خدا کا ہے۔ تفکر تو خنک اور پرسکون ہونا چاہئے اور ہمارے ناتواں دل دھڑکتے ہیں اور ہمارے کمزور دماغ گرم ہو جاتے ہیں جو اس کے لئے ناموزوں ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھی میں نے سوچا ہے کہ میرا دماغ بہت پرسکون ہے۔ برف کی مانند ساکن لیکن جب میں نے سوچنا شروع کیا ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی چٹخ گیا ہو، جیسے ایک گلاس کی طرح جس میں پانی منجمد ہو کر اس کی دیواروں کو پھیلا دیتا ہے۔ اور یہ بال بڑھ رہے ہیں۔ اس لئے بھی بڑھ رہے ہیں اور اس کے لئے گرمی ضروری ہے۔ لیکن نہیں۔ یہ اس عام زمین کی طرح ہے جو ہر چیز کی پرورش کرتی ہے اور ان نشانوں کے آگے جھکتے ہوئے دامن کے درمیان ہر جگہ اگتی ہے۔ تیز ہوائیں انہیں ادھر ادھر اڑا رہی ہیں۔ یہ میرے چہرے کے اردگرد اس طرح اڑ رہے ہیں جیسے کسی بادبان کی دھجیاں اڑتی ہیں

اور وہ مستول سے ٹھنسا ہوا تیز سمندری ہوا کی لہروں پر تھپیڑے کھا رہا تھا۔ شریر ہوا جو بلاشبہ اس سے پہلے قید خانوں کی تاریک کوٹھڑیوں اور پھول مزاروں اور ہسپتال کے وارڈوں سے ہو کر گذری ہے اور اس نے وہاں کی فضا کو ناپاک کیا ہے اور اب یہ بہتی ہوئی یہاں آ رہی ہے۔ اتنی عیش جیسے کھیڑ۔ لعنت ہو اس پر۔ یہ دغا باز ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اس ناپاک اور ذلیل دنیا پر کبھی نہ بہتا بلکہ کسی نامعلوم جگہ اور حیطہ پر ٹھہرا رہتا۔ اور پھر یہ ایک اعلیٰ اور ارفع چیز ہے۔ ہوا کون ہے جو اسے فتح کر سکتا ہے۔ ہر مقابلے میں اس کا وار آخری اور مہلک ہوتا ہے۔ پوری طاقت سے اس پر حملہ کرو اور تم اس میں سے ہو کر گذر جاؤ گے۔ ہا۔ ہا۔ بزدل ہوا۔ یہ ننگے انسانوں کی پیداوار ہے۔ خدا کی ہے لیکن خود ایک ۔۔۔ کبھی نہیں ٹھہرتی۔ اھاب بھی ایک بہادر شخص ہے۔ اس سے زیادہ شریف اور اعلیٰ۔ کاش اس ہوا کا جسم ہوتا۔

لیکن وہ تمام چیزیں جو انسان کو مشتعل کرتی ہیں بالکل ۔۔۔ کرتی ہیں وہ بادی ہیں۔ محسوس اشیا کے طور پر غائب ۔۔۔ ہے لیکن یہ بھی میں کہتا ہوں اور آج قسم کھاتا ۔۔۔ ہوا میں کوئی چیز ایسی بھی ہے جو بہت ہی شاندار ۔۔۔ یہ دہ ہے کہ گرم گرم سمندری ہوا ۔۔۔ آسمان کے نیچے سمندر ۔۔۔ میں کبھی تیز اور کبھی مدھم ۔۔۔ ذلیل دھارے ۔۔۔ کتنا ہی ۔۔۔ مختلف ۔۔۔ اور سمندر کی بے کراں ۔۔۔ کیوں ۔۔۔ اور کتنی کمزور ہے ۔۔۔ اپنا رخ نہیں بدلتی ہے اگرچہ بہ جاتی ہیں نہیں ہیں کہ انہیں کہاں جانا ہے اور قسم ہے ابدی قطبیں ۔۔۔ ہی سمت ۔۔۔ ہوا ہیں جو میرے جہاز کو اس رخ چلا رہی ہیں ۔۔۔ ہواؤں یا انہیں کے مندروں کے، کوئی ناقابل تبدیل ستے، بہت ہی قوت اور تندی سے میرے جہاز کو چلاتی رہو۔ تم نے کیا دیکھا؟"

"کچھ نہیں جناب؟"

"کچھ نہیں اور دوپہر ہو گئی! اشرفی مہیب مانگتی ہے۔ مہر ۔۔۔ کو دیکھو، اسے ایسا ہی ہونا چاہئے میں اس سے آگے نکل آیا۔ کیسے ہم پہلے ۔۔۔ وہ اب میرا پیچھا کر رہی ہے۔ نہیں نہیں، وہ یہ ہوا ہے۔ مجھے بھی اس کا اندازہ ہو جانا چاہئے تھا۔ احمقو! رسیاں

وہ پھر مجھے کھینچ رہی ہے۔ چلو سب کے سب۔ سوائے مستقل نگہبانوں کے بادبانوں کو ادرتا لو، اور کسو۔

پکاڈ ہوا کے رخ پر چل رہا تھا۔ اس لئے جب اسے بالکل الٹی طرف موڑ دیا گیا تو بادبان تن گئے اور جہاز ہوا کے مخالف رخ پر چلنے لگا۔

"ہوا کے خلاف وہ اب جہاز کو کھلے ہوئے جبڑے میں لیجا رہا ہے۔" آرچ استار بک نے بڑبڑایا۔

"خدا ہماری مدد کرے۔ لیکن مجھے اپنی ہڈیاں ابھی سے پگھلتی محسوس ہو رہی ہیں اور اپنا گوشت پانی ہوتا لگ رہا۔ مجھے گمان ہوتا ہے کہ میں اس کا حکم ماننے میں خدا کی نافرمانی کر رہا ہوں۔"

"میری مدد کے لئے قریب کھڑے رہو۔" اھاب چلایا، "مجھے سب سے اوپر مستول پر پہنچا دو۔ اب ہماری اس سے جلد ہی مڈبھیڑ ہوگی۔" اور اھاب کو اوپر پہنچا دیا گیا۔

ایک گھنٹہ گذر گیا۔ سونا پگھلتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وقت خود مانے تجسس کے دم بخود کھڑا ہے۔ لیکن آخر اس جہاز سے تین قریب دہ پہ ۔۔۔ ریائی کا فوارہ اچھلتا دکھائی دیا اور اسے دیکھتے ہی جہاز کے تین سب سے بلند مستولوں سے تین خوفناک چیخیں بلند ہوئیں جیسے وہ شعلوں کی زبان سے نکل رہی ہوں

"منہ در منہ میں تجھ سے ملتا ہوں! اب تیسری بار۔۔۔۔۔۔ موبی ڈک۔ عرشے پر۔۔۔۔ تیز چلاؤ۔۔۔۔۔۔ ہوا کے جگر کو چیرتے ہوئے جہاز کو نکال لے چلو۔۔۔۔۔۔۔۔ ابھی رفتار بہت سست ہے مسٹر استار بک۔۔۔۔۔۔ بادبان لٹک رہے ہیں انہیں اور تانو کھینچ لو۔۔۔۔۔۔ وہ بہت تیز جا رہی ہے اور مجھے اسے فوراً جالینا ہے لیکن مجھے ایک نظر اور اسے دیکھ لینے دو۔۔۔۔۔۔۔۔ ابھی بہت وقت ہے۔۔۔۔۔ وہی پرانا قدیم منظر۔۔۔۔۔۔ اور پھر بھی۔۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں۔۔۔۔۔۔ بالکل نیا نیا سا۔۔۔۔ عجیب و غریب۔۔۔۔۔ جب سے کہ میں نے اسے پہلی بار دیکھا۔ جھلک میں ایک بچہ تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہی! وہی۔۔۔۔ بالکل وہی۔ نوح کے زمانے کی وہی جو میرے لئے۔۔۔۔۔۔ ہوا کے دوسری طرف مدھم پھوار ۔۔۔۔۔۔ ایسی مدھم پھوار۔۔۔ کہ

کہیں اور رہنمائی کرنی چاہیئے۔ کسی ایسی دنیا کی طرف جو عام دنیا سے مختلف ہو۔ جہاں کھجوروں کے ہرے بھرے جھنڈ ہوں۔۔۔۔ ہوا کے رخ پر وہیل جا رہی ہے۔۔۔ ہوا کے رخ پر دیکھو۔۔۔۔۔۔ اس سے مقابلے کے لئے بدترین مقام بھی بہترین ہو گا۔۔۔۔ لیکن خدا حافظ، خدا۔۔ حافظ میرے پرانے مستولیو۔۔۔۔ یہ کیا ہے؟ سبز؟ ارے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کائی کے ٹکڑے۔۔۔۔۔۔ اس جگہ پر ؟ اھاب کے دماغ پر اب ایسا کوئی ہرا بھرا منظر نہیں چھا سکتا انسان کی بوڑھی عمر اور مادی اشیاء میں فرق ہے۔ بوڑھے مستول! ہم دونوں ساتھ بوڑھے ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ہمارے جسم مضبوط ہیں کیا ایسا نہیں ہے میرے جہاز؟ ہاں اس جسم میں کیا نہیں ہے۔ صرف ایک ٹانگ ہی تو نہیں ہے۔ بس لیکن خدا کی قسم یہ مردہ لکڑی کی ٹانگ، یہ مردہ لکڑی۔۔۔۔۔۔۔ میرے زندہ گوشت سے بہتر ہے۔ میں اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا اور میں نے بے جان درختوں سے بنے ہوئے جہازوں کو انسانوں سے زیادہ پائیدار دیکھا ہے ان انسانوں سے جو اپنے باپ کی سب سے اہم چیز سے جنم پاتے ہیں۔ وہ کیا تھا جو اس نے کہا تھا؟ وہ اب بھی میرے سامنے جائے گی میرے کپتان اور پھر نظر آئے گی! لیکن کہاں؟ اگر میں یہ لاتعداد سیڑھیاں اتر جاؤں اور تمام رات اس کے پیچھے دوڑتا رہا ہوں جہاں کہیں بھی وہ غوطہ لگائے میں بھی جاؤں تو کیا میں اسے سمندر کی تہہ میں دیکھ سکوں گا؟ ہاں بہتوں کی طرح تو نے بھی ہولناک بات کہی ہے اے وہیل! لیکن اھاب یہاں تیرا دلدادہ پڑ گیا۔ خدا حافظ! مستول کے نگہبانو۔ وہیل پر کڑی نظر رکھو جب تک میں لوٹ نہ آؤں اب ہم کل باتیں کریں گے نہیں آج رات ہی کو جب وہ سفید وہیل معہ اپنی دم اور سر کے میرے جہاز سے بندھی ہو گی"

اس نے حکم دیا اور اسی طرح چاروں طرف دیکھتا ہوا وہ مستول سے نیچے اتار لیا گیا۔ کشتیاں جہاز سے سمندر میں اتاری گئیں اور اھاب نے اپنی چھوٹی کشتی کے پچھلے سرے پر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلائے اور پھر جہاز کے نائب کپتان کو رک جانے کا حکم دیا گیا۔

"اسٹاربک!"

"جی"

"تیسری بار میری روح کا جہاز اس سفر کے لئے روانہ ہو رہا ہے اسٹاربک!"

"جی جناب آپ کا یہی حکم ہے"

"کچھ جہاز بندرگاہ سے نکل کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتے وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتے اسٹاربک!"

"بجا ارشاد۔ بڑی المناک حقیقت ہے"

"کچھ لوگ جوار بھاٹا میں مر جاتے ہیں۔ کچھ چھچلے پانی میں، کچھ لوگ طغیانی میں، اور اب میں محسوس کر رہا ہوں جیسے میں ایک زبردست موج ہوں جو ایک طغرے کی شکل میں اٹھ رہی ہے۔ اسٹاربک! میں بوڑھا ہوں۔ ہاتھ ملاؤ دوست!"

ان کے ہاتھ ملے، ان کی آنکھیں چار ہوئیں اسٹاربک کی دھندلی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اے میرے کپتان، میرے کپتان، شریف دل کپتان۔ مت جا مت جا، دیکھو یہ ایک بہادر انسان ہے۔ جو اشکبار ہے۔ پھر اس ترغیب کی اذیت کتنی زبردست ہو گی"

"نیچے لے جاؤ" اھاب اسٹاربک کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے چیخا: "ملاحوں کے ساتھ کھڑے رہو"

اور دوسرے ہی لمحے اس کی کشتی جہاز کے پشت کی طرف پھسلنے لگی "شارک! شارک!" لوہے جیسی کے دریچوں سے چیخا: "آقا۔ میرے آقا واپس آ جاؤ"

لیکن اھاب نے کچھ نہ سنا کیونکہ اس وقت اس کی اپنی آواز کی گھن گرج گونج رہی تھی اور کشتی آگے بڑھتی رہی۔ پھر بھی وہ آواز ٹھیک تھی کیونکہ جیسے ہی وہ جہاز سے علیحدہ ہوا تھا بیشمار شارکیں جو بظاہر جہاز کے نیچے پانی کی اتھاہ گہرائیوں سے امنڈ آئی تھیں اور بری طرح پانی میں ڈوبتے چپوؤں کے سروں پر دانت مارنے لگیں۔ ان بے کراں سمندروں میں وہیل کا شکار کرنے والے جہازوں کے ساتھ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ شارک اکثر ان کا پیچھا اسی پیش بینی کے ساتھ کرتی ہیں جیسے مشرقی ممالک میں بڑھتی ہوئی فوجوں کے ساتھ گدھ [illegible]

کرتے رہتے ہیں۔لیکن یہ شارکوں کا پہلا غول تھا جو سفید وہیل کو دکھائی دینے کے بعد پکاڈ کے قریب آئی تھیں خواہ اس کی وجہ یہی کیوں نہ ہو کہ اھاب کے ملاح سب کے سب چیتے کے رنگ کے پیلے جسموں والے تھے۔ جن کے بدن سے اٹھنے والی مہک شارکوں کو بہت پسند تھی۔۔۔ایسا اکثر ہوتا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو۔ وہ سب کی سب اسی ایک کشتی کا پیچھا کر رہی تھیں جیسے اور دوسری کشتیوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

"اے تپے ہوئے لوہے کے دل"! اسٹاربک دور ہوتی ہوئی کشتیوں کو دیکھ کر بڑبڑایا۔"کیا تیری آنکھیں اب بھی نہیں کھلتی ہیں؟ تو نے اپنی کشتی کو ان گوشت خور شارکوں کے درمیان اتار دیا ہے اور وہ منہ کھول کر تیرا پیچھا کر رہی ہیں۔ اور پھر یہ خطرناک تیسرا دن! کیونکہ جب تین دن کے بعد دیگرے کسی مہم کا تندہی سے پیچھا کرنے میں لگیں تو سمجھ لو کہ پہلا دن صبح ہے، دوسرا دوپہر اور تیسرا شام اور اس کا انجام؟ انجام کیا ہوگا؟ اے میرے خدا! وہ کون سی لہر ہے جو بار بار میرے اندر تمام چیزوں کو چیرتی ہوئی اٹھتی ہے اور پھر مجھے موت کی طرح پرسکون لیکن منتظر چھوڑ دیتی ہے۔ میں دہشت کی منتہا پہ پہنچ رہا ہوں۔ مستقبل کے واقعات میرے سامنے تیر رہے ہیں جیسے وہ بے معنی لکیریں اور ڈھانچے ہوں سارا ماضی نہ جانے کیوں دھندلا سا گیا ہے۔ میری، میری میری تو میرے پیچھے زندہ عظمتوں میں مرجھا رہی ہے۔ لڑکے! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تیری آنکھیں انتہائی نیلگوں ہو گئی ہیں۔ زندگی کے پراسرار ترین مسئلے صاف ہوتے نظر آ رہے ہیں لیکن بادل ان کے درمیان دوڑتے ہیں۔ کیا میرے سفر کی منزل آ رہی ہے؟ میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اس شخص کی طرح جو تمام دن چلتا رہا۔ اپنا دل دیکھ! کیا یہ اب بھی دھڑک رہا ہے؟ متحرک ہو اسٹاربک! اسے دور کر دے۔ چل، پھر چلا۔ اے مستول کے نگہبان کیا تو پہاڑی پہ میرے بچے کا ہاتھ دیکھ رہا ہے؟ پاگل امداد پہ۔ ہاں! اپنی عقابی نگاہیں کشتی پہ جمائے رکھو وہیل کو اچھی طرح دیکھتے رہو۔ لے۔ پھر۔ اس باز کو بھگا دو!

دیکھو! وہ جو چونچیں مار رہا ہے۔ اسے وہ مرغ باد نما کو پھاڑے ڈال رہا ہے۔" اس نے اس سرخ پرچم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو سب سے اگلے مستول پہ لہرا رہا تھا۔ "اسے وہ اسے لے اڑا۔ بڈھے اب تو کہاں ہے؟ کاش تو نے یہ منظر دیکھا ہوتا۔ اھاب! تو کانپ کانپ اٹھتا!"

کشتیاں ابھی زیادہ دور نہ گئی تھیں جب سب سے بلند مستول کے اشارے، ایک جھکتے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر اھاب سمجھ گیا کہ وہیل پھر ڈوبی ہے لیکن اس خیال سے کہ جب وہ دوسری بار ابھرے تو وہ اس سے قریب تر ہو وہ جہاز سے دوسری طرف ہٹ کر بڑھتا گیا اور جب سامنے سے آنے والی موجیں کشتی کی کمان سے ٹکرا رہی تھیں تو ملاح بالکل سحر زدہ کھڑے تھے۔

"جھاڑو، اپنے ناخن، او سمندر کی موجو! اپنی پوری قوت اس پہ صرف کرو۔ لیکن تم ایک ایسی چیز پر وار کر رہی ہو جس پہ کوئی ڈھکن نہیں، کوئی ڈھال نہیں، کوئی تابوت۔۔۔اور کوئی تابوت گاڑی میرے لئے نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ صرف سفید وہیل مجھے مار سکتی ہے۔ ہا ہا!"

یکایک ان کے گرد پانی اوپر اٹھنے لگا۔ پانی بڑے بڑے دائروں میں اوپر اٹھ کر پھر ان کے چاروں طرف گر رہا تھا۔ جیسے کوئی ڈوبی ہوئی برف کی چٹان اوپر سطح کو آ رہی ہو۔ ایک ہلکی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی اور سب نے اپنا سانس روک لیا۔ جیسے ہی رسیوں، بھالوں اور برچھیوں سے اٹا ہوا ایک مہیب جسم لمبا لمبا سمندر کی سطح سے نکل کر کھڑا ہونے لگا۔ کہر کی پھٹتی ہوئی چادر میں تن کر، شام کی جھلملی ہوا میں ایک لمحہ کے لئے لہرایا اور پھر سمندر کی سطح میں بڑے زور کے ساتھ ڈوب گیا تیس فٹ کا جب یہ ابھرا ہوا جسم پھر پانی کی چادر پہ گرا تو سطح سمندر سے بے شمار فوارے ابل کر بارش کے ننھے ننھے قطروں کی طرح واپس سطح سمندر پہ گرنے لگے اور ڈوبتی ہوئی وہیل کے اردگرد تازے دودھ کے دائرے سے بن گئے۔

"بڑھاؤ" اھاب ملاحوں پر گرجا اور کشتی حملے کے لئے آگے بڑھنے لگی لیکن کل کے حملوں اور برچھیوں کے زخموں سے چور ہونے کی وجہ سے موبی ڈک کے اندر معلوم ہوتا تھا کہ سارے فرشتوں کی قوت جمع ہو گئی تھی اس کی شفاف کھال کے نیچے چوڑی سفید پیشانی پہ بے شمار معمولی سوئی ہوئی نسیں الجھی ہوئی رسی کی طرح گتھی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ سر کے رخ پہ

کشتیوں کے درمیان اپنی دم پھڑپھڑاتی ہوئی آئی اور ایک مرتبہ پھر انہیں منتشر کر دیا۔ وہ دونوں کشتیوں سے پھینکے ہوئے رسی بندھے بھالوں اور برچھوں کو جھٹکتی ہوئی اور ان کی کشتیوں کے اگلے سرے سے ٹکراتی ہوئی اھاب کی کشتی کو بالکل نظر انداز کر کے گزر گئی۔

ڈیگو اور کوئیکیگ کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختوں کو درست کر رہے تھے اور جب وہیل ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی یکایک مڑی اور اس کا پورا ایک رخ نمایاں ہوا تو ایک زبردست شور اٹھا۔ مچھلی کی پشت کے گرد اور اس کے چاروں طرف کل سے پھنسے ہوئے بیشمار برچھے اور رسیاں جگہ جگہ لپٹی ہوئی تھیں جس سے اس کا نصف بدن بالکل زخمی ہو گیا تھا اس کا سیاہ جامہ تار تار ہو گیا تھا جبکہ اس کی چھپی ہوئی آنکھیں اھاب سے چار ہوئیں۔

اھاب کے ہاتھ سے برچھا گر گیا۔

'احمق، بیوقوف، وہ ایک لمبا سانس لیتے ہوئے چلّایا" ہاں ڈمپل! میں تجھے پھر دیکھتا ہوں۔ ہاں۔ اور تو آگے جا رہی ہے۔ یہ وہ تابوت گاڑی ہے جس کا تو نے وعدہ کیا تھا لیکن میں تیری بات کو اس کے آخری حرف تک پورا کروں گا۔ ملاحو! جہاز کو لوٹو۔ وہ کشتیاں بیکار ہیں۔ انہیں جلد از جلد درست کر لو اگر تم کر سکتے ہو اور پھر میرے پاس واپس آ جاؤ نہیں تو اھاب تنہا مرنے کے لئے کافی ہے۔ میں اس پہلی چیز پر جو اس کشتی سے ٹکرانے کی کوشش کرے گی برچھا چلاؤں گا۔ تم دوسرے مختلف انسان نہیں ہو بلکہ میرے ہاتھ اور میرے پیر ہو اس لئے میرا حکم مانو۔ وہیل، کہاں ہے؟ پھر ڈوب گئی!"

لیکن وہ کشتی کے کافی قریب نظر آئی۔ جیسے وہ اپنے زخمی جسم کے ساتھ بھاگ جانا چاہتی ہو اور جیسے اس آخری مقابلے کی وہ مخصوص جگہ محض اس کے بھاگ نکلنے والے سفر کے راستے کی تلاش ہو۔

موبی ڈک بہت تیزی کے ساتھ آگے تیر رہی تھی اور تقریباً جہاز سے ہو کر گزر گئی تھی۔ کیونکہ جہاز اب تک اس کے مخالف سمت کو چل رہا تھا اگرچہ وقتی طور پر اس کا سفر رک گیا تھا۔ وہ اپنی پوری قوت سے تیرتی نظر آ رہی تھی اور اب ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے سیدھے راستے پر چلی جانا چاہتی ہو۔

"لے اھاب" اسٹاربک چلایا "اب بھی وقت ہے۔ یہ تیسرا دن، رک جا باز رہ۔ آہا، موبی ڈک تو تیرے پیچھے نہیں پڑ رہی بلکہ تو ہے جو موبی ڈک کے پیچھے پاگلوں کی طرح پڑا ہے"۔

سمندر کی تیز ہوا کے رخ پر بادبان لگاتے ہوئے کشتی طرح چل رہی تھی۔ اور آخر کار جب وہ کبھی جہاز سے اس قدر ہو کر گزری کہ اھاب جہاز کی ریلنگ پر جھکے ہوئے اسٹاربک کا چہرہ بخوبی دیکھ سکتا تھا اس نے حکم دیا کہ وہ جہاز کو موڑ کر اسکے پیچھے آئے۔ تیزی سے نہیں۔ آہستہ آہستہ۔ اوپر کی جانب اس نے ٹیشٹیگو، ڈگو اور کوئیکیگ کو مستولوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا جبکہ ملاح دونوں کشتیاں جہاز سے باندھ کر اس کی مرمت کر رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے اس جہاز کے دریچوں سے اسٹب اور فلاسک کو عرشے پر بھالوں اور ... سے مشغول دیکھا۔ جب اس نے یہ سب دیکھا؟ جب اس نے ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں ہتھوڑوں کی کھٹ کھٹ سنی تو اس نے محسوس کیا جیسے بہت سے ہتھوڑے اس کے دل میں کیلیں ٹھونک رہے ہوں لیکن اس نے ہمت باندھی اور یہ دیکھ کر کہ سب سے اگلے مستول سے اس کا سرخ پرچم غائب ہے اس نے ٹیشٹیگو کو حکم دیا کہ وہ نیچے سے ایک دوسرا پرچم ہتھوڑا اور کیل لیکر جائے اور پرچم کو اس کی جگہ ٹھونک دے۔

خواہ تین دن کی مسلسل بھاگ دوڑ اور جسم میں گھسے ہوئے برچھوں کی تکلیف سے یا کسی پنہاں عیاری اور مکاری کی وجہ سے، جو کچھ بھی ہو سفید وہیل کی رفتار کم ہونے لگی کیونکہ کشتی اب اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی حالانکہ پہلے وہیل کافی فاصلے پر تھی۔ اور اھاب جو لہروں پر پھسلتا ہوا جا رہا تھا اب بھی بے رحم شارکوں کے نرغے میں تھا جو چپوؤں کے سروں کو ہمیشہ دانتوں سے کتر رہی تھیں اور چپوؤں کی دھار بار بار دندانے دار اور کند ہوتی جا رہی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر علیحدہ ہو رہے تھے۔

"ان کی پرواہ مت کرو۔ ان دانتوں کی بجائے اپنے چپوؤں کے سرے کو بدل دو۔ یہ آرام کی بہتر شکل ہے۔ شارک کے جبڑے نرم پانی سے بہتر ہیں"۔

"لیکن جناب ہر مرتبہ اس کی پتلی دھار پتلی اور چھوٹی ہوتی۔

جلدی ہے ۔۔۔

"فکر نہ کرو۔ ابھی یہ کافی دیر تک کام آسکتے ہیں۔ چلے چلو۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے۔" احاب بڑبڑایا۔ "کہ یہ شارک وہیل کا گوشت کھانے جا رہی ہیں یا اخاب کا؟ لیکن چلے چلو۔ ہاں میرے زندہ دلو اب ہم اس سے قریب ہو رہے ہیں۔ چپو۔ چپو اٹھاؤ۔ مجھے جانے دو۔" اور یہ سن کر دونوں چپو چلانے والوں نے اسے کشتی کے سامنے کے سرے میں چلا جانے دیا جبکہ کشتی ادھی چلی جا رہی تھی۔

آخر شں جب جہاز ایک طرف موڑ دیا گیا اور سفید وہیل کے پہلو بہ پہلو چلنے لگا تو وہ حیرت انگیز طور پر اس سے غفلت برتنے لگی اور اخاب اب تقریباً اس دھواں نما کہر کے پہاڑ کے اندر جا چکا تھا جو وہیل کے منہ سے فواروں کی طرح نکل کر دائرے بناتا ہوا اس کے سفید کوہان پر گر رہا تھا۔ وہ اس سے اس قدر قریب تھا۔ تب اخاب نے اپنے جسم کو نیم دائرائی شکل میں پیچھے کی طرف موڑ کر دونوں ہاتھو کو ہوا میں بلند کرتے ہوئے اس نے پوری قوت سے اپنا خوفناک برچھا اور اس کے ساتھ ہی اس سے زیادہ خوفناک بددعا وہیل پر پھینکی۔ جیسے ہی کہ بددعا اور برچھا دونوں اپنی انتہا تک اس میں گھسے جیسے وہ کسی دلدل میں گھس رہے ہوں موبی ڈک انتہائی کرب کے ساتھ ایک طرف کو مڑی اور بڑے تشنج کیساتھ اپنے پورے جسم کو کشتی کے سامنے لائی اور بلا کسی توقف کے یکا یک اسے اس طرح اچھالدیا کہ اگر اخاب نے کشتی کے بالائی کنارے کو پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ ایک بار پھر سمندر میں جا گیا ہوتا۔ لیکن کشتی کے تینوں چپو باز جو مچھلی کے اس حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھے سمندر میں اچھل کر جا پڑے لیکن گرتے ہی ان میں سے دو نے فوراً تیر کر کشتی کے بالائی حصہ کو پکڑ لیا اور ایک لہر کے سہارے اٹھ کر کشتی میں آگئے لیکن تیسرا جو کشتی کے پیچھے گرا تھا اسی طرح بہتا اور تیرتا رہا۔

تقریباً اسی وقت ایک زبردست قوت ارادی اور بے پناہ عجلت کے تحت سفید مچھلی طوفان زدہ سمندر کو چیرتی ہوئی چلی لیکن جب اخاب نے ملاحوں کو کشتی موڑ کر مچھلی سے قریب تر کرنے کو کہا تو لائن اس قدر تن گئی تھی کہ دو چٹاخ سے ٹوٹ گئی۔

"میرے اندر کیا ٹوٹ رہا ہے۔ کوئی پٹھا چڑ رہا ہے۔ یہ پھر جڑ جائیگا! چپو چلاؤ۔ جلدی چپو۔ اس پر ٹوٹ پڑو۔"

سمندر کے سینے کو چیرتی ہوئی کشتی کا بے پناہ شور سن کر وہیل مڑی اور اس کی صاف پیشانی سامنے تھی لیکن اس موڑ مڑتے وقت اس نے ہر لحظہ قریب تر ہوتے ہوئے جہاز کو دیکھ لیا اور شاید اسے سمجھ لیا کہ یہ ہی مصیبتوں اور ساری آفتوں کی جڑ ہے اسی لئے یا اسے بڑا اور زیادہ طاقتور دشمن سمجھ کر وہ اس کے بڑھتے ہوئے رخ پر اپنے منہ سے جھاگ کا طوفان اٹھاتی ہوئی چلی۔

"آہ! اب لڑکھڑایا۔" اس نے اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر مارا۔ "میں اندھا ہو رہا ہوں۔ ساتھیوں مجھے اپنے ہاتھوں کا سہارا دو تاکہ میں راستہ پا سکوں۔ کیا رات ہو گئی ہے؟"

"وہیل! جہاز" کشتی سے چپکے ہوئے ملاح نے کہا۔

"چپو۔ چپو۔ اے سمندر۔ قبل اس کے کہ وقت نکل جائے تو اسی اتھاہ گہرائیوں میں غرق نہ کر تاکہ اخاب آخری۔ آخری بار اپنے نشانے پر وار کر سکے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ جہاز۔ جہاز۔ آگے بڑھو۔ میرے ساتھیو۔ کیا تم جہاز کو نہ بچا سکو گے؟"

لیکن جوں ہی ملاحوں نے پوری قوت سے کشتی کو پرے تھپیڑ سمندر میں چلایا تو شارک کے ضرر پہنچاتے ہوئے تختے چیخ گئے اور ایک لمحے میں وہ ٹوٹی کشتی لہروں پر پڑی نظر آئی اس کے ڈوبتے ہی ملاح پوری قوت سے اس میں سے پانی نکالنے لگے

اسی دوران میں اس لمحہ کے لئے ٹیشگو کا ہتھوڑا اس کے ہاتھ میں رک کر رہ گیا اور اس سرخ پرچم نے چادر کی طرح اسکے نصف جسم کو لپیٹ لیا اور اسی وقت اسٹاربک اور اسٹب نے اس عجیب بلا کو آتے دیکھا۔

"وہیل۔ وہیل۔ چپو اٹھاؤ۔ چپو اٹھاؤ۔ اے ہوا کی تمام نیک قوتو۔ مجھے اب اچھی طرح لپیٹ لو۔ اسٹاربک کو اگر مرنا ہے تو اسے ایک عورت کے مدہوش غصے سے مت مرنے دو۔ چپو اٹھاؤ۔ میں کہہ رہا ہوں۔ احمقو۔ جبڑا۔ جبڑا۔ کیا میری تمام دلدوز دعاؤں کا انجام ہے۔ میری ساری زندگی کی عقیدت اور وفاداری کا؟۔۔۔۔ آہ اخاب۔ اخاب۔ یہ تیرا کام ہے۔ مستعد رہو۔ چپو چلانے والو مستعد رہو۔ نہیں نہیں۔ اور اوپر اٹھاؤ۔ وہ ہم پر جھپٹ کے [illegible]

ہے۔ آہ۔ اس کی خوفناک بھویں میری طرف تنی ہوئی تھیں۔ میری طرف جب کے فرض کا مطالبہ ہو کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ میرے خدا۔ میرا ساتھ دے۔ میرے ساتھ کھڑا رہ۔"

"میرے ساتھ نہ کھڑا ہو! میرے پیچھے کھڑا ہو۔ تو کون ہے جو اسٹب کی اب مدد کرے گا کیونکہ اسٹب بھی اسی مقام پر ہے میں تجھ پر مسکراتا ہوں۔ مسکراتی ہوئی وہیل۔ کس نے اسٹب کی مدد کی ہے یا۔ اسٹب کو بے خواب رکھے ہے مگر اس کی اپنی نہ بند ہونے والی آنکھوں نے اور اب بیچارہ اسٹب ایک بہت ہی ملائم قالین پر سونے جا رہا ہے کاش! اس میں کانٹے بھرے ہوتے۔ میں تجھ پر مسکراتا ہوں مسکراتی ہوئی وہیل۔ اے سورج چاند اور ستارو دیکھو۔ میں تجھ کو قاتل قرار دیتا ہوں ایک ایسے اچھے انسان کا؟ ان تمام باتوں کے باوجود میں تجھ سے جام ٹکرانے پر تیار ہوں بشرطیکہ تو جام اٹھا لے۔ اوہ! اوہ! اوہ! اے ہنستی ہوئی وہیل! لیکن بہت جلد ہی تو بہت کچھ ہڑپ کر لیگی۔ اے اھاب تو کیوں نہیں بھاگ چلتا۔ میری خاطر اپنے جوتے اتار لے اور بھاگ جا اور اسٹب کو اپنے لباس میں مرنے دے۔ ایک بہت ہی کھچ پٹی ہوئی اور نمکین موت۔ اگرچہ ———— شاہ دانے، شاہ دانے، شاہ دانے اے فلاسک جہاں ہم سب ایک سرخ آوچے کے لئے مر رہے ہیں۔ اسٹب نے کہا۔

"شاہ دانے؟ میری اب صرف یہ تمنا ہے کہ ہم سب وہاں ہوتے جہاں شاہ دانے پھلتے ہیں۔ اے اسٹب۔ مجھے امید ہو کہ میری دکھیا ماں نے میری تنخواہ اس وقت سے پہلے ہی لے لی ہوگی۔ اب اسے چند ٹکے ہی ملیں گے کیونکہ سفر ختم ہو گیا۔" فلاسک بولا۔

جہاز کے عرشہ کی دیوار سے تقریباً سارے ملاح لپٹے ہوئے تھے ہتھوڑے، لکڑی کے تختوں کے ٹکڑے۔ بھالے اور برچھے اپنے ہاتھوں میں عادتاً پکڑے ہوئے بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنی کارگزاریوں سے چپٹے ہوئے ...... ان سب کی مسحور نگاہیں وہیل پر گڑی ہوئی تھیں جو حملہ آور ہوتے ہوئے اپنے سر کو عجیب انداز میں دائیں اور بائیں لہراتی ہوئی سفید جھاگ کا ایک زبردست فوارہ نیم دائراتی شکل میں ہوا میں بلند کر رہی تھی۔ مکافات، شدید انتقام، ابدی خباثت اس کے پورے وجود میں سرایت کی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور ان تمام دفاعی تدابیر کے باوجود جو فانی انسان کر رہے تھے اس نے اپنی پیشانی کے سفید اور ٹھوس پشتے کو جہاز کے دائیں طرف اس زور سے ٹکرایا کہ جہاز کے آدمی ڈگمگا گئے اور تختے چرچرا رہے تھے۔ کچھ اوندھے منہ گر گئے ایک ملٹے ہوئے ٹرک کی طرح جسکی پہیاں ناچ رہی ہوں۔ برچھا بردازوں کے سران کی سانڈ جیسی موٹی موٹی گردنوں پر ہلنے لگے۔ جہاز کی پھٹی ہوئی دراڑوں سے انھوں نے پانی کے ابلنے کی آواز سنی جیسے کوئی پہاڑی نالہ چوٹی سے گھڑگھڑاتا ہوا بہہ رہا ہو۔

"جہاز۔ تابوت۔ دوسرا تابوت۔" اھاب اپنی کشتی سے چیخا۔ "اس کی لکڑی یقیناً امریکن ہوگی۔"

ڈوبتے ہوئے جہاز کے نیچے غوطہ لگاتی ہوئی وہیل اس کے پیندے سے لگتی ہوئی گذری اور پانی کے اندر ہی اندر مڑتی ہوئی بڑی تیزی کے ساتھ جہاز کے دوسرے کنارے سے کافی دور مگر اھاب کی کشتی سے بالکل قریب ابھری اور کچھ دیر تک خاموش رکی رہی۔

"میں اپنا جسم سورج سے پھیرتا ہوں۔ کیا ہے؟ شیبگو۔ میں تیرے ہتھوڑے کی کھڑک سننا چاہتا ہوں۔ اے میرے تین ناقابل تسخیر بنا دینے والے جہاز کے زیریں حصوں اور اے خدا کے مارے ہوئے ڈھانچے، تیرا ٹھوس عرشہ، تیری مغرور بلندیاں اور تیری نکیلی پیشانی لئے فنا میں تیرتے ہوئے جہاز! کیا تیری تباہی ضروری ہے اور بلا میرے! کیا میں تباہ شدہ جہازوں کے ذلیل ترین کپتانوں کی ہی پسندیدہ ترین تمکنت سے محروم رہ جاؤں گا؟ اے اکیلی زندگی کی تنہا موت؟ اوہ! یہ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میری عظیم ترین عظمت میرے شدید ترین غم میں پنہاں ہے۔ ہو ہو سے میری تمام گذری ہوئی زندگی کی بے لطیاں موجو اپنی بعید ترحدود سے نکل آؤ اور مواج ہو جاؤ۔ اور میرے اس موت کے فرشتے سے سبقت لیجاؤ۔ میں تیری طرف آرہا ہوں۔ اے سب کو مٹانے والی لیکن فتح نہ پانے والی وہیل! میں آخری بار تجھ سے الجھتا ہوں اور جہنم کے قلب سے تجھے نیزہ مارتا ہوں اور انتہائی نفرت سے تجھ پر تھوکتا ہوں۔ سارے تابوت اور تابوت برداروں کو ایک ہی جگہ ڈوبنے دے اور چونکہ ان میں سے کچھ بھی میرے مقدر میں نہیں ہے اس لئے مجھے پارہ

پارہ ہو جانے دے اس وقت جبکہ میں تیرا پیچھا کر رہا ہوں اے مردود میں اس طرح میں تجھے برچھا مارتا ہوں "

برچھا پھینکا گیا۔ چوٹ کھائی ہوئی وہیں لگے کو لگی، اور دار خالی گیا اور برچھے کی دم سے بندھی لمبی اور موٹی رسی الجھ گئی۔ اھاب اسے سلجھانے کے لئے جھکا۔ اس نے اسے سلجھا دیا لیکن وہ خود رسی کے پھیر میں آ گیا رسی اس کے گلے میں ایک پھندے کی طرح پھنس گئی اور وہ ایک جھٹکے میں سمندر میں جا پڑا۔ جیسے سمندر کی کسی قوت نے اس کے گلے میں پھندا ڈال کر اسے جھٹک دیا ہو۔ قبل اس کے کہ کشتی کا عملہ یہ جان پاتا کہ وہ کر گیا ہے رسی کے سرے کا بھاری دائرہ اس کھبے سے نکل گیا جس میں اسے پھنسایا گیا تھا اور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں رسی ڈوبتی چلی گئی۔

ایک لمحہ کے لئے حیرت زدہ ملاح خاموش کھڑے رہے۔ کچھ مڑے "ہمارا عظیم خدا، جہاز کہاں ہے؟" اور جلد ہی شام کے دھندلکے میں انہوں نے اس کا ہیولا دیکھا۔ جہاز ڈوب چکا تھا۔ صرف اس کے تین بلند مستول پانی کی سطح پہ ہر لحظہ چھوٹے ہوتے نظر آ رہے تھے اور حیرت یا وفاداری یا عقل کے بدولت ان تینوں مستولوں سے چپکے ہوئے اب بھی کبھی بیٹھے نظروں سے سمندر کی ..... نگرانی کر رہے تھے۔ اور اب وہ اکیلی کشتی گرداب میں تھی اور اس کا تمام عملہ اور ہر تیرتا ہوا چپو اور ہر برچھا اور رسی کے تمام ڈھیر اور تمام جاندار اور بے جان چیزیں ایک ہی بھنور میں چکراتی ہوئی سمندر کی تہہ میں چلی گئیں۔

اور جب کہ جہاز کے مستولوں سے چپکے ہوئے نوجوانوں کے سر سے پانی قریب ہونے لگا تھا اور جہاز کے پھٹے ہوئے بادبان سطح پر تڑپ رہے تھے اور اوپر نیچے ہوتی ہوئی موجوں کی آغوش میں جھول رہے تھے اسی وقت ایک سرخ ہاتھ میں ہتھوڑا اٹھا اور ڈوبتے ہوئے مستول پر اھاب کا سرخ پرچم ٹھونکنے چلا۔ ایک باز جو ستاروں کے جھنڈ سے نکل کر جانے کہاں سے جہاز کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا جھنڈے پر چونچ مارنے اور شبنگو کی مزاحمت کرنے لگا۔ یکایک اس کا بازو مستول اور ہتھوڑے کے درمیان آ گیا۔ اور اسی وقت ہتھوڑا پورے زور سے اس پر پڑا اور ڈوبتے ہوئے وحشی نے اپنا ہتھوڑا وہیں جمائے رکھا اور اس طرح آسمان کا یہ پرندہ اپنی بے پناہ چیخوں کے ساتھ اپنی شاہانہ چونچ اوپر اٹھائے ہوئے اپنا پورا جسم، اھاب کے پرچم میں لپیٹے ہوئے ڈوبتے ہوئے جہاز کے ساتھ ڈوب گیا شیطان کی طرح جو جہنم میں اس وقت تک جانے پر راضی نہ ہوا جب تک اس نے جنت کا بھی ایک حصہ اپنے ساتھ نہ گھسیٹ لیا۔ پیکاڈ ڈوب گیا۔

اب چھوٹے چھوٹے طیور اس مہیب غار پر اڑ رہے تھے جو جہاز کے ڈوبنے سے سطح پر چند لمحوں کے لئے بن گیا تھا۔ ایک پرسکون سفید جھاگ ابھرنے لگا۔ پھر سب مٹ گیا اور سمندر کا عظیم کفن بہنے لگا جیسے یہ پانچ ہزار سال قبل بہہ رہا تھا۔

شوکت تھانوی •

غلطی میری ہی تھی!

مباحثہ : شوکت تھانوی ، زہرہ شوکت تھانوی

شوکت :۔ سوال یہ ہے کہ اگر میاں اور بیوی میں صحیح ذہنی رابطہ نہیں ہے تو قصور کس کا ہے؟

زہرہ :۔ اگر مان لے تو میاں کا ورنہ بیوی کی قسمت کا۔

شوکت :۔ گویا دونوں صورتوں میں اگر نہیں ہے تو بیوی کا قصور۔ اسلیئے کہ بیوی ہوتی ہے عورت، اور عورت نے تاریخ عالم میں آج تک کبھی اپنے قصور کو قصور نہیں کہا۔ آپ ہی پر منحصر نہیں ہے میں تو اس عورت کے عورت پن کی طرف سے مشکوک ہوجاتا ہوں جو مجھ کو اعتراف کے آس پاس بھی نظر آئے۔ جو اعتراف کرلے وہ عورت ہی کیا۔

زہرہ :۔ انتظار کر رہی ہوں کہ آپ دم لیں تو میں بھی کچھ عرض کردوں۔

شوکت :۔ یہ تو خیر دم دلاسے کی بات ہے بہرحال فرمایئے میں چپ ہوں۔

زہرہ :۔ طے یہ کرنا ہے کہ اپنے رنگ میں کون کس کو رنگے۔ میاں بیوی کو یا بیوی میاں کو؟

شوکت :۔ یہ تو معاملات پر منحصر ہے دونوں میں سے جس کا رنگ چوکھا ہوگا وہی رنگے گا اپنے رنگ میں۔

زہرہ :۔ میں تمام دنیا کی بات نہیں کرتی اپنی اور میری مثال ہی لے لیجئے

شوکت :۔ چلیئے یہی سہی، مگر انصاف شرط ہے۔ خدا کو حاضر وناظر جان کر بتایئے گا کہ میں نے ہمیشہ اپنے کو آپ کی مرضی کے عین مطابق بنانے کی کوشش کی ہے یا نہیں؟

زہرہ :۔ کوشش کریں آپ کے دشمن مدعی، میں تو یہ جانتی ہوں کہ میں ہمیشہ آپ کے چشم و ابرو کو دیکھتی رہی ہوں کہ اس وقت سرکار کی مرضی کیا ہے۔

شوکت :۔ خیر یہ تو آپ سے زیادہ شاید مجھ کو کرنا پڑا تلبیہ مگر مجھ کو اسکا اعتراف ہے کہ میں آپ کے چشم و ابرو کی عبارت پڑھنے میں ہمیشہ دھوکا ہی کھاتا ہوں۔

زہرہ :۔ دھوکا آپ اس لئے کھاتے ہیں کہ عینک آپ ہی کی ہوتی ہے۔ مرد کی یہی تو زبردستی ہے کہ وہ عورت کی وہی منشا دیکھنا چاہتا ہے جو خود اس کی ہو۔

شوکت :۔ یہ سراسر اتہام ہے۔ کم سے کم میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔

زہرہ :۔ یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ ان مردوں میں سے نہیں ہیں۔۔۔ بہرحال ہیں مرد۔ اور مجھ کو تربیت دی گئی ہے کہ میں اپنے آپ کو میاں کی مرضی کے مطابق ڈھالوں۔

شوکت :۔ ماشاءاللہ، تو یہ گویا آپ میری مرضی کے سانچے میں اپنے کو ڈھالا کرتی ہیں، جو آئے دن بک بک جھک جھک رہتی ہے۔ اور دیکھیئے۔۔ کھٹ میٹ رہا کرتی ہے میں پوچھتا ہوں جب ایسی ہی ایثار پیشہ ہیں تو لڑائی جھگڑا کیسا؟

زہرہ :۔ اسی پر تو مجھ کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔ اور جو کچھ میں سمجھتی ہوں اگر سچ سچ کہدوں تو ابھی قیامت آجائے۔

شوکت :۔ اب دیکھ لیجئے یہ آپ کی زیادتی ہے یا نہیں کہ میں کس قدر۔۔۔۔ صلح جویانہ انداز سے باتیں کر رہا ہوں اور آپ مجھ کو ایٹم بم سمجھ رہی ہیں اور خواہ مخواہ ہیروشیما بنی جاتی ہیں۔ آپ کے اسی طرزِ عمل نے دنیا جہان میں مجھ کو عقصور مشہور کردیا ہے۔

زہرہ :۔ اچھا اب دیکھیئے برا نہ مانیے گا، شاہدہ کی شادی کے تحفے کے قصے میں میرا کیا قصور تھا؟

شوکت :۔ آپ چاہتی تھیں کافی سٹ دینا اور میں چاہتا تھا آئس کریم سٹ دینا

زہرہ :۔ بھلا غور تو کیجئے اس موسم میں آئس کریم سٹ کا کون سا تک تھا۔

شوکت :۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھ کو کافی کے نام سے وحشت ہوتی ہے۔ ایک پیالی پلا دیجئے۔ حقہ کا پانی سمجھ کر زہر مار تو کر لوں گا۔ مگر رات بھر خشکی کے مارے نہ نیند آئے گی نہ موت۔

زہرہ :۔ آپ اپنے لئے تو نہیں لے رہے تھے، تحفہ دینا تھا کسی کو۔

شوکت :۔ پھر اسی کی کیا ضرورت تھی کہ کافی سٹ دیا جائے؟ زہر خورانی کا سٹ بھی دیا جا سکتا تھا۔ میں تو آئس کریم سٹ اس امنگ کے ساتھ لایا تھا کہ آپ اس کے حسین پیالے دیکھ کر جھوم اٹھیں گی، اور میرے انتخاب کی داد دیں گی۔ مگر نہ ہوا آئینہ ورنہ میں دکھاتا کہ کیا برا منہ بنایا تھا آپ نے اس تحفہ کو دیکھ کر۔

زہرہ :۔ فرض کر لیجئے کہ مجھ کو وہ ناپسند ہی ہوا تھا تو بھی کیا آپ کو یہی چاہیئے تھا کہ اٹھا کر جو پھینکا ہے اس کا بکس تو ایک ایک کے چھ چھ پیالے ہو گئے

شوکت :۔ پھر آخر کہاں تک انسان اپنے کو قابو میں رکھے؟ آپ کو کیا معلوم کہ میں کن راستوں سے گزرتا ہوا بازار تک پہنچا۔ بازار کی کتنی دکانیں جھانکیں، مول تول میں کتنا وقت صرف کیا۔ انتخاب میں ...کس دیدہ ریزی سے کام لیا۔ اور جب ان تمام مرحلوں سے گزر کر اپنے نزدیک سارے بازار کی جان نکال کر لایا۔ تو آپ کی ایک نگاہ تحقیر نے میرا تو دل ہی توڑ دیا۔ اور الٹا مجھ پر الزام کہ میں نے سٹ کیوں توڑا

زہرہ :۔ آپ نے اچھا کیا توڑا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان یہ اختلاف خیال ہی کیوں ہوا؟

شوکت :۔ ہاں بے شک سوال تو یہی ہے کہ ہم دونوں نے کافی سٹ اور یا دونوں نے آئس کریم سٹ کیوں نہ چاہا؟

زہرہ :۔ خیر اس قسم کا اختلاف خیال تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ دونوں کے ... دماغوں میں کوئی بجلی کا سوئچ تو لگا نہیں ہے کہ بٹن دبایا اور ایک ہی قسم کی روشنی دونوں نے دے دی۔

شوکت :۔ جمیلہ خالہ اور بڑے خالو کو دیکھو تو نا رشتہ میں ایک دوسرے کے میاں بیوی نہیں بلکہ جی ہاں اور جی حضور معلوم ہوتے ہیں میاں نے کہا دن ہے۔ بیوی بولیں بالکل دن ہے۔ یہ تارے تھوڑی ہیں سورج ٹوٹ گیا ہے اس کے ذرے ہیں۔ بیوی نے کہا آج سردی زیادہ ہے۔ میاں نے پنکھا ہاتھ سے رکھ کر انگیٹھی ہی تاپنا شروع کر دی۔ کوئی مر جائے تو دونوں باقاعدہ کورس میں روئیں گے با ترتیب کے ساتھ آہیں بھر یں گے۔ کیا مجال کہ میاں چھیالیس آنسو بہائیں اور بیوی پینتالیس بہا کر رہ جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تعزیتی آنسو قدم ملا ملا کر پریڈ کر رہے ہیں۔

زہرہ :۔ خیر ان کی نہ کہیئے۔ ان کے یہاں تو میاں بیوی کے تعلقات میں وہ نمائش در تجارتی لین دین معلوم ہوتا ہے کہ ہنسی آ جاتی ہے مگر ہمارے یہاں کا قصہ ہی کچھ اور ہے۔

شوکت :۔ وہی تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ قصہ کیا ہے۔ اسی کا پتہ چل جائے تو قصہ ہی ختم نہ ہو۔

زہرہ :۔ مجھ میں تو اتنی ہمت ہے نہیں کہ میں اتنا بڑا سچ آپ کے منہ پر بول جاؤں ....

شوکت :۔ دیکھئے بیگم صاحبہ آپ کا بس یہی طریقہ زہر لگتا ہے آپ دراصل مجھ سے ڈرتی ورتی تو خاک بھی نہیں ہیں اور نہ ڈرنا چاہیئے مگر ظاہر یہی کرتی ہیں کہ گویا میں نہایت خوفناک درندہ ہوں۔

زہرہ :۔ میں آپ سے نہیں ڈرتی، آپ کے غصّے سے ڈرتی ہوں۔

شوکت :۔ پھر وہی غصّہ، آپ نے میرے غصّے کا وہ ڈھنڈورا پیٹا ہے کہ آپ کے میکے کے ایک ایک گھر میں بچے میرے نام سے ڈرائے جاتے ہیں اور آپ کے غم کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں کہ ایسے بھوت کے ساتھ بیچاری آسیب زدہ لڑکی زندگی کے ....دن کاٹ رہی ہے۔

زہرہ :۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے کہ یہ غصّہ نہیں تو اور کیا ہے۔

شوکت :۔ یہ غصّہ ہے؟ اس کو غصّہ کہتے ہیں؟ خدا کے واسطے میرے حال پر رحم کیجئے......صاحب یہ تو میں اپنا دردِ دل کہہ رہا ہوں، آپ کی سرکار میں اپیل کر رہا ہوں اور اگر یہ بھی غصّہ ہے تو خدا مجھ نامراد کو غارت ہی کر دے۔

زہرہ :۔ لیجئے کوسا کاٹی شروع ہو گئی......بھئی میں نہیں کرتی... آپ سے بات، آپ ہی سچ کہتے ہیں، آپ جیتے میں ہاری۔

شوکت :۔ ابھی نہیں.....ہاریں آپ کے دشمن، ہارا تو میں ہوں کہ

جس کی بلند آواز سب سن لیتے ہیں مگر یہ خاموش چٹکیاں کوئی نہیں دیکھتا..... کوئی نہیں دیکھتا کہ آپ چپکے سے کیا شوشہ چھوڑ جاتی ہیں..... غلطی میری ہی تھی کہ میں یہ باتیں کرنے بیٹھا اب کان پکڑے..... توبہ کی میں نے پھر بابا..... +

مضمون نگار حضرات سے:

جوابی ٹکٹ کے بغیر کسی مضمون کی رسید یا اس سے متعلق کوئی مراسلت دفتر کی جانب سے نہیں ہوگی۔ (ادارہ)

مطالعہ کی میز •

"مشیر کا اسلامی ادب نمبر"

عبدالکریم عابد

آپ ہر ماہ بہت کچھ پڑھتے اور مطالعہ کرتے ہیں اور آپ اس کے متعلق کسی اچھی یا بری رائے پر ضرور پہنچتے ہیں۔ اور اپنے احباب میں تبادلۂ خیال بھی کرتے ہیں۔ لیکن آپ کی رائے اور نقطۂ نظر ایک حلقہ میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس سے عام افادہ ممکن نہیں ہوتا۔ مشیر اپنے قارئین کے لئے ان صفحات میں "مطالعہ کی میز" پیش کر رہا ہے تاکہ آپ کے مطالعہ کا افادہ زیادہ سے زیادہ عام ہو جائے اور لوگوں کو مطالعہ کے لئے مفید مشورے مل سکیں جن کے اکثر اشخاص بہت محتاج رہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ متعدد موضوعات پر سوچ بچار کی راہیں بھی آسان ہو جائیں۔ اس مرتبہ ہم عبدالکریم عابد کا پیش نظر مضمون شائع کر رہے ہیں۔ آپ بھی اپنی پڑھی ہوئی کسی کتاب کسی مضمون کسی نظم یا شعر کے متعلق اپنے تاثرات و خیالات ان صفحات کے لئے روانہ کریں۔ تاکہ دوسروں کو بھی اس سے فائدہ پہنچ سکے۔ پیش کردہ کسی رائے اور خیال پر اختلافی مضامین بھی شائع کئے جائیں گے بشرطیکہ اختلاف جائز اور سنجیدہ حدود میں ہو۔ (ادارہ)

ہمارے ادبی حلقوں میں اسلامی ادب کی تحریک اب نہ صرف یہ کہ غیر متعارف نہیں رہی ہے بلکہ سوچنے سمجھنے والی ذمہ دار ادبی شخصیتوں نے اس موضوع پر ملک کے معیاری رسائل و جرائد میں اظہار خیال کیا اور اب تک موافقت و مخالفت کے نقطۂ نظر سے اس عنوان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تاہم یہ ایک واقعہ ہے کہ اب تک اسلامی ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش بڑی حد تک ناتمام رہی ہے اور اس مسئلہ کے بہت سے پہلو ہیں جو ابھی زیر بحث آنا باقی ہیں۔

غالباً ادارۂ مشیر نے اسی احساس کی بناء پر اپنے ماہنامہ کا "اسلامی ادب نمبر" پیش کیا ہے اور اس نمبر میں منتخب مقالات، افسانے، اور حصۂ شعر و نظم کے ذریعہ اسلامی ادب کے تصور کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجھے معاف کیجئے اگر میں یہ کہوں کہ اسلامی ادب کی تحریک کے علمبردار[1] ایک عرصہ دراز تک اس افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ اسلامی ادب کی روایت کا آغاز محض ان کے اپنے حلقے اور مکتب خیال کا رہین منت ہے حالانکہ مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ ادبی زندگی کے مختلف ادوار میں اسلامی ادب اور جاہلی ادب کی یہ کشمکش ہمیں واضح طور پر ملتی ہے اور اس کشمکش کے نتیجہ میں اسلامی ادب کا ایک بیش قیمت ورثہ بھی ہم نے اپنے اسلاف سے پایا ہے۔ مسلمانوں کے قومی ادب میں سے داستان، قصص، و حکایات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو بھی صرف شاعری کا میدان اس اعتبار سے اپنے دامن میں لامحدود و قدر و قیمت کے ذخائر رکھتا ہے اور ہمیں اسلامی ادیبوں میں بہت سے سعدی

[1] نوٹ دوسرے کالم پر دیکھئے۔

---

[1] مقالہ نگار کو نہ معلوم کیوں یہ غلط فہمی ہوئی کہ اسلامی ادب کے علمبردار اس غلط فہمی میں مبتلا رہے اور وہ بھی عرصۂ دراز تک۔ ہماری نظر سے کم از کم اسلامی ادیبوں کی ایسی کوئی تحریر نہیں گزری جو اس غلط فہمی کا باعث ہوتی۔ (م۔ ت)

ودکی، اور اقبالؔ، اسلامی ادب کی موجودہ تحریک سے پہلے دکھائی دیتے ہیں۔

اور پھر صرف مسلمان ہی پر کیا منحصر ہے دنیا کی قوموں اور جماعتوں کے پاس خدا پرستانہ ادب کی روایت کم یا بیش موجود رہی ہے خود ہمارے ملک کی قومی زبانوں میں تلسی داس، والمیک، مہاتما کبیر، رابندر ناتھ ٹیگور، منشی پریم چند اور متعدد شخصیتیں ملتی ہیں کہ ہم ان کے ادب کو اسلامی ادب سے ہم آہنگ کہہ سکتے ہیں اور یہی حال دوسرے ممالک کا بھی ہے اور اب جب تک کہ ہم مسلمانوں اور غیر مسلموں کے پیش کردہ اس تعمیری ادب کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھیں گے تب تک ہم ایک خطرناک قسم کی تنگ نظری کا شکار رہیں گے جو ہماری ادبی تحریک کے لئے بہر حال مضر ہوگی۔

خدا کا شکر ہے کہ ادارۂ مشیر نے اسلامی ادب نمبر کے توسط سے ہمارے ادیبوں کی اس غلط فہمی کے خلاف بھی جہاد کیا ہے اور نہ صرف مسلمانوں کی قومی زندگی کے مختلف ادوار سے متعلق ادیبوں کے اسلامی فن و ادب کو پیش کیا ہے بلکہ غیر مسلموں کے ادبی ورثہ میں سے بھی صالح اجزا منتخب کرکے ہمارے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔ اس طرح گویا یہ حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی ادب کی تحریک ایک عالمگیر اور آفاقی تحریک ہے جس کا تعلق کسی خاص قوم، نسل، رنگ، یا مذہب سے نہیں ہے بلکہ ہر وہ ادب جو انسان کے جذبات خیر کی بنیاد پر پرورش پائے اور شر کے خلاف نبرد آزما ہو اسلامی ادب ہے۔

دراصل انسان کی داخلیت نیک و بد جذبات کی کشمکش سے عبارت ہے۔ ہمارے اپنے نفس میں خدا اور شیطان کی دو طاقتیں پنہاں ہیں اگر ہمارا نفس شیطان کا مطیع ہو کر اس کی عبادت کرنے لگے تو ہماری زندگی فاسقانہ اور کافرانہ زندگی کہلائے گی اگر ہمارے نفس کے اندر کا خدا ہم پر غالب ہے اور ہم اس کے مطیع رہیں تو ہماری یہ زندگی مسلم و مومن کی زندگی کہلائے گی اس نقطۂ نظر سے زندگی کی جو تعلیم محمد صلعم کے زمانے میں ہوئی تھی وہ ادب پر بھی اثر انداز ہوئی چنانچہ ہمارا ادب بھی اسلامی یا کافرانہ ہو سکتا ہے

اسلامی ادب ہم اسے کہیں گے جو انسان کے اندر چھپے ہوئے نیک احساسات کا نتیجہ ہو اور کافرانہ یا فاسقانہ ادب وہ ہے جو ہم میں پوشیدہ برے جذبات کی پیداوار ہو اور پھر ادب کی یہ دونوں اقسام ہر ملک ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگوں کے درمیان پائی جاتی رہی ہیں اور پائی جاتی رہیں۔

غالباً "اسلامی ادب" کے بارے میں یہی تصور مشیر کے اسلامی ادب نمبر کے اداریہ موسوم بہ سبد گل سے ظاہر ہو رہا ہے اور میرے خیال میں ضروری ہے کہ ہمارے ادیب اس تصور کو قبول کریں۔

اسلامی ادب کے موضوع پر غور و فکر کے ساتھ ہی فوراً ایک سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ فنون لطیفہ کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہو یہ ایک واقعہ ہے کہ دور نبوی اور دور خلافت راشدہ میں فنون لطیفہ کی وہ گرم بازاری نظر نہیں آتی جو اور تہذیبوں میں عام ہے، موسیقی، مصوری، رقص مجسمہ سازی کو تو واضح طور پر ناجائز کہا گیا ہے، شاعری بھی بس برائے نام ہی رہی، اور عرب میں کوئی دوسرا امراء القیس پیدا نہیں ہو سکا۔ تعمیرات اور لباس کے معاملہ میں بھی عہد اول کے مسلمان ہر طرح کے تکلفات کو معیوب سمجھتے تھے اور مصنوعی آرائش و زیبائش سے ہر معاملہ میں پرہیز ہی کیا جاتا تھا دراصل اس بارے میں مسلمانوں کا آرٹ بعد کی پیداوار ہے اور اجنبی تہذیبوں کے اثرات کا نتیجہ کہا جاتا ہے اور ان تاریخی حقائق کی بدولت اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ صحیح اسلامی معاشرہ میں فنون لطیفہ کی گنجائش بڑی کم رہے گی۔

اس عام خیال کے برعکس مسلمانوں کے صوفیا کا ایک طبقہ ہمیشہ فنون لطیفہ کے جواز اور ان کے اجتماعی مقاصد کے لئے استعمال کی اہمیت کا قائل رہا اور اس گروہ نے اپنی دانست میں فنون لطیفہ کو مسلمان بنانے کی حتی الامکان کوشش بھی کی اس کا سب سے زیادہ واضح اثر موسیقی کے سلسلہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

امام غزالی نے موسیقی[1] کے ناجائز ہونے کے حکم کو بعض خاص وقتی

---

[1] موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ سے متعلق مقالہ نگار نے جو سوالات اٹھائے ہیں وہ نہایت ہی برمحل ہیں ان سوالات کو جب تک حل نہ کر لیا جائے اور ان کے متعلق مناسب و موزوں رائے کا تعین نہ ہو جائے اس وقت ہماری تنقید بہر حال تشنہ ہی رہے گی۔ اس سلسلہ میں ہمارے تنقید نگاروں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے مشیر اسلامی ادب کے نقادوں کو ان سوالات کے سلسلہ میں دعوت فکر دیتا ہے۔ (م۔ف)

دقتی مصلحتوں کا نتیجہ بتایا تھا اور ان کے خیال میں جونہی یہ وقتی مصلحتیں ختم ہو گئیں موسیقی جائز حیثیت سے فروغ پانے کی مستحق ہو گئی امیر خسرو رحمہ اللہ کا نام تو ہندوستانی موسیقی کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتا ہے ——— بہرحال یہ ایک شدید ضرورت ہے کہ ہمارے اہلِ فکر اور اہلِ قلم اس موضوع کا حق ادا کریں۔

مشیر کے اسلامی ادب نمبر میں اس عنوان پر گو چند اچھے مقالات شامل ہیں تاہم وہ بھی بڑی حد تک تشنہ اور نامکمل ہی ہیں اکثر مقالہ نگاروں نے تو صرف یہ ثابت کرنے پر اکتفا کیا ہے کہ اسلام جمالیاتی احساس کے اظہار کی اجازت دیتا ہے مگر جمالیاتی احساس کے اظہار کا جواز اور مروج فنون لطیفہ کی سرپرستی میں بہرحال بڑا فرق ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سوال تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں کیا ان فنون کو انسانی بھلائی و بہبودی کے نقطۂ نظر سے استعمال کرنے اور حکومت و عوام کو اس کی سرپرستی کے لئے آمادہ کرنے کی خاطر سے کوئی تحریک چلائی جا سکتی ہے یا نہیں، اگر ہاں تو اس کا جواز کیا ہے؟ اور نہیں تو کیوں نہیں ؟

پھر دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم فنون لطیفہ کی ہر شاخ کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کریں گے یا ان میں جائز و ناجائز کی تفریق ہے اگر ایسی کوئی تقسیم پائی جاتی ہے تو اس کی بنا کیا ہے؟ آخر کس لئے ہم موسیقی کو تو اختیار کر لیں اور مجسمہ سازی کو چھوڑ دیں ؟

پھر سب سے تیسری اہم بات یہ ہے کہ آخر کس لئے قرن اول کے مسلمانوں کی زندگی میں فنون لطیفہ کا عمل دخل بس برائے نام ہی رہا حالانکہ یہی مسلمان عہدِ جاہلیت میں فنون لطیفہ کے سب سے بڑے پرستار تھے مگر مسلمان ہونے کے بعد مصوری، موسیقی، مجسمہ سازی، رقص و سرود کا تو ذکر ہی کیا۔ استعمال کی اشیا تک میں آسائش و زیبائش کے باقاعدہ فنون کا پتہ نہیں چلتا نہ تو خوبصورت لہروں، باغوں اور بارہ دریوں کی تعمیر پر توجہ ہے نہ نقاشی و سنگتراشی مرکز فکر و نظر ہے، بلکہ صرف سادگی اور ممکنہ حد تک سادگی پر ہر ایک کا ایمان تھا۔ اور طاؤس و رباب کی بجائے ہر شخص شمشیر و سناں پر رقص کر رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ دورِ اول کے مسلمانوں کی فنونِ لطیفہ سے ہماری یہ مجاہدانہ و سپاہیانہ زندگی اسلامی تعلیمات کا براہِ راست نتیجہ تھی یا یہ صرف اس ملک کے مخصوص معاشی سیاسی اور جغرافیائی اسباب کا نتیجہ ہے

افسوس ہے کہ ان سب سوالات کا کوئی واضح جواب اسلامی ادب نمبر کے ان مقالات میں ہمیں نہیں ملتا ہے بلکہ صرف یہ بات کو جھٹلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی موقع پر حضور نے شعر کو بھی پسند کیا تھا اور یہ کہ حدیث کی کتابوں میں حبشیوں کے رقص کا بھی تذکرہ ملتا ہے جسے حضور نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک دفعہ دیکھا تھا، حالانکہ سوال ایک آدھ خاص موقع یا بعض خاص [illegible] کا نہیں ہے بلکہ ان فنون کے معاشرہ میں باضابطگی اور باقاعدگی کے ساتھ استعمال کا ہے نہ صرف مذہبی حلقوں میں بلکہ اکثر فلسفیانہ مکاتیب خیال میں بھی فنون لطیفہ کو باعثِ گمراہی قرار دیا گیا ہے افلاطون آرٹ کو نقل کی نقل کہتا ہے اور اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ آرٹسٹ حقیقت سے بہت زیادہ دور ہوتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں ایک اور گروہ ہے جو جمالیاتی احساس کی اہمیت و افادیت کا قائل ہے اور اس جمالیاتی احساس کی مجازیت میں وہ حقیقت کو پوشیدہ مانتا ہے اس گروہ کے نزدیک خالق باری کے عشقِ حقیقی کی راہ، انسان کے جمالیاتی احساس کے عشق مجازی میں مستور ہے ان ہر دو مکاتیب خیال کی اعلےٰ سطح پر تنقید اسلامی ادیبوں کے لئے بہت ضروری ہے اس سلسلے میں نجات اللہ صدیقی صاحب کا مقالہ بڑی حد تک سود مند ہے۔

مشیر کے اس اسلامی ادب نمبر میں غیر ملکی زبانوں کے ترجمہ شدہ افسانے بھی شامل ہیں میں ٹالسٹائی کے ادب کو تو اسلامی ادب سمجھ سکتا ہوں لیکن چیخوف اور اس طرح کے دوسرے ادیبوں کا ادب بہرحال اسلامی نہیں ہو سکتا اب اگر اتفاقاً ان کا کوئی ایک آدھ افسانہ ہمارے لئے باعثِ مخالفت نہ ہو تو محض اتنی سی بات کی وجہ سے اسے اسلامی ادب سے موسوم و معنون کرنا میرے نزدیک صحیح نہیں اسلامی ادب میں تو صرف ان فن پاروں کا شمار ہوگا جو مثبت طریقہ پر اسلامی اقدار کو نمایاں کرتے ہوں ورنہ انہیں زیادہ سے زیادہ بس جائز ادب ہی کہا جا سکتا ہے اسلامی ادب نہیں۔ یہ بہتر ہوتا کہ اس نمبر کے افسانوں میں صرف ان ادیبوں کی کاوشوں کو شامل کیا جاتا جو

مثبت طریقے پر انسان کے اخلاقی شعور اور احساسات کی ترجمانی کا اسلامی طریقہ اختیار کرتے ہیں ایسے افسانہ نگار بہت تھے مگر صرف ٹالسٹائی اور منشی پریم چند کے علاوہ باقی سب کو نظرانداز کر دیا گیا اور معلوم نہیں کیوں ان ادیبوں کو ترجیح دی گئی جو کھلم کھلا کمیونزم کا پروپیگنڈہ اپنا مقصود قرار دے چکے تھے حالانکہ اگر اس سلسلہ میں صرف بنگالی، ہندی، گجراتی، اور مرہٹی افسانوں کے شائع شدہ اردو تراجم ہی پر نظر ڈال لی جائے تو کئی افسانے مل جاتے جو ہمارے مقصدی نقطۂ نظر کے مطابق تھے اور اس طرح کے افسانوں کی اشاعت کی بدولت "اسلامی ادب نمبر" کی اہمیت و افادیت میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا۔

حصہ شعر و نظم اپنی جگہ پر خوب ہے اردو کی منتخب غزلیں، اور نظمیں مقصدی ذہنی اعتبار سے کامیاب ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ محض عاشقانہ قسم کے اشعار نے کیوں پیش نظر نمبر میں جگہ پائی ہے اور یہ کہ کب سے اس طرح کے اشعار کا شمار بھی اسلامی ادب میں ہونے لگا ہے؟

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اسکی آنکھوں کی نیم خوابی سے

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کسی تصدق حسین خالد صاحب کی ایک آزاد نظم "شیر دل خاں" بھی اس اسلامی ادب نمبر میں شامل ہے ایک تو ویسے ہی آزاد نظموں کا سلسلہ اردو شاعری کی روایت سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا اور پھر خاص طور پر سے ابہام ان نظموں میں پوشیدہ ہوتا ہے وہ عام قاری کے لئے بجائے خود ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ اور پھر اسلامی ادب کے اس شیر دل خاں کو دیکھ کر تو واقعی شاعری کا دل دہل جاتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہمارے اسلامی ادیب آزاد نظم کی لغویت ۵ سے پرہیز کریں جو کہ اردو شاعری میں ترقی پسندوں کی بدعت سیئہ ہے۔

بہرحال اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا کہ اس "اسلامی ادب نمبر" کے ذریعے ادارہ مشیر نے ہمارے ادب کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے ایک عرصہ دراز سے ہمارے ادیب اس کی ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ ایسا کوئی منتخب مجموعہ شائع ہوتا۔

۳ہ اس نمبر کی ترتیب میں یہ اصول پیش نظر رہا کہ جہاں سے بھی کوئی اچھی بات ملے قبول کر لیا جائے۔ خواہ وہ کسی نے کہی ہو۔ یہ بات غلط ہے کہ کسی خاص گروہ کو ترجیح دی گئی ہے۔ البتہ یہ مسئلہ ضرور محل نظر ہے کہ کسی غیر مسلم یا مخالف اسلام کے تعمیری نمونہ کو اسلامی ادب کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور وہ کون سی حدود ہیں جو "اسلامی ادب" اور "جائز ادب" میں امتیاز پیدا کرتی ہیں؟ یہ مسئلہ بھی ہمارے تنقید نگاروں کو دعوتِ فکر دیتا ہے اور اس سلسلہ میں مشیر کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ (د م۔ ف)

۴ہ "ابہام" اگر ایسا ہو کہ وہ غیر محسوس طریقہ پر اصل مفہوم کی طرف اشارہ کرے تو وہ فنی حسن بن جاتا ہے اس صورت میں وہ ایک ایسا نقاب بن جاتا ہے جس میں صورت تو چھپ جاتی ہے لیکن جلوے عیاں رہتے ہیں البتہ ایسا ابہام جو معانی کے جلووں تک کو دبیز سیاہ چادر میں لپیٹ دے کہ نظر کے لئے کوئی قرینہ ہی باقی نہ رہے تو بلاشبہ یہ ایک فنی سقم ہوگا جس سے بچنا چاہیئے خواہ وہ آزاد نظم میں ہو یا کسی اور صنعت میں (د م۔ ف)

۵ہ آزاد نظم کو لغویت کہنا ایک طرح سے بڑی زیادتی ہے اس میں شک نہیں ترقی پسند ادب میں ایسی بیشتر آزاد نظمیں شامل ہیں جن میں ابہام غلو کی حد تک پہنچ گیا ہے لیکن یہ بذات خود آزاد نظم کا قصور نہیں بلکہ کہنے والوں کا سقم ہے اسلامی ادب نے ایسی آزاد نظمیں پیش کی ہیں جن میں ابہام کو بڑے سلیقہ اور خوبی کے ساتھ برتا گیا ہے اور وہ اپنے تاثر کے لحاظ سے مکمل فن پارہ ہیں۔ (م۔ ف)

تذکرے اور تبصرے

"کنز العلاج"

مصنف : جناب ڈاکٹر محمد رفیق صاحب حجازی

ملنے کا پتہ : کتب خانہ "رہنمائے زندگی" ٹوبہ ٹیک سنگھ (مغربی پاکستان)

قیمت : مجلد گیارہ روپے چار آنے غیر مجلد دس روپے ، صفحات : ۶۸۸

میں نے کتاب "کنز العلاج" مصنفہ جناب ڈاکٹر حکیم محمد رفیق صاحب حجازی کا مطالعہ کیا۔ بلاشبہ موصوف کی یہ تصنیف فن کی اس اعتبار سے ایک بیش بہا خدمت ہے کہ بیک وقت تمام امراض کی تشخیص کے لئے مفید معلومات ساتھ ہی فوری استعمال کے لئے مجرب نسخے ڈاکٹری، طبی اور ہومیوپیتھک ہر مرض کے تحت مل جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ موصوف نے خود تحریر کیا ہے کہ اپنے علم و تجربہ کی رو سے نہایت دیانت داری و ایمانداری سے لکھا ہے اور بخل کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ بالکل صحیح و درست ہے۔ یقیناً اہل ذوق و ایسے احباب کے لئے ایک نادر تحفہ ہے جو بیک وقت ہر سہ معالجات کی دوائیں معلوم کرنا چاہتے ہوں یہاں سے استفادہ مقصود ہو۔ متعدد کتابوں کے بجائے صرف یہ ایک کتاب کافی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ مصنف کی یہ فنی خدمت عند اللہ و عند الناس مقبول ہو۔ حکیم سید محمد عبد اللہ ندوی

سالنامہ روزنامہ "دور جدید" (برما)

ایڈیٹر ابراہیم احمد مظاہری۔

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ برما کو بھی اردو زبان کے ساتھ ہمیشہ اچھا خاصا تعلق رہا ہے۔ برما کے مختلف بڑے بڑے شہروں میں نہ صرف یہ کہ اردو بھی اور بولی جاتی ہے بلکہ اسے ایک اہم علمی و ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر اردو روزنامہ "دور جدید" رنگون کا سالنامہ ہے جو جہازی سائز کے تقریباً ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اس ضخیم نمبر میں سیاسیات، تاریخ و تحقیق، ادب و افسانہ، حقائق و معارف، منظومات و متفرقات کے عنوان سے اچھا خاصا علمی و ادبی مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس پرچہ کی بدولت ہم برما کی گذشتہ اور موجودہ زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں خاص طور پر مندرجہ ذیل مضامین و مقالات ہمارے لئے دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔

(۱) برما کے سیاسی اداے
(۲) برما چائنا روڈ
(۳) برمی زبان میں ترجمہ و تفسیر۔
(۴) برما میں اسلام اور عربوں کی آمد
(۵) برما میں اردو شاعری۔
(۶) یونین آف برما علما سروس
(۷) برما اور فن خوشنویسی۔

رنگون کو بہادر شاہ ظفر کے ساتھ بڑا تعلق ہے چنانچہ جریدہ ہذا کے مخصوص نمبر میں بہادر شاہ کے مقبرہ سے متعلق ایک مضمون شامل ہے نیز رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے ایام آخری ایام' بہادر شاہ ظفر کی شاعری سے متعلق بھی مضامین ہیں۔ اور اس کے مقبرہ کی تصاویر سرورق پر دی گئی ہیں۔ ایک اور مفید مقالہ نیتاجی سبھاش بوس کی تحریک آزادی کی نام سے شائع ہوا ہے اس مقالہ میں آزاد ہند فوج کی تاریخ بڑی تفصیل سے بیان کی گئی ہے اور آزاد ہند فوج سے تعلق رکھنے والی بعض اہم شخصیتوں کے متعلق کافی معلومات مہیا کر دی گئی ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ سالنامہ اس قابل ہے کہ ہم اسے ایک تاریخی یادداشت کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھیں۔

کتابت و طباعت کا معیار کافی بلند ہے اس روزنامے کا سالانہ چندہ ۶۰ روپیہ اور ششماہی ۳۰ روپے ہے۔ (ع۔ر)

ماہنامہ استقلال (رنگون)

ایڈیٹر محمد ابراہیم احمد مظاہری۔

سالانہ چندہ ۱۰ چار برمی سکہ

یہ دیدہ زیب آرٹ پیپر میں ملبوس ایک خوبصورت ماہنامہ ہے۔ اس پرچہ کا تعلق بھی روزنامہ دور جدید کے ادارے سے ہے۔ یہ ادارہ برما میں مسلمانوں کی علمی اور دینی خدمات کے لئے قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس ادارہ کی مطبوعات نہ صرف اپنے مضامین کے لحاظ سے معیاری ہیں بلکہ اپنی ظاہری شان کے اعتبار سے بھی بڑی بلند پایہ ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مطبوعات کسی عوامی ادارہ کی جانب سے نہیں بلکہ سرکاری انتظام کے تحت شائع ہو رہی ہیں۔ حالانکہ یہ صرف مسلمانان برما کی اپنی ہمتوں اور ذوق و جذبہ کا نتیجہ ہیں۔ ماہنامہ استقلال بھی ایک مفید اور معلوماتی پرچہ ہے۔ اس میں امیر البحر ضمیر الدین کا مضمون ایک اچھی تاریخی یادداشت ہے۔ مولانا ابراہیم احمد مظاہری کی ذاتی ڈائری کے اوراق بھی بڑے دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ہم ان پرچوں کے مطالعہ کے لئے سفارش کرتے ہیں۔

(م - ف)

مسلمانان برما کے نام!

"دور جدید" اور "استقلال" کو دیکھ کر ایک خیال ذہن میں آتا ہے کہ دینی خدمت کے لئے ایک کام تو یہ ہے کہ اسلام کے علمی اور تاریخی حقائق کو معلوماتی انداز میں پیش کر دیا جائے اور ساتھ ساتھ کچھ اخلاقی اور اصلاحی مضامین بھی شامل ہوں یہ کام بھی خاص اہمیت رکھتا ہے اور اسے جاری رہنا ہی چاہیئے لیکن انہی کاموں کو کرنے کا ایک دوسرا انداز یہ ہے کہ اسلام کو ایک علمی تحریک اور ذمہ دارانہ جدوجہد کی صورت میں پیش کیا جائے تحریکی جدوجہد کا یہ سلیقہ اسلام کے علمی، و تاریخی اور فلسفیانہ پس منظر میں ایک نئی سی پھونک دیتا ہے اور اسلامی علوم و فنون کا ذخیرہ محض تبرک و نمائش نہیں بلکہ ایک کار فرما قوت کا میگزین بن جاتا ہے۔ اسلام کو زندگی کی ایک اسکیم بنا کر پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف ملکوں میں کام کرنے والے مسلمانوں کے ادارے اپنے اپنے حالات کا صحیح جائزہ لے کر اسلام کو ایک کار فرما قوت اور مسلم و غیر مسلم ذہنوں کے لئے ایک فیصلہ طلب علمی مسئلہ بنانے کی کوشش کریں اور ایک معین و باقاعدہ پروگرام کے ساتھ اس طرح کام کریں کہ اسلام محض عقائد و عبادات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام حل طلب مسائل میں بتدریج ایک فیصلہ کن قوت بن جائے۔ یہی وہ جہاد ہے جس کی اسپرٹ اگر ہماری تحریروں سے نہ جھلکے تو بقول علامہ اقبال دین بھی بس ایک مجموعۂ تصورات بن کر رہ جاتا ہے۔ مسلمانان برما کے لئے خلوص و محبت سے کام کرنے والے تمام احباب اور خاص طور سے مولانا محمد ابراہیم احمد مظاہری اور ان کے رفقاء کو اس پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ روزنامہ دور جدید کے خاص نمبر میں مسٹر ایم اے رشید وزیر معدنیات حکومت متحدہ برما نے ایک مضمون میں "یونین آف برما علماء سرد س" کی تجویز پیش کی ہے کہ تعلیم و تبلیغ کے لئے علماء حق کی مساعی کو ایک مرکزی اور تنظیمی صورت دینا بلاشبہ مفید اور بہتر کام ہے اور اس تجویز پر برما میں جدوجہد کی جانی چاہیئے لیکن محترم رشید صاحب بخوبی واقف ہوں گے کہ متحدہ ہندوستان میں گزشتہ سو سال میں ایسے بیشتر تعلیمی اور تبلیغی ادارے اور تنظیمیں برسرکار رہی ہیں اور ان سے ایک خاص دائرہ میں مسلمانوں کو کافی فائدہ بھی پہنچا ہے لیکن ان میں سے بیشتر کام اس نقطۂ نظر اور اسپرٹ کے ساتھ انجام نہیں دیئے گئے جس کا میں نے اوپر تذکرہ کیا ہے اس لئے بحیثیت مجموعی مسلم قوم علمی اخلاقی سیاسی معاشی اور دینی اعتبار سے روبہ انحطاط ... رہی اور ملت اسلامیہ کی اس گرتی ہوئی دیوار کو یہ تھتے بخوبی سہار نہیں سکے۔ اسی لئے اندیشہ ہے کہ "علماء سرد س" کی اس اسکیم سے بھی وہ نتائج حاصل نہ ہو سکیں جنکی مسلم دنیا سخت محتاج ہے۔

اس ہنگامہ پرور دور میں جس میں ساری دنیا ایک شدید قسم کی نظریاتی جنگ میں الجھی ہوئی ہے جب تک ہم اسلام کو زندگی کے مسائل کو حل کرنیوالا ایک مکمل و مدلل فارمولا بنا کر پیش نہ کریں گے اس وقت تک دنیا بھر کے مسلمان ان خرابیوں اور مفاسد سے نجات نہ پا سکیں گے جو ان کی زندگی میں گھن کی طرح لگ گئے ہیں اور بتدریج وہ دنیا کے اس روز افزوں حرکہ میں اپنی اہمیت کو کھوتے جا رہے ہیں۔ اگر مسٹر ایم اے رشید اور مولانا ابراہیم احمد مظاہری کی کوشش سے فکر و نظر کا یہ زاویہ برما کے مسلمانوں میں ایک جذبہ بن کر عملاً رونما ہو سکے تو بلاشبہ یہ ان حضرات اور ان کے رفقائے کار کا ایک ایسا تاریخی کارنامہ ہو گا جس کے لئے عالم

باوقار تنظیم

ایک ضروری اعلان

ماہ مئی ۵۷ء میں پانچویں گروپ کی تکمیل کے ساتھ 'باوقار تنظیم' کا ابتدائی پروگرام مکمل ہوگیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ خلاف توقع ہم نے اپنے ابتدائی مراحل بڑی تیز رفتاری سے طے کرلئے ہیں۔ اس کے لئے ہم ربِ کریم کے بیحد شکر گزار ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم ان احباب کے بھی تہ دل سے ممنون ہیں جنھوں نے کارکنانِ تنظیم پر پورا اعتماد کرکے بڑی فراخ دلی سے اس سکیم کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اور اپنے پُرخلوص تعاون سے ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ ورنہ ہوسکتا تھا کہ آجکل کے فاسد ماحول میں جہاں جھوٹ 'خیانت' دھوکہ اور لالچ کا دور دورہ ہے ایک ایسی سکیم کو جو جوئے 'لاٹری' اور تقدیر آزمائی جیسے دلفریب محرکات سے خالی ہو کسی توجہ کی مستحق نہ سمجھی جاتی اور ایک یا مندرجۂ اصولوں کی مبنی سکیم کا قدم جمانا مشکل ہو جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ پانچ گروپوں کی تکمیل کے بعد یہ سکیم اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی ہے۔ ابتدا میں پانچ گروپوں کی تعداد متعین کرنے سے ہمارا مقصد یہی تھا کہ ایسی سکیموں کو کامیابی سے چلانے کے لئے یہ کم ازکم تعداد تھی' اس سے کم تعداد میں ایسی سکیم کبھی بھی کامیابی سے نہیں چلائی جاسکتی۔ اب اس سکیم کو پوری طرح کامیاب' مفید عام اور بارآور بنانے کے لئے اس کی ممبر سازی جاری رہے گی۔ گروپ نمبر 6 زیر تشکیل ہے دسمبر ۵۷ء تک کم ازکم 12 گروپ مکمل کرنے کا پروگرام ہے اس پروگرام کی تکمیل کے بعد انشاءاللہ تعالیٰ ہم اپنے منصوبوں کو پوری قوت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچا کر مفید عام اور بارآور بنا سکیں گے ہمیں امید ہے کہ حسبِ سابق ہمارے معاون احباب اپنے پُرجوش جذبہ اور پُرخلوص تعاون سے بدستور ہماری حوصلہ افزائی فرماتے رہیں گے۔ زیر تشکیل گروپ نمبر 6 کی پہلی ڈرائنگ انشاءاللہ تعالیٰ ۲۳ جون ۵۷ء کو باقی پانچ گروپوں کی ڈرائنگ کے ساتھ ہی ہوگی۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

ماہ اپریل ۵۷ء میں "منیر" کا "اسلامی ادب نمبر" شائع ہوا تھا جس میں باوقار تنظیم کی ماہ مارچ ۵۷ء کی کارروائی و دیگر کوائف شامل تھے۔ چونکہ اسلامی ادب نمبر" اپریل اور مئی ۵۷ء کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اس لئے مئی ۵۷ء میں "منیر" کا کوئی شمارہ شائع نہ ہوسکا جس کی وجہ سے ماہ اپریل ۵۷ء کی کارروائی و دیگر کوائف بروقت اشاعت پذیر نہ ہوسکے۔ اس لئے جون ۵۷ء کے اس شمارہ میں ہم ماہ اپریل اور ماہ مئی ۵۷ء دونوں ماہ کی ڈرائنگ کی کارروائی مع دیگر کوائف کے شامل کر رہے ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں :۔

اپریل ۱۹۵۷ء

ماہ اپریل ۱۹۵۷ء کی ڈرائنگ بتاریخ ۲۱ اپریل ۵۷ء بروز اتوار حسبِ سابق ساڑھے تین بجے منعقد ہوئی۔ اس کارروائی کی صدارت جناب سید رشید احمد صاحب گیلانی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں چار گروپوں کی ڈرائنگ عمل میں آئی۔ گروپ نمبر ۱ کی چوتھی ڈرائنگ' گروپ نمبر ۲ کی تیسری، گروپ نمبر ۳ کی دوسری اور گروپ نمبر ۴ کی پہلی ڈرائنگ۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد صاحبِ صدر نے متعینہ طریقے کے مطابق حاضرین سے اعداد طلب فرمائے' جن کے کوائف حسبِ ذیل ہیں :۔

گروپ نمبر ۱ ـــــــــ چوتھی ڈرائنگ :۔

نمبر شمار	گروپ	رول نمبر	نام	عدد
(۱)	۱	۵۵	عبدالقیوم صاحب	۷۸۶

گروپ	رول نمبر	نام	عدد
۲	۴۳۲	عبدالحمید صاحب	۵۱۵
۲	۱۲۸	امیر احمد صاحب	۵۰۰
۲	۲۷۸	محمد صالح صاحب	۲۸۰
۳	۲۹۸	علی اصغر شاہ صاحب	۵۴۳۲۱

حاصل جمع = ۵۶۴۰۲ × ۵

حاصل ضرب = ۲۸۲۰۱۰ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۴۴۸

کامیاب رول نمبر ۴۴۸ گروپ نمبر ۱ +

حبیب اللہ خاں صاحب، دکان نمبر ۔۔۔، جامع مسجد۔ ٹنڈو آدم +

گروپ نمبر ۲ ——— تیسری ڈرائنگ :۔

گروپ	رول نمبر	نام	عدد
۱	۵۵	عبدالقیوم صاحب	۶۴۶۲
۱	۳۷۲	محمد حسین قریشی صاحب	۴۴۸
۳	۷۵	محمد الیاس صاحب	۵۳۷۵
۱	۳۵۸	اقبال احمد صاحب	۲۳۴۵۶
۲	۲۷۸	محمد صالح صاحب	۳۷۳
۱	۹۳	محمد امین صاحب	۷۸۷
۲	۴۳۲	عبدالحمید صاحب	۷۰

حاصل جمع = ۳۶۹۷۱ × ۷

حاصل ضرب = ۲۵۸۷۹۷ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۲۸۱

کامیاب رول نمبر ۲۸۱ گروپ نمبر ۲ +

محمد سلیم صاحب، محلہ خلد آباد بتوسط دفتر جماعت اسلامی، لانڈھی۔ کراچی +

گروپ نمبر ۳ ——— دوسری ڈرائنگ :۔

گروپ	رول نمبر	نام	عدد
۳	۲۶۱	محمد سلیم صاحب	۱۰
۱	۱۳	عابد سعید صاحب	۱۰۵

(۳)	۳	۷۵	محمد الیاس صاحب	۴۵۸۲۳
(۴)	۱	۲۷۲	محمد حسین قریشی صاحب	۳۷۲
(۵)	۱	۱۱۴	انوار احمد صاحب	۳۲۴
(۶)	۲	۱۲۹	محی الدین صاحب الوبی	۳۴۵۳۲۱

حاصل جمع = ۱۹۴۷ ۳۹ × ۶

حاصل ضرب = ۲۳۵۱۶۸۲ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۴۸۹

کامیاب رول نمبر ۴۸۹　　گروپ نمبر ۳ ؛
عبدالرحیم خان صاحب نیشنل بنک آف پاکستان سکھر ؛

گروپ نمبر ۴ ——— پہلی ڈرائنگ :-

نمبر شمار	گروپ	رول نمبر	نام	عدد
(۱)	۲	۴۹۸	سید محمد عبد السلام صاحب	۷۷۷
(۲)	۱	۹۳	مولوی محمد امین صاحب	۳۱۳
(۳)	۲	۱۲۹	محی الدین صاحب الوبی	۴۹۰۴۹۰
(۴)	۴	۲۵۴	احمد علی صاحب	۹۷۴۵
(۵)	۱	۳۷۲	محمد حسین صاحب قریشی	۱۴۳۲۱

حاصل جمع = ۵۶۵۶۴۶ × ۵

حاصل ضرب ۲۸۲۸۲۳۰ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۸۵

کامیاب رول نمبر ۸۵　　گروپ نمبر ۴ ؛
صالح سلیم صاحب نمبر ۲۱ ۔ پاک مینشن فریر روڈ ۔ کراچی ؛

جلسہ صاحبِ صدر اور حاضرین کے شکریہ کے ساتھ برخواست ہوا۔ ادارہ باوقار تنظیم جناب سید رشید احمد صاحب گیلانی کا بیحد شکرگزار ہے کہ انھوں نے اس ڈرائنگ کی صدارت کے فرائض سرانجام فرما کر کارکنانِ تنظیم کا ہاتھ بٹایا۔

اس ماہ کی امدادی رقوم کی ادائیگیاں حسب ذیل ذرائع سے کی گئیں :-

(۱) گروپ نمبر ۱ کامیاب رول نمبر ۴۴۸ ۔ جناب حبیب اللہ خان صاحب ٹنڈو آدم کو ادائیگی بذریعہ منی آرڈر کی گئی ۔ اسلئے کہ ٹنڈو آدم میں کوئی نمایاں بنک موجود نہیں تھا ؛

(۲) گروپ نمبر ۲ کامیاب رول نمبر ۲۸۱ ۔ جناب محمد سلیم صاحب خُلد آباد لانڈھی کو ادائیگی صدر دفتر سے نقد رقم کی صورت میں کی گئی ؛

(۳) گروپ نمبر ۳ کامیاب رول نمبر ۲۸۹ جناب عبدالرحیم خاں صاحب سکھر کو ادائیگی بذریعہ حبیب بنک سکھر ..... کرائی گئی۔

(۴) گروپ نمبر ۴ کامیاب رول نمبر ۸۵ جناب صلاح الدین سلیم صاحب (نابالغ) کراچی کو ادائیگی ان کے والد سرپرست جناب حبیب حسن نمیری کے توسط سے صدر دفتر سے نقد رقم کی صورت میں کی گئی۔

ڈرائنگ کے نتائج کا اعلان روزنامہ "انجام" و روزنامہ "جنگ" کراچی مورخہ ۲۴ اپریل ۵۷ء میں اور روزنامہ "تسنیم" لاہور میں کردیا گیا۔ بیرونی ایجنٹ حضرات کو فرداً فرداً بذریعہ ڈاک نتائج کی اطلاع بروقت کردی گئی۔

مئی ۱۹۵۷ء

ماہ مئی کی ڈرائنگ بتاریخ ۱۹ مئی ۱۹۵۷ء بروز اتوار حسب سابق ساڑھے تین بجے منعقد ہوئی۔ اس کارروائی کی صدارت جناب صابر حسین صاحب شرفی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں پانچ گروپوں کی ڈرائنگ عمل میں آئی۔ گروپ نمبر ۱ کی پانچویں، گروپ نمبر ۲ کی چوتھی گروپ نمبر ۳ کی تیسری، گروپ نمبر ۴ کی دوسری اور گروپ نمبر ۵ کی پہلی ڈرائنگ۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد صاحب صدر نے متعینہ طریقہ کے مطابق حاضرین سے اعداد طلب فرمائے۔ جن کے کوائف حسب ذیل ہیں:-

گروپ نمبر ۱ ——— پانچویں ڈرائنگ :-

نمبر شمار	گروپ	رول نمبر	نام	عدد
۱	۳	۲۹۸	علی صغر شاہ صاحب	۲۲۵
۱	۱	۱۲۶	مسعود حسین صاحب	۱۱۱۱
۲	۵	۱۰۱	مسعود المصطفیٰ صاحب	۳۵۶۲۳
۱	۱	۳۷۲	محمد حسین قریشی صاحب	۷۸۶
۱	۳	۵۲	خواجہ محمد ابراہیم صاحب	۷۰۹

حاصل جمع = ۳۸۴۵۴ × ۵

حاصل ضرب = ۱۹۲۲۷۰ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۳۸۷

کامیاب رول نمبر ۳۸۷ گروپ نمبر ۱:
رفیع احمد خاں صاحب، سکھر۔

گروپ نمبر ۲ ——— چوتھی ڈرائنگ :-

نمبر	گروپ	رول نمبر	نام	عدد
	۲	۱۲۹	محی الدین صاحب آلوبی	۳۲۱۱۲۳
	۳	۲۹۸	علی صغر شاہ صاحب	۱۹۵۷

(۳)	۳	۴۶۳	غلام قادر صاحب	۱۲۴۵۹
(۴)	۲	۴۵۰	سید مسعود حسین صاحب	۷۲
(۵)	۲	۱۲۸	امیر احمد صاحب	۵۰۰
(۶)	۱	۳۷۲	محمد حسین قریشی صاحب	۱۳۷۲۱
(۷)	۳	۷۵	محمد الیاس صاحب	۳۹۵۷

حاصل جمع = ۳۵۴۷۸۶ × ۷

حاصل ضرب = ۲۴۸۳۵۰۲ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۴۵

کامیاب رول نمبر ۴۵ گروپ نمبر ۲

امام الدین صاحب۔ مکان نمبر ۱۱۱۔ سی۔ علامہ اقبال کالونی، نیو چنیسر گوٹھ۔ کراچی نمبر ۴

گروپ نمبر ۳ —— تیسری ڈرائنگ :-

نمبر شمار	گروپ	رول نمبر	نام	عدد
(۱)	۳	۳	سید عثمان پاشا قادری	۱۰۳۳۳۳
(۲)	۲	۴۲۱	قیوم صاحب	۲۵
(۳)	۱	۳۷۲	محمد یٰسین صاحب	۱۲۳۴۵۶۷
(۴)	۵	۱۰۱	مسعود المصطفیٰ صاحب	۹۲
(۵)	۳	۴۲۸	غلام مصطفیٰ صاحب	۴۲۷۲۵
(۶)	۳	۲۹۸	علی اصغر علی شاہ صاحب	۱۸۵۷

حاصل جمع = ۱۳۱۲۵۹۹ × ۶

حاصل ضرب = ۷۸۷۵۵۹۴ ÷ 5.1

کامیاب رول نمبر ۳۷۵ گروپ نمبر ۳

راجہ احسان الحق صاحب، مکان نمبر ۳۰۹۔ E ریلوے کوارٹرس۔ نزد ڈھوک رتہ، امرال۔ راولپنڈی

گروپ نمبر ۴ —— دوسری ڈرائنگ :-

نمبر شمار	گروپ	رول نمبر	نام	عدد
(۱)	۳	۴۲۷	غلام مصطفیٰ صاحب	۱۲۵۰
(۲)	۴	۴۸	امیر احمد صاحب	۱۲۳۴۵
(۳)	۱	۱۴	محمد خالد فاروقی	۱

(۴)	۳	۷۵	محمد الیاس صاحب	۳۴۰
(۵)	۵	۱۰۱	مسعود المستقلی صاحب	۷۸۶۰
(۶)	۲	۴۲۶	قیوم خاں صاحب	۶۰
(۷)	۱	۳۷۲	محمد حسین صاحب قریشی	۲۰۶
(۸)	۱	۲۱	بے بی سارہ بتوسط سرپرست	۵۵۵
(۹)	۱	۱۱۴	الزار احمد صاحب	۴۴۴

حاصل جمع = ۲۳۰۶۱ × ۹

حاصل ضرب = ۲۰۷۵۴۹ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۱۳۵

کامیاب رول نمبر ۱۳۵ گروپ نمبر ۴ +

رفیع الدین صاحب ۱۲۶/۶ C. آصف کالونی، منگھا پیر روڈ۔ کراچی +

گروپ نمبر ۵ ـــــ پہلی ڈرائنگ :-

نمبر شمار	گروپ	رول نمبر	نام	عدد
(۱)	۱	۱۴۰	محمد خالد فاروقی صاحب	۰
(۲)	۳	۷۵	محمد الیاس صاحب	۴۵۷۸۹۷۱
(۳)	۲	۴۶۲	سید مسعود حسین صاحب	۳۹۸
(۴)	۵	۱۰۱	مسعود المستقلی صاحب	۷۸۶
(۵)	۵	۳۸۲	امیر احمد صاحب	۰
(۶)	۳	۴۲۷	غلام مصطفےٰ صاحب	۱۲۵
(۷)	۳	۵۲	خواجہ محمد ابراہیم صاحب	۵
(۸)	۱	۱۳	عابد سعید صاحب	۹۵۹

حاصل جمع = ۴۵۸۱۲۴۴ × ۸

حاصل ضرب = ۳۶۶۴۹۹۵۲ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۲۹۹

کامیاب رول نمبر ۲۹۹ گروپ نمبر ۵ +

انتظار حسین صاحب ـ گیسن پاک ورکشاپ ـ ماری پور ـ کراچی

جلسہ صاحب صدر اور حاضرین کے شکریہ کے ساتھ برخاست ہوا ـ ادارہ باوقار تنظیم جناب صابر حسین صاحب شرفی کا بیحد شکر گزار ہے

کہ انہوں نے اس ڈرائنگ کی صدارت کے فرائض سرانجام فرما کر کارکنانِ تنظیم کا ہاتھ بٹایا۔

اس ماہ کی امدادی رقم کی ادائیگیاں حسب ذیل ذرائع سے کی گئیں :-

(۱) گروپ نمبر۱ کامیاب رول نمبر ۳۸۷ جناب رفیع احمد خاں صاحب لودھی سکھر کو ادائیگی بذریعہ بنک ڈرافٹ حبیب بنک سکھر جناب ضیاء الحق صاحب صدیقی ایجنٹ برائے سکھر کے توسط سے کرائی گئی۔

(۲) گروپ نمبر۲ کامیاب رول نمبر ۴۵ جناب امام الدین صاحب چنیسر گوٹھ کراچی کو ادائیگی نقد رقم کی صورت میں صدر دفتر سے کر دی گئی۔

(۳) گروپ نمبر۳ کامیاب رول نمبر ۳۷۵ جناب راجہ احسان الحق صاحب راولپنڈی کو ادائیگی بذریعہ بنک ڈرافٹ حبیب بنک راولپنڈی سے جناب عبدالقدیر صاحب ایجنٹ راولپنڈی کے توسط سے کرائی گئی۔

(۴) گروپ نمبر۴ کامیاب رول نمبر ۱۳۵۔ جناب رفیع الدین صاحب صنعت کالونی کراچی کو ادائیگی نقد رقم کی صورت میں صدر دفتر سے کر دی گئی۔

(۵) گروپ نمبر۵ کامیاب رول نمبر ۲۹۹۔ جناب انتظار حسین صاحب بی پور کراچی کو ادائیگی نقد رقم کی صورت میں صدر دفتر سے کر دی گئی۔

ڈرائنگ کے نتائج کا اعلان روزنامہ "انجام" کراچی مورخہ ۲۰ مئی ۷۵ء کو، روزنامہ "جنگ" کراچی میں ۲۱ مئی ۷۵ء کو اور روزنامہ "تسنیم" لاہور میں کر دیا گیا۔ بیرونی ایجنٹ حضرات کو فرداً فرداً بذریعہ ڈاک نتائج کی اطلاع بروقت کر دی گئی۔

● —— پانچواں گروپ ۱۳ مئی ۷۵ء کو مکمل ہو گیا تھا۔ ۱۴ مئی سے چھٹے گروپ کی بکنگ شروع کر دی گئی ہے۔ اور انشاءاللہ اس کے مکمل ہونے پر ۲۲ جون ۷۵ء کو اس گروپ کی پہلی ڈرائنگ باقی گروپوں کے ہمراہ کر دی جائے گی۔

● —— گروپ نمبر۴ اور گروپ نمبر۵ کے ممبران کی فہرست اور ان کے رول نمبر وغیرہ اس شمارے میں شائع ہو رہے ہیں اگر کسی ممبر کے نام و پتہ میں کوئی غلطی ہو تو وہ اس کی اطلاع صدر دفتر کو دے تاکہ اس کی اصلاح کر لی جائے۔

● —— گروپ نمبر۴ تک کی پاس بکیں جاری ہو چکی ہیں اگر کسی ممبر کو پاس بک نہ ملی ہو یا کسی پاس بک میں کوئی غلط اندراج ہو تو وہ بھی صدر دفتر کو مطلع کریں تاکہ اس کی تصحیح کر لی جائے۔

● —— پانچویں گروپ کی پاس بکیں تیار ہو رہی ہیں جو انشاءاللہ جون ۷۵ء کے پہلے ہفتہ تک جاری کر دی جائیں گی۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرما لیں :-

(۱) —— ایجنٹ حضرات کمربستہ رہیں اور حسب سابق پُرخلوص جوش و خروش کے ساتھ ممبر سازی کی مہم جاری رکھیں۔

تاکہ آئندہ پروگرام اپنے وقت پر پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے۔

---

(۲) ـــــــ اقساط کی فراہمی میں کوتاہی نہ کریں اور ہر ماہ زیادہ سے زیادہ اقساط فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ آئندہ پروگرام کا دارومدار اقساط کی فراہمی پر ہی منحصر ہے۔

---

(۳) ـــــــ ماہ جون ۵۷ء میں پانچوں گروپوں کی اقساط وصول کرنی ہیں جو ۱۲ رجون تک فراہم کرلینی چاہئیں۔ جو ممبر دور رہتے ہوں انھیں ہدایت کریں کہ وہ اپنی اقساط بذریعہ منی آرڈر ارسال کردیا کریں۔ منی آرڈر فیس اصل رقم سے وضع کرلیں۔

---

(۴) ـــــــ بڑی رقومات حتی الوسع بنک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ ڈرافٹ باوقار کمپنی لمیٹڈ کے نام سے ہونا چاہیئے۔

(BAVAQAR COMPANY LIMITED, BUNDER ROAD, KARACHI.)

---

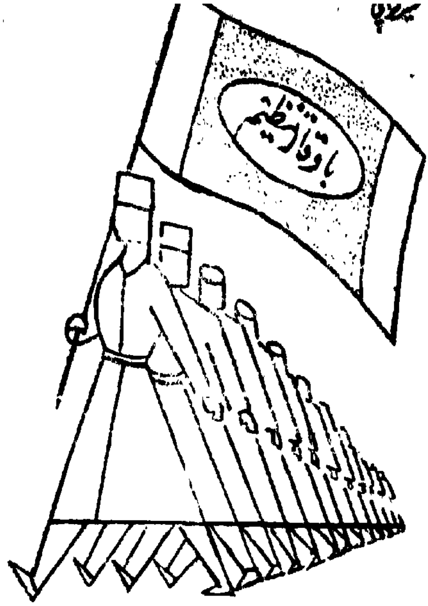
(۵) اپنے حسابات چھپے ہوئے فارموں پر روانہ کریں۔ جو صدر دفتر سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

آئندہ ڈرائنگ ۲۳ رجون ۱۹۵۷ء بروز اتوار حسب معمول منعقد ہوگی

باوقار تنظیم

سے جملہ خط وکتابت کرتے وقت اپنا یا اپنے متعلقہ ممبر کا رول نمبر اور گروپ نمبر ضرور تحریر کریں، تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ رہے۔

باوقار تنظیم کے ہر نئے گروپ کے ممبران اپنی دوسری اقساط اس گروپ کی ڈرائنگ ہوجانے کے بعد ارسال کیا کریں۔ کیونکہ دوسری قسط گروپ کی ڈرائنگ کے بعد ہی واجب الادا ہوتی ہے۔ منیجر



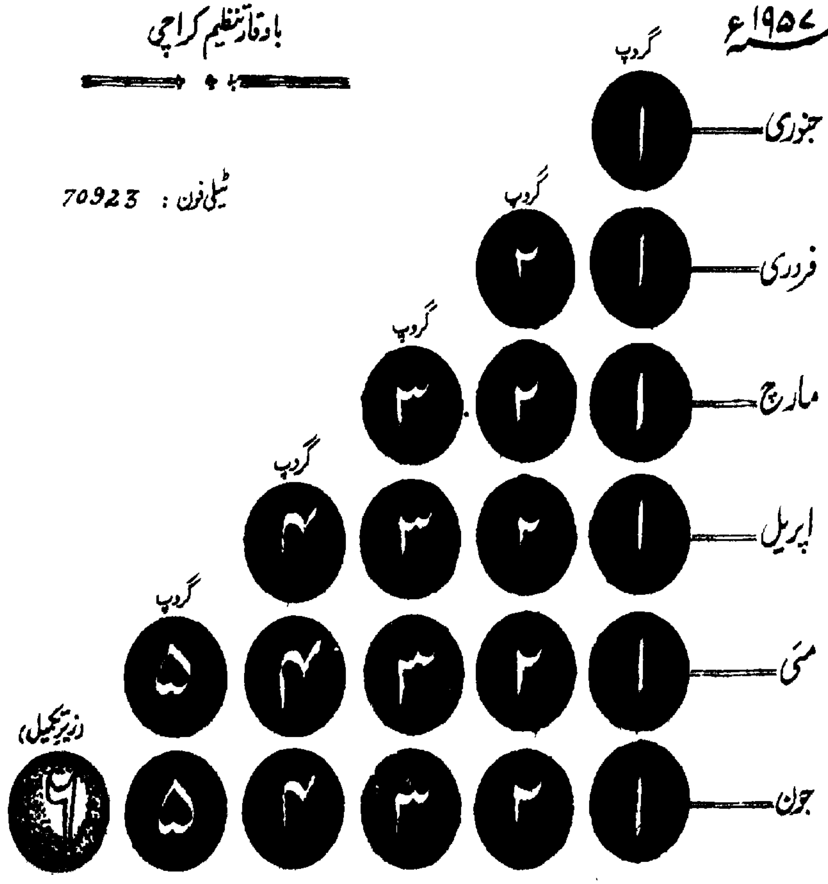
تدم ملا کے بڑھو "باوقار" بن کے چلو
اس انتشار میں "تنظیم" کی ضرورت ہے



رفتارِ کار

باوقار تنظیم کراچی

ٹیلی فون : 70923



باوقار تنظیم

باہمی بچت کی پرافٹ شیئرنگ سکیم کے گروپ نمبر ۴ اور گروپ نمبر ۵ کے ممبران کی فہرست

رول نمبر	نام اور پتہ
۱	نور محمد ولد سوا صاحب کچہری روڈ کھانچی بلڈنگ کراچی
۲	حسن ولد سلیمان صاحب سلیم اسٹیشنری مارٹ۔ ولی محمد حسن علی روڈ چاکیواڑہ کراچی۔
۳	منصف علی ولد عبدالشکور صاحب۔ بی ڈویژن۔ کراچی الیکٹرک کارپوریشن۔ لارنس روڈ کراچی۔
۴	داؤد ولد حسن صاحب ولی محمد حسن علی روڈ کھانچی جماعت خانہ حاجی عیسٰے کمپاؤنڈ۔ چاکیواڑہ کراچی
۵	حسین ولد حاجی عیسٰے صاحب۔ ولی محمد حسن علی روڈ۔ کھانچی جماعت خانہ۔ چاکیواڑہ کراچی۔
۶	چودھری ممتاز حسین صاحب ولد چودھری قاسم علی صاحب چک نمبر ۱۲، جنوبی ڈاک خانہ مردلیانوالا تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا
۷	ارشاد بیگم صاحبہ ولد راجہ غلام رسول صاحب زوجہ فضل کریم صاحب پراس ریکارڈ انچارج ورکس نمبر ۱۶۱۶، کھیوڑا سوڈا کمپنی لمیٹڈ۔ کھیوڑا۔ ضلع جہلم۔
۸	فضل کریم میاں ولد میاں محمد دین صاحب پراس ریکارڈ آفس، ورکس نمبر ۱۶۱۶ معرفت کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ۔ کھیوڑہ جہلم۔
۹	محمد صدیق ولد محمد اسماعیل صاحب کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ۔ دائرمین نمبر ۱۶۵۴۔ کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۱۰	عبدالحمید ارشد ولد محمد صدیق صاحب دائرمین نمبر ۱۶۵۴ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ، کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۱۱	حافظ محمد ابراہیم خالد ولد مولوی عبدالکریم صاحب مقام لونڈھر۔ نمبر ۲۵۴ ڈاک خانہ خاص براستہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائلپور۔
۱۲	حافظ محمد ابراہیم خلد ولد مولوی عبدالکریم صاحب۔ مقام لونڈھر نمبر ۲۵۴ ڈاک خانہ خاص براستہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائلپور۔
۱۳	علی حسین ولد محمد رفیق صاحب۔ ویگن شاپ ٹی نمبر ۱۱۲۱ ریلوے ورکشاپ۔ سید پور۔ مشرقی پاکستان۔
۱۴	اختر عالم عظیم آبادی ولد محمد عبدالحی۔ ریلوے بازار۔ سید پور ضلع رنگ پور مشرقی پاکستان۔
۱۵	محمد شکر اللہ ولد علی مرحوم صاحب ٹی نمبر ۱۳۰۴۸۔ ایم ایف او۔ سی آر ڈبلیو۔ ای بی ریلوے ورکشاپ سید پور مشرقی پاکستان۔
۱۶	محمد ادریس ولد آس محمد صاحب ریلوے بازار سید پور مشرقی پاکستان
۱۷	اسعد گیلانی صاحب ولد سید رسول شاہ صاحب نمبر ۲۷۸ جناح کالونی۔ لائلپور شہر۔
۱۸	زبیدہ اسعد صاحبہ اہلیہ اسعد گیلانی صاحب نمبر ۲۷۸ جناح کالونی لائلپور شہر۔
۱۹	محمد یونس ولد چودھری علی محمد صادق صاحب معرفت محمد انشار نیوز ایجنٹ اینڈ بک سیلر ریلوے روڈ۔ رحیم یار خاں۔
۲۰	عبدالرحمٰن حامر ولد محمد عبداللہ صاحب دفتر جماعت اسلامی یعقوب بلڈنگ حسین آگاہی ملتان شہر۔
۲۱	محمد یسین ولد مہر الٰہی صاحب چوڑی سرائے ملتان۔
۲۲	حافظ عبدالعلیم صاحب دواخانہ نورالقمر بازار لاٹن شاہ بہاولپور
۲۳	حکیم مولوی گل محمد صاحب شفاخانہ جماعت اسلامی لالاموسیٰ۔ گجرات
۲۴	عائشہ فرحت صاحبہ معرفت آباد شاہ پوری رکن ادارہ روزنامہ تسنیم شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور۔
۲۵	عثمان جمال الدین صاحب علوی معرفت ایجنٹ محمد انور علوی نمبر ۸۵۲ بزاز محلہ صدر بازار لاہور چھاؤنی۔
۲۶	یعقوب احمد واسطی صاحب مکان نمبر ۸۲۱ کوچہ نمبر ۳۷ بزاز محلہ صدر بازار لاہور چھاؤنی۔
۲۷	محمد حفیظ اللہ خاں صاحب فرگرینڈ سیکنڈ پاور ہاؤس۔ داؤد کاٹن ملز لمیٹڈ لانڈھی کراچی۔
۲۸	محمد دین علی خاں صاحب ڈرائیور پاور ہاؤس۔ ٹرسٹ کلے ورکس ریڑھی۔ لانڈھی کراچی۔
۲۹	شفیع محمد صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۳۰	کلثوم بی صاحبہ قصبہ ریڑھی۔ نزد لانڈھی کراچی۔
۳۱	حاجی اسمٰعیل صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۳۲	محمد یوسف صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۳۳	حسن صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۳۴	رمضان صاحب۔ قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۳۵	ہارون صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۳۶	محمد صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۳۷	محمد حسن صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۳۸	ابوبکر صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۳۹	ہاشم صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۴۰	محمد صدیق صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۴۱	محمد صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۴۲	گل محمد صاحب قصبہ لٹ بستی ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۴۳	محمد صادق صاحب قصبہ لٹ بستی ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۴۴	محمد صاحب قصبہ لٹ بستی ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۴۵	محمد حسین صاحب لٹ بستی قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۴۶	دوست محمد صاحب لٹ بستی ، ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۴۷	حسین ولد ابراہیم صاحب لٹ بستی ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۴۸	امیر احمد صاحب محلہ خلد آباد لانڈھی کراچی ۔
۴۹	محمد مظفر الدین صاحب مشین روم ٹرسٹ کلے ورکس قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۵۰	علی محمد صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۵۱	نظر محمد صاحب قصبہ لٹ بستی ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۵۲	محمد صاحب قصبہ لٹ بستی ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۵۳	جمعہ صاحب قصبہ لٹ بستی ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۵۴	حوا صاحبہ قصبہ لٹ بستی ریڑھی نزد لانڈھی کراچی ۔
۵۵	لعل شاہ ، لکڑی کی ٹال ۔ جواہر اسٹریٹ متصل اعجاز کالونی لارنس روڈ کراچی نمبر ۵ ۔
۵۶	عبدالحمید صاحب رنچھوڑ لائن بوہرہ پیر ، تیجا اسٹریٹ بلڈنگ نمبر ۱۴۶۲ روم نمبر ۱۴ کراچی ۔
۵۷	نثار احمد صاحب پلاٹ نمبر ۲۹۲ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی
۵۸	محمد رفیع صاحب ۹/۱۰۴ ناظم آباد کراچی ۔
۵۹	حکیم و ڈاکٹر توفیق احمد عباسی صاحب ۔ عباسی دواخانہ ۔ لیاقت چوک ۔ گولی مار کراچی ۔
۶۰	شیر خان صاحب نیوز ایجنٹ مقام ہزارہ ضلع کیمبلپور اٹک ۔
۶۱	محمد دین صاحب ٹیکنیکل اسسٹنٹ ۔ انسپکشن انجینئرنگ PIAC کراچی ایرپورٹ ۔
۶۲	محمد شفیع صاحب معرفت سیالکوٹ ہاؤس شاہ عالم مارکٹ لاہور ۔
۶۳	محمد دین صاحب ٹیکنیکل اسسٹنٹ انسپکشن انجینئرنگ PIAC کراچی ایرپورٹ ۔
۶۴	نسیم اختر صاحب سیالکوٹ ہاؤس شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور ۔
۶۵	عبدالرحمٰن صاحب سیالکوٹ ہاؤس شاہ عالم مارکیٹ لاہور ۔
۶۶	عبدالوحید صاحب مکان نمبر ۱۵۲ ۔ لیاقت روڈ ۔ گلی نمبر ۵ کہار منڈی ۔ راولپنڈی ۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۶۷	شمیم اختر صاحب ۲۹۸/سی مینا بازار راولپنڈی ۔
۶۸	محمد اسحٰق صاحب جلال پوری ۔ پرس مشن ہائی اسکول راولپنڈی ۔
۶۹	محمد یٰسین صاحب ۱۰/۶۷۶ بی ۔ فاطمہ جناح کالونی ۔ کراچی
۷۰	وحید الدین صاحب ۶۷۶/۱۰ بی ۔ فاطمہ جناح کالونی جمشید روڈ ۔
۷۱	شفاعت بیگم صاحبہ ۱۰/۶۷۶ بی ۔ فاطمہ جناح کالونی جمشید روڈ کراچی
۷۲	غلام علی صاحب ۶۷۶/۱۰ بی ۔ فاطمہ جناح کالونی جمشید روڈ ۔ کراچی ۔
۷۳	غلام علی صاحب بی ۔ ۶۷۶/۱۰ فاطمہ جناح کالونی جمشید روڈ کراچی ۔
۷۴	امداد علی صاحب بی ۔ ۶۷۶/۱۰ فاطمہ جناح کالونی جمشید روڈ کراچی ۔
۷۵	طفیل احمد صاحب سی ۔ ای ایل ، پی این ایس ہمالیہ منوڑہ کراچی ۔
۷۶	محمد یٰسین صاحب پی اے ایف ماری پور مسی نمبر ۱
۷۷	میر حسین صاحب ۶/۵۰ ملیر کینٹ ۔ کراچی ۔
۷۸	قاضی اکبر حسین صاحب ۳۸۶۱۱۴ پی این ایس تیمور معرفت فلیٹ میل آفس کراچی ۔
۷۹	عبدالرحمٰن صاحب ملک ۔ گیرج شمبوناتھ روڈ صدر کراچی ۔
۸۰	محمد یوسف صاحب ۲۴۱۴۳ پی این ایس تیمور معرفت فلیٹ میل آفس کراچی ۔
۸۱	اللہ یار خان صاحب پی او ایم رای ، پی این ایس ایف ایم او ۔ طارق کراچی ۔
۸۲	محمد یونس صاحب معرفت ایف ایم او ۔ کراچی ۔
۸۳	شیر زادہ صاحب معرفت مدینہ ہوٹل موسےٰ لین کراچی ۔
۸۴	سید نقی علی صاحب نمبر ۳ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور ۔
۸۵	صالح سلیم صاحب نمبر ۲۱ پاک مینشن فریر روڈ کراچی ۔
۸۶	اسلام حامد صاحب زبیری ۵۹ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۔
۸۷	اسلام منور زبیری صاحب ۵۹ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۔
۸۸	اقبال احمد صاحب ۱۹۰ ۔ پاپوش نگر ناظم آباد کراچی ۔
۸۹	محمد ایوب خان صاحب سرسوتی گلی مکان نمبر D/42 / 957 حیدر آباد ۔ سندھ ۔
۹۰	عبدالحق صاحب بلاک نمبر B / 8 کوارٹر نمبر 424 لطیف آباد کالونی ۔ حیدر آباد سندھ ۔
۹۱	اکرام الدین صاحب مکان نمبر ۱۰۸ سرکل نمبر D/37 بلبلانی گلی شاہی بازار حیدر آباد سندھ ۔
۹۲	محمد زکی احمد صاحب صدیقی ۱/۶۳۷ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی
۹۳	فاطمہ خاتون صاحبہ ۱۸/۱۲ مقابل سعید منزل بندر روڈ کراچی
۹۴	آسیہ خاتون صاحبہ ۱۸/۱۲ بندر روڈ کراچی نمبر ۱
۹۵	شجاع الرحمٰن صاحب ۱۳/۲ ٹیونیشیا لائن کراچی ۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۹۶	نزہت بی بی صاحبہ ۸۰ چھاگلہ بلڈنگ۔ یوسف علی بھائی روڈ رام سوامی۔ کراچی۔
۹۷	مہر محمد صاحب معرفت صادق برادرس شاپ نمبر C/300 جینٹا بازار راولپنڈی۔
۹۸	محمد شریف صاحب ٹکٹ نمبر ۴۹۱۸ پارک چک لالہ۔
۹۹	محمد اسماعیل صاحب بٹ۔ صدر قانون گوئی دفتر کچہری راولپنڈی
۱۰۰	محمد الیاس صاحب ٹکٹ نمبر GSSD 4676 کلوزنگ ڈپو راولپنڈی شہر۔
۱۰۱	عبداللہ بن سعید صاحب۔ ۵۲۔ حیدرآباد کالونی کراچی
۱۰۲	تسنیم فاطمہ صاحبہ معرفت محمود فاروقی صاحب۔ حاذق دواخانہ مقابل ماما پارسی گرلز اسکول بندر روڈ کراچی نمبرا
۱۰۳	محمد ظہور الحق صاحب ٹریفک اکاؤنٹس آفس کوچنگ سیکشن پولوگراؤنڈ۔ ای۔ بی ریلوے چٹاگانگ۔
۱۰۴	رضیہ خاتون صاحبہ کوچنگ سیکشن پولوگراؤنڈ ای بی ریلوے چٹاگانگ
۱۰۵	نور الحسن انصاری صاحب پورٹ اکاؤنٹس سیکشن۔ اکاؤنٹس آفس۔ ای۔ بی ریلوے چٹاگانگ۔
۱۰۶	عبدالفتاح فاطمی صاحب کلیم آفس چیف ٹرافک مینجر ایسٹرن بنگال ریلوے چٹگام مشرقی پاکستان۔
۱۰۷	عصمت رقیہ صاحبہ کوارٹر نمبر اے سی ۳۴ اے ٹائیگر پاس چاٹگام۔ مشرقی پاکستان
۱۰۸	نذیر الحسن صاحب ریلوے کوارٹر نمبر ۷/۱ پہاڑتلی چاٹگام۔
۱۰۹	محمد قیام الدین صاحب کوارٹر نمبر ۳۱/بی پورٹ کالونی روڈ نمبر ۱۱ سالٹ گولہ چاٹگام مشرقی پاکستان۔
۱۱۰	وسیم احمد صاحب معرفت نسیم احمد صاحب اے سی ۴۲ اے ٹائیگر پاس چاٹگام مشرقی پاکستان۔
۱۱۱	سید عبدالرافع صاحب ایف اے اینڈ سی اے او ایس آفس ای۔ بی ریلوے چٹگام مشرقی پاکستان
۱۱۲	سید عبدالرافع صاحب ایف اے اینڈ سی اے او ایس آفس ای۔ بی ریلوے چٹگام۔ م۔ پ
۱۱۳	سید عبدالرافع صاحب ایف اے اینڈ سی اے او ایس آفس ای۔ بی ریلوے چٹگام۔ م۔ پ
۱۱۴	سید عبدالرافع صاحب ایف اے اینڈ سی اے او ایس آفس ای۔ بی ریلوے چٹگام۔ م۔ پ
۱۱۵	سید عبدالرافع صاحب ایف اے اینڈ سی اے او ایس آفس ای۔ بی ریلوے چٹگام مشرقی پاکستان۔
۱۱۶	محمد ظہیر الدین صاحب ۲۹ اے ریلوے کوارٹر پولوگراؤنڈ چاٹگانگ۔
۱۱۷	ایس ایم مظفر حسین صاحب معرفت ایس اے رافع صاحب ۳۵ پولوگراؤنڈ ریلوے کالونی چٹگام۔ م۔ پ
۱۱۸	محمد علی ظفر صاحب ۲۹/بی پولوگراؤنڈ چٹگام۔ م۔ پ
۱۱۹	مقبول الٰہی صاحب آفیشل نمبر ۶۴۹۵۰ پی این ایس طارق معرفت ایف ایم او۔ کراچی۔
۱۲۰	محمد بخش صاحب آفیشل نمبر ۴۹۳۰۹ ایل ایم ای پی این ایس طارق معرفت ایف ایم او کراچی۔
۱۲۱	مرزا شفیق بیگ کوارٹر نمبر ۲۸/۵ بلاک ۱۲ ڈرگ کالونی کراچی۔
۱۲۲	سید انوار الحق صاحب ہاجرہ بائی بلڈنگ کمرہ نمبر ۸ ہری داس لال جی روڈ۔ بندر روڈ کراچی۔
۱۲۳	سید معین الحق صاحب ۸۔ ہاجرہ بائی بلڈنگ ہری داس لال جی روڈ، بندر روڈ کراچی۔
۱۲۴	شعیلہ شمیم انصاری ۸۔ ہاجرہ بائی بلڈنگ ہری داس لال جی روڈ
۱۲۵	نفیسہ انصاری آنسہ حسین صاحبہ ۸۔ ہاجرہ بائی بلڈنگ ہری داس لال جی روڈ۔ کراچی۔
۱۲۶	عارف داؤد تار محمد صاحب۔ ۸۔ ہاجرہ بائی بلڈنگ ہری داس لال جی روڈ۔ کراچی۔
۱۲۷	عثمان غنی صاحب موسیٰ لین پکچر روڈ ایل ۸۸ کراچی۔
۱۲۸	سید حسن شاہ صاحب ولی محمد حسن علی روڈ چاکیواڑہ کراچی۔
۱۲۹	محمد صدیق صاحب معرفت سلیم اسٹیشنری مارٹ ولی محمد حسن علی روڈ۔ چاکیواڑہ کراچی۔
۱۳۰	ماسٹر عبدالکریم صاحب بالمقابل موسیٰ جمعہ ہوٹل۔ ولی محمد حسن علی روڈ۔ چاکیواڑہ کراچی۔
۱۳۱	عزیز النساء بیگم صاحبہ ۱۲/۱۸ بندر روڈ کراچی۔
۱۳۲	عزیز النساء بیگم صاحبہ ۱۲/۱۸ بندر روڈ کراچی۔
۱۳۳	حافظ محمد زاہد صاحب معرفت مولانا محمد ظفر صاحب حسن شاہ بلاک نیو رنگیلا لائن منگھا پیر روڈ کراچی۔
۱۳۴	محمد یونس صاحب ۹/ای ایس کے ڈی کالونی لالوکھیت کراچی۔
۱۳۵	رفیع الدین صاحب سی ۱۲۶/۹ آصف کالونی منگھا پیر روڈ کراچی۔
۱۳۶	وقار النساء بیگم صاحبہ کوارٹر نمبر ۳۳۴ ایف پرانا لالوکھیت نزد لسبیلہ ہاؤس کراچی۔
۱۳۷	ظفر الاسلام صاحب کوارٹر نمبر ایف ۳۳۴ پرانا لالوکھیت نزد لسبیلہ ہاؤس کراچی۔
۱۳۸	حسن آرا بیگم صاحبہ کوارٹر نمبر ایف ۳۳۴ پرانا لالوکھیت نزد لسبیلہ ہاؤس کراچی۔
۱۳۹	کشور سلطانہ بیگم صاحبہ کوارٹر نمبر ایف ۳۳۴ پرانا لالوکھیت

سوال نمبر — نام اور پتہ

نزد پس بیلہ ہاؤس کراچی
۱۴۰ منور سلطانہ بیگم صاحبہ کوارٹر نمبر الیف ۴/۳۳۴ پرانا لالو کھیت نزد نیک لس بینہ ہاؤس کراچی۔
۱۴۱ ایم۔ وی محمدانی صاحب الیف ۲/ پیڈی پولس کوارٹرز۔ رتن تالاب کراچی۔
۱۴۲ سید عبداللطیف صاحب مکان نمبر ۱۴۱۹۔ پی ہریوپٹہ ولینڈی
۱۴۳ محمد صادق میر گل صاحب نمبر ۶۱۹۲۰ نلہ ڈھوک رتہ ایال راولپنڈی
۱۴۴ پروین اختر صاحبہ ۲۹۸/سی آزاد ہلی سٹور مینا بازار راولپنڈی
۱۴۵ خوشحال خان صاحب عقب حاذق دواخانہ فدو بلڈنگ بندر روڈ کراچی
۱۴۶ گل محمد خان صاحب۔ لوہاری بلڈنگ۔ بابر اسٹریٹ۔ رتن تالاب کراچی۔
۱۴۷ مس خورشید صاحبہ ۲۰۔ اسلام آباد کراچی۔
۱۴۸ مس شفیعت صاحبہ ۲۰۔ اسلام آباد کراچی۔
۱۴۹ ناصرہ بیگم صاحبہ۔ معرفت نصرت اللہ صاحب کوارٹر نمبر ۱/۹ مدینہ کوارٹرز۔ ناظم آباد کراچی۔
۱۵۰ حسینی بیگم صاحبہ ۳۲/۲ مسلم بیک کوارٹرز۔ بلاک نمبر ناظم آباد کراچی۔
۱۵۱ جان محمد ولی محمد صاحب سوداگران بیضہ جھیلی ساگر کالونی حیدرآباد۔ سندھ۔
۱۵۲ ولی محمد صاحب سوداگران بیضہ جھیلی ساگر کالونی حیدرآباد سندھ۔
۱۵۳ گوہر علی بیگ صاحب مکتبہ جماعت اسلامی گاڑی کھاتہ حیدرآباد۔ سندھ۔
۱۵۴ مرزا ظفر علی بیگ صاحب کوارٹر نمبر ۲۶۷ بلاک سی۔ یونٹ نمبر ۷ لطیف آباد کالونی۔ حیدرآباد سندھ۔
۱۵۵ مرزا غضنفر علی بیگ صاحب کوارٹر نمبر ۲۶۸ بلاک سی یونٹ نمبر ۷ لطیف آباد کالونی۔ حیدرآباد سندھ۔
۱۵۶ نزہت جمیل محمد تقی صاحب اینڈ سنز برش مرچنٹ میر کھا چاڑی۔ حیدرآباد سندھ۔
۱۵۷ محمد شوکت صاحب کوارٹر نمبر ۲۶۶، یونٹ ۷ سی بلاک لطیف آباد کالونی حیدرآباد سندھ۔
۱۵۸ محمد یوسف صاحب سی ون ایریا ۲۹/۱ خیاط الوقت مین روڈ لالو کھیت کراچی۔
۱۵۹ محمد ایاز قریشی صاحب معرفت ڈاکٹر عثمانی صاحب کیماڑی کراچی۔
۱۶۰ حافظ طاہر حسین صاحب ۱۳۔ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی۔
۱۶۱ سید صابر حسن حسینی صاحب ۱۳ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی۔
۱۶۲ سید زین العابدین حسینی صاحب ۱۳۔ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی۔

سوال نمبر — نام اور پتہ

۱۶۳ عبدالقدیر حسینی صاحب آگرہ تاج کالونی۔ مسان روڈ نمبر ۲ کراچی
۱۶۴ تنویر صالحہ صاحبہ چوہدری جنرل سٹور بجامع مسجد کیماڑی کراچی۔
۱۶۵ خلیل احمد صاحب معرفت جمیل احمد صاحب ارجن بلڈنگ، گراؤنڈ فلور نمبر ۲ موہن روڈ کراچی۔
۱۶۶ امان اللہ بٹ صاحب (ایس۔ بی اے) اوفیشل نمبر ۹۲۷۳۹ پی۔ این ہاسپٹل کراچی۔
۱۶۷ احمد خاں صاحب دکان نمبر ۱۳/سی۔ سائیکل اسپیرنگ شاپ ریلوے مارکیٹ سید پور ضلع رنگپور مشرقی پاکستان۔
۱۶۸ سید محمد طارق صاحب معرفت ایچ حبیب الرحمٰن صاحب ہوزری مرچنٹ ریلوے بازار۔ سید پور ضلع رنگپور۔ م۔ پ۔
۱۶۹ محمد عثمان صاحب نیو منشی پاڑہ۔ سید پور ضلع رنگ پور۔ م۔ پ
۱۷۰ ارشاد نبی خاں صاحب ۱۲۔ مریم منزل۔ مول شنکر دیاس روڈ رنچھوڑ لائن کراچی۔
۱۷۱ زینب صاحبہ زوجہ عبدالمجید صاحب۔ خالد سوپ کمپنی۔ کچہری روڈ۔ نواب شاہ۔ سندھ۔
۱۷۲ عبدالمجید صاحب خالد سوپ کمپنی کچہری روڈ۔ نواب شاہ۔ سندھ
۱۷۳ محب علی صاحب معرفت قاضی احمد صاحب۔ نواب شاہ۔
۱۷۴ محمد حسین صاحب ڈوڑ ضلع نواب شاہ سندھ
۱۷۵ محمد طیب صاحب ڈوڑ ضلع نواب شاہ سندھ
۱۷۶ سید احمد اللہ صاحب کاظمی ڈپٹی کسٹوڈین آفس نواب شاہ
۱۷۷ محمد عمر صاحب مدرس مسلم اسکول نواب شاہ سندھ
۱۷۸ مظہر اللہ صاحب ضلع لوکل بورڈ نواب شاہ
۱۷۹ عبدالجواد صاحب گورنمنٹ بوائز پرائمری اسکول پوسٹ آفس سکرنڈ نواب شاہ۔ سندھ
۱۸۰ محمد سعید صاحب اسلامیہ ہائی اسکول نواب شاہ۔
۱۰۱ صفیہ خاتون صاحبہ معرفت ڈاکٹر مقبول حسین صاحب قسمر میڈیکل ہال الشرپوڑ نواب شاہ
۱۸۲ دبیع الدین صاحب معرفت فضل الدین صاحب پان وچائے فروش۔ پریڈی اسٹریٹ صدر کراچی۔
۱۸۳ شاہجہان بیگم صاحبہ معرفت فضل الدین صاحب پان وچائے فروش۔ پریڈی اسٹریٹ صدر کراچی۔
۱۸۴ نعیمہ صاحبہ معرفت فضل الدین صاحب پان وچائے فروش پریڈی اسٹریٹ صدر کراچی۔
۱۸۵ امین الدین صاحب معرفت فضل الدین صاحب پان وچائے فروش۔ پریڈی اسٹریٹ صدر کراچی
۱۸۶ رضیہ سہیل صاحبہ تھیوبالڈ میگراج بلڈنگ۔ بنس روڈ کراچی۔

نمبر شمار	نام و پتہ
۱۸۷	محمودہ بیگم صاحبہ پرنسپل پولیس ہیڈ کوارٹر ... کراچی
۱۸۸	محمد امین صاحب ... بہاولپور
۱۸۹	حبیب اللہ صاحب شہداد کوٹ ضلع لاڑکانہ سندھ۔
۱۹۰	مولوی غلام رسول صاحب ۸۴/۳ سی محلہ ریلی باغ پیش امام مسجد لوہار بازار۔ لاڑکانہ
۱۹۱	محمد شریف صاحب سیکشن آفیسر بی سی بی کمپنی۔ بہاولپور۔
۱۹۲	رحیم بخش صاحب اسٹیشن ماسٹر لال سوہانرا۔ ضلع بہاولپور
۱۹۳	حفیظ الرحمٰن صاحب ۸۴۷ بی ایل۔ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ۔ کراچی پاکستان۔
۱۹۴	خداداد خان صاحب ہیڈ ماسٹر ڈی۔ بی مڈل اسکول ... ضلع راولپنڈی۔
۱۹۵	عزیز محمد صاحب مکان صوبیدار مولا داد۔ بالمقابل چونگی نمبر ۲۲ پنج بھائیہ راولپنڈی۔
۱۹۶	سردار نبی صاحب ۲/۱۴ لائنز کیٹ کراچی۔
۱۹۷	کنیز فاطمہ صاحبہ پلاٹ نمبر ۴۹۲ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی۔
۱۹۸	انوار خان صاحب پلاٹ ... آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی۔
۱۹۹	ایس عبد العزیز صاحب پلاٹ ۴۴۶ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی۔
۲۰۰	مرزا محمت علی صاحب چشتی۔ ممتاز دار اللباس جیفیق لائن۔ بغدادی۔ مسان روڈ کراچی۔
۲۰۱	محمد حکیم الرحمٰن صاحب خطیب جامع مسجد بالمقابل نشیا عظم ہاؤس۔ کراچی۔
۲۰۲	مسرت بیگم صاحبہ معرفت محمد شجاعت علی صاحب چشتی ٹیچر بی وی۔ ایس پارسی ہائی اسکول وکٹوریہ روڈ صدر کراچی۔
۲۰۳	سلطان احمد صاحب پلاٹ ۴۹۳ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی۔
۲۰۴	قاضی عماد الدین صاحب ... متصل مسان کیماڑی کراچی۔
۲۰۵	محمد یوسف خان صاحب پلاٹ نمبر ۴۹۲ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی
۲۰۶	شاہ نور خان صاحب پلاٹ ۸۲۳ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی۔
۲۰۷	اشفاقی بیگم صاحبہ ۳۲/ ایل اے آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی۔
۲۰۸	نزہت بیگم صاحبہ ۳۲/ ایل اے آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی۔
۲۰۹	انوار احمد صاحب پلاٹ نمبر ۴۹۲ لے تی کالونی مسان روڈ کراچی
۲۱۰	افضال احمد صاحب پلاٹ نمبر ۴۹۲ لے تی کالونی مسان روڈ کراچی۔
۲۱۱	حمیدہ بیگم صاحبہ پلاٹ نمبر ۴۹۲ آگرہ تاج کالونی مسان روڈ کراچی
۲۱۲	نثار احمد صاحب اسسٹنٹ ماسٹر جامعہ اسلامیہ سیکنڈری اسکول اسلام آباد کالونی۔ کراچی
۲۱۳	نثار احمد صاحب اسسٹنٹ ماسٹر جامعہ اسلامیہ سیکنڈری اسکول اسلام آباد کالونی کراچی

نمبر شمار	نام و پتہ
۲۱۴	سید وراثت علی صاحب دربار معرفت پوسٹ بکس نمبر ۲۰۴۴۔ کراچی
۲۱۵	سید وراثت علی صاحب درباری معرفت پوسٹ بکس نمبر ۲۰۴۴۔ کراچی۔
۲۱۶	سید وراثت علی صاحب درباری معرفت پوسٹ بکس نمبر ۲۰۴۴ کراچی
۲۱۷	ضمیر الدین احمد صاحب عثمانی معرفت عبد الرشید صاحب صدیقی پوسٹ بکس نمبر ۵۰۴۰۔ کراچی۔
۲۱۸	ممتاز الرحمٰن خاں صاحب بلاک نمبر ۲ مکان نمبر ۸۰۳ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔
۲۱۹	جاوید الرحمٰن خاں صاحب بلاک نمبر ۲ مکان نمبر ۸۰۳ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔
۲۲۰	سمیع اللہ خان صاحب۔ آصف کالونی منگھوپیر روڈ کراچی۔
۲۲۱	محمد عبد اللہ صاحب امام اسٹریٹ نمبر ۱۵ مکان نمبر ... نیا حرم پورہ لاہور۔
۲۲۲	احمد برہان الدین صاحب بی اے۔ شمشاد ریسٹورنٹ پیسہ اخبار انارکلی۔ لاہور مغربی پاکستان۔
۲۲۳	شہزاد حسین خان صاحب ۱۲۰/۵ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔
۲۲۴	محمد عقیل صاحب صدیقی۔ ستلج کاٹن ملز ہوزری فیکٹری اوکاڑہ ضلع منٹگمری۔
۲۲۵	محمد اشرف صاحب کے/۱۳۳ متصل مسجد فیض بخش گلی نمبر ۲ کمیٹی محلہ راولپنڈی شہر۔
۲۲۶	شاہ محمد صاحب ظفر جنرل اسٹور ایبٹ بازار نارووال ضلع سیالکوٹ۔
۲۲۷	ظفر عثمان صاحب ولد شاہ محمد صاحب جنرل مرچنٹ ایبٹ روڈ۔ نارووال۔ ضلع سیالکوٹ۔
۲۲۸	عطاء الرحمٰن صاحب متعلم جامع مسجد حنفیہ۔ نارووال ضلع سیالکوٹ۔
۲۲۹	مفتی بشیر احمد صاحب ہیڈ ماسٹر ڈی۔ بی مڈل اسکول، کرتو پنڈ ددی ضلع شیخوپورہ۔
۲۳۰	محمد شفیع صاحب بٹ۔ جنرل مرچنٹ ریلوے روڈ نامعلی ضلع سیالکوٹ۔ پنجاب۔
۲۳۱	محمد ابراہیم صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۲۳۲	محمد صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۲۳۳	ابوبکر صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۲۳۴	عبد الحمید صاحب بٹ قصبہ لٹ بستی ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۲۳۵	شریفہ بیگم صاحبہ قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۲۳۶	سید مجاہد حسین صاحب رضوی۔ صدیقی کراد ... آباد مہاجر کالونی لانڈھی کراچی۔
۲۳۷	عثمان صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۲۳۸	علمت بیگم صاحبہ قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۲۳۹	محمد یعقوب علی خاں صاحب ڈرائیور پاور ہاؤس ٹرسٹ کے ورکس۔ ریڑھی لانڈھی کراچی۔
۲۴۰	محمد بچو صاحب قصبہ بیٹ بستی ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۲۴۱	علی محمد صاحب قصبہ بوٹ گوٹ نزد ریڑھی لانڈھی کراچی۔
۲۴۲	محمد اسمٰعیل صاحب قصبہ بلٹ گوٹ نزد ریڑھی لانڈھی کراچی۔
۲۴۳	حمیدہ بیگم صاحبہ قصبہ بوٹ گوٹ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۲۴۴	محمد صدیق صاحب قصبہ بولٹ گوٹ ریڑھی لانڈھی کراچی۔
۲۴۵	صغریٰ بیگم صاحبہ پلاٹ نمبر ۹۴۴/۱ ڈرگ روڈ کالونی کراچی۔
۲۴۶	محمد فضل صاحب سعود آباد کوارٹر ۲، ۲۷/۵ ملیر کالونی کراچی
۲۴۷	نذر الحق صاحب ۲۱ ۲ لالوکھیت کراچی۔
۲۴۸	مشتاق احمد صاحب ایف ۱۶۶ جہانگیر روڈ (غربی) کراچی۔
۲۴۹	ظہیر احمد صاحب معرفت رجب علی صاحب دفتر جماعت اسلامی نیفش محمد فتح خاں روڈ۔ کراچی۔
۲۵۰	عرفان علی خاں صاحب کینٹ ٹیلیفون ایکسچینج فریر ہال کراچی۔
۲۵۱	عتیق الرحمٰن صاحب جاپانی بستی دہلی کالونی گزری روڈ کراچی۔
۲۵۲	عزیز الرحمٰن صاحب ۲/۱۲۷ بی، پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی۔
۲۵۳	عزیز الرحمٰن صاحب ۲/۱۲۷ بی۔ پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی۔
۲۵۴	عاشق حسین صاحب او۔این ۳۶۲۱۸ پی او پی این ایس کارنر معرفت ایف۔ ایم۔ او کراچی۔
۲۵۵	عبدالحفیظ صاحب بی ۲/۱۲۷ پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی۔
۲۵۶	مظہر حسین صاحب ولد جمعدار مدد حسین پینشنر چک نمبر ۶۶ جنوبی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔
۲۵۷	حافظ عبدالمجید صاحب اسلامی مدرسہ محمد پورہ لائلپور۔
۲۵۸	عبدالرشید ارشد صاحب اسلامی مدرسہ محمد پورہ لائلپور۔
۲۵۹	عزیز احمد صاحب معرفت محمد انور علوی صاحب ۸۵۲ بزاز محلہ صدر بازار لاہور کینٹ۔
۲۶۰	خالد جمال الدین صاحب معرفت محمد انور علوی صاحب ۸۵۲ بزاز محلہ صدر بازار لاہور کینٹ۔
۲۶۱	اختر جمال الدین صاحب علوی معرفت محمد انور علوی صاحب ۸۵۲ بزاز محلہ صدر بازار لاہور کینٹ۔
۲۶۲	طارق جمال الدین صاحب علوی معرفت محمد انور علوی صاحب ۸۵۲ بزاز محلہ صدر بازار لاہور کینٹ۔
۲۶۳	سردار احمد ولد گل احمد صاحب ٹیلر فرنٹیئر شوگر ملز تخت بھائی مردان۔
۲۶۴	حمید اللہ خاں صاحب معرفت عبدالستار دوکاندار۔ فرنٹیئر شوگر مل۔ تخت بھائی۔ مردان۔
۲۶۵	فضل الرحمٰن صاحب معرفت عبدالمنان چائے فروش۔ فرنٹیئر شوگر مل۔ تخت بھائی مردان۔
۲۶۶	محمودہ فرحت صاحبہ معرفت ڈاکٹر غلام رسول اکرم صاحب مقام و ڈاکخانہ جھول۔ ضلع سانگھڑ۔
۲۶۷	خان زمان خاں صاحب نامہ نگار اخبارات۔ میانوالی۔
۲۶۸	نعیم اللہ صاحب ولد مولوی حامد صاحب عیدگاہ مسجد منگو لائن ولی محمد حسن علی روڈ کراچی۔
۲۶۹	نواب الدین صاحب کٹلری مرچنٹ مقابل رتن اسٹریٹ جونا مارکیٹ کراچی۔
۲۷۰	محمد مجاہد۔ بہار کالونی ۲/۱۹ مسان روڈ کراچی۔
۲۷۱	ہارون صاحب معرفت سلیم سٹیشنری مارٹ ولی محمد حسن علی روڈ کراچی۔
۲۷۲	محمد حنیف صاحب معرفت یوسف بیڑی انڈسٹریز چاکیواڑہ لائن کراچی
۲۷۳	سید لطف اللہ ۴/۲۷ بہار کالونی کلیٹن روڈ کراچی
۲۷۴	نصرت اللہ خاں صاحب ۶/۱۹۷ ڈی۔ پیر کالونی کراچی۔
۲۷۵	سعیدہ بیگم صاحبہ ۳/۳۷۹ ویسٹ گارڈن لائنس روڈ نزد لسبیلہ ہاؤس۔ کراچی۔
۲۷۶	عبدالحکیم صاحب۔ اشرفی بیڑی ورکس رجسٹرڈ مشنری روڈ بہار کالونی کراچی۔
۲۷۷	ظہیر الدین حیدر صاحب بلاک نمبر ۸۲/۲ بہار کالونی مسان روڈ کراچی۔
۲۷۸	محمد ابراہیم صاحب غنی ٹیلرنگ ہاؤس وسے لین بحر روڈ... پنجابی دھان کھاتہ باکسنگ کلب مقابل کمرہ نمبر ۶ کراچی۔
۲۷۹	ہاجرہ بائی غنی ٹیلرنگ ہاؤس موسیٰ لین بحر روڈ ایل نمبر ۵۶۔ کراچی۔
۲۸۰	عبدالغنی صاحب غنی ٹیلرنگ ہاؤس موسیٰ لین بحر روڈ ایل نمبر ۵۶ کراچی
۲۸۱	بندو صاحب محلہ جوہر لین مکان نمبر ڈی ۱۶۸۷/۳۲ حیدرآباد سندھ
۲۸۲	نور علی صاحب سندھ آئل مل ٹکٹ نمبر ۵۹ حیدرآباد سندھ۔
۲۸۳	قطب الدین صاحب اکاؤنٹس۔ ای بی آر پولوگراؤنڈ چاٹگام۔ م۔پ
۲۸۴	اظہار الاحسن صاحب صدیقی۔ ایف اے اینڈ سی اے او پوسٹ اکاؤنٹس۔ سی آر بی ای بی ریلوے چاٹگام۔ م۔پ
۲۸۵	عبدالوحید خاں صاحب ایف اے اینڈ سی اے او آفس ٹی ایم برانچ کوچنگ ای بی ریلوے چاٹگام۔ م۔پ۔
۲۸۶	محمد شفیع ملک صاحب بی ۴-۱۰۰۴/۲۱ ایڈوانی اسٹریٹ حیدرآباد سندھ
۲۸۷	محمد شفیع ملک صاحب بی ۴-۱۰۰۴/۲۱ ایڈوانی اسٹریٹ حیدرآباد سندھ
۲۸۸	علی احمد صاحب میمن انجمن ہائی اسکول سرے گھاٹ حیدرآباد سندھ
۲۸۹	محمد بشیر صاحب صدیقی میمن انجمن ہائی اسکول سرے گھاٹ حیدرآباد سندھ
۲۹۰	وحید الاحسن صاحب رفیق منزل پرنس علی روڈ حیدرآباد سندھ
۲۹۱	وحید الاحسن صاحب رفیق منزل پرنس علی روڈ حیدرآباد سندھ۔
۲۹۲	آفتاب احمد صاحب جعفری مکان نمبر ڈی ۵۲/۳۴۳۶ [illegible]

رول نمبر	نام اور پتہ
	ستارگلی۔ حیدرآباد سندھ۔
۲۹۳	آفتاب احمد صاحب جعفری مکان نمبر ڈی ۵۳/۱۴۴۶، شاہی بازار۔ ستارگلی۔ حیدرآباد سندھ۔
۲۹۴	احمد علی صاحب ۱۰۰/سی اے کمرشل ایریا نمبر ۲ لالوکھیت کراچی
۲۹۵	فاطمہ بیگم صاحبہ ۱۰۰/سی اے کمرشل ایریا نمبر ۲ لالوکھیت کراچی
۲۹۶	محمد اشرف خان صاحب موجودہ مشن روڈ وکٹری سیف ورکس کراچی
۲۹۷	محمد اشرف خان صاحب موجودہ مشن روڈ وکٹری سیف ورکس کراچی
۲۹۸	شاکرہ خاتون صاحبہ ۸/۱۲ بندر روڈ کراچی۔
۲۹۹	سید محمد اللہ حسینی صاحب معرفت حسینی ٹریڈرز فریر اسٹریٹ ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی۔
۳۰۰	سید محمد اللہ حسینی صاحب معرفت حسینی ٹریڈرز فریر اسٹریٹ۔ کراچی
۳۰۱	لطیف النساء بیگم صاحبہ ۱۵۱/بی خداداد کالونی کراچی۔
۳۰۲	رضیہ خاتون محمد عظیم خان صاحب مکان ۱۷/اے خداداد کالونی کراچی
۳۰۳	صوفیہ خاتون محمد عظیم خان صاحب مکان ۱۷/اے خداداد کالونی کراچی
۳۰۴	فرخ آمنہ بیگم صاحبہ بی/۱۵۱ خداداد کالونی کراچی۔
۳۰۵	سید اکبر حسینی صاحب ۱۵۱/بی۔ خداداد کالونی کراچی۔
۳۰۶	سید محمد حسینی صاحب ۱۵۱/بی۔ خداداد کالونی کراچی۔
۳۰۷	سید خلیل اللہ حسینی صاحب ۱۵۱/بی خداداد کالونی کراچی۔
۳۰۸	ڈاکٹر سید احمد فریدالدین صاحب ڈرگ روڈ نمبر ۳۔ مہاجر آباد کالونی نمبر ۳۶۔ کراچی۔
۳۰۹	امتیاز حسین صاحب معرفت کیمن پاکستان لمیٹڈ ملیر پور بکس نمبر ۵۱/۲۷۔ کراچی۔
۳۱۰	عاصم احمد صاحب عبدالجبار شبیر احمد اینڈ کمپنی۔ کراچی۔
۳۱۱	شفیق فاطمہ صاحبہ، جی ۸/۲۱ فیڈرل ایریا کراچی۔
۳۱۲	محمد خان صاحب گیلانی معرفت ڈاکٹر مسعود الدین حسن کیماڑی کراچی
۳۱۳	عبدالمجید صاحب بٹ ایل بی ۶۷۵ آگرہ تاج کالونی کراچی۔
۳۱۴	عبدالمجید صاحب بٹ ایل بی ۶۷۵ آگرہ تاج کالونی کراچی
۳۱۵	محمد خلیل اللہ صاحب بلاک نمبر ڈی/۵۱۵ عقب بسم اللہ ہوٹل شیرشاہ مہاجر کالونی۔ کراچی۔
۳۱۶	محمد خلیل اللہ صاحب ڈی/۵۱۵۔ شیرشاہ کالونی کراچی۔
۳۱۷	راج میر خان صاحب معرفت نور خان صاحب بلال ہوٹل دریاباد کراچی۔
۳۱۸	عبدالمنیم صاحب ڈی/۲۱۳ متصل اسٹیشن شاپ شیرشاہ کالونی کراچی۔
۳۱۹	ملک قربان حسین صاحب ہیڈ کلرک بغدادالجدید۔ سرکل آفس محکمہ انصار بہاولپور۔
۳۲۰	ملک قربان حسین صاحب ہیڈ کلرک بغدادالجدید۔ سرکل آفس محکمہ انصار بہاولپور۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۳۲۱	محمد عارف صاحب علوی لاء آفیسر ای بی ریلوے چاٹگام۔ م پ
۳۲۲	محمد عارف صاحب علوی لاء آفیسر ای بی ریلوے چاٹگام۔ م پ
۳۲۳	حکیم مشیرالحسن صاحب معرفت محمد عارف علوی صاحب ای بی ریلوے چاٹگام مشرقی پاکستان۔
۳۲۴	حکیم مشیرالحسن صاحب معرفت محمد عارف علوی صاحب ای بی ریلوے چاٹگام۔ مشرقی پاکستان۔
۳۲۵	نرگس بیگم صاحبہ نیشنل سائیکل ہاؤس فریر روڈ سکھر سندھ
۳۲۶	عبدالحمید صاحب کھتری پاڑہ موچی بازار مکان بی/۵۰ سکھر
۳۲۷	امین الدین صاحب فائنل سلور سٹور شاہی بازار سکھر سندھ۔
۳۲۸	محمد عظیم صاحب معرفت دفتر جماعت اسلامی بشارپور سکھر
۳۲۹	محمد ذکی حسن صاحب ۹۸/الف جیل روڈ کراچی۔
۳۳۰	مولانا محمد افضل صاحب بدر علمی کتب خانہ چوک اسلامی مظفرگڑھ
۳۳۱	اللہ بخش صاحب کوٹلہ مغلاں تحصیل جامپور۔ ڈیرہ غازی خان۔
۳۳۲	بشیر بیگم صاحبہ کوٹلہ مغلاں تحصیل جامپور۔ ڈیرہ غازی خان۔
۳۳۳	مولوی عبدالصمد صاحب حاجی پور براستہ راجن پور ضلع ڈیرہ غازی خان
۳۳۴	اللہ ڈیوایا صاحب کوٹلہ مغلاں تحصیل جامپور ضلع ڈیرہ غازی خان۔
۳۳۵	عبدالخالق صاحب کوٹلہ مغلاں تحصیل جامپور۔ ڈیرہ غازی خان۔
۳۳۶	شاہدہ پروین صاحبہ معرفت اسلامی کتب خانہ نیم کی چاڑی سکھر۔
۳۳۷	در محمد صاحب کرانہ مرچنٹ گاڑی احاطہ والس روڈ۔ سکھر سندھ
۳۳۸	نور محمد صاحب کرانہ مرچنٹ گاڑی احاطہ والس روڈ سکھر سندھ۔
۳۳۹	محمد حسن صاحب ماسٹر محمد حسن قریشی صاحب، اسٹیشن سانگھی ڈاک خانہ کھریجانی۔ ضلع سکھر سندھ۔
۳۴۰	عبدالسبحان صاحب مالی پاڑہ ٹنڈو آدم۔
۳۴۱	محمد یوسف صاحب پاکستان ٹریڈنگ کمپنی ٹنڈو آدم۔
۳۴۲	محمد اسمٰعیل صاحب معرفت پاکستان ٹریڈنگ کمپنی ٹنڈو آدم۔
۳۴۳	محمد صدیق صاحب معرفت پاکستان ٹریڈنگ کمپنی ٹنڈو آدم۔
۳۴۴	حسین صاحب معرفت پاکستان ٹریڈنگ کمپنی ٹنڈو آدم۔
۳۴۵	سلطان سلطانہ صاحبہ معرفت عبدالستار صاحب کریانہ مرچنٹ ٹنڈو آدم۔
۳۴۶	رشید احمد صاحب وارڈ نمبر ۴ میانی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔
۳۴۷	محمد حیات اعوان صاحب معرفت میاں غلام نبی صاحب وارڈ نمبر ۴۔ میانی۔ تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔
۳۴۸	ذبیح الرحمٰن صاحب رحمانی معرفت خلیل الرحمٰن صاحب کوارٹر نمبر ڈی ۶/۲ پلاٹ نمبر ۱۴۱ متصل لیاقت شبینہ سیکنڈری اسکول پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی۔
۳۴۹	نکہت خلیل صاحبہ معرفت حکیم السید کے رحمانی۔ کوارٹر ڈی ۶/۲ پلاٹ ۱۴۱ متصل لیاقت شبینہ سیکنڈری اسکول۔ [illegible] کالونی۔ کراچی۔

سلسلہ نمبر	نام اور پتہ
۳۵۰	ذاکر خان صاحب سعود آباد کوارٹر نمبر ۵۰۱/۳۶۱ کراچی ۔
۳۵۱	محمد اکبر خان صاحب جنرل برانچ میپل لیف سیمنٹ فیکٹری داؤد خیل ۔ ضلع میانوالی ۔
۳۵۲	محمد اکبر خان صاحب جنرل برانچ میپل لیف سیمنٹ فیکٹری ۔ داؤد خیل ۔ ضلع میانوالی ۔
۳۵۳	محمد غلام رسول صاحب معرفت خورشید عبادر ریلوے بازار نمبر ۴۸ سید پور ضلع رنگ پور ۔ مشرقی پاکستان
۳۵۴	محمد نبی اکرام صاحب ورکشاپ اکاؤنٹس آفس ۔ ای بی ریلوے پوسٹ آفس سید پور ضلع رنگ پور ۔ م ۔ پ ۔
۳۵۵	عبدالرشید صاحب کلاجہ مرزا بلاک نمبر ۲ گورالی کیمٹی ڈیرہ غازیخاں ۔
۳۵۶	محمد یونس صاحب ولد بوستان صاحب مکان نمبر ۵۶ آوازہ راولپنڈی
۳۵۷	غلام حیدر مسلم صاحب کلرک جنرل پوسٹ آفس راولپنڈی ۔
۳۵۸	حافظ محمد احسن صاحب ڈی بی ہائی اسکول ستور تحصیل کہوٹہ ضلع راولپنڈی مغربی پاکستان ۔
۳۵۹	حافظ خدا بخش صاحب ریلوے پاور ہاؤس راولپنڈی ۔
۳۶۰	نادر بخش صاحب نکٹ نمبر ۵۰۲ لوکو شیڈ ریلوے راولپنڈی ۔
۳۶۱	خلیل الرحمٰن صاحب مکان نمبر ۶ ۔ ٹرنک بازار راولپنڈی ۔
۳۶۲	محمد الیاس صاحب معرفت قاری عبدالرزاق صاحب کہوٹہ راولپنڈی ۔
۳۶۳	قاری عبدالرزاق صاحب خلاتم جنٹ کہوٹہ راولپنڈی ۔
۳۶۴	عبدالرشید صاحب بالمقابل ڈاک خانہ کہوٹہ ضلع راولپنڈی ۔
۳۶۵	حکیم محمد شفیع صاحب شاپ نمبر ۲ تحصیل کہوٹہ ضلع راولپنڈی ۔
۳۶۶	حکیم ارتضیٰ حسن صاحب بابو محلہ ۔ ملتان چھاؤنی ۔
۳۶۷	محمد احمد صاحب معرفت شاہین بک ڈپو ۔ ساؤتھ سرکلر روڈ پشاور صدر ۔ مغربی پاکستان ۔
۳۶۸	عبدالجلیل صاحب مکان نمبر ۲۱۶ نوتحصیہ پشاور صدر ۔
۳۶۹	عبدالرشید فاروقی صاحب ۔ ۲۸ ۔ احاطہ شیورام تانھیا روڈ پشاور چھاؤنی ۔ م ۔ پ ۔
۳۷۰	عبداللہ جان صاحب دوکاندار نزد اسٹیٹ بنک پاکستان ، صدر روڈ ۔ پشاور صدر ۔
۳۷۱	اللہ بخش صاحب ۔ اشرف روڈ بیرون کچہری دروازہ مکان نمبر ۱۱ پشاور شہر ۔ صدر ۔
۳۷۲	عبداللہ رحمانی صاحب بمقام منڈی جہانیاں ضلع ملتان ۔
۳۷۳	عبدالجبار صاحب بمقام منڈی ۔ جہانیاں ڈاک خانہ خاص تحصیل خانیوال ضلع ملتان ۔
۳۷۴	ماسٹر عبدالقادر صاحب معرفت الیکس اشار ہنڈری گجر گلی ، مکان نمبر ۲۴۴ اندرون موچی گیٹ لاہور ۔
۳۷۵	محمد صابر صاحب معرفت الیکس اشار ہنڈری ۔ گجر گلی مکان نمبر ۲۴۴ ۔ اندرون موچی گیٹ لاہور ۔
۳۷۶	صاحبزادہ محمد ابراہیم صاحب دفتر جماعت اسلامی حلقہ لاہور گوالمنڈی ۔ لاہور ۔ پنجاب ۔
۳۷۷	محمد جان صاحب مکان نمبر ۴ گلی نمبر ۲۲ مجاہد نگر لاہور ۔
۳۷۸	حمیرہ نسیم صاحبہ معرفت آباد شاہ پوری روزنامہ "تسنیم" شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور ۔
۳۷۹	منیرہ اسماء صاحبہ معرفت آباد شاہ پوری روزنامہ "تسنیم" شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور ۔
۳۸۰	تاج الدین صاحب کمٹی بازار کوچہ بیلی رام ۔ مکان نمبر جی ۳۵۹ ۔ لاہور مغربی پاکستان
۳۸۱	عبدالحمید صاحب نیا مدرسہ اچھرہ لاہور ۔
۳۸۲	حافظ صالح محمد صاحب کشش ، ورلیج ابد ذکر بھلوال قدیم ڈاک خانہ ایضاً تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا ۔
۳۸۳	ناصرہ خاتون صاحبہ معرفت محمد انور خان صاحب ۱۳۳۷/ بی سیٹ لائٹ ٹاؤن ۔ راولپنڈی ۔
۳۸۴	زاہدہ پروین صاحبہ معرفت غلام رسول صاحب ۔ محلہ عیدگاہ گلی نمبر ۶ مکان نمبر بی ، بی ۶۹۸ راولپنڈی شہر ۔
۳۸۵	عبدالوحید صاحب قریشی معرفت میاں عبدالعزیز فارمین کو عکر عبدالحمید قریشی کوٹھے ۔ زراعتی کالج ورکشاپ ۔ لائلپور ۔
۳۸۶	سید وجاہت حسین صاحب معرفت سید عبدالفتح فاطمی صاحب کلیم آفس ای ۔ بی ریلوے چاٹگام ۔ م ۔ پ
۳۸۷	عبداللطیف صاحب فرقلی واٹر سافٹنگ پلانٹ ۔ کوٹری ۔
۳۸۸	عبدالرحیم صاحب کھارادر ۔ الیاس اسٹریٹ ۔ حاجی بچہ گروپ روڈ بھیمن پل ۔ ڈی لوٹیا بلڈنگ نمبر ۱۱/۱۸۶ کراچی ۔
۳۸۹	یونس صاحب معرفت اشرفی بیڑی ورکس ۔ بہار کالونی مینری روڈ ۔ کراچی ۔
۳۹۰	ذاکر علی صاحب صدیقی معرفت جمعیت اسلامی طلبہ ۲۳ اسٹریچن روڈ کراچی پاکستان ۔
۳۹۱	امیر شاہ صاحب ۔ جے بی ٹیلرنگ ہاؤس ۔ ولی محمد حسن علی روڈ چاکیواڑہ ۔ کراچی ۔
۳۹۲	داؤد ولد قاسم صاحب بمبئی بکڈپو ۔ بندر روڈ ۔ کرایس مشن روڈ کراچی ۔
۳۹۳	محمد حسیب ولد علی محمد صاحب چاکیواڑہ نمبر ۲ جان محمد موسیٰ کمپاؤنڈ کراچی ۔
۳۹۴	لال محمد ولد خدا بخش صاحب شیر شاہ لین لیاری کوارٹرز کراچی ۔
۳۹۵	ابراہیم صاحب نوسی جمعہ ہوٹل ولی محمد حسن علی روڈ چاکیواڑہ
۳۹۶	محمد صلاح الدین صاحب انجمن اسلامیہ سیکنڈری اسکول لالوکھیت نمبر ۱ کراچی ۔

مسلسل نمبر	نام اور پتہ
۳۹۷	نکہت ناز صاحبہ ڈرگ روڈ کالونی مکان نمبر ۸۰۲/۲ کراچی.
۳۹۸	بی بی ربیعہ خاتون صاحبہ معرفت ارشد حسین خان صاحب مکان نمبر ۲/۲۴۴ شہاب الدین غوری کالونی کراچی.
۳۹۹	بی بی رضیہ خاتون صاحبہ معرفت ارشد حسین خان صاحب مکان نمبر ۲/۲۴۴ شہاب الدین غوری کالونی کراچی.
۴۰۰	عزیز الرحمٰن صاحب (پاک نمبر ۵۶۳۵۰ الیف، ایم اے) موضع ڈاکخانہ گل بیلہ ضلع پشاور.
۴۰۱	عزیز الرحمٰن صاحب (پاک نمبر ۵۶۳۵۰ الیف، ایم اے) موضع ڈاک خانہ گل بیلہ ضلع پشاور.
۴۰۲	حیات محمد صاحب کلرک دفتر ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر میانوالی.
۴۰۳	محمد اکرم خان صاحب معرفت زمان خان صاحب نامہ نگار اخبار آفاق میانوالی.
۴۰۴	سعید نور صاحب معرفت زمان خان صاحب نامہ نگار اخبار آفاق میانوالی.
۴۰۵	خدیجہ بیگم صاحبہ معرفت زمان خان صاحب نامہ نگار اخبارات میانوالی.
۴۰۶	خان زمان خان صاحب نیوز ایجنٹ میانوالی.
۴۰۷	شیخ محمد سرور صاحب واصفی معرفت انجمن خانقاہ احاطہ خانقاہ بلاک نمبر ۱۷ سرگودھا.
۴۰۸	شیخ محمد انور گوہر صاحب واصفی معرفت انجمن خانقاہ احاطہ خانقاہ۔ بلاک نمبر ۱۷۔ سرگودھا.
۴۰۹	شیخ محمد منور صاحب واصفی معرفت انجمن خانقاہ۔ احاطہ خانقاہ۔ بلاک نمبر ۱۷ سرگودھا.
۴۱۰	عبدالواحد صاحب نیا مدرسہ ایبٹ ۵، لاہور.
۴۱۱	نسیم اللہ خان صاحب ۵۔۵/۱۱۰ شاہ وکشا روڈ کوئٹہ.
۴۱۲	نسیم اللہ خان صاحب ۵۔۵/۱۱۰ شاہ وکشا روڈ کوئٹہ.
۴۱۳	نسیم اللہ خان صاحب ۵۔۵/۱۱۰ شاہ وکشا روڈ۔ کوئٹہ.
۴۱۴	محمد شفیق اللہ خان صاحب سیزر بلڈنگ فلیٹ نمبر ۲ آسن مل، اودھا روڈ، رتن تالاب کراچی.
۴۱۵	رفیق بانو صاحبہ۔ سیزر بلڈنگ فلیٹ نمبر ۲۔ آسن مل اودھا روڈ۔ رتن تالاب کراچی.
۴۱۶	سید راحت علی صاحب معرفت سید محمد علی۔ سی اے آفس کراچی پورٹ ٹرسٹ کراچی.
۴۱۷	خستہ خان صاحب معرفت ظہور احمد عبدالرؤف ایجنٹ مرچنٹ رانگی واڑہ کراچی شہر.
۴۱۸	خدا بخش صاحب گل محمد لائن نزد ملا تاؤر ہاؤس پول نمبر نیپئر روڈ شہر کراچی.
۴۱۹	زینب النساء بیگم محمد صاحبہ معرفت محمد اللہ داد صاحب مینا ہوٹل دیوا چند رتن چند روڈ موسیٰ لین کراچی.

مسلسل نمبر	نام اور پتہ
۴۲۰	مسماۃ مسرت منظر خیری صاحبہ ۹/۹ بزرٹا لائن کراچی.
۴۲۱	نور محمد صاحب ایل، ڈی سی سپلائی اینڈ ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ فریئر روڈ کراچی.
۴۲۲	پی کے۔ ارمو صاحب معرفت اے۔ کے ریسٹورنٹ فریئر اسٹریٹ صدر
۴۲۳	انصار احمد صاحب بمقام حیدرآباد نعل بندگلی مکان نمبر ڈی ۶۳/۱۰۱۲ نزد سبز مسجد اپوزٹ ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد.
۴۲۴	عائشہ بیگم صاحبہ مکان نمبر ۶۳/۱۰۱۲ ڈی۔ نعل بندگلی نزد گرین مسجد بالمقابل ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد سندھ.
۴۲۵	ممتاز بیگ صاحب بمقام حیدرآباد سندھ گدو روڈ بالمقابل سیشن کورٹ نزد سندھ یونیورسٹی.
۴۲۶	رضیہ بیگم صاحبہ مکان نمبر ۶۳/۱۰۱۲ ڈی۔ نعل بندگلی نزد سبز مسجد بالمقابل ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد سندھ.
۴۲۷	ایاز بیگ صاحب مکان نمبر ۶۳/۱۰۱۲ ڈی نعل بندگلی نزد سبز مسجد بالمقابل ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد سندھ.
۴۲۸	الیاس بیگ صاحب مکان نمبر ۶۳/۱۰۱۲ ڈی۔ نعل بندگلی نزد سبز مسجد بالمقابل ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد سندھ.
۴۲۹	خوش محمد صاحب منڈی قاسم لاہور چھاؤنی.
۴۳۰	عنایت اللہ خان صاحب مکان نمبر ۲۳۹، گلی نمبر ۱۹ بنگالی محلہ صدر بازار لاہور چھاؤنی.
۴۳۱	صالح محمد صاحب معرفت انصار برادرز بیرون پاک گیٹ ملتان شہر.
۴۳۲	محمد شفیق صاحب پاکستان جنرل اسٹور لوہاری چوک ملتان شہر.
۴۳۳	صدیق احمد صاحب محلہ رائیزارگان مکان نمبر ۴/۳۰۰، اندرون لوہاری گیٹ ملتان شہر.
۴۳۴	محمد اکرم صاحب مکان نمبر ۶۲۳ وارڈ نمبر ۴، اندرون لوہاری گیٹ ملتان شہر.
۴۳۵	محمد ابو قیصر صاحب فاروقی باؤت گوٹ ملیر سٹی.
۴۳۶	چودھری نیک عالم خان صاحب کوسٹ آفس آرڈیننس فیکٹری واہ کینٹ.
۴۳۷	عبداللطیف صاحب ہوٹل والے۔ اسٹیشن روڈ جیکب آباد.
۴۳۸	خواجہ بشیر احمد صاحب نزد پیر بخاری جیکب آباد.
۴۳۹	عبدالرشید صاحب حیدر لودی ریلوے پوسٹ آفس جیکب آباد.
۴۴۰	ارباب عبداللہ خان صاحب ایس کے آر ایف سینٹر راولپنڈی.
۴۴۱	صاحبزادہ ہدایت الرحمٰن صاحب محلہ معظم خیل موضع ماشو گگر ڈاک خانہ بڈھ بیر تحصیل و ضلع پشاور.
۴۴۲	محمد صدیق صاحب شیخ ریلوے گارڈ۔ لال بارک کوارٹر ۱۶ کوٹری
۴۴۳	عبدالقدوس صاحب جعفری کلرک کوٹنگ این ڈبلیو آر کوٹری سندھ.
۴۴۴	فیض علی صاحب فیڈر دار ٹرانسفٹنگ کوارٹر ۲۵۹/ڈی این ڈبلیو آر کوٹری

سعل نمبر	نام اور پتہ

۴۴۵ سید جمیل احمد صاحب معرفت سید محمد مجتبےٰ صاحب ریلوے گارڈ کوارٹر نمبر ۲۶۶/بی۔ این ڈبلیو آر کوٹری۔
۴۴۶ سیدہ کبریٰ خاتون صاحبہ۔ سید جمیل احمد صاحب معرفت سید محمد مجتبےٰ گارڈ کوارٹر نمبر ۲۶۶/بی ریلوے کالونی کوٹری۔
۴۴۷ عبدالمجید صاحب ولد عبدالغنی صاحب دکاندار لوہا ریلوے روڈ ناروال۔ ضلع سیالکوٹ۔
۴۴۸ معراج دین صاحب دکاندار کریانہ فروش۔ ریلوے روڈ ناروال ضلع سیالکوٹ۔ پنجاب۔
۴۴۹ محمد اصغر ملہی صاحب وکیل۔ ناروال ضلع سیالکوٹ۔
۴۵۰ محمد اصغر ملہی صاحب وکیل ناروال ضلع سیالکوٹ۔
۴۵۱ محمد اصغر ملہی صاحب وکیل ناروال ضلع سیالکوٹ
۴۵۲ محمد اصغر ملہی صاحب وکیل ناروال ضلع سیالکوٹ۔
۴۵۳ عبدالحمید صاحب آئرن مرچنٹ ریلوے روڈ ناروال سیالکوٹ۔
۴۵۴ محمد رفیق صاحب اہل سلطانی اسٹریٹ نزد گھاس منڈی ظفر وال روڈ، ناروال ضلع سیالکوٹ۔
۴۵۵ محمد صادق صاحب معرفت ظفر جنرل ہٹور ناروال ضلع سیالکوٹ۔
۴۵۶ سجاد حسین صاحب معرفت شیخ الطاف حسین بشیر حسین گنج ناروال۔
۴۵۷ محمد اسلم صاحب ولد شاہ دین صاحب معرفت محمد اسلم سائیکل والا۔ ناروال۔ ضلع سیالکوٹ۔
۴۵۸ محمد انور صاحب معرفت محمد اسلم سائیکل مرچنٹ ریلوے روڈ ناروال ضلع سیالکوٹ۔
۴۵۹ طارق محمود صاحب ولد محمد اسلم صاحب محلہ معماران معرفت سلم سائیکل ورکس ناروال ضلع سیالکوٹ۔
۴۶۰ غلام قادر صاحب تمباکو فروش ایسٹ بازار ناروال سیالکوٹ۔
۴۶۱ محمد امین صاحب ولد عبدالکریم صاحب محلہ معماران ناروال سیالکوٹ۔
۴۶۲ محمد حسین صاحب کھٹی معرفت دارالسلام ناروال ضلع سیالکوٹ
۴۶۳ محمد سعیدالدین صاحب جیبی مدرس گنج ماچھی ڈاک خانہ خان بیلہ اسٹیشن لیاقت پور۔
۴۶۴ محمد قاسم صاحب پینٹر۔ موسےٰ لین بچھڑ روڈ متصل بالنگ کلب کراچی شہر۔ م۔پ۔
۴۶۵ محمد احمد صاحب موسےٰ لین بچھڑ روڈ گھاس گنج پول نمبر ۳ کراچی
۴۶۶ محمد عبدالحمید صاحب سوئچ بورڈ اپریٹر بایا درہاؤس ٹرسٹ ملز ورکس ریڑھی لانڈھی کراچی۔
۴۶۷ محمد موسےٰ صاحب محلہ معین آباد عقب ٹرسٹ میچ فیکٹری نزد سکڑی مسجد لانڈھی کراچی۔
۴۶۸ عبدالقیوم صاحب ویونگ سیکشن کارڈ نمبر ۱۳۰۸ داؤد کاٹن ملز لمیٹڈ۔ لانڈھی کراچی۔
۴۶۹ رحیمی عرف ریڑھی صاحبہ قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۴۷۰ جعفر ولد نانگا صاحب قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۴۷۱ ابراہیم ولد عثمان کندہ قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۴۷۲ چاند سلطانہ صاحبہ محلہ معین آباد جھونپڑی نمبر ڈی ۱۷۹/۲ عقب ٹرسٹ میچ فیکٹری لانڈھی کراچی۔
۴۷۳ حسو ولد پیرانو صاحب قصبہ بولٹ گوٹ نزد ریڑھی لانڈھی کراچی۔
۴۷۴ گل محمد ولد پیرانو صاحب قصبہ بولٹ گوٹ نزد ریڑھی لانڈھی کراچی۔
۴۷۵ تو تا علیخاں صاحب گاندھی نگر گلی نمبر ۲۹ کراچی۔
۴۷۶ شمسازہ بیگم صاحبہ معرفت ذوالاصیاں گاندھی نگر گلی نمبر ۲۹ کراچی
۴۷۷ آل علی خاں صاحب گاندھی نگر گلی نمبر ۲۹ مقابل شاہ محمد خاں بلڈنگ نمبر ۱ کراچی شہر۔
۴۷۸ اصغر علی خاں صاحب گاندھی نگر گلی نمبر ۲۹ مقابل شاہ محمد خاں بلڈنگ نمبر ۱ کراچی شہر۔
۴۷۹ شہزاد محمد صاحب ۱۳۸۔ محمود آباد کراچی۔
۴۸۰ سیدہ نزہت سلطانہ صاحبہ معرفت سید محی الدین صاحب آئی سی آئی پاکستان لمیٹڈ ڈائز ڈیپارٹمنٹ پوسٹ بکس ۴۷۳۱ کراچی۔
۴۸۱ سید وقارالحسن صاحب معرفت سید محمد ابراہیم ریٹائرڈ تحصیلدار لاہور۔ کینال ریسٹ ہاؤس دھرم پورہ لاہور۔
۴۸۲ سید شاہ صادق اللہ صاحب ندوی۔ ہاشمی ٹی اسٹال حاجی مینشن اے ایم نمبر ۱ فریر روڈ کراچی۔
۴۸۳ سید خورشید صاحب ۳/۴۲ بہار کالونی مسان روڈ کراچی۔
۴۸۴ بلقیس خاتون صاحبہ معرفت سید امان اللہ ۳۰۸/۲ الیس سعود آباد کراچی
۴۸۵ سید امان اللہ صاحب سعود آباد کالونی ۳۰۸/۲ الیس کراچی۔
۴۸۶ کنیز فاطمہ صاحبہ مکان نمبر ۶۲۳/۱ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔
۴۸۷ غوث فاطمہ صاحبہ مکان نمبر ۶۲۳/۱ ڈرگ روڈ مہاجر کالونی کراچی۔
۴۸۸ محمد عمر صاحب موسیٰ لین بچھڑ روڈ ایل ۵۴ کراچی۔
۴۸۹ محمد الیاس صاحب موسیٰ لین بچھڑ روڈ گھاس گنج پول نمبر ۳ کراچی۔
۴۹۰ محمد یسین صاحب موسیٰ لین بچھڑ روڈ گھاس گنج پول نمبر ۳ کراچی۔
۴۹۱ محمد اسحٰق صاحب موسیٰ لین بچھڑ روڈ گھاس گنج پول نمبر ۳ کراچی۔
۴۹۲ مریم بی بی صاحبہ موسیٰ لین بچھڑ روڈ گھاس گنج پول نمبر ۳ کراچی۔
۴۹۳ عصمت نفیس صاحبہ معرفت محمد نفیس خاں صاحب ۲/۳۰ ذکریا اسٹریٹ رام پارٹ روڈ کراچی۔
۴۹۴ عبدالباری خاں صاحب اے ایس ایم ریلوے اسٹیشن دھولی ضلع بستی۔
۴۹۵ محمد یار صاحب پوائنٹس مین ریلوے اسٹیشن دھولی ضلع بستی۔
۴۹۶ تسنیم کوثر صاحبہ سی ۲۹۸ مینا بازار راولپنڈی۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۴۹۷	سید محمد طیب صاحب مکان نمبر ۲۱/بی جے آریہ محلہ راولپنڈی.
۴۹۸	سلیم اللہ صاحب مکان نمبر ۳۴۴/کیو محلہ چوک امام باڑہ راولپنڈی
۴۹۹	سعید احمد صاحب مکان ۱۱۴۱/بی محلہ رام نگر راولپنڈی.
۵۰۰	سید محمود حسن صاحب مکان نمبر ۱۰۰۶/ا و یہ سرام نگر صغریاں راولپنڈی.

گروپ نمبر: ۵

۱ انوری بیگم صاحبہ مکان نمبر ۳۴۴/کیو چوک امام باڑہ راولپنڈی.
۲ زکیہ بی بی قریشی صاحبہ معرفت عبدالرشید صاحب قریشی. پی. اے
او سی ۶۵. میکلنگ روڈ. کوئٹہ.
۳ عفت رشید صاحبہ معرفت عبدالرشید صاحب قریشی. پی. اے
او سی. ۶۵ میکلنگ روڈ کوئٹہ.
۴ اعجاز حسن صاحب، ۱۰۷ آگرہ تاج کالونی کراچی.
۵ مقبول احمد صاحب ۱۸/۱۲ بندر روڈ کراچی.
۶ محمد رئیس احمد صاحب قدوائی، این ایس آر. پی این ایس اقبال
چارٹ ڈپو، ویسٹ وارف کراچی
۷ سید اعظم علی صاحب، اعظم کلاتھ ہاؤس نور کلاتھ مارکیٹ دکان نمبر
۲ لالوکھیت مین روڈ کراچی.
۸ نذیر احمد صاحب کراچی
۹ سید احمد صاحب کراچی
۱۰ محمد نقی صاحب معرفت عبدالستار صاحب گرین مرچنٹ ریلوے
کراسنگ ٹنڈو آدم
۱۱ مہراسب خان صاحب کلرک پوسٹ آفس راولپنڈی.
۱۲ کرم دار صاحب پوسٹ مین ہیڈ آفس راولپنڈی.
۱۳ سید مقصود علی صاحب شعلہ مقام وڈاک خانہ میرا خورہ دبراستہ
ہیڈ آفس راولپنڈی شہر.
۱۴ مہرالنسا بیگم صاحبہ ڈھوک فضل الٰہی نزد چونگی نمبر ۲۲ راولپنڈی.
۱۵ محمد صفدر صاحب فاروقی مہاجر کالونی مکان ۱۰۲ ہارون آباد بہاولنگر
۱۶ محمد ابوبکر صاحب کھانڈہ مسلم ہوٹل. کھارادر کراچی.
۱۷ محمد عبدالرحمٰن صاحب ۱۹۶۴ ٹرمائن اینڈ سیپچ بورڈ اینڈ ٹیٹ کمپنی
سوڈا کمپنی. کھیوڑہ ضلع جہلم.
۱۸ صوفی غلام حسن صاحب دکان بازار نان بائی. میانوالی.
۱۹ فضل کریم صاحب معرفت عبدالکریم ڈرافٹسمین متصل سرکل میانوالی.
۲۰ عبدالکریم صاحب ڈرافٹسمین متصل سرکل میانوالی.
۲۱ غلام رسول صاحب مکان متصل غلہ منڈی میانوالی.

رول نمبر	نام اور پتہ
۲۲	محمد خلیل صاحب دکان متصل غلہ منڈی میانوالی.
۲۳	رفیع اللہ صاحب محلہ فتح میاں شیر میانوالی.
۲۴	رفیع اللہ صاحب بی اے بی ٹی محلہ میاں فتح شیر میانوالی.
۲۵	ملک غلام محمد صاحب کلرک آف کورٹ سینئر سول جج میانوالی.
۲۶	ڈاکو معرفت ملک غلام محمد صاحب کلرک آف کورٹ عدالت سینئر سول جج. میانوالی.
۲۷	خوشی محمد صاحب کلرک ٹیلیگراف ورکشاپ کوٹری.
۲۸	محمد صدیق صاحب اکاؤنٹس آفس ٹیلیگراف ورکشاپ کوٹری.
۲۹	عابدہ صاحبہ معرفت لطیف محمد صاحب انچارج این ڈبلیو آر کوٹری.
۳۰	طلعت صغیر احمد گورنمنٹ کوارٹر نمبر ۵/ای بلاک نمبر ۲۱، جہانگیر روڈ ایسٹ کراچی.
۳۱	عبدالغفور صاحب نور کلاتھ مارکیٹ دکان نمبر ۲ لالوکھیت کراچی.
۳۲	عباس حسن صاحب کوارٹر نمبر ۵۵۹/ا خالدگی گھر لالوکھیت کراچی.
۳۳	امیر حسن صاحب کوارٹر نمبر ۵۵۹/ا خالدگی گھر لالوکھیت کراچی.
۳۴	نگار انجم صاحبہ ۱۶۶/الف جہانگیر روڈ ویسٹ کراچی.
۳۵	سیدہ نورالنسا ممتاز صاحبہ زوجہ سید مسعود حسین صاحب مکتبہ فکر اسلامی بس ہیلیہ بس اسٹاپ کراچی.
۳۶	محمد صدیق صاحب ۱۳۵/سی. موتی بازار راولپنڈی.
۳۷	عبدالرحمٰن صاحب عزیز اسلامی دواخانہ مورو ضلع نواب شاہ.
۳۸	محمد ادریس صاحب مکان نمبر ۱ سکرنڈ ضلع نواب شاہ
۳۹	سید مظفر حسین صاحب اسلامی دواخانہ مورو ضلع نواب شاہ
۴۰	نظر محمد خالد صاحب. منوآباد نزد نیا مدرسہ ضلع نواب شاہ
۴۱	زرینہ بیگم صاحبہ معرفت نظر محمد خالد صاحب منوآباد نزد نیا مدرسہ نواب شاہ
۴۲	حکیم گل محمد صاحب دیسی دواخانہ مسان روڈ کراچی.
۴۳	عبدالقیوم صاحب مکان ۵۰۹/ای مسان روڈ بھنڈ دینج کیماڑی کراچی
۴۴	محمد برہان صاحب پلاٹ نمبر ۲۰ ادہو رو داس تارا چند روڈ جونا دھوبی گھاٹ گارڈن ویسٹ کراچی.
۴۵	آمنہ خاتون صاحبہ پلاٹ نمبر ۲۰. ادہو رو داس تارا چند روڈ جونا دھوبی گھاٹ گارڈن ویسٹ کراچی.
۴۶	اسلامی بیگم صاحبہ معرفت خطیب جامع مسجد مقابل وزیر اعظم ہاؤس کراچی.
۴۷	مولانا قاری محمد علیم الرحمٰن صاحب معرفت خطیب جامع مسجد بالمقابل وزیراعظم ہاؤس. کراچی.
۴۸	ایم اے. آر غضنفر رفیق صاحب جے پوری. جے پور ہاؤس، نمبر ۴۸ جی ایچ لالوکھیت کراچی.
۴۹	حافظ عزیز الرحمٰن صاحب معرفت خطیب جامع مسجد بالمقابل وزیراعظم ہاؤس کراچی.

رکنیت نمبر	نام اور پتہ
۵۰	قلندر بخش صاحب ۱۷ وکٹوریہ روڈ کراچی نمبر۴
۵۱	محمد ثاقب صاحب معرفت اشرف صاحب کرانہ مرچنٹ بومنٹ روڈ کراچی
۵۲	مولانا محمد شفیع صاحب کوارٹر نمبر ۸/۱۹۳ ریلوے کالونی کراچی۔
۵۳	عبدالقیوم صاحب کوارٹر نمبر ۸/۱۹۲ ریلوے کالونی کراچی۔
۵۴	محمد شفیع صاحب معرفت محمد یعقوب صاحب ۵۰ وکٹوریہ روڈ کراچی
۵۵	بشیر احمد صاحب معرفت خطیب جامع مسجد مقابل دریا اعظم ہاؤس کراچی
۵۶	اقبال فاطمہ صاحبہ ۶۵۸/۶ لالوکھیت کراچی۔
۵۷	محمد صابر خاں صاحب معرفت محمد شفیع خاں صاحب۔ پیلس ہوٹل کچہری روڈ کراچی۔
۵۸	اورنگ زیب صاحب معرفت اشرف صاحب کرانہ مرچنٹ بومنٹ روڈ کراچی
۵۹	محمد اختر صاحب صدیقی عباسی مارکیٹ نمبر ۱۶۶ ماڈل کالونی کراچی۔
۶۰	محمد سعید شاہ صاحب معرفت ڈاکٹر کے بی موڈی صاحب ۱۵۱ کچہری روڈ۔ کراچی۔
۶۱	مولوی قلندر صاحب امام مسجد۔ مسجد چوکی پولس ہری پور ضلع ہزارہ۔ مغربی پاکستان۔
۶۲	فضل الرحمٰن صاحب کوارٹر نمبر ۵ ریلوے پختہ کوارٹرز بلاک نمبر ۲۲۷ مغل پورہ لاہور۔
۶۳	محمد رمضان صاحب مکان نمبر۱ شرف منزل نزد ریلوے اسٹیشن مغلپورہ لاہور
۶۴	شیخ اعجاز احمد صاحب ۳۔ اے کوپر روڈ لاہور۔
۶۵	اللہ دتا پہلوان صاحب لدھیانوی وارڈ نمبر۹ جلال پور جٹاں ضلع گجرات،
۶۶	قاضی فاروق احمد صاحب منگھا پیر ٹیلی فون ایکس چینج، ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای کراچی۔
۶۷	حسین احمد صاحب کوارٹر نمبر ۲۱/۵ بی۔ ناظم آباد کراچی۔
۶۸	سید ریاض احمد صاحب بخاری کوارٹر نمبر ۱۷، ۴/ ناظم آباد کراچی۔
۶۹	شمیم فاطمہ ہاشمی صاحبہ ۴/۱۷۸ مہاجر کوارٹرز ناظم آباد کراچی۔
۷۰	نسیم فاطمہ ہاشمی صاحبہ معرفت سید ریاض احمد صاحب بخاری کوارٹر نمبر ۱۷، ۴/ ناظم آباد کراچی۔
۷۱	ٹی احمد صاحب ٹی شاپ وکھل بھائی پٹیل روڈ عالی کالونی کراچی
۷۲	نور اللہ مسعود صاحب صدیقی ۴۳ حیدرآباد کالونی کراچی۔
۷۳	محمد ادریس صاحب ۵۳ حیدرآباد کالونی کراچی۔
۷۴	محمد ذکریا صاحب معرفت عبدالستار صاحب درانی۔ دوکان زردوزی بالمقابل مسجد نو ٹنکی نمبر۲ کاغذی بازار کراچی۔
۷۵	بشیر احمد خاں صاحب کراچی میونسپل کارپوریشن اسیر و کلکٹر ڈیپارٹمنٹ کراچی۔
۷۶	لال الدین صاحب اکاؤنٹس آفس ٹیلیگراف ورکشاپ کوٹری۔

رکنیت نمبر	نام اور پتہ
۷۷	زبیدہ خاتون صاحبہ معرفت کنور سعید اللہ بی اے (آنرز) معلمہ ہائی اسکول جنن براستہ ڈنگہ گجرات۔
۷۸	سید نور الہدیٰ صاحب سروال کاٹن فیکٹری ٹالی ضلع حیدرآباد سندھ
۷۹	سید نور الہدیٰ صاحب سروال کاٹن فیکٹری ٹالی ضلع حیدرآباد سندھ
۸۰	احسان الٰہی صاحب معرفت جمعدار غلام محمد اینڈ سنز غلہ منڈی سرگودھا
۸۱	محمد رمضان صاحب سنار گلی ٹنڈو آدم۔
۸۲	رحمت اللہ صاحب معرفت پاک ٹریڈنگ کمپنی ٹنڈو آدم۔
۸۳	محمد رمضان صاحب پاکستان ٹریڈنگ کمپنی ٹنڈو آدم۔
۸۴	محمد رمضان صاحب پاکستان ٹریڈنگ کمپنی ٹنڈو آدم۔
۸۵	محمد یوسف صاحب حاجی عبداللہ فلور مل اسٹیشن روڈ ٹنڈو آدم
۸۶	محمد صاحب محمدی تاجرمل اسٹیشن روڈ ٹنڈو آدم۔
۸۷	تسنیم صاحب عبدالستار حاجی عثمان آئل مل بمبئی بازار ٹنڈو آدم
۸۸	محمد اعظم صاحب فاروقی مہاجر کالونی مکان ۱۰۲ ہارون آباد بہاولنگر۔
۸۹	عزالدین بانو صاحبہ مکان نمبر ۲۸۵ مہاجر کالونی ہارون آباد بہاولنگر۔
۹۰	پروین اختر صاحبہ، عبدالقیوم خاں صاحب مدرس مڈل اسکول چک نمبر آر ۸۲/۵ ڈاک خانہ ہارون آباد ضلع بہاولنگر۔
۹۱	موسیٰ عبدالمحصی صاحب انچارج للذمی تعلیم ہارون آباد ضلع بہاولنگر
۹۲	احمد حسین صاحب مدرس مڈل اسکول چک نمبر آر ۵/۸ ڈاک خانہ ہارون آباد ضلع بہاولنگر۔
۹۳	محمد ابراہیم گیلانی صاحب مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ہارون آباد ضلع بہاولنگر،
۹۴	تاج دین صاحب امیر دین تاج دین دال پائے ہارون آباد بہاولنگر۔
۹۵	محمد علی صاحب دفتر میونسپل کمیٹی ہارون آباد بہاولنگر۔
۹۶	غلام جیلانی صاحب ۲۴/۱۲ ایف فیڈرل ایریا کراچی
۹۷	آصف علی صدیقی صاحب ۴۳ ایف جیل روڈ کراچی۔
۹۸	سردار بہادر صاحب کلرک اسٹیشن ماسٹر این ڈبلیو آر کوٹری سندھ۔
۹۹	عبدالرحمٰن صاحب عسکری موسیٰ لین ریواچند تن چند روڈ کراچی۔
۱۰۰	محمد عزیز صاحب اے۔ بی۔ بی۔ این۔ ایس، او این ۲۴۱۳۷ قائم منوڑا۔ کراچی،
۱۰۱	مسعود المصطفیٰ صاحب ۶۲۳ ہاؤسنگ سوسائٹی کالونی کراچی۔
۱۰۲	محمد صادق صاحب لاہور۔
۱۰۳	محمد قاسم صاحب پاکستان تمباکو کمپنی لمیٹڈ راجشاہی گوڈاؤن راج شاہی۔ مشرقی پاکستان۔
۱۰۴	سید مسعود احمد صاحب اردو لائبریری رانی بازار۔ ڈاک خانہ گھوڑامارا راج شاہی،
۱۰۵	عبدالمتین صاحب پی ایچ انجینئرنگ آفس ڈاکخانہ گھوڑامارا راجشاہی،

رول نمبر	نام اور پتہ
۱۰۶	عبدالمتین صاحب پی ایچ انجینئرنگ آفس گھوڑا مارا راجشاہی۔
۱۰۷	عبدالمتین صاحب پی ایچ انجینئرنگ آفس گھوڑا مارا راجشاہی۔
۱۰۸	مشرف حسین صاحب ۵/ایف نیو مسلم کالج ہوسٹل راجشاہی۔
۱۰۹	سید ابوالخیر سیفی صاحب ولی منزل آلوپٹی گھوڑا مارا راجشاہی۔
۱۱۰	محمد مصطفےٰ کمال پی۔ ایچ ای آر جی جی پی او گھوڑا مارا راج شاہی مشرقی پاکستان۔
۱۱۱	محمد مصلح خاں صاحب۔ پی۔ ایچ۔ انجینئرنگ۔ پی۔ او گھوڑا مارا راجشاہی۔ مشرقی پاکستان
۱۱۲	محمد مجیب الرحمٰن۔ ضلع جاہی پور پاکوریا۔ پی۔ او۔ زمان آباد۔ راجشاہی۔ مشرقی پاکستان
۱۱۳	ایس۔ ایم کفیل صاحب۔ ۱۱۔ نیلام بادشاہ روڈ۔ ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)
۱۱۴	محمد شفیع اللہ صاحب۔ ضلع لکشی نراین پور۔ پی۔ او۔ میدی کورٹ۔ نواکھالی
۱۱۵	مسز فیروزہ بیگم۔ پی۔ او ضلع لوہالیہ۔ پی۔ ایس پاٹیاکھالی۔ باریسال۔
۱۱۶	نورالحق صاحب تعلقہ دار۔ ضلع خدرا کاٹھی۔ پی۔ او کلاش کھاتی۔ پی۔ ایس۔ باری گنج۔ باریسال۔
۱۱۷	منیر الزماں صاحب۔ ضلع نرتان سینا کنڈا۔ پی۔ او لوہیت پور۔ ڈھاکہ۔
۱۱۸	اے۔ کے ایم شفاعت اللہ صاحب۔ پروفیسر جیاگرافی ڈیپارٹمنٹ راجشاہی کالج۔ راجشاہی
۱۱۹	مسماۃ صفورہ بیگم صاحبہ معرفت شیخ خداداد خاں صاحب حسینی گنج شیخ پاڑہ راجشاہی۔ م۔ پ
۱۲۰	محمد منیار علی صاحب۔ معرفت شیخ خداداد خاں صاحب۔ شیخ پاڑہ حسینی گنج راجشاہی۔
۱۲۱	مسماۃ زہرہ نورالنساء بیگم صاحبہ۔ معرفت شیخ خداداد خاں صاحب شیخ پاڑہ حسینی گنج راجشاہی۔
۱۲۲	نرگس آرا بیگم صاحبہ معرفت ایم۔ اے صادق صاحب۔ نیرنگ پور۔ مولی باری۔ پی۔ او ہوسیا جھیرا۔ مشرقی پاکستان
۱۲۳	راشدہ خانم صاحبہ ۱۲ مریم منزل مول شنکر دیاس روڈ رنچھوڑ لائن کراچی
۱۲۴	عبدالرحمٰن صاحب ۳ سی/پی ٹی جام شورہ غلام محمد بیراج کوٹری۔
۱۲۵	عبدالرحمٰن صاحب ۳ سی/پی ٹی جام شورہ غلام محمد بیراج کوٹری۔
۱۲۶	عبدالرحمٰن صاحب ۳ سی/پی ٹی جام شورہ غلام محمد بیراج کوٹری
۱۲۷	عبدالرحمٰن صاحب ۳ سی/پی ٹی جام شورہ غلام محمد بیراج کوٹری۔
۱۲۸	ایم اے حمید صاحب دالی سار ڈاین۔ ڈبلیو۔ آر کوٹری۔
۱۲۹	محمد صادق صاحب الصادق فرمی سٹور نوتھیہ روڈ پشاور صدر
۱۳۰	مولانا فضل واحد صاحب مسجد حسینی گراں چوک ناصر خاں پشاور
۱۳۱	فضل رزاق صاحب یونیورسٹی ہاسٹل نمبر ۲ پشاور یونیورسٹی پشاور
۱۳۲	چوہدری سراج دین صاحب ولد محمد بوٹا صاحب لائلپوری چک نمبر آر ۱۴/۹۴ ڈاکخانہ ہارون آباد ضلع بہاول نگر۔
۱۳۳	زبیدہ بیگم صاحبہ مکان نمبر ۱۹۱ مہاجر کالونی ہارون آباد بہاولنگر۔
۱۳۴	رضیہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر ۱۹۱ مہاجر کالونی ہارون آباد بہاولنگر
۱۳۵	محمد اسلم صاحب مکان نمبر ۱۹۱ مہاجر کالونی ہارون آباد بہاولنگر
۱۳۶	محمد ظفر صاحب مکان نمبر ۱۹۱ مہاجر کالونی ہارون آباد بہاول نگر
۱۳۷	محمد ارشد صاحب مکان نمبر ۱۹۱ مہاجر کالونی ہارون آباد بہاول نگر۔
۱۳۸	غیاث الدین صاحب کوارٹر نمبر ۲۴۷ مہاجر کالونی ہارون آباد بہاولنگر
۱۳۹	مظہر ہاشمی صاحب ۱۰ الیشور اسٹریٹ کرشن نگر لاہور
۱۴۰	محمد رمضان خاں صاحب ناصر پنسل ٹائپ رائٹر آفس اکیومینٹ کارپوریشن ۱۹ فضل منزل بیڈن روڈ لاہور۔
۱۴۱	محمد شریف قریشی صاحب مکان نمبر ۱۰ گوبن اسٹریٹ نمبر ۵ گرونانک نگر اچھرہ لاہور۔
۱۴۲	محمد لطیف صاحب مکان نمبر ۳۲ پانڈو اسٹریٹ کرشن نگر لاہور
۱۴۳	سید محمد عبداللہ کرمانی صاحب یثرب ہومیوپیتھک دواخانہ بی ہائینڈ جیکب لائن نزد کوارٹر نمبر ۱۴۳ بالمقابل دکان محمود حلوائی کراچی۔
۱۴۴	سید محمد عبداللہ کرمانی صاحب یثرب ہومیوپیتھک دواخانہ بی ہائینڈ جیکب لائن نزد کوارٹر نمبر ۱۴۳ بالمقابل دکان محمود حلوائی کراچی۔
۱۴۵	سید منظور احمد صاحب بی ۲/۱۵۱ خداداد کالونی کراچی
۱۴۶	حمیدہ بانو فریدہ صاحبہ معرفت ڈپٹی ناصر علی صاحب ۴۳/اے نزد جامع مسجد خداداد کالونی کراچی۔
۱۴۷	عائشہ صدیقہ صاحبہ معرفت ڈپٹی ناصر علی صاحب ۴۳/اے نزد جامع مسجد خداداد کالونی کراچی۔
۱۴۸	کلثوم بیگم صاحبہ ۴۳/اے خداداد کالونی کراچی۔
۱۴۹	رقیہ خاتون صاحبہ ۲۰۲/۱ الالوکھیت کراچی۔
۱۵۰	شفیق بانو صاحبہ ۲۰۲/۱ الالوکھیت کراچی۔
۱۵۱	ثناء الحق صاحب صمد لکی جی ۳/۱ ناظم آباد کراچی۔
۱۵۲	صوفی عبدالرحیم خاں صاحب جنرل برانچ دفتر ڈائرکٹر تعلیم حلقہ لاہور
۱۵۳	محمد عبدالرشید صاحب ۱۸ اکر ہاٹ لین نواب پور ڈھاکہ۔
۱۵۴	ذکیہ خاتون صاحبہ ۱۸ اکر ہاٹ لین نواب پور ڈھاکہ
۱۵۵	محمد اسماعیل صاحب ۱۸ اکر ہاٹ لین نواب پور ڈھاکہ۔
۱۵۶	سید قمر الحسن صاحب ۹۰ سوری باغ دیا گنج ڈھاکہ۔
۱۵۷	اشتیاق احمد اعظمی بی۔ ۲۴/جی ۵ موتی جھیل کالونی ڈھاکہ
۱۵۸	بیگم سیم النساء اشتیاق بی ۲۴/جی ۵ موتی جھیل کالونی ڈھاکہ

رول نمبر	نام اور پتہ
۱۵۹	محمد عمر صاحب نیشنل بنک آف پاکستان لوکل پرنسپل آفس ڈھاکہ
۱۶۰	محمد عبدالمجید صاحب نیشنل بنک آف پاکستان صدر گھاٹ ڈھاکہ
۱۶۱	علی اکبر صاحب نیا ڈولہ بڑا انگہ بانار رمنہ ڈھاکہ
۱۶۲	سید مسعود الرحمٰن صاحب ۲۲ بہار کالونی مسان روڈ کراچی۔
۱۶۳	بیگم محمد منیف ۱۶۹۴/۵ ڈرگ ڈیلیج کالونی کراچی۔
۱۶۴	فاضل مقبول صاحب قریشی معرفت ایس ایم حسین قریشی ۱۶۹۴/۵ ڈرگ ڈیلیج کالونی کراچی۔
۱۶۵	عاقل مقبول قریشی صاحب معرفت ایس ایم حسین قریشی ۱۶۹۴/۵ ڈرگ ڈیلیج کالونی کراچی۔
۱۶۶	بیگم منظور قریشی صاحبہ معرفت ایس ایم حسین قریشی صاحب مکان نمبر ۱۶۹۴/۵ ڈرگ ڈیلیج کالونی کراچی۔
۱۶۷	سید اختر مراد صاحب ۸۰ اے بی پیر الٰہی بخش کالونی نمبر ۲ کراچی
۱۶۸	اے رحمٰن صاحب ۵۳/۷ الفنسٹن اسٹریٹ صدر کراچی
۱۶۹	عبدالرحمٰن صاحب ولد اللہ بخش صاحب معرفت جمعہ موسیٰ گھانچی ہوٹل دلی محمد حسن علی روڈ چاکیواڑہ کراچی۔
۱۷۰	شہاب الدین صاحب ٹیلر ماسٹر مکان نمبر آر۔ سی۔ ۱۶/۱۱/۴/۲ کاشی رام اسٹریٹ رنچھوڑ لائن کراچی۔
۱۷۱	سلیمان کارا صاحب چاکیواڑہ لائن نمبر ۲ کراچی۔
۱۷۲	بشیر احمد خان صاحب حاجی اسمٰعیل حاجی محمد صاحبان کھجور بازار کراچی
۱۷۳	غلام علی صاحب دلی محمد حسن علی روڈ چاکیواڑہ کراچی۔
۱۷۴	سردار خان صاحب کراچی الیکٹرک کمپنی سپلائی لمیٹڈ بلیک لائٹ ڈیپارٹمنٹ ٹیلی نمبر ۸۶ جمعدار کراچی۔
۱۷۵	اسماعیل صاحب دلی محمد حسن علی روڈ چاکیواڑہ کراچی
۱۷۶	عبدالحیٔ صاحب عثمانی انسپکٹر سینٹرل ایکسائز لینڈ کسٹم پسنی کوئٹہ ڈویژن مغربی پاکستان۔
۱۷۷	عبدالباری صاحب عثمانی معرفت عبدالحیٔ صاحب عثمانی پسنی مکران
۱۷۸	شاہین عثمانی صاحبہ معرفت عبدالحیٔ صاحب عثمانی انسپکٹر پسنی مکران۔
۱۷۹	آفاق احسن عثمانی صاحب معرفت عبدالحیٔ عثمانی صاحب انسپکٹر کسٹم ایکسائز پسنی مکران۔
۱۸۰	عبدالعزیز عثمانی صاحب معرفت عبدالحیٔ عثمانی صاحب انسپکٹر کسٹم پسنی
۱۸۱	فقیر محمد صاحب لازمی پرائمری اسکول بارون آباد بھاولنگر
۱۸۲	علاؤالدین خان صاحب کلرک چیف انجینئرز آفس۔ ای۔ پی ریلوے چٹاگانگ مشرقی پاکستان۔
۱۸۳	حکیم انوار احمد صاحب انچارج گشتی سوہاوہ ضلع جہلم
۱۸۴	مسرت صاحب سندھ پنجاب گڈس ٹرانسپورٹ حیدرآباد
۱۸۵	نسرین کوثر صاحبہ سی/۲۹۶ مینا بازار راولپنڈی۔

رول نمبر	نام اور پتہ
۱۸۶	منصور احمد صاحب اختر سی/۳۲۷/۲ موتی بازار راولپنڈی۔
۱۸۷	عبدالرزاق صاحب ایف پی۔ او۔ سی کے آر ایف راولپنڈی
۱۸۸	محمد عبدالحمید صاحب ایف۔ پی۔ او۔ اے سی کے آر ایف باغ سبز واری راولپنڈی۔
۱۸۹	صدیق کامل شاہی صاحب انکم ٹیکس آفس راولپنڈی
۱۹۰	فضل جلال صاحب (کاتب) معرفت مسجد حسینی گران چوک ناصر خان پشاور شہر۔
۱۹۱	عظمت حسین فاروقی صاحب ٹیکنیکل اسسٹنٹ انسپکشن آفس پی۔ آئی۔ اے۔ کراچی۔
۱۹۲	مظہر حسن صاحب ۴۲ اسٹیول آباد ہاؤسنگ سوسائٹی یوٹین ایریا کراچی
۱۹۳	احمد دین صاحب چارج ہینڈ کارپینٹر ۱۷۳۲ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۱۹۴	عبداللہ خان صاحب ولد احمد دین صاحب چارج ہینڈ کارپینٹر ۱۷۳۲ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۱۹۵	حفیظ اللہ صاحب ولد احمد دین صاحب چارج ہینڈ کارپینٹر ۱۷۳۲ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۱۹۶	ایم غلام احمد بیگ صاحب چک نمبر ۱۴۲/۴۰ ای۔ بی ڈاکخانہ چک نمبر ۱۴۲/۴۰ ای بی براستہ داڑی ضلع ملتان۔
۱۹۷	منصور احمد صاحب مکان نمبر ۳/۲۲ جلدی محلہ خیر پور ریرس
۱۹۸	حسین احمد صاحب ۱۰۔ ایس پشاور یونیورسٹی پشاور شہر۔
۱۹۹	عفت جمال صاحبہ مکان نمبر ۱۲۲/۳ لال کڑی بازار لاہور چھاؤنی۔
۲۰۰	علی محمد صاحب مقام گنجو چک نمبر ۳۵۸ براستہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائلپور مغربی پاکستان۔
۲۰۱	فریدہ پروین صاحبہ مکان نمبر ایس/۱۱۷ محلہ قطب الدین راولپنڈی
۲۰۲	حافظ نور محمد صاحب مدرس مدرسہ عربیہ قاسم العلوم فقیروالی بھاولنگر
۲۰۳	ظفر اقبال بیگ صاحب معرفت دفتر جماعت اسلامی جھنگ صدر
۲۰۴	عارفہ خاتون صاحبہ معرفت ارشاد احمد صاحب علوی مکان نمبر ۲۴۰ وارڈ نمبر ۶ جھنگ (سٹی) مغربی پاکستان
۲۰۵	قدسیہ خاتون صاحبہ معرفت ارشاد احمد صاحب علوی مکان نمبر ۲۴۰ وارڈ نمبر ۶ جھنگ سٹی مغربی پاکستان
۲۰۶	محمد یعقوب ندوی صاحب مکان نمبر ۶۷ محلہ باغ والا جھنگ صدر
۲۰۷	گوہر صدیقی صاحب مکان نمبر ۶۷ محلہ باغ والا جھنگ صدر
۲۰۸	ظفر مقبول صاحب ولد مقبول احمد صاحب کو ہدیسی سوہال متصل گندہ نالہ جھنگ صدر
۲۰۹	ملک عبدالحمید صاحب الفوزہ مرچنٹ غلہ منڈی مارکیٹ جھنگ صدر
۲۱۰	عبدالغفار بن نالوی صاحب مکان نمبر ۲۲۹ محلہ پیپلیانہ جھنگ صدر

سلسلہ نمبر	نام اور پتہ
۲۱۱	عبداللہ صاحب مکان نمبر ۹۲۲ محلہ بھیرانہ جھنگ صدر
۲۱۲	الطاف حسین ملک صاحب انگلش ٹیچر اسلامیہ ہائی اسکول جھنگ صدر
۲۱۳	سید علی امام صاحب صدر مدرس ڈی۔ بی۔ ہائی اسکول شاہ جیونا ضلع جھنگ صدر
۲۱۴	مسماۃ حفیظ فاطمہ بیگم صاحبہ معرفت سید محمود الحسن صاحب ۲۱۲ سول لائنز نزد پاور ہاؤس جھنگ صدر
۲۱۵	عبدالستار صاحب غوری تعمیر ملت اے۔ دی۔ مڈل اسکول۔ کھیالی ضلع گجرانوالہ۔
۲۱۶	عبدالغفور صاحب قریشی شاہ جیونا ضلع جھنگ۔
۲۱۷	ملک اللہ دتہ صاحب مقام ڈھگکانہ ضلع جھنگ۔
۲۱۸	سید آل نبی صاحب کاسٹ آفس پی۔ او۔ ایف۔ واہ کینٹ
۲۱۹	طارق محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے دی۔ کالج روڈ راولپنڈی۔
۲۲۰	طارق محمود اعظم خان صاحب۔ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۲۱	طارق محمود اعظم خان صاحب۔ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۲۲	طارق محمود اعظم خان صاحب۔ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۲۳	طارق محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۲۴	طارق محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۲۵	طارق محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۲۶	طارق محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۲۷	طارق محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۲۸	طارق محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۲۹	خالد محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۳۰	خالد محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۳۱	خالد محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ دی۔ کالج روڈ راولپنڈی۔
۲۳۲	خالد محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۳۳	خالد محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۳۴	خالد محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۳۵	خالد محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۳۶	خالد محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۳۷	خالد محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۳۸	خالد محمود اعظم خان صاحب مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ دی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۳۹	نیک پروین صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶۔ ڈی اے۔ دی کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۴۰	نیک پروین صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ دی کالج روڈ راولپنڈی۔
۲۴۱	نیک پروین صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے دی کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۴۲	نیک پروین صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے دی کالج راولپنڈی۔
۲۴۳	نیک پروین صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے دی کالج روڈ راولپنڈی۔
۲۴۴	نیک پروین صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے دی کالج روڈ راولپنڈی۔
۲۴۵	نیک پروین صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے دی کالج روڈ راولپنڈی۔
۲۴۶	نیک پروین صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے دی کالج روڈ۔ راولپنڈی۔
۲۴۷	نیک پروین صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے دی کالج روڈ راولپنڈی۔
۲۴۸	نیک پروین صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے دی کالج روڈ راولپنڈی۔
۲۴۹	یاسمین عالم صاحبہ مکان نمبر جی/۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے

رول نمبر — نام اور پتہ

ڈی کالج روڈ راولپنڈی۔

250 یاسمین عالم صاحب مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶۔ ڈی اے ڈی کالج روڈ۔ راولپنڈی۔

251 یاسمین عالم صاحب مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی کالج روڈ راولپنڈی۔

252 یاسمین عالم صاحب مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی کالج روڈ راولپنڈی۔

253 یاسمین عالم صاحب مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی کالج روڈ راولپنڈی۔

254 یاسمین عالم صاحب مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی کالج روڈ راولپنڈی۔

255 یاسمین عالم صاحب مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی کالج روڈ راولپنڈی۔

256 یاسمین عالم صاحب مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی کالج روڈ راولپنڈی۔

257 یاسمین عالم صاحب مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی کالج روڈ راولپنڈی۔

258 یاسمین عالم صاحب مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی کالج روڈ راولپنڈی۔

259 عابدہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی کالج روڈ۔ راولپنڈی شہر۔

260 عابدہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی کالج روڈ۔ راولپنڈی شہر۔

261 عابدہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ ڈی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی شہر۔

262 عابدہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ ڈی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی شہر۔

263 عابدہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ ڈی کالج روڈ۔ راولپنڈی شہر۔

264 عابدہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے۔ ڈی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔

265 عابدہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے۔ ڈی۔ کالج روڈ راولپنڈی۔

266 عابدہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے ڈی۔ کالج روڈ راولپنڈی۔

267 عابدہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی اے

ڈی۔ کالج روڈ راولپنڈی۔

268 عابدہ سلطانہ صاحبہ مکان نمبر جی /۴۷۶ گلی نمبر ۶ ڈی۔ اے ڈی۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی۔

269 امین الحق صاحب ولد عبدالحق صاحب ٹیکنیکل ڈائریکٹر زد فرنیئر شوگر مل تخت بھائی ضلع مردان۔

270 محمد یوسف خان صاحب کین کلرک فرنیئر شوگر مل تخت بھائی ضلع مردان

271 افروز بیگم صاحبہ لانڈھی مہاجر کالونی کوارٹر نمبر ۲/۴ ۲۴ بی ایریا ۲ سنگل کوارٹر کراچی۔

272 خواجہ سید قمرالحسن صاحب ۵-۶/۲ سعود آباد کالونی ملیر کراچی۔

273 سلطانہ بیگم صاحبہ معرفت شمیم احمد صاحب پروفیسر مکان نمبر ۴ متصل تھانہ گولیمار کراچی۔

274 ناہید سلطانہ صاحبہ معرفت شمیم احمد صاحب پروفیسر مکان نمبر ۴ متصل تھانہ گولیمار کراچی۔

275 انتظار احمد صاحب بی ۹۶ گولیمار نمبر ۱ نزد پولیس اسٹیشن کراچی۔

276 قمر جبیں بیگم صاحبہ معرفت بدر عالم صاحب ہوڈکیپر پی۔ ڈبلیو ڈی ضلع دادو۔

277 محمد یوسف حسین صاحب عبدالرسول بلڈنگ نمبر ۵ نزد گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ کراچی پاکستان

278 عبداللطیف صاحب رنگون والا سلکشن ہیڈ لیجر سکشن اسٹینڈرڈ دیکوم آئل کمپنی میکلوڈ روڈ کراچی۔

279 جمیل احمد جمالی صاحب ۵-۷۰/۲ سعود آباد کالونی ملیر کراچی

280 جاوید جمالی صاحب ۵-۷۰/۲ سعود آباد کالونی ملیر کراچی۔

281 معین الدین احمد صدیقی صاحب ۵-۲۲/۲ سعود آباد کالونی کراچی

282 عبدالسلام خان صاحب کوارٹر نمبر ۵-۱۵۱/ا سعود آباد کالونی کراچی۔

283 پیارے نبی صاحب ۵-۳۱۵/ا سعود آباد کالونی ملیر کراچی۔

284 محمد سلیم انصاری صاحب کوارٹر نمبر جی اے ۶ بیراج کالونی سکھر۔

285 اقبال الرحمن صاحب ۵-۲۲۴/۲ سعود آباد کالونی ملیر کراچی۔

286 جمیلہ خاتون صاحبہ معرفت توفیق احمد صاحب عباسی کوارٹر نمبر ۲۶/۴ سو کوارٹر گولیمار کراچی۔

287 سید حفیظ اللہ صاحب مکان نمبر ۱۵۱ جہان محمد گوٹھ گولیمار کراچی۔

288 نعیم الرحمن خان صاحب کوارٹر نمبر سی ۵۵۲/ا مہاجر کالونی لانڈھی کراچی

289 شبقدر فاطمہ صاحبہ مکان نمبر ۳۴۹ جیل روڈ ہیرآباد حیدرآباد

290 علیق الحق صاحب مکان نمبر ۳۴۹ جیل روڈ ہیرآباد حیدرآباد۔

291 مقبول حسین صاحب معلم معین انجمن ہائی اسکول حیدرآباد۔

292 مقبول حسین صاحب معلم معین انجمن ہائی اسکول حیدرآباد۔

293 خلیل احمد صاحب معرفت نوابزادہ فاروق علی خان صاحب سنت نگر

رول نمبر — نام اور پتہ

منگا رام بلڈنگ ہیرآباد حیدرآباد
۲۹۴ خلیل احمد صاحب معرفت نواب زادہ فاروق علی خان صاحب۔ سنت درس منگا رام بلڈنگ ہیرآباد حیدرآباد۔
۲۹۵ امان الرحمٰن خان صاحب اے/۱۱۳ لطیف آباد نمبر۱ حیدرآباد۔
۲۹۶ امان الرحمٰن خان صاحب اے/۱۱۳ لطیف آباد نمبر حیدرآباد
۲۹۷ محمد رشید ازظفر صاحب ۱۵۸ پیر الٰہی بخش کالونی سیدنوح کراچی۔
۲۹۸ نشاط انور صاحب ۱۵۸ پیر الٰہی بخش کالونی سید ہ ج کراچی۔
۲۹۹ انتظار حسین صاحب کیمن پاک ورکشاپ ماری پور کراچی
۳۰۰ حمیرا خاتون صاحبہ دی/۲۹ پاپوش نگر ناظم آباد کراچی۔
۳۰۱ محمد شریف صاحب مقام بھال ڈاکخانہ جند ضلع اٹک
۳۰۲ محمد انور صاحب مقام بھال ڈاکخانہ جند ضلع اٹک۔
۳۰۳ عبدالرشید صاحب، قومی دواخانہ جنڈ ضلع اٹک۔
۳۰۴ بشیر محمد شریف صاحب کوارٹر ۲ بی ٹمبر یری سید پرده ملام محمد سراج جام شوره
۳۰۵ نوردین صاحب ڈرائیور ظفر جنرل سٹور نارووال ضلع سیالکوٹ۔
۳۰۶ منظور احمد صاحب مولوی امام مسجد حنفیہ نارووال ضلع سیالکوٹ
۳۰۷ محمد صدیق صاحب معرفت دارالسلام نارووال ضلع سیالکوٹ۔
۳۰۸ قریشی غلام مصطفیٰ صاحب محلہ قاضیاں روڈ نمبر۱ نارووال سیالکوٹ
۳۰۹ ایم۔بی۔مرزا صاحب موذن دھاریوال ڈاکخانہ عوط فتح گڑھ تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ۔
۳۱۰ محمد اصغر صاحب پلیڈر نارووال ضلع سیالکوٹ
۳۱۱ محمد صادق صاحب معرفت دارالسلام نارووال ضلع سیالکوٹ۔
۳۱۲ فضل الٰہی صاحب ڈی۔بی مڈل اسکول کندن پور ضلع سیالکوٹ
۳۱۳ نور محمد صاحب ولد جان محمد معمار محلہ معماران نارووال ضلع سیالکوٹ
۳۱۴ غلام نبی ولد محمد دین صاحب محلہ بھاٹریاں گلی نیچہ شاہ وارڈ نمبر۱ نارووال ضلع سیالکوٹ۔
۳۱۵ عبداللہ خان صاحب کراچی
۳۱۶ سردار حامد نواز خان صاحب باہتر براہ حسن ابدال تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک
۳۱۷ ابوالافتخار احمد صاحب ۸۰۶/۱ ریلوے مارکیٹ مغل پورہ لاہور
۳۱۸ دین محمد صاحب متصل مسان بھٹہ دیلیج کیماڑی کراچی۔
۳۱۹ دین محمد صاحب متصل مسان بھٹہ دیلیج کیماڑی کراچی۔
۳۲۰ عماد اللہ صاحب صدیقی معرفت ظفر احمد صاحب القادری ۱۸/۲ بندر روڈ کراچی
۳۲۱ خلیل احمد صاحب ۱۸/۲ بندر روڈ کراچی۔
۳۲۲ ابوالخیر اشرفی صاحب ۲۲۸/۲ مسعود آباد کالونی کراچی۔
۳۲۳ ش۔ب۔ والدہ نوشاد علی خان صاحب معرفت ظفر علی خان صاحب مکان نمبر ۲۰۶ وارڈ نمبر۱۶ اندرون پاک گیٹ ملتان شہر۔
۳۲۴ اہلیہ ظفر علی خان صاحب اندرون پاک گیٹ وارڈ نمبر۶ مکان نمبر ۲۰۶ ملتان شہر۔

رول نمبر — نام اور پتہ

۳۲۵ رحمت الٰہی خان صاحب معرفت ظفر علی خان صاحب مکان نمبر ۲۰۶/۶ اندرون پاک گیٹ ملتان شہر۔
۳۲۶ مطلوب شاہ ہاشمی صاحب اسسٹنٹ شفٹ سپرنٹنڈنٹ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ۔ کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۳۲۷ مطلوب شاہ ہاشمی صاحب اسسٹنٹ شفٹ سپرنٹنڈنٹ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ۔ کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۳۲۸ آفتاب احمد صاحب مدینہ واشنگ اینڈ ڈائنگ فیکٹری اسٹیشن روڈ حیدرآباد
۳۲۹ محمد حلیف صاحب مدینہ واشنگ اینڈ ڈائنگ فیکٹری اسٹیشن روڈ حیدرآباد
۳۳۰ حرم ہمایوں صاحبہ ۵۹/۳ بہار کالونی مسان روڈ کراچی۔
۳۳۱ عبدالرحمٰن صاحب لالوکھیت بلاک نمبر دس کوارٹر نمبر ۴۹ کراچی۔
۳۳۲ حسین بیگ صاحب معرفت لطافت کرائم جنٹ پارک جٹ لائن کراچی
۳۳۳ عبدالرحیم خان صاحب اے/۱۳۱ حیدرآباد کالونی کلیٹن روڈ کراچی
۳۳۴ بیگم عبدالواحد صاحبہ معرفت عبدالواحد صاحب دفتر جماعت اسلامی سکرنڈ ضلع نواب شاہ۔
۳۳۵ محمد صادق مصطفیٰ صاحب سائنس ٹیچر ابن بی ہائی اسکول نواب شاہ
۳۳۶ عبدالواحد صاحب دفتر جماعت اسلامی سکرنڈ ضلع نواب شاہ
۳۳۷ سعید احمد فاروقی صاحب ولد محمد اصغر صاحب فاروقی مہاجر کالونی مکان نمبر ۱۰۲ ہارون آباد ضلع بہاولنگر۔
۳۳۸ محمد سرور صاحب مہاجر کالونی مکان نمبر ۱۰۲ ہارون آباد بہاولنگر
۳۳۹ منظور حسین جمیل صاحب مقام وڈاکخانہ چک ۶۶ جنوبی تحصیل بھلوال سرگودھا
۳۴۰ روشن آرا صاحبہ ڈی/۴۹ گارڈن روڈ کراچی۔
۳۴۱ حافظ عبدالغنی صاحب مقام بھال ڈاکخانہ جنڈ ضلع اٹک
۳۴۲ ضیاءالدین حسن صاحب ورکشاپ اکاؤنٹس آفس ای۔بی ریلوے سید پور ضلع رنگ پور۔
۳۴۳ محمد مسلم صاحب ڈی۔اے۔او آفس۔ای۔بی۔ریلوے سید پور ضلع رنگپور
۳۴۴ عبداللطیف قریشی صاحب دفتر سی۔ایم۔اے۔او۔ راولپنڈی۔
۳۴۵ عبداللطیف قریشی صاحب دفتر سی۔ایم۔اے۔او۔ راولپنڈی
۳۴۶ طاہرہ بی بی صاحبہ آٹھ چھاگلہ بلڈنگ یوسف علی بھائی روڈ کراچی
۳۴۷ راحت بی بی صاحبہ آٹھ چھاگلہ بلڈنگ یوسف علی بھائی روڈ راسوامی کراچی
۳۴۸ ظفر سعید صاحب صدیقی مکان نمبر۳ لچھمن اسٹریٹ نمبر۶ پرانی انارکلی لاہور۔
۳۴۹ عطیہ الٰہی صاحبہ مکان نمبر۳ لچھمن اسٹریٹ نمبر۶ پرانی انارکلی لاہور
۳۵۰ ریحانہ ظفر صاحبہ مکان نمبر۳ لچھمن اسٹریٹ نمبر۶ پرانی انارکلی لاہور
۳۵۱ ظفر سعید صاحب صدیقی مکان ۳ لچھمن اسٹریٹ نمبر۶ پرانی انارکلی لاہور
۳۵۲ فاروق فضل صاحب معرفت محمد افضل بدر صاحب علمی کتب خانہ مظفر گڑھ

رول نمبر	نام اور پتہ
۳۵۳	جاوید افضل صاحب معرفت محمد افضل بدر صاحب علمی کتب خانہ مظفر گڑھ
۳۵۴	شبیر احمد صاحب معرفت محمد فضل بدر صاحب علمی کتب خانہ مظفر گڑھ
۳۵۵	مولوی محمد بخش صاحب مقام و ڈاکخانہ حاجی پور شریف تحصیل جامپور ڈیرہ غازی خان
۳۵۶	سید لبشارت علی شاہ صاحب محلہ پٹھانان وارڈ نمبر ۲ قصبہ خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ
۳۵۷	محمد فاضل سلیم صاحب ٹکٹ کلکٹر کوٹری۔
۳۵۸	محمد فاضل سلیم صاحب ٹکٹ کلکٹر کوٹری۔
۳۵۹	تہذیب النساء صاحبہ معرفت انوار احمد صاحب ٹکٹ کلکٹر کوٹری ریلوے اسٹیشن
۳۶۰	غلام جیلانی صاحب معرفت حاجی مطیع اللہ صاحب کیپ مینٹ ملتان شہر
۳۶۱	محمد رمضان صاحب معرفت چوہدری حسین بخش صاحب مکان نمبر ۲۵۰/۲/۱ اکبر منڈی ملتان چھاؤنی۔
۳۶۲	سید نبی احمد صاحب ٹائپسٹ دفتر ڈپٹی کسٹوڈین حیدر آباد۔
۳۶۳	سید نبی احمد صاحب ٹائپسٹ دفتر ڈپٹی کسٹوڈین حیدر آباد
۳۶۴	ممتاز علی خان صاحب کوارٹر نمبر ۴۴/۱ ڈرگ روڈ کالونی کراچی
۳۶۵	عبدالرؤف بیگ صاحب۔
۳۶۶	محمد ظفر صاحب جامعہ اسلامیہ سیکنڈری اسکول کھڈہ کراچی۔
۳۶۷	حمیدہ بیگم صاحبہ معرفت عبدالواحد صاحب سکرنڈ ضلع نوابشاہ
۳۶۸	عبدالعزیز صدیقی صاحب اسسٹنٹ ٹیچر لوکل بورڈ ہائی اسکول سکرنڈ ضلع نوابشاہ
۳۶۹	غلام حیدر خان صاحب گورنمنٹ ٹریننگ اسکول لاڑکانہ
۳۷۰	محمد یوسف صاحب بازار ایسوسی ایٹڈ کمپنی کھوڑ ضلع اٹک
۳۷۱	عبدالمجید صاحب گھڑی ساز صدر بازار راولپنڈی۔
۳۷۲	عبدالرحمن صاحب انصاری کلرک ہیڈ کوارٹر راولپنڈی۔
۳۷۳	حافظ احمد الدین صاحب مقام بھال ملکی ڈاک جھنڈ ضلع اٹک۔
۳۷۴	محمد حنیف صاحب محلہ معین آباد نزد پانی کی ٹنکی لانڈھی کراچی
۳۷۵	عابدہ بیگم صاحبہ محلہ معین آباد نزد پانی کی ٹنکی لانڈھی کراچی
۳۷۶	آمنہ بیگم صاحبہ محلہ معین آباد نزد پانی کی ٹنکی لانڈھی کراچی۔
۳۷۷	محمد ہاشم معین آباد نزد بنیان فیکٹری لانڈھی کراچی۔
۳۷۸	محمد ہاشم صاحب لولٹ گوٹ نزد ریڑھی لانڈھی کراچی
۳۷۹	لاکھو پٹ مرزو گوٹ لاکھے جے سرو تحصیل میرپور ساکرو پوسٹ گھارو
۳۸۰	حبیب اختر صاحب گڈی ۵۰۔۲/۱۲ کوارٹر نمبر ۲۱/۴ مہاجر کالونی کراچی۔
۳۸۱	محمد سیف الدین صاحب صدیقی آپریٹر سلیپ ہاؤس کارڈ مینزا ہا ٹرسٹ سرائیک انڈسٹریز لانڈھی کراچی
۳۸۲	امیر احمد صاحب محلہ خلد آباد معرفت دفتر جماعت اسلامی لانڈھی کراچی
۳۸۳	تہور علی جاندار صاحب جنرل کلرک میکانیکل انجینئرنگ ٹرسٹ ٹیچ فیکٹری لانڈھی
۳۸۴	شاہدہ خاتون صاحبہ معرفت محی الدین بالوی صاحب
۳۸۵	سید سلطان محی الدین صاحب ویونگ سیکشن آدمجی کاٹن ملز لانڈھی کراچی
۳۸۶	مختار علی صاحب انسٹرومنٹ میکینک بی/۵۲ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۳۸۷	مختار علی صاحب انسٹرومنٹ میکینک نمبر بی/۵۲ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۳۸۸	عبدالرشید صاحب قریشی شفٹ کیمسٹ ورکس ۲۸ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۳۸۹	محمد وحید الدین صاحب صدیقی ۴۳ حیدر آباد کالونی کراچی۔
۳۹۰	یاسمین صدیقہ صاحبہ بلڈنگ نمبر ۹۹۹/۳ عقب تاج محل سینما کراچی
۳۹۱	محمد وجیہہ الدین صاحب صدیقی ۴۳ حیدر آباد کالونی کراچی۔
۳۹۲	حنیف احمد صاحب مولی رام گلی شاہی بازار سکھر۔
۳۹۳	محمد اشرف صاحب ایل ایل پبلسٹی صرافہ بازار سکھر۔
۳۹۴	محمد نعیم صاحب معرفت حکیم محمد ابراہیم صاحب میانی روڈ سکھر۔
۳۹۵	محمد سلیم صاحب معرفت حکیم محمد ابراہیم صاحب میانی روڈ سکھر۔
۳۹۶	قمر النساء بیگم صاحبہ کوارٹر نمبر جی ۶۰ بیراج کالونی سکھر۔
۳۹۷	قاضی محبوب عالم صاحب مکان نمبر بی/۳۵۵ چبوترہ چوک روہڑی۔
۳۹۸	بالے خان صاحب مکان نمبر سی ۲۹۶ نیم کی چاڑی سکھر۔
۳۹۹	احمد الدین صاحب شاہی غلہ منڈی۔ چنیوٹ
۴۰۰	عبدالوہاب خان صاحب ۸۵۶/۱ ڈرگ روڈ کالونی کراچی۔
۴۰۱	محمد حسن صاحب عرف انگوٹی۔ قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۴۰۲	علی محمد صاحب عرف ٹیکو قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔
۴۰۳	سید عبداللہ صاحب جھونپڑی نمبر ڈی۔ ۳۹/۱۱ معین آباد کراچی
۴۰۴	رسول بی صاحبہ جھونپڑی نمبر ڈی ۳۹/۱۱ معین آباد لانڈھی کراچی
۴۰۵	سید عبداللہ صاحب جھونپڑی نمبر ڈی ۳۹/۱۱ معین آباد لانڈھی
۴۰۶	محمد ابراہیم صاحب قصبہ لولٹ گوٹ نزد ریڑھی لانڈھی۔
۴۰۷	نبی بخش صاحب قصبہ لولٹ گوٹ نزد ریڑھی لانڈھی۔
۴۰۸	زاہدہ خانم صاحبہ ۶ الف ایبے سینیا لائن کراچی
۴۰۹	مظہر الدین صاحب مڈل اسکول ماڑی اللہ بچایا براستہ خانپور بہاولپور
۴۱۰	کبیر احمد صاحب ۱۱/۱۲ اے سمن آباد لاہور۔
۴۱۱	اقتدار احمد صاحب ۷۷/۴ کرچا گلی منٹگمری۔
۴۱۲	امجد شفیع صاحب ۲۰ دیانند روڈ کرشن نگر لاہور
۴۱۳	عبدالرشید خان صاحب مکان نمبر اے ۱۷۳۲/بی بازار سنناں اندرون لوہاری منڈی لاہور
۴۱۴	بشیر علی صاحب ۴/۵۴/۱۲ لال کوٹھی نمبر ۹۸ ولنگٹن ہال صدر بازار لاہور چھاؤنی۔
۴۱۵	معراج النساء صبیحہ صاحبہ
۴۱۶	محمد عطاء اللہ صاحب کلرک دفتر ڈپٹی کمشنر صاحب ڈیرہ غازی خان
۴۱۷	عابدہ بیگم صاحبہ کتاب ہاؤس پتھر بازار ڈیرہ غازی خان۔

رول نمبر — نام اور پتہ

۴۱۸ زاہدہ بیگم صاحبہ معرفت عطا محمد صاحب کتاب ہاؤس بچھر بازار ڈیرہ غازی خاں۔

۴۱۹ فریدہ بیگم صاحبہ سرپرست محمد حمید خاں صاحب ڈی۔ آئی۔ بی محلہ رانی بازار رمالی پاٹھ پولیس ڈیپارٹمنٹ ڈاکخانہ گھوڑا مارا راجشاہی

۴۱۹/A پروفیسر ایم۔ سلے حامد صاحب ایم۔ ایس۔ سی۔ ایڈورڈ کالج۔ پبنا۔ مشرقی پاکستان

۴۲۱ سید سلیمان احمد صاحب۔ دفتر ڈپٹی کلکٹر ملیند کمشنر وسینئر ملکیا ٹریر ڈاکخانہ گھوڑا مارا ضلع راجشاہی۔

۴۲۲ محمد عباس علی خاں صاحب دفتر جماعت اسلامی رانی بازار راجشاہی

۴۲۳ محمد عباس علی خاں صاحب دفتر جماعت اسلامی رانی بازار راجشاہی

۴۲۴ محمد قاسم صاحب پاکستان تمباکو کمپنی لمیٹڈ بوگرہ گودام ضلع بوگرہ

۴۲۵ غلام مرتضیٰ صاحب پرنٹر زیر ٹریننگ کھاتہ الیف۔ پی۔ ٹیکسٹائل ملز جہانگیرہ روڈ ضلع پشاور۔

۴۲۶ صابر حسین صاحب ولد ملک فضل داد خاں صاحب پرنٹنگ انچارج الیف۔ پی۔ ٹیکسٹائل ملز جہانگیرہ روڈ ضلع پشاور

۴۲۷ غلام عائشہ صاحبہ زوجہ ملک فضل داد خاں صاحب الیف۔ پی ٹیکسٹائل ملز جہانگیرہ روڈ ضلع پشاور۔

۴۲۸ محمد رزاق صاحب معرفت عبدالقادر صاحب نیوز ایجنٹ پی/۱۲۲۷ بن ملی دیرو راولپنڈی۔

۴۲۹ حافظ محمد عبدالغفور صاحب مکان نمبر ۱/۳۳ نزد جیل حیدر آباد کالونی

۴۳۰ اسحاق صاحب عرف صابر قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔

۴۳۱ محمد صاحب عرف اچھل قصبہ ریڑھی نزد لانڈھی کراچی۔

۴۳۲ محمد احسان الحق صاحب پی/۱۴۹۳ ہری پورہ راولپنڈی۔

۴۳۳ ڈاکٹر محمد اقبال جنجوعہ صاحب پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ کیو۔ ۲/۱۴۱ کراچی

۴۳۴ اسلم جنجوعہ صاحب کیو۔ ۲/۱۴۱ پاکستان ایمپلائیز ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

۴۳۵ اقبال شاہین صاحبہ کیو۔ ۲/۱۴۱ پاکستان ایمپلائیز ہاؤسنگ سوسائٹی

۴۳۶ مولانا شاہ محمد صاحب امام مسجد کھیوڑہ سوڈا کمپنی کھیوڑہ لمیٹڈ ضلع جہلم

۴۳۷ فاطمہ بیگم صاحبہ معرفت شاہ محمد صاحب امام مسجد کھیوڑہ سوڈا کمپنی کھیوڑہ ضلع جہلم۔

۴۳۸ معراج الدین صاحب فرڈ ۵۸۰ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ ضلع جہلم

۴۳۹ معراج الدین صاحب فرڈ ۵۸۰ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ ضلع جہلم

۴۴۰ معراج الدین صاحب فرڈ ۵۸۰ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ ضلع جہلم

۴۴۱ معراج الدین صاحب فرڈ ۵۸۰ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ ضلع جہلم

۴۴۲ منیر خاں صاحب ۴۶۹ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ ضلع جہلم

۴۴۳ منیر خاں صاحب ۴۶۹ کھیوڑہ سوڈا کمپنی لمیٹڈ ضلع جہلم

۴۴۴ آمنہ بی صاحبہ معرفت محمد سلیم صاحب لکڑی اور کوئلہ گودام نمبر نمبر ۴۳ بالمقابل بلاک نمبر ۱۹ مارٹن کوارٹرز مارٹن روڈ کراچی

۴۴۵ آمنہ بی صاحبہ معرفت محمد سلیم صاحب لکڑی دکوئلہ گودام نمبر ۴۳ بالمقابل بلاک نمبر ۱۹ مارٹن کوارٹرز مارٹن روڈ کراچی۔

۴۴۶ آمنہ بی صاحبہ معرفت محمد سلیم صاحب لکڑی دکوئلہ گودام نمبر ۴۳ بالمقابل بلاک نمبر ۱۹ مارٹن کوارٹرز مارٹن روڈ کراچی۔

۴۴۷ آمنہ بی صاحبہ معرفت محمد سلیم صاحب لکڑی دکوئلہ گودام نمبر ۴۳ بالمقابل بلاک نمبر ۱۹ مارٹن کوارٹرز مارٹن روڈ کراچی

۴۴۸ مسماۃ خدیجہ بی بی صاحبہ ۱/[illegible] اے ایریا لالوکھیت کراچی۔

۴۴۹

۴۵۰ عبداللہ خاں صاحب معرفت ظہور احمد عبدالرؤف صاحبان اسکن مرچنٹ رانگیواڑہ کراچی۔

۴۵۱ امداد علی صاحب محمد علی صادق علی بھائی جی والد بلڈنگ صدر کراچی

۴۵۲ محمد سلیم صدیقی صاحب ۱/۳۲ اے ایریا لیاقت آباد کراچی

۴۵۳ حبیب اللہ حسینی صاحب جاگیردار۔

۴۵۴ ظفر علی خاں صاحب ۲/بی اسٹاف کوارٹرز ناجہ آباد ڈرگ روڈ کراچی

۴۵۵ مسز سید محمد اصغر وفا قائی ایس آٹھ۔ ۳ ماڈرن کالونی متصل پاک کالونی منگا پیر روڈ کراچی۔

۴۵۶ سید محمد اصغر وفا قائی ایس آٹھ۔ ۳ ماڈرن کالونی متصل پاک کالونی منگا پیر روڈ کراچی۔

۴۵۷ رفعت کہکشاں صاحبہ ۱/۶ برساتی شیڈ گولیمار کراچی۔

۴۵۸ شمیم احمد صاحب معرفت حمید الدین صاحب سب ہیڈ آفس آف ڈی۔ فنانس ایڈوائزر کمیونیکیشن ریلوے اکاؤنٹس کراچی

۴۵۹ شکیلہ بیگم صاحبہ معرفت ڈاکٹر قیوم سعادت خاں صاحب ایم۔ بی بی ایس زینت منزل بارنس اسٹریٹ کراچی۔

۴۶۰ شکیلہ بیگم صاحبہ معرفت ڈاکٹر قیوم سعادت خاں صاحب ایم بی بی ایس زینت منزل بارنس اسٹریٹ کراچی۔

۴۶۱ محمد زماں صاحب دیوور دیونگ ڈیپارٹمنٹ آدم جی اینڈ سنز کارڈ نمبر ۲۷ کراچی۔

۴۶۲ سید منظور عالم صاحب معرفت حکیم محمد اکرم صاحب محلہ خلد آباد جماعت اسلامی کراچی۔

۴۶۳ محمد علی صاحب خداداد کالونی مکان نمبر ۱۹/بی کراچی۔

۴۶۴ محمد ہارون صاحب ڈبل سائیڈر رنگ ڈیپارٹمنٹ حسین ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ لانڈھی کراچی۔

۴۶۵ عرفان احمد صاحب ۵۔ ۳۵۳/۲ سعود آباد کالونی کراچی

۴۶۶ عبدالوہاب خاں صاحب ۵۔ ۱۴۲/۲ سعود آباد کالونی کراچی

رول نمبر	نام اور پتہ
۴۶۷	محمد یونس خاں صاحب کوارٹر نمبر ۲۰۰-۲۷/۴ ڈرگ روڈ کالونی کراچی
۴۶۸	میمونہ خاتون صاحبہ کوارٹر نمبر ۲۰-۲۷/۴ ڈرگ روڈ کالونی کراچی۔
۴۶۹	شہناز صاحبہ سعود آباد ایس ۳۰۰-۱/ ملیر کراچی
۴۷۰	نظام الدین صاحب سعود آباد ایس ۱۱۴/۲ ملیر کراچی
۴۷۱	عبدالرزاق صاحب سعود آباد کوارٹر ایس ۲۹۸/۲ ملیر کراچی
۴۷۲	محمد اسحاق صاحب صدیقی ایس ۲۷۱/۱ سعود آباد کالونی کراچی
۴۷۳	محمد فراست علی خاں صاحب ایس ۲۸۵/۱ سعود آباد کالونی کراچی
۴۷۴	عبدالحکیم صاحب ایس ۲۴۵/۱ سعود آباد ملیر کراچی۔
۴۷۵	انجم پروین صاحبہ ایس ۶۴۰/۲ سعود آباد کالونی کراچی
۴۷۶	محمد خلیل احمد صاحب ایس ۳۵۳/۲ سعود آباد کالونی کراچی
۴۷۷	احمد جان صاحبہ ایس ۵۳۸/۲ سعود آباد کالونی کراچی
۴۷۸	ریاض فاطمہ صاحبہ ایس ۸۶۰/۲ سعود آباد کالونی کراچی۔
۴۷۹	خورشید اختر صاحبہ ایس ۱۱۷/۲ سعود آباد کالونی کراچی
۴۸۰	محمد انور صدیقی صاحب کوہر بلڈنگ نمبر ۸۴ فسٹ فلور موسٹی جی اسٹریٹ رامسوامی کراچی۔
۴۸۱	فیض محمد صاحب معرفت جمیل احمد صاحب ڈرجن بلڈنگ گراؤنڈ فلور نمبر ۲ موہن روڈ رتن تالاب کراچی۔
۴۸۲	تاج محمد صاحب الیف ۸۹ ایبی سینیا لائن کراچی۔
۴۸۳	محمد امین خاں صاحب بیٹی افسر ٹرالی ایس اداقبال ولیسٹ وہارف کراچی۔
۴۸۴	سکندر حیات مکان نمبر ۵۳ محلہ شکاریاں نزد غلہ منڈی احمد پور شرقیہ ضلع بہاولپور۔
۴۸۵	عطاء اللہ صاحب ای۔این۔ایس معرفت تیمور فلیٹ میل آفس کراچی۔
۴۸۶	محمد سرور صاحب چیف الیکٹریشن ۳۹۷۴ پی۔این ایس "بدر" معرفت فلیٹ میل آفس۔
۴۸۷	راج ولی صاحب پیٹی افسر پی این ایس "دلاور" کراچی
۴۸۸	طارق سعید صاحب معرفت مرزا اسد رضا صاحب پیٹی افسر پی۔این۔ایس "ہمالیہ" کراچی۔
۴۸۹	صدیق النساء صاحبہ محلہ ہیرآباد ۲۰۸/۱۱۳ اے حیدرآباد
۴۹۰	محمد انور صاحب کھلیانی بلڈنگ نمبر ۱۲ رام چند ٹیمپل روڈ رتن تالاب کراچی۔
۴۹۱	ظہور بخش صاحب خالصا اسکول صدر بالمقابل پولیس ہیڈکوارٹر رسالہ روڈ حیدرآباد
۴۹۲	خورشید علی صاحب خداداد کالونی مکان نمبر ۵۵ کراچی
۴۹۳	فصاحت الدین صاحب بی ناظم ہائی اسکول سعید منزل کراچی
۴۹۴	زبیر اشرف واسطی صاحب معرفت محمد انور علوی صاحب ۸۵۲ بزاز محلہ صدر بازار لاہور۔
۴۹۵	حسن عارف واسطی صاحب معرفت محمد انور علوی صاحب ۸۵۲ بزاز محلہ صدر بازار لاہور
۴۹۶	آسیہ بیگم صاحبہ دہلی روڈ صدر بازار لاہور چھاؤنی۔
۴۹۷	محمد یوسف صاحب مکان نمبر ۱۰۵۷ گلی نمبر ۷۷ خراس محلہ صدر بازار لاہور چھاؤنی۔
۴۹۸	اخلاق احمد نیازی صاحب آٹھ بھلا اسٹریٹ نواکوٹ ملتان روڈ لاہور۔
۴۹۹	اللہ بخش صاحب موسیٰ لین بچھر روڈ ایل ۳۵ نزد باغیچہ کنگری کراچی۔
۵۰۰	منظور احمد صاحب مولانا خطیب جامع مسجد حنفیہ نارووال ضلع سیالکوٹ۔


ماہنامہ
مشیر
کراچی
E MUSHIR KARAC

نگارشے

خزاں

اُس دن ایک ویرانے میں کھڑے ایک پیپل کے درخت سے میں نے کہا۔ "موسم بہار آتا ہے، تم نئے نئے پتّوں کا لبادہ زیب تن کر لیتے ہو، لیکن یہ ناہنجار خزاں آکر کیسی بے رحمی سے تمہیں برہنہ کر دیتی ہے، کیا تمہیں خزاں کے اس کالے کرتوت اور بے رحمی پہ غصہ نہیں آتا؟"

درخت مُسکرایا اور بولا۔ "بہار جب آتی ہے، میرے موہ اور ممتا کو جگا جاتی ہے، خزاں آکر میرے سارے پتّوں کو مجھ سے الگ کر دیتی ہے، جیسے وہ مجھے اس دنیائے فانی کی حقیقت سے آگاہ کر رہی ہو۔ اب تم ہی بتاؤ جو مجھے بار بار آکر ایک ازلی حقیقت کا درس دیتا ہو، اُس پر کیسا غصہ؟"

اور میں لاجواب ہو گئی!

—— نیناکاش

پاکیزہ ادب کا ڈائجسٹ

ٹیلیفون : 70323

ماہنامہ مُشیر کراچی

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

جلد :— ۸

شمارہ :— ۷

جولائی سنہ ۱۹۵۷ء

نگاہِ

نگراں — نینا کاش ۱

سوچ بچار

تخریب پسندوں کا کنونشن — محمود فاروقی ۳

پسِ پردہ

سیاسی نخرے — کھوجی ۵

فکر و نظر

عصر حاضر کی پیچیدگیاں اور اسلام — الان ہوبھام (ترجمہ) ۶

تحلیل و تجزیہ

مزاج کی بے اعتدالی — سید ابوالاعلیٰ مودودی ۱۰

مردانہ الجھن — شیر محمد اختر ۱۲

شخصیات

بدنام چو ایڈن مانٹیگو ۱۳

کس نے کیا کہا؟ ۱۵

مقدس سفر ۱۶

مکے سے مدینہ جاتے ہوئے — ماہر القادری ۱۶

برگِ گل

اثرِ عید — انور افسری ۱۷

آمدِ عید — بشیر انصاری ۱۷

تین شعر — ساقی فاروقی ۱۷

غزل — رشید کوثر فاروقی ۱۸

طوافِ ماضی — وحید نسیم ۱۹

غزل — بیدل میرٹھی ۱۹

خیالِ دوست — اعظم ادیب ۲۰

احساس وتبی — انوار ظہوری ۲۰

غزل — ظہور الحق صدیقی ۲۱

حسنِ تغزل — محشر رسول نگری ۲۱

لوگو! — محسن بھوپالی ۲۲

غزل — نیر و نظر ۲۲

آج کا مردِ مومن — محمد یعقوب طاہر ۲۳

سرخ نظام — طالب حجازی ۲۳

غزل : دھن — بنت مجتبیٰ مینا ۲۴

غزل — ڈاکٹر عبدالسمیع قریشی ۲۵

کہاں؟ کیوں؟ — کوثر عظمی ۲۵

اپنے پہلے مجموعے سے — انور ظہوری ۲۶

ایک شعر — امین الرحمن ساز ۲۶

افسانے

جب عورت جاگی — شرون کمار ورما ۲۷

جال — آتم میرزا ۳۳

کفارہ — رضیہ انصاری بی اے ۴۰

پک نک — ام زہیر ۴۳

دیس بدیس

انعام — پروفیسر محمد خورشید علیم ۴۷

طنز و مزاح

کشمیری سوتی — محمودہ سلطانہ ۴۹

پان آفتِ جان — شوکت تھانوی ۵۰

مطالعہ کی میز پر

حقیقت اور حقیقت نگاری — محمود فاروقی ۵۱

پیروڈی

ماں کی محبت — حاجی لق لق ۵۳

اپنا خیال اپنی رائے

"اسلامی ادب نمبر" (چند ادیبوں کے خطوط) ۵۵

تذکرے اور تبصرے

(ادارہ) ۵۷

باوقار تنظیم ۵۸

نگراں :
عبدالغفور بیگ

مُرتّب :
محمود فاروقی

بدلِ اشتراک :
سالانہ : پانچ روپے
فی پرچہ : آٹھ آنے

(پرنٹر پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ الیکٹرک پریس سے چھپوا کر دفتر رسالہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا) کاتب : [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سویم بہار ———

تخریب پسندوں کا کنونشن

ڈھاکہ میں نیشنل پارٹی مگنا منتری دل۔ اور بھاشانی گروپ کے سربراہ ایک نئے سیاسی پلیٹ فارم کے لئے گفت و شنید کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں میاں افتخارالدین، جی ایم سید اور محمود الحق عثمانی تفصیلی مذاکرات کر چکے ہیں۔ یہ نیا سیاسی پلیٹ فارم کیوں بنایا جا رہا ہے؟ یہ سوال آ ج کا پراسرار نہیں ہے۔

مشرقی پاکستان کے کمیونسٹ عناصر نے متحدہ محاذ میں شامل ہو کر ملک کے سیاسی مسائل میں ایک ہموار قدم کیا تھا۔ اور وہ پاکستان کے نصف علاقے کے نظم و نسق میں براہ راست دخیل ہو گئے تھے۔ بھاشانی ایک ایسی شخصیت تھی جو کمیونسٹ عناصر کے لئے مقدس آڑ کا کام دے رہی تھی جس کے پیچھے وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بتدریج آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وزیراعظم سہروردی سے شدید اختلاف اور ایک سخت معرکہ کے بعد بھاشانی گروپ کو بری طرح شکست ہوئی اور عوامی لیگ کا ان کی پس پردہ سرگرمیوں کے لئے سخت محدود ہو گیا۔ عوامی لیگ سے مایوس ہو کر کمیونسٹ عناصر اب ایک نئے پلیٹ فارم سے وہی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں جس کے مظاہر گزشتہ سال ڈیڑھ سال سے مشرقی پاکستان میں نظر آتے رہے ہیں۔

کمیونسٹ سرگرمیوں کے سلسلہ میں ایک بات لازماً ذہن نشین رکھنی چاہئیے۔ اور وہ ایک بہت ہی واضح بات ہے ——— کمیونسٹ پارٹی کا لائحہ عمل اور پالیسی سوویٹ روس کی خارجہ پالیسی کا ایک چربہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھارتی حکومت اور کمیونسٹ روس میں روابط پیدا ہو گئے تو بھارتی کمیونسٹ پارٹی نے کانگریسی حکومت کے ساتھ اپنے مخالفانہ رویہ کو یکایک تبدیل کر دیا۔ اور یہی تبدیلی پاکستان کے متعلق کمیونسٹ نظریہ میں بھی تبدیلی کا باعث بنی۔ چنانچہ کلکتہ میں کمیونسٹ پارٹی کی کانگریس .... منعقد ہوئی۔ اور اس میں باقاعدہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس سے قطع نظر کہ وہاں پاکستان کے کون نمائندے تھے اور پاکستان کمیونسٹ پارٹی کن حالات میں بنائی گئی۔ کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ ——— "پاکستان مغربی سامراج کی پیداوار ہے جو کہ اسے تسلیم کئے بغیر ہندوستان کی آزادی ممکن نہیں تھی..... لہٰذا وقتی طور پر اس کا وجود ناگزیر تھا ——— "مرکزی کمیٹی یہ سمجھتی ہے کہ ——— "پاکستان جاگیردارانہ نظام کی سطح پر ہے۔ اور انڈیا صنعتی دور میں داخل ہو چکا ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان پر انڈیا کو فوقیت حاصل رہے گی اور کمیونسٹ پارٹی کی انڈیا میں انقلابی جدوجہد کا اثر لامحالہ پاکستان پر بھی ہوگا، اور انقلاب کے بعد یہ علاقائی تقسیم خود بخود مٹ جائے گی اسی لئے تنظیمی لحاظ سے پاکستان میں جدا پارٹی کی ضرورت ہے ——— "اسی اجلاس میں مسئلہ کشمیر کے متعلق بھارت کی پالیسی کی مشروط طور پر تائید کی گئی لیکن اس کے ساتھ کلچر اور قومیت کے نام پر کشمیر میں کمیونسٹ محاذ قائم کرنے پر زور دیا گیا ——— ان فیصلوں کے بعد ہی کمیونسٹ سرگرمیاں مشرقی پاکستان اور مقبوضہ کشمیر میں ایک ساتھ اپنا رنگ دکھانے لگیں۔ اور واضح ہو گیا کہ دونوں جگہ کمیونسٹ پاکستان کے خلاف بھارتی ایجنٹ کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں۔ کشمیر میں بھارت کی غاصبانہ پالیسی کی کوشش کا صاف مطلب یہ ہے کہ کمیونسٹ انڈین نیشنل کانگریس کے نظریات کے مطابق پاکستان کو ایک ایسا علاقہ تصور کرتے ہیں جو ان کی سیاسی اور بین الاقوامی ریشہ دوانیوں کا ہدف اور ان کی حرص و آز کا متوقع شکار ہے ——— !

ان واقعات کی روشنی میں پاکستان کی وہ حیثیت واضح ہو جاتی ہے جسے پیش نظر رکھ کر کمیونسٹ عناصر اپنی تخریبی سرگرمیوں کا جال پھیلانے میں مصروف ہیں۔ کمیونسٹوں کو متحدہ محاذ کے ذریعے سیاسی طالع آزمائی کا جو موقع مل گیا تھا اس سے انھوں نے اپنے آپ کو کافی حد تک زیادہ مستحکم کر لیا ہے۔ اور اب وہ مشرقی پاکستان سے آگے بڑھ کر مغربی پاکستان میں بھی اپنے حوصلے آزمانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس غرض کے لئے ایک ایسے سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت تھی، جو پاکستان کے دونوں حصوں میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ اس سلسلے میں بھاشانی، میاں افتخار الدین اور جی ایم سید اور غفار خاں کے علاوہ اور کون شخصیتیں موزوں و مناسب ہو سکتی تھیں۔ ان کے باہمی سمجھوتہ کا مطلب یہ ہے کہ کمیونسٹ تحریک اب ایک کل پاکستان تخریبی منصوبہ کو منظم طریقہ پر چلانے کا سلسلہ کرنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہے، اس سلسلہ کی ابتدائی سرگرمیاں چند ماہ سے مغربی پاکستان کے بعض علاقوں میں شروع کی جا چکی ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں کمیونسٹ ہراول یعنی نام نہاد ترقی پسند ادیب، سوشل اداروں، ادبی مجلسوں، تعلیمی مرکزوں اور صحافتی حلقوں میں زیادہ سے زیادہ نفوذ حاصل کر کے قومی، علاقائی، لسانی عصبیتوں کو ہوا دے رہے ہیں اور طبقہ وارانہ منافرت پھیلانے میں مصروف ہیں۔ یہی وہ طریقہ کار تھا جسے انھوں نے پوری قوت کے ساتھ مشرقی پاکستان میں برتا تھا۔ اور جس سے بہ حیثیت مجموعی کافی موثر نتائج ان کو حاصل ہوئے تھے۔ مشرقی پاکستان میں کوئی منظم اصولی تحریک ایسی نہیں تھی جو ابتدا میں ان کا راستہ روک سکتی۔ اسی لئے وہ تیزی سے آگے نکل گئے۔

سہروردی گروپ جس انداز میں ان کی روک تھام کر رہا ہے وہ قطعاً موثر و مفید نہیں ہے۔ محض سیاسی سازشوں اور پارلیمانی کرتبوں سے کسی ایسی تحریک کو روکا نہیں جا سکتا جو عوام میں کام کرنے کا تجربہ اور کارکنوں کی ایک منظم گروہ رکھتی ہو۔ کمیونسٹ کارکنوں کے لئے سیاسی مخالفات پیدا کرنا جس قدر ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ ضروری کمیونزم کا فکری اور نظری مقابلہ ہے۔ سہروردی صاحب کا رویہ اس سلسلہ میں انتہائی غیر منطقی اور الجھا ہوا ہے۔ وہ بین الاقوامی مسائل میں کمیونزم کی مخالفت کرتے ہوئے اسلام کا حوالہ دیتے ہیں اپنی خارجہ پالیسی کی تائید کے لئے اسلامی ہمدردیوں کا واسطہ دیتے ہیں کشمیر کے سلسلہ میں اسلامی اخوت کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن ملک کے اندرونی مسائل میں اسلام کو نظر انداز کرنے اور اس کی اہمیت گھٹانے کی دانستہ کوششیں کرتے ہیں۔ حالانکہ اس ملک میں کمیونزم کا موثر علاج اسلامی فکر و تمدن کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اگر سہروردی صاحب واقعی یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں صحت مند جمہوری نظریات فروغ پائیں تو ان کے لئے ایک کامیاب سیاسی پالیسی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اس تضاد اور نفاق کو چھوڑ کر پوری یکسوئی کے ساتھ ان لوگوں کو اپنا دوست بنانے کی کوشش کریں جو ہر محاذ پر بائیں بازو کے تخریبی اقدام کو روک سکتے ہیں۔

(محمود فاروقی)

پس پردہ

سیاسی نخرے

کھوجی

الکشن کے زمانے میں ہر جگہ بڑی دلچسپ حرکتیں ہوتی ہیں ابھی بھارت میں عام الکشن ہوئے ہیں ایک خبر آئی تھی کہ دو آراستہ و پیراستہ خواتین ووٹ ڈالنے کے لئے آئیں اور جب معلوم ہوا کہ انہیں اپنے ہاتھوں پر کالی روشنائی لگانی ہوگی تو انہوں نے اپنے گورے گورے ہاتھوں کو دیکھا پینٹ لگے ہوئے ناخنوں پر نظر ڈالی پھر ایک نے دوسری سے کہا نہیں۔ تو کوئلوں کی دلالی ہے اچھے بھلے ہاتھ کالے ہو جائیں گے اور وہ ووٹ ڈالے بغیر لوٹ گئیں ——— اصل بات یہ ہے کہ آج کل ووٹ لینا، ووٹ دینا، کوئی قومی ذمہ داری کا کام نہیں کہ آدمی خواہ مخواہ الکشن میں سنجیدگی سے حصہ لینے پر غور کرے یا تو ایک چلتا ہوا "بزنس" ہے یا پھر ایک "سیاسی فیشن" اور بہت سے لوگ تو اسے محض تفریح و دلبستگی کا ہی ذریعہ سمجھتے ہیں ———

——— سنا ہے مصر میں بھی پارلیمنٹ کے لئے الکشن ہونے والے ہیں امیدواروں نے ابھی سے دوڑ دھوپ شروع کر دی ہے۔ مصر کی یہ نئی پارلیمنٹ کیا کچھ کرے گی اس کا کچھ اندازہ ان انتخابی نعروں اور وعدوں سے ہو سکتا ہے جو امیدوار اپنے ووٹ دہندوں سے کر رہے ہیں۔ ایک امیدوار نے وعدہ کیا ہے کہ وہ کنواری عورتوں خاص کر بڑی عمر والی عورتوں کے لئے شوہروں کا بندوبست کریں گے ان کے ایک حریف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ نوجوانوں میں جھوٹی اور دکھاوے کی محبت اور لڑکیوں کے نخرے ختم کرنے کی کوشش کریں گے ایک اور امیدوار نے صابن کا کارخانہ کھلوانے اور لپ اسٹک کی سپلائی کے عمدہ انتظام کی ضمانت دی ہے۔ اب ذرا تصور کیجیے اس پارلیمنٹ کا جس میں یہ سارے امیدوار اپنے ان دلچسپ وعدوں کے نتیجہ میں معاملات طے کرنے کے لئے بیٹھیں گے جہاں سوئز، اسرائیل، صحرائے سینائی، مصر کے معاشی اور سیاسی مسائل کے بجائے اصل اور نمائشی محبت، لڑکیوں کے نخروں کے اسباب، صابن کی مختلف اقسام اور لپ اسٹک کے استعمال کے طریقوں پر گرما گرم بحثیں ہوں گی فیصلے کئے جائیں گے اور ان فیصلوں پر ملک میں موافق و مخالف مظاہرے جلسے اور ہنگامے برپا ہوں گے ——— اس میں تعجب والی بات امیدواروں کا بھی نہیں مصر میں آج کل جس قسم کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہے۔ اسی کے زیر سایہ الکشن کے موضوعات اسی کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے وہاں کس کی ہمت ہے کہ سوئز، سینائی، اور اسرائیل سے متعلقہ مسائل میں ان مظالم کو زیر بحث لائے جو ناصر گورنمنٹ سے سرزد ہوئی ہیں۔ ان مظالم پر تنقید کرے جو مختلف سیاسی اور عوامی جماعتوں پر توڑے گئے ہیں اس استبداد پر نکتہ چینی کرے جس نے رائے عامہ کا گلا گھونٹ دیا ہے جب یہ سب نہیں ہو سکتا تو خواہ مخواہ کس کو پڑی ہے کہ الکشن کو ایک سنجیدہ اور ذمہ دارانہ فریضہ سمجھ کر دردسر مول لے وہاں تو الکشن بس اس طرح کے سیاسی نخروں کے لئے ہو سکتے ہیں کہ صابن سے منہ دھو لپ اسٹک سے ہونٹ رنگے اور ستم جمال کے گانے گاتے ہوئے پارلیمنٹ کے ممبر بن گئے۔ عوام بھی خوش اور مالک الملک جمال ناصر بھی خوش۔

"پیار بیوپار"

- ——— ہمارے بگڑے ہوئے معاشرے کی ایک تلخ داستان!
- ——— ان بیشمار آنسوؤں کی روئیداد، جو پلکوں پر لرز کر رہ جاتے ہیں!
- ——— اس گھناؤنے کاروبار کی ظالمانہ روایات کی کہانی، جو خلوص کے مرجھائے ہوئے پھولوں اور پیار کی ٹوٹی ہوئی محرابوں پر قہقہہ زن ہے!

"پیار بیوپار" آثم میرزا کے اس ناول کے کردار آپ کے ارد گرد چلتے پھرتے، ہنستے روتے نظر آئیں گے!

دلکش گرد و پوش ——— حسین ٹائیٹل

صفحات ۳۰۰ ——— قیمت ساڑھے تین روپے۔

ملنے کا پتہ :- نیو پبلشرز، پوسٹ بکس نمبر ۲۹۱، مصری شاہ۔ لاہور

مضمون نگار حضرات سے۔

جوابی ٹکٹ کے بغیر کسی مضمون کی رسید یا اس سے متعلق دوسری مراسلت دفتر کی جانب سے نہیں ہوگی۔ (ادارہ)

فکر و نظر

عصرِ حاضر کی پیچیدگیاں اور اسلام

(ایک جرمن نو مسلم کے قلم سے)

• امان ہربھام (جرمن) • ترجمہ: یوسف احمد لکھنوی بی اے

مسلم ممالک میں رہنے والے میرے تمام بھائی اور بالخصوص تعلیم یافتہ افرادِ عصرِ حاضر کے نت نئے پیچیدہ مسائل اور روز افزوں مصائب سے تنگ آچکے ہیں۔ اور ان مسائل پر غور کرتے کرتے ان کے دماغ پراگندہ ہو چکے ہیں۔ وہیں حالات ایک تاریک مستقبل کے تلخ احساس کی وجہ سے موجودہ ماحول ایک گھٹی ہوئی فضا کا رنگ اختیار کر چکا ہے۔ مسلم ممالک کے قطع نظر دنیا کے حالات پر نظر ڈالئے یہی نقشہ وہاں پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ انفرادی زندگی کے مسائل سے لیکر اجتماعی مسائل تک تمام معاملات خاردار جھاڑیوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ عمومی طور پر دنیا کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے کل محسوس ہوتا ہے تمام انسان لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی پریشانیوں میں خوف و ہراس کے زبردست بوجھ تلے دبے چلے جا رہے ہیں۔

مسلم ممالک میں رہنے والے میرے تمام بھائی اور بالخصوص تعلیم یافتہ افرادِ عصرِ حاضر کے نت نئے پیچیدہ مسائل کا شکار بنے ہوئے ہیں۔

بادی النظر میں بڑے تاجر اور زمیندار کہلاتے ہیں۔ مادی طور پر فائق ہونے کی وجہ سے مغربی ممالک محسوس اور غیر محسوس طور پر تمام مسلم ممالک کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہیں۔ سماجی انصاف چند غرض مند افراد کی ہیلتے نفس اور مفاد پرستی کی بنا پر عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ لے دے کے چند دودھ خانے اور یتیم خانے ان کے لئے کھلے ہوئے ہیں جو کسی صورت سے بھی ان کی ضرورت کے لئے کافی نہیں سمجھے جا سکتے۔

تمام سماجی ادارے خوابیدہ اور خستہ حالت میں ہیں۔ نظامِ تعلیم سے نوجوانوں کے شعور اور اعلیٰ صلاحیتوں کو ابھارنے کی بجائے غلامانہ ذہنیت اور مغرب کی اندھا دھند تقلید کا درس دیا جاتا ہے۔ اس سے ہٹ کر عمومی طور پر عوام کی ایک زبردست اکثریت ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ ہے۔ اس جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے باشعور مادی طاقتیں انہیں کسی بھی سمت موڑ سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اپنا قومی تحفظ کرنے کے اہل بھی نہیں ہیں۔

بلاشبہ ہم اندرونی اور بیرونی مسائل کا مقابلہ کر رہے ہیں ——— مادی نقطہ نظر سے ہماری حالت جتنی خراب ہے روحانی طور پر اس سے کہیں بدتر ہے جس کی وجہ سے ایک کرب ناک حالت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

معاشی اور سیاسی اعتبار سے جتنے گروہوں میں ہم بٹے ہوئے ہیں ذہنی، فکری اور روحانی اعتبار سے ہمارا شیرازہ اور زیادہ بکھرا ہوا ہے۔ بہت سے مسلم ممالک بیرونی اقتدار کے پنجے سے آزاد ہو چکے ہیں۔ صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی ملتے ہی اندرونی معاملات سے نپٹنے کے لئے اور ایک ساتھ ہی اپنے لئے ایک علیحدہ نظامِ حیات کی جستجو میں بہت سی بھاری ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں۔ کیونکہ فکری اور سیاسی اعتبار سے جن خطوط پر یہ حکومتیں چل رہی تھیں۔ ان کے تعلق سے یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ان خطوط کو یکسر بدل دیا جائے۔ ہم میں سے کچھ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات قرآن اور رسول اکرمؐ کے بتائے ہوئے راستوں پر گامزن ہو کر ہی ہم اپنی حیاتِ ملی کی عظیم الشان عمارت تعمیر کر سکتے ہیں اور ان ہی بنیادوں پر قانون سازی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

مغرب کی اندھا دھند تقلید

لیکن دوسرے لوگ اس نقطہ نظر کی شدید مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ اگرچہ وہ دھڑلے کے ساتھ ہیلک جلسوں یا دیگر موقعوں پر اسلام کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس طریقہ سے وہ اپنے وقار کو کھو بیٹھیں گے اور بعض ممالک میں اسلامی اصولوں کی تائید بھی کی جاتی ہے لیکن تقریریں سے ہٹ کر ان کا عمل بالکل صفر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے مسائل اور الجھنوں کے تعلق سے وہ مغرب سے

اس لئے بیٹھے ہیں۔ یورپ امریکہ یا روس سے آئے ہوئے اصولوں کو ہی وہ مقصد اور حاصل سمجھتے ہیں۔ جن اصولوں پر ان ممالک کا ٹھپہ یا مہر ثبت نہ ہو وہ انہیں رجعت پسندی سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ اس لحاظ جو چیز بھی مغرب سے آئے وہ اپنی مرعوب ذہنیت کے تحت بلا چون و چرا قبول کر لیتے ہیں ۔۔۔ سوشلزم، سرمایہ داری اور کمیونزم خصوصیت کے ساتھ ان کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ان میں سے کوئی ایک نظام ہی ان کے درد کا مداوا بن سکتا ہے ———— اور ان کے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ وہ پُر فریب اور دل خوش کن نعروں سے آگے اپنی سپر ڈال دیتے ہیں۔ آزادی، انسانی اقدار اور سماجی انصاف ایسے دلپذیر نعرے ہیں جن کے دام فریب میں گرفتار ہو کر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ توقع کئے ہوئے ہیں کہ ان کی غربت، سماجی پستی اور سماجی بیماریوں کے لئے ایک ہی نسخہ صحیح ہو سکتا ہے۔ بالخصوص نوجوان طبقہ اس طریق فکر کو اپنانے میں بہت پیش پیش ہے۔

دراصل جن باتوں کی وہ تقلید کر رہے ہیں وہ مغربی کلچر نہیں ہے۔ بلکہ چند گھٹیا درجہ کے وہ عناصر ہیں جو بالکل ہی جذباتی ہونے کی وجہ سے جلد ی اور بآسانی قبولیت کا باعث بن جاتے ہیں۔ ناچ گھروں، شراب خانوں ورتوں سے آزادانہ اختلاط۔ لباس اور وضع قطع جیسی سستی، نفسیاتی اور نس کو لبھانے والی باتوں کو وہ اپنائے ہوئے ہیں۔ جو کسی مغربی کلچر کی پیچ میں لہلائے جا سکتے۔ بلکہ یہ مغربی کلچر کی چھوڑی ہوئی وہ ہڈیاں ہیں جو ہوس اور حریص افراد کو ایک قوم کی شکل میں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اس طرح نفس پرستی اور بوالہوسی کے ہاتھوں ان کی بہترین توانائیاں، قومی غیرت و حمیت کا بیش بہا سرمایہ بھی لٹ جاتا ہے جس کا انہیں احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس طرح زندگی میں وہ بھاری ذمہ داریوں کے بندھے ہوئے نظم زندگی کی قیود اور پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

مغربی کلچر ایک سراب ہے!

لیکن میرے عزیز بھائی اور بہن مغربی کلچر سے اور مغربی طرز زندگی سے بڑا اتنے متاثر اور مرعوب ہیں جبکہ یہ معاشرہ خود ہی روز بروز زوال پذیر ہوتا جا رہا ہے۔ کیا میرے بھائیوں نے یہ سوچ رکھا ہے کہ اہل مغرب ساری مشکلات اور پیچیدہ مسائل سے دوچار نہیں ہو رہے ہیں اگر آپ فی الحقیقت ایسا ہی سوچ رہے ہیں تو پھر سامراجی اقتدار اور غیر ملکی نظام کے تسلط سے آزاد ہونے کے لئے اتنی جدوجہد اور قربانیاں دینے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ جس ذہنیت کو اپنانا ہوا سے آزاد ہونے کے بعد ہی کیوں اپنایا جائے جبکہ زیر اقتدار اور زیر تسلط رہ کر بھی بہت آسانی کے ساتھ شیر و شکر ہو کر پورے مغرب زدہ ہو سکتے ہیں؟

نہیں! آپ مجھ سے سنیئے! جو خود ایک مغربی ہے اور جس نے نازی ازم، کمیونزم اور سرمایہ داری اور جمہوریت جیسے جاری و ساری تمام نظاموں کا مزہ چکھا ہے۔ میں اور مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں افراد جو مغربی ممالک میں رہتے ہیں ایسے ہی ناخوشگوار اور غیر مطمئن حالات سے دوچار ہیں۔

بلاشبہ ہم لوگوں کا (اہل مغرب) کا معیار زندگی بہت بلند ہے۔ ہمارے مزدوروں تک کو بھاری اجرتیں ملتی ہیں۔ غذا، کپڑے اور مکان جیسی بنیادی ضرورتیں بڑی آسانی اور اعلیٰ معیار کے ساتھ پوری ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے بادی النظر میں ان کی مادی زندگی عیش و عشرت اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے گزرتی ہے کیونکہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ پُر مسرت بنانے کے لئے عیش و نشاط کے پورے سامان مہیا ہیں لیکن اس کے باوجود زندگی کی حقیقی مسرتوں سے وہ تہی دامن ہیں۔ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی بے چینی اور اضطرابی کیفیت میں عیش و نشاط کے یہ سارے وسائل کچھ اس طرح سے مدغم ہو چکے ہیں کہ ناخوشگواری کا احساس کسی طرح مٹنے نہیں پاتا اور موہوم سی خواہش اور اطمینان قلب کا احساس دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے۔

شعوری طور پر یہ احساس عام ہو چکا ہے کہ تمدن و سائنسی ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج طے کرنے کے باوجود ان مغربی ممالک میں صرف ۲۵ ۔ ۳۰ برس کی قلیل مدت میں دو ہولناک جنگیں نمودار ہو چکی ہیں۔ اور ان دونوں جنگوں میں بہیمیت اور درندگی نے دل کھول کر اپنے حوصلے نکالے۔ ہزاروں لاکھوں افراد اس بہیمیت کا شکار بن گئے۔ اور لاکھوں افراد معذور اور اپاہج بن کر زندہ درگور ہو گئے۔ بڑے بڑے پر رونق شہر دیکھتے دیکھتے شمشان بن گئے۔ مرد عورت اور بچے ہزاروں کی تعداد میں نہایت بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ہزاروں لاکھوں افراد نے اپنے گھروں سے بے گھر ہو کر فٹ پاتھ پر سسک سسک کر دم توڑ دیا۔ اور ابھی تک جبکہ گذشتہ جنگ عظیم کے ناسور رس رہے ہیں وہ جان لیوا گھاؤ مندمل نہیں ہوئے ہیں ہم سب ایسے ماحول میں

وجہ کرب کی فضا پیدا کر رہے ہیں۔ مصائب اور آلام سے دوچار "انسانیت" کی سسکیوں کا تسلسل ابھی تک ٹوٹنے بھی نہیں پایا۔ ایک اور جنگ کے لئے "لاوا" تیار کیا جا رہا ہے اور ان بجھے ہوئے شعلوں کو ہوا دے کر پھر بھڑکایا جا رہا ہے تاکہ رہے سہے انسان بھی ان شعلوں کی لپیٹ میں آ کر جھلس جائیں۔ ان ساری تلخ حقیقتوں کے پیش نظر یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ ـــ یہ ساری وساری نظریات دارس مل کر بھی انسانیت کے لئے کوئی پر امن اور سکون بخش حل تلاش نہیں کر سکیں گے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

مغربی زندگی کے دوسرے پہلو میں کہ جب سے مغرب نے اپنی زندگی کو مادی بنیادوں پر استوار کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس وقت سے اب تک زندگی کا منشاء اور مقصود صرف حصول دولت کے تنگ دائرہ میں محدود ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انسانی زندگی کی ابتداء اور انتہا یہی ہے کہ انسان دولت کمانے کے لئے زندہ رہے اور اسی کے لئے مرے جس کے نتیجہ کے طور پر خود غرضی اور مفاد پرستی جیسے عناصر کا وجود میں آنا ایک لازمی امر ہے۔ ہر فرد کو خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ہو دولت کے پیمانہ میں ناپ تول کر اس کی عظمت اور بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ہر کام میں تجارتی اخلاق اور ہر کام میں نفع اندوزی کا احساس ان کی حد تک پہنچ چکا ہے۔

عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط نے خاندانی زندگی بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دی ہے جنسی بے راہ روی اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کا شوق عورتوں اور مردوں میں حیوانیت کے درجے تک پہنچ چکا ہے۔ فلم، ناچ گھر، فحش لٹریچر اور آزاد عشق و عاشقی نے نوجوانوں کو ہوس پرستی اور نفسانی خواہشات کا غلام بنا دیا ہے۔

ان تمام برائیوں سے بڑھ کر یہ برائی ہے کہ تمام مغربی ممالک اور روس میں تمام معاملات میں انسان کی ناقص عقل کو اور ناقص فیصلوں کو اٹل مانا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے قدم قدم پر ناانصافی، تعصب اور مفاد پرستی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

قانون سازی اور نظریہ حیات مدون کرنے میں خود اقتدار اعلیٰ کی حیثیت سے انسانی اقتدار کا صحیح معنوں میں کبھی احاطہ ۔۔۔۔ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کوئی آدمی بھی انسان کامل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اس کی بصیرت اس حد تک محیط ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کے محدود مسائل کی صحیح صحیح نشاندہی اور ان کا مناسب حل نکال کر لے علوم و فنون کی لامحدود ترقی بھی انسان کے محدود علم کو لامحدود نہیں بنا سکی جس کی بنا پر اس کے فیصلوں میں اس کی سمجھ بوجھ میں اور دماغ کی فکر میں کوئی نہ کوئی ڈھکی چھپی خامی ایسی رہ جاتی ہے جو شر و فساد اور بڑے پیمانہ پر تباہی و بربادی کا موجب بن جاتی ہے۔

اس کی وجہ سے موجودہ انسانوں کی زندگی اتنی پر حوادث اور غیر محفوظ ہو چکی ہے کہ صحت اور سلامتی اس سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔

یہاں پر میں اس سلسلے کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں جو برلن میں خود مجھ پر گذرا ہے۔

برلن وہ تقسیم شدہ شہر ہے جہاں پر مغربی جمہوریت اور روسی کمیونزم ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ایک مرتبہ جبکہ میں شہر کی ریل پر سفر کر رہا تھا میرا ایک ہم سفر ایک مغربی اخبار پڑھ رہا تھا جس پر جلی حرفوں میں یہ سرخی چھپی تھی۔

"شمالی کوریا کا ایک زبردست حصہ کمیونزم کی غلامی سے
چھٹکارا پا چکا ہے۔"

اس کے دس منٹ بعد جبکہ روس کا مقبوضہ علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ جب ایک اخبار مطالعے کے لئے خریدا تو اس پر یہ سرخی جمی ہوئی تھی

"امریکی جارحیت نے آزاد کوریا کے ایک زبردست حصہ
کو غلام بنا لیا۔"

یہاں پر جو چیز قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ایک چیز کو کچھ لوگ نیکی اور ثواب گردانتے ہیں لیکن اسی چیز کو چند لوگ زبردست گناہ اور بدترین جرم خیال کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے خیر و شر کے معیار ان کی نوعیت اور ان کے مقاصد میں بالکل ہے اور یہی بات حق و ناحق کے تعلق پر کہی جا سکتی ہے در حقیقت یہاں پر انسان انسان ہے بلکہ چند اغراض و مفادات اور حیوانی خواہشات کا پتلا بن گیا ہے۔

اگر میرے ہم سفر کے پاس سے جو دس منٹ پہلے اسی خلاف کمیونسٹ اخبار مطالعہ کر رہا تھا اگر کمیونسٹ پولیس اخبار برآمد کر لیتی تو اسے سیدھا جیل کی ہوا کھانی پڑتی اور یہی حال میرا بھی ہوتا۔ اگر میں اس اخبار کے تحت مغربی جرمنی کی جانب چلا جاتا۔ اور ہم ہی اس بات کا بلند بانگ دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ حق پر ہے لیکن ایک تیسرا آدمی کا

فیصلہ کرے گا۔ وہ کسے حق اور کسے ناحق کہے گا۔ اور حق اور باطل کے درمیان کیسے تمیز کریگا یہی حال دنیا کے تمام مسائل کا ہے اور دنیا کے تمام معاملات حق و ناحق کی اس کشمکش کا شکار ہیں۔

اے میرے بھائیو! کیا ان حالات میں ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ یہ مغربی افکار اور مغربی عقل جو "اسفل السافلین" کی حد تک گر چکے ہیں انسانی مسائل کو انصاف اور حق و ناحق کی بنیادوں پر حل کر سکیں گے۔

یقیناً کوئی شخص بھی ان حالات کو دیکھ کر افسوس کئے بغیر نہ رہ سکے گا پھر ایسی صورت میں وہ کونسی طاقت اور وہ کون سے محرکات ہیں جو انہیں ان دیوالیہ نظاموں کی طرف کھینچ کر لا رہے ہیں۔ اگر ہماری عقلوں پر پردے پڑ چکے ہیں۔ تو ان کو نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اگر اب بھی ہم نے اپنی چشم بصیرت سے کام نہ لیا تو پھر تباہی و بربادی ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوگی۔

(بشکریہ "المنیر" لائلپور)

تحلیل و تجزیہ

مزاج کی بے اعتدالی

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اعتدال و توازن

ایک پورا خاندانِ عیوب اس کمزوری سے جنم لیتا ہے جس کے لئے موزوں ترین نام "مزاج کی بے اعتدالی" ہے۔ مزاج کی بے اعتدالی کا فطری نتیجہ نظر و فکر کی بے اعتدالی اور عمل و سعی کی بے اعتدالی ہے، اور یہ چیز زندگی کے حقائق سے براہِ راست متصادم ہوتی ہے۔ انسانی زندگی بے شمار متضاد عناصر کی مصالحت اور بہت سے مختلف عوامل کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں انسان رہتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ انسانی افراد میں سے ہر ایک فرداً فرداً بھی ایسا ہی بنایا گیا ہے۔ اور انسانوں کے ملنے سے جو اجتماعی ہیئت بنتی ہے اس کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اس زندگی میں کام کرنے کے لئے فکر و نظر کا ایسا توازن، اور سعی و عمل کا ایسا اعتدال درکار ہے جو مزاجِ کائنات کے توازن و اعتدال کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔ حالات کے ہر پہلو پر نگاہ رکھی جائے۔ معاملات کے ہر رخ کو دیکھا جائے۔ ضروریات کے ہر گوشے کو اس کا حق دیا جائے۔ فطرت کے ہر تقاضے کو ملحوظ رکھا جائے۔ کمال درجے کا ہمہ گیر اعتدال چاہے نصیب نہ ہو۔ مگر یہاں کامیابی کے لئے بہرحال اعتدال ناگزیر ہے۔ جتنا بھی وہ معیار سے قریب ہوگا اتنا ہی مفید ہوگا۔ اور جس قدر وہ اس سے دور ہوگا اسی قدر زندگی کی حقیقتوں سے متصادم ہو کر نقصان کا موجب بنے گا۔ دنیا میں آج تک جتنا بھی فساد رونما ہوا ہے اور آج رونما ہے اسی وجہ سے ہے کہ غیر متوازن دماغوں نے انسانی مسائل کو ایک رخے پن کے ساتھ دیکھنے اور سمجھنے کی کوششیں کیں۔ ان کو حل کرنے کے لئے غیر متوازن اسکیمیں بنائیں۔ اور ان کو نافذ کرنے کے لئے غیر معتدل طریقے اختیار کئے۔ یہی بگاڑ کا اصل سبب ہے، اور بناؤ کا جو کچھ بھی کام ہو سکتا ہے، فکر و نظر کے توازن اور طریقِ عمل کے اعتدال ہی سے ہو سکتا ہے۔

> خبردار! انتہا پسندی میں نہ پڑنا کیونکہ تم سے پہلے کے لوگ دین میں انتہا پسندی اختیار کر کے ہی تباہ ہوئے ہیں
> (مسند احمد بروایت ابن عباس)
>
> برباد ہو گئے شدت اختیار کرنے والے، مبالغے اور تعمق سے کام لینے والے۔
> (مسلم اور بروایت ابن مسعود)

یک رخی

مزاج کی بے اعتدالی کا اولین مظہر انسان کے ذہن کا ایک رخا پن ہے۔ اس کیفیت میں مبتلا ہو کر آدمی بالعموم ہر چیز کا ایک رخ دیکھتا ہے دوسرا رخ نہیں دیکھتا۔ ہر معاملے میں ایک پہلو کا لحاظ رکھتا ہے۔ دوسرے کسی پہلو کا لحاظ نہیں کرتا۔ ایک سمت جس میں اس کا ذہن ایک دفعہ چل پڑتا ہے اسی کی طرف وہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دوسری سمتوں کی جانب توجہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس سے معاملات کو سمجھنے میں مسلسل ایک خاص طرح کے عدمِ توازن کا ظہور ہوتا ہے۔ رائے قائم کرنے میں بھی وہ ایک ہی طرف جھکتا چلا جاتا ہے۔ جس چیز کو اہم سمجھ لیتا ہے بس اسی کو پکڑ بیٹھتا ہے۔ دوسری ویسی ہی اہم چیزیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم چیزیں اس کے نزدیک غیر وقیع ہو جاتی ہیں۔ جس چیز کو برا سمجھ لیتا ہے اسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ دوسری ویسی ہی بلکہ اس سے زیادہ بڑی برائیاں اس کے نزدیک قابلِ توجہ نہیں ہوتیں۔ اصولیت اختیار کرتا ہے تو جمود کی حد تک اصول پرستی میں شدت دکھانے لگتا ہے۔ کام کے عملی تقاضوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ عملیت کی طرف جھکتا ہے تو بے اصولی کی حد تک عملی بن جاتا ہے۔ اور کامیابی کو مقصود بالذات بنا کر اس کے لئے ہر قسم کے وسائل و ذرائع استعمال کر ڈالنا چاہتا ہے۔

• انتہاپسندی

یہ کیفیت اگر اس حد پر نہ رک جائے تو آگے بڑھ کر یہ سخت انتہاپسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر آدمی اپنی رائے پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرنے لگتا ہے۔ اختلاف رائے میں شدت پیدا ہونے لگتی ہے۔ دوسروں کے نقطہ نظر کو انصاف کے ساتھ نہ دیکھتا ہے، نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ ہر مخالف رائے کو برے سے برے معنی پہنا کر ٹھکرانا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز روز بروز اسے دوسروں کے لئے اور دوسروں کو اس کے لئے ناقابل برداشت بناتی چلی جاتی ہے۔

اس مقام پر بھی بے اعتدالی رک جائے تو غنیمت ہے لیکن اگر اسے خوبی سمجھ کر مزید پرورش کیا جائے تو پھر معاملہ بدمزاجی، اور چڑچڑے پن اور تیز زبانی، اور دوسروں کی نیتوں پر شک اور حملوں تک پہنچ جاتا ہے جو کسی اجتماعی زندگی میں بھی نبھنے والی چیز نہیں ہے۔

• نتائج

نتائج کے اعتبار سے بے اعتدالی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ وہ بالعموم ناکامی کی موجب بن جاتی ہے۔ نظام زندگی میں اصلاح و تغیر کی کوئی اسکیم بھی لیکر آپ اٹھیں، آپ کی کامیابی کے لئے صرف یہ بات بہت کافی نہیں ہے کہ آپ خود اس کے برحق ہونے پر مطمئن ہوں۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اپنے معاشرے کے عام انسانوں کو اس کے صحیح، مفید اور قابل عمل ہونے پر مطمئن کریں۔ اور اپنی تحریک کو اس شکل میں لائیں اور ایسے طریقے سے چلائیں جس سے لوگوں کی امیدیں اور دلچسپیاں اس کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی جائیں۔ یہ بات صرف اسی تحریک کو نصیب ہو سکتی ہے جو نظر و فکر میں بھی متوازن ہو اور طریق عمل میں بھی متوازن۔ ایک انتہاپسندانہ اسکیم، جو انتہاپسندانہ طریقوں سے چلائی جائے، عام انسانوں میں اپنے لئے رغبت اور امید پیدا کرنے کی بجائے نفرت اور مایوسی پیدا کرتی ہے، قائل اور مطمئن کرنے کے بجائے معترض اور غیر مطمئن بنا دیتی ہے۔ اس کی یہ صفت خود ہی اس کی قوت تبلیغ اور قوت نفوذ کو ضائع کر دیتی ہے۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لئے کچھ انتہاپسند لوگ اکٹھے ہو بھی جائیں تو سارے معاشرے کو اپنے جیسا انتہاپسند بنا لینا اور دنیا بھر کی آنکھیں حقائق سے بند کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

• اجتماعی خسارہ

ایک آدمی یہ روش اختیار کرے تو زیادہ سے زیادہ نتیجہ یہی ہوگا کہ اکیلا جماعت سے کٹ جائے گا اور اس مقصد کی خدمت سے محروم رہ جائے جس کی خاطر وہ جماعت سے وابستہ ہوا تھا۔ اس سے کوئی اجتماعی نقصان واقع نہ ہوگا۔ مگر جب کسی اجتماعی ہیئت میں بہت سے غیر متوازن ذہن اور غیر معتدل مزاج جمع ہو جائیں تو پھر ایک ایک قسم کا عدم توازن ایک ایک گروہ کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ ایک انتہا کے جواب میں دوسری انتہا پیدا ہو جاتی ہے۔ اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے جاتے ہیں۔ کھینچ تان پڑتی ہے۔ دھڑے بندی ہوتی ہے۔ اس کشمکش میں وہ کام خراب رہتا ہے جسے بنانے کے لئے بڑی نیک نیتی کے ساتھ کچھ لوگ جمع ہوئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کام انفرادی کوششوں سے کرنے کے نہیں ہیں بلکہ جن کی نوعیت ہی اجتماعی ہوتی ہے انہیں انجام دینے کے لئے بہرحال بہت سے لوگوں کو ساتھ مل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی بات سمجھانی اور دوسروں کی سمجھنی ہوتی ہے۔ طبیعتوں کا اختلاف، قابلیتوں کا اختلاف، ۔۔۔ ذاتی خصوصیات کا اختلاف اپنی جگہ پر رہتا ہے۔ اس کے باوجود سب کو آپس میں موافقت کا ایک تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی تعاون ممکن نہیں۔ اس موافقت کے لئے کسر و انکسار ناگزیر ہے۔ اور یہ کسر و انکسار صرف معتدل مزاج کے لوگوں ہی میں ہو سکتا ہے جن کے خیالات بھی متوازن ہوں اور طبیعتیں بھی متوازن۔ غیر متوازن لوگ جمع ہو بھی جائیں تو زیادہ دیر تک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ان کی جمعیت پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ اور جن ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر ایک ایک قسم کے عدم توازن کے مریض جمع ہوں گے، ان میں پھر تفرقہ رونما ہوگا۔ یہاں تک کہ آخر کار ایک ایک امام مقتدیوں کے بغیر کھڑا نظر آئے گا۔

(بشکریہ "ترجمان القرآن")

دفتر منیجر سے

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر تحریر کرنا نہ بھولئے تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو۔ (منیجر)

جدید پاکستانی عورت کا ایک نفسیاتی روگ

"مردانہ الجھن"

شیر محمد اختر

ہماری تہذیبی ترقی نے عورت کو مرد کا مقابلہ کرنے پر بہت اکسایا ہے اور آج عورتیں مردوں کے برابر حقوق حاصل کرنے میں سرگرداں ہیں میں یہاں حقوق کے ان مطالبات کے بارے میں کچھ عرض نہیں کروں گا۔ بلکہ اس باہمی کشمکش اور "آزادی" کی جدوجہد نے عورتوں میں ایک نفسیاتی بیماری ضرور پیدا کر دی ہے جسے مردانہ الجھن (MASCULINE COMPLEX) کہا جاتا ہے، عورتوں کا مردوں کے خلاف موجودہ احتجاج عورتوں کے داخلی میلانات اور مریضانہ اقتضاءات کی پیداوار ہوتا ہے ——

آپ نے اکثر عورتوں کو مرد بننے کی خواہش میں مبتلا دیکھا ہو گا۔ بالوں کی تراش خراش اور پتلون کا استعمال اس کے شاہد ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ خواہش عورت کے لازمی پہلوؤں کو دبانا شروع کر دیتی ہے۔ اس سے انسان میں سادیت پسندی (SADISM) اور ایذا دہی پیدا ہو جاتی ہے۔ مروجہ قوانین اور روایات سے سرکشی کے ساتھ ساتھ بے جا نکتہ چینی اور دوسروں کے نقائص کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت اپنے نسوانی فرائض سے بھی کوتاہی کرنے لگتی ہے۔ تکبر، خود پسندی اور جذباتی حرکات کا موجب بنتی ہے۔

ایسی عورتیں اپنے گھر میں بہت سی الجھنیں پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ نفسیاتی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ ایسی مائیں جن میں "مردانہ الجھن" پائی جاتی ہے وہ اپنے بچوں سے بڑے اہتمام اور زور شور سے پیار کا اظہار کرتی ہیں اور ان کی دیکھ بھال میں بڑی محتاط ہوتی ہیں اپنی تشویش اور اضطراب کو دور کرنے کے لئے وہ غیر ضروری تدابیر سے ان کے کھانے کے اوقات، رفع حاجت اور وزن کی بھی پیمائش کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ وہ بچوں کو اتنے زور سے چاہتی ہیں کہ بچہ ان کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے جب وہ ماں کو ذرا دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو ماں دبدبے اور رعب سے کام لیکر اسے خاموش کرا دیتی ہے۔

"مردانہ الجھن" کا جب زیادہ گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرد کی مجلسی برتری اور آزادی سے عورت میں رشک اور حسد پیدا ہوتا ہے اور وہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ انسانی پیدائش کے علاوہ دوسرے کاموں کے لئے بھی اتنی ہی موزوں ہے۔ مرد بننے کی یہ خواہش ان رعایتوں اور مراعات کی وجہ سے ہے جو مرد کو حاصل ہیں معاشرتی زندگی میں قوت، جرأت، جنسی اور دوسری آزادی عورت کو ایسی زندگی کی آرزو کے لئے مجبور کرتی ہے جس سے انہیں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ ایک فطری ردِعمل ہے۔

صدیوں سے عورت خارجی زندگی سے دور ایک جذباتی دنیا میں مقید رہی ہے۔ اب اسے مواقع ملنے لگے ہیں، ان کے خلاف ہی ایک نفسیاتی الجھن نے بھی اپنا کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ عورت کے اس ذہنی مرض کا نفسیاتی علاج کیا جائے اس کے لئے علم کے عام کرنے کی ضرورت ہے، ایسے حالات کی ضرورت ہے جس میں یہ الجھن دور ہو کر ارتفاعی صورت اختیار کر لے۔ کیوں کہ :——

—— فطرت کا منشا یہی ہے کہ عورت اپنی گراں بہا نسوانیت کو ان مردانہ مشاغل پر قربان نہ کرے جن کا کرنا مرد کے سپرد ہے۔ انسانی زندگی کی تخلیق کا سب سے بڑا کارنامہ اس کائنات میں اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور اس عظیم الشان کارنامے کا سہرا عورت کے سر پر ہے۔ اپنے وجدان کو چھوڑ کر عورت جب دماغی مشاغل کے میدان میں آتی ہے تو اس کی نسوانیت کا خون ہو جاتا ہے وہ نسوانیت سے دور ہٹنے لگتی ہے۔ موجودہ "تہذیب" کی ترقی کا ایک اور "ثمر" یہ ہے کہ مرد اور عورت کے جنسی رشتے میں ایک گریز کا پہلو نمایاں ہونے لگا ہے۔

(بشکریہ "مسلمہ")

شخصیات

روزنامچہ ایڈن مانٹیگو

جو بات گھر کے اندر کہی جاتی ہے یہ سمجھ کر کہ اس کو باہر کوئی نہ سن سکے گا وہ بات زیادہ دلچسپ اچھے زیادہ سچی ہوتی ہے اس کلام سے جو عوام کے درمیان شہرت اور اشاعت کے لئے زبان پر لایا جائے۔ اخبار کے کالموں میں اور پبلک جلسوں میں ماہرین اور لیڈروں کی تقریریں کچھ ہوتی ہیں اور گھر کی باتیں کچھ اور ——

ایڈون مانٹیگو سنہ ۱۹۱۷ء میں سلطنت برطانیہ کے وزیر ہند تھے۔ اب وہ دنیا میں موجود نہیں۔ جب وہ وزیر ہند کی حیثیت سے سنہ ۱۹۱۷ء میں ہندوستان کا دورہ اور آئینی اصلاحات کے متعلق اپنی رپورٹ تیار کر رہے تھے۔ تو ایک ذاتی روزنامچہ بھی لکھا کرتے جس میں وہ دل کی باتیں، تجربے اور ان لوگوں کے متعلق اپنے خیالات جو ان سے ملاقات ... حاصل کرتے تھے، بے تکلف اور بے فکر درج کر لیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ اوراق بجنسہٖ شائع کر دیئے گئے ہیں ۔

گاندھی

ہم مشہور گاندھی سے ملے۔ یہ ایک سوشل ریفارمر ہیں۔ ان کی حقیقی خواہش یہ ہے کہ لوگوں کی شکایتیں معلوم کریں اور ان کو رفع کرائیں اپنی شہرت کی غرض سے نہیں بلکہ بنی نوع کی حالت بہتر بنانے کے لئے ۔

جناح

ان کے بعد جناح آئے۔ نوعمر، نہایت سلیقہ شعار، مرعوب کرنے والی شکل و صورت، گفتگو کی تمام ترکیبوں سے مسلح اور اپنی پوری اسکیم کے منوانے پر مصر۔ میں تھکا ہوا تھا۔ میں تو بات کرتے ہوئے گھبرایا۔ البتہ چیمسفورڈ نے بحث کرنی چاہی۔ ان کو بھی گھما گھما کر ایسا باندھا کہ جواب بن نہ آیا جناح بہت ہوشیار آدمی ہیں اور حیف ہے کہ ایسے شخص کو اپنے ملک کے انتظام میں حصہ لینے کا موقع نہ ملے

راماسوامی ایر

اس کے بعد راماسوامی ایر آئے۔ اپنی زندگی میں ان سے زیادہ ہوشیار آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔ خیالات میں انتہا پسند ہیں۔ مگر بہت قابل ... دوران بحث میں بار بار ہم کو (مجھے اور چیمسفورڈ کو) لاجواب کر دیا ۔

مالوی

پنڈت مدن موہن مالوی بھی آئے۔ ان سے زیادہ سرگرم آدمی شاید ہی کسی کونسل میں ہو۔ ظاہری حالت بہت دلکش ہے۔ برہمن اور سر تا پا سفید لباس میں، بہت دلکش آواز اور نہایت شائستہ بات چیت اور نہ گھٹنے والی ترقی کی خواہش ..... اس کے بعد مالوی سے بہت طویل گفتگو رہی۔ مجھے یہ شخص بہت بھایا۔ اس میں اس قدر قوتِ امادی ہے کہ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ مالوی کی گھاس کے اندر ایک سانپ کی شکل ہے۔ میرے خیال میں یہ لوگ گورنمنٹ ہاؤس کے ساتھ صحیح برتاؤ کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کرتے ۔

سر سریندر ناتھ بنرجی

سر سریندر ناتھ بنرجی اور مدھوکر آئے۔ بنرجی تو سراپا گفتار ہیں بہت باتونی۔ اور ان میں آثارِ اعتدال اور سمجھوتے کے نہیں پائے جاتے۔

انھوں نے ایک عجیب اصول بیان فرمایا کہنے لگے کہ ... "آپ خود ایک سیاست داں ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص اقلیت میں ہو تو وہ سوائے اس کے اور کیا کرسکتا ہے کہ اکثریت میں شامل ہوجائے" —

واہ! ہندوستانی سیاستدانوں کا کس قدر اعلیٰ اصول کا ہے۔

امام صاحب جامع مسجد

دہلی کی جامع مسجد کے امام صاحب آئے۔ اور مجھے سمجھایا کہ ہوم رول کس قدر خطرناک چیز ہے اور ہم کو اصلاحات دینے میں کس قدر احتیاط ضروری ہے مگر ان کی کوئی بات دلچسپ نہ تھی۔

نواب محمود آباد

شستہ انگریزی بولتے ہیں۔ اور میرے خیال میں کلیتہً مخالف ہیں۔ نواب محمود آباد خوش مزاج آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ محمود آباد سے بہت طویل باتیں ہوئیں تا آخر کار میں ان کی دماغی کیفیت اب اچھی طرح سمجھ سکا اور اب مجھے بہت پسند آگئے۔ غالباً مسٹن نے ان کے ساتھ غلط برتاؤ کیا۔ وہ ایسے مسلمانوں سے تنگ آگئے ہیں جو محض پین اسلامزم کو ترجیح دیتے ہیں اور ہندوستانی وطنیت کی پروا نہیں کرتے۔ بہت موثر گفتگو تھی۔

باسو

باسو سے کچھ باتیں ہوئیں۔ بڑا ہی چلتا ہوا شخص ہے جو کاغذات دیئے جاتے ہیں ان کو نہیں پڑھتے اور مجھ ار بار وہی باتیں سمجھانی پڑتی ہیں جو وہ کاغذات سے معلوم کر سکتے تھے ——— باسو چلتے ہوئے ہوشیار، ضدی، جھگڑالو میں سمجھتا مگر شکر گزار شریف بہت انصاف پسند اور جج کے لیے اچھا مُرتا۔

محمد علی

رابرٹسن نے مجھ سے کہا کہ ایک آل انڈیا ڈیپوٹیشن مجھ سے ملنے دلی آیا تھا۔ اس سے کہا گیا کہ صرف اصلاحات کے متعلق گفتگو کرے۔ مگر اس کے ایڈریس میں محمد علی کو آزاد کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ ممبران ڈیپوٹیشن سے کہا گیا کہ اس جزو کو نکال دیں۔ وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ افسوس اگر چیمسفورڈ ان سے بحث کرلیتے، تو [illegible]

شاید ان کو رضامند کرسکتے اور اب وہ بہت بددل ہوکر واپس گئے۔ رابرٹسن کہتے تھے کہ ان میں سے وہ ان سے ملنے آئے تھے۔ وہ دونوں یوں کہتے تھے کہ ہمیں محمد علی کی نظربندی کی اس قدر فکر نہیں بلکہ ہم کو اس بات کا یقین ہوگیا ہے ... کہ نظر بندی گورنمنٹ کی اس پالیسی کا ایک جزو ہے۔ کہ خلیفہ سے تعرض کیا جائے ... اور تجویز یہ کیا جائے کہ اس ذلیل بڈھے شاہ حجاز کو خلیفہ بنادیں۔

کلیولینڈ کھانے کے بعد مجھ سے یہ کہہ رہے تھے کہ ایک زمانہ میں محمد علی سے ان کی بہت دوستی تھی۔ ترکوں کے شریک جنگ ہونے سے پہلے ایک دن محمد علی ان کے پاس آئے تھے۔ اور یہ رمضان کا آخری دن تھا۔ محمد علی بہت بھوکے تھے کلیولینڈ نے ان کو پیٹ بھر روٹی کھلائی۔ کھانے کے بعد محمد علی نے برطانوی فوجوں کی فتحیابی کی امید ظاہر کی اور وہ اس پر رضامند ہوتے ہوئے معلوم ہوئے کہ ایک تار دیا۔ اور برطانیہ کے خلاف شریک جنگ ہونے سے روکا ———

چنانچہ کلیولینڈ نے صبح کو ان سے اجازت لے کر وہ تار روانہ کردیا۔

مسز نائیڈو

شاعرہ ہے اور بہت دلکش اور ہوشیار عورت ہے۔ لیکن میرا خیال کہ وہ اپنے دل میں پوری انقلاب پسند ہے۔

نظام

چار بجے نظام کا باضابطہ ورود ہوا۔ ہمیں شک نہیں کہ نظام کی شخصیت ہمارے لئے بہت اہم شخصیت ہے اسلئے کہ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بگڑنے نہیں دیا۔ اور ہم نے ان کو چلتے ہوئے بڈھے اور اپنے ریذیڈنٹ کے توسط کافی استعمال کیا ہے مگر ہم نے تمام والیان ریاست میں نظام کو ممتاز بنا کر بہت بددلی پیدا کردی ہے ——— نظام دو شنبہ کی رات کو وزیر کے یہاں کھانا کھائیں گے۔ اس وقت مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں کہیں اور کھانا کھاؤں تاکہ میری موجودگی کی وجہ سے حفظ مراتب کی دشواری پیدا نہ ہو۔ یہ حرکت تو بالکل مضحکہ خیز ہے اور اس طرح نظام کو یا ان کا منصب چڑھ گیا ہے کی ہنسی کے ساتھ پیشانی اٹھا

بیگم بھوپال

بیچاری مجھ سے ملنے آئیں ایک بھاری ریشم کے کپڑے میں ایک ذرا سا سوا

[illegible]

کس نے کیا کہا؟

خرابی کے اسباب

"پاکستان میں حکمرانوں اور عوام کے درمیان بُعد، برسرِ اقتدار طبقہ کا اپنے اقتدار کو طوالت دینا، عوام کا اعتماد حاصل نہ ہونے کے باعث حکومت کی بے حسی، موقع پرستی اور جذبات سے کھیلنا، یہ ہیں حکومت کے غیر مستحکم ہونے کی علامتیں اور پاکستان میں بھی یہ موجود ہیں۔ کیونکہ ہم نے اپنے ماضی کی عادتوں کو ترک نہیں کیا ہے۔ اخلاقی آزادی کے ساتھ ساتھ قانونی آزادی کو نہیں اپنایا اور سیاسی قیادت اور حکومت کی ذمہ داری کو یکجا کرنے کی بجائے اسے دُور دُور رکھا ہے۔ پاکستان کے مسائل کا حل انتخابات ہیں۔"

"سہروردی"

جمہوریت و آمریت

"بعض لوگ آمریت کو مسائل کا حل بتلاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی ہے۔ اس علاج کے حامی بدعنوانیوں، عوام کی ناواقفیت، صوبائی عصبیت وغیرہ کی لعنتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ میں ان برائیوں کی موجودگی کا منکر نہیں لیکن آمریت کی تجویز پیش کرنے والے علاج نہیں کر رہے ہیں، علاج سے بچ رہے ہیں۔ ڈکٹیٹرشپ سے مشرقی و مغربی پاکستان میں مفاہمت پیدا نہیں ہوگی بلکہ ایک کو دوسرے کے غلبہ کے ذریعہ دبا دیا جائیگا۔ اور ہم ڈکٹیٹرشپ کے ذریعہ اپنی مشکلات میں اضافہ کریں گے۔ دراصل ہمارے ملک میں جمہوریت کو پورا موقع نہیں ملا ہے۔ جمہوریت کے نقائص ضرور ہیں لیکن جمہوریت ہی ترقی اور ارتقا کی ضامن ہوسکتی ہے۔"

"سہروردی"

انڈونیشی جمہوریت

"انڈونیشیا کو اپنی جمہوریت بہتر بنانا چاہیئے اور ڈکٹیٹرشپ اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ ڈکٹیٹرشپ تہذیب کے خلاف ہے اور تاریخ یہ بتاتی ہے کہ آمریت صرف عبوری دور میں قائم رہ سکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے مصائب کا حل اسی میں ہے کہ ایماندار لیڈر حکومت چلائیں۔"

"ڈاکٹر محمد حتّیٰ"

میں کمیونسٹ نہیں ہوں

"میں وہی پہلا سوئیکارنو ہوں۔ مجھ پر کمیونسٹ ہونے کا الزام صرف اس لئے لگایا جاتا ہے کہ میں نے کمیونسٹوں کو بھی حکومت میں شامل کر لیا ہے۔ صدر سوئیکارنو نے کہا یہ الزامات بھی بالکل غلط ہیں کہ میں انڈونیشیا میں روس اور چین جیسا نظام حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں۔"

"سوئیکارنو"

عرب کمیونسٹ نہیں بن سکتے

"عرب قومی تحریک ہرگز ہرگز بین الاقوامی کمیونزم کی ساتھی نہیں بن سکتی۔ جو لوگ کمیونزم اور عرب قومیت میں اس قسم کے لگاؤ یا تعاون کا دعویٰ کرتے ہیں وہ عرب قومی تحریک کے اصولوں سے ناواقف ہیں۔"

"شاہ حسین"

اتحاد کی بنیاد

"مشرق وسطیٰ کو تین خطرات کا سامنا ہے۔ ایک تخریبی سرگرمیاں دوسرے استعماریت اور تیسرے صیہونیت۔ اخوتِ اسلامی نے ہم پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ ہم مسلمانوں کو متحد کرنے کی جد و جہد کریں اور ہمیں امید ہے کہ مسلم ممالک میں جو خیر سگالی کے جذبات پائے جاتے ہیں، ان سے مستقبل قریب میں ان کا اتحاد ظہور میں آجائیگا۔ میرے خیال میں مسلم ممالک کے اتحاد کے لئے اسلام سے بڑی کوئی بنیاد نہیں ہوسکتی۔"

"شاہ سعود"

نفاق

"ایک نئی آزاد قوم کی حیثیت سے ہم پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ہمیں ایک طرف اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنا ہے جو گذشتہ غلامی نے ہم میں پیدا کی ہیں اور دوسری طرف ہمیں ان قوموں کی قطار میں شامل ہونا ہے جو ہم سے ترقی کے میدان میں آگے نکل چکی ہیں۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ ہم نفاق سے بچتے رہیں، اپنی قوتیں بیکار باتوں میں ضائع نہ کریں، تعمیری کاموں میں"

مسلسل مصروف [illegible]

مقدس سفر

حج فی الحقیقت بہت بڑا عمل ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں اس اہم فریضہ کو رہبرِ صادق سید المرسلین خاتم النبیین محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کے عین مطابق ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ انہیں کافی روپیہ خرچ کر کے اور اس طویل اور صبر آزما سفر کی تمام صعوبتیں برداشت کر کے یہ شرف حاصل کرنے کی توفیق میسّر ہوئی۔ وہ اللہ مالک الملک کے اس عظیم الشان سالانہ دربار میں شامل ہوئے۔ اور کرۂ ارض کے طول و عرض سے آتے ہوئے ابنائے جنس کے شامل کر عبادت الٰہی میں مشغول رہے انہوں نے اپنے اس محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم مقدس کی زیارت بھی کی۔ جو انہیں سارا کائنات سے کہیں زیادہ عزیز ہے اس پر اللہ عزوجل کا جس قدر شکر کیا جائے کم ہے۔ اللہ رب العزت دوسرے مسلمانوں کو بھی اس عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اس محنت شاقہ اور اس غیر معمولی قربانی کا صحیح اور پورا ثواب حاصل کرنے کے لئے یہ لابدی ہے کہ اس سارے سفر میں اسی مالک کی رضا جوئی کو تمام مصلحتوں پر مقدم رکھا جائے اور تسبیح و تہلیل۔ تلاوتِ کلام اللہ۔ درود شریف میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارا جائے۔ اور لڑائی جھگڑے غصہ پیدا کرنے والی حرکات، بدگوئی اور پیچ و ملال سے بچا کر آرام سے کے ساتھ الگ رہا جائے۔ بعض لوگ تنبع نفسانی کے زیر اثر اہل حجاز کے خلاف نازیبا کلمات منہ پر لاتے ہیں۔ بعض ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ وہ کسی لغو خیال کی بنا پر حرمین الشریفین میں نماز با جماعت سے عمداً محروم رہتے ہیں۔ اس قسم کی حرکات حمیت جاہلیہ کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اس سے ایک تو حج کا ثواب یا یوں کہئے کہ ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات اس قسم کے اقدام ان نادان افراد کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو بھی قانونی مشکلات میں پھنسا دیتے ہیں بعض لوگ جہازوں کی واپسی کے پروگرام میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے اس قدر پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان سے ناشکری کے کلمات بھی نکل جاتے ہیں۔ کئی ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ اگر خرچ اندازے سے زیادہ ہو جائے تو وہ واویلا شروع کر دیتے ہیں۔

بہرکیف ان چیزوں سے بچے رہنا ضروری ہے۔ صبر و استقامت ہمت مردانہ اور بلند حوصلہ ہی وہ صفات ہیں۔ جو اس مقدس سفر کو نتیجہ خیز بنا سکتی ہیں۔ اور جن کے شامل حال ہونے سے حج فی الواقع حج مبرور ہو سکتا ہے جس کی جزا کم از کم جنت ہے۔ اللہ عزوجل ہم سب ہی کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(بشکریہ "المنیر" لائلپور)

ماہر القادری •

مکّہ سے مدینہ جاتے ہوئے

پاک دل، پاک نفس، پاک نظر کیا کہنا
بعد مکّہ کے مدینہ کا سفر کیا کہنا

جیسے جنّت کے دریچوں سے جھلکتی ہو بہار
پہلی منزل ہی کے انوارِ سحر کیا کہنا

تپشِ شوق بھی ہے، گرمیِ موسم بھی ہے
اور پھر اُس پہ مرا سوزِ جگر کیا کہنا

راہِ طیبہ کی ببولوں پہ مچلتی ہے نگاہ
مرحبا! دیدۂ فردوس نگر کیا کہنا

خشک آنکھوں کو مبارک ہو طغیانیِ شوق
ہیں رواں اشک بہ اندازِ دگر کیا کہنا

سنگریزے ہیں کہ جاگی ہوئی قسمت کے نجوم
خارِ منزل ہیں کہ انگشتِ خضر کیا کہنا!

انور افسری •

"اثرِ عید"

صد شکر کہ آئی ہے گلستاں میں بہار
چہروں سے نمایاں ہیں خوشی کے آثار

معلوم ہے انور اثرِ عید تمہیں
ہوگی نہ کبھی ختم مسرت زنہار

بشیر انصاری •

"آمدِ عید"

نکہت و رنگ کا طوفاں ہے کہ عید آئی ہے
ہر کلی رشکِ گلستاں ہے کہ عید آئی ہے

رہگذاروں میں بہاروں کا ہے رقصِ پیہم
یاس و غم آج گریزاں ہے کہ عید آئی ہے

ہر طرف جشنِ مسرت کی مجالس ہیں بپا
ہر بشر عیش بداماں ہے کہ عید آئی ہے

للہ الحمد ہوئی یادِ خزاں خواب و خیال
ہر طرف رقصِ بہاراں ہے کہ عید آئی ہے

پھر ہوئی جاتی ہیں ایمان کی فصلیں سرسبز
بارشِ رحمتِ یزداں ہے کہ عید آئی ہے

عید کا چاند ہے پیغامِ مسرت سب کو
جس کو دیکھو وہی شاداں ہے کہ عید آئی ہے

جلوۂ طور مری نظروں میں رقصاں ہے بشیر
ذرہ ذرہ مہِ تاباں ہے کہ عید آئی ہے

ساقی فاروقی •

تین شعر

جینے کے سب دروازے تیرے شہر میں ہم پر بند
اپنے میٹھے بول بھی زہر ان کے منہ سے زہر بھی قند

کچھ تو سوچ کے اٹھے ہیں
بستی میں دیوانے چند

دنیا گہرِ عشق کی پرساں تو نہیں ہے
یہ مصر کا بازار ہے کنعاں تو نہیں ہے

اس دور کا زردار مسلماں تو نہیں ہے
قارون جو ٹھہرا وہ سلیماں تو نہیں ہے

بے پردہ ابھی لیلیِ امکاں تو نہیں ہے
تا حدِّ نظر اب رہ بیاباں تو نہیں ہے

منصور خدا تھا تو سرِ دار نہ مرتا
ہر راہِ جنوں راہِ شہیداں تو نہیں ہے

دنیا نہیں معلوم تو عقبیٰ مری معلوم
دامن سے کوئی دور گریباں تو نہیں ہے

یہ پردۂ سیمینِ جہاں اس کا چم و خم
سب آتشِ صحرا ہے چراغاں تو نہیں ہے

بیداریِ احساس بڑی چیز ہے ایدوست
بے اشکِ ندامت کوئی عصیاں تو نہیں ہے

آ چوم لوں لے دستِ دعا میں تجھے لیکن
ہر درد کا صرف ایک ہی درماں تو نہیں ہے

قطعہ

اک شاہدِ راضی سے محبت ہے مجھے بھی
لیکن یہ مری زیست کا عنواں تو نہیں ہے

اس نے تو بڑھایا ہے مرا جذبِ یقیں اور
کافر منش و آفتِ ایماں تو نہیں ہے

ہر چند سکوں بخش سہی روئے عروسی
کچھ میرے لیے مصحفِ قرآں تو نہیں ہے

یک گونہ دل آویز ہے گو زلفِ معطر
اس میں کششِ گیسوئے دوراں تو نہیں ہے

آغوشِ نگاریں میں بھی اک کیف ہے کوثرؔ
اسلام کی جنت کا وہ رضواں تو نہیں ہے

وحیدہ نسیم ●

طوافِ ماضی

پر کیف سی شب گذر رہی ہے
ساغر میں شراب بھر رہی ہے
گردوں میں سکوت میں ہیں تارے
چلنے سے ہوا بھی ڈر رہی ہے
شانوں پہ سیاہ بال کھولے
جادو سا رات کر رہی ہے
آرام سے سو گیا زمانہ
کس کو کس کی خبر رہی ہے
لیکن ایک روحِ کشتۂ غم
ماضی کا طواف کر رہی ہے

بیدل میرٹھی ●

برمِ جاناں میں نہیں دیدار کا سودا مجھے
یاد آ جاتا ہے ان کے سامنے کیا کیا مجھے

اپنی بربادی میں خود کو شاں اس انداز سے
جس طرح تعمیر کرتی ہے نئی دنیا مجھے

کھل چکے ہیں اب مری وحشت پہ اسرار بہار
اب نہ ہوگا امتیازِ گلشن و صحرا مجھے

کر لیا میں نے یقیں ترکِ محبت کا مگر
جانے والے! دور تک مڑ مڑ کے کیوں دیکھا مجھے

ترجمانِ شورشِ دل ہے یہی گر اسکوت
کیوں پسند آئے نہ ویرانوں کا سناٹا مجھے

میرے دل میں ایک تازہ آرزو پیدا ہوئی
تم نے جب بھی بے نیازِ آرزو پایا مجھے

کیوں گلہ اہلِ وفا کا، کیوں شکایت غیر کی
بیدل اپنے آپ سے ہی ہے اگر شکوہ مجھے

(زیرِ ترتیب مجموعہ "خونِ دل" کا ایک ورق)

اعظم ادیب

خیالِ دوست میں

تاریکیوں میں راہ نما ہے خیالِ دوست
اف رے خیالِ دوست ہو برقِ جمالِ دوست

آئینہ دارِ ہر دو جہاں اس کا حرف حرف
مت پوچھئے حقیقتِ جامِ سفالِ دوست

اے مہر و ماہ تم ہی بتاؤ کچھ ان کا حال
تم نے تو خوب دیکھا ہے جاہ و جلالِ دوست

اے کاش میں بھی دیکھ لوں ایسی نگاہ کو
دیکھا ہے جس نگاہ نے اوجِ کمالِ دوست

اللہ رے وہ نگاہ بھی جانِ بہار ہے
دیکھی ہے جس نگاہ نے برقِ جمالِ دوست

اُس[1] کا مقام حمد سے محمود ہو گیا
ملتی کہاں ہے دونوں جہاں میں مثالِ دوست

آئے گا پھر سے موسمِ تقویٰ بہار پر
پھل لا رہے ہیں برگ و ثمر نونہالِ دوست

پھر جانِ نوبہار ہے اعظم مشامِ جاں
پھر چھا رہا ہے ذہن پر ابرِ خیالِ دوست

---

[1] صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

انوار ظہوری

احساسِ واقعی

حسنِ رنگین کے نظاروں نے مجھے چھوڑ دیا
آج معصوم سہاروں نے مجھے چھوڑ دیا

وہ جنھیں مجھ سے عقیدت تھی، مجھے بھول گئے
جب مری راہگزاروں نے مجھے چھوڑ دیا

کام آیا نہ کوئی منزلِ فرقت میں ندیم
صبحدم چاند ستاروں نے مجھے چھوڑ دیا

موجِ آلام سرِ دوش لئے پھرتی ہے
بحرِ ہستی میں کناروں نے مجھے چھوڑ دیا

درِ زنداں سے نکلتے ہی خزاں آ پہنچی
ہائے کس وقت بہاروں نے مجھے چھوڑ دیا

اب رندوں میں بھی اخلاص نہیں ہے ساقی
دیکھنا بادہ گساروں نے مجھے چھوڑ دیا

گل تو پہلے ہی چھڑا بیٹھے تھے دامن اپنا
آج کیا بات جو خاروں نے مجھے چھوڑ دیا

نہ منزل کا پتہ ہے نہ دھندلکوں سے نجات
لا کے کس راہ پہ یاروں نے مجھے چھوڑ دیا

حسنِ خورشید نے جب پھیر لیا رخِ انوار
خود بخود چاند ستاروں نے مجھے چھوڑ دیا

ظہور الحق صدیقی •

جب تخیل بڑھ کے گیسوئے بتاں تک آ گئے
سلسلے غم کے وہاں سے داستاں تک آ گئے

غم کو پلکوں میں لئے ہم کہتے کہتے رو پڑے
چند قطروں سے بڑھے سیلِ رواں تک آ گئے

عشق کو راہِ طلب میں ضبط پیہم چاہیئے
وائے قسمت مرحلے آہ و فغاں تک آ گئے

کھیلتے دار و رسن سے بڑھ گئے جو قافلے
پھر یقیناً وہ حیاتِ جاوداں تک آ گئے

دو قدم جب رہ گئی تھی منزلِ راحت نشاں
راہزن کچھ اور بڑھ کر کارواں تک آ گئے

ہم نے پھیرے بارہا رُخ گردشِ ایام کے
حیف اے پستیٔ ہمت اب کہاں تک آ گئے

پھر جنوں سامانیاں بھی ہو گئیں بے رنگ و کیف
رہروانِ عشق جب سود و زیاں تک آ گئے

بڑھ کے دامن تھام لیں صیاد کا اہلِ قفس
کچھ اشارے یا دِ غم کے گلستاں تک آ گئے

یا ہوئے وہ آپ کے اقوالِ زریں شیخ جی
یا سبب ہے آپ بھی زلفِ بتاں تک آ گئے

فصلِ گل میں دیکھ کر پھولوں کو پژمردہ ظہورؔ
چھوڑ کر گلچیں کا دامن باغباں تک آ گئے

محسن رسول نگری •

حسن تغزّل

شعلہ سا قلب و روح میں رقصاں ملا مجھے
یا تحفۂ تبسم پنہاں ملا مجھے

جب بھی بڑھا ہے عشق تو کافر ہوا ہوں میں
ایماں سے کفر کفر سے ایماں ملا ہے مجھے

ہر صبح تیرے چہرے کی دیکھی نئی جھلک
یعنی ورق ورق تیرا قرآں ملا ہے مجھے

ناپختگی سے دونوں ہیں اب ننگ کفر و دیں
کافر ملا کوئی نہ مسلماں ملا مجھے

تعبیر سوچتا ہی رہا اس کی عمر بھر
دنیا سے ایک خواب پریشاں ملا ہے مجھے

جب تک تھا بتکدے میں تو جنت تھی زندگی
مومن ہوا تو گوشۂ زنداں ملا مجھے

میں اس کو ماورائے جہاں ڈھونڈتا رہا
وہ جانِ زندگی یہیں پنہاں ملا مجھے

محسن بھوپالی •

لوگو!

بڑھ گئی اور دوریِ منزل
چلتے چلتے یہ کیا ہوا لوگو؟!
انجمِ صبح جگمگاتے ہی
ظلمتِ نو میں کھو گیا لوگو
جو پسِ گردِ کارواں بھی نہ تھے
بن گئے ہیں وہ رہنما لوگو
گل ہیں پژمردہ خار ہیں شاداب
نظمِ گلشن بدل گیا لوگو
اب سسکتے چراغ گل کردو
ہے سحر کا یہ مدعا لوگو
اک حسیں پُرفریب وادی میں
کارواں آکے رک گیا لوگو
نہ ہوا بے کسی میں بھی محسنؔ
محرمِ عرضِ مدعا لوگو!

فیروز نظامی •

جانتے ہیں جو ڈھنگ جینے کے
شکوۂ روز و شب نہیں کرتے

اس قدر بدگماں نہ ہو اے دوست
ہم تجھے یاد کب نہیں کرتے؟

کر رہے ہیں ترے ستم محسوس
وا، مگر اپنے لب نہیں کرتے

جانے کیا بات ہے نظرؔ اب لوگ
ذکرِ صبحِ طرب نہیں کرتے

محمد یعقوب ساحر •

"آج کا مردِ مومن"

(اقبال مرحوم سے معذرت کے ساتھ)

"ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن"
گفتار میں کردار میں کرسی کا ثناخوان
مل جائے جو کرسی تو وہ ملت کا ہے دشمن
اور اس سے ہو محروم تو ملت کا نگہبان
نفرت ہے سکوں سے تو تغیر سے محبت
اب لون ابھی ممدوٹ ابھی ممتاز ابھی خان
لاتا ہے مسائل پہ مسائل وہ شب و روز
کل کہتا ہے اور آج مکرتا ہے بالاعلان
کچھ فرقِ مراتب نہیں کافر ہو کہ مومن
ہیں ایک ہی درجے میں وہ گیتا ہو کہ قرآن
صاحب زمین و زر و زن کیا ہیں نہ پوچھو
"دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان"
میخواری و تخریب و زراندوزی و سازش
"یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان"
بنتے ہیں مری کار گہِ فکر میں عہدے
"لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان"

طالب حجازی •

سُرخ نظام

رُخِ حیات کے تیور بدلتے جاتے ہیں
جبینِ وقت پہ شکنیں اُبھر سی آئی ہیں
اُمڈی ہیں خون کی لہریں اُفق کے سینے سے
"کنارِ شرق" پہ تاریکیاں سی چھائی ہیں

نئے نظام کی آمد کا غلغلہ ہے بپا
فضا کے چہرے پہ سرخی جھلک سی آئی ہے
نئے نظام کے داعی اُچھلتے آتے ہیں
"نظامِ کہنہ" کے چہرے پہ موت چھائی ہے

خشونتیں سی نمایاں ہیں زرد چہروں پر
ہے انتقام کا ہونٹوں پہ گونجتا نعرہ
"فریب خوردہ عساکر" نئے خداؤں کے
یہ ختم کرنے چلے ہیں "نظامِ سرمایہ"

بدل سکی نہ مگر پھر بھی انکی قدرِ حیات
بپا ہوا ہے مساعی سے جن کی سرخ نظام
ملا ہے لطفِ معیشت نئے خداؤں کو
مگر غریب کا اب تک بدل سکا نہ مقام

بنت مجتبیٰ مینا •

کون ہے کون! جو آنکھوں میں کُھبا جاتا ہے
غمِ دل اب غمِ انساں میں ڈھلا جاتا ہے

لب ہر خار پہ ٹپکاتا ہوا خونِ جگر
اک مسافر ہے کہ منزل کو چلا جاتا ہے

یوں تو بتخانہ کی جانب سے بہت بچ کے چلے
اے خدا! دامنِ دل پھر بھی کھنچا جاتا ہے

ہاں تری نگہِ کرم ہی نے جلایا تھا چراغ
پھیر لی تو نے نظر کیا کہ بجھا جاتا ہے

جب بچھڑ جائے رہِ شوق کا ساتھی کوئی
یہ وہ صدمہ ہے جو مشکل سے سہا جاتا ہے

کبھی پیمانۂ ماضی! کبھی جامِ فردا!
دور چلتا ہے تو چلتا ہی چلا جاتا ہے

خامیٔ ذوقِ طلب! اور قدح خواروں میں؟
شعلۂ مے دلِ میناؔ میں بجھا جاتا ہے

(بشکریہ "چراغِ راہ")

دُھن

دل واقفِ جنوں ہے
پلکوں پہ اشکِ خوں ہے

ہر دم خیالِ منزل
ہر دم یہی لگن ہے

مسحورِ جستجو ہوں
معمورِ آرزو ہوں

میں ہوں مری تمنا
دل کس قدر مگن ہے

خامی ہے کیا جواب تک
پہنچی نہیں وہاں تک

جس محفلِ جنوں میں
وہ شمعِ انجمن ہے

میناؔ مگر نہیں غم
گر ہے یقین محکم

آجائے گا وہ دن بھی
گر واقعی لگن ہے

جس دن کی آرزو میں
جس دن کی جستجو میں

آنکھیں بھی خوں چکاں ہیں
اور دل بھی شعلہ زن ہے

۵۰ ربیع الثانی

ڈاکٹر عبد السمیع قریشی

جائیں گے کیا وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم
اب ذوقِ جستجو کا وہ لائیں کہاں سے ہم
منزل پہ بھی پہنچ کے نہ منزل کا تھا یقیں!
مایوس اس قدر ہوئے تیرے جہاں سے ہم
کچھ اختیار رکھتے ہیں محرومِ التفات!
لو جا رہے ہیں بندہ نواز اب یہاں سے ہم
اک تیر جو خدنگ سے محروم ہی رہا!
نکلے ہوئے ہیں روزِ ازل کی کماں سے ہم
انجام کی خبر کوئی ملتی نہیں ہمیں!
کتنے فسردہ جاتے ہیں تیرے جہاں سے ہم
تیرا نہیں ہے گھر تو سمیع کا ہے کونسا!
تو ہے لامکاں تو ہیں لامکاں سے ہم

کوثر اعظمی

کہاں؟

کہاں باقی ہے اب سوزِ دوامی
نہیں حاصل رہی اعلیٰ مقامی
یمِ ہستی میں لے ڈوبی ہے تجھ کو
ہوا و حرص کی بدتر غلامی

کیوں؟

یہاں چھایا نظامِ جاہلی کیوں؟
تجھے گھیرے ہوئے ہے کاہلی کیوں؟
تری غیرت کو آخر ہو گیا — کیا؟
تجھے راس آ گئی ہے بزدلی کیوں؟

انوار ظہوری •

"اپنے پہلے مجموعہ سے"

پھر ذرا غم کو دیجئے آواز   مسکراہٹ لبوں پہ آئی ہے

انھیں ترکِ آرزو کی مرے دل سے ہے توقع   مرے دل کا کیا بھروسہ مرے دل کا کیا ٹھکانا

ہر نقشِ لطافت پہ کھینچے گا خطِ تنسیخ   ہو جائے حسینوں میں اگر طرزِ حیا بند

نہ مل سکا رُخِ ہستی پہ غازۂ جلال   وہ انقلاب جو تصویرِ انقلاب نہیں

نیچ رہے ہیں ہوش دحواس   عقل و خرد کے دیوانے

اے میرے ہمدموا ہے یقیناً کوئی سبب   اب کے سفر میں حدِ نظر تک جورات ہے

یہ جنوں یہ فغاں یہ غم انوار   عادتیں ہیں تری خراب بہت

تم نے جیسے ہمیں برباد کیا   ایسے برباد کیا کرتے ہیں

انھیں بھی آپ آکر دیکھ لیجے   نہ آیا جن کے ہونٹوں پر تبسم

جس کے ہنگاموں سے نفرت ہو چکی ہے ایکبار   آپ چاہیں بھی تو اس محفل میں آسکتا نہیں

حقیقتوں سے ہو جسے نہ دور کا بھی واسطہ   ہم اہلِ درد کے لئے وہ رنگ ناگوار ہے

خزاں تو پھول پھول کا شباب لوٹ کر گئی   چمن میں کہہ رہے ہیں لوگ رد کش بہار ہے

کہیں خلوصِ وفا ہر صورتِ تسکیں   کہاں کہاں سے مری زندگی گذر آئی

دلِ ویراں میں اُمیدوں نے دیئے ہیں روشن   کچھ تو اندیشۂ آلام نہ کر آج کی رات

غم سے جب آگہی نہیں ہوتی   زندگی، زندگی نہیں ہوتی

ان کے غم کو گلے لگاتے ہیں   جب کوئی بے کلی نہیں ہوتی

اللہ اللہ دیکھئے یہ عالمِ جذب و سرور   بزمِ دل میں جیسے روشن ہو چراغِ برقِ طور

امین الرحمٰن ساز •

ایک شعر

نہ ڈریئے موجِ تلاطم سے بحرِ ہستی میں   ہر ایک موجِ الم کو اُبھارتے چلئے

افسانہ

جب عورت جاگی

شرون کمار ورما

لیڈیا نے کش لے کر سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ سگریٹ میلے زرد پانی میں "سس" کی آواز پیدا کر کے بجھ گیا۔ نہ جانے کیوں لیڈیا کو اپنے دل سے ویسی ہی "سس" کی سی آواز آئی۔ اس نے غور سے پانی میں گھلتے ہوئے سگریٹ کو دیکھا اور اسے ایسا لگا، جیسے وہ کسی ڈوبتے ہوئے آدمی کو بے بسی سے دیکھ رہی ہو۔ پانی تمباکو اور راکھ کی وجہ سے گدلا اور دھندلا ہو چکا تھا۔ کئی سگریٹوں کے ٹکڑے پانی میں گھلے پڑے تھے۔ جیسے دلدل میں لاشیں سڑ رہی ہوں۔ اس کے جی میں آیا کہ سامنے بیٹھے ہوئے اپنے دوست سٹیشن انجینئر سے کہے، کتنے سگریٹ مرے پڑے ہیں! ہم روزانہ کتنے سگریٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں! لیکن اپنے اس طفلانہ خیال پر وہ خود ہی دل ہی دل میں ہنس دی... وہ ہنسے گا اور مجھے خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے گا۔

"ڈارلنگ!" انجینئر نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر کے دوسرا سگریٹ پیش کیا...... پل بھر وہ گہری نظروں سے سگریٹ کو دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے انکار کر دیا۔ اور خاموشی سے دیگر میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے مسافروں کا جائزہ لینے لگی۔ بوڑھے، جوان، بچے، مرد، عورتیں سبھی تو تھے۔ ہلکے پھلکے چمڑے کے ہوائی سفری تھیلے لئے ہوئے...... یہ سب کشمیر جانے والے تھے۔ ایک میز پر ایک گنجا مدراسی بیٹھا کوکو کولا پی رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لیڈیا پر مرکوز تھیں۔ لیڈیا اس سے غافل نہیں تھی۔ ایک جگہ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر تنہا بیٹھا سگریٹوں پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ وہ بار بار لیڈیا کی طرف دیکھ کر اسے اپنی شدید تنہائی کا احساس اداس آنکھوں سے دلا رہا تھا۔ ایک کونے میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا سرگوشیوں میں مشغول تھا۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔ ایک موٹا بنگالی سیٹھ اپنی کالی کالی گہری آنکھوں والی بے حد دبلی بیوی سے الجھ رہا تھا۔ وہ شاید مسافروں کا خیال کر کے بات کو ٹالنا چاہتی تھی...... اپنی چہار سالہ ملازمت میں لیڈیا تقریباً ہر رنگ ہر نسل کے آدمی کو دیکھ چکی تھی...... وہ ان کی کئی عادتوں سے بھی واقف ہو گئی تھی...... ریٹائرڈ افسر نے اسے اداس نگاہوں سے دیکھا اور سگریٹ سلگا لیا...... اسے پھر خیال آیا۔ یہ مرد اس قدر سگریٹ کیوں پھونکتے ہیں؟ لیا جلا کر راکھ کر دیا۔ مسل کر پھینک دیا۔ پانی میں غوطہ دے کر غریب کا بند بند کھول دیا۔ صرف چند سیکنڈ...... چند منٹ کی تفریح کے لئے...... وہ سگریٹوں کے کارخانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے خیالات تمباکو کے کھیتوں تک اڑ کر لے گئے۔ اس نے سامنے بیٹھے ہوئے انجینئر کو اپنا ہاتھ دباتے ہوئے محسوس کیا اور خیالات کی دنیا سے لوٹ آئی۔ سامنے بیٹھا ہوا ایک خوبرو نوجوان سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے سامنے کریون کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ لیڈیا نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی...... یہ کیا فضول خیالات لے بیٹھی ہوں میں...... سگریٹوں کے بارے میں، میں آج اس طرح کیوں سوچ رہی ہوں؟...... "کیا سوچ رہی ہو سویٹی؟" انجینئر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ یہ کہتے ہوئے اسے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ تنہا، پھیکی اور بے جان سی ہے۔ اور اگر یہی حالت رہی، تو وہ ایک اچھی ایئر ہوسٹس ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس نے انجینئر کی شادی کے بارے میں سوچنا چاہا۔ کل وہ چرچ میں اس کی شادی کے موقع پر موجود تھی لیکن اس کا دل اس خیال سے اور بھی بھاری ہو گیا۔

"بیس منٹ اور ہیں جہاز جانے میں۔" انجینئر نے معنی خیز نگاہوں سے لیڈیا کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

لیڈیا نے اپنی گوری نازک کلائی پر بندھی ہوئی چھوٹی سی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولی "ہاں۔" اس کی آواز میں افسردگی تھی، وہ اس تبدیلی پر خود حیران تھی۔

"کم آن ڈارلنگ!" انجینئر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور وہ ریستوران کے عقبی کمرے سے ہوتے ہوئے پیچھے باغیچے میں چلے گئے۔

باغ میں اترنے والی سیڑھیوں کے عین مقابل گلمہر اور بوگن بیلیا کی الجھی ہوئی شاخوں پر کانٹوں کے درمیان فاختہ کا گھونسلا اپنی پرانی جگہ پر موجود تھا۔ انڈوں پر بیٹھی ہوئی فاختہ نے انہیں اپنی طرف آتے ہوئے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا اور پتوں میں دبک گئی۔ لیڈیا کی آنکھیں دبکی ہوئی فاختہ پر ٹھہر گئی تھیں۔

"تم کتنی دنوں سے کمپنی کی نوکری کر رہی ہو؟" انجینئر نے لیڈیا کا ہاتھ ہولے ہولے دباکر انگریزی میں کہا۔

"دیکھو! فاختہ کانٹوں میں بھی گھر بنا کر خوش ہے۔" لیڈیا نے اسکے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ہاں!" انجینئر نے محض لیڈیا کو خوش کرنے کے لئے کہہ دیا۔

"کانٹوں میں رہ کر اور کامیابی سے رہ کر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔" لیڈیا نے اس آشیانے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"عورت کو، اور پھر خوبصورت عورت کو فلسفی بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے انجینئر لیڈیا کو کنیر کی گھنی جھاڑیوں کے پیچھے لے گیا۔ وہاں اس نے لیڈیا کی پتلی، نازک سی کمر سے کسی جونک کی طرح بانہیں ڈال دیں۔ اس کی جھکی جھکی آنکھوں میں پیار سے جھانکا۔ آج ان نشیلی آنکھوں میں وہ ترنگ نہیں ہوتی تھی، جو وہ ہمیشہ اسے آغوش میں لے کر محسوس کیا کرتا تھا۔ ان آنکھوں میں ایسی لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوا کرتی تھیں جو جھیل کے پرسکون پانی میں ہلورے لینے پیدا ہو جاتی ہیں۔

"لیڈیا!" اس نے اسے چپٹا کر ہولے سے کہا۔

"جی!" ___ وہ پہلے کی طرح شوق سے اس سے لپٹی نہیں۔ آج اس کے بے جھجکے ہاتھ اس کی پیٹھ اور کندھوں کو سہلا نہیں رہے تھے۔

انجینئر نے لیڈیا کے جسم میں گرمی پیدا کرنے کے لئے اسے اور بھی زور سے بھینچ لیا۔ اس کے ہاتھ لیڈیا کی پیٹھ، کمر اور کولہوں کو سہلاتے رہے اور وہ برف بنی رہی۔ انجینئر تو ہمت نہیں ہارنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کے لبوں پر لب رکھ دیئے۔ آج ان لبوں میں اس نے وہ شہد اگلتی گرم لمس نہیں محسوس کیا۔ وہ جنبش، وہ لرزش نہیں محسوس کی جو ہمیشہ اس کے جھکتے ہوئے لبوں کو لمحہ بہ لمحہ نزدیک تر آتے ہوئے محسوس کر کے پیدا ہو جاتی

....

... انجینئر نے ایک طویل بوسہ لیا۔

لیڈیا اپنے ہی خیالات میں گم تھی۔ وہ سوچ رہی تھی، اپنی نوکری کے بارے میں...... انٹرویو والے دن بیس لڑکیاں آئی تھیں، بیس بائیس سال کی عمر کی نوکری کے لئے یہ شرط تھی کہ لڑکی خوبصورت ہو، کنواری ہو اور بیس پچیس سال کے درمیان عمر ہو...... سب کی سب خوب سج دھج کر آئی تھیں جیسے نمائش میں جا رہی ہوں۔ ہر ایک خود کو دوسری سے زیادہ حسین، زیادہ چست، چالاک، زیادہ سمارٹ، زیادہ دلچسپ، دلکش اور جاذب نظر، زیادہ تہذیب یافتہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ ان سب سے کم عمر، زیادہ حسین، جوان اور جاذب نظر ہے۔ نتیجے نے بھی یہی ثابت کیا۔ وہ چن لی گئی...... اس کی کمر بائیس انچ، چھاتی چونتیس انچ، بسٹ تیس انچ اور قد ساڑھے پانچ فٹ...... یعنی ہر لحاظ سے وہ ائیر گرل تھی۔ پھر اسے ایلکی کا خیال آیا جس کی کل شادی ہو گئی تھی۔ وہ جوڑے کو بدھائی دینے گئی تھی اور شام کو بھی پارٹی میں بھی شامل تھی۔ ایلکی سیکریٹریٹ میں سٹینو ٹائپسٹ تھی۔ اسے شادی کرنے کی اجازت تھی لیکن لیڈیا کو نہیں...... ائیر ہوسٹس کو شادی کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ شادی کے بعد وہ اپنے خاوند اور بچوں کی ہو کر رہ جائے گی۔ مسافروں کی دلچسپی کا باعث نہیں رہے گی۔ ان کی دلجوئی نہ کر سکے گی۔ ان کی تفریح کا سامان مہیا نہیں کر سکتی۔ اور کمپنی کو اس طرح گھاٹا...... کا اندیشہ ہے۔ کمپنی چونکہ کروڑوں روپیہ خرچ کر رہی ہے اس لئے نہیں کہ نقصان اٹھایا جائے اور دیوالہ نکال کر بیٹھ رہے۔ اسے منافع چاہیئے۔ اور منافع کے لئے جوان، کنواری اور حسین لڑکیوں کی اداؤں اور مسکراہٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ نوکری بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ کیونکہ اسکا ہندوستانی باپ مر چکا تھا۔ اور انگریز ماں شراب اور ریس کے سمندر میں اچانک کوئی قیمتی موتی ڈھونڈ لینے کی امید میں پے در پے غوطے لگا رہی تھی۔ باپ کی چھوڑی ہوئی پونجی ختم ہو چکی تھی۔ ماں اور بہن بھائیوں کا خرچ اسکے ذمہ تھا۔ ماں کی عمر اب ایسی نہیں تھی کہ ملازمت کر سکتی...... لیڈیا مجبوراً نوکری کر رہی تھی۔ وہ سینئر کیمبرج سے آگے تعلیم نہیں حاصل کر سکی تھی۔ شارٹ ہینڈ اور ٹائپ بھی نہیں سیکھ سکی تھی۔ اس کے لئے یہی نوکری تھی۔ جہاں تنخواہ کافی مل جاتی تھی۔ ہفتے میں ایک آدھ دن کے لئے وہ گھر جا سکتی تھی۔ ان چند گھنٹوں میں وہ اپنی سہیلیوں سے ملتی، بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلتی۔ وہ چند گھنٹے اس کی زندگی میں خزانے کی حیثیت رکھتے تھے...... اسکا بچپن لوٹ آتا، وہ کھل کر ہنس سکتی تھی، گا سکتی، ناچ سکتی تھی۔ ملازمت کی زندگی کا بہروپ ختم ہو جاتا۔ وہ مسکراہٹ جو اسے زبردستی مسافروں کی تفریح کے لئے اپنے ہونٹوں پر پیدا کرنا پڑتی تھی۔ وہ قہقہے جو اسے افسروں کو خوش رکھنے کے لئے لگانے پڑتے تھے، یہاں آ کر بدل جاتے تھے۔ ان کا ملمع اتر جاتا تھا۔ اور جوں جوں یہ وقت گزرتا جاتا، وہ اداس ہوتی جاتی اور پھر وہ اپنا چھٹی کا کالا تھیلا کندھے سے لٹکا کر بہن بھائیوں کو روتا ہوا دیکھ کر ماں سے گلے مل کر اور اپنی سہیلیوں سے پھر جلدی ہی ملنے کا وعدہ کر کے کام پر حاضر ہو جاتی اور وہ ائیر ہوسٹس کی مشینی زندگی اسے اپنی مخصوص لپیٹ میں لے لیتی۔ شروع شروع میں یہ زندگی اسے

انہیں لگتی۔ ہوائی جہاز کی سیر، نئے نئے شہر دیکھنے کو، دوسرے ممالک سے ہو آنے کے بھی امکانات تھے نئے نئے آدمیوں سے ملنا، بڑے بڑے افسروں میں گھرے رہنا، وہ شاف کی زبان میں ملے ڈان تھی، تمام افسر اس سے دلچسپی لینے لگے تھے، ہر روٹ پر اسکا انتظار رہتا جس سے وہ چند لمحوں کے لیے مل جاتی وہ خود کو بہت خوش نصیب سمجھنے لگتا۔ وہ جہاں پہنچتی جھٹ پروگرام مرتب ہو جاتا۔ لیکن بہت جلد وہ اس زندگی سے اکتا گئی۔ وہ افسروں کو بخوبی سمجھ گئی، جب کوئی نئی ایئر ہوسٹس آتی ہے۔ وہ اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں...... انہیں شراب، سگریٹ اور لڑکی چاہیئے کسی ایک کا ہو کر رہنا ان کی عادت نہیں...... روٹ بدلنا ان کے خون میں سرایت کر گیا ہے۔ وہ ان سے تنگ آگئی تھی۔ اس مشینی طرح چلتی زندگی سے گھبرا گئی تھی، کہیں خلوص نہیں، کہیں پیار نہیں، سب جوانی کے گاہک ہیں...... وہ چند لمحے کسی حسین، خوبصورت لڑکی کے پہلو میں گزار کر خوش ہوتے ہیں۔ لڑکی جوان کی بیوی نہ ہو بہن نہ ہو، بیٹی نہ ہو۔ جس کے سامنے وہ آزادانہ گفتگو کر کے اپنی زندگی کے بوریڈم کو کچھ دیر کے لیے بہلا سکیں......

وارننگ سائرن بجا۔ لیڈیا خیالات کے کنویں سے نکل آئی۔ انجینئر کے ہاتھ اب بھی اس کی کمر کے گرد تھے لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہ پا کر وہ بھی اب سُست پڑ گئے تھے۔ لیڈیا نے چونک کر گھڑی دیکھی۔

"اوہ! صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں.... مجھے چلنا چاہیئے۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ اور خود کو انجینئر کی آغوش سے آہستہ سے علیحدہ کیا ہینڈ بیگ سے لپ اسٹک اور ڈاڑھی آئینہ نکال کر ہونٹ چمکائے، پھر اپنے ہلکے سنہری بالوں کی لٹیں سنواریں اور انجینئر کو الوداع کہہ کر چلی آئی.....

انجینئر حیران اسے دیکھتا رہ گیا۔ اسے لیڈیا میں اچانک اس تبدیلی کی کوئی بھی وجہ نظر نہیں آرہی تھی..... پچھلے دنوں تو بڑی RESPONSIVE تھی۔ اس نے سوچا۔ پھر دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالنے کے خیال سے اس نے سگریٹ سلگا لیا اور ہال میں آکر بل پر دستخط کر دیئے۔

دروازے میں انجینئر کو بنگالی وائرلیس آفیسر مل گیا۔

"ہیلو جی! " اس نے مسکرا کر کہا۔ "تمہاری محبوبہ کا کیا حال ہے؟" بنگالی نے انگریزی میں پوچھا......

"شاید وہ کچھ سوچتی" انجینئر نے انگریزی میں جواب دیا...... اور سگریٹ کا دھواں اڑا دیا......

"وہ ان دنوں جذباتی ہو رہی ہے" بنگالی افسر نے کہا اور پھر نئی ایئر ہوسٹس کی طرف بڑھ گیا جو اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

(۲)

لیڈیا نے جہاز میں پہنچ کر مسافروں کی فہرست دیکھی اور مسافر گن کر فوراً کاک پٹ کی طرف چلی گئی۔ سیڑھی ہٹا دی گئی۔ جہاز کا دروازہ بند ہو گیا، پائلٹ نے گھوم کر مسافروں کو دیکھا اور جہاز سٹارٹ کر دیا۔ جہاز سڑک پر دوڑنے لگا۔

"ٹائی یور بیلٹس" (اپنی پیٹیاں باندھ لو) لیڈیا نے مسافروں کو آواز دی مسافروں نے اپنی اپنی پیٹیاں باندھ لیں۔

لیڈیا کے عین سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ایک دس گیارہ سال کی بچی سے پیٹی نہیں بندھ رہی تھی۔ اس نے ملتجیانہ نظروں سے لیڈیا کی طرف دیکھا۔ لیڈیا نے جھک کر ہک لگا دیا۔

بچی نے مسکرا کر کہا "تھینکس!"

لیڈیا بچی کی معصومیت اور ذہانت پر مسکرا دی..... بچی خوبصورت اور صاف ستھری تھی...... جہاز اب ہوا میں اڑ رہا تھا...... مسافر کھڑکیوں سے باہر جھانکنے لگے تھے۔ لیڈیا گھوم پھر کر ان سے باتیں کر رہی تھی۔ ایک مسافر نے پانی مانگا۔ وہ پانی کا گلاس لے آئی۔ کچھ مسافر اخبار پڑھ رہے تھے، کچھ رسالے دیکھ رہے تھے۔ ایک مارواڑی سیٹھ توند پر ہاتھ رکھے اونگھ گئے تھے۔ ان کی بھدی سی موٹی بیوی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی کبھی کبھی وہ سیٹھ کی طرف دیکھ لیتی اور اس طرح ہونٹ ہلاتی کہ اس کے کیڑا لگے دانت دکھائی دے جاتے۔ پھر وہ بھی اونگھنے لگی۔

لیڈیا ایک خالی سیٹ پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ جہاز میں بھی کامل خاموشی تھی۔ صرف انجن کی آواز آرہی تھی۔ جہاز بادل کے ایک ٹکڑے میں سے گزرا تھوڑی سی نمی اندر آگئی۔ دوسرے ہی لمحے جہاز دھوپ میں آگیا۔ چاروں طرف دور دور تک نیلا وسیع آسمان پھیلا ہوا تھا۔ نیچے دریا، درخت، مکان وغیرہ کھلونے نظر آرہے تھے...... کہیں ریل گاڑی چل رہی تھی...... ایسا لگتا تھا جیسے کوئی رسی کا ٹکڑا گھسیٹ رہا ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ منظر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا......

...... لیڈیا اکتا کر بیٹھ گئی۔ اس کے لیئے یہ مناظر نئے نہ تھے۔ ایک چکر جہاز کا لگا کر وہ کاک پٹ میں چلی گئی۔ پائلٹ اپنے کام میں مصروف تھا۔ وائرلیس آفیسر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اور اس کے کولہے پر ہلکی سی چپت لگا کر بولا...... "سرینگر پہنچ کر......" وہ لوٹ آئی۔

...تھی سیٹھ کی بیوی سوگئی تھی اور اب سیٹھ جی جاگ رہے تھے لیڈیا ...قریب سے گزری تو سیٹھ نے للچائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ ...بت سے پوچھا۔

"اب ہم کہاں ہیں جی ؟"

"انبالہ کے اوپر ہیں اس وقت ہم" لیڈیا نے وقت کے اندازہ سے بتایا۔

"سمجھو جی ! انبالہ بہت اچھا ٹاؤن ہے یہاں پر...... ہی ہی ہی ...."

لیڈیا آگے بڑھ گئی سیٹھ مڑ کر اسکی گوری گوری پنڈلیوں کو دیکھنے لگا......

ڈالی نے جو اب بیدار ہو چکی تھی سیٹھ کو ٹھوکا دیا...... "لے" ...... سیٹھ جی پانی ہو گئے۔

ایک نوجوان نے لیڈیا کو اشارے سے بلایا اور انگریزی میں کہا۔

"میرا جی متلا رہا ہے ...."

لیڈیا نے فوراً اپنے تھیلے سے دو گولیاں نکال کر دیں اور پانی لینے چلی گئی .... پانی دیکر وہ دوسرے مسافروں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ نوجوان نے گولیاں زور سے باہر پھینک دیں اور پانی پی لیا۔ گلاس لوٹاتے ہوئے اس نے لیڈیا کی انگلیاں چھو لیں۔ لیڈیا سمجھ کر نظرانداز کر گئی .... تھک کر وہ بچی کے برابر سیٹ پر جا بیٹھی۔ بچی اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

"تم اکیلی ہو ؟" لیڈیا نے پوچھا۔

"ہوں" بچی نے بھولے پن سے کہا۔

"کیا نام ہے تمھارا ؟"

"ڈالی ...."

"پڑھتی ہو ؟"

"ہاں ! تھرڈ کے جی (K. G) میں"

"سرینگر جا رہی ہو ؟"

"ہاں ! اپنی آنٹی کے پاس، آنٹی مجھے لینے آئیں گی اڈے پر، میرے انکل میں میجر ہیں اور میرے پاپا بھی ...."

بچی کی معصومانہ باتیں سن کر لیڈیا کو میری کی چھوٹی لڑکی جینی یاد آگئی جو اسی طرح بھولے پن سے باتیں کیا کرتی ہے اور اس سے ہمیشہ فرمائش کرتی "آنٹی ! اب کے میرے لئے چینی کی گڑیا اور چابی والی موٹر لانا"

"تمھاری آنٹی تمھیں بہت پیار کرتی ہیں نا ؟" لیڈیا نے پوچھا۔

"ہاں ! آنٹی مجھے کچھ دکھاتی ہیں۔ گھوڑے کی سیر کراتی ہیں، آئس کریم بھی کھلاتی ہیں۔ بہت سے پیسے دیتی ہیں، اور ...."

"اور کیا ؟" لیڈیا نے بچی کو گود میں بٹھا لیا۔

"آنٹی کے پاس ایک کتا ہے وہ میرے ساتھ کھیلتا ہے"

"اچھا...... ؟"

"ہاں ..... !"

لیڈیا نے تھیلے سے اسے لیمن ڈراپس نکال کر دیں۔ وہ اس کی گود میں بیٹھی آرام سے چوسنے لگی۔ پھر وہ اس کی گود میں بیٹھی بیٹھی سو گئی، لیڈیا نے احتیاط سے اس کی ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور اس کے چہرے کو پیار سے دیکھنے لگی ....

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نئے شادی شدہ جوڑے میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں، نوجوان کی بات بات پر لڑکی مسکرا دیتی۔ اس کی دبی دبی سی ہنسی کی آواز لیڈیا کے کانوں میں متواتر پڑ رہی تھی۔ نوجوان اپنے کالج کے ایام کا کوئی ..... ایسا دلچسپ واقعہ بیان کر رہا تھا جس کا وہ خود کامیاب ہیرو تھا۔ جب وہ کہہ چکا تو لڑکی نے اپنے کالج کی زندگی کا کوئی واقعہ سنایا جس کی وہ ہیروئن تھی۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے، مسکرا رہے تھے۔ لڑکے نے کہا۔

"سرینگر پہنچ کر چند دن ہاؤس بوٹ میں رہیں گے ..... تم پہلے تو نہیں گئیں کشمیر ؟...... بڑا لطف رہے گا شالیمار اور نشاط جیسے باغ تم نے دیکھے ہی نہیں ہونگے ..... شاہی چشمہ کی تو بات ہی کیا ہے ...... اور شنکر آچار کا مندر اتنی اونچائی پر واقع ہے کہ تم چڑھ نہیں سکوگی ...."

"واہ ! چڑھ کیوں نہیں سکوں گی ؟ میں قطب مینار پر شرط لگا کر دو مرتبہ چڑھی اتری ہوں" لڑکی نے جھٹ کہا۔

"چلو شرط رہی ....." نوجوان نے کہا۔

"رہی ..... بیس بیس روپے کی ...."

"نہیں .... پچاس پچاس کی" نوجوان نے ہنس کر کہا۔

"منظور" لڑکی نے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔

"لیکن اتنا روپیہ دوگی کہاں سے ؟"

"کیوں ؟ تم سے لے کر" لڑکی مسکرا دی۔

"اچھا جی !" نوجوان نے اس کے چٹکی لی۔

"ارے ..." وہ کسی قدر آہستہ سے کہا "ہٹو بھی، شرم نہیں آتی"

"نہیں" لڑکا اس کی طرف اور بھی جھک گیا۔

لیڈیا بہت غور سے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ جوڑا ہنی مون منانے کشمیر جا رہا ہے ...... کتنے خوش ہیں یہ دونوں! اپنی نئی زندگی کی خوشیاں وہ مرقوں اور مسکراہٹوں پر رکھ رہے ہیں۔ یہ لوگ جھیل کی گہرائی اور سکون اپنے دلوں میں بھر لیں گے، باغوں کی مخمور فضا میں جھومتے پھریں گے، دو دیوانے ...... برف پوش چوٹیوں کی مقدس بلندیوں سے اپنی محبت کی تزئین کریں گے پھر نگر شاداب دلوں سے جوانی کا نشہ پئیں گے۔ ان کا گھر ہوگا۔ ایک ننھی سی خوبصورت زندگی ہوگی جو ان کا دل بہلایا کرے گی۔ لیڈیا گود میں سوئی ہوئی بچی کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرنے لگی۔

جہاز امرتسر اترا...... مسافروں کو چند منٹ کے لئے کھلی ہوا میں اترنے کا موقع مل گیا۔ بچی بھی جاگ گئی تھی۔ لیڈیا اسے لیکر باہر نکل آئی۔ وہ بچی کی فرمائش پر اسے کنٹرولنگ سیکشن دکھانے لے گئی۔ وہ بچی کو اس کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اسے ریستوران میں لیجا کر کوکا کولا پلایا۔

ابراہیم نے اسے وہاں بچی کے ساتھ دیکھ کر کہا۔

"یہ کیا مصیبت لے آئی ہو ساتھ ...... ؟ کون ہے یہ ..... ؟"

لیڈیا کو وائرلیس آفیسر کا یہ فقرہ ناگوار گزرا ...... وہ بچی کو لے کر جہاز میں لوٹ آئی ...... جہاز پھر اڑا ...... کچھ دیر لیڈیا امرتسر سے سوار ہونے والی تین نوجوان لڑکیوں سے گفتگو کرتی رہی۔ پھر آکر ڈالی کے پاس آ بیٹھ گئی۔

"آنٹی! سرینگر جا کر میں تمھیں اپنی وہاں والی آنٹی سے ملاؤں گی، وہ بڑی اچھی ہیں ......" بچی نے پیار سے کہا۔

بچی کے منھ سے اپنے لئے لفظ "آنٹی" سن کر لیڈیا کے دل میں ممتا جاگ اٹھی ...... "اچھا ضرور ملانا"

"آنٹی! تمھارا کوئی بے بی ہے؟" بچی نے معصومیت سے پوچھا۔

لیڈیا کے دل میں جیسے کسی نے سوئی چبھو دی۔ اس نے بچی کا ہاتھ دبا کر دلار سے کہا۔ "نہیں" اور خلا میں دیکھنے لگی۔

"کیوں؟" بچی نے حیرانی سے پوچھا اور بھولے پن سے لیڈیا کے چہرے کو تکنے لگی ...... لیڈیا کے دل میں ٹیس اٹھی، پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "میری شادی نہیں ہوئی ابھی ...."

...... لیڈیا سمجھ نہ سکی کہ اس نے چھوٹی سی بچی سے یہ کیوں کہا۔

"میری چھوٹی آنٹی کی بھی شادی نہیں ہوئی ابھی، ہو جائے گی، تم آؤ گی نا بیاہ میں ..... ؟ ضرور آنا"

"تم بلاؤ گی تو ضرور آؤں گی"

بچی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی ...... لیڈیا اس کے قریب بیٹھی اپنے خیالات میں ڈوب گئی ......

جہاز سرینگر پہنچ گیا۔ اڈے پر مسافروں کے دوست، رشتہ دار وغیرہ آئے ہوئے تھے، اچھی خاصی رونق ہو گئی تھی۔ ڈالی کی آنٹی اور انکل اسے لینے آئے تھے۔ ڈالی نے انھیں لیڈیا سے متعارف کرایا۔

"آنٹی! یہ بہت اچھی ہیں انہوں نے مجھے لیمن ڈراپس دی تھیں"

انھوں نے لیڈیا کو چائے پر مدعو کیا۔ لیڈیا نے شکریہ کے ساتھ بتایا کہ وہ شام کو اسی جہاز سے لوٹ جائے گی اور پھر اس کی ڈیوٹی کلکتہ کی طرف ہو جائے گی۔

"جب بھی آپ کو وقت ملے ضرور آئیے گا" یہ کہہ کر ڈالی کی آنٹی نے نمستے کی اور ڈالی کو لے کر وہ لوگ چلے گئے۔ جاتے وقت ڈالی نے بھی ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آنٹی نمستے۔"

وہ کھڑی ڈالی کو اس کے پاپا اور چاچی کے ہمراہ جاتے دیکھتی رہی۔ اس کے ننھے نازک سفید ہاتھ لیڈیا کے دماغ میں ایک گہرا نقش بنکر رہ گئے تھے۔

جب سب مسافر چلے گئے تو لیڈیا جہاز میں گئی۔ سب نشستیں دیکھیں تاکہ کسی کی کوئی چیز رہ گئی ہو تو جا کر دفتر میں جمع کرا دے۔ سب نشستیں خالی تھیں۔ البتہ ڈالی والی سیٹ کے نیچے اس کا لال ربن گرا پڑا تھا ...... لیڈیا نے وہ ربن اٹھا لیا اور دفتر میں اپنی رپورٹ دینے چلی گئی ......

(۳)

رپورٹ دیکر جب وہ باہر نکلی تو وائرلیس آفیسر ابراہیم اسکا انتظار کر رہا تھا۔ لیڈیا کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور سگریٹ پھینک کر اسکا ہاتھ تھام لیا۔

"کم آن سویٹی ..... !"

تین چار گھنٹوں کی چھٹی تھی شام کو جہاز کو واپس جانا تھا۔ ابراہیم بھی اس دوران میں زندگی کا بھرپور لطف لے لینا چاہتا تھا۔ پھر وہی جہاز، وہی سگنل وہی رٹ ...... لیڈیا بے دلی کے ساتھ اس کے ہمراہ چلی جا رہی تھی۔ اسکا دماغ کہیں اور تھا قدم کہیں ...... اور معلوم نہیں کب وہ ٹیکسی میں بیٹھی، کب وہ ہوٹل میں پہنچی اور

ہب بیرے نے ان کے سامنے شیمپین کے گلاس لاکر رکھے ؟ لسے اس وقت ہوش آیا جب

ابراہیم نے کہا :۔ "ڈارلنگ ! کیا سوچ رہی ہو..... ؟"

وہ چونکی ..... "کچھ نہیں ! کچھ نہیں !"

"تم آہستہ پھر خاموش رہی ہو..... کیا بات ہے ؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

ابراہیم نے سگریٹ پیش کیا ، اس نے انکار کر دیا۔

اچانک لیڈیا نے بیرے کو آواز دی :۔

"بیرا ....." اس کی آواز قدرے اونچی تھی۔

"جی ....." بیرے نے جھک کر کہا۔

"یہ ایش ٹرے صاف کرلاؤ" اس نے حکم دیا۔

بیرا ایش ٹرے اٹھا کر لے گیا ..... ابراہیم نے اسکا ہاتھ دبا کر پوچھا۔

"کیا ہوا ہے تمھیں ..... ؟"

لیڈیا خاموش رہی اسکا ہاتھ برف کی طرح سرد رہا۔

ابراہیم کیا کہتا رہا ..... ؟ لیڈیا نے کچھ نہیں سنا ..... اس نے شیمپین بھی نہیں پی ابراہیم اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اس کے روبرو کھڑا تھا۔ لیڈیا کی آنکھیں اس کے کندھوں سے پرے ، کھڑکی کے باہر فضا کی وسعت میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں ابراہیم نے اسے بیدار کرنے کے لئے اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دیئے ۔ اسے اپنے رخسار اور ناک بھیگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ زبان نے نمکین و گرم آنسوؤں کا ذائقہ لیا۔ اور ابراہیم ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ لیڈیا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے ، وہ پل بھر کو بیوقوف سا بن گیا.....

"لیڈیا ! تم جیسی لڑکیاں روتی بھی ہیں .... ؟"

لیڈیا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی اس لئے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے لیڈیا ..... اور زندگی ہر ایک کو ایسے موقع نہیں دیتی ....." ابراہیم نے کہا اور اسے لپٹا لیا۔

"میں اس زندگی سے تنگ آچکی ہوں" لیڈیا کی آواز میں درد تھا۔

"عورت بڑی جذباتی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کئی خوبصورت لمحوں کا اکثر خون کر دیتی ہے اور پھر بھی معصوم بنتی ہے" ابراہیم نے فلسفی بننے کی کوشش کی۔

.... ابراہیم نے اس کا بوسہ لینے کی کوشش کی۔ لیڈیا نے اسے ہٹاتے ہوئے کہا :۔ "مجھ سے شادی کرو گے ابراہیم ؟"

ابراہیم پل بھر لیڈیا کو گھورتا رہا ، پھر زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"تم سے .....؟ تم سے شادی ؟ ..... آہا ! ہا ! ہا ! ہا ! ..... !!"

لیڈیا کے آنسو جیسے ایک دم خشک ہو گئے ..... اس کا ہاتھ اٹھا اور ..... ابراہیم کے گال پر تڑاخ سے بیٹھ گیا .... اس کے ہاتھ کا لال رین فرش پہ گر گیا .... ابراہیم اسے دیکھتا رہ گیا ......

لیڈیا نے رین اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گئی ۔

(بشکریہ "الحمراء")

افسانہ ——

جال

آثم میرزا

لوئیسا کی لمبی پتلی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ اس کے خیالات کی مانند سلگ رہا تھا۔ دھوئیں کی ملائم لہریں بل کھاتی ہوئی دودھیا بلب کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کرسی کی پشت سے کمر لگاتے ہوئے اس نے دیوان نظروں سے کارنس کے اوپر ٹنگی ہوئی اپنی ممی جین کی تصویر کی طرف دیکھا۔ اس کی روح کی گہرائیوں میں ایک اذیت ناک کسک رینگنے لگی۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے اچانک انجن فیل ہو گیا ہو۔ درد کی شدت ناک احساس کے تحت اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں اور اس کے بازو کرسی کی ہتھیلیوں کے باہر جھولنے لگے۔ وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ اور سگریٹ سلگ رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ ممی کی تصویر کی طرف دیکھا اور ممی کے پتلے عنابی ہونٹوں سے پھوٹتی ہوئی مسکراہٹ کے سہارے وہ رنج والم کے سمندر کو عبور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اب وہ خود کو ایک معصوم بچی کی مانند پا رہی تھی۔ تاریکی کے جھومتے ہوئے سایوں میں وہ اپنے بھائی پیٹر کے ساتھ کھیل میں مشغول تھی اور جین اداس نظروں سے نیلگوں خلاؤں کو گھور رہی تھی اس وقت اسے بالکل علم نہ تھا کہ اس کا پاپا جانسن کتنا ذلیل انسان ہے اور کیوں ان سے دور رہتا ہے...... پیٹر نے بازوؤں سے پکڑ کر اسے نیچے گرا دیا اور وہ روہانسی ہو کر جین سے شکایت کرنے لگی "ممی دیکھو پیٹر نے پھر شرارت کی ہے آپ بار بار اسے سمجھاتی ہیں کہ بڑوں کا ادب کرنا چاہئیے مگر اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔" پیٹر قہقہہ لگا کر بولا "ممی دیکھو لوئیسا کے سامنے میں جھک گیا ہوں۔ کیا یہ ادب نہیں!" جین نے مسکرانے کی کوشش کی اور آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔ "کیا بات ہے ممی؟" لوئیسا نے سسکتے ہوئے کہا۔ پیٹر کے چہرے سے ہنسی غائب ہو گئی۔ جین کو اپنی کمزوری کا احساس ہو گیا۔ انگلیوں میں آنسو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ سنبھل کر بولی۔

"کوئی بات نہیں میرے بچو! یونہی آنکھیں دکھنے لگی ہیں۔ تم کھیلو۔ میں اچھی بھلی ہوں۔"

مگر وہ دونوں اب اداس ہو گئے تھے۔ انہوں نے جین کے آنسوؤں کو بری علامت سمجھا تھا ایسے دلفریب ماحول میں غم کا مظاہرہ ان کے ننھے ذہنوں کے لئے ایک الجھن بن گیا تھا۔ وہ جین کے قلبی ہیجان کو نہ جان سکے تھے۔ اور نہ ہی کبھی جین نے اشارتاً ہی بچوں کو معلوم ہونے دیا تھا۔ کہ شادی کے بعد سے لیکر اب تک وہ کیسی آگ میں جلی جا رہی ہے اور اب اگر وہ زندہ ہے تو اس امید پر کہ یہ ننھے منے کھلونے ایک دن ضرور اس کی کھوئی خوشیاں واپس لا دیں گے۔ جانسن کے متعلق لوئیسا اور پیٹر صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ ان کا پاپا ہے اور کسی دوسری جگہ ملازم ہے جہاں سے وہ کبھی کبھار ان سے ملنے کو آ جاتا ہے۔ انہیں پیار کرتا ہے، تحائف لا کر دیتا ہے اور پھر انہیں مغموم چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ مگر اس نے جین کی زندگی میں جو تلخیاں گھول دی تھیں اس سے وہ دونوں بے خبر تھے۔ جین کو جب وہ سہانی شام یاد آتی جب پہلی بار مسز ڈیسوزا کے ہاں دعوت پر جانسن سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ تو اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ سوچ کے بھنور اس کے ذہن کے گرد پھیل جاتے "کاش جانسن سے وہ ایک خاص لگاؤ محسوس کرتی نئے ولولوں کے ساتھ اس کی طرف نہ بڑھتی اسے اپنی زندگی کا رفیق منتخب نہ کرتی۔ اور آج یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔"

مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ حال ماضی بن چکا تھا اور مستقبل کے قدموں کی آہٹ تیز ہو رہی تھی۔ وہ ایک یتیم لڑکی تھی اور تعلیم سے فارغ ہو کر اس نے کانونٹ میں ملازمت اختیار کر لی تھی —— اس کی

پرورش کچھ اس ڈھنگ سے ہوئی تھی کہ اپنے طبقہ کی برائیوں کے دلکش نظاہرے کے باوجود ان سے بچتی رہی تھی خود کو ان سے الگ تھلگ رکھنے کی خاطر وہ مطالعہ میں اپنا فرصت کا وقت گذارتی تھی۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ پاکیزگی اور شرافت ہی وہ زیور ہیں جو عورت کے حسن میں نکھار پیدا کرتے اور اسے بلند مقام پر پہنچاتے ہیں سبے جا تعریف، کلبوں کی بے راہ رو زندگی، ہوٹلوں اور پارکوں میں میک آپ کی نمائش، تصنع اور بناوٹ کے...... سوا کچھ نہیں۔

اور جانسن سے پہلی ملاقات میں بھی اس نے یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ بھی پاکیزگی اور شرافت کا مجسمہ ہو۔ اور جین جس نے کبھی کسی سے کھل کر بات نہ کی تھی۔ جانسن کے ساتھ وہ اپنے شب و روز کے واقعات پر تبصرہ کرنے لگی تھی۔ جیسے وہ مدت سے ایک ساتھ رہے ہوں۔ اور جانسن نے بھی اسے اپنے متعلق کوئی غلط نظریہ قائم کرنے کا موقع نہ دیا تھا۔ اس کے لہجہ کی نرمی، حلاوت، اور شستگی نے جین کو یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بلند کردار اور زندگی کی صحیح معنوں میں قدر کرنے والا انسان ہے۔ سے زندگی میں پہلی بار اپنے حسن کی قدر و قیمت کا بھرپور یقین ہوا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی وہ اپنے حسن کی تعریف میں ایسے کلمات سن چکی تھی جو کسی کو متکبر اور خود غرض بنانے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ مگر اس نے ان کلمات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی اور اب اسے اپنے حسن پر باکیف مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ جانسن ایک یورپین فرم کا ملازم تھا اور جین کانونٹ میں پڑھاتی تھی۔ اور ایک ساتھ زندگی گزارنے میں کوئی رکاوٹ اس کے راستہ میں حائل نہ تھی۔ شادی کے بعد جانسن اپنا سا مان اسی کے خوب صورت فلیٹ میں لے آیا تھا۔ شام کا وقت وہ ساحل سمندر پر گذارنے لگے تھے۔ جین کو مناظر قدرت سے والہانہ لگاؤ تھا۔ چند ماہ خلوص اور پیار کی قندیلیں روشن کرتے ہوئے گذر گئے۔ یہ چند ماہ جین کی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ تھے۔ اور اس کے بعد اسے کبھی یہ سرمایہ حاصل نہ ہو سکا۔ آہستہ آہستہ جانسن اصلیت اس پر ظاہر ہونے لگی۔ جانسن ایک بدقماش فطرت کا انسان تھا۔ وہ جین کے حسن کی آڑ لیکر اپنے شب و روز رنگینیوں میں ڈبونے کی خاطر محبت کا ڈھونگ رچاتے ہوئے تھا۔ بہت مدت سے اس کی خواہش تھی کہ اسے ایک ایسا حسین ترین سہارا مل جائے جس کی بدولت وہ بڑے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرے بجائے کسی کی نوکری کرنے کی بجائے۔ دوسرے اس کی نوکری حاصل کرنا فخر سمجھیں۔ نوابوں اور راجاؤں کی عیاشی اور سیر و تفریح کی خاطر یہاں آتی ہے جین انہیں اپنے دام محبت میں گرفتار کر کے دولت سمیٹتی رہے۔ اور وہ اس دولت کو اپنے قبضہ میں کر کے عیش اڑاتا رہے مگر جین سے اس ڈگر پر چلنے کی امید ایک خیال خام تھا۔ وہ چاہتی تو اس سے بہت پہلے اپنی اینگلو انڈین برادری کی عیاشانہ روایات کے مطابق اس کاروبار کی بنیادیں استوار کر سکتی تھی۔ مگر نہ تو ان روایات کی باغی تھی، اس کے کسی نقش سے اپنی زندگی کو داغدار بنانے کے خلاف تھی۔ وہ کیسے جانسن کا ساتھ دے سکتی تھی۔ اب معمولی بات پر بھی ان کی آپس میں تکرار ہونے لگی۔ جانسن اسے سبز باغ دکھاتا۔ اور جین اپنے اصولوں کی تیز آنچ سے اس کے خوابوں کے ابریشمی پردوں کو جھلس کر رکھ دیتی۔ جھگڑا بڑھتا رہا اور اسی دوران میں جانسن کی تبدیلی ہو گئی۔ لوئیسا کی پیدائش کے چھ ماہ بعد جانسن اسے منانے کی خاطر آگیا۔ اس نے ظاہری طور پر اگرچہ ماضی کی غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہا تھا مگر اس کے ارادوں میں گمراہیوں کی پرچھائیوں کا رقص جاری تھا—————— جین خوش تھی کہ جانسن نے صحیح راستہ پالیا ہے۔ مگر جلد ہی اسے اپنی اس خوش فہمی پر افسوس ہوا۔ جانسن اب بھی اسے اپنے ساتھ تعفن میں دھنسانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اب پھر ان میں جھگڑا ہو گیا۔ اور جانسن اسے تڑپتا چھوڑ کر چلا گیا۔ جین چاہتی تو اس سے بڑی آسانی سے چھٹکارا حاصل کر سکتی تھی۔ اس کی برادری میں ایسے جھگڑوں کا تصفیہ بہت معمولی بات سمجھا جاتا تھا۔ مگر جین اب بہت دل برداشتہ ہو چکی تھی۔ وہ مزید تلخیوں کے بھنور میں زندگی کی ناؤ کو پھنسانا نہ چاہتی تھی۔ شادی کے بعد کے پرمسرت لمحوں کو یاد کر کے اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ جان ایک دن ضرور سچے دل سے معافی مانگ لے گا۔ اور وہ پھر ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگیں گے۔ میرٹ کی ولادت کے بہت عرصے بعد اسے جانسن کی شکل دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر سیاہ کاریوں کے نقوش گہرے ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کی بے حیائی بڑھ گئی تھی اور اس سے مل کر جین کو بہت دکھ ہوا تھا۔ اب جانسن کبھی کبھار یوں آ دھمکتا جیسے راستہ بھول کر ادھر آنکلا۔ جین اسے دیکھ کر ماضی کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی۔ اور بچے حقیقت حال سے بے خبر "پاپا۔ پاپا" کہہ کر اپنی معصومیت کا اظہار کرنے

گئے۔ وہ جانسن کی اندرونی خباثت کو نہ جانتے تھے۔ اور جین بھی انہیں یہ راز بتانا نہ چاہتی تھی کہ کہیں اس عمر ہی میں وہ مرجھا کر نہ رہ جائیں اور ان کا مستقبل آہوں اور کراہوں کی آماجگاہ بن جائے۔

پیٹر اور لوئیسا اس کی زندگی کے دو چراغ تھے جن کی روشنی سے وہ مستقبل کے تاریک ناہموار راستوں کو منور کرنا چاہتی ہے۔ اور یہ روشنی اس کی تشنہ زندگی کو ہر وقت ڈھارس بندھاتی رہتی تھی۔

سگرٹ کا شعلہ لوئیسا کی انگلیوں کے بالکل قریب آگیا تھا اس نے جلن محسوس کر کے دور سے ہاتھ جھٹک دیا اور سگرٹ کا ٹکڑا دیوار کے پاس جا گرا۔ ماضی کے حسین ساحل کا تصور سگرٹ کے شعلے نے مٹا دیا۔ سامنے ٹنگی ہوئی جین کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ سگرٹ کا ٹکڑا اٹھا کر ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ اور کھڑکی کے ہلکے آسمانی رنگ کے پردے کو سرکا کر باہر جھانکنے لگی سورج کی بیمار زرد شعاعیں یوکلپٹس کی ٹہنیوں میں دم توڑ رہی تھیں۔ اس کے شعور میں رنگ برنگی فانوس جگمگانے لگے۔ اور اس کا ذہن لمبی جست لگا کر پھر ماضی کے شبستان میں پہنچ گیا۔ اب وہ خود کو اپنے پرانے فلیٹ میں محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بچپن کی حدیں پھلانگ لی تھیں۔ پیٹر اس سے زیادہ تندرست اور توانا نظر آتا تھا اور وہ اپنی ننھی منی بہن مرتھا کو گود میں اٹھائے سیٹی بجا رہا تھا انہیں اب بھی ریاکار جانسن کی فطرت کا علم نہ ہو سکا تھا۔ جین اب بوڑھی نظر آنے لگی تھی۔ اس کی ہم عمر سہیلیاں میک اپ کی بدولت کہیں سے زیادہ خوب صورت جوان نظر آتی تھیں۔ جین کو اگرچہ اپنی خوب صورتی کی بدولت کبھی ان سب پر فوقیت حاصل تھی مگر جانسن کی بیوفائیوں کے صدمے نے اسے وقت سے پہلے ہی زندگی کو بڑھاپے کے اندھیرے غار کے سپرد کر دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ جانسن بھی اب بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ اپنے ارادوں کی ناکامی کے شعلوں نے اس کی زندگی کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت عرصہ بعد انہیں ملنے کو آیا ہوا تھا۔ لوئیسا کو جین سے بھی زیادہ حسین دیکھ کر اسے یوں خوشی ہوئی تھی جیسے سراب کے چکر میں پھنسے ہوئے مسافر کو نخلستان کا پتہ چل جائے۔ اسے یقین نہ آرہا تھا کہ لوئیسا اس کی بیٹی ہے۔ ایسی حسین بیٹی کا باپ ہونے کے احساس سے اسکی گردن غرور سے اکڑ گئی تھی۔ وہ جتنے دن ان کے پاس رہا۔ اپنے پیار کا والہانہ اظہار کرتا رہا۔ پیٹر اور لوئیسا کے لئے پکنک کے پروگرام بناتا رہا۔ انہیں تحفے لے کر سیرگاہوں میں گھومتا رہا۔ جین بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ لوئیسا کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شادی کے بعد کے چند کیف آور لمحات پھر واپس آ گئے ہوں۔ وہ خود کو بالکل نوجوان محسوس کرنے لگی تھی اور جب جانسن کی خوشیوں کی تلافی کرنے کی خاطر اسے پیار بھرے لہجہ میں مخاطب کرتا اس کی زندگی کے افق پر شفق مسکرانے لگتی۔ اور وہ یوں جھوم اٹھتی جیسے کوئی لطیف شعر اس کی روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا جا رہا ہو

جانسن کا اب واپس جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ عنقریب اپنا تبادلہ یہاں کرالے گا۔ اور پھر وہ کبھی ان سے جدا نہ ہوگا۔ اس کے بعد لوئیسا اور پیٹر کو یہ خوشگوار لمحات میسر نہ آسکے جس طرح جین کے لئے پیار کی منزل خوشیوں کا گہوارہ بنی تھی۔ اور اس کے بعد یہ گہوارہ ٹوٹ گیا تھا اسی طرح ان دونوں کے لئے بھی جانسن کے والہانہ پیار اور شفقت کے یہ چند لمحے مرجھائے ہوئے پھول بن کر رہ گئے تھے جن کو حالات کے بگولوں نے منتشر کر دیا تھا۔

کھڑکی پر کھڑے ہوئے لوئیسا پر نیم غنودگی کی حالت طاری ہو گئی۔ اس کا سر ایک طرف کو جھکے ہوئے کھڑکی کے پٹ سے ٹکرا گیا۔ وہ ٹھک کی آواز نے کیف آور ماحول کو دور بھگا دیا۔ اور اداس شام دبے دبے اس روح کو ڈسنے کے لئے بڑھ رہی تھی۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں سیلاب سے پیدا ہو گئے۔ صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اپنے کندھوں پر منوں بوجھ کر رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اور صوفے پر بیٹھ کر اس میں سکت نہ رہی تھی کہ بجلی جلا سکے۔ یا نوکر کو آواز دے کر جلا لے۔ اندھیرے میں اس کا دم گھٹنے لگا جین کی تصویر دھندلی پڑ گئی۔ اور اس کی مسکراہٹ کی دلکشی دھندلاہٹوں میں ڈوبنے لگی۔ آنسو لوئیسا کے رخساروں پر لکیر بنا رہے تھے۔ اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دے اور اس وقت تک روتی رہے جب تک اس کے سانسوں کا تسلسل ہمیشہ کے لئے ٹوٹ نہ جائے۔ بہت مدت کے بعد اس پر یہ کیفیت طاری ہوئی۔ پیٹر کی موت کے حادثہ کی خبر سن کر بھی اس کا جی یہی چاہا تھا۔ اسی حادثہ نے اس کی ممی کی جان لی تھی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے صوفے کے بازو پر سر رکھ دیا۔ ماضی اس کے سامنے خونی جبڑے کھولے قہقہہ لگا رہا تھا۔ اب وہ پھر اپنے پہلے فلیٹ میں پہنچ گئی تھی۔ سمندر سے آنے والی سرد ہو

میں مسرور رہا ہوا تھا۔ بادلوں کے بکھرے ٹکڑے مستانہ روی سے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ فضا خوشگوار تھی اور لوئیسا اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں ٹھنڈی ہواؤں کی آسودگی محسوس کر رہی تھی۔ جانسن کا تبادلہ یہیں پر ہو گیا تھا۔ اور وہ ان کے لئے خوب صورت تحفے لیکر آیا تھا۔ پیٹر اپنے دوستوں کے ساتھ پکنک پر گیا ہوا تھا اور لوئیسا، جانسن اور مرتھا کے ساتھ شام کا پروگرام بنا رہی تھی۔ دروازہ پر کسی نے زور سے دستک دی۔ اور وہ چونک سی پڑی اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ پیٹر کا ایک دوست پریشان حالت میں اندر داخل ہوا۔ جین نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے جوزف! پیٹر واپس نہیں آیا؟"

جوزف نے پھولے ہوئے سانس کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے رنجیدہ آواز میں کہا۔

"ہم سب اکٹھے واپس آ رہے تھے۔ راستہ میں موٹر سائیکل کے حادثہ سے پیٹر زخمی ہو گیا ہے۔ ہسپتال پہنچا کر آپ کو اطلاع دینے کے لئے آیا ہوں۔"

جین نے دہشت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ایک دم بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور پھر یوں سنائی دیا جیسے سیڑھیوں پر کسی نے بھاری پتھر لڑھکا دیا ہو۔ جانسن کے بعد لوئیسا بھی کمرے سے باہر نکل گئی۔ نیچے دبا دبا شور پیدا ہو گیا تھا۔ جین خون میں لت پت ڈیوڑھی میں پڑی تھی۔ لوئیسا کی چیخ نے فضا کو تھرا دیا۔ جانسن جلدی سے ٹیکسی لے آیا۔ لوئیسا نے جین کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا تھا۔ اور اس کی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ہچکیاں جین کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جانسن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ پیٹر کی حالت خطرناک تھی۔ جانبر نہ ہو سکا۔ اور جین نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ یہ حادثات اتنی جلدی سے وقوع پذیر ہوئے تھے کہ لوئیسا کی ذہنی کائنات زلزلوں کی آغوش میں بے سدھ ہو کر گر پڑی تھی۔ اس کے ننھے سینے کی گہرائیوں میں ... ہو کر رہ گئے۔ اس کی خوشیوں کو گھن لگ گیا۔ اور اس کی مسکراہٹیں ہوئی سسکیوں میں بدل گئیں۔ مرتھا کے ننھے ذہن پر بھی اس غم کا اثر پڑا تھا۔ کھیلنے کی بجائے وہ ہر وقت خاموش رہتی۔ ان کی حالت دیکھ کر جانسن کی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور دل کے تاریک کونوں میں چھپی ہوئی خباثت تلملا رہی تھی۔ جانسن کو ایک خوف ستانے لگا کہ اگر وہ یہیں پر رہا تو جین کی یادوں کے جھکڑ لوئیسا کی جوانی کی شاندار عمارت کو منہدم کر دیں گے۔ اور مرتھا کی زندگی کا نازک کنول کیچڑ میں ڈوب کر رہ جائے گا۔ اس نے جگہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے خیالات کو ہمنوا بنانے کی خاطر اس نے دونوں بیٹیوں کا سوچ کا رخ موڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ اور آخر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ فلیٹ کا تمام فالتو سامان اس نے بیچ دیا۔ خاص ضرورت کا سامان اٹھا لے رکھ لیا۔ اب وہ یہاں سے بہت دور چلا جانا چاہتا تھا۔ جہاں وہ نئی زندگی کا آغاز اس تمکنت سے کرے۔ کہ ماضی کی تمام حسرتیں سنہری تتلیوں کے روپ میں اس کی زندگی کے ارد گرد دیوانہ وار رقص کرنے لگیں لاہور میں چند مہینے وہ بہت مدت پہلے گزار چکا تھا۔ اور یہاں کی اینگلو انڈین برادری میں اس کی جان پہچان کے ایک دو آدمی موجود تھے۔ یہاں پہنچ کر اسے فلیٹ تلاش کرنے میں ....

.... اسے زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔ انہیں کی وساطت سے اس نے ایک فلیٹ حاصل کر لیا۔ اور لوئیسا کو ان سے یوں متعارف کرایا جیسے برتری کے احساس نے اسے شاہی فرد کی حیثیت دیدی ہو۔ اب وہ بہت خوش تھا اسے یقین تھا کہ لوئیسا کی موجودگی میں ہر کوئی اس کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آئے گا۔ اس کا وقار بڑھ جائے گا۔ اس کے بگڑے ہوئے معاشرے میں دوغلی نسل کی جنسی بے راہ روی کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور مشرقی روایات کے پروردہ نوجوان ان کی ظاہری ترک بھڑک سے اس قدر متاثر ہو رہے تھے کہ اپنی "قدامت پسندی" پر انہیں ندامت محسوس ہونے لگی تھی۔ اور خود کو، اپنے گھریلو ماحول کو، اپنی روایات کو مغربی رنگ میں ڈبونے پر فخر محسوس کر رہے تھے۔ اور اس فضا میں جانسن کے لئے لوئیسا جیسی شگفتہ مسحور کن اور مدھر جوانی کا باپ ہونا ایک قابل فخر بات تھی۔ یہاں پر آ کر اس نے پھر وہی پرانا جال پھینکا۔ جال مرمت طلب تھا جانسن نے بڑی ہوشیاری سے اس کی مرمت شروع کر دی تھی اور اس پر نیا رنگ چڑھا کر وہ مسرور ہو گیا تھا۔ لوئیسا کی الم ناک اداسیوں کو دور کرنے کے بہانے وہ اسے اپنے ساتھ ہوٹلوں میں لے جانے لگا۔ رقص گاہوں کی رونق بڑھانے لگا۔ سیاروں اور تفریح گاہوں میں گھومنے

کا اس نے لوئیسا کو بھڑکیلے نیم عریاں لباس سلوا دیئے تھے۔ جنہیں پہن کر لوئیسا کے سوگوار حسن میں ایک دلپذیر جاذبیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کی جھلکیاں ہی لوگوں کو بے خود بنا دیتی تھیں۔ جانسن کا حلقہ احباب پھیل رہا تھا۔ اور لوئیسا کے پاکیزہ شباب کو داغدار بنانے والے شکاریوں کی ہوس میں بھنور پڑنے لگے تھے۔ لوئیسا جب تک باہر رہتی ان کا دل بہلا رہتا مگر گھر آ کر اسے تنہائی میسر ہو جاتی تو ماضی کی یادیں اس کے دل میں چٹکیاں لگاتی رہتیں۔ اس کا جی چاہتا کہ اس دنیا سے دور کہیں بھاگ جائے۔ اس کی سہیلیوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا جانسن کے سبھی دوست اب اس کے بھی دوست تھے۔ سب دوستوں میں نیا دوست ولیم اسے اپنانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ وہ ایک بڑا افسر اور ماہانہ تنخواہ کے علاوہ اسے ٹھیکیداروں سے کافی رقم رشوت کے طور پر وصول ہو جاتی تھی۔ اس کی چمکیلی کار میں بیٹھ کر جانسن دعائیں مانگا کرتا تھا کہ لوئیسا اس شکار کو پھانس کر اس کی ناکام تمناؤں کو پورا کر دے۔ مگر لوئیسا کے سامنے وہ صاف لفظوں سے اپنا مدعا بیان کرتے ڈرتا تھا۔ اسے اچانک جین کی اولوالعزمی کا اور ثابت قدمی کا خیال لرزا دیتا تھا۔ جین نے جس دلیری سے اس کے جال کو توڑ دیا تھا۔ اب وہ اس قصے کو دہرانا نہ چاہتا تھا۔

ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق ایک دن صبح سویرے ہی اس نے شروع کر دیا۔ لوئیسا اور سوزیتا ابھی سوئی ہوئی تھیں۔ جانسن کی کراہیں بلند ہونے لگیں۔ اور وہ بستر پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔ لوئیسا اور سوزیتا جاگ پڑیں۔ جانسن کی کراہوں نے انھیں پریشان کر دیا۔ جانسن بڑی ہوشیاری سے اپنا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ لوئیسا نے قریب آ کر فکرمندانہ انداز سے پوچھا:۔

"ڈیڈی! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

جانسن نے بدحواسی کے عالم میں کہا۔

"کئی دنوں سے ٹانگوں میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ مگر میں نے اس کی طرف خاص توجہ نہ دی۔ اور اب۔ یوں معلوم ہو رہا ہے۔ کہ کوئی انہیں کند چھری سے کاٹ رہا ہے۔"

جانسن کو اپنی ایکٹنگ کی کامیابی پر پورا یقین ہو گیا۔ اس کی بیماری نے دونوں بیٹیوں کو بہت پریشان بنا دیا تھا۔ جین اور میری کی موت کے صدمے نے پہلے ہی ان کی زندگیوں کو غم و الم کے اندھے غاروں میں دھکیل دیا تھا۔ اور اب جانسن کے سہارے کے بغیر وہ اپنے مستقبل کا خیال کر کے کانپ اٹھتی تھیں۔

ایک ہفتہ تک جانسن کے درد میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس کے دوست لوئیسا کے دیدار کی خاطر خبرگیری کے بہانے آتے رہتے تھے۔ ولیم تو اپنی فرصت کا وقت اب یہیں گزارنے لگا تھا۔ اور اس کے قیمتی تحائف میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک دن جانسن نے لوئیسا کو اپنے پاس بٹھا کر بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"لوئیسا بیٹی! درد تو شاید اب میری جان ہی لے کر چھوڑے ڈاکٹر سے معلوم ہوا ہے کہ اب میں چل پھر نہیں سکتا۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ تھوڑا بہت جو آتا تھا۔ اب ختم ہو چکا ہے۔ اب گزارے کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ تم نوکری کر لو۔ مسٹر ولیم تمہیں اپنا پی اے بنانے پر تیار ہے آدمی مالدار ہے۔ اس سے تمہیں بہت فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔"

لوئیسا سوچ میں پڑ گئی۔ جانسن کہہ رہا تھا۔

"ولیم کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ لیکن نہ جانے تم نے اس پر کیا جادو کر دیا ہے جو وہ یوں تمہاری خاطر روپیہ پانی کی طرح بہا رہا ہے۔ تم اب بچی نہیں ہو۔ اپنا نفع و نقصان بخوبی جانتی ہو۔ تم سے یہ بات بھی چھپی نہیں ہے کہ باوقار زندگی بسر کرنے کی خاطر انسان کو کتنے خطرناک موڑوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور پھر تو یہ ایک معمولی بات ہے۔ اس نوکری میں تم بہت خوش رہ سکتی ہو۔ اور گھر کے حالات بھی بہت زیادہ سدھر سکتے ہیں۔"

جانسن نے لوئیسا کے لئے نئی الجھنیں پیدا کر دی تھیں۔ جین نے اگر جانسن کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہوتا تو وہ بھی ایک مضبوط ارادے کے ساتھ جانسن کے طلسمی جال کو توڑ دیتی۔ مگر وہ جانسن کو دنیا میں سب سے بڑا ہمدرد اور سرپرست سمجھ رہی تھی اور اس کے مکر کے متعلق اسے کچھ علم نہ تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر جانسن اسے اپنی برادری کی دوسری لڑکیوں کے معاشقوں کا حال بتانے لگا۔ ان میں سے ہر لڑکی ولیم کی قربت حاصل کرنے کے لئے بیتاب تھی۔ مگر ولیم صرف لوئیسا کو اپنانا چاہتا تھا۔ لوئیسا کو مستقبل کا خیال آ گیا۔ اگر پاپا اچھا نہ ہوئے، آمدنی کا کوئی ذریعہ پیدا نہ ہوا تو

یہ معصوم کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا کر رہ جائے گی۔ میری زندگی کیسے یہ دکھ برداشت کر سکے گی؟" اس کا دل ڈوبنے لگا۔ جانسن نے اسے تسلی دی۔

"لوسیا بیٹی! کیا سوچ رہی ہو۔ یہ بھی تو ایک سودا بازی کا معاملہ ہے۔ اپنے ساتھ۔ دو دو زندگیوں کی دسترس محفوظ رکھنے کی خاطر کیا تم مجھے کھونا نہ چاہو گی۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ اس نوکری میں ہم سب کا مفاد مضمر ہے۔"

لوسیا سوچ رہی تھی۔ "مرتھا کی زندگی کو مصائب سے محفوظ رکھنے کی خاطر مجھے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہوگا۔ جب وہ بڑی ہو کر کسی بہترین ساتھی کے ساتھ ہنی مون منانے جائے گی تب مجھے اپنی تمام لغزشوں کا صلہ مل جائے گا۔ اور کیا عجب ہے مجھے بھی کوئی بہترین ساتھی مل جائے گا۔ پھر پاپا کا علاج بھی تو کرانا ہے۔ وہ کیا خیال کریں گے اس برے وقت میں میں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ تو پھر مجھے ولیم کا حکم ماننا پڑے گا۔ البتہ مرتھا کو اس سودا بازی کے ماحول سے دور رہنا پڑے گا جس میں جلنے کی میں تیاری کر رہی ہوں میں اس کی زندگی کو گندگی سے پاک دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ڈیڈی! مرتھا اور آپ کی خاطر میں ولیم کی ملازمت اختیار کرنے پر تیار ہوں۔ لیکن ایک شرط ہے!"

"وہ کیا؟" جانسن نے بے تابی سے کہا۔

"آپ مرتھا کو گندگی سے بچانے کا وعدہ کریں۔ اور کبھی اس پر ظاہر نہ ہونے دیں کہ میں کون سے فرائض انجام دیتی ہوں۔ اگر اسے علم ہو گیا تو اس کے دل و دماغ پر برا اثر پڑے گا اور وہ بھی چھیچھوری آوارگی اختیار کرے گی میں اسے ایک شریف لڑکی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

جانسن کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا تھا۔ اس نے قسم کھا کر وعدہ کر لیا اس کی مزدوری مل گئی تھی اور لوسیا کی جوانی نے اپنی پاکیزگی اور شگفتگی کو اس کے ارمانوں کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

ولیم کی نوکری کے ساتھ ہی وہ مرتھا کی نگہداشت پر بھی خاص توجہ دے رہی تھی۔ شہر سے باہر ولیم نے انہیں ایک کوٹھی کرایہ پر لے دی تھی اور مرتھا کے لئے یہ علیحدہ پرسکون ماحول بڑا خوش کن ثابت ہوا تھا اور جانسن کی بیماری میں بھی کمی واقع ہو رہی تھی۔ کچھ دنوں بعد وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ اور قیمتی سوٹ زیب تن کئے۔ عمدہ قسم کی شراب پیئے ولیم کی کار پر جب وہ گھر سے نکلتا تو اپنے مقابل کسی کو انسان ہی نہ سمجھتا تھا۔ اسے رئیسانہ ٹھاٹھ میسر ہو گئے تھے۔ اور لوسیا ولیم کی داشتہ بن کر اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی مانند سلگ رہی تھی۔

ولیم ریٹائرڈ ہو کر انگلستان چلا گیا اور جانسن نے جگل کشور کو پھانس لیا۔ وہ بہت بڑا ٹھیکیدار تھا۔ اور لوسیا کو ولیم کے نقش دیکھ کر اس کا دل بری طرح تڑپ اٹھتا تھا۔ وہ کوٹھی جس میں جانسن کرایہ دار کی حیثیت سے رہ رہا تھا جگل کشور ہی کی تھی۔ اسامی مالدار تھی اور ولیم کے بعد جانسن کی نظروں میں وہی ایک عمدہ شکار تھا لوسیا اب کٹھ پتلی بن کر رہ گئی تھی۔ جانسن کے اشاروں پر دوسروں کی خاطر ہنسنا اور اٹھکیلیاں کرنا ہی اس کا کام تھا۔ اور مرتھا کی طرف دیکھ کر جب وہ ماضی کا خیال کرتی تو اس کے سینے میں دھواں سا پھیل جاتا۔ اور اس کی پلکوں پر آنسو تڑپنے لگتے۔ مرتھا بچپن کی حدیں پھاند رہی تھی۔ فسادات کے بگولوں کا خونی رقص شروع ہو گیا تھا۔ آگ اور خون کے سمندر میں ڈوب کر جگل کشور نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ لوسیا کی مصروفیت بالکل ختم ہو گئی فسادات کا زور کم ہوا تو وہ کوٹھی کی مالک بن چکی تھی اور جگل کشور کی زندگی کا کوئی سراغ نہ مل سکا تھا۔ لوسیا نے اپنے نام پر بھی کافی روپیہ بنک میں جمع کرا رکھا تھا۔ اسے اب کسی کی داشتہ بن کر زندگی گذارنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اور دوسرے راتوں رات امیر بننے اور رئیس بننے والوں کے اوچھے پن سے اسے نفرت سی ہو گئی تھی۔ مگر جانسن چاہتا تھا کہ لوٹ مار کی تمام دولت اسی کے گھر جمع ہو جائے۔

لوسیا کو مجبوراً اس شرط پر سیٹھ قربان علی کا پلے بندھنا پڑا کہ اس کے ساتھ زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی تو وہ ہمیشہ کے لئے اس کام سے کنارہ کشی اختیار کر لے گی۔ آج وہ سیٹھ قربان علی کے ساتھ ایک مدت سے مل کر آ رہی تھی کہ راستہ میں ڈاکٹر شاہد کے ہاں اسے رکنا پڑا۔ سیٹھ قربان علی کو اس سے ایک ضروری کام تھا۔ انہیں باتوں میں مشغول دیکھ کر لوسیا ادھر ادھر نظریں گھمانے لگی۔ میز پر تصویروں کا البم پڑا تھا۔ اس نے البم اٹھا کر تصویریں دیکھنی شروع کر دی۔ آخری تصویر پر نظر پڑتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ایک الاؤ میں پھینک دیا ہو

یہ تصویر مرتھا کی تھی۔ وہ نیم عریاں حالت میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ لوئیسا کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس کی ذہنی کائنات میں زلزلہ آگیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس کمرے کو بھک سے اڑا دے۔ خودکشی کرے۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا۔ اب وہ سیٹھ قربان علی کے ساتھ کہیں اور جانا نہ چاہتی تھی۔ سر کے درد کا بہانہ ... کر کے وہ اپنی کوٹھی میں آگئی۔

جانسن اور مرتھا موجود نہ تھے۔ نوکر سے معلوم ہوا کہ دوپہر سے وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ جانسن ایک ظالم جلاد کی مانند اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا۔ اس کی مکار فطرت اپنے پورے زاویوں کے ساتھ اس کے سامنے آگئی تھی۔ اور ندامت کے تیز چرکے اس کی روح کو لرزا رہے تھے۔ اتنی مدت تک میں کیا کرتی رہی ہوں؟ جانسن میرا باپ کیسے ہو سکتا ہے! وہ تو ایک ذلیل دلال ہے۔ میں اندھی ہو گئی تھی ممی نے بھی تو اس کمینہ کی فطرت کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ کاش! مجھے پہلے معلوم ہو جاتا کہ جسے میں آبِ حیات سمجھ رہی ہوں وہ زہر ہے۔ اس کی خاطر میں نے خود کو پستیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اور اس کا مجھے یہ انعام ملا ہے۔ اگر مرتھا نے بھی یہی زندگی اختیار کر لی تو ممی کی روح کو کبھی چین میسر نہ ہوگا۔ اف۔ خداوندا!"

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور ابھی تک جانسن اور مرتھا واپس نہ آئے تھے۔ اچانک ایک خیال آنے سے لوئیسا کھڑی ہو گئی۔ بجلی جلائی اور خواب آور گولیوں کی شیشی جسے وہ چند دنوں سے استعمال کر رہی تھی میز کی دراز میں سے نکال کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر عزائم کی سختی پھیل گئی۔ اس نے لیبل کو دوبارہ پڑھا "مقدار سے زیادہ گولیوں کا استعمال زہر کا اثر رکھتا ہے" اس نے شیشی کو گلاس میں انڈیل دیا۔ جانسن کے کمرے میں جا کر شراب کی ... بوتل نکالی اور واپس آکر شراب سے آدھا گلاس بھر لیا۔ پھر وہ فونٹین پن سے گولیوں کو دبا کر شراب میں حل کرنے لگی۔

ابھی وہ اس کام سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ کار کے ہارن کی آواز سن کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی پر کھڑے ہو کر اس نے باہر جھانکا۔ مرتھا کے بعد جانسن باہر نکل رہا تھا۔ چہرے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکرانے کی مشق کی۔ اور صوفے پر یوں بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جانسن کمرے میں داخل ہوا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ مرتھا بھی پشیمان نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ لوئیسا نے مسکرا کر کہا۔

"شاپنگ میں بہت دیر لگا دی۔ ڈیڈی میں آپ کو ایک خوشخبری سنانے کے لئے جلد واپس آگئی تھی۔"

جانسن کی گھبراہٹ مٹ گئی۔ وہ مطمئن انداز سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ لوئیسا بولی۔

"سیٹھ قربان علی کے ایک دوست نے مجھے قیمتی ... موتیوں کا وہ ہار خرید کر دیا ہے جسے حاصل کرنے کے لئے میں بہت دنوں سے بے چین تھی۔ اس خوشی میں میں اپنے ہاتھ سے یہ جام پیش کر رہی ہوں۔"

لوئیسا نے گلاس بڑھایا۔ اور جانسن نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے انداز میں گلاس پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ گلاس خالی ہوگا لوئیسا اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں ابھی ہار لے کر آتی ہوں۔"

اور وہ مرتھا کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئی۔ اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ مرتھا کے کمرے میں پہنچ کر اس نے قہر آلود نظروں سے اس کے نیم عریاں لباس کی طرف دیکھا۔ اور غصیلی آواز میں پوچھا۔

"مرتھا! اس وقت تک کہاں تھی؟ سچ سچ بتاؤ۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

مرتھا کے لبوں کی حسین محرابوں میں زلزلہ سا آگیا۔ سہمی ہوئی نظروں سے وہ لوئیسا کے چہرے پر ابھری ہوئی نیلی رگوں کو دیکھنے لگی۔

"بولتی کیوں نہیں؟"

لوئیسا نے اسے بہت جھنجھوڑا۔ مرتھا خوف زدہ لہجہ میں بولی

"ڈیڈی کے اکسانے پر میں بیوٹی کنٹسٹ میں حصہ لے رہی ہوں۔ ڈیڈی آج پھر مجھے ایک دوسرے جج کے پاس لے گئے تھے"

"ہونہہ۔ یہ بات ہے۔ میری جوانی کو تباہ کر کے اب وہ تمہیں برباد کرنا چاہتا تھا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ایک شدید احساس کے تحت اس نے مرتھا کو سینہ سے لگا لیا۔

"میری معصوم بہن تو نہیں سمجھتی ڈیڈی کتنا ذلیل آدمی ہے

(باقی صفحہ ۴۸ پر دیکھئے)

کفارہ

رضیہ انصاری بی اے

مگر "کبری بلی" گھر بھر میں کسی سے محبت کرتی تھی تو رامو کی بیوی سے اور اگر رامو کی بیوی کسی سے نفرت کرتی تھی تو "کبری بلی" سے۔ رامو کی بیوی نئی نئی سسرال آئی تھی، وہ چودہ سال کی بھولی بھالی ناتجربہ کار لڑکی تھی۔ آتے ہی ساس نے سارا کاروبار اسے سونپ دیا اور خود پوجا پاٹ میں لگ گئی۔ بس اب گھر کی چابی اس کے پاس رہنے لگی۔ نوکروں پر اس کا حکم چلنے لگا۔

ناتجربہ کاری کی وجہ سے کبھی رسوئی گھر کھلا رہنے لگا۔ کبھی کبھی وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو جایا کرتی۔ اب کبری بلی کے لئے سنہری موقعہ ہاتھ آیا۔ کبھی دودھ ہاتھ صاف ہونے لگا۔ ادھر بے چاری رامو کی بیوی پریشان رہنے لگی، ادھر کبری بلی موج اڑانے لگی۔ اگر کبھی اتفاق سے رامو کی بیوی نے کوئی چیز نیچے رکھ دی یا الماری میں بند نہ کی اور وہاں سے ہٹ گئی تو اس کے آنے تک وہ نرفاتب۔ رامو کی بیوی کے کمرے میں رکھی ہوئی کٹوری پہنچی۔ اور جب تک آتے تب تک کٹوری صاف چٹی ہوئی۔ بازار سے بالائی آئی جب تک رامو کی بیوی نے پان لگایا۔ بالائی ختم۔ اب رامو کی بیوی نے یہ طے کر لیا کہ یا تو وہ گھر میں رہے گی یا "کبری بلی" ہی۔ مورچہ بندی ہو گئی۔ بلی پھنسانے کے لئے کٹہرہ منگوایا گیا۔ اس میں دودھ، بالائی، چوہے اور بلی کی مرغوب چیزیں رکھی گئیں لیکن بلی نے ادھر نگاہ تک نہ ڈالی۔ اب تو بلی اور نڈر ہو گئی۔ اب وہ ہمیشہ رامو کی بیوی کے ساتھ رہنے لگی۔ لیکن اتنے فاصلہ پر کہ وہ اسے ہاتھ نہ لگا سکے۔

ایک دن رامو کی بیوی نے رامو کے لئے مختلف قسم کے میوے اور دودھ میں اونٹا کر کھیر تیار کی۔ اس پر سونے کا ورق لگایا۔ کھیر سے بھرا کٹورہ کمرے کے ایک ایسے اونچے طاق میں رکھ دیا جہاں بلی نہ پہنچ سکے اور پان بنانے چلی گئی۔ ادھر کمرے میں بلی آئی پہلے سونگھی، تاکی اور پھر تاک لگا دی۔ پنجہ کٹورے میں لگا۔ اور کٹورہ جھنجھناہٹ کی آواز کے ساتھ فرش پر آ رہا۔

آواز سن کر رامو کی بیوی کمرے میں آئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ کھیر فرش پر پھیلی پڑی ہے۔ اور بلی ڈٹ کر کھیر اڑا رہی ہے۔ رامو کی بیوی کو دیکھتے ہی بلی چمپت ہو گئی۔

رامو کی بیوی پر خون سوار ہو گیا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس نے بلی کو مار ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی۔ صبح ہوتے ہی رامو کی بیوی ایک کٹورہ دودھ کمرے کے دروازے کی دہلیز پر رکھ کر چلی گئی۔ ہاتھ میں پاٹلے کر وہ لوٹی تو دیکھتی کیا ہے "کبری" دودھ پر جٹی ہوئی ہے موقع ہاتھ آیا۔ پوری قوت کے ساتھ پاٹا اس پر پٹک دیا۔ بلی نہ ہلی نہ جلی نہ چیخی نہ چلائی۔ بس ایک دم الٹ گئی۔

آواز سن کر ماما، نوکر، ساس سب اپنا کام کاج چھوڑ چھوڑ کر اس مقام پہنچ گئے ذرا سی دیر میں رامو کی بیوی سر جھکائے قصوروار کی باتیں سن رہی تھیں۔

نوکرانی بولی ———— "ارے رام بلی تو مر گئی۔ ماں جی بلی کی موت بہو سے ہو گئی۔ یہ تو بہت برا ہوا۔" ماما بولی ———— "ماں جی بلی کی موت اور آدمی کی موت برابر ہے۔ جب تک بہو کے سر ہتیا رہے گی ہم کھانا نہیں بنائیں گے۔"

ساس جی بولیں ———— "ہاں تم ٹھیک تو کہتی ہو۔ اب جب تک بہو کے سر سے ہتیا نہ اترے گی تب تک نہ کوئی کھا سکتا ہے اور نہ پی سکتا ہے۔ بہو تم نے یہ کیا کر ڈالا؟"

نوکرانی نے کہا ———— "پھر کیا ہو۔ کہو تو پنڈت جی کو بلا لاؤں"

ساس کی جان میں جان آئی: "ارے ہاں، جلدی دوڑ کر پنڈت جی کو بلا لا۔"

یہ بات ملانے جانے کی خبر بجلی کی طرح سارے محلے میں پھیل گئی۔ پڑوس کی عورتوں کا راموکے گھر میں تانتا بندھ گیا تھا۔ چاروں طرف سے سوالات کی بوچھار ہونے لگی۔ راموکی بیوی سر جھکائے بیٹھی رہی۔

پنڈت پرم سکھ کو جب یہ خبر ملی، اس وقت وہ پوجا کر رہے تھے۔ اطلاع ملتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے، پنڈتیائن سے مسکراتے ہوئے بولے: "بھوجن بنانا۔ لالہ گھسی رام کی بہو نے بلی کی ہتیا کر ڈالی۔ پرائشچت ہوگا۔ پکوان پر ہاتھ پھرے گا۔"

پنڈت پرم سکھ چھوٹے موٹے سے آدمی تھے۔ قد چار فیٹ دس انچ اور توند کا گھیرا اٹھاون انچ، چہرہ گول مٹول، مونچھیں بڑی بڑی، رنگ گورا، چوٹی کمر تک پہنچتی ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ متھرا میں جب پانچ سیری خوراک والے پنڈتوں کو ڈھونڈا جاتا تھا۔ تو پنڈت پرم سکھ جی کو اس لسٹ میں سب سے پہلا مقام دیا جاتا تھا۔

پنڈت جی پہنچے، پنچایت بیٹھی ——— ساس جی، مہراتی، کسنو کی ماں، چھتو کی دادی اور پنڈت پرم سکھ، باقی عورتیں بہت سے سوالات کر رہی تھیں۔

کسنو کی ماں نے کہا ——— "پنڈت جی! بلی کی ہتیا سے کون سا نرک ملتا ہے؟"

پنڈت جی نے پترا دیکھتے ہوئے کہا: "یہ معلوم کرنے کے لئے یہ بھی بتانا ہوگا کہ کس وقت بلی ماری گئی؟"

نوکرانی نے کہا ——— "یہی کوئی سات بجے صبح۔"

پنڈت جی نے پترے کے پنے الٹے، الفاظ پر انگلیاں چلائیں، ماتھے پر ہاتھ لگایا اور کچھ سوچا، چہرے پر دھندلا پن آیا۔ ماتھے پر بل پڑے ناک کچھ سکوڑی اور سنجیدگی سے کہا۔

"ہرے کرشن! ہرے کرشن! بڑا برا ہوا۔ صبح کے وقت بلی کی ہتیا۔ سخت بڑا پاپ ہوگا۔ راموکی ماں، یہ تو بہت برا ہوا۔"

راموکی ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے ——— "ہے رام! پھر پنڈت جی اب کیا ہوگا! آپ ہی بتلائیے۔"

پنڈت جی مسکرائے ——— "راموکی ماں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ——— پروہت کس دن کے لئے ہیں۔ شاستروں میں پرائشچت کا طریقہ ہے۔ اس سے سب کچھ ٹھیک ہو گا۔ اس کے لئے ایک سونے کی بلی بنواکر دان دینی ہوگی۔ پھر اکیس دن کا پاٹھ کروانا ہوگا۔"

راموکی ماں نے کہا ——— "کتنے تولے کی بلی بنوائی جائے؟"

پنڈت جی نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— "بلی کتنے تولے کی بنوائی جائے؟ ارے راموکی ماں! شاستروں میں لکھا ہے کہ بلی کے وزن بھر سونے کی بلی بنوائی جائے۔ لیکن آجکل دھرم کرم کا ناش ہو گیا ہے۔ صرف اکیس تولے کی بلی سے ہی کام چل سکتا ہے۔"

راموکی ماں نے آنکھیں پھاڑ کر پنڈت جی کو دیکھا ——— "ارے باپ! اکیس تولے سونا!! پنڈت جی یہ تو بہت ہے۔ تولہ بھر کی بلی سے کام نہ نکلے گا؟"

پنڈت جی ہنس پڑے ——— "راموکی ماں! ایک تولہ سونے کی بلی۔ ارے روپیہ بہو سے بڑھ کر ہے کیا؟ بہو کے سر بڑا پاپ ہے اس میں اتنی کنجوسی ٹھیک نہیں۔"

مول تول شروع ہوا۔ اور معاملہ گیارہ تولے کی بلی پر ٹھیک ہو گیا۔ اس کے بعد پوجا پاٹ کی بات آئی۔ پنڈت جی نے کہا: "اس میں کیا مشکل ہے۔ ہم لوگ کس دن کے لئے ہیں؟ راموکی ماں، میں پاٹھ کر دیا کروں گا۔ پوجا کی چیزیں ہمارے گھر بھجوا دینا۔"

"پوجا کا سامان کتنا لگے گا؟" ساس جی نے پوچھا۔

"ارے کم از کم سامان میں ہم پوجا کر دیں گے۔ دان کے لئے تقریباً دس من گیہوں، ایک من دال، من بھر تل، پانچ من جو اور پانچ من چنا، چار پنسیری گھی اور من بھر نمک بھی لگے گا بس۔ اتنے سے ہی کام چل جائے گا۔" "پنڈت جی! اس میں تو سینکڑوں سے بھی اوپر کا خرچ ہے۔" راموکی ماں نے کہا۔

پنڈت جی نے کہا ——— "راموکی ماں! ایک طرف تو بہو کے سر بہت بڑا پاپ ہے اور دوسری طرف تمہارے ذمہ تھوڑا سا خرچ سو اس سے منہ نہ موڑو۔"

دوسری سب عورتوں نے بھی پنڈت جی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ایک ٹھنڈی سانس لیکر راموکی ماں نے کہا ——— "اب تو

کھائیں گے۔ ناچنا بھی پڑے گا"۔ ـــــ پنڈت پرم سکھ
ـــــ" راموکی ماں! یہ تو خوشی کی بات ہے۔ اگر تمہیں
توڑ کر دو۔ میں چلا۔" اتنا کہہ کر پنڈت جی نے اپنا پوتھی پترا اٹھایا۔
لیے پنڈت جی۔ راموکی ماں کو کچھ نہیں اکھرتا۔ بیچاری کو کتنا دکھ
ہونہ" سب نے ایک ساتھ کہا۔ راموکی ماں نے پنڈت جی کے
۔ اور پنڈت جی نے رک کر آسن جمایا۔ "اور کیا ہے؟" راموکی ماں
لیس دن کے پاٹھ کے اکیس روپے اور اکیس دن تک دونوں سمے
برہمنوں کو بھوجن کرانا ہوگا۔ سو اس کی فکر نہ کرو۔ میں اکیلا ہی دونوں
جن کرلوں گا۔ اور میرے اکیلے کے بھوجن کرنے سے پانچ برہمنوں
کے بھوجن کا پھل مل جائے گا ـــــ ہاں، تو، اب انتظام شروع
کردو۔ راموکی ماں! گیارہ تولے سونا لگاؤ۔ اس کی بلی بنوا لاؤں۔ وہ گھنٹے
میں بنوا کر واپس آؤں گا۔ تب تک پوجا کا انتظام کر رکھو۔۔۔۔ اور دیکھو
پوجا کے لیے۔۔۔۔" پنڈت جی کی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ لڑکالاتی
ہانپتی کانپتی ہوئی کمرے میں گھس آئی۔ اور سب لوگ چونک اٹھے۔ رامو
کی ماں نے گھبرا کر کہا۔۔۔۔ "ارے کیا ہوا ری؟" لڑکالا نے لڑکھڑاتی
ہوئی آواز میں کہا ـــــ "ماں جی بلی تو اٹھ کر بھاگ گئی۔" یہ سنتے ہی
پنڈت جی کا چہرہ فق ہو گیا۔

(ہندی سے) (نئی نسلیں)

افسانہ

پک نک

امّ زبیر

پورا ایک گھنٹہ میک آپ پہ صرف کر کے نجمہ نے ایک بار پھر قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا سراپا دیکھا۔ پشت کی جانب بھی دوسرے آئینہ کی مدد سے بالوں جوڑے، چھپے جوڑے، گردن اور کھلی ـــــ کمر کا جائزہ لیا۔ اطمینان کا سانس لیکر ساری کا پلو اٹھاتے ہوئے راشد کے پاس گئی۔

"گیارہ بج رہے ہیں آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے ؟" پلنگ کے قریب رکھی چھوٹی تپائی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں تو تیار ہوں جانِ من! مگر کمبخت ٹائی کی گرہ درست ہونے میں نہیں آتی۔" راشد نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"لایئے میں ٹھیک کر دوں!" نجمہ دلربایانہ انداز سے آگے بڑھی۔

انگریزی سینٹ کی تیز خوشبو نے راشد کو پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا نجمہ کے نیم عریاں و چست لباس پر نظر پڑتے ہی اس نے ایک جھرجھری لی مردوں نے آنکھیں بند کر کے گردن نجمہ کے آگے کر دی۔ "بھائی جان! آپ نے مجھے بلایا ہے؟" سیما نے دروازے کا پردہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں نے ہی بلایا تھا۔ مگر تم ابھی ویسی کھڑی ہو۔ نہ لباس تبدیل کیا نہ بال سنوارے۔ عجیب ہو تم بھی!" راشد نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر بھائی جان۔" سیما نے جواب دینے کی کوشش کی۔

"مگر کیا؟" راشد کا لہجہ سخت ہو گیا۔ سیما ایک دم سہم گئی "بس اب ہمارا مزہ کرکرا ہو گا۔"

"میں نہیں جا سکتی۔" سیما نے دبے لفظوں میں کہا۔

"تم ہمیشہ تفریح کے موقعہ اس طرح کھو دیتی ہو! آج تمہیں ضرور جانا ہو گا۔ میں نے اسی لئے کل کہہ دیا تھا۔" راشد نے تحکمانہ انداز سے کہا "کل تو کہا؟ مجھے نہیں معلوم۔"

"میں نے سیما کو کل نہیں کہا تھا۔ اس لئے کہ یہ جائے گی نہیں اور ہمارا وقت بھی ضائع کرے گی۔" سیما کی بجائے نجمہ نے جواب دیا۔

سیما کو بھابی کی یہ بات ناگوار تو گزری۔ مگر مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ "آپ بخوشی جائیں۔ میں پھر کبھی چلی جاؤں گی۔ گھر کو بھی تو دیکھنا ہو گا۔"

"گھر دیکھنے ملازم جو ہیں۔ ابھی مشرف و نعیم بھی آجائیں گے۔" راشد نے کہا۔

"پھر تو بھائی جان مجھے معاف کیجئے۔ اچھے بھائی جان اکیلے میں آپ کبھی چلیں گے تو ضرور ساتھ چلوں گی۔" سیما نے عاجزی سے کہا۔

نجمہ سوچ رہی تھی، اب راشد کو سیما کو قائل کرنے میں لگے رہیں گے اور ہماری پیر دھری رہ جائے گی آج پھر سمندر میں نہانے کا پروگرام بھی ہے۔ یہ سیما صاحبہ اگر چلی گئیں تو خود ہر موقع پر گٹھڑی بنی رہیں گی اور ہمارا مزہ بھی کرکرا ہو گا۔ سیما کے منہ سے یہ سن کر کہ آج مجھے معاف کیجئے پھر کبھی سہی اس کا دل خوشی سے جھوم گیا۔ اس نے چاہا کہ جو کچھ سیما کے بارے میں اس نے ہمیشہ سوچا ہے وہ اسے معاف کر دے اور کہہ دے کہ سیما تم بہت اچھی لڑکی ہو میں نے تمہیں برا سمجھا ہے۔ مگر کچھ نہ کہہ سکی۔ پہلے پہل جب وہ ان کے گھر آئی تھی تو سیما ایسی تھی بھی نہیں۔ مگر چند مہینوں سے اسے معلوم کیا ہو گیا ہے کہ وہ بھائی بھاوج کی تفریحات میں شامل نہیں ہوتی۔ ہماری مجلسوں سے کنارہ کش ہو گئی ہے۔

اور تو سیما کی تمام باتیں اس کے لئے قابلِ برداشت تھیں مگر یہ وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح اکیلی وہ کیلی چلی جایا کرے۔ پھر دوستوں کے ساتھ جو سیر و تفریح میں مزہ ہے وہ الگ اکیلے جانے میں کہاں۔ مگر سیما نے تو پڑھ لکھ کر عادت کر دیا کہ ایسی مجلسوں سے احتراز کرتی ہے۔

"غسل خانے میں رکھ لیا ہے ناشتہ دان تیار ہے نجمہ!" راشد نے پوچھا۔

"ہاں سب کچھ تیار ہے! مگر تمہارے مشرف و نعیم نے دیر لگا دی ہے۔ ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔"

"بھائی جان غسل کریں گی سمندر میں؟" سیما نے سوالیہ نگاہوں سے بھائی کی طرف دیکھا۔

"ہاں تو کیا ہے؟ تم اس قدر حیران کیوں ہو؟" راشد نے فراخدلی سے سیما کی حیرانگی پر قہقہہ لگایا۔

"بھابی جان آپ بھی اس کے لئے تیار ہیں کھلے میدان میں۔۔۔ ن اللہ کسی کی نظر پڑ گئی تو؟"

"تو کوئی مجھے کھا جائے گا۔" نجمہ نے سامان درست کرتے ہوئے کہا باہر سے موٹر کے ہارن اور نقرئی دھاری قہقہوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔

"وہ آ گئے۔" نجمہ خوشی سے اچھل پڑی سیما کی آمد گفتگو نے دماغ جو مکدر کر دیا تھا وہ آنے والوں کے خیال نے دور کر دیا۔ دروازے پر استقبال کے لئے بڑھی۔ "السلام علیکم! ہیلو۔ مسز راشد آج کس کس کو مسحور کرنے کے سامان ہیں؟" نعیم نے دہلیز پر قدم رکھتے ہی کہا۔ مگر سیما کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

سیما نے جلدی سے بستر کی چادر ہی اوڑھ کر اپنے آپ کو چھپا لیا ں میں تلملا کر رہ گئی۔ بھائی دبھابی جان کی اس آزادی پر زنانہ مکان ی مردانہ قدموں سے نہیں بچا۔

"آیئے آیئے نعیم صاحب! یہ میری بہن سیما ہیں آپ کیوں رک گئے۔ سیما کی طرف متوجہ ہو کر "سیما! یہ نعیم ہیں۔ مجسٹریٹ صاحب۔ ہیں؟ نجمہ! کہاں ہے سیما؟"

نجمہ نے پلنگ پر چادر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ فورتھ ایئر میں پڑھتی ہیں۔ حاضر جواب بلا کی ہیں۔ مگر ذہنیت ا قدر پرانی ہے۔ میں کیا کروں؟ اپنے آپ کو یوں چھپاتی ہیں۔ گویا کسی کے سامنے آنے سے گھل جائیں گی یا چھوئی موئی کا پودا ہیں کہ مرجھا جائیں گی" نے اپنی خفت مٹانے کے لئے سب کچھ سیما کے متعلق اگل دیا۔

"دہ اللہ [illegible] کی ملاقات ہو [illegible] مشرف نے نعیم کو دھکیلتے ہوئے کہا۔ نعیم راشد پر گرتے گرتے بچا اور سیما ان کو ادھر متوجہ دیکھ بھاگ کر غسلخانے میں چلی گئی۔

راشد بھی خوب صورت ہے اور نجمہ کا سرخ و سفید رنگ موزوں ناک نقشہ دلوں کو موہ لینے والا ہے۔ مگر سیما گندمی رنگت میں بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک ملکوتی چمک ہے۔ نعیم سوچ رہا تھا کہ ایک نظر اور دیکھ لیتا۔ اس نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ مگر وہ تو جا چکی تھی۔

نجمہ نے آگے بڑھ کر دونوں سے شیک ہینڈ کیا: "کہاں ہیں مسز مشرف؟" نجمہ نے مشرف سے پوچھا۔ "گاڑی میں وہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" مشرف نے جواب دیا۔

"خوب چہ خوب خود باہر آ گئے اور انہیں وہیں چھوڑ دیا۔ میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔" نجمہ باہر کی طرف لپکی۔

"اگر وہ کبھی یہاں آ جائیں تو جناب سب پکنک دھری رہ جائے۔"

"عورتوں کا ایک جگہ سے اٹھنا بھی مصیبت بن جاتا ہے۔" راشد نے بھی لقمہ دیا۔

"عورتوں کا اٹھنا مصیبت نہیں بنتا۔ مگر مرد خود ہی لسوڑے بن جاتے ہیں۔" نجمہ نے باہر جاتے جاتے جواب دیا۔

"لسوڑے خوب!" تینوں دوست لسوڑے کی پھبتی پر لطف اندوز ہوتے رہے۔ خاص کر نعیم کیونکہ اس کی موجودہ حالت پر یہ پھبتی ٹھیک چست بیٹھ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کسی صورت یہاں چند منٹ ٹھہرنا ممکن ہو جائے۔ اور سیما کو ایک نظر اور دیکھ لے۔

راشد نے اپنا ناشتہ دان اور دوسرا سامان اٹھایا۔ آگے پیچھے گاڑیاں ساحل سمندر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ کلفٹن پر آج اتوار ہونے کی وجہ سے خوب چہل پہل تھی۔ دور فاصلہ پر اچھی جگہ دیکھ کر اس پارٹی نے بھی اپنا دائرہ بنایا۔ بیڈمنٹن ہوا۔ تاش کی بازی ہوئی۔ کھانا کھایا ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ سہ پہر کو غسل کا پروگرام تھا۔

ناہید مشرف باوجود بے پردہ ہونے کے ان کی پارٹی [illegible]

کے دوسرے مشاغل میں حصہ لینے کے غسل میں نجمہ کا ساتھ دینے لگی
خوف ختم کر دو گیا تاہم اس نے ساتھ دے کر اس کا مزہ کرکرا کر دیا۔ نجمہ
کو خود راشد نے غسل کا لباس پہنایا۔ نجمہ اس کو پہن کر جھجک محسوس کر رہی
تھی۔ اس نے اوپر سے کپڑا اوڑھنا چاہا۔ مگر راشد نے دور پھینک دیا۔ پانی
میں کون دیکھ رہا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی تک لے گیا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ
ڈالے خراماں خراماں پانی میں یوں چل رہے تھے جیسے خشکی پر۔ یہاں تک کہ پانی ان
کے گھٹنوں کو چھونے لگا۔ تیرنے کے لئے لیٹ گئے۔ نجمہ نے دلیر بن کر راشد کا
ہاتھ چھوڑ دیا۔ خشکی کی طرف بڑھنے لگے۔ گو کہ راشد نے اس کا حوصلہ بڑھایا
ہائے یہ کیا؟ راشد کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ نجمہ خود ہاتھ پاؤں مار کر تیراک بننے
کی کوشش کر رہی تھی۔ پانی کی ایک لہر کے زور سے آنے سے نجمہ اور راشد کو
دور دور کر دیا۔ نجمہ ایک لمحہ میں بے ہوش ہو کر پانی کے رحم و کرم پر ہو گئی۔

راشد تیزی سے نجمہ کی طرف لپکا۔ اس کے بال اس کے ہاتھ میں آگئے۔
بال پکڑ کر کھینچنے لگا۔ راشد اچھا خاصا تیراک ہونے کے باوجود حواس باختہ ہوتا
جا رہا تھا۔ خشکی سے کافی دور جا چکے تھے۔ واپس پہنچنے کے لئے بہت جدو
جہد کی ضرورت تھی۔ مگر فاصلہ دور شام کے پانی کا رخ، بیہوش نجمہ کا بوجھ کافی
دیر پانی میں رہنے سے اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو رہے تھے۔ واپس پہنچنا اسے
ناممکن نظر آ رہا تھا۔

پانی سے لطف اندوز ہونے والوں کی نگاہیں اچانک اس جانب
اٹھ گئیں۔ "کوئی ڈوب رہا ہے۔ کوئی ڈوب رہا ہے۔" اچانک ایک شور سا
مچ گیا۔ بے فکرے اور خوش باش چہروں پر بھی سراسیمگی چھا گئی۔

"اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟" ایک دوسرے سے پوچھا جا رہا تھا
ایک منچلا نوجوان فوراً پانی میں کود گیا۔ جلدی جلدی ہاتھ پیر مارتا
ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ راشد کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے سنبھالو یہ بے ہوش ہے
نوجوان سمجھ رہا تھا کہ راشد ڈوب رہا ہے۔ مگر راشد نے نجمہ کو آگے دھکیل
دیا۔۔۔۔۔

نوجوان نے نجمہ کو سنبھالے آہستہ آہستہ ساحل سمندر کی طرف بڑھنا
شروع کیا۔ پانی اگرچہ تیز تھا۔ مگر نوجوان تازہ دم تھا۔ چند منٹ میں خشکی پر
جا کر دم لیا۔ راشد بھی نجمہ کے بوجھ سے ہلکا ہو چکا تھا تاہم اتنی سکت نہ تھی
کہ نوجوان کا مقابلہ کرتا۔ اسے نجمہ کی فکر تھی۔ اپنی جان سے زیادہ۔ نوجوان
نے نجمہ کو لا کر خشکی پر لٹا دیا۔ اور اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگے۔

چند ثانیوں کے بعد راشد بھی پہنچ گیا۔ وہ نوجوان راشد کو یہ کہہ کر
کہ ڈاکٹر کو لینے کے لئے جاتا ہوں۔ بھیڑ میں گم ہو گیا۔ کسی کے ڈوبنے
کی خبر سن کر ان کی پارٹی بھی وہیں آگئی۔ جو غسل کے وقت علیحدہ ہو چکی تھی۔
وہ چائے تیار کر کے ان کے منتظر تھے۔ وہ ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ نجمہ کو
تو سب کے حواس باختہ ہو گئے۔ نجمہ کی زندگی کی سب کو فکر تھی۔

چند بار الٹ پلٹ کرنے سے نجمہ کے پیٹ سے قے کے ذریعہ کافی پانی
خارج ہوا۔ اس کی زندگی کی امید بندھی۔ نجمہ بالکل بے سدھ ہو کر پڑی
ہوئی تھی۔ اس کا لباس جسم سے چپک گیا تھا۔ ایک ایک عضو نمایاں ہو رہا
تھا۔ بال بکھرے پڑے تھے۔

سمندر کی تفریح سے لطف اندوز ہونے والوں کی نگاہیں اسی پر
مرکوز تھیں۔ لوگوں کا جمگھٹا اس کے ارد گرد لگا ہوا تھا۔

کچھ لوگ تو ہمدردی سے راشد کے ساتھ مل کر نجمہ کو ہوش میں
لانے کی فکر میں تھے۔ کچھ عورتوں کی آزادی پر باتیں بنا رہے تھے۔ اور کچھ
لوگوں کی للچائی ہوئی نظریں اس کے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔

راشد جو سردی سے کپکپا رہا تھا۔ اس نے مجمع کو دیکھا۔ لوگوں
کی رائے زنی سنی۔ للچائی ہوئی نظریں نجمہ کے جسم کو گھورتی دیکھیں تو اس
کا دل چاہا کہ ان کو چلا کر کہہ دے کمبختو یہاں کوئی تماشہ ہے؟ مصیبت
کے وقت بھی لوگ تنگ کرنے سے باز نہیں آتے۔ کسی کی مجبوری سے یہ
ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس نے ایسی نگاہوں سے مجمع کی طرف دیکھا
جس میں ہزاروں عاجزیاں پوشیدہ تھیں۔ مگر ان نگاہوں کو سمجھنے والا
کون تھا وہاں؟

اچانک اس کے کانوں نے یہ آوازیں سنی۔

"یار دیکھنا ذرا اس کی باہیں کس قدر سڈول ہیں۔"

"صرف باہیں ہی نہیں۔ یار سارا جسم دیکھو۔" نعیم کی آواز آئی۔

اسے ایسا معلوم ہوا جیسے گرم گرم سیسہ اس کے کانوں میں ڈال
دیا گیا ہو۔ باوجود اس کے کہ وہ سردی سے کانپ رہا تھا مگر اس کے سینہ
میں چنگاریاں بھڑک رہی تھیں جیسے ابھی شعلہ بن جائیں گی۔ اور یہ شعلے
سارے مجمع کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ وہ خود جل رہا تھا اس کا سارا

...کی پیشانی پر تھا۔ منہ اور سینے سے آگ نکل رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سب چلے جائیں اس کی نجمہ کو کوئی آنکھ ... گھورنے والی نہ ہے۔

مگر وہ کیسے کہے؟ لوگوں کی تفریح کا سامان تو اس نے خود مہیا کر دیا تھا۔ وہ کس کو الزام دے کہ اس کی طرف نہ دیکھے۔ سرِ بازار تو لا کے ڈالا گیا تھا۔ اس میدان میں تو اس حالت میں اسی نے لا کر رکھا تھا۔ تو آؤ راس کو دیکھو۔ لطف اندوز ہو اپنی آنکھوں کو سینکو

وہ تو خود کہا کرتا تھا "عورت چھپانے کی چیز نہیں دیکھنے کی ہے۔ لطف حاصل کرنے کی چیز ہے۔ اسے اندر گھروں میں چھپا کر رکھنا اس پر ظلم ہے

اس کا دل چاہا کہ نعیم کو کچا کھا جائے۔ جو نجمہ کا جسم دیکھنے کی دعوت دے رہا ہے۔ مگر نعیم کا کیا قصور؟ وہ دعوت نظارہ دینے والا خود تہا دینے والا ہے۔ نعیم کا یا اس کے ساتھی کا یہی قصور ہے کہ اس نے خود دیکھا اور دوسروں کو دیکھنے کی دعوت دی۔

مگر یہ اس کا اپنا ہی فلسفہ تو ہے کہ پھول چمن میں ہی خوبصورت لگتا ہے چمن سے پھول کو دور رکھنا اس پر ایک ظلم ہے۔ اس نے سوچا کیا یہ اسی کی غلطی نہ تھی کہ اس نے اس میدان کو چمن سمجھا۔ اس پھول اس نازک جسم کا چمن تو وہی ہے جہاں سے میں نے اس کو نکالا نوکِ نشتر کی طرح سیما کی یہ بات اس کے ذہن میں اتر گئی کہ کانٹے پھول کی ظالم ہاتھوں سے حفاظت کرتے ہیں۔ اور پردہ انسانیت کو شیطنیت سے محفوظ رکھتا ہے۔

راشد کے فلسفہ کی ساری بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں اس کے دلائل کا ذخیرہ ایک ایک کر کے ختم ہو رہا تھا۔

اتنے میں وہی اجنبی جوان ڈاکٹر کو لے کر آ گیا۔ اس نے دیکھا راشد دنجمہ کے گرد بھیڑ جمع ہے۔ راشد کانپ رہا ہے۔ لوگوں کی ہوسناک نگاہیں نجمہ کے سراپا کو گھور رہی تھیں اس نے فوراً بھیڑ کو پرے ہٹا دیا۔ کہیں سے ایک چادر لا کر نجمہ پر ڈال دی۔ ڈاکٹر نے فوری دوائیاں دیں۔ تھوڑی دیر بعد نجمہ کا جسم گرم ہو جانے کے بعد گھر جانے کے لئے کہا۔

شرف راشد کا لباس لا چکا تھا۔ اس نے گیلے کپڑے بدلے نعیم کو سامنے دیکھ کر راشد نے منہ پھیر لیا۔

گاڑیوں میں سامان رکھا جا چکا تھا نعیم نے راشد کا ساتھ دینے کے لئے نجمہ کو جو ہوش میں آ چکی تھی سہارا دینا چاہا۔ مگر راشد نے اسی نوجوان کو سہارے کے لئے بلایا نعیم کو پرے کر دیا۔ راشد کی یہ اس نے محسوس تو کی مگر اسے اہمیت نہ دی۔ اس کا یہ انداز بے اس حادثہ سے تعبیر کیا گیا۔

ساحلِ کلفٹن چھوڑنے سے پیشتر راشد کا دل چاہا کہ نوجو بڑھ کر گلے لگا لے جس نے اس کی نجمہ کی جان بچائی اور سینکڑوں سے اسے پوشیدہ کر دیا جذبات کی فراوانی سے اس کا گلا رندھ گیا۔ دا تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے اتنا کہہ سکا "میرے محسن!" نوجوا مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ راشد کے گرم گرم آنسو اس کے ہ پر گر پڑے۔

(حلقہ ادبِ اسلامی خواتین کراچی میں پڑھا گیا)

ب بدیسی ——— (ایک فرانسیسی افسانہ عربی توسط سے)

انعام

پروفیسر محمد خورشید عالم ایم اے

عشائیہ سے لوٹتے وقت موسیو بولستان اور اس کی بیوی نے سوچا کہ
کاش اگر یہ بچا لینا چاہیئے کوئی اور بھی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ چنانچہ
قریبی راستہ سے واپس ہوتے وہ تھیٹر کے میدان سے گزر رہے تھے
م کے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی اس نے جھک کر دیکھا تو ایک جڑاؤ
تھا۔ کہنے لگی :" یقیناً یہ ایک بیش قیمت کنگن ہے "
" ہاں۔ مگر اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے مت دیکھو۔ ہو سکتا
کوئی آنے والا ... دیکھ لے اور ہماری صورت اسے مشتبہ نظر آئے۔
چنانچہ اس نے کنگن لے کر جیب میں ڈال لیا اور جب گھر پہنچے تو
دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اور اس کی قیمت کا پوری طرح اندازہ
میں مشغول رہے آخر کار موسیو نے کہا۔
" اگر اتنی رات نہ گذر چکی ہوتی تو میں یقیناً اسے تھانہ لے گیا ...
ا "

صبح وہ دیر سے اٹھا اور بھاگم بھاگ دفتر پہنچا فیصلہ یہ کیا کہ اگلے
اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے، دوسرے دن مادام خاوند کے ساتھ
لے جانے کے لئے تیار ہو گئی تھی مگر جب اس کا خاوند دفتر سے واپس
اس نے کہا :۔
" اب ہمیں پولیس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے
نے گلیوں میں اشتہار لگا رکھے ہیں کہ جو کوئی گم شدہ کنگن واپس
گا اسے دو ہزار فرانک انعام دیا جائے گا ..... اور ہاں میری
! کچھ جانتی بھی ہو وہ ہے کون ؟ وہ میڈم فینس ہے جو مشہور کروڑ
موسیو فینس کی بیوی ہے اور وہ ہمارے کارخانے کے مالک کا گہرا
دوست بھی ہے میرا خیال ہے ..... تم اس کی بیوی سے ایک بار
بھی چکی ہو "

" ہاں یاد آگیا ہے میں نے اسے دیکھا ہے وہ ریشم پشم اور پھولے
ہوئے منہ والی عورت ہے وہ تو اچھی خاصی ہتنی ہے میں نہیں سمجھتی کہ یہ
کنگن اس کی کلائی کا زیور ہے ———— ہاں البتہ اس کی
انگلی کی انگشتری کا ہو سکتا ہے بڑی کریہ المنظر اور بھیانک شکل کی عورت
ہے اگر وہ اس بے شمار دولت کے مالک کی بیوی نہ ہوتی تو اس کی کوئی
بات بھی نہ پوچھتا ———— ہاں تو اب اس کنگن کے بارہ میں کیا کرنا
چاہتے ہو "
" میرا خیال ہے میں خود اس کے گھر جاؤں گا اس صورت سے ہماری
واقفیت آئندہ زندگی میں زیادہ نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے۔ اور نہ بھی
تو یہی کافی ہے وہ میرے افسر سے کوئی کلمۂ خیر کہہ دے "
" تو کیا تم انعام کے دو ہزار فرانک قربان کر دو گے "
" پیاری ! میری شرافت یہ گوارا نہیں کرتی کہ میں ایسے بڑے شخص
سے جس کی میری افسر سے گہری دوستی ہے کوئی معاوضہ قبول کر دوں۔ جو کسی بھی
وقت جب میں اس کا محتاج ہوں فائدہ پہنچانے پر قادر ہے ....
ہاں میں اس سے دو ہزار فرانک ہرگز نہ لوں گا ورنہ مجھ میں اور کسی مزید
بچے کے طرز عمل میں جسے یہ کنگن ملا ہوتا اور وہ انعام لے لیتا فرق ہی کیا رہا "
اس کی بیوی نے جھلا کر کہا تمہاری بات میرے پلے نہیں پڑتی۔
کیا اس غربت میں یہ رقم تمہاری اس شرافت سے زیادہ وقعت نہیں
رکھتی ؟ لیکن میں یہ تھوڑی کہتی ہوں تم خود جاؤ "
" تو پھر کیا چاہتی ہو، تمہیں بدل کر جاؤں۔ کیا کروں ؟ "
" کیسی بودی باتیں کرتے ہو میں چاہتی کہ یہ معاملہ شکریے کی ایک
مسکراہٹ اور گرم جوشانہ مصافحہ پر ختم ہو جائے یا یہ اگر وہ نوازش کریں تو ایک
گلدستہ بھیج دیں جس کی قیمت زیادہ سے زیادہ پچاس فرانک ہو سکتی ہے میں

لیکن کوئی بھی دولت کا شمار نہیں ہے دینے کے لئے تیار نہیں ہوں کیا
ان جیسا بھی نہیں ہے ہم جیسوں کے لئے یہ معمولی رقم ہے میں اسے خاوند
کے حوالے کر دوں تاکہ انعام بھی آجائے اور تمہاری شرافت پر بھی دھبہ نہ آئے"
"خاوند؟...... ہرمانس کے ہاتھ...... چھوڑو وہ تو
گنوار ہے جو معمولی سی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتی"
"میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گی وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہے گی
کہ یہ کنگن چوک والے تھیٹر سے ملا تھا پھر وہ کنگن انہیں دے آئی گی اور
انعام اپنے پاس لے آئی گی۔ ابھی تم خود دیکھ لو گے کہ میری بات کیسے سمجھ
جاتی ہے ہرمانس ——— ہرمانس"
"میری جان! اس معاملہ میں تھوڑی دیر اور غور کر لو" خاوند نے
لیکن اس کی بیوی نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی، اور کسی منت پر
دھیان نہیں دھرا۔ اتنے میں نوکرانی آگئی۔ حماقت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی منہ
کھلا، آنکھیں سہمی ہوئی، وہ ایک گول مول چہرے...والی عورت تھی۔ اور
دنیا میں رہ کر اگر کوئی بات اس کی سمجھ میں آتی تھی تو صرف یہ کہ وہ خدمت
کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے مالکن نے جو کچھ کہا وہ کان دھر کر سننے لگی۔
"سمجھ لے کہ یہ کنگن تھیٹر کے چوک میں تو نے پڑا ہوا پایا تھا تو یہ ان کو
دے دیگی وہ تجھے دو ہزار فرینک دے دیں گے...۔ معاوضہ کے طور پر...
کہ یہ رقم کنگن واپس کرنے کے لئے مقرر کر رکھی ہے...... زبان پر
قابو رکھنا خبردار میرا یا آقا کا نام تیری زبان پر نہ آئے۔ یہ کام بطرز احسن
انجام دینا اگر تم نے یہ کام دانشمندی سے کر لیا تو میں وعدہ کرتی ہوں تجھے انعام
ملے گی ——— سمجھ گئی ہو نا!"
دونوں میاں بیوی اس کا انتظار کرنے لگے موسیو بوتاں اطمینان و
سکون سے بیٹھا تھا مگر اس کی بیوی دو ہزار فرانک کو کام میں لانے کے...
طریقوں پر غور کر رہی تھی جب طویل انتظار کے بعد خادمہ آئی تو میڈم بوتاں نے
جلدی سے پوچھا:۔
"کیا کچھ کر آئی ہو۔ وہ دو ہزار فرانک کہاں ہیں"
"میرے پاس تو نہیں ہیں" نوکرانی نے جواب دیا۔
"یہ کیسے؟ کیوں نہیں ہیں؟ کیا اپنی حماقت اور بیوقوفی کی وجہ سے
انہیں کنگن دے دیا تھا"

"ہرگز نہیں جب کنگن کی مالکن نے مجھے دیکھا تو بولی تو ایسی کسن ہے تو
یہ رقم سمجھ بوجھ کے ساتھ صرف نہ کر سکے گی چنانچہ اس ضمن میں اس نے
میرے نام سے یہ رقم بنک میں.... جمع کرانے کی تحریر لکھ دی"
"اے کمینی پاجی عورت! یہ رقم تیرے نام سے کیسے جمع ہو سکتی ہے کنگن
تجھے تو نہیں ملا تھا"
جو کچھ آپ نے بتایا اس سے زیادہ کچھ کہنا میرے بس میں نہ تھا۔
آپ نے تو مجھے منع کر دیا تھا کہ میں آپ کا ذکر کر دوں، یا آپ کا نام لوں، علاوہ
بریں میں آج سے آپ کی ملازمت ترک کر دوں گی میڈم نے مجھے اپنی خادمہ
خاص بنا لیا ہے اس سے دوگنی تنخواہ دی ہے جس کا میں یہاں مطالبہ کرتی
رہی ہوں پھر رہنے کو ایک کمرہ عطا کیا ہے اور ہفتہ میں ایک بار سینما دیکھنے
کی بھی اجازت دیدی ہے یہ سب کچھ میری دیانت داری کا نتیجہ ہے۔ میڈم بوتاں
غصے سے کھول رہی تھی منہ سے جھاگ بہہ رہے تھے اسے چیختا ہوا چھوڑ کر ہرمانس
اپنا کپڑا التا سیٹنے چلی گئی۔ (بشکریہ "کامران")

بقیہ افسانہ صفحہ ۳۹ سے آگے:۔

وہ ہم سے انتقام لے رہا ہے اچھا ہوا کہ مجھے وقت پر پتہ چل گیا۔ ورنہ
تمہارا حشر بھی مجھ سے بھی بدتر ہوتا"
وہ اسے سینہ سے لگائے دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ مرتھا کو
وہیں چھوڑ کر وہ جانسن کے پاس آگئی۔ وہ قالین پر گرا ہوا تھا۔ موت
نے اس کی مکاریوں کا جال توڑ دیا تھا۔
لومیسا نے اس کی لاش دہشت زدہ نظروں سے دیکھ کر قہقہہ
لگایا۔ اور پھر جلین کی تصویر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور سسکیاں
بھرنے لگی۔
"ممی معاف کر دو مجھے۔ میں نے ڈیڈی کی سازشوں کا جال
توڑ دیا ہے" (بشکریہ "سوداگر")

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے تاکہ
تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو۔ (مینیجر)

کشمیر کی سوئی —— محمودہ سلطانہ

پان آفت جان —— شوکت تھانوی

اس زمانے کی بھولی بسری باتیں ہیں جب میں کمی تو ننھی سی مگر تھی نئی شرارتوں سے سارا گھر سر پر اٹھائے پھرتی تھی۔ مجھے ایک کھیل بہت پسند تھا۔ ایک لڑکی بڑا سا کوب نکال کر بڑھیا بن جاتی۔ اور لاٹھی ہاتھ میں لے کر کوئی چیز ڈھونڈتی پھرتی۔ دوسری لڑکیاں کہتیں:۔ "بڑھیا۔ بڑھیا۔ کیا ڈھونڈھتی ہو؟"

بڑی بی جواب دیتیں: "سوئی"

"سوئی لیکر کیا کرے۔؟"

"تھیلا سیوں"

"تھیلا سی کے کیا کرے ؟"

"گائے خریدوں"

"گائے خرید کے کیا کرے ؟"

"دودھ دوھوں"

"دودھ دوھ کے کیا کرے ؟"

"کھیر پکاؤں"

"کھیر پکا کے کیا کرے ؟"

"اپنے بچوں کو کھلاؤں"

بڑی بی کو بیوقوف بنانے کے لئے ایک شریر لڑکی ان کی ہمدرد بن جاتی دوسری لڑکیوں سے لڑائی کر ہوئے کہ۔ ہماری نانی اماں کو کوئی نہ ستائے ورنہ ہم سے برا کوئی نہیں"

شریر لڑکی بڑی بی سے دوستی کا نمونہ لینے کے بعد ان سے کہتی:۔

"نانی اماں کھیر ہمیں بھی کھلاؤ"

بڑی بی جواب دیتیں:۔

"میری بچی پوتوں پھلے دودھوں نہائے۔ میں تجھے کھیر نہ کھلاؤں تو اپنے جوتے بنوانے کو کھلاؤں۔ لیکن گلی کی لڑکیاں بڑی شریر ہیں تو میرے گھر کی دیکھ بھال کرتی رہنا میں ابھی سوئی ڈھونڈ کر آتی ہوں"

بڑی بی تو جاتیں سوئی ڈھونڈھنے۔ شریر لڑکی ان کے "سیواگرام آشرم" میں گھس کر ساری رسوئی "بھرشٹ" کر دیتی۔ جو کچھ گھر میں پکا ہوتا مال مفت دل بے رحم، خاندی کھا پی ہاتھ مارتی اور برتن بھانڈے توڑ پھوڑ کر پھینک دیتی پھر بگلا بھگت بن کر بڑی بی کے آشرم کے دروازے پر کھڑی ہو جاتی۔

سوئی ڈھونڈھنے والی بڑی بی کو سوئی کے نام اشوکا لاٹھ بھی نہ ملتی۔ ہانپتی، کانپتی تھکی ماندی اپنے گھر واپس آتی اور کانگریس سوشلسٹ کے انداز میں سینہ پیٹ پیٹ کر سیاپہ شروع کرتیں۔

"ہائے میرے گھر کا کھوج کس نے کھویا؟"

لڑکی گانے کے لہجہ میں جواب دیتی:۔

"جنگل کے شیر نے"

"شیر تو میرے تھا"

"محلے کی بلی نے"

"بلی تو میرے تھی"

"گھر کے مرغے نے"

"مرغا تو میرے ساتھ"

شریر لڑکی لمبی چوڑی قرأت کے ساتھ کہتی:۔

"تیرے گھر کا کھوج کھویا میں نے"

بڑی بی اس پر ڈنڈا سنبھال کر سیدھی ہوتیں۔

شریر لڑکی بڑھیا کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیتی اور سلطان محمود غزنوی بن کر بڑی بی کے بتوں کے سومنات کا کباڑا کر دیتی۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنے بھارت ماتا کے اقتدار کی پھٹی ہوئی چولی سینے کے لئے کشمیر کی سوئی چاہیے اور وہ اس "سوئی" کو حاصل کرنے کے لئے اس قدر بے چین و مضطرب ہیں کہ اخلاق کے بخیے ادھڑ گئے ہیں اور دماغ کی چولیں ہل

...ہو گئی ہیں جو شاید اس انصاف اور معقولیت کی بنا پر وہ ہر چیز کو تیا... کشمیر کی سوئی حاصل کرنے کے لئے اور مجھے ان کی حالت دیکھ کر وہ بھی بڑھیا ...کہانی یاد آ رہی ہے۔

"بڑھیا، بڑھیا کیا ڈھونڈھ رہی ہے ۔۔۔ ؟ سوئی"

پنڈت نہرو آج کشمیر کی سوئی حاصل کرنے کیلئے بھارتی دلال کے ذریعہ کشمیر ...میں مظلوم مسلمانوں کا قتل عام کرا رہے ہیں اور انھیں اپنے بخشی غلام محمد کی ...پر بھروسہ ہے لیکن اس تلاش و جستجو کا حشر کیا ہوگا۔ سن لیجئے۔

"کشمیر کے مسلمانوں کا خون رنگ لا کر رہے گا آج کل میں"

آزاد علاقہ کے پٹھان پنڈت نہرو کو گھیر کر پوچھیں گے۔

"بڈھے، بڈھے کیا ڈھونڈھتے ؟"

پنڈت جی جواب دیں گے:۔ "کشمیر"

"کشمیر لیکر کیا کرے ؟"

"مسلمانوں کے گھر اجاڑوں"

"مسلمانوں کے گھر اجاڑ کر کیا کرے ؟"

"بھارت کے ہندوؤں اور سکھوں کو بساؤں"

پنڈت جی کو بیوقوف بنانے کے لئے کوئی "بخشی" کوئی "پختون" انہیں ...تماشی تھیلی دے کر کہے گا۔

جا بڈھے، ڈھونڈ لا اپنی کشمیر کی سوئی۔ ہم تیرے گھر کی دیکھ بھال کریں ...پنڈت جی بھرے میں آ کر ادھر قدم نکالیں گے۔ ادھر اسلام کے بہادر ...ی پٹھان ہلّہ بول کر پنڈت جی کا بھرا گھر خالی کر دیں گے۔

بھارت کے اقتدار کی بھٹی دھولی سینے کے لئے پنڈت نہرو کو انشاء اللہ ...کی سوئی تو سات جنم تک نہ ملے گی۔ ہوگا یہ کہ جب وہ ناکامی کی ٹھوکریں ...کر اپنے گھر واپس آئیں گے تو لٹے ہوئے گھر کی حالت دیکھ کر سیاپہ شروع ...دیں گے۔

"بھائی میرے گھر کا کھوج کس نے کھویا ؟"

پختون کہے گا کہ "ہندو مہا سبھا نے"

"مہا سبھا تو میرے ساتھ"

"جن سنگھ نے"

"جن سنگھ تو میرے ساتھ"

"جموں پرجا پریشد نے"

"پرجا پریشد تو میرے ساتھ"

"کشمیر کے کمیونسٹ نے"

"کمیونسٹ میرے ساتھ"

پٹھان قہقہہ لگا کر کہے گا: او بڈھے تیرے گھر کا کھوج کھویا ہم نے

پنڈت جی غصے کے مارے، ناچ ہی تو جائیں گے بدحواسی میں جیسے ننگے مسلح پٹھان کو بھارت کا کوئی مظلوم مسلمان سمجھ کر اپنا ڈنڈا سنبھالیں گے اس کا انجام جو کچھ بھی ہوگا ظاہر ہے۔ (بشکریہ "انجام")

• • • • •

میں اکثر غور کرتا ہوں کہ آخر انگریزوں کو یہ کیا خدا کی مار تھی کہ وہ پان نہیں کھاتے تھے۔ کاش کھاتے ہوتے تو ہم کو ایک یہی فائدہ پہنچتا کہ سگرٹ کی طرح پان بھی پرتکلف ڈبیوں میں بند بازار میں مل سکتا اور نہایت نفاست کے ساتھ پیکیٹ اور یہ کی خوبصورت پیکنگ میں دستیاب ہوتا۔ پان کے لئے بھی نت نئے سائنٹفک تجربے کئے جاتے اور اس پاندان کے جھگڑے سے یا تو نجات مل جاتی یا پاندان بھی کچھ ٹائپ رائٹر کی قسم کا بن چکا ہوتا کہ پان کا پتہ رولر پر لپیٹا چونے کا بٹن دبایا چونا لگ گیا۔ کتھے کا بٹن انگلی سے دبایا اور کتھا لگ گیا۔ اسی طرح چھالیہ تمباکو، الائچی، قوام سب کے بٹن ہوتے اور گھنٹی بجتے ہی ایک خوبصورت سڈول سی گلوری اس مشین سے نکل آتی۔ اب ذرا اس تصور کو وسعت دیجئے تو بہت سے گوشے اٹھ سکتے ہیں مثلاً یہ کہ جب پاندان ٹائپ رائٹر کی قسم کا ہوتا تو اس مشین پر پان بنانے والے بھی ماہرین فن سے ٹریننگ حاصل کیا کرتے اور جس طرح سٹینو ٹائپسٹ کی سپیڈ دیکھی جاتی ہے اسی طرح پان بنانے والوں کی رفتار بھی دیکھی جاتی امیدوار کی رفتار کیا ہے یعنی کتنی گلوریاں کتنی دیر میں بنا لیتا ہے گلوری کو غالباً کیپسول کہا جاتا اور یہ کیپسول کھٹا کھٹ اس مشین سے نکلتے رہتے ظاہر ہے کہ سگریٹ اور سگار کی طرح ان کی بھی قیمتیں ہوتیں قیمتوں میں فرق بھی ہوتا مگر آسانی کتنی پیدا ہو جاتی تقریباً وہی آسانی جو حقہ پان کے بجائے سگرٹ سے پیدا ہو گئی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ حقہ پان اور سگرٹ کا کیا مقابلہ مگر آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ سگرٹ رواج پا گئی ہے اور حقہ کے عذاب سے بیدل نے یہ لکھ کر نجات حاصل کر لی ہے کہ ع حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

(بشکریہ "حریم")

مطالعہ کی میز پر

حقیقت اور حقیقت نگاری

محمود فاروقی

اس مرتبہ مطالعہ کی میز پر ام زبیر کا افسانہ "پکٹ نک" رکھا ہوا ہے۔ افسانہ اپنے موضوع پلاٹ اور کردار کے لحاظ سے ایک اچھا افسانہ ہو لیکن بعض مقامات پر مقصد کا چہرہ لفظوں کی عریانی میں مستور سا ہو گیا ہو۔ گفتگو کے لئے یہ بھی اچھا خاصا موضوع ہے لیکن اس اعتماد پر کہ اس جانب اشارہ کر دینا ہی ہمارے ہم خیال ادیبوں کے لئے کافی ہے۔ ام زبیر کے کردار "نعیم" کا ایک جملہ "سوچ بچار کے لئے پیش کیا جا رہا ہو۔ اس سلسلہ میں" ام زبیر کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ تحریر کیا گیا تھا وہ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے اور غرض صرف یہ ہو کہ حقیقت اور حقیقت نگاری کے پیش کردہ فرق سے متعلق رفقائے "مشیر" سے مزید توضیحات مل جائیں اور اس سلسلہ میں مزید افادہ و استفادہ کے مواقع نکل آئیں۔ (ادارہ)

آپ نے بلاشبہ کسی حقیقت کو ہی افسانوی رنگ دیا ہوگا۔ اور واقعہ میں نعیم ہے کسی شخص نے ہی زیر بحث جملہ اپنے دوست کے روبرو کہا ہوگا لیکن اس تو یا حقیقت کو فنی شکل دیتے ہوئے اسے بعینہ پیش کر دیا جائے تو یہ صرف ... حقیقت بیانی ہوگی حقیقت نگاری نہیں۔

حقیقت کے بیان میں تو ضروری ہے کہ ہر تفصیل اور ہر جزو کا اس طرح ذکر کیا جائے جس طرح وہ پیش آئی لیکن یہ بیان کسی صورت فن پارہ نہیں ہو سکتا تو بس واقعہ یا حقیقت کی رپورٹ ہوگی۔

اس کے برعکس حقیقت نگاری کے لئے نہایت ہی ضروری ہے کہ کسی حقیقت کے صرف اس پہلو کو پیش کیا جائے جو عام ہو اس جیسی حقیقتوں میں مشترک رہا ہو یا جاتا ہو اور کسی ایسے پہلو کو پیش نہ کیا جائے جس میں استثنا اور خصوصیت پائی جاتی ہو۔ اب آپ نعیم کے اس جملہ کو لیجئے۔ یہ حقیقت ہوگی کہ کسی شخص نے کسی موقع پر یہی جملہ برملا کہہ دیا ہو لیکن ہم اپنے پڑھنے والوں کو نعیم نامی کسی شخص کے متعلق کوئی رپورٹ نہیں دے رہے ہیں بلکہ ہم اس افسانہ میں نعیم کو ایک فرد کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ انسانی نفسیات کا جو مشترک احساس

اس افسانہ کے پڑھنے والوں میں قدرتی طور پر موجود ہے صرف وہی ایک کسوٹی ہے جس پر پڑھنے والے کسی کردار کی حقیقت کو جانچ سکتے ہیں ان کو اس کا علم ہے اور نہ ان کو اس سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے کہ کسی شخص نے کلفٹن پر اس کی بیوی کے متعلق اس کے روبرو یہ جملہ واقعتا کہا ہے۔ ان کا اپنا احساس تو یہ کہتا ہے کہ کوئی اوباش اور غنڈہ (خواہ وہ جاہل ہو یا تعلیم یافتہ) (افسانہ میں بیان کردہ موقع پر) اپنے دوست کے منہ پر اس کی بیوی کے متعلق اس طرح کا جملہ نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہ انسانی نفسیات کے قطعاً خلاف ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ انسانی نفسیات کے خلاف ہے تو پھر فلاں موقع پر فلاں شخص کی زبان سے یہ جملہ کیسے نکل گیا۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ہر انسان سے کبھی نہ کبھی کوئی حرکت ...... سرزد ہو ہی جاتی ہے جو انسانی نفسیات کے عمومی اور مطابق معمول (NORMAL) عمل سے مستثنیٰ اور جداگانہ ہوتی ہے اس حرکت کا بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ضرور ہوتا ہے لیکن وہ محرک ایک استثنائی حیثیت رکھتا ہے اب اگر فن کار ضروری سمجھتا ہے کہ وہ اس غیر معمولی حرکت کا ذکر کرے تو پھر اس کے لئے یہ لازمی ہو جائے گا کہ وہ اپنے کردار کا ارتقا ہی اس انداز میں کرے کہ اس

معمولی حرکت یا گفتگو کے مخصوص حرکات ان کے مناسبات اور اسباب سے قاری
پہلے واقف ہوتا چلا جاتا ہے تاکہ جب اس خاص حرکت یا گفتگو کا ذکر آئے تو
اس کے لئے غیر متوقع نہ رہے لیکن زیر بحث افسانہ میں انجم کا کردار نہ کوئی
غیر معمولی کردار ہے اور نہ اس کے اس غیر معمولی جملہ کے لئے کسی قسم کے مناسبات
پیدا کئے گئے ہیں اس لئے یہ جملہ بطور حقیقت و واقعہ کے توصحیح اور درست ہوگا لیکن
حقیقت نگاری یعنی حقیقت و واقعہ کے فنی اظہار کے لحاظ سے قطعاً غلط اور بے محل
ہے۔ مختصراً یہ کہ

حقیقت اپنے اصلی روپ میں ایک خام مواد ہوتی ہے،

فنکار اس خام مواد کو چھانٹتا، تراشتا، پگھلاتا، آمیز کرتا،
اور ڈھالتا ہے، تب کہیں جاکر وہ نئی روپ اختیار کرتی ہے
اس عمل میں اس کے بیشتر اصلی اجزا ختم ہو جاتے ہیں۔ مماثل حقیقتوں کے کچھ
اجزاء کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ اس کی بعض نمایاں خصوصیات اوجھل ہو جاتی
ہیں اور کچھ دوسری مبہم خصوصیات اجاگر ــــــ اور واقعاتی دنیا کی
ایک سپاٹ سی مجرد حقیقت فن کے زرتار لباس میں کچھ اور ہی طرح کا جلوہ
دکھانے لگتی ہے ــــــ یہی فنکاری ہے اور اسی کے لئے فنکار کو ایک
بھٹی کی طرح سدا جلتے اور سلگتے رہنا پڑتا ہے۔

ماں کی محبت

● —— حاجی لق لق

مولوی محمد حسین آزاد (مرحوم) نے اردو کی پہلی کتاب لکھی۔ جو آج سے
ے سال پہلے تک مدارس میں پڑھائی جاتی رہی۔ اس کا پہلا سبق تھا
محبت"...... یہ سبق یوں تھا:-

"ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ باپ حقہ پی رہا ہے۔ اور دیکھ
ش ہوتا ہے۔ بچہ آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ ماں
ری نگاہوں سے بچے کا منہ تک رہی ہے۔ اور پیار سے کہتی ہے...
ن! وہ دن کب آئے گا جب کما کر لائے گا آپ کھائے گا، ہمیں بھی
ا سہرا باندھے گا دلہن بیاہ لائے گا"...... بچہ مسکراتا ہے، تو
ے باغ باغ ہو جاتا ہے جب ننھا سا ہونٹ نکال کر رونی سی صورت
تو بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے جھولا لٹک رہا ہے سلانا ہوتا ہے
لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے جاگ اٹھتا ہے تو
ڈنک چھلتی ہے کچی نیند رونے لگتا ہے تو آدھی رات تک یہ بیچاری
مار لئے بیٹھی رہتی ہے صبح جب بچے کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ
ٹھتی ہے۔ دن چڑھے منہ دھلاتی ہے۔ اور کہتی ہے کیا چاند سا
آیا۔ واہ واہ، واہ!!

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ بچے، بچہ گاڑی یا آیا کی گود کی
ان کی گود میں ہوتے تھے۔ اور باپ سگریٹ یا پائپ نہیں بلکہ
تا تھا، اب زمانہ بدل گیا، ہمارا ماحول تبدیل ہو گیا، اب ہم
وہ چیزیں نہیں دیکھتے جو مولوی محمد حسین آزاد کو اپنے زمانے
اتی تھیں......

اس لئے اگر ہم میں سے کوئی شخص "ماں کی محبت" کے عنوان
ہتی لکھے تو اس کی عبارت کچھ اس قسم کی ہوگی:-

"آیا بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ باپ انعامی معمہ حل کر رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ انعام آئے تو بچہ گاڑی خریدی جائے گی بچہ آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ چوسنی چوس رہا ہے۔ ماں کاجل بھری آنکھوں سے اور مصنوعی پلکوں کے نیچے سے اس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے کہتی ہے۔ میری جان! وہ دن کب آئے گا جب بلیک مارکیٹ کرے گا۔ نوٹ پرمٹ لائے گا، کوٹھی الاٹ کرائے گا۔ رشوت کا مال خود کھائے گا ہمیں بھی کھلائے گا۔ ووٹوں کا سہرا باندھے گا اور ممبری بیاہ لائے گا"...... بچہ مسکراتا ہے تو ماں کا دل گول باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال کر رونی صورت بنانے لگتا ہے تو ماں اس کو لیکر ڈرائنگ روم میں چلی جاتی ہے۔ سامنے ریڈیو سیٹ دھرا ہے۔ بہلانا ہوتا ہے تو دیہاتی پروگرام لگا دیتی ہے۔ ڈرانا ہوتا ہے تو ریڈیو والوں سے معذرت کیساتھ پکے گانے لگا دیتی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد (مرحوم) کی پہلی کتاب کے آخر میں حصہ نظم بھی تھا جس کی ایک نظم کے چند اشعار یہ ہیں ؎

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی
یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل
ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل
وہاں جا کے دیکھی عجب ہی بہار
درختوں کی ہے ہر طرف اک قطار
کہیں ہے چنبیلی، کہیں موتیا
گلاب اور گیندا کہیں ہے کھلا

اس نظم کے بہت سے اشعار اور بھی ہیں، لیکن میں سوچتا ہوں کہ اگر مجھے آج کل کی صبح کی کیفیت پر ایک ایسی ہی نظم لکھنی پڑے۔ تو میں کیا لکھوں گا......؟

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی،
نظر آئی ہر سو نئی روشنی
نہ قرآن خواں کوئی دیندار ہے
فقط ہاتھ میں تازہ اخبار ہے
نہ نام رسولؐ اور نہ نام خدا
ڈبل روٹی، مکھن کی آئی صدا
یہی جی میں آئی کہ بستر سے ٹل
ذرا سیر کرنے کو بازار چل
وہاں جاکے دیکھی عجب ہی بہار
کہ ہے بائیسکلوں کی ہر سو قطار
کہیں کیو میں چلتی ہیں موٹریں
یہ گویا الیکشن کی ہیں ووٹریں،
کہیں تاجروں میں سلام علیک
کہیں چپکے چپکے رواں ہے بلیک
کہیں نفع خوروں میں ناچاقیاں
کہیں واگہہ بارڈر کی قاچاقیاں
ہے اخبار کے ہاکروں کی پکار
کہیں روزنامے اور کہیں ہفتہ وار
بلاکوں سے مانوس بانگ خروس
کہیں مدحِ لندن کہیں قدحِ روس

★ ★ ★

بات یہ ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد کے زمانے میں ابتدائی تعلیمی اسباق کا لکھنا ایک ضرورت تھی، اور آج کل ایک فن ہے۔ ان دونوں حالتوں میں وہی فرق ہے جو انگریزی زبان میں (NECESSIT) کے لفظ میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ مولوی آزاد (مرحوم) کے زمانے میں سیدھے سادے اسباق سے زبان کا سکھانا مطلوب تھا۔

اور ——— موجودہ زمانے میں زبان کو چٹخارہ بھی چاہیئے۔ اور چٹخارہ اس ماحول سے پیدا ہوتا ہے جو آزاد مرحوم کے زمانہ میں ناپید (تھا)

(بشکریہ "پرچم" لائلپور)

"مشیر" کا "اسلامی ادب نمبر"

چند ادیبوں کے خطوط

- عبد الرحمن چغتائی
- کوثر اعظمی
- نعیم قیصر
- پنہاں انصاری

مکرمی! سلام مسنون

"آپ نے بعض ایسے قیمتی مضامین کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، جو ادھر ادھر بیکار پڑے سڑتے۔ یہ آپ کا مسلک ضرور اچھے نتائج پیدا کرے گا میں سمجھتا ہوں کہ یسی کوششوں کی ابھی اور بھی ضرورت ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ ایک خاص نمبر ں بجائے ایک ایسی کتاب مرتب کر دیتے جس کی حیثیت ایک جامع تصنیف کی ہوتی

اسلام نے اپنے وقت میں ہر موڑ پر اپنے قیمتی سرمایہ سے انسان و انسانیت کی خدمت عظیم انجام دی ہے۔"

والسلام: مخلص عبد الرحمن چغتائی

برادر مکرم! سلام مسنون

"باعتبار موضوع و ضخامت اس نمبر سے جو توقعات تھیں وہ بہت کم پوری ہوئی ہیں انتخاب میں بہت سے خلا رہ گئے ہیں۔ اور اسلامی ادب اور ادیبوں کی بھی نمائندگی کا حق کما حقہ ادا نہیں ہو سکا ہے۔ اسلامی ادب کی موجودہ تحریک میں تو انتخاب کے لئے اور بھی بہت سا لائق تر مواد ہو سکتا تھا۔ مثلاً آباد شاہ پوری کی "جب ... وزیر اعظم کے نام ایک مہاجر بچے کا خط" ہماری تحریک کے افسانوی ادب میں یادگار افسانہ ایک عظیم اضافہ ہے۔ آسی ضیائی کا "یسوع کی باتیں" ابن بطوطہ ... اعظم آدیب کی "جھاڑیوں کی آڑ میں" وغیرہ بھی بہتر مواد تھا۔ بخلاف اس کے ... جو کچھ چیزیں شامل اشاعت ہو کر رہ گئیں۔ پریم چند کا جو افسانہ شریک اشاعت کیا گیا ہے وہ بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ پریم چند کے یہاں انتخاب کے لئے اور بھی بہتر مواد موجود تھا۔ مثلاً "حج اکبر" منتر بالخصوص منتر کا مقصدی تاثر اس قدر ... زوردار ہے کہ جس سے بے حس آدمی کو ایک بار ضرور جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اور ٹھہر کر سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بعض چیزیں قابل قدر شامل ہوئی ہیں۔ م نسیم کا "نور الٰہی" اور بلراج کومل کی نظم معری "اکیلی" اچھی چیزیں ہیں۔"

والسلام، کوثر اعظمی

برادر محترمی! سلام علیکم

"نمبر کے ٹھوس نہ ہونے کے باوجود انتخاب اپنی جگہ پر ٹھوس ہے، اور گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اس نمبر کے ذریعے چند اہم کاموں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے اور وقت کے اہم تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ وہ یہ کہ نئے اور پرانے شعراء اور افسانہ نگاروں کی وہ تمام تخلیقات یکجا کر دی جائیں جو ہماری نظریاتی کسوٹی پر پورے اترتے ہوں۔

پھر آپ نے ترجمہ کا حصہ پیش کر کے بھی بہت اچھا کیا۔ ضرورت یہ ہے کہ "ویش بدیش" کے زبان و ادب کی ان چیزوں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام کیا جائے جن میں کہ مصنفوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر تعمیری رجحان کو اپنایا ہے۔ غالباً ترجمہ کے حصہ سے یہی مقصود بھی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہمارے رسائل ان ضروریات کو وقتی طور پر اپنے

مختلف نمبروں سے پورا کر سکتے ہیں۔ مثلاً "افسانہ نمبر" "شعر نمبر" یا "منظوم نمبر" "ذولیش پریش نمبر" وغیرہ ——————

میں بحیثیت مجموعی "اسلامی ادب نمبر" کو ٹھوس کہنے میں ذرا اس لئے ہچکچا رہا ہوں کہ آپ نے ان تمام چیزوں کو ۲۴۴ صفحات کے اندر سمونے ... کی کوشش کی ہے۔ جن پر الگ الگ نمبر نکالا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حصہ اپنی جگہ پر نامکمل ہے۔ خاص طور پر حصہ شعر اور افسانہ کا حصہ۔ مثلاً حصہ شعر میں شاد وغیرہ جیسے اہم شاعر اور دیگر اہم شعراء کی چیزیں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ پھر افسانہ کے حصہ میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی، نعیم صدیقی، اللہ صحرائی وغیرہ اہم افسانہ نگاروں کو شریک نہیں کیا گیا۔ تاہم آپکے (SELECTIONS) بہت ہی خوب ہیں، اور اپنی جگہ پر ٹھوس ہیں۔

والسلام آپ کا خیر اندیش، نعیم قیصر

برادرم! السلام علیکم

"نمبر" ماشاء اللہ اپنی سابقہ روایات کے مطابق خوب سے خوب تر ہے۔ خصوصیت سے انداز ترتیب بہت پسند آیا ——— مجھے افسوس ہے، کہ میں اس ضمن میں آپ سے کچھ تعاون نہیں کر سکی ——————

لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی ——— میر کے اس شعر کو "اسلامی ادب نمبر" میں کس طرح شامل کر لیا گیا کہ ؎

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں

ساری مستی شراب کی سی ہے

وغیرہ ......؟ والسلام

مخلص، پنہاںؔ انصاری

تذکرے اور تبصرے

ہفت روزہ "عالم" ۔ سالانہ دس روپیہ ، فی پرچہ ۲ آنے

مشرقی پاکستان میں ایسے اخبارات و رسائل کی شدید ضرورت ہے جو اسلامی اقدار کی اشاعت کریں۔ اور مسلمانوں کے لئے صحیح راہ عمل متعین کرنے کی کوشش کریں۔ ہفتہ وار "عالم" کا اجرا اس لحاظ سے بہت ہی مفید اور نیک فال ہے لیکن ضرورت ہے کہ پرچہ کو کچھ اور دلچسپ بنایا جائے۔ زیر نظر پرچہ میں "اقبال کا تصور معیشت" ایک اچھا مضمون ہے اور محنت سے مرتب کیا گیا ہے

ملنے کا پتہ :۔ ہفت روزہ عالم ، سیدپور ، رنگپور مشرقی پاکستان ۔

(ادارہ)

"دمٹو" ——— ایک جھوٹی کہانی!

مصنف : خلیل عزیزی ، صفحات ۳۲ ؛ قیمت ایک روپیہ چار آنے ۔

خلیل عزیزی نے "دمٹو ـــ ایک جھوٹی کہانی" لکھ کر طنز کی نازک اور دو دھاری تلوار استعمال کی ہے۔ اگر ایک طرف اس طنز کا وار اس سماج کی طرف ہے جس میں ہر "بڑے آدمی" کی موت کچھ لوگوں کے لئے سستی شہرت، اور گھٹیا پروپیگنڈہ کرنے کا موقع پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف خود اس "بڑے آدمی" کی زندگی بھی خلیل عزیزی کے وار سے نہیں بچ سکی۔ اس پوری کہانی میں جہاں جہاں طنز کا وار بھرپور ہے وہ لطف و کیفیت سے خالی نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ انداز کہانی میں کم ہی نمایاں ہو سکا ہے۔ اس کے علاوہ ۳۲ صفحات کے کتابچہ کی قیمت ایک روپیہ چار آنے رکھنا ناشر کی ناتجربہ کاری پر دلالت کرتا ہے۔ پہلی نظر میں تو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ کسی سوڈا واٹر کمپنی کا اشتہاری پمفلٹ ہے لیکن کتاب کھولنے پر اس جھوٹ کے پردہ میں چند سچی اور کھری باتیں پڑھنے کیلئے مل جاتی ہیں ۔

(ن۔ع)

ہفت روزہ "مشعلِ راہ" کراچی

سالانہ چندہ دس روپیہ ؛ فی پرچہ چار آنے ؛ مقام اشاعت ۱۴۔ بینک ہاؤس حبیب اسکوائر نمبر ۱ تیسری منزل بولٹن مارکیٹ کراچی۔

کراچی سے کسی ہفت روزہ پرچے کے اجراء کو ایک خاص اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ یہاں کے ماحول میں یہ پودا کم ہی سرسبز ہوتے دیکھا گیا ہے...... یہ پودے نمو سے پہلے کیوں مرجھا گئے ؟ اس وقت ان کے اسباب گنانے کا موقع نہیں لیکن "مشعلِ راہ" کو اس کے مختلف النوع عنوانات کو دیکھ کر اسکا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ یہ یہاں کے ذوق کی تسکین کے ساتھ ایک مخصوص قسم کا سنجیدہ مذاق بھی پیدا کر سکے گا۔ "دعوت فکر و عمل" اور "رفتار زمانہ" اس میں بڑے اہم موضوعات ہیں۔ امید ہے کہ ان اہم موضوعات کے تحت یہ کوئی بڑا کام کر سکے۔

(ا۔خ)

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری جولائی ۵۷ء کے اس شمارہ کیساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں یا پھر خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے۔ کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا

منتظر کرم :۔ منیجر "مشیر" کراچی۔

- ۲۰۰۰ جناب مستری محمد عثمان صاحب ، لالوکھیت کراچی۔
- ۲۰۰۴ جناب عبدالغفور بھٹی صاحب ، رتن تالاب ، کراچی۔
- ۲۱۵۹ جناب محمد رفیق صاحب قریشی ، مغلپورہ۔ لاہور۔
- ۲۱۹۴ جناب محمد حنیف صاحب قریشی لاہور
- ۲۳۴۰ میسرز ترکی الیکٹرک ورکس گوجرہ لائلپور

باوقار تنظیم

جون ۱۹۵۷ء

ماہ جون کی ڈرائنگ بتاریخ ۲۳ جون ۱۹۵۷ء بروز اتوار حسب معمول ساڑھے تین بجے منعقد ہوئی۔ اس اجلاس کی صدارت جناب محمد جلیل خاں صاحب نے فرمائی۔ اس اجلاس میں پانچ گروپوں کی ڈرائنگ عمل میں آئی۔ گروپ نمبر ۱ کی چھٹی، گروپ نمبر ۲ کی پانچویں، گروپ نمبر ۳ کی چوتھی، گروپ نمبر ۴ کی تیسری اور گروپ نمبر ۵ کی دوسری ڈرائنگ۔ تلاوت کلام پاک کے بعد صاحب صدر نے مقررہ طریقے کے مطابق حاضرین سے اعداد طلب فرمائے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

گروپ نمبر ۱ ——— چھٹی ڈرائنگ :-

نمبر شمار	گروپ نمبر	رول نمبر	نام ممبر	عدد
(۱)	۱	۴۵۰	عالم خاں صاحب نیازی	۱۵۸۵
(۲)	۴	۲۹۴	احمد علی صاحب	۳۹۴۶
(۳)	۱	۴۳۸	احمد حسین صاحب	۱۹۵۷
(۴)	۵	۱۶۲	سید مسعود الرحمن صاحب	۷۸۶
(۵)	۲	۱۲۸	امیر احمد صاحب	۱۲۳۴۵۶

حاصل جمع = ۱۳۱۷۳۰ x ۵

حاصل ضرب = ۶۵۸۶۵۰ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۳۳۶

کامیاب رول نمبر ۳۳۶ گروپ نمبر ۱

جناب سردار بانو صاحبہ، معرفت مغلیہ ٹیلرنگ ہاؤس۔ چکوال ضلع جہلم

گروپ نمبر ۲ ——— پانچویں ڈرائنگ :-

نمبر شمار	گروپ نمبر	رول نمبر	نام ممبر	عدد
(۱)	۲	۱۱۸	احمد حسین صاحب	

(۲)	۳	۶۳	ضیاء احمد صاحب	۸۵
(۳)	۵	۱۶۲	سید مسعود الرحمن صاحب	۱
(۴)	۱	۴	مظفر حسین صاحب زبیری	۴۴۴۴۴

حاصل جمع = ۴۴۵۳۰ × ۴

حاصل ضرب = ۱۷۸۱۲۰ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۲۶۵

کامیاب رول نمبر ۲۶۵ گروپ نمبر ۲ ۔

جناب سیدہ بدرالنساء صاحبہ، بی ۷۴/۱، ناجرہ آباد، کراچی ۔

گروپ نمبر ۳ ——— چوتھی ڈرائنگ :۔

نمبر شمار	گروپ نمبر	رول نمبر	نام ممبر	عدد
(۱)	۲	۴۵۱	وکیل محمد خاں صاحب	۲۲۹۲۱
(۲)	۲	۴۹۸	عبدالسلام صاحب	۷۹۷۹
(۳)	۱	۴۳۸	احمد حسین صاحب	۱۹۵۸
(۴)	۳	۶۳	ضیاء احمد صاحب	۹۵
(۵)	۳	۴۶۳	غلام قادر صاحب	۱۲۳۵
(۶)	۱	۴۵۱	محمد سلیم صاحب	۴۴۴۴
(۷)	۳	۴۲۱	عبدالغفور صاحب	۱۲۴۳۶

حاصل جمع = ۵۱۰۶۸

× ۷

حاصل ضرب = ۳۵۷۴۷۶ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۲۶۳

کامیاب رول نمبر ۲۶۳ گروپ نمبر ۳ ۔

جناب محمد عبدالمجید صاحب بتوسط دواخانہ جماعت اسلامی، محلہ خلد آباد۔ لانڈھی، کراچی ۱۲

گروپ نمبر ۴ ——— تیسری ڈرائنگ :-

نمبر شمار	گروپ نمبر	رول نمبر	نام ممبر	عدد
(۱)	۴	۵۷	نثار احمد صاحب	۳۰۰۱
(۲)	۳	۷۵	محمد الیاس صاحب	۳۹۱
(۳)	۲	۴۹۸	عبدالسلام صاحب	۴۲۰
(۴)	۴	۱۳۳	حافظ محمد زاہد صاحب	۲۳۴۷
(۵)	۳	۳	سید عثمان پاشا قادری صاحب	۳۲۴۱

حاصل جمع = ۹۴۰۰

۵

حاصل ضرب = ۴۷۰۰۰ ÷ ۵۰۱

باقی عدد = ۴۰۷

کامیاب رول نمبر ۴۰۷ گروپ نمبر ۴ :

جناب شیخ محمد سرور صاحب واصفی معرفت انجمن خالقیہ احاطہ خالقیہ ، بلاک نمبر ۱۷ ۔ سرگودھا :

گروپ نمبر ۵ ——— دوسری ڈرائنگ :-

نمبر شمار	گروپ نمبر	رول نمبر	نام ممبر	عدد
(۱)	۲	۲۵۱	وکیل محمد خاں صاحب	۲۷۳
(۲)	۵	۱۶۲	سید مسعود الرحمٰن صاحب	۱۰۰۰
(۳)	۳	۷۵	محمد الیاس صاحب	۲۲۵
(۴)	۱	۱۲۶	سید مسعود حسین صاحب	۷۸۶
(۵)	۵	۳۸۲	امیر احمد صاحب	۱۰۹۸۷۶۵

حاصل جمع = ۱۱۰۱۰۴۹

۵ ×

حاصل ضرب = ۵۵۰۵۲۴۵ ÷ ...۱

باقی عدد = ۲۵۷

کامیاب رول نمبر ۲۵۷ گروپ نمبر ۵ ؛
جناب یاسمین عالم صاحبہ مکان نمبر ۴۷۶/ G گلی نمبر ۶ - ڈی ۔ اے ۔ وی کالج روڈ ۔ راولپنڈی ؛

جلسہ صاحب صدر اور حاضرین کے شکریہ کے ساتھ برخواست ہوا۔ ادارہ باوقار تنظیم جناب محمد جلیل خان صاحب کا بیحد شکرگزار ہے کہ انھوں نے اس ڈرائنگ کی صدارت کے فرائض سرانجام فرماکر کارکنانِ تنظیم کا ہاتھ بٹایا ؛

رقومات کی ادائیگی :-

اس ماہ کی امدادی رقم کی ادائیگیاں حسبِ ذیل ذرائع سے کی گئیں :-

(۱) گروپ نمبر ۱ کامیاب رول نمبر ۳۳۶ ۔ جناب سردار بانو صاحبہ معرفت مغلیہ ٹیلرنگ ہاؤس ۔ چکوال ضلع جہلم کو ادائیگی بذریعہ منی آرڈر کردی گئی ؛

(۲) گروپ نمبر ۲ کامیاب رول نمبر ۲۶۵ ۔ جناب سیدہ بدرالنسا صاحبہ بی ۴/۱ ہاجرہ آباد کالونی، کراچی کو ادائیگی بصورتِ نقد صدر دفتر سے کردی گئی ؛

(۳) گروپ نمبر ۳ کامیاب رول نمبر ۲۶۳ ۔ جناب عبدالمجید صاحب توسط دواخانہ جماعتِ اسلامی ۔ محلہ خلد آباد لانڈھی، کراچی کو عدم ادائیگی اقساط کی وجہ سے باوقار تنظیم کے قواعد و ضوابط کی دفعہ (۱۱) کے تحت امدادی رقم ادا نہیں کی گئی ؛

(۴) گروپ نمبر ۴ کامیاب رول نمبر ۲۰۴ ۔ جناب شیخ محمد سرور صاحب واصفی معرفت انجمن خالقیہ، احاطہ خالقیہ، بلاک نمبر ۱۷ سرگودھا کی امدادی رقم ایک قسط کی عدم ادائیگی کی وجہ سے روک لی گئی ہے، قسط کی ادائیگی کے بعد امدادی رقم ادا کر دی جانے گی ؛

(۵) گروپ نمبر ۵ کامیاب رول نمبر ۲۵۷ ۔ یاسمین عالم صاحبہ مکان نمبر ۴۷۶/ G ۔ ڈی ۔ اے ۔ وی کالج روڈ راولپنڈی کو ادائیگی بذریعہ بنک ڈرافٹ حبیب بنک راولپنڈی کرادی گئی ؛

ڈرائنگ کے نتائج کا اعلان روزنامہ "انجام" کراچی میں مورخہ ۲۵ جون ۵۷ء کو، اور روزنامہ "تسنیم" لاہور میں کردیا گیا ؛ بیرونی ایجنٹ حضرات کو فرداً فرداً بذریعہ ڈاک نتائج کی اطلاع بروقت کردی گئی ؛

● ——— چھٹا گروپ ماہ جون ۵۷ء میں تکمیل نہیں پاسکا، اسی لئے اس کی ڈرائنگ عمل میں نہیں آئی ۔ اس گروپ کی ڈرائنگ انشاء اللہ جولائی میں ممکن ہوگی، بشرطیکہ مقررہ تاریخ تک گروپ تکمیل پاجائے ۔ اس ضمن میں چھٹے گروپ کے ممبران کی فہرست اگست کے "مشیر" میں شائع کردی جائے گی ؛

● ———— پانچویں گروپ کی پاس بکیں براہ راست اور ایجنٹ حضرات کے توسط سے جاری کر دی گئی ہیں۔ اگر کسی ممبر کو نہ ملی ہو یا اندراجات میں کوئی غلطی ہو تو صدر دفتر کو متوجہ کریں۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں :-

● ———— ایجنٹ حضرات کمربستہ رہیں اور حسب سابق پُرخلوص جوش وخروش کیساتھ ممبرسازی جاری رکھیں تاکہ آئندہ پروگرام اپنے وقت پر پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے۔

● ———— اقساط کی فراہمی میں کوتاہی نہ کریں اور ہر ماہ زیادہ سے زیادہ اقساط فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ آئندہ پروگرام کا دار و مدار اقساط کی فراہمی پر ہی منحصر ہے۔

● ———— ماہ جولائی ۱۹۵۷ء میں پانچوں گروپوں کی اقساط وصول کرنی ہیں جو ۱۲ جولائی تک فراہم کرلینی چاہئیں۔ جو ممبر دُور رہوں۔ انھیں ہدایت کریں کہ وہ اپنی اقساط بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دیا کریں۔ منی آرڈر فیس اصل رقم سے وضع کرلیں۔

● ———— بڑی رقومات حتی الوسع بنک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں ———— ڈرافٹ باوقار کمپنی لمیٹڈ کے نام سے ہونا چاہیئے۔
(BAVAQAR COMPANY LIMITED, BUNDER ROAD KARACHI.)

● ———— اپنے حسابات چھپے ہوئے فارموں پر روانہ کریں، جو صدر دفتر سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

آئندہ ڈرائنگ

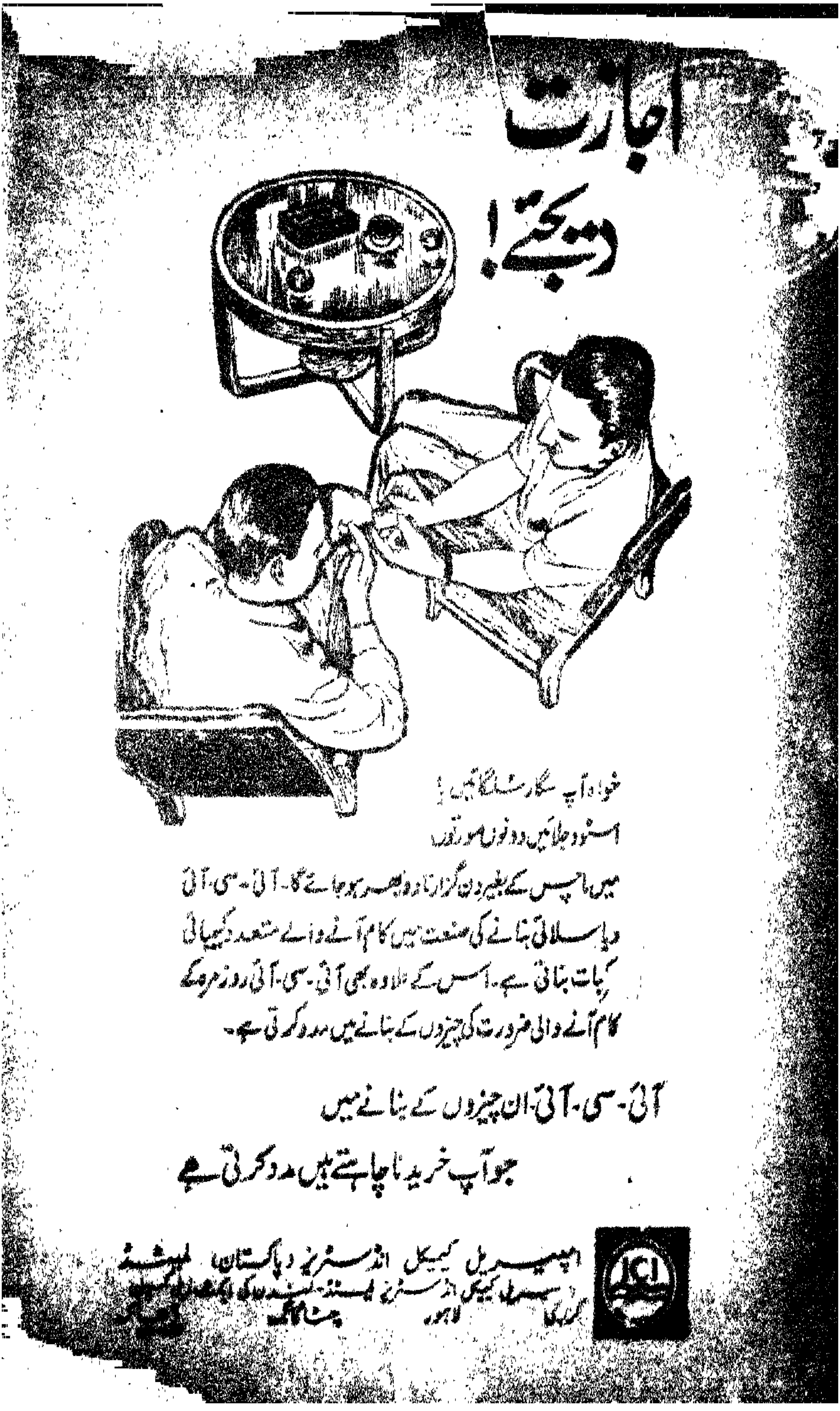
۲۱ جولائی ۱۹۵۷ء بروز اتوار حسب معمول منعقد ہوگی

● ———— "باوقار تنظیم" سے خط وکتابت کرتے وقت اپنا یا اپنے متعلقہ ممبر کا رول نمبر اور گروپ نمبر ضرور تحریر کریں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ رہے۔

● ———— "باوقار تنظیم" کے ہر نئے گروپ کے ممبران اپنی دوسری اقساط اس گروپ کی ڈرائنگ ہوجانے کے بعد ارسال کیا کریں۔ کیونکہ دوسری قسط گروپ کی پہلی ڈرائنگ کے بعد ہی واجب الادا ہوتی ہے۔

"مینیجر"


قیمت
پاکستان


اجازت دیجئے!
خواہ آپ سگار سلگائیں یا
اسٹوو جلائیں دونوں صورتوں
میں ماچس کے بغیر دن گزارنا دوبھر ہو جائے گا۔ آئی۔سی۔آئی
دیا سلائی بنانے کی صنعت میں کام آنے والے متعدد کیمیائی
مرکبات بناتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی آئی۔سی۔آئی روزمرہ کے
کام آنے والی ضرورت کی چیزوں کے بنانے میں مدد کرتی ہے۔
آئی۔سی۔آئی۔ ان چیزوں کے بنانے میں
جو آپ خریدنا چاہتے ہیں مدد کرتی ہے
امپیریل کیمیکل انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ

نگارشے ——

پاکستان کا گیارہواں یومِ آزادی

سب کے سب بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
وہ سب مل کر کُل دس تھے جو ایک دوسرے سے لگے ہوئے مایوس و افسردہ بیٹھے تھے
ان کو اپنے گیارہویں بھائی کا انتظار تھا

جو صبح سے گیا ہوا تھا ، اور اب شام ہونے لگی تھی !

"وہ آرہا ہے"
سب نے بڑی اُمید کے ساتھ اپنے سر اٹھائے
وہ آیا ——— لیکن
اس کا سر جھکا ہوا تھا
اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں

"کیا تم نے اسے دیکھا ——— ؟
دس کے دس ایک ساتھ بول اٹھے !!

اس کے لب ہلے لیکن وہ کچھ بول نہیں سکا
اس نے ایک لانبی آہ کھینچی ——— اور ———

چُپ چاپ اپنے دس بڑے بھائیوں کے پہلو میں بیٹھ گیا !!

——— محمود فاروقی

پاکستانی ادب کا ڈائجسٹ

ٹیلی فون :- 70923

ماہنامہ مُشیر کراچی

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

جلد ــــــ ۸
شمارہ ــــــ ۸

اگست ۱۹۵۷ء

ترتیب

نگاہے		
گیارہواں یومِ آزادی	محمود فاروقی	۱
سوچ بچار		
گیارہواں سنگِ میل	محمود فاروقی	۳
پس پردہ		
ملاوٹ کا زمانہ	کھوجی	۶
فکر و نظر		
تاریخ اور آدم نو	مترجم کپیل احمد بیدل	۸
قدم بہ قدم		
شاشن ری کے لیس میں	عبداللہ کم۔یو۔دو	۱۳
سرگزشت		
ہمالیہ کی گود میں...	مترجم حسین محمود	۱۵
برگِ گل		
آزادی کی جوالا	ماہر القادری	۲۰
اسلامی انقلاب	محشر رسولنگری	۲۲
آزاد پنچھی	کوثر اعظمی	۲۴
نذرِ شہیداں	تاج الدین احمد شعر	۲۵
غزل	فضل احمد کریم فضلی	۲۶
غزل	ادیب سہارنپوری	۲۷
غزل	قمر جمیلی	۲۷
غزل	اظلم ادیب	۲۸
غزل	بیدل میرٹھی	۲۹
غزل	بنتِ مجتبیٰ مینا	۲۹
نوائے تازہ	کوثر نیازی	۳۰
غزل	عالم اکبرآبادی	۳۰
پیروڈی		
پنجۂ عقاب	محمد یٰسین	۳۱
طنز و مزاح		
منکلایک کالونی	عاصی کرنالی	۳۲
افسانے		
اب کیا ہوگا؟	محمود فاروقی	۳۵
آزاد خیال	حمید اختر	۴۴
رونق	نامعلوم	۴۶
دیس بدیس		
خطوں کا پلندہ	مترجم سیّد ابوالانشا	۴۷
کرائے کے آنسو	مترجم ضیاء الحسن موسوی	۵۲
یادِ رفتگاں		
	مرتّبہ: محمود فاروقی	۵۴
بہادر یار جنگ		۵۴
مولانا آزاد سبحانی		۵۵
چراغ حسن حسرت		۵۶
مجید لاہوری		۵۷
سر آغا خان		۵۸
مطالعہ کی میز پر		
مسئلہ حُسن	مسعود جاوید	۶۰
آزاد نظم	بشیر انصاری	۶۰
جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا	پروفیسر ہمایوں کبیر	۶۱
تذکرے تبصرے		
تین سالنامے	(ادارہ)	۶۴
باوقار تنظیم		۷۰

نگراں :-
عبدالغفور بیگ

مرتب :-
محمود فاروقی

بدلِ اشتراک :-

سالانہ : پانچ روپے
فی پرچہ : آٹھ آنے

(پرنٹر پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس سے چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر منٹ روڈ، کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا) کاتب: حامد سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوچ بچار ——

گیارہواں سنگ میل

—— ایک صحیح منزل کی طرف جانے کے لئے!!

ہم پاکستان کی آزادی کے پورے دس سال گزار چکے ہیں اور اب ۱۴ اگست ۱۹۵۸ء سے ہماری قومی زندگی گیارہویں سال میں قدم رکھ رہی ہے۔ اس دس سال کی مدت میں ہم کو کیا ملا ؟ اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم کو چند بھاری بھرکم نام اور اصطلاحیں ضرور مل چکی ہیں "پاکستان" - "جمہوریت" - "اسلامی دستور" - "جمہوریۂ اسلامیہ" - "رائے عامہ" - "انتخابات" —— یہ خالص اور کھرے سکے ہیں، لیکن ابھی تک سرکاری خزانہ نے ان کی "قدر" کو قبول نہیں کیا ہے۔ ان کا بے میل اور خالص ہونا ہی اس کے نزدیک ان کا سب سے بڑا کھوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے بازار میں ان کا چلن نہیں ہو سکا۔

جب "پاکستان" کا نام لیا جاتا ہوگا تو یقیناً باہر کی دنیا جان جاتی ہوگی کہ یہ ایک ملک کا نام ہے جو برعظیم ہند کے دو پہلوؤں پر آباد ہے، لیکن پاکستان کیسا ملک ہے ؟ اس کا قطعی جواب دینے میں شاید ہی کوئی کامیاب ہو سکے۔

پاکستان —— جمہوری ملک ہے —— ؟

پاکستان —— میں آمرانہ نظام ہے —— ؟

پاکستان —— میں قدیم طرز کی مذہبی مملکت ہے ؟

پاکستان —— میں جمہوری نظام چل رہا ہے —— ؟

پاکستان —— ترقی یافتہ اسلامی ملک ہے —— ؟

—— آخر وہ ہے کیا —— ؟؟؟؟

باہر والے تو باہر والے خود گھر والوں سے یہ سوال کر کے دیکھ لیجئے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ سوچنے لگ جائے گا، ایک مختصر سے جملے میں برجستہ کوئی جواب نہیں دے سکے گا۔

اور ادھر یہ حقیقت ہے کہ ایک نہیں دو نہیں پورے دس سال ہوتے کہ ہم ایک آزاد ملک کے آزاد باشندے بن چکے ہیں۔ ہم نے اپنا دستور بنا لیا ہے۔ ہماری اپنی قومی پارلیمنٹ ہے۔ ہم ایک جمہوریہ کا اعلان کر چکے ہیں اور پورے دس سال سے بین الاقوامی کلب میں ایک ممبر کی حیثیت سے دوستانہ پارٹ ادا کر رہے ہیں، لیکن دنیا پھر بھی نہیں جان سکی کہ ہم کیا ہیں؟ وہ ہمارے کسی ممتاز و معروف اجتماعی مسلک سے آشنا نہیں ہو سکی ہے۔ اس سارے معمہ کا راز صرف یہی ہے کہ بہت کچھ طے کر لینے اور قبول کر لینے کے باوجود ہم نے کوئی بات قطعی طور پر طے کی ہے اور نہ قبول کی ہے۔ بہت سی باتیں عوام دل و جان سے قبول کر چکے ہیں لیکن اوپر کا طبقہ ان کو ماننے اور اپنانے کے لئے آمادہ و تیار نہیں۔ بہت سی باتوں کو اوپر

کے طبقہ نے عوام پر لاد دیا ہے لیکن عوام اس بوجھ کو اٹھا پھینکنے کے لئے بس موقع کے منتظر معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے تمام داخلی و خارجی مسائل بے یقینی، موقع پرستی اور انتشار کا گورکھ دھندا بنکر رہ گئے ہیں جس کو سلجھانے کی ہر تدبیر ایک نیا الجھاؤ پیدا کرکے رکھ دیتی ہے اور قول و عمل میں ایک اجتماعی تضاد اور نفاق سا پیدا ہو کر رہ گیا ہے۔

فکر و نظر کی دنیا کا یہ نفاق ہی وہ اصل سرچشمہ ہے جو ہماری زندگی کے مسائل اور روزمرہ کے معاملات میں گندگی اور کثافت کی ملاوٹ کر رہا ہے اور جس کے ہاتھوں عوام گئے دن نت نئی مشکلات و مصائب میں گرفتار ہوئے جا رہے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد ہمارے لئے دو ہی راستے تھے۔ یا تو ہم دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ایک ایسی قوم بن جاتے جو اپنے ملک کے مسائل صرف قومی، وطنی اور مادی اصولوں پر حل کرتی اور بھول کر بھی اپنے اجتماعی مسائل میں کسی ایسے اصول و نظریہ کا نام نہ لیتی جو خدا کی نازل کی ہوئی ہدایت اور حکمت سے وابستہ ہوتا —————— دوسری راہ یہ تھی کہ ہم اس انفرادی اور اجتماعی مسلک کو پوری یکسوئی کے ساتھ اختیار کر لیتے جسے ہم اللہ کا دین اور اسلام کہتے اور اس سے ایک تاریخی اور جذباتی لگاؤ اور تعلق رکھتے تھے۔

پچھلی دس سالہ عوامی جدوجہد شاہد ہے کہ ملک نے اجتماعی طور پر پہلی راہ کو تو یکسر مسترد کر دیا اور ایک طویل کش مکش کے بعد اوپر کے طبقہ کو مجبور کر دیا کہ دوسری راہ کو قبول کر لینے اور اپنانے کا اعلان کر دے —————— کسی ایک جانب ہو جانا اور یکسوئی اختیار کرنا، ان کیلئے تو بہت آسان ہے جو نیک نیت اور مخلص ہوں لیکن ایسے لوگ جو خود غرض اور مفاد پرست ہوں۔ ان میں کبھی بھی یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں کے سامنے کوئی نقاب ڈالے بغیر آئیں اور اپنے آپ کو ویسا ہی کچھ ظاہر کریں جیسے کچھ کہ وہ ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایسے بزدلوں اور خود غرضوں کی کمی نہیں ہی ہے چنانچہ انھوں نے عوام کے مطالبات کو تسلیم کر لینے کے باوجود ان کو دل سے مان کر نہیں دیا۔ اور محض اپنی غرض کی خاطر لوگوں میں بے یقینی اور بدعملی کو پھیلانے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کرتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پورے دس سال گذر جانے پر بھی ہمارے ملک کا نہ تو کوئی اجتماعی مسلک بن سکا اور نہ ہم میں کسی طرح کی کوئی قومی وحدت اور اجتماعی مرکزیت پیدا ہو سکی۔

دراصل ہمارا یہ اوپر کا طبقہ سنجیدگی سے کسی بھی مسلک پر یقین و اعتماد ہی نہیں رکھتا ہے۔ صرف ذاتی منفعت اور اقتدار ہی ایک ایسا عقیدہ ہے جس کے وہ مومن ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا اور وہ کسی بھی مسلک پر دیانتداری اور خلوص سے ایمان رکھتے ہوتے تو وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اس کی تبلیغ و اشاعت کرتے، اس کو رواج دینے کے لئے ایک ان تھک ذمہ دارانہ جدوجہد میں لگے رہتے —————— لیکن سب واقف ہیں کہ آج تک انھوں نے ایسی کوئی فکری و عملی تحریک نہیں چلائی، عوام کو اس کی طرف دعوت نہیں دی۔ اس کے لئے لوگوں کے ذہن تیار کرنے کی کوشش نہیں کی —————— بالکل یہی رویہ اسلام کے ساتھ بھی رہا۔ اگر ان کو اسلامی مسلک پر ایمان و بھروسہ ہے۔ جس کا مبالغہ آمیزی کے ساتھ وہ اظہار کرتے رہتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج تک انھوں نے اسلام کے لئے کوئی سنجیدہ کام کر کے نہیں دکھایا بلکہ عملاً اسلامی تحریکوں، اسلامی فکر و نظر کو الجھانے، اس کا راستہ روکنے اور رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اس طرح کے اجتماعی نفاق کا مظاہرہ کرنے والوں میں تقریباً ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہ اور عوامی نمائندگی کا ڈھول پیٹنے والے لیڈر شامل ہیں ایسے اخبار نویس، ادیب اور اہل قلم بھی ان کے برابر کے شریک ہیں جو اپنا قلم کسی مسلک اور نظریہ کے ہاتھ نہیں بلکہ شخص کے ہاتھ فروخت کرنے کے عادی ہیں۔ یہ سب مل کر ایک منافقانہ قیادت کا بوجھ عوام کے سروں پر لادے رکھتے ہیں۔ جس کے نیچے ہماری عوام کی زندگی برابر سسک رہی ہے —————— گزشتہ گیارہ سال میں یہ قیادت مختلف روپ بدل بدل کر اس ملک کے بخیے ادھیڑتی رہی ہے

اور عوام سخت انتشار اور بے چینی میں مبتلا رہے ہیں۔

اس منحوس قیادت کے بوجھ سے نجات کی صرف یہی صورت ہے کہ ملک کے سچے ہمدرد اور مخلص اشخاص اس اجتماعی نفاق کو ختم کرنے کی متحدہ کوشش کریں اور ایک جان توڑ جد و جہد کے ذریعہ اس صورت حال کو بدل دیں اور اپنی ساری توجہ ایک صحیح اسلامی مرکزیت پیدا کرنے پر لگا دیں۔ ہم پر خدا کا یہ بڑا فضل رہا ہے کہ ہر طرح کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود عوام خیر و فلاح، خلوص و سچائی کی دولت سے بالکل ہی محروم نہیں رہے۔ اسلامی افکار و نظریات کی اشاعت' اسلامی دستور کی کامیاب جد و جہد' اسلامی تحریکوں کی روز افزوں ترقی نے پاکستانی عوام کے سینوں میں ایمان اور یقین کی شمع کو بجھنے سے بچائے رکھا ——— یہی وجہ ہے کہ آج عوام اس منافقانہ صورت حال سے سخت بیزار ہیں اور ان چہروں کو پہچاننے لگے ہیں جو رنگین نقاب ڈال ڈال کر آج تک دھوکہ دیتے رہے ہیں ان کو ہر سال اپنا سیاسی اسٹیج بدلنے والے ان لیڈروں پر بھروسہ نہیں رہا ہے۔ اور وہ اپنی اس بے اعتمادی کا کھلے بندوں اظہار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن عوام کے اس احساس اور جذبہ کو اگر صحیح سمت پر نہ موڑا جائے تو ان کے ایک دوسری انتہا پر بہک جانے کا بھی اندیشہ ہے اسی لئے ہمارے ملک کے سمجھ بوجھ رکھنے والے افراد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس جذبہ اور احساس کو تخریب پسند عناصر کے ہاتھوں کھلونا بننے سے بچائیں اور اس کو تعمیری منصوبوں کے لئے مفید بنانے کی کوشش کریں۔ اس کام کی ذمہ داری اور اہمیت اب کچھ اور بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اب ہمارا ملک دستور سازی کے بعد عام الیکشن کے دروازہ تک آپہنچا ہے اور یہ ایک اچھا موقع آگیا ہے کہ عوام اس مصنوعی قیادت کے بوجھ سے چھٹکارا پالیں جو دس سال سے ان کے سروں پر زبردستی مسلط رہی ہے۔

اس وقت ملک کو ایک ایسی سیاسی مرکزیت کی سخت ضرورت ہے جو اسلام کے جامع اور عالمگیر نظریۂ حیات پر یقین رکھتی ہو اور اپنے اس نظریہ کو انسانی عقائد و افکار میں، اخلاق و عادات میں، علوم و فنون میں، ادب و آرٹ میں، تمدن و تہذیب میں، مذہب اور معاشرت میں، معاشی معاملات میں، سیاست اور نظم مملکت میں، بین الاقوامی تعلقات و روابط میں عملاً نافذ کر سکے۔

ایسی سیاسی مرکزیت جب تک ملک میں پیدا نہ ہوگی اس وقت تک ہمارے مصائب کا کوئی حل نہیں نکل سکے گا۔

حق رائے دہی کے صحیح اور جائز استعمال کے ذریعہ ہی ہم اس ناپسندیدہ قیادت کو بدل کر ایک ایسی قیادت کو اوپر لا سکتے ہیں، جو "اجتماعی نفاق" کی پالیسی کو یکسر ختم کردے اور عوام کو بے یقینی کے اندھیروں سے نکال کر یقین و ایمان کے اجالوں میں لے آئے۔

جس دن یہ کام ہو جائے گا اسی دن ہم حقیقتاً آزادی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو سکیں گے، اور اسی دن آزادی کے یہ جشن ہم کو زیب بھی دیں گے

——— محمود فاروقی

پسِ پردہ ——

مِلاوَٹ کازمَانہ

—— کھوجی

پاکستان بنے ہوئے دس سال ہوگئے اور اب ۱۴ اگست سے اللہ رکھے ہماری قومی زندگی کا گیارھواں سال شروع ہو رہا ہے دوسرے معنوں میں بچپن کا زمانہ گذر گیا اور اب لڑکپن کا دور شروع ہوا ہے لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات —— اس دس سالہ زندگی میں پاکستان نے جو کچھ ہونہاری دکھائی ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ برخوردار جب بڑے ہوں گے تو کیسے نہ کیسے کارہائے نمایاں انجام دیں گے۔

اس دس سال میں ہم کو کچھ ملا ہو یا نہ ملا ہو لیکن ایک نکتہ کی بات ایسی ملی ہے جس کا کوئی مول نہیں اور وہ یہ انکشاف ہے کہ —— "گدھا مرچ نہیں کھاتا" ہاں صاحب یقین کیجئے گدھا ہرگز ہرگز مرچ نہیں کھاتا۔ چنانچہ لاہور کے ایک گدھے نے ایک دوکاندار کی مرچ کھالی، اس پر دکاندار اور گدھے والے میں بڑا جھگڑا ہوا اور فوجداری ہوتے ہوتے رہ گئی۔ گدھے والے کا کہنا تھا کہ گدھا مرچ نہیں کھاتا اور دوکاندار مصر تھا کہ گدھے نے مرچ کھائی ہے۔ آخر کار معاملہ تھانہ میں پہنچا اور بعد از تحقیق مقدمہ کی نوعیت کچھ اس طرح بنی کہ —— گدھا مرچ نہیں کھاتا اگر گدھے نے مرچ کھائی ہے یا تو گدھا گدھا نہیں یا مرچ مرچ نہیں۔ ماہرین نے پوری طرح پرکھ کر بتایا کہ گدھا اول و آخر حسباً و نسباً اصلی گدھا ہے البتہ مرچ مرچ نہیں بلکہ رنگدار برادہ ہے اسی لئے گدھے نے مرچ نہیں بلکہ برادہ کھایا ہے۔ چنانچہ گدھے کو تو باعزت طریقہ پر الزام سے بری قرار دیا گیا اور مرچ والے کا سر قانون کی اوکھلی میں دیدیا گیا۔

قانون نے تو اس گدھے کو خالص اور اصلی گدھا قرار دیا لیکن یہ گدھا اصلی گدھا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس میں سمجھ بوجھ کی بڑی ملاوٹ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اپنی اس ایک حرکت سے اس نے پاکستان کے اچھے خاصے انسانوں کو گدھا بنا کر رکھ دیا کہ وہ انسان تو ہیں لیکن ان کے سر میں عقل کے بجائے بھس بھرا ہوا ہے کہ دس سال سے برابر وہ مرچ کی جگہ برادہ کھاتے رہے ہیں۔ لوگوں کو گدھے کے اس انکشاف پر خواہ کتنی ہی مرچیں لگیں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ہم پورے دس سال سے جن الجھنوں اور مصیبتوں میں گرفتار رہے ہیں وہ صرف ایک چھوٹے سے لفظ کی بدولت جسے عرف عام میں ملاوٹ کہا جاتا ہے۔

"ملاوٹ" —— لفظوں کی دنیا میں بڑا ہی کسان نرم، ملائم، معصوم اور ملنسار سا لفظ ہے۔ چنانچہ ادا کرتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ چپکنے لگتا ہے! اس کی یہ ملنساری پاکستانیوں کو ایسی پسند آئی کہ وہ ہماری پوری زندگی سے بس چپک کر ہی رہ گیا ہے۔ چنانچہ یہ حال ہے کہ ہم اپنے روزمرہ کے چھوٹے بڑے معاملات میں آئے دن اس سے دوچار ہوتے رہتے ہیں —— دودھ والا آپ کے گھر دودھ دے جاتا ہے اور یہ دیکھ کر آپ کا خون کھول جاتا ہے کہ دودھ میں پانی نہیں بلکہ پانی میں دودھ ملا کر دیا گیا ہے، آپ بڑے اعتماد کے ساتھ گھی کا ٹِن خرید کر لاتے ہیں اور یہ انکشاف آپ کو جھنجلا دیتا ہے کہ اوپر اوپر تو گھی ہے اور اندر میاں ملاوٹ پانچوں انگلیاں گھی میں ڈالے بیٹھے کھلکھلا رہے ہیں۔ اب آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ آپ اپنا سر کڑھائی میں ڈالے اسلامی دستور کی دہائی دیتے رہیں۔ آپ کے گھر راشن کا آٹا آتا ہے اور روٹی ربڑ کی طرح کھنچتی چلی جاتی ہے اور اسی مناسبت سے آپ کی آنتیں کھنچ کر رہ جاتی ہیں کیونکہ ہر لقمہ میں میاں ملاوٹ قومی ترانہ الاپتے ہوئے نظر آتے ہیں —— غرض یہ ملاوٹ

کی لگاوٹ ہے کہ کوئی چیز ایسی دستیاب نہیں ہوتی جو خالص ہو اپنے اصلی اجزاء کا مرکب ہو بلکہ ہر چیز نقلی، بناوٹی اور ملاوٹی نظر آتی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ آپ کی اور آپ کے اہل خاندان کی صحت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ دوا دارو پر روپیہ خرچ ہو رہا ہے لیکن دوائیوں اور انجکشنوں پر بھی بھروسہ نہیں رہا ہے اور برابر یہ شبہ رہتا ہے کہ ان میں بھی ملاوٹ کی گئی ہے۔

یہ معاملہ صرف دودھ گھی اور آٹے دال تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا وبائی مرض ہے جو زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں زہر کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ صرف تجارتی ذخیروں اور مال گوداموں ہی میں نہیں بلکہ اسمبلی کے ایوانوں میں حکومت کے دفتروں میں سیاسی کانفرنسوں میں سماجی محفلوں میں ادبی اور تعلیمی اداروں میں ہر جگہ ہر مقام پر ملاوٹ کے اس نسخہ پر عمل کیا جا رہا ہے اور ہمارے لیڈر، سیاست داں حکومت کے سربراہ، عوام کے نمائندے اہل قلم اور ادیب سب کے سب ایک نفع خور لالچی تاجر کا پارٹ ادا کر رہے ہیں اور ملاوٹ کی پالتو بلی میاؤں میاؤں کرتے ہوئے ان کے آگے پیچھے دوڑ رہی ہے۔

حالانکہ پاکستان بنا ہی اس تصور پر تھا کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ کسی قسم کی ملاوٹ منظور نہیں تھی انھوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ رکھنے کے لئے ہی پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ لوگ ملاوٹی تعلیم، ملاوٹی دستور، ملاوٹی انتخاب، ملاوٹی گورنمنٹ اور ملاوٹی شریعت کی خوبیوں کے فلسفے بیان کر رہے ہیں اور جو لوگ ملاوٹ کے خلاف ہیں ان کا منہ چڑھانے پر اُتر آئے ہیں۔

تاریخ میں انسانی زندگی کے پہلے دور کو "پتھر کا زمانہ" اور دوسرے دور کو "لوہے کا زمانہ" کہا جاتا ہے تیسرے دور کا نام ابھی ہمارے مورخین نے طے نہیں کیا ہے۔ کوئی اسے "ربر کا زمانہ" کہتا ہے کوئی "تیل کا زمانہ" اور اب بیشتر لوگ اسے "ایٹم کا زمانہ" کہنے لگے ہیں دنیا بھر میں اس زمانہ کو لوگ خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ پاکستان میں نہ ربر ہے نہ تیل اور نہ ایٹم، اس لئے یہ سب زمانے یہاں نہیں چل سکتے، یہاں تو صرف ملاوٹ ہی ملاوٹ چلتی ہے۔ جو پوری دس سالہ قومی زندگی میں گھل مل کر پاکستان کے معاشرے کا ایک امتیازی وصف بن چکا ہے۔ اسی لئے ہمارے مورخین کو چاہیئے کہ وہ پاکستان کی تاریخ لکھتے ہوئے اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز نہ کریں اور اس پورے عرصہ کو "ملاوٹ کا زمانہ" قرار دے کر آگے بڑھیں۔ اگر ہماری قومی اور ملکی تاریخ کو اس بنیادی حقیقت سے ہٹا کر کسی اور طرح مرتب کیا گیا تو ہماری ساری تاریخ غلط ہو کر رہ جائے گی۔

فکر و نظر

تاریخ اور آدمِ نو

پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی
مترجم : وکیل احمد بیدل

پروفیسر آرنالڈ جے ٹائن بی اس دور کے تاریخ دانوں میں قائدانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف ..... A STUDY OF HISTORY ہے جو دس جلدوں میں ہے۔ پیش نظر مضمون ان کے ایک بہت ہی مشہور مضمون کا ترجمہ ہے۔ اس مضمون میں اگرچہ مغربی فکر غالب ہے اور صاحب فکر مغرب سے پرے جھانک بھی نہیں سکے ہیں پھر بھی یہ اپنی افادیت کے لحاظ سے اہم ہے۔ وہ لوگ جو مغرب کی مادی ترقی سے مرعوب ہیں اور اس کی نری نقالی ہی میں اپنی نجات سمجھتے ہیں ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے اس مضمون میں بہت کچھ مواد موجود ہے۔ خدا بیزار تہذیب کتنی بودی اور لچر ہوتی ہے۔ آج اہل مغرب کے مفکرین اس کی تباہیوں کو دیکھ کر کانپ رہے ہیں لیکن اس سے نکلنے کی کوئی صورت انہیں نظر نہیں آتی۔ کاش اسلام کی صحیح روشنی ان تک پہنچ جاتی۔ عبارت میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے کہیں کہیں تصرف کیا گیا ہے جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ (و۔ا۔ بیدل)

جدید انسان مثل پانسہ باز POKER PLAYER کے ہے۔ وہ بازی لگائے جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا بینک اکاؤنٹ پیشہ زندگی اور دوسری ساری چیزیں اس کی نذر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور وہ تذبذب کا شکار رہتا ہے۔ کامیابی کی موہوم تمنا ہر وقت اس کے دل میں گدگدی لیتی رہتی ہے لیکن وہ یقین سے محروم رہتا ہے یہاں تک کہ اسے اپنے پتوں اور ہنر پر اعتماد نہیں رہتا کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اسے کامیابی سے کب ہمکنار ہونا ہے۔ اگر اسے علم نجوم پر یقین ہوتا ہے تو وہ فال گر سے منتیں کرتا ہے کہ انہیں ستاروں کے بداثرات سے مامون کر دیں اور اسے بتا دیں کہ کب اس کی قسمت کا پانسہ پلٹے گا۔ اس کے خیال میں کھیل میں کامیابی کا انحصار قسمت پر ہے۔

آپ پچھلی تاریخ پر نظر کریں، آپ دیکھیں گے لوگ اس وقت بھی سڑکوں سے گزرتے تھے۔ گذرگاہوں کے قواعد کی پابندی انہیں بھی کرنی پڑتی تھی۔ اگر فرق ہے تو صرف اتنا ہے کہ وہ لوگ چھکڑا گاڑی پر اور پیدل سفر کرتے تھے اور ہم اسی میل فی گھنٹہ رفتار والی کار سے سفر کرتے ہیں آج اگر ہماری گاڑی قواعد کی پابندی نہیں کرتی تو خطرے سے دوچار ہوتی ہے اسی طرح وہ بھی قانون توڑ کر زخم اٹھاتے تھے۔ نہ قوانین بدلے ہیں اور نہ سڑکیں بدلی ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جدید انسان اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اس نے صنعت و حرفت میں اس مقام کو حاصل کر لیا ہے جہاں اس کے اسلاف کا وہم بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

صنعتی ترقی بجائے خود عقل و خرد کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ماضی میں جب بھی کوئی تمدن اپنی صنعتی ترقی پر نازاں ہوا تو اس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ خودکشی کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ جب اس نے اس رجحان کو بدل دیا پھر ترقی سے ہمکنار ہوا لیکن یہ بھی صرف اس وقت ہوا جب اس نے ہتھیار پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ رہ گئی۔ اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو یہ بات ابتدائی دور تاریخ میں بھی صحیح دکھائی پڑے گی۔

قدامت میں بسنے والوں میں لور نیولتھک (LOWERNEIO LITHIC) اوزار سے اچھی طرح مرصع تھے۔ لیکن ان کا خاتمہ ان ہی کے ہاتھوں ہو گیا لیکن برخلاف اس کے (UPPER PALAEOLATHIC) عہد کے اوزار بالکل بھدے رہ گئے۔ پھر بھی ان کی تہذیب مذکورہ بالا عہد سے کہیں اونچی تھی..... (MEYANS) جس نے ماضی کے ایک بہت بڑے کلچر کی بنیاد ڈالی ہے دھاتوں کے استعمال سے ناواقف تھے۔ اس کی طرف انھوں نے کبھی خصوصی توجہ نہیں

(۵) لیکن اس کے پڑوسی (MAYAS) مایا اور ازٹکس (AZTECS) دھاتوں کے استعمال میں بہت ہوشیار تھے۔ لیکن ان کی تہذیب بالکل ادنیٰ تھی۔

کیا طاقت گرفت میں آسکتی ہے؟

صرف یہی ایک سوال ہے جو تاریخ میں گردش کرتا ہے اگر کوئی عالمی کامیابی حاصل ہوگی تو پھر کوئی ناکامیابی نہیں۔ کئی تہذیبوں کے مطالعے نے مجھے اس بات پر مطمئن کردیا ہے کہ صرف وہی کلچر مضبوط ہے جو تعمیری ہے۔ جب آپ دیکھیں کہ اقتصادی یا انقلابی تبدیلی کے چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو وہ کلچر پورے اعتماد کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ اس تہذیب کا مستقبل تاریک ہے جو وقت کے اٹھائے ہوئے مسائل کی جواب دہی کی طاقت نہیں رکھتی۔ مختصر یہ کہ یہ اصول بالکل درست ہے۔ مثلاً امریکہ نے پیڈل اسٹیمر (PADDLE STEAMER) ایجاد کیا۔ اور اس ایجاد پر مبہوت ہوگیا اور اس کامیابی کا مستقلاً ڈھنڈورا پیٹنے لگا۔ برخلاف اس کے یورپین قوموں نے اسی دوران میں اسکریو پروپلر (SCREW PROPELLER) کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیدیا۔ معمولی کامیابی ہمارے عمل تجسس کو زیادہ بہتر بنا سکتی ہے۔

آج ہم کو ہماری مشینوں پر حاکمیت نے خطرہ میں ڈال دیا ہے ہم اپنی صنعتی ترقی سے اس قدر حیرت زدہ ہوگئے ہیں کہ ہم نے ... وسیع تر تعمیری کاموں کو نظر انداز کردیا ـــــ شاید انسان کی فطری رغبت ہے۔ اس سے زیادہ تعمیریت کو خشک کردینے والے ذرائع دوسرے نہیں ہیں کہ ہم اپنے ماضی کی کامیابی کی پوجا کرنے لگیں۔ حب الوطنی ایک ادنیٰ سی بات ہے ان وجوہات میں سے ایک یہ کہ ہمارا زمانہ کیوں خطرناک ہے۔ یہ ہے کہ ہم نے اپنی قوم، اپنا علم اور اپنی گزشتہ تاریخ کو بھلا دیا ہے جو آدمی بلا خوف و خطر صرف اللہ کی پوجا کرسکتا ہے اقتدار اعلیٰ ہی انفرادیت اور سوسائٹی کی ترقی کا پہلا زینہ ہے جب ہم اس کو توڑ دیں گے تو ہم ناکام رہیں گے انیسویں صدی نے ایک واضح دلیل اٹلی کی پیش کی ہے ۱۸۴۸ء میں وینس والوں نے آسٹرین شہنشاہیت پر دھاوا کیا۔ ماضی کی شاندار تاریخ کی یاد نے انہیں کچھ دنوں بہادری سے مقابلہ کرایا لیکن آخر میں اپنی ہار مان لی۔ پانڈومنٹوں (THE PIED MONTESE) نے بھی حملہ کیا لیکن ان کا ماضی روشن نہ تھا۔ وہ مقابلہ میں بہادری تو نہ دکھا سکے۔ لیکن دس برس کے بعد وہی پانڈومنٹ تھے جنہوں نے کامیابی حاصل کی۔ اور وینس کو آزاد کردیا۔

دونوں میں کیا فرق تھا؟ پانڈومنٹ ثابت قدم رہے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ ایک تعمیری حقیقت کو رونما دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ حقیقت کیا تھی؟ اٹلی کو متحد کرنا جس کا پہلے کوئی وجود بھی نہ تھا لیکن اس تعمیری جذبے نے انہیں پسپا کرکے بھی شاندار کامیابی سے ہمکنار کیا لیکن وینس والے اپنے شاندار ماضی پر فریفتہ تھے جسے انہیں پھر حاصل کرنے کی تمنا تھی۔ لیکن یہ تمنا کسی تعمیری جذبے کے تحت نہ تھی۔ اور ہر تمنا کا پورا ہونا لازمی نہیں۔ وطن پرستی ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اہل وطن کا ساتھ دیں۔ یہ ہی عصر حاضر کا جذبہ جس کا وجود انقلاب فرانس سے قبل برائے نام تھا۔ ان زمانوں میں لوگ خدا پرست تھے۔ وہ ملک کو وہی محدود وفاداری (LOYALTY) پیش کرتے تھے۔ جیسا کہ آج ہم سب سرکار کو پیش کرتے ہیں ٹیکس ادا کرتے تھے اور اپنا ووٹ بھی ڈالتے تھے لیکن (STATE) کو اپنا صاحب یا حکمراں نہیں بناتے تھے۔ حب الوطنی (PATRIOTISM) نے آج مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ میرے خیال میں یہ بہت ہی برا بدل ہے۔ ہٹلر اور مسولینی نے حب الوطنی کو منطقی حیثیت دے کر اسے انتہا پر پہنچا دیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اسٹیٹ شہریوں سے ہر طرح کی وفاداری کا مطالبہ کرسکتی ہے ان دونوں لیڈروں نے اپنے شہریوں کو مجبور کیا کہ اپنے ماضی کو محبوب بنائیں۔ اس کے لئے مسولینی نے جدید اٹلی کو روم حکومت کا محور بنایا اور ہٹلر نے والہالا (VAL HALLA) کے دیوتاؤں کو مرکز بنایا۔ مگر جدید ممالک کے تمام شہریوں نے اس لعنت میں حصہ لیا۔ تعصب حب الوطنی جس کو آج ہم نے سند قبولیت بخش دی ہے۔ یہ بربادی کا اور خطرناک قسم کی بت پرستی ہے۔ (IDOLETRY) میں اپنے مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ سائنس شاید ہمارے موجودہ مسائل کا جواب دے سکے۔ صنعت کاری کے چیلنج کا جواب ہماری موجودہ سائنٹیفک ترقی ہے اور بہترین جواب ہے لیکن ہمارے موجودہ مسائل جن کا ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ اس قسم کے نہیں ہیں جن کا حل لیبارٹری (LABORATORIES) میں حل ہوسکے۔ وہ ہیں اخلاقی مسائل ـــــ اور اخلاق سے سائنس کا تعلق؟

۱۹۶۰ء کا چیلنج صاف ہے۔ ہم کس طرح فطری طاقت کا استعمال کررہے ہیں جسے سائنس نے ہمارے لئے حاصل کیا ہے۔ اگر ہم اس مسئلہ کو قدیم سائنس کے علم سے حل کرنا چاہیں گے تو ہمیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس میں کامیابی بھی شاید مشکل ہی ہو مگر (POLYNESIANS) جہاز رانی میں ماہر ہونے کے باوجود ... (SPARTANS) سپہ گری اور خانہ بدوش (NOMADS) گھوڑے پالنے میں۔ ہر ایک اپنے فن میں یکتا ہونے کے باوجود گرفتار بن گئے اور

لیکن آج ان کو دنیا کی صورت سے ایک سبق ہے لیکن وہ اس سلسلہ ان سے نئی تعمیری کوشش کا مطالبہ کیا گیا جس سے مطالبہ پیدا کر سکے۔ تبھی ان کا پورا ترقی کر سکتا

قوم پرستی ایک تہدید ہے

تاریخ بتاتی ہے کہ وہ تہذیب جس نے فوجی طاقت کا سہارا لیا آخر گئی۔ فن سپہ گری فتح کا ذریعہ تو بن سکتا ہو لیکن وقت کے مسائل کا حل اس کے بس کا روگ نہیں۔ چنگیز، تیمور، اتھنس کے جاگیردار، برطانیہ کے پارلیمنٹ سب کے سب ناکام رہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ انہوں نے صرف ایک چیز پر نظر رکھی اور وہ تھی عسکریت۔ ان کا خیال تھا کہ ہماری فوجی طاقت ہی ہر حال میں ہماری معاون و مددگار بن سکتی ہے۔

زندگی کوئی سہل چیز نہیں۔ کامیابی کا صرف ایک ہی اصول مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کا ہر مطالبہ فرد اور سوسائٹی سے نئی ذمہ داری کا خواہاں ہوتا ہے۔

لیکن انسان سست واقع ہوا ہے وہ نئے حل کی تلاش پسند نہیں کرتا۔ جب کہ اس کے پاس پرانا حل موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جدید انسان کے لئے یہ دشوار ہے کہ وہ دنیا کے مسائل کا حل مادی سہاروں سے الگ ہو کر سوچ سکے۔

مادی ترقی نے دوسرے میدانوں میں بڑی کامیابی دکھائی ہے۔ سمندروں کو چھان ڈالا، طوفانوں پر قابو پا لیا، یقیناً سائنس کی مدد سے ہمارا بچہ ہمارے لئے دنیا کو گلزار بنا سکتا ہے لیکن اشیاء کے تجزیہ سے سیاسی مسائل کا حل نہیں نکل سکتا۔ یہ خیال رکھنا کہ ہمارے مسائل کا حل سائنس کا کوئی اسپیشلسٹ دے سکتا ہے، ایک خطرناک ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ انسان اپنے کنٹرول کرنے کا فن حاصل کرنے میں بہت ہی پست رہا ہے۔

دنیا کے اتحاد کے مسئلہ کا ادنیٰ سا حل بھی ممکن ہوتا ہم اپنے تمام فضلا کو اس کی نذر کر سکتے ہیں لیکن ایسا ممکن بھی ہو۔ جیسا کہ حقیقت ہے کہ یہ مسئلہ جدید انسان کی روحانی تبدیلی چاہتا ہے اس کام کو ہمیں کسی سول سروس کلاس کے ہاتھ میں نہیں دینا ہے۔ یہ کام ہم سب کو خود کرنا ہے۔ اسی کام سے ہماری امیدوں کو سہارا ہے ——— لیکن یہ روحانیت کی نشاۃ ثانیہ ایسی ہو کہ ہر بڑا متمدن اس میں برابر کا شریک ہو۔

اس تبدیلی کے لئے ہمیں ایک بات پر دھیان دینا ہوگا۔ اور وہ یہ کہ ان بتوں مثلاً مشینری (MACHINARY) قومی جھنڈا، اقتصادیات، اور بذات خود سائنس کی پوجا بند کرنی ہوگی۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے جتنا ہم انسانی تجویزوں کا سہارا لیں گے ہمیں اس سے نکلنا دشوار ہوگا۔ ہر زمانہ میں افراد کو خدا کی حاکمیت تسلیم کرنے میں نرالی قسم کی دشواری ہوتی رہی ہے۔ جو لوگ اعلیٰ قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ حب الوطنی ترک کر کے عام سطح پر آ کر عالمی حکومت کے قیام میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

لیکن ہمارے لئے چوتھی، تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح کے یونانی اسٹیٹ میں ایک نمونہ ہے۔ اگر اس کو ترقی دی جائے تو ہماری سیاسی فیڈریشن کی ضرورت کو پوری کر سکتا ہے۔ ان کے سامنے بھی وہی ضرورتیں تھیں جو آج ہمارے سامنے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے بھی تجارت کو خوب فروغ دے لیا تھا۔ انکی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کا ایک دوسرے پر اقتصادی انحصار ٹھیک آج ہماری بین الاقوامی تجارت کے طور پر تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے سیاسی اتحاد ضروری تھا۔ سینکڑوں سال تک یونان کے عقلا نے کوشش کرتے رہے کہ فیڈریشن کے لئے کوئی اصول مرتب کریں لیکن ناکام رہے۔ کیوں؟ اپنے وطن پر فخر کی وجہ سے اتھنز والے اتھنز کے ماضی پر ... پرانے ... نازاں تھے کہ وسیع یونان کو اپنی وفاداری دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور یہی حال کورنتھ اور اسپارٹا کے شہریوں کا تھا۔ یہ وہ شہر تھے جن کا ماضی شاندار تھا جس زمانے میں یونانی اپنے شہروں پر فخر کر کے الگ طاقت منوانا چاہتے تھے۔ عین انہی صدیوں میں کابل، شام، مصر اور اٹلی میں فیڈریشن کا مسئلہ کفایت سے حل ہو رہا تھا۔

ہمیں ان بت پرستیوں کو چھوڑنا ہوگا۔

یہ حکومتیں پرانے یونانی شہروں میں حل گئیں کیوں؟ اس لئے کہ ان نئے شہریوں کے پاس مسحور کرنے والی شاندار تاریخ نہ تھی۔ وہ اس لائق تھے کہ وقت کے مسائل کا صحیح حل نکال سکتے تھے۔ ان کا ذہن آبا پرستی سے خالی تھا۔ ان کا کٹ کر جانا ایسا نہ تھا جس کی وہ پوجا کرتے۔ وہ اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکے

لے گئی تھی۔

آج بھی دنیا کا اتحاد ان طریقوں کے ذریعہ عمل میں لایا جا سکتا ہے جن کا گزشتہ چند صدیوں میں کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں رہا ہے۔
اگر طبعی طاقتیں حب الوطنی کے فرسودہ جذبہ کو پس پشت ڈال دیں۔ اور ان لوگوں سے اشتراک کے لئے تیار ہو جائیں جن کو ابھی وطن پرستی کی چاٹ نہیں لگی ہے تو یہ تجربہ خوش آیند ہو گا۔

دنیا کو اپنے مسائل کا حل مل سکے گا۔ میرا گمان ہے کہ ایسے ملک امریکہ میں فرنچ کناڈینس (FRENCH CANADIANS) اور ایشیا میں چین ہیں۔
عالمی اتحاد یقیناً عمل میں آئے گا۔ کیوں کہ یہ سب کے دل کی پکار ہے۔ اور وہ پر امن رضا کارانہ ذرائع سے آئے گا۔ شرط یہ کہ مجوزہ اتحاد ہر قیمت پر ہماری منزل بنا لیا جائے۔ مثلاً کیشن کش فتح کے ذریعہ یورپ کے اتحاد کو ہم قبول کر سکتے تھے۔ لیکن دنیا کبھی اتحاد کو خریدنا پسند نہیں کرتی جب کہ وہ اس قدر گراں قیمت بھی ہو۔ قدیم دنیا کو رومن حکومت نے امن بخشا تھا۔ لیکن روحانیت کی گرانقدر قیمت پر تلوار کے ذریعہ اتحاد کو تاریخ میں نہ پہلے پسند کیا گیا اور نہ آئندہ خوش آیند حل سمجھا جائے گا۔ یہ بالکل اغلب ہے کہ ایک دنیا بنانے کی جو اصل تڑپ ہم میں پائی جاتی ہے اس کے مطالبات کو پورا کرنے کے ہم ناکام رہیں۔ البتہ میں پورے عزم و یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انسانی برادری کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک انسان خدائے بزرگ و برتر پر ایمان نہ لے آئے۔

ہماری مغربی تہذیب کی بنیاد بھی ان لوگوں کے ذریعہ نہیں پڑی جو اقتصادی و سیاسی اتحاد جیسی حقیر چیزوں کے قیام کی جدوجہد میں لگے رہے۔
یقیناً اپنے مسائل کو حل کرنے کی ہماری حالیہ کوششیں جاری رہی ہیں جو ناکام بھی رہیں۔ اور اس نے ہمارے تمام منصوبوں کو تتر بتر کر کے رکھ دیا۔ محنت کی حفاظت (LABOUR SAVING) کیلئے کل پرزوں کو ترقی دے کر ہم نے ترقی کی بڑی چھلانگ لگائی ہے۔ یہ چیز ہمیں کسی حد تک حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن اس ترقی کا سب سے فرسودہ نتیجہ (OLD RESULT) جو برآمد ہوا ہے وہ یہ ہے کہ آج ہماری عورتیں اتنی مشغول ہیں جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ امریکہ کی بیویاں امور خانہ داری میں توجہ نہیں دے پا رہی ہیں۔ اور وہ پورا وقت دے بھی نہیں سکتیں۔ آج کی عورتوں کو دگنے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ایک گھر کے اندر بیوی اور ماں کی حیثیت سے ایک دفتر اور کارخانوں میں ملازم کی حیثیت سے۔ زمانہ جنگ میں انگلینڈ کی عورتوں کو دوہری محنت ایک عام بات تھی۔ یہ حالت امید افزا نہیں۔
تاریخ میں پریشانیوں کا زمانہ اس وقت آیا ہے جب عورتوں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ پانچویں صدی میں یونان کلاسیکل تاریخ کی انتہائی بلندی پر تھا۔ لیکن عورتیں اندرون خانہ نظر آتی تھیں۔ لیکن سکندر کے بعد جب یہ شہر تتر بتر ہو گئے اس وقت بھی آج ہی کی طرح نسوانی تحریک نظر آتی ہے۔

دوسری بدقسمتی ہمارے دور کی یہ ہے کہ ہم نے سماج کی خرابیوں کا علاج خدا کو نظر انداز کر کے سوچا ہے۔ مشینی دور نے ہمیں ان گنت نقصان پہنچایا ہے۔ آج مکانوں کی بہتات ہوتے ہوئے بھی شدت کی کمی ہے۔ اس نے ہمیں بے روزگار بنا رکھا ہے لیکن ہم محفوظ محنت (LABOUR SAVING) کا ڈنکا پیٹتے ہیں آج کی ناگوار حقیقت یہ ہے کہ مشین ہم پر حکمراں ہے۔ آج یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے اخلاقی قدریں سابق زندگی کے لئے جتنی ضروری تھیں اس سے زیادہ ہمارے لئے ضروری ہیں۔

صنعت کاری سے جو برائیاں آج ہم پر مسلط ہو گئی ہیں۔ اگر ہم عیسائیت پر عامل ہوتے تو ہم ان سے زیادہ مفید کام لے کر ان سے کہیں زیادہ خوش ہوتے ہمیں بہت جلد ضبط مشین کے فیصلہ پر پہنچنا ہے۔

تاریخ کے عظیم فیصلے ہمیشہ اخلاقی ہوتے ہیں۔ ہم صنعتوں کو بھلے برے دونوں کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ حقیقت کا فیصلہ بہر حال کرنا پڑتا ہے۔ قدیم مصر نے جو ترقی کی وہ نیل کے کنٹرول کرنے کے مسئلے کو حل کر لیا اس سے بڑی طاقت اور کامیابی حاصل ہوئی جس سے مصر کے سارے لوگ خوشحال بنائے جا سکتے تھے لیکن اس کے بجائے حکمراں طاقت نے اپنی شہرت کے لئے پیرامڈ (PYRAMIDS) کی تعمیر شروع کی۔ ان لوگوں نے وہی کچھ کیا جو آج ہم کر رہے ہیں۔ ہمیشہ طاقت کا غلط مصرف کیا گیا ہے۔

ہمیں آزادی حاصل ہے　ہم اپنے مفاد کی خواہش سے بچ نہیں سکتے یہ ہر راہ میں مشکل ہے۔ جس بازار پر ہم قابو پاتے ہیں وہ ہماری قسمت

پر اثر انداز ہوتا ہے۔ سائنس کی ہر ترقی کامیابی ہماری روحانی طاقت کے لئے امتحان ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری صنعتی ترقیاں بھی ہماری روحانیت کے لئے روگ بن گئی ہیں۔ ایک دفعہ عالمی تعلیم پر غور کیا گیا کہ اسکے ذریعہ ہی امن و ترقی ہو سکتی ہے۔ ....

ٹھیک بیس برس کے بعد بچوں کی پچھلے پیڑھی کو آزاد اسکولوں میں اپنی مادری زبان میں تعلیم دی گئی اس بے تعلیم کے تجربہ پر اثر ڈالا جب کہ جذباتی نعروں کے ذریعہ اسے عوام میں پھیلایا گیا۔ اکیس تہذیبوں کو دیکھنے پرجن کا میں نے مطالعہ کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انسان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ اچھے اخلاقی فیصلے پر پہنچ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ عالمی نقطۂ نظر سے غور کرے۔ انسانیت سے محبت تاریخ میں ایک طاقت رہی ہے۔ لیکن صرف اس وقت سے یہ ممکن ہوا ہے جب کہ انسان نے اللہ سے محبت کی ہے۔ اور اللہ کی محبت کے طفیل میں انسانیت سے محبت پیدا ہوئی ہے۔ جدید دنیا کی سب سے بڑی ضرورت مادرائی طاقت پر ایمان کو طاقت دینا ہے۔ بغیر اس کے انسان انسان کی تخریب کرے گا۔ اس کی لیبوریٹریاں جو خطرناک ہلاکت خیز ہتھیار پیدا کر رہی ہیں انکی موجودگی میں یہ مشکل ہی سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ خدا سے بیزار رہ کر وہ انسانیت کے لئے مفید ہو سکیں۔ (بشکریہ "دعوت")

مکرم محترم ———

شاشن ری کے دیس میں

اسلامی فکر و نظر کی اشاعت

ذیل میں جنوبی کوریا کی اسلامی جماعت کے چیرمین جناب عبداللہ کم یودو کا ایک مکتوب دیا جا رہا ہے جس میں پاکستانی عوام سے کوریا میں اشاعتِ اسلام اور تعمیرِ مسجد کے سلسلہ میں اپیل کی گئی ہے۔ موصوف کوریا کے نومسلم ہیں۔ اس سے پہلے گوتم بدھ کے پیرو تھے۔ جب سے جنوبی کوریا میں ترکی افواج کا دستہ گیا ہے اس کے امام جناب زبیر کوش نے اسلام کی اشاعت کے لئے بڑی انتھک کوشش کی جس کی بدولت کوریا میں پہلی بار اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی اور پہلی مسجد کی بنیاد پڑی۔ اسلامی فکر و نظر کی اشاعت میں ترکی کے ساتویں بریگیڈ کے امام جناب زبیر کوش کا نام بہت اہم ہے۔ آپ نے بدھ پیرؤوں کو اسلام سے روشناس کرایا، اور بہت سے بدھوں کو مسلمان کیا ہے۔ اب کوریائی عوام تیزی سے اسلام کی طرف لپک رہے ہیں۔

"منشیر" ماہ جون ۵۴ء میں زبیر کوش کا ایک خط شائع ہوا تھا۔ انھوں نے مشرقِ بعید کے اس خطّہ میں ترقیٔ دین کا پس منظر بیان کرتے ہوئے دینی اداروں اور دیگر اسلام پسند حلقوں سے انگریزی میں اسلامی لٹریچر ارسال کرنے کی اپیل کی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر ہند و پاکستان کے چند خیر پسند نوجوانوں نے کتابوں کے چند سٹ "کورین اسلامک ایسوسی ایشن" کے نام روانہ کئے ان کتابوں کے نام یہ ہیں:- (۱) رسالہ دینیات (۲) اسلام کا نظریہ سیاسی (۳) اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے (۴) انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل (۵) اسلامی قانون (۶) اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر (۷) بلاسود بینکنگ (۸) کیا آشتراکیت کمیونزم کا علاج ہے؟

یہ کتابیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، پروفیسر زبیر اور نعیم صدیقی کی تصنیف ہیں۔ عبداللہ کم یودو کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ کوریائی زبان میں کر لیا گیا ہے اور قرآن مجید کے کوریائی ترجمہ کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

۲۰ ستمبر ۵۵ء کو کوریائی نومسلموں کی ایک انجمن سیول میں تشکیل دی گئی تھی اور یہی انجمن اسلامی افکار و نظریات کی اشاعت اور اسلامی تحریک کو پھیلانے کا کام انجام دے رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہند و پاکستان کے اہلِ خیر اور درد مند مسلمان دنیا کے اس کنارے پر بسنے والے اپنے نئے دوستوں اور بھائیوں کا اس کارِ خیر میں ہاتھ بٹائیں اور ان کو یہ ڈھارس بندھائیں کہ زندگی کے اس اندھیرے سے لڑنے اور اُجالا پھیلانے میں وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ دُنیا کے ہر خطّہ میں ان کے ساتھی اور مددگار موجود ہیں۔

(ادارہ)

جناب کِم یُو۔ دو کا مکتوب

P.O. BOX CHUNGRY ANG-RI, SEOUL, KOREA

جنابِ محترم!

اللہ تبارک تعالیٰ سے آپ کی صحت کے لئے عظیم طلب ہے

ماتے ہیں۔

ہمیں آپ کے اس مراسلہ کا پڑھنے کا شرف حاصل ہوا جو کہ آپ نے کوریا میں ترکی بریگیڈ امام جناب زبیری قریح کو ارسال کیا تھا۔ ہمیں آپ کی تحریر کتابیں وصول کر کے دلی مسرت حاصل ہوئی جن کی ہمیں عرصے سے آرزو تھی۔

ہم کوریا کے مسلم اخوان آپ کے اس خلوص کے از حد مداح ہیں جو کہ آپ نے کوریا کی نو زائیدہ اسلامک ایسوسی ایشن کو کتابوں کا غیر معمولی عطیہ ارسال کر کے ظاہر کیا ہے۔

انجمن ہذا کی تاسیس کوریا کے دار الخلافہ سیول میں ۲۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کو کی گئی۔ جس کے ذریعے بہت سے لوگوں کو دین کی دعوت دی گئی لوگوں کے روز افزوں قبول اسلام کی رفتار دیکھ کر ہمیں قوی امید ہے کہ مستقبل قریب ہی میں اسلام یہاں غیر معمولی طور پر ترقی کر جائے گا۔

اسلام کے بلند پایہ عقیدہ کو قبول کرنے کے بعد ہم نے یہ راز پالیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں بے مثال حقیقی رہنمائی اسلام ہی میں ہے۔

اور اب یہ ہمارا پختہ ایمان ہے کہ اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اسلام ہی پر عمل کرنے سے صحیح طور پر زندگی بسر ہو سکتی ہے۔

اس ایمان کی موجودگی میں اب ہم اس ملک میں دین عظیم کی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔

لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے ہم ابھی تک مسجد کی تعمیر سے محروم ہیں اور ہمیں اپنی اس بے چارگی کا از حد ملال ہے۔ چنانچہ اسلامی دنیا سے متعارف ہونے کی بنا پر ہم آپ ہی کے ذریعہ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے اپنی آواز آپ لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس وقت ایک مسجد کی تعمیر ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اور ہمیں آپ لوگوں کی مالی امداد کی ضرورت ہے۔

اللہ پر ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کے بعد کیونکہ ہم عالمگیر اسلامی برادری میں کا جز و بن گئے ہیں۔ ہم نہایت سنجیدگی سے آپ لوگوں سے دست تعاون دراز کرنے کی عاجزانہ التماس کرتے ہیں تاکہ اس ملک میں ہماری اپنی مسجد ہو اور ہم عبادت کر سکیں۔ اس مسجد کی تکمیل پر ہمیں بے پایاں مسرت ہوگی۔ مزید برآں اس ملک میں اسلام کی ہمہ گیر اشاعت کے لئے ہم یہاں کے نو مسلم جوانوں کی مذہبی تربیت کی اشد ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہم کوریا کے تین ذہین ترین نو مسلم کالج گریجویٹوں کو آپ کے ملک بھیجنے کا قصد کرتے ہیں۔ آپ کے ملک کو ہم اسلامی ممالک کی صف میں ممتاز ترین ملت تصور کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنی حکومت کے ذریعہ ہمارے ان طلبہ کی تکمیل کا فریضہ سر انجام دے سکیں تو ہم آپ کے از حد ممنون ہوں گے۔

چونکہ بیں آپ نے ہمیں ہدیۃً روانہ کی تھیں ان کا کوریائی ترجمہ مکمل ہو گیا ہے اور وہ اس وقت زیر طباعت ہیں۔ اسی طرح ہم قرآن پاک کا ترجمہ بھی کوریائی زبان میں کر رہے ہیں۔

ہم آپ سے آپ کی رہنمائی کے متمنی ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں کہ آپ اپنے کوریائی بھائیوں سے تعلقات استوار کریں گے

مخلص :- کم۔ یو۔ وو (عبداللہ)

چیرمین کورین اسلامک ایسوسی ایشن ۹ ۱۳ مئی ۱۹۵۷ء

• ڈاکٹر اریکا لیوشاغ

ہمالیہ کی گود میں انقلابی جدوجہد

"ڈاکٹر اریکا لیوشاغ" ——— ایک جرمن خاتون ہے جو آج کل لندن میں مقیم ہے۔ جس نے سویڈش میڈیکل انسٹی ٹیوٹ (ہیمبرگ) میں "طبعی طریقِ علاج" کی تربیت حاصل کی اور ۱۹۳۹ء میں ہندوستان کے گرمائی شہر شملہ میں سکونت اختیار کی اور مشہور و معروف شخصیتوں کا علاج کیا ——— اور غیر متوقع طور پر اس نے نیپال کے مقدر کی تبدیلی میں بڑا اہم حصہ لیا۔

نیپال سے متعلق ایک دلچسپ حقیقی سرگذشت!

• ترجمہ ——— حسین محمود

بظاہر وہ ایک معمولی ساخط تھا لیکن جب میں نے ۱۹۴۹ء کی اس صبح کو اسے پڑھا تو میرا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ یہ ایک دعوت نامہ کھٹمنڈو جانے اور ملکۂ نیپال کا علاج کرنے کے لئے تھا۔ میں شمالی ہند میں تقریباً ۱۰ سال سے PHYSIOTHERAPHY (طبعی طریقِ علاج) کی پریکٹس کر رہی تھی۔ میرے مریضوں میں بہت سے راجے اور رانیاں تھیں، لیکن ملکۂ نیپال! ——— نیپال!! ہمالیہ کی آغوش میں وہ پُراسرار مملکت۔ ایورسٹ اور انوپنا کی سرزمین، جنگجو گورکھوں کا وطن ——— باہر کی دنیا کے لئے ایک انجانا ملک!

میرے دوستوں نے اس سفر کے لئے جو تنہا عورت کے لئے خطرناک ہو سکتا تھا، مجھے منع کیا ——— کھٹمنڈو "شہرِ ممنوع" تھا۔ جہاں نہ سڑک جاتی تھی اور نہ ریل۔ لیکن میں نے سنی اَن سنی کر دی۔ نیپال میرے دماغ پر سوار ہو گیا تھا اور میں جانتی تھی کہ اگر اس موقعے کو کھو دیا تو عمر بھر پچھتاؤں گی۔

چار دن تک چھوٹی لائن کی ریلوے ٹرین میں میں نے سفر کیا جس نے مجھے تھکا مارا۔ راتیں میں نے ڈاک بنگلوں میں بسر کیں، جہاں فرش پر چوہے دوڑتے اور غسل خانوں میں سانپ رینگتے تھے۔ مزید تین دن میں نے ڈانڈی میں سفر کیا۔ ڈانڈی ایک طرح کی پالکی تھی جسے کہار اٹھائے ننگے پیر برف سے ڈھکے ہوئے پُرخطر راستوں پر چل رہے تھے۔ جس کی دونوں جانب سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں۔ آخرکار ہم وہ چندراگیری پہنچے جو سطحِ سمندر سے ۰۰۰۰ فٹ بلند ہے۔ یہاں سے دور سیاہ اور بیگنی کوہستانی سلسلوں کے درمیان پیالہ نما نشیب میں جگمگاتا ہوا کھٹمنڈو نظر آ رہا تھا ——— کھٹمنڈو جو ایک طلسماتی شہر ہے۔ جس میں سنہری چھتیں، مخروطی گنبد والے مندر، سرخ پگوڈے اور سفید محل سرائیں ہیں۔

شہر کے کنارے ایک سرکاری کار میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے ایک سادہ لیکن پُرتعیش سے مزین بنگلے پر لے جایا گیا جہاں مجھے آستانہ

۵ ماہ تک رہائش رکھی تھی۔ وہاں ۱۲ خادموں کے علاوہ گیٹ پر ایک گارڈ بھی تھا جو گہرے سُرخ رنگ کا صافہ باندھے ہوئے تھا۔ اس کی کمر میں گُرکھوں کی مخصوص ترولی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ میرا ذاتی باڈی گارڈ ہے۔ اس سے میرے پندار کو تسکین ہوئی کیونکہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنا اہم مہمان سمجھا جائے گا۔

دوسری صبح طبیب شاہی مجھے لینے آیا۔ ہم بندو اور لبوترہ مندروں اور منقش کواڑوں والی گلیوں میں سے گزرے۔ گلیاں آگے نکلے ہوئے چھجوں تلے دھندلی دھندلی سی نظر آتی تھیں۔ ان گلیوں سے گزرنے پر بڑی حیرت ہوئی اور بات تھی بھی بڑی حیرت والی —— یہاں نہ معلوم کب اور کیسے ایک ایسا شہر بس گیا تھا جس میں پختہ سڑکیں، بجلی، موٹر کاریں اور بسیں نظر آ رہی تھیں —— ظاہر ہے یہ نظر آنے والی ایک ایک بس، ایک ایک کار، ایک ایک اینٹ، قلیوں کی پیٹھ پر لاد کر اونچے اونچے پہاڑوں سے گزار کر لائی گئی تھی —— لیکن کچھ عجیب عجیب سا لگتا تھا سڑکوں کی زندگی وقت سے بے نیاز سی معلوم دیتی تھی۔ سامان بیچنے والے گوتل کی ٹوکریاں لئے ہوئے قلی اور متبرک گائیں ہر جگہ پائی جاتی تھیں۔

جب ہم ایک عالیشان محل کے قریب آئے تو طبیب شاہی نے کہا کہ ہم پہلے وزیر اعظم کے پاس حاضر ہوں گے۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ مجھے سیدھے مریض کے پاس کیوں نہیں لیجایا جاتا —— !

وزیر اعظم ایک بارعب شخصیت کا مالک بوڑھا آدمی تھا جس کی مونچھیں بڑی بڑی اور نیچے کی طرف بل کھائی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھ سے میری تعلیم، پریکٹس، تجربہ اور میرے ہندوستان میں قیام اور وہاں کے مریضوں کے بارے میں دریافت کیا۔ غالباً وہ میری قابلیت کے متعلق اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔

شام ہوا چاہتی تھی کہ ہم شاہی محل پہنچے۔ مسلح گارڈ نے مجھے اندر جانے کی اجازت دی، میں وہ پہلی مغربی شخصیت تھی جس نے اس سو سال میں اس دروازہ کے اندر قدم رکھا تھا —— محل کے برآمدے میں شاہی خاندان میرا انتظار کر رہا تھا۔ سامنے شاہ تربھون سبز بریکیڈ کے جیکٹ اور جودھپوری برجس کی طرح سفید پاجامے میں ملبوس کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے دو رانیاں، چند شہزادیاں اور کنیزیں تھیں جو سب کی سب سنہری ساڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ میں نے جھک کر نمسکار کیا جس کے معنی ہیں —— "میں آپ کے تقدس کو مبارکباد دیتی ہوں"۔

اعلیٰ حضرت مسکرائے اور خوش ہو کر بولے "یہ نیپالی بول سکتی ہیں"۔ مجھے ہندوستان میں بتایا گیا تھا کہ وہ پانچ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھے تھے اور ۱۳ سال کی عمر میں ان دو رانیوں سے شادی کی تھی جو آپس میں بہنیں تھیں۔ ان کی عمر اب ۴۴ سال کی تھی اور وہ بظاہر ایک حساس، نرم خو اور سیاہ آنکھوں والے آدمی تھے۔ جب ہم لوگ اپنے سفر کی بات کرنے لگے تو ان کی آنکھوں میں اداسی سی جھلکنے لگی اور حسرت آمیز لہجہ میں وہ زیر لب کہنے لگے "میں بھی سفر کرنا چاہتا ہوں میں نے دنیا بہت ہی کم دیکھی ہے!"

اسی وقت طبیب شاہی آدھمکا اور یہ تجویز رکھی کہ میں [illegible] کی مریضہ کا معائنہ کر لوں —— چند ہی دن میں میں نے اپنی مریضہ یعنی اپنی بڑی رانی کو علاج کا پہلا کورس شروع کرا دیا اور پھر بڑی رانی کی زبانی یہ سن کر بڑی خوش ہوئی تھی کہ —— "اب میں اچھی ہو رہی ہوں اور مجھ میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں" ——

علاج کے دوسرے کورس کے دوران بادشاہ سلامت بھی موجود تھے مجھے تعجب تھا کہ انھیں اتنا کم کام کرنا پڑتا ہے۔ میرے خیال کے مطابق کاہل سے کاہل بادشاہ کو بھی کاغذات پر دستخط کرنے ہوتے اور افسروں سے مشورہ کرنا پڑتا ہوگا —— لیکن ان کو کسی قسم کا کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔

جب جانے کا وقت آیا تو مجھ سے ٹھیرنے کی خواہش کی گئی!!

اس کے بعد کے دنوں میں مجھے شاہی خاندان میں زیادہ سے زیادہ نفوذ کے مواقع ملے۔ میں نے رانیوں کو انگلش اور جرمن زبان سکھانا شروع کی اور ان کی حسین ساڑھیوں کے ڈیزائن بنانے میں ان کی مدد بھی کرتی رہی۔ شاہ نے مجھ سے کہا کہ میں انھیں ناچنا سکھاؤں، اور ہم روزانہ ناچ کے ایک ریکارڈ پر ناچتے رہے۔

لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں

شریف گھرانے میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ اعلیٰ حضرت کبھی کبھی بے چین اور غیر مطمئن نظر آتے تھے۔ ان کا دامن، ان کا کیمرہ، ان کی گھڑیوں اور جواہرات کے ذخیرے اور شاہی باغات ——— ان سب میں ان کا وقت گزرتا مگر دل نہ لگتا ——— ایک دن میں شاہ تربھون کے ساتھ چند لمحوں کے لئے تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے جرأت کرکے پوچھا ——— "اعلیٰ حضرت! مجھے بتائیں، کیا سبب ہے کہ آپ کوئی کام نہیں کرتے؟ کیا آپ کو اپنی رعایا کی فلاح و بہبود میں دلچسپی نہیں ہے؟"

وہی غم کے بادل جوان کے چہرے پر میں نے اوّل روز دیکھے تھے پھر چھا گئے۔ کچھ دیر وہ متامل رہے، بالآخر بولے۔ "میں صرف نام کا راجہ ہوں اور کچھ نہیں۔ نیپال میں رانا خاندان ہی اصل حکمران ہے وہی حکومت کرتا ہے۔ تم وزیرِ اعظم سے مل چکی ہو، وہ ایک "رانا" ہے۔ میں ایک قیدی ہوں، میں پانچ مقفل دروازوں میں بند ہوں۔ اور ہر دروازہ پر پانچ گارڈ ہیں۔ یہ میری حفاظت کے لئے نہیں بلکہ مجھے مفرور ہونے سے روکنے کے لئے ہیں۔"

بادشاہ کا اعتماد مجھے ایک دم نہیں مل گیا اور یہ صرف بتدریج ہوا کہ میں نے جوڑ جوڑ کرکے ساری کہانی مرتب کی۔ ۱۸۴۶ء میں فوج کے سپہ سالار نے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا اور اپنے آپ کو وزیرِ اعظم کا لقب دے لیا تھا۔ جب یہ غاصب مرگیا تو حکومت اس کے بھائی کو ملی اور اس طرح یہ ایک رانا سے دوسرے رانا تک ایک سو سال تک منتقل ہوتی رہی۔ ہر سال یہ مستقل اور خود مختار وزرائے اعظم ملک کو لوٹتے رہتے۔ ہر سال یہ ملک کی قلیل آمدنی میں سے ——— ۱,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ اڑا لیا کرتے اور شاہ صرف ۷۰,۰۰۰ پونڈ کا حقدار رہتا۔ اور بقیہ آمدنی میں سے ۲۰,۰۰۰ پونڈ سے زائد کبھی بھی عوامی فلاح کے لئے استعمال نہیں ہوئے

اسکولوں کی تعداد بہت ہی کم تھی اور صرف ۳ فیصدی آبادی خواندہ تھی۔ غیر ملکیوں کو ملک میں آنے سے روکا جاتا تھا۔ کیونکہ اس سے عوام کے خیالات میں انتشار پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔ "رانا" خاندان ذرا سی بے وفائی کے شبہ پر بھی سخت سزائیں دیتے تھے۔ ایک بار ایک شخص کو صرف اس بات پر سزا ملی تھی کہ اس نے ریڈیو پر گاندھی کی تقریر سن لی تھی۔

صرف شاہ کو ضرر پہنچانا ہی ایک ایسا ناپاک کام تھا جس کی ہمت راناؤں کو نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ نیپالی ہندوؤں کے نزدیک وہ وشنو ——— حی و قیوم ——— کا اوتار ہوتا ہے۔

دنیا میں شائد ہی کوئی بادشاہ ہوگا جو اس قدر بے اختیار اور مجبور ہو۔

"میں خطوط نہیں لکھ سکتا کیونکہ جو کچھ میں لکھوں سنسر کیا جاتا ہے": شاہ نے مجھ سے کہا۔ "جتنی کتابیں اور اخبارات میرے لئے آتے ہیں سب سنسر سے گزرتے ہیں۔ مجھے کبھی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا"

اپنے ظالموں کے پنجہ سے ایک ہی بار اسے نکلنے کا موقع ملا تھا۔ جبکہ نوجوانی میں اسے بھارت جانے کی اجازت دی گئی تھی اپنے شاہی بکچے کو اس نے پتھروں سے بھر لیا تھا اور واپسی میں اپنی پسند کی کتابیں بھر لایا تھا۔ انھیں کتابوں سے اس نے تعلیم حاصل کی اور جمہوری حقوق اور اجتماعی عدل کے اُصول سیکھے تھے۔

"اسکول! اسکول!! اسکول!!!" وہ تقریباً چیخ اٹھے۔ "ہمیں لازماً اسکول کھولنے ہیں" ——— ان کا خیال تھا کہ عوام اپنے ووٹ سے نمائندے منتخب کریں، ملک میں سڑکیں ہوں اور صنعتیں قائم کی جائیں۔

نیپال آنے سے پہلے میں نے سیاست میں کوئی دلچسپی نہ لی تھی لیکن اب جب میں نے ان باتوں کے متعلق شاہ سے گفتگو کی تو مجھے یہاں کے عوام کی افسوسناک حالت اور اس جابرانہ حکومت سے جو انھیں غلام بنائے ہوئے تھی۔ نفرت سی ہونے لگی۔ اس سلسلہ میں جوں جوں میری دلچسپی بڑھتی گئی ویسے ویسے میرے علم میں بھی کافی اضافہ ہوا۔

چند آدمی نیپال میں اور کچھ جلا وطن بھارت میں ایسے تھے جو عرصہ سے انقلاب اور جمہوریت کے لئے بے چین تھے لیکن انھیں مدد کی ضرورت تھی۔ اور باہر سے موثر ذرائع کی حاجت تھی جس کا مطلب

تھا کہ بھارت ان کی مدد کرے۔

بھارت کے لئے نیپال ایک فاصل ریاست (BUFFER STATE) ہے کیونکہ یہ ہند اور تبت کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھتی ہے۔ تبت کو اس وقت چینی کیمونسٹ ہڑپ کرتے جا رہے تھے اور کیمونسٹ نیپال میں بھی گڑبڑ مچا رہے تھے۔ تاکہ اس پر بھی اپنا قبضہ جمالیں۔ اگر وہ اس ہمالیائی مملکت پر چھا جاتے تو وہ اس کو بھارت کے خلاف ایک اڈہ کے طور پر استعمال کرتے۔ صرف عوامی حکومت ہی جمہوریت کے بل پر کمیونسٹ خطرہ کا مقابلہ کر سکتی تھی جب کہ مظلوم نیپالی راناؤں سے سخت خوفزدہ اور مرعوب تھے۔

کیا بھارت شاہ تربھون کے ہاتھ مضبوط کرنے میں مدد دے سکتا ہے؟ —— میں نے اس کا جواب حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا میں نے کھٹمنڈو میں بھارت کے تجارتی نمائندہ سے ملاقات کی جو میرا پرانا دوست تھا۔ دوسرے سفراء کی طرح اس نے بھی کبھی شاہ سے اکیلے میں بجز راناؤں کی موجودگی میں ملاقات نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب میں نے اس سے کہا کہ شاہ ملک میں جمہوری حکومت چاہتے ہیں۔

"کچھ نہ کچھ اس سلسلے میں ہو سکے گا" —— سفیر نے مجھ سے کہا اس نے مجھ سے سب سے مشکل کام کرنے کو کہا کہ میں اس کی ملاقات کسی طرح شاہ سے کرا دوں —— شاہی باغات کے ایک کنج میں جہاں راناؤں کے جاسوس نہ پہونچ سکتے تھے۔ یہ اسکیم بنائی گئی۔ بادشاہ نے اپنے شادی شدہ شہزادہ ہمالیہ سے ملنے کی اجازت حاصل کی اور اپنی وائلن ہاتھ میں لئے ہوئے اس طرح گویا وہ شام کی موسیقی کے لئے روانہ ہوا ہے۔ اپنے بیٹے کے باغوں کے ایک کنج میں غائب ہو گیا۔ جب کہ رانا کا مقرر کردہ گارڈ دروازہ ہی پر کھڑا رہا۔

اندر جانے پر اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ ایک پشت کی دیوار پھاندی اور ایک دہان کے کھیت کو پار کر کے ایک کار میں گھس گیا جس میں فرش پر لیٹ کر وہ بھارتی سفارت خانہ پہنچا۔

دو گھنٹہ کے بعد وہ اپنے لڑکے کے محل سے اپنی کار کی طرف چلا۔ بغل میں وائلن کا کیس —— ! یوں لگتا تھا کہ ایک دلچسپ موسیقی کے پروگرام کے بعد تکان دور کر کے نکلا ہے۔

جب اس نے مجھے یہ سب کچھ بتایا تو وہ نہایت خوش اور پرجوش تھا۔ "ہم نے حرکت شروع کر دی ہے، آریکا —— ! اس نے پھر کہا —— "تم ایک ہوشیار لڑکی ہو۔ میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں۔"

چونکہ شاہ اور سفیر کی ملاقاتیں پُرخطر تھیں اس لئے میں ادھر سے ادھر خبریں لیجایا کرتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ سخت خطرناک ہے اور مجھے علم تھا کہ میرا باڈی گارڈ رانا کا آدمی ہے جو میری ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے میں نے یہ احتیاط ضرور کی کہ کبھی کوئی کاغذ کا پرزہ ساتھ نہیں رکھا جو گرفت میں آ جائے۔

جلد ہی سازش ایک خاص صورت اختیار کرنے لگی۔ بھارت میں بااثر نیپالی حلقوں نے اپنی قوت نیپالی کانگرس (جو دستوری شہنشاہیت کا مطالبہ کر رہی تھی) کے سایہ میں مجتمع کرنی شروع کر دی تھی۔ خود نیپال میں شاہ کے کئی وفادار ساتھی تھے لیکن پھر بھی وہ محسوس کرتے تھے کہ وہ کوئی ایجابی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ جب تک کہ بھارت کی مدد کا واضح یقین نہ ہو جائے۔

اسی دوران میں اچانک یوں ہوا کہ سرجیت سنگھ بھارتی سفیر کی واپسی کا حکمنامہ آ گیا —— شاہ بہت رنجیدہ تھے۔ لیکن نیا سفیر سی۔ پی۔ این سنگھ بھی ہمارے لئے ہمدرد ثابت ہوا۔ میں نے اس سے پہلی ہی ملاقات میں محسوس کیا کہ وہ ہماری اُمیدوں سے آگاہ ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ چلو تنہا پکنک پر چلیں۔

پکنک پر میں نے سفیر سے کہا کہ ضرورت ہے کہ شاہ کو اس بات کا اطمینان دلا دیا جائے کہ اگر انھوں نے راناؤں کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تو بھارت ان کا ساتھ دے گا۔ اس سلسلہ میں نہرو کا ایک ذاتی خط حاصل کرنا ضروری تھا۔ جلد ہی ماسٹر سنگھ بھارت گئے یہ کہہ کر کہ وہ ایک رشتہ دار کی موت کے سلسلہ میں جا رہے ہیں۔ لیکن خفیہ مقصد یہ تھا کہ نہرو کو شاہ کی اسکیم سے آگاہ کیا جائے اور خط حاصل کیا جائے۔

اس دوران میں کھٹمنڈو میں میرے قیام کا زمانہ ختم ہو رہا تھا،

ں سے قبل رانی سکے مزید معالجہ کی بنا پر میرے ویزا میں ۳ ماہ کی
یت کا اضافہ کیا جا چکا تھا۔ اور اب وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکی
ی۔ اس لئے میرے مزید قیام کے لئے کوئی بہانہ نہیں رہا تھا۔

مجھے وہاں اپنا آخری دن اچھی طرح یاد ہے ——— پورا
وان خانہ، پیانو اور ساری میزیں ان تحائف سے اٹی ہوئی تھیں جو
اہ اور رانیوں نے دیئے تھے۔ سب پر مرا نام "اریکا" ثبت تھا،
ر وہ سب چاندی اور سونے کے ورقوں میں لپٹے ہوئے تھے سب سے
یادہ خوبصورت سونے کے وہ کنگن تھے جنھیں شاہ نے خود میرے
تھوں میں پہنائے تھے۔

"اتنے زیادہ، یہ سارے تحفے" ——— میں نے کہا ———
یں کس طرح شکریہ ادا کروں"۔

"بھارت میں تم ہر اس آدمی سے ملو اور اسے بتاؤ جو ہماری مدد
کتا ہے ——— شاہ نے مجھ سے کہا، پھر مجھے وہ ایک جانب
ے گئے اور میرے ہاتھ میں ایک کاغذ تھما دیا جس پر ایک کوڈ (Code)
کلیدی تحریر درج تھی جس کے ذریعہ ہم مراسلت کر سکتے تھے۔ یہ ایک
سان کلیدی تحریر تھی جیسے ——— رانا کے لئے سانپ، نہرو
کے لئے سفید چڑیا اور خط کے لئے پھول کے لفظ قرار دیے گئے تھے۔

جب میں بھارت واپس آئی تب شاہ نے مجھے لکھا کہ نہرو کا
ط آگیا تھا میں نے نیپال میں جو آخری کام کیا تھا۔ وہ یہی تھا کہ شاہ تک
کو خط کے پہنچ جانے سے متعلق ایک سکیم بنا دی تھی۔ سارا کام اسکیم
ے مطابق انجام پایا۔ مسٹر سنگھ نے شاہی کی سیر کی اجازت لی۔ وہاں
ن کا شاہ نے استقبال کیا۔ جب کہ رانا کا آدمی موجود تھا لیکن چالاک
ے چالاک گارڈ کی توجہ بھی ہٹائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح وہ خط شاہ
ے حوالہ کر دیا گیا ——— شاہ نے مقررہ تحریر میں مجھے تھوڑی بہت
طلاع دی ——— مطابق سانپ میں اور ڈاکٹر کا پھول دے گیا"۔

——— انھوں نے لکھا ایسی عبارت میں جس کی تشریح کی ضرورت
تی۔ انھوں نے پھر لکھا ——— "تم جس نے تخم ریزی کی اور
ر پورے کی نگہداشت کی میں تمہارا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں"۔

۶ نومبر ۱۹۵۰ء کی صبح شاہی کاروں کا ایک قافلہ کھٹمنڈو کے
ارد گرد پہاڑیوں میں شکار کی غرض سے روانہ ہوا۔ موٹر خود اعلیٰحضرت
اور پرنس مہندرا چلا رہے تھے۔ جن کے پیچھے محافظ دستہ تھا۔ اس انتظام
کے ساتھ کہ محافظ کو شبہ نہ ہو ناشتہ کے بٹوے جواہرات سے بھرے گئے
تھے۔ راستہ بھارتی سفارت خانہ ہی سے گذرتا تھا۔ جیسے ہی شاہی
پارٹی نمودار ہوئی سفارت خانہ کے دروازے فوراً کھل گئے اور یکلخت
موٹریں اندر داخل ہو گئیں۔ محافظوں کو ان آقاؤں کے پاس اس اطلاع
کے ساتھ لوٹا دیا گیا کہ اب شاہی خاندان بھارتی علاقہ میں محفوظ ہے۔

طیش میں آکر وزیر اعظم نے بھارتی سفارت خانہ کا فوجی محاصرہ
کرلیا لیکن آخر کار بین الاقوامی قانون اور بھارتی قوت کے آگے اسے
جھکنا پڑا۔ اور شاہ مع اپنے خاندان کے بحفاظت نئی دہلی پہنچ گئے۔ دہلی
آنے کے بعد شاہ تربھون علانیہ باغی گروپ سے مل گئے۔ اس کے
بعد نیپال میں ایک کامیاب بغاوت اور بھارت کے موثر اقدام اور
مداخلت کے نتیجہ میں راناؤں کے منحوس دور کا خاتمہ ہو گیا۔

ایک سو چھ دن کی جلاوطنی کے بعد شاہ تربھون کھٹمنڈو واپس
ہوئے اور وہاں ایک مفاہمت کے نتیجہ میں۔ انھوں نے ایسی مخلوط
وزارت کی سربراہی قبول کرلی جس میں وزیر اعظم بھی شامل تھا۔

ایک سال بعد میں شاہ کے بلاوے پر دوبارہ نیپال گئی ابھی تک
ملک میں استحکام پیدا نہیں ہوا تھا لیکن مجھے ان کا مسرت سے جگمگاتا ہوا
چہرہ اب تک یاد ہے جبکہ انھوں نے مجھے ایک خط دکھایا ——— میں
چاہتا تھا کہ سب سے پہلے تمہیں دکھاؤں" ——— یہ وزیر اعظم
کا استعفیٰ تھا۔

عیش اور کاہلی کا زمانہ رخصت ہو چکا تھا۔ شاہ کی میز نقشوں
اور کاغذوں سے اٹی ہوئی تھی۔

کچھ ہی عرصہ بعد میں بھارت سے رخصت ہو کر لندن میں اقامت
پذیر ہو چکی تھی۔ اوائل سنہ ۱۹۵۴ء اعلیٰحضرت نے خط لکھا اور مجھے
ایک طویل دورہ پر نیپال بلایا۔ اس کے لئے اکتوبر کا حق طے کیا گیا
لیکن اس کو ملتوی کرنا پڑا۔ کیونکہ اس دوران میں شاہ عارضہ قلب میں
مبتلا ہو گئے تھے اور وہ علاج کے لئے سوئٹزرلینڈ جا رہے تھے
وہ ۱۳ مارچ کو زیورچ کے ہسپتال میں انتقال کر گئے

بقیہ صفحہ ۸۸ پر دیکھئے

ماہر القادری

آزادی کی جوالا

ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار
آزادی کی جوالا بھڑکی دیس میں چاروں اور
چوروں کو مت جانے دیجیو شور مچا تھا شور
تھر تھر، تھر تھر، کانپ رہی تھی انگریزی سرکار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

بھیس بدل کر چھپتے دیکھے، کتنے صاحب لوگ
لندن کے شاہی محلوں میں سوگ بپا تھا سوگ
برکھا رت میں جیسے کوئی گرتی ہو دیوار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

لاٹ پادری، کرنل، جرنل، لفٹنٹ اور کپتان
ایک اک کی سٹی گم تھی، غائب تھے اوسان
کب تک آخر چلتا رہتا دھوکے کا بیوپار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

ہرن کے بچے شیر ہوئے تھے اور نیولے باز
جنگ کا نقارہ بجتے ہی توڑ دیئے تھے ساز
گوروں نے کالوں کے آگے ڈال دیئے ہتھیار
پھول کی پتی بن جاتی ہے ایسے میں تلوار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

ہرتی بازی دیکھ کے اپنی چال چلا انگریز
سازش کا رُخ بھی کچھ بدلا اور بنایا تیز
رشوت دیکر، لالچ دے کر توڑ لئے سردار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار

اپنوں نے غیروں سے ملکر کھول دیئے سب بھید
ملاحوں نے کشتی میں خود ڈال دیئے تھے چھید
توڑ جوڑ کا شیش محل تھا دلی کا ..... دربار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

شاہ ظفر قلعہ سے نکلے چھوڑ کے تخت اور تاج
مرتے مرتے پھر اُٹھ بیٹھا ہائے فرنگی راج
اَدھ بھر میں جب نیا پہنچی ٹوٹ گئی پتوار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

پڑیں میں بارود کے بدلے راکھ بھری تھی راکھ
نا بچاری بھی کیا کرتی بگڑ گئی جب ساکھ
غداروں نے سازش کر کے جیت بنا دی ہار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار

روں نے سنگینیں لے کر وار کئے بھرپور
دلے چھوٹے پھول سے بچے زخموں سے تھے چور
گھوڑوں کی ٹاپوں نے روندی مغلوں کی پھلوار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

ں میرٹھ، جھانسی، پلول اور فریدآباد
ے ایک بستی میں پہنچے، قاتل اور جلاد
پھانسی گھر آباد ہوئے، ویران ہوئے گھر بار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

ہ گو جن جن کے مارے داد نہ کچھ فریاد
انسی کے پھندے لے لے کر ٹوٹ پڑے صیاد
کیسی بھاگم بھاگ مچی تھی، کیسی مارا مار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

ن ستاون نکلا آخر کتنا خوش انجام
قربانی رفتہ رفتہ آئی ہمارے کام
بھیج کے چھوڑا افرنگی کو سات سمندر پار

.. ..

طورِ آزادی کا جلوہ ہے یہ پاکستان
جس کی بنیادوں میں شامل سنت اور قرآن
جس کے کانٹے پھول سے اچھے جس کے بن گلزار

.. ..

شاہ ظفر کی روح نے باہر بھیجا ہے پیغام
پاکستان کے رکھوالوں کو اور جنتا کے نام
سانٹھ گانٹھ سے توڑ جوڑ سے رہنا تم ہشیار

.. ..

بغلی گھونسے جانے کر دیں کس دن چھپکر وار
چوک نہ کرنا، ہر دم رہنا چوکس اور تیار
جو ہیں دھن دولت کے ساتھی وہ ہیں کھسکے یار

.. ..

لال قلعہ کے تم وارث ہو، تم ہو خود آگاہ
دلی کب سے دیکھ رہی ہے راہ تمہاری راہ
کب نکلے گی کب چمکے گی خیبر کی تلوار
یہ آنکھیں یہ بھی دیکھیں گی جمنا کے اس پار

۵ عوامی زبان

(تعمیر انسانیت)

محشر رسولنگری •

اسلامی انقلاب

نہ ڈھل سکی نئے سانچوں میں زندگی اپنی　　نہ "دورِ نو" کا یہ ماحول سازگار ہوا
سکون دے نہ سکا "نظامِ جمہوری"　　نہ "اشتراکِ شکم" باعثِ قرار ہوا
ملی نہ "طائرِ جمہور" کو پناہ کہیں　　یہ جس طرف بھی گیا "صیدِ اقتدار" ہوا
جمالِ غرب سے "ظلماتِ جوع" اور بڑھی　　جسے بھی دیکھا طبیعت میں انتشار ہوا
یہ اڑ رہی ہیں فضاؤں میں دھجیاں کیسی　　یہ کس کا "پرچمِ سرخ" آج تار تار ہوا!

ابھی بشر کی خدائی کا ہے شکار انساں　　جدھر بھی رُخ کرو، شعلہ سا اک لپکتا ہے
فریب دے نہ سکی دل کو اشتراکیت　　اس آستین سے اب تک لہو ٹپکتا ہے
صدائیں آتی ہیں "ھل من مزید" کی پیہم　　ہنوز اس کا "تنورِ شکم" دہکتا ہے
چمن کے "آہنی پردوں" سے جھانک کر دیکھو　　فریب خوردہ تہہ دام ابھی پھڑکتا ہے
سسکتی، چیختی، انسانیت کا کیا ہوگا　　ہنوز شعلۂ جوّالہ اک بھڑکتا ہے

یہ صلح و امن و محبت کے خوشنما الفاظ　　فریب و مکر کے رنگین تانے بانے ہیں
یہاں ڈھل کے نکلتے ہیں سینکڑوں چنگیز　　یہ عدل اور اخوت کے کارخانے ہیں
لہو نچوڑ کے پیتے ہیں زیر دستوں کا　　مگر زباں پہ مساوات کے ترانے ہیں
اگرچہ تلخ ہیں اے دوست ان کی تعبیریں　　مگر یہ خواب بہ ظاہر بڑے سہانے ہیں
سمجھ سکے نہ زمانہ اگر تو کیا کہیئے　　ہر ایک گام پہ عبرت کے تازیانے ہیں

یہ ان کی عظمت و سطوت کے پُروقار اعلان　　دل و نظر کی بغاوت دبا نہیں سکتے

یہ تاشقند و بخارا کے لوٹنے والے — نظامِ حق کے مقابل اب آ نہیں سکتے
جو پی رہے ہوں مساوات کا لہو ہر دم — وہ شرق و غرب کے ڈانڈے ملا نہیں سکتے
بھٹک رہے جو فکر و عمل کی ظلمت میں — وہ کوئی شمع سرِ راہ جلا نہیں سکتے
فریبِ "جنتِ شداد" ہو گیا ظاہر — جو اہلِ عقل ہیں دھوکا وہ کھا نہیں سکتے

نظامِ حق کی اذانوں سے گونج اٹھا ہے جہاں — حقیقتوں کا یہ طوفان رک نہیں سکتا
مجاہدوں کی یہ رفتار دب نہیں سکتی — کسی مقام پہ ایمان رک نہیں سکتا
اگرچہ محملِ فکر و نظر گراں ہے بہت — کسی جگہ یہ حدی خوان رک نہیں سکتا
ہزار بند بھی ہوں سامنے تو بہہ جائیں — یہ سیلِ عشق ہے نادان، رک نہیں سکتا
نہ کھا فریب، تقاضائے ارتقا ہے یہی — کہ ایک نقطے پہ انسان رک نہیں سکتا

سرورِ عزم و یقیں میں جرات سویا ہوں — عجیب خواب حقیقت بھی مجھے نظر آئے
فضائیں جھومتی ہیں "پرچم ہلالی" سے — زمیں پہ چاند ستارے ہیں سب اتر آئے
فلک سے چھین لئے ہیں زمیں نے سب انوار — اُدھر کے ڈوبنے والے ادھر اُبھر آئے
نگاہ جن کی سرِ پردۂ ابد تک ہے — بساطِ عشق و رضا پر وہ دیدہ ور آئے
کہاں ہیں ناوکِ مغرب کے آج صیدِ زبوں — جہاں میں دردِ محبت کے چارہ گر آئے

وہ انقلاب جو پہلے بھی آچکا ہے یہاں — اس انقلابِ حقیقت کو کون روکے گا
چھپائیں لاکھ وہ تاریخ کی شہادت کو — نظامِ عدل و اخوت کو کون روکے گا
قدم قدم پہ تصادم ہے عصرِ حاضر سے — اس اقتضائے مشیت کو کون روکے گا
زبانیں کاٹ بھی دوگے اگر بہ فرضِ محال — دلوں کے جوشِ بغاوت کو کون روکے گا

یہ زندگی کے تقاضے بدل نہیں سکتے
نوائے صورِ قیامت کو کون روکے گا

کوثر اعظمی •

آزاد پنچھی

شامِ الم کا گذرا اندھیرا کُنجِ قفس آیا سویرا
جس شاخ پر بھی جی چاہے تیرا
کرلے بسیرا
آزاد پنچھی!
آزاد پنچھی —— آزاد پنچھی

•

اب تو چمن میں آزاد ہے تو آزاد ہے تو، آباد ہے تو
آباد ہے تو دل شاد ہے تو
دلشاد ہے تو
آزاد پنچھی
آزاد پنچھی —— آزاد پنچھی

•

سارا چمن اب تیرا چمن ہے سارا چمن اب تیرا وطن ہے
تیرے وطن میں تیرا چلن ہے
اب تو مگن ہے؟
آزاد پنچھی
آزاد پنچھی —— آزاد پنچھی

تیرے ہی سرو ہیں تیرا چمن ہے تیری ہی نسرین ہی نسترن ہے!
تو ہی بہارِ حسنِ چمن ہے
کیا خوش چلن ہے
آزاد پنچھی
آزاد پنچھی —— آزاد پنچھی

•

تیرے ہی پھول ہیں پھولوں کی ڈالی شبنم کی صہبا، لالے کی پیالی
اپنے چمن کا تو آپ مالی
با وصف عالی
آزاد پنچھی
آزاد پنچھی —— آزاد پنچھی

•

جور و ستم کی ٹوٹی کمانیں اب تو اڑا لے خوشیوں کی تانیں
اونچی فضائیں کر لے اڑانیں
کر لے اڑانیں
آزاد پنچھی
آزاد پنچھی —— آزاد پنچھی

تاج الدین احمد شعر ہاشنگری

نذرِ شہیداں

اخوان کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

• مصر کے جیل میں ناصر کے ظالم کارندوں نے اندھا دھند فائرنگ کر کے تقریباً ۱۵۰ اخوان کو شہید کر دیا •

لٹایا خاک و خوں میں جن کو ظالم عبدِ ناصر نے — خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک طینت پر
یہ بندے تھے سراپا پیکرِ صبر و رضا بندے — نچھاور ہو گئے پروانہ آسا شمعِ وحدت پر
گنہ اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا ان بے گناہوں کا — یقیں رکھتے تھے رب العالمیں کی حاکمیت پر
حکومت چاہتی تھی ہو سیاست دین پر غالب — یہ کہتے تھے خدا کا دیں رہے غالب سیاست پر
وہ طاغوتوں کی جباری سے کیا مرعوب ہو جاتے — نظر رکھتے تھے جو اک قادرِ مطلق کی عظمت پر
سوئے مقتل رواں تھے اور لبوں پر مسکراہٹ تھی — ہزاروں آفریں ان صاحبانِ عزم و ہمت پر
شہادت کی عروسِ مہ جبیں مشتاق رہتی ان کی — ادھر یہ بھی فدا سو جان سے تھے اسکی لطافت پر
قمارِ عشق میں یہ جاں کی بازی بھی لگا بیٹھے — انہیں حق کی رضا مطلوب تھی ہر ایک قیمت پر
صفیں حوروں کی بہرِ خیر مقدم ایستادہ تھیں — یہ گلگوں پیرہن جس وقت پہنچے بابِ جنت پر
جہاں کو ایک اسوہ دے گئے جو حق پرستی کا — خدا کی رحمتیں ہوں ان شہیدانِ محبت پر
یہ مر کر دے گئے اسلام کو وہ پاک خوں اپنا — رہے گی جس کی سرخی تا ابد رخسارِ ملت پر

لٹائے آسماں تابندہ گوہر ان پہ شبنم کے
شفق شام و سحر لا کے چڑھائے ان کی تربت پر

ہزاروں اہلِ حق ہیں آج بھی محبوس جیلوں میں — وہ جیلیں چشمِ گردوں خوں فشاں ہے جن کی حالت پر
ستم ان بیکسوں پر ایسے ایسے توڑے جاتے ہیں — کہ انساں موت کو ترجیح دے ان کی اذیت پر
کوئی اے کاش جا کر عبدِ ناصر سے یہ کہہ دیتا — جری اتنا نہ بن بدبخت یزداں کی بغاوت پر
ہر فرعونوں کی سنت اہلِ حق کو کلفتیں دینا — عمل کب تک کرے گا تو اسی پارینہ سنت پر
تشدد سے کبھی حق کو دبایا جا نہیں سکتا — تجھے ایمان لانا ہی پڑے گا اس حقیقت پر
بہت جلدی بساطِ صورتِ حالات بدلے گی — کبھی رہتا نہیں یہ چرخِ گردوں ایک حالت پر
ابھی یورش جو کی تھی مصر پر اربابِ یورپ نے — یہ غیبی تازیانہ تھا تری خوئے شقاوت پر
رعایا بھی گرفتارِ مصائب ہو ہی جاتی ہے — خدا کا قہر جب گرتا ہے اربابِ حکومت پر

تجھے اب بھی نہ ہوش آیا تو پھر کب ہوش آئے گا
زمانہ سخت حیراں ہے تری نسیان و غفلت پر

فضل احمد کریم فضلی ●

عقدہ کھلا یہ تجربۂ خیر و شر کے بعد
منزل سلامتی کی ہے راہِ خطر کے بعد

گذرے ہوئے تلاطم و طوفاں کا شکریہ
کتنا سکون دل کو ہے اب شور و شر کے بعد

پہلی سی وہ نظر نہ وہ پہلے سے ہم رہے
کیا جانے کیا ہوا ہمیں پہلی نظر کے بعد

وہ رہگذر تو چھوڑ کے ہم آ گئے مگر
دنیا ہی ختم ہو گئی اس رہگذر کے بعد

اے دل بہت دعائے سحر مانگتا تو ہے
مانا سحر بھی ہو گئی۔ لیکن سحر کے بعد؟

کیا کیا نہ کہئے ہم تو گئے تھے وہاں مگر
اب ان سے کیا کہے کوئی نیچی نظر کے بعد

"اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے"
کیسا خلا ہے وحشتِ شوریدہ سر کے بعد

گو رات بھر غریب کے دم سے تھی روشنی
روتا ہے کون مرگ چراغِ سحر کے بعد

یوں بارِ جسم روح نے آخر پٹک دیا
جیسے تھک گیا ہو مسافر سفر کے بعد

اس غمکدے میں موت بھی نعمت سے کم نہیں
یہ ایک راز تھا جو کھلا عمر بھر کے بعد

حد عرصۂ حیات کی شام و سحر نہیں
کچھ اور بھی ضرور ہے شام و سحر کے بعد

جیسے کہ جسم و جاں میں چراغاں سا ہو گیا
محسوس ہو رہا ہے یہ عرضِ ہنر کے بعد

فضلی غمِ حیات کی شوخی و تازگی
آئی مرے کلام میں خونِ جگر کے بعد

(آہنگ)

ادیب سہارنپوری •

ظلمت شام غم ڈھلے تو چلیں
ہم کو اپنا پتہ چلے تو چلیں

وہ گھٹا میکدے کی سمت چلی
ہم بھی ٹھنڈی ہوا چلے تو چلیں

تھک گئے رہروانِ راہِ وفا
اب کوئی تیرا نام لے تو چلیں

قافلے رنگ و نور نکہت کے
منہ پہ غازہ سحر ملے تو چلیں

اب کہاں بادِ تند کے جھونکے
پھر مرا آشیاں جلے تو چلیں

جستجو بے نشانِ منزل کیا
کوئی تازہ دیا جلے تو چلیں

رہروؤں پر نہ جا ادیبؔ کہ یہ
سہل ہولیں جو مرحلے تو چلیں

(ہمایوں)

قمر نسیمی •

قمرؔ آسکا نہ جھکے کبھی سامنے زمانہ
انھیں بجلیوں پہ میری ہے بنائے آشیانہ

تری جستجو میں آخر یہ جنوں ہی کام آیا
نہ سمجھ سکی یہ دنیا مرا ذوقِ والہانہ

تری بے رخی سلامت مجھے کچھ گلا نہیں ہے
مرا ساتھ دے رہی ہے ابھی گردشِ زمانہ

یہ بتاؤ تا بہ منزل مرا ساتھ دے سکو گے
ہر قدم قدم پہ حائل مری راہ میں زمانہ

یہ نظر نظر کی پستی یہ دلوں کی تنگ ظرفی
یہ ہما ہمی کا عالم ہے بزعمِ فاخرانہ

اعظم ادیب ●

○

ساقیا انڈیل بھی دے ایک بار پی جاؤں
تلخیاں نہ جائیں گی گھونٹ گھونٹ پینے سے

یہ کہاں کی دانش ہے یہ کہاں کی آگاہی
شوق ہے شہادت کا پیار بھی ہے جینے سے

اعتبار ـــــ پھر وہ بھی زندگی کی مہلت کا
تم بھی کیا لپٹتے ہو ڈوبتے سفینے سے

ان کا دل جو نازک ہے اپنی بات نازک تر
آئینہ نہ ٹکرائے نازک آبگینے سے

ہو سکے تو ـــــ اے واعظ اسنے کہہ خدا لگتی
بات کرنا آتی ہے تجھ کو ہر قرینے سے

کوئی باغ میں آکر سوز کا سبق پڑھ لے
اب بھی ہوک اٹھتی ہے کوئلوں کے سینے سے

ہم بھی آ گئے آخر ان بتوں کی باتوں میں
ہاتھ کون اُٹھائے اب درد کے خزینے سے

بیدل میرٹھی

دل کی پوری جو آرزو نہ ہوئی
میری رسوائی چارسو نہ ہوئی

رُک گئی آتے آتے بادِ خزاں
گلستاں میں صدائے ہُو نہ ہوئی

اس کا ساحل ہی موجِ طوفاں کی
جس کو ساحل کی جستجو نہ ہوئی

مجھ سے برہم ہیں کیوں خدا جانے
آج تک اُن سے دو بدو نہ ہوئی

کون ہوگا شریکِ غم اپنا
اے محبت جو دل میں تو نہ ہوئی

اک زمانے کی ٹھوکریں کھائیں
پھر بھی تبدیل اپنی خو نہ ہوئی

لاکھ واعظ نے اپنا سر مارا
یہ جبیں تھی کہ قبلہ رُو نہ ہوئی

وہ بھی انسان ہے کوئی بیدلؔ
جس کی دنیا میں آبرو نہ ہوئی

بنت مجتبیٰ مینا

زندگی عشق فسوں گر کا اشارہ بن کر
رگِ ہر سنگ میں رقصاں ہی شرارا بن کر

خامیٔ ذوقِ طلب بڑھ کے ڈرا دیتی ہے
ورنہ ہر موج اُٹھے رنگ کنارا بن کر

کس کا ٹوٹا ہوا دِل تھا جو ذرا دم لینے
آن ٹھہرا تیری پلکوں پہ ستارا بن کر

دِل تو جلتا ہے مگر جان کہاں جلتی ہے
گو نکلتی ہے ہر اک سانس شرارا بن کر

عالمِ یاس میں دِل ڈوب ہی جاتا مینا
دفعتاً یاد تری آئی سہارا بن کر

(عفت)

کوثر نیازی •

نوائے تازہ

نوائے قمری وصوتِ ہزار کی باتیں
چمن چمن ہیں نگارِ بہار کی باتیں

نظر نظر میں تعصب نفس نفس میں فریب
میں کر رہا تھا کہاں حسنِ یار کی باتیں

کسی زباں پہ غمِ داستاں کا قصہ ہے
کسی زباں پہ غمِ روزگار کی باتیں

رہ حبیب میں سود و زیاں کا ذکر نہ چھیڑ
روا نہیں ہیں یہاں جیت ہار کی باتیں

دل و نگاہ میں سرمستیوں کا عالم ہے
مری زباں پہ ہیں کس رہگزار کی باتیں

عالم اکبر آبادی •

حسیں نظر کے اشاروں کو چھوڑ آیا ہوں
بڑے لطیف سہاروں کو چھوڑ آیا ہوں

نہ گل نہ ابر نہ ساقی نہ نم نہ دل نہ شباب
خزاں کے پاس بہاروں کو چھوڑ آیا ہوں

نہ انکی بزم نہ مطرب نہ چاندنی راتیں
میں دل فریب نظاروں کو چھوڑ آیا ہوں

یہ گھن گرج یہ تلاطم یہ ناخدا کا ہراس
نظر سے دور کناروں کو چھوڑ آیا ہوں

وہاں ہیں درد و فغاں آہ و نالۂ و فریاد
جہاں میں درد کے ماروں کو چھوڑ آیا ہوں

وطن کی بات ہے عالمؔ چمن کا ذکر نہیں
میں دردناک نظاروں کو چھوڑ آیا ہوں

پیروڈی ——

پنجۂ عقاب

—— محمد یٰسین

محمد یٰسین صاحب شاعر نہیں ہیں۔ البتہ شاعروں کی مجسم پیروڈی بننے پر قادر ہیں۔ اس ادب پارہ میں اُنھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے آزاد نظم کا خاکہ اڑایا ہے۔ یہ منظوم پیروڈی لطف سے بہر حال خالی نہیں۔

(ادارہ)

واژگوں پنجۂ عقاب ہے اک راز ابھی
نیم پرواز ابھی
خرس قطب شمالی نے بیک جست ندیم
پھاند لی چین کی ناقابل تسخیر فصیل
دیکھتے دیکھتے اب
منجمد ٹھوس سا اک سُرخ سویرا ہوگا
جس کی تابندہ شعاعوں کے طفیل
بے گنت قسمتیں رخشاں ہوں گی
اور مزدور سفارت خانے
پھیل جائیں گے یاں سے واں تک
آؤ مزدور روٹی کھاؤ
واژگوں ——— !

طنز و مزاح

"منکہ ایک کالونی"

عاصی کرنالی

منکہ ایک کالونی ہوں۔ نام غریب پورہ۔ واقع سمت جنوبی مغربی شہر امیرآباد بفاصلہ تین میل۔ آج سے پورے سات قبل ایک بڑے آدمی نے میرا سنگ بنیاد رکھا۔

اے میرے بدنصیب سیاح! شاید اب تجھے نہ وہ سنگ بنیاد کہیں نظر آئے نہ سنگ مرمر کی یادگاری تختی۔ کہ یہ دونوں چیزیں دست بردِ زمانہ کا شکار ہو گئیں۔ تاہم میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ یہ دونوں چیزیں کسی وقت ضرور موجود تھیں۔

اے غیر ملکی سیاح! ہمارے یہاں یہ دستور عام ہے کہ ہر بڑا آدمی اپنے سیاسی شباب کے زمانے میں دس پانچ سنگِ بنیاد ضرور رکھتا ہے۔ پس تحقیق! یہ پتھر کی سل میرے کلیجے پر بھی رکھی گئی تھی ——— تیرے چہرے سے برابر حیرانی سے ٹپک رہی ہے تو غالباً یہ سوچ رہا ہوگا کہ تیرے اردگرد، آگے پیچھے، دائیں بائیں، ہر طرف لق و دق صحرا اور چٹیل سپاٹ میدان بہ کثرت نظر آ رہے ہیں اور خال خال ایک آدھ گھروندا یوں نظر آ جاتا ہے جیسے شب تاریک میں کوئی ٹوٹا تارا۔ یا اونٹ کے منہ میں روایتی زیرہ۔ اتنے بڑے رقبے میں سو پچاس مکان واقعی حیرت کو دعوت دیتے ہیں۔ سو تو حیران ہو۔ تجھے روکتا کون ہے؟ کہ اگر ایسے موقع پر روک دیا گیا تو دماغ کی کسی رگ کے پھٹنے کا ضرور اندیشہ ہے۔ اے دیس بدیس کے مسافر! تو براستہ امیرآباد یہاں پہنچا ہے۔ اسی لئے تجھے یہاں بھی ویسے ہی الف لیلائی محلات دیکھنے کی آرزو ہے۔ الف لیلائی محلات ابھی تو نہیں البتہ ہاں سات صدیوں کے بعد شاید یہاں تعمیر ہو جائیں۔ سو تجھے مرتے وقت اپنی ساتویں آٹھویں پشت کے نام ایک وصیت نامہ ضرور چھوڑ جانا چاہیے کہ اگر اس پشت میں کوئی تیرا نام روشن کرنے والا، سیاحت کے میدان کا مرد، پیدا ہو تو یہاں آئے اور ضرور آئے۔

ثقہ راویوں سے میں نے سنا ہے کہ آج سے پورے سات سال قبل ایک نقشہ میری تعمیر اور آبادکاری کا بنایا گیا۔ میں تجھے اس کا مطالعہ کراتی لیکن اب وہ نقشہ اس دنیائے فانی میں موجود نہیں۔ وہ سامنے کے شکستہ مکان میں ایک پٹواری رہتا ہے۔ نہ معلوم سچ بولتا ہے کہ جھوٹ:۔ وہ کہتا ہے کہ اگر اس نقشے کی زندگی وفا کرتی تو یہاں تعمیر کا وہ وہ طلسم بندھتا اور فنِ آبادکاری کے وہ وہ جوہر کھلتے کہ میں بے چاری، آفت کی ماری، پیرس سے آنکھ لڑاتی اور لندن کو شرماتی۔ لیکن یہ حسن مجھ بھاگوں جلی کے نصیب میں کہاں تھا! وہ موا پٹواری بات بات میں کیسی کیسی سحر بندیاں کرتا ہے کہ نقشے میں لکھا تھا کہ "غریب پورے" کو چار بلاکوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ہر بلاک میں زنانہ، مردانہ، پرائمری اور ہائی اسکول، شفاخانہ، دارالمطالعہ، کتب خانہ، مسجد، سینما، پارک، دکانیں، منڈی، جانے کیا کیا گل و گلزار کھلائے جائیں گے، ایک جامع مسجد، ایک مرکزی کالج، ایک پولیس سٹیشن، نہ جانے نگوڑا اور کیا کچھ واہی تباہی بکتا ہے۔ مجھے تو ساری باتیں سینہ گزٹ ہی معلوم ہوتی ہیں۔ کہ ان میں اگر کوئی صداقت ہوتی تو آج تک ایک آدھ پھول تو میرے ویرانے میں کھلتا اور ایک آدھ تبسم کی لہر تو میرے بے کیف ہونٹوں پر ابھرتی۔

باہمت سیاح! تیرے قیمتی جوتے خاک میں لٹے ہوئے ہیں۔ کاش میں تیرے راستہ میں فرشِ گل بچھا سکتی۔ میں شرمندہ ہوں کہ تجھے کچے اور ریتیلے راستوں سے گزر کر آنا پڑتا ہے۔ کوئی پختہ سڑک تیرے قدموں کو آسائش نہ پہنچا سکی۔ تجھے وہ سامنے، دور، بہت دور ایک سیاہ نقطہ سا نظر آ رہا ہے۔ وہ دراصل تارکول پکانے کا ایک بڑا کنستر ہے۔ اور وہیں دو پہیے ٹوٹے پڑے ہیں۔ جو سچ مچ آج سے سات سال پہلے ایک لوہے کی زندہ، جیتی جاگتی اور حرکت کرتی ہوئی مختصر گاڑی کا جزوِ اعظم تھے کہتے

تنظیمین نے اپنی کمرِ معدوم پر ہمت کا ایک ریشمی کمر بند کس کر باندھا تھا
لطیف اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ اب ہم غریب پلے میں
کا جال بچھا کر ہی دم لیں گے۔ ابھی ایک دو کنستر ذرا سا تار کول لاکر
یب گاڑی پہنچی ہی تھی کہ اچانک کمر بند ہمت کی گرہ کھل گئی۔ یہی
ڈاری کرتا ہے کہ وجہ یہ ہوئی کہ اچانک الیکشن سر پر آگئے۔ منتظمین کی تمام
قوتیں ادھر صرف ہو گئیں اور یہ کام ذہن سے اس طرح نکل گیا جیسے
دہ پہیے سے ہوا۔

اے سیاح! سنا ہے تیرے ملک میں تحقیق کا بہت شوق ہے اگر
اور مکھیوں کی تحقیق کے لئے کوئی گروہ تیار ہو تو میں اسے خوش آمدید کہوں
ی حدود میں مچھروں کی اتنی پرورش گاہیں ہیں کہ تمام روئے زمین
ں گی۔ ان پرورش گاہوں میں مچھروں کی وہ تمام اقسام مل سکتی ہیں
پیدائش اس تخلیق گاہِ عالم میں ممکن ہے۔ ہر سائز کا مچھر۔ چیونٹی سے
مرغے تک کی جسامت کا یہاں ملے گا۔ فنونِ جنگ میں پوری طرح
آلات حرب کے استعمال میں پورا پورا مشاق۔ اتنا جیالا اور نڈر کہ۔۔
شن میں کھلے دھڑلے حملہ آور ہو اور حریف کو چت کر جائے۔ ہٹے کٹے
صحت مندی کا یہ عالم کہ ہر مچھر بجائے خود "دار الصحت" معلوم ہوتا
اس بے تکلفی اور فیاضی سے پیتا ہے اور اسے اس طرح "سٹاک"
اچھا خاصا "بلڈ بنک" نظر آتا ہے ———— اور مکھیاں
پھر وں کا جواب غزل اور برابر کی چوٹ کبھی کبھی تو یہ گمان ہوتا ہے
ب پورے کے اصلی باشندے یہی مکھی اور مچھر ہیں۔ اور اے حیران سیاح
وق کی پیداوار کا اصلی سبب صرف یہ ہے کہ تمام بستی میں "نالی سسٹم"
ہے۔ لوگوں کے گھروں کے سامنے پانی کی جھیلیں اور کھاڑیاں قائم ہیں
ہیں تو کھڑے پانی میں وہ لہر بحر ہے کہ محلے کے بچے اچھی خاصی تیراکی کی
سکتے ہیں۔ چند ایجاد پسند طبیعتوں نے اپنی بطخوں، بکریوں اور
ں کو ان قدرتی تالابوں میں نہلانا شروع کر دیا ہے۔ رات چند دھوبی
نیال کر رہے تھے کہ ہم ناحق دو میل پرے نہر میں کپڑے دھونے جاتے
رات کے اندھیرے میں کیوں نہ اس گھر کی گنگا سے فائدہ اٹھائیں۔
تحقیق کے شناورو! اگر یہی حال ان مچھروں کی پرورش گاہوں کا رہا
دو چار سال بعد یہ مچھر ایسے قوی الجثہ نہیں ہو جائیں گے کہ انہیں بھی
جال ڈال کر مچھلیوں کی طرح پکڑا جا سکے گا۔ شاید اس وقت یہ آبی جانور
ہمارے ملک کے غذائی بحران کو دور کرنے میں بھی مدد دے سکیں۔

واللہ اعلم بالصواب

صرف ایک دکان تجھے یہاں نظر آئے گی جس کا کانا دکاندار اس
بستی کا "حاجت روا" ہے۔ اس کے یہاں ہر وہ چیز ملے گی جس کی ضرورت
نہیں۔ مثلاً سفید کھانڈ کی بجائے کالا گڑ۔ مرچوں
کی بجائے اصلی کیکر کی نہایت سرخ چھال۔ گھی کی بجائے وہ شئے جسے گھی
کے سوا اور سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ چائے کے سر بند ڈبوں کی بجائے کھلی پتی
جسے بروایت پٹواری، ایک بار پکا کر پھر سکھا لیا جاتا ہے۔ دالیں تمام اور
ازراہ خدمت خلق چوہے کی مینگنیاں مفت! یہ تمام چیزیں عوام کی
"قوتِ خرید" کی بجائے اپنی "قوتِ فروخت" کے مطابق یہ کانا بستی کے
مجبور باشندوں کو سپلائی کرتا ہے۔ ایک شخص نے ایک انڈا اس سے خریدا
اس میں سے بچہ نکل آیا۔ اس نے بچے کی قیمت بھی رکھوا لی! یہ دودھ بھی
بیچتا ہے جس میں بقول پٹواری، کھڑے پانی کی کافی مقدار ملا لیتا ہے۔
اس طرح عوام کو صحت مند مچھروں کے جسم کا تمام وٹامن دودھ کی شکل
میں ملتا رہتا ہے۔

اے روشن سرزمین کے باشندے! یہاں تجھے بجلی کا ایک قمقمہ بھی
نظر نہیں آئے گا۔ اس کی ایک نیچرل وجہ ہے۔ فطرت کے رموز پر غور کر۔
انسان پیدائش سے پہلے رحم مادر کے اندھیروں میں رہتا ہے اور مرنے کے بعد
لحد کی ظلمتوں سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ تو جب انسان کی ابتدا اندھیرا ہے
اور انتہا بھی اندھیرا۔ تو کیوں نہ اس فطری نظام کو حیات مستعار میں بھی
برقرار رکھا جائے۔ پس تحقیق! یہ ظلمتِ بے کراں اصل میں سرمہ۔۔۔۔
چشم بصیرت ہے اور مردمکِ دیدۂ عبرت ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

ایک حکیم بقراط، چند مہینوں سے یہاں آیا ہے۔ اس نے تختی پر لکھایا
ہے:۔ "حاذق الحکماء، نباض الاطبا۔ ارسطوئے زماں، سقراط دوراں
الیف۔ آر۔ اے۔ یو۔ ڈی"

نہ معلوم ان حروف کا کیا مطلب ہے۔ ویسے انہیں ملا کر پڑھو تو
"فراڈ" بنتا ہے۔ اور سچ مچ وہ ہے بھی مجسم فراڈ۔ آنے والے کا ہر قسم کا ٹیکہ
منگا لیتا ہے۔ اور بوتلوں میں ڈال کر پانی بھر دیتا ہے۔ مریضوں کو بھی

رنگین پانی مہنگی قیمت پر فروخت کرتا ہے۔ خالص پانی کے انجکشن لگاتا ہے اور پانچ پیسے فی انجکشن کھلا ریٹ ہے۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔ قابلیت کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص کو سخت قبض ہوگیا اسے لایا گیا۔ اس نے کہا: "فوری علاج یہ ہے کہ اسے خوب کھلاؤ۔ مسلسل کھلاؤ۔ کھلاتے ہی رہو۔ اوپر سے بوجھ پڑے گا۔ نیچے سے خارج ہوگا" کہتے ہیں وہ دو گھنٹے بعد مرگیا۔ اس نے کہا۔ غذا دینے میں بخل کیا گیا ہے۔ ورنہ یہ وہ طاقتی علاج ہے جو بوعلی سینا نے ایجاد کیا تھا۔

اے جہاں دیدہ سیاح! بات لمبی ہوتی جارہی ہے۔ شاید تو بے کیف ہورہا ہو۔ لیکن ایک آخری بات اور سنتا جا۔ ایک خوش خبری۔ جو شاید تیرے اذیت ناک احساسات کا ردعمل بن سکے! وہ یہ کہ یہاں کی زمین غریب اور قلاش لوگوں کو مفت ملتی ہے۔ بس دو چار سو روپے صرف ہوتے ہیں۔ جو دفتر کو ہرگز ادا نہیں کئے جاتے۔ پھر بھی خرچ ہوجاتے ہیں یہ زمین جلد ہی مل جاتی ہے۔ بس دو تین سال کے مختصر سے عرصے میں! اور اے عزیز سیاح! زمین ملنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ غریب اور قلاش لوگ تھوڑی سی رقم لگاکر اس پر مکان تعمیر کرلیں۔ بالکل تھوڑی سی رقم لگاکر! ——— بس یہی تین چار ہزار روپلے! ———

اچھا خدا حافظ! ———

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے :-

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری اگست ۵۷ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہورہی ہے۔ برائے مہربانی آئندہ کیلئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہی سمجھیں گے کہ وی۔پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم: مینجر "مشیر" کراچی

۲۰۰۵ جناب فرخندہ صاحبہ معرفت آزاد صاحبہ، گارڈن ویسٹ۔ کراچی

۲۱۳۴ جناب اسمٰعیل نواب صاحب۔ مارشس

۲۳۷۳ جناب محمد اسلم صاحب معرفت شیخ محمد سلم محمد سلیم صاحبان۔ بھاولپور

۲۳۷۷ جناب ایس۔ ایم۔ اقبال حسین صاحب۔ مشرقی پاکستان

۲۵۰۹ جناب کے۔ اے قریشی صاحب۔ ناظم آباد، کراچی

۲۵۱۲ جناب عبدالمجید صاحب حسینی۔ ناظم حلقہ متفقین، عمرکوٹ

۲۵۴۹ جناب ایس۔ ایم حسنی صاحب۔ لکھنؤ (بھارت)

۲۵۵۰ جناب سکرٹری صاحب عوامی دارالمطالعہ۔ نواب شاہ۔

۲۵۵۱ میسرز یوسف سلک اینڈ ریے آن ملز۔ طارق آباد۔ لائل پور

۲۵۵۳ جناب دوست محمد صاحب سوات۔ ضلع مردان

● ——— ترکی کے ایک اخبار فروش کے پاس ایک خریدار آیا۔ اور اس نے "آزادی" رسالہ طلب کیا۔ اخبار فروش نے کہا "ہمارے پاس آزادی نہیں ہے"۔ "اچھا" خریدار بولا "تو مجھے 'زندگی' ہی دیدیجئے"۔ "وہ بھی نہیں ہے" "اُف، اوہ!" خریدار بولا۔ "یہ تو مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ جہاں آزادی نہیں وہاں زندگی نہیں!"

افسانہ ————

اب کیا ہوگا؟

● ———— محمود فاروقی

شرف الدین کو لوگ اس کی سائیکل کی وجہ سے پہچانتے تھے ——— سائیکل کیا تھی۔ اچھا خاصا باجہ تھی۔ جب صبح کو شرف الدین کھچڑی کھٹے کا ناشتہ کرکے لال سرخ رنگ کی ٹوپی پہن کر اور چار مینار کے نشان والے بٹن لگی ہوئی شیروانی۔ کاندھے پر ڈالے اپنی سائیکل اٹھاتا تو اڑدس پڑوس کے لوگ جان جاتے کہ شرف الدین امیدوار مال گزاری کے دفتر کو جا رہا ہے۔

سائیکل اور شرف الدین میں بہت پرانا رشتہ تھا۔ اتنا ہی پرانا جتنا اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تھا ——— شرف الدین کی بیوی اپنے جہیز میں کیا کچھ نہ لائی تھی۔ کسی کو یاد رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن یہ بات ہر شخص کو یاد تھی کہ شرف الدین کے خسر نے اس کے عقد میں اپنی لڑکی کے علاوہ یہ سائیکل بھی دی تھی ——— یہ سائیکل غالباً اس کے خسر نے اپنی جوانی میں خریدی تھی۔ اور شرف الدین کے پاس پہنچتے پہنچتے وہ اپنی جوانی کی آخری سرحد کو جا لگی تھی۔ البتہ اس کے خسر نے اس کو ٹھیک ٹھاک کرکے اور رنگ و روغن چڑھا کر کچھ اس طرح نوعمر بنا دیا تھا کہ شرف الدین اپنی بیوی کی بڑھی ہوئی عمر پر اعتراض نہیں کر سکا۔ اور سائیکل شرف الدین اور اس کی بیوی کے درمیان ایک مضبوط رشتہ بن گئی۔ شرف الدین مالگزاری میں امیدوار تھا اور تقریباً سات سال سے امیدوار چلا آ رہا تھا ——— امیدواری میں نہ تو کوئی لگی بندھی تنخواہ ہوتی ہے۔ اور نہ امیدوار کو باقاعدہ ملازم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ محض بیگار ہی نہ تھی ایک امیدوار اور ایک باقاعدہ اہلکار سے کچھ کم نہ کما لیتا تھا۔ درخواست لکھنے "فارم بھرنے" اہلکار کے پاس سے صیغہ دار صاحب اور صیغہ دار کے پاس سے منتظم صاحب اور وہاں سے سررشتہ دار تک کاغذ پہنچاتے پہنچاتے ایک امیدوار کی امیدوں اور آرزوؤں کے خشک کھیت میں جل تھل نہیں تو پرنالہ بھر بوندا باندی تو ضرور ہو جاتی تھی۔ اور اگر سال دو سال میں کسی اہلکار کی منظوری مل گئی تو پھر اتنی زرخیزی ہو جاتی تھی کہ شرف الدین جیسے امیدوار پورے اطمینان کے ساتھ ایک دو بچوں کے باپ بن جاتے اور اللہ کے نبیؐ کا شکریہ ادا کرتے۔ امیدواری کی قدر و قیمت سے لوگ بخوبی واقف تھے۔ اور امیدواری بھی بغیر خریدے نہیں ملتی تھی۔ شرف الدین نے بھی یہ امیدواری ۲۵ روپیہ میں خریدی تھی۔ اور "نظم جمعیت" سے ملنے والی ۵ روپیہ کی "منصب" پانچ مہینے کے لئے فروخت کر دی تھی۔ اور یہی امیدواری تھی جس پر تکیہ کرکے شرف الدین کے خسر نے اپنی بیٹی کو اس کے عقد میں دینا قبول کر لیا تھا اور اپنے امیدوار داماد کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنے کے لئے یہ سائیکل بھی اس کے عقد میں دے دی تھی۔

سائیکل اپنی خصوصیات میں شرف الدین کی بیوی سے بڑی مشابہ تھی الغرض وہ اس کو اپنی بیوی کی بہن کے برابر ہی لگتی تھی ——— جس طرح سے شرف الدین کی بیوی کے کوئی بریک نہیں تھا۔ اسی طرح سائیکل بھی بغیر بریک کے چل رہی تھی۔ اور جس طرح اس کی بیوی کا رنگ روغن جھلسا جھلسا تھا اسی طرح اس کی سائیکل بھی بدرنگ ہو چکی تھی اور جس طرح وہ چلتے چلتے اچانک اڑ جاتی تھی۔ یہ بھی رک جاتی تھی۔ کہ شرف الدین اس کی مزاج پرسی کرتے کرتے جھنجھلا جاتا ——— جس طرح شرف الدین کی بیوی کی زبان کتر کتر چلتی تھی اسی طرح سائیکل کا اگلا مڈگارڈ بھی کھڑ کھڑ کرتا رہتا۔ چنانچہ بیچارا شرف الدین اپنی بیوی کی چخ چخ سن کر گھر سے نکلتا تو اسے دفتر پہنچنے تک کچھ ایسا ہی لگتا جیسے اس کی بیوی اس کے ساتھ چخ چخ کرتی چلی آئی ہے۔ مڈگارڈ کی کھڑ کھڑ اور بیوی کی چخ چخ میں شرف الدین کے لئے کوئی فرق نہیں تھا۔ امیدواری بیوی اور سائیکل کی تثلیث پر شرف الدین کی زندگی قائم تھی اسے یوں لگتا جیسے وہ تین پائے والے اسٹول پر چار مینار سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے بیٹھا ہے۔ جس پر سے اسے کوئی نہیں اٹھا سکتا اور واقعہ یہی تھا کہ اس اسٹول پر بیٹھے ہوئے اسے کئی سال بیت چکے تھے اور کسی نے بھی اس کو اٹھنے کے لئے نہیں کہا تھا پہلے پہل تو وہ بڑا بے چین رہتا تھا۔

کہ وہ کسی طرح باقاعدہ اہلکار بن جائے اس کے لئے اس نے بڑی سعی سفارش بھی کرائی لیکن کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی تھی کہ وہ عبدالعزیز اہلکار کے میز کی دوسری جانب تین پائے والے اسٹول پر بیٹھ جاتا اور عبداللہ چپراسی سے ایک آنہ کی سگریٹ منگا کر ایک خود جلاتا اور دوسرا اہلکار عبدالعزیز کو دیتا ——— اور اہلکار عبدالعزیز اس کے سامنے "قبض الوصول" کا رجسٹر رکھ دیتا کہ وہ تنخواہوں کی "برآورد" کا اندراج کرے ——— مہینہ پر مہینہ گزرتا چلا گیا اور شرف الدین "قبض الوصول" میں تنخواہوں کا اندراج کرتا رہا۔ لیکن اس کا نام اس رجسٹر میں کبھی درج نہ ہو سکا اور وہ امیدواری کا بوجھ لادے عبدالعزیز کے سامنے جھکا رہا۔ فرصت کے لمحوں میں جب وہ بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگتا تو اس کی امیدیں بڑھی رو پہلی اور خوش آیند ہو جاتیں اسے محسوس ہوتا جیسے عبدالعزیز گردن جھکائے دفتر سے نکلا چلا جا رہا ہے۔ اور وہ پورے اہلکارانہ اعزاز کے ساتھ اس کی کرسی پر بیٹھا ہوا "موصولہ" اور "مجاریہ" کے رجسٹروں پر دستخط کر رہا ہے۔ لیکن ہوش میں آتے ہی اسے اپنے دل میں ہلکی سی ملامت کا احساس ہوتا کہ وہ عبدالعزیز جیسے ہمدرد اور بھلے آدمی کے متعلق اس طرح سوچنے لگا

اہلکاری کی کرسی پر بیٹھا ہوا منحنی سا آدمی جس کا ہونٹ چوٹ کے ایک نشان ...... کی وجہ سے بدنما معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نگاہ میں سررشتہ دار اور مہتمم سے کہیں زیادہ قابل قدر اور لائق عزت تھا۔ کیونکہ وہ ایک دردمند دل اور بے داغ سیرت کا مالک تھا۔ اور شرف الدین کو دفتر اور اپنے نجی معاملات میں بارہا اس کے حسن سلوک سے واسطہ پڑا تھا۔ اس لئے یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ اس کے اپنے فائدہ کے لئے عبدالعزیز کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ جس کے کمزور کاندھوں پر خاندان کے چھ سات افراد کا بوجھ تھا۔ لیکن یہ امیدواری ——— آخر یہ سلسلہ کب تک کب تک میں اس کھٹارا سائیکل پر چرچوں چرچوں کرتا رہوں" اس نے چار مینار سگریٹ منگانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن وہاں دو چار چھالیہ کے دانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اور مہینہ کی آخری تاریخیں تھیں ———

عبدالعزیز نے اس کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے چار مینار کا... پیکٹ نکال کر شرف الدین کے آگے رکھ دیا ——— اس وقت شرف الدین کو عبدالعزیز بہت بڑا آدمی، پیکٹ پر بنے ہوئے چار مینار سے کہیں زیادہ اونچا آدمی نظر آیا۔

چرخ چرخ شرف الدین کی بوڑھی بولتی رہی۔ چرچوں چرچوں شرف الدین کی سائیکل گلے بندھے راستہ پر گھسٹتی رہی لیکن ان جانی پہچانی آوازوں کے برعکس چاروں طرف بڑا ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ——— سارا ملک دھواں دھار نعروں سے گونج رہا تھا ——— تقریریں" بیانات" نعرے حیدرآباد خودمختار مملکت ہو ——— یہ احساس حیدرآبادی نوجوانوں کو اپنی سائیکل زیادہ تیزی سے دوڑانے پر اکسا دیتا اور سائیکلیں تیزی سے سڑکوں پر اس طرح تیرتی ہوئی نظر آتیں جیسے کٹی ہوئی پتنگ جھپاکے سے گزر جائے ——— حیدرآباد آزاد رہے گا" ——— اور اس آزادی کی خاطر انھوں نے لمبے کالر والی شیروانیاں جنہیں وہ اپنا ملکی امتیاز جتا کر فخر محسوس کرتے تھے اتار دیں اور زمین کے خاکی اور کھدر کے بش شرٹ پہن لئے اور سب نے مل کر" پرچم آصفی کو سلامی دی" جس پر "زرد تاج"، مسلمانوں کے اقتدار کا مظہر اور نشان تھا اور رضاکار "زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

دفتروں میں سارے کام بس یونہی پڑے رہتے۔ اور" ملازمین سرکار" جن کو عرصہ دراز سے اس بات کی تعلیم دی گئی تھی۔ کہ سیاست" ملازمین سرکار کے لئے شجر ممنوعہ ہے کھلے بندوں اخبار پڑھتے اور نت نئی چیزوں پر دل کھول کر تبصرے کرتے۔ ——— "ہم اپنے ملک کے مالک ہیں" یہ احساس ان کے ملازمانہ پھٹکار سے سنولائے ہوئے چہروں پر ایک نئی .... چمک پیدا کر دیتا اور اپنے آپ کو ملازم سرکار کی جگہ... سیاسی آدمی جتلاتے ہوئے ایک طرح کی بڑائی محسوس کرتے لیکن شرف الدین ——— وہ بیچارہ محض ایک امیدوار تھا۔ اس کے چھوٹے سے ذہن کے لئے ان ساری باتوں کا احاطہ کر لینا اور ان تبدیلیوں سے پوری طرح آگاہ ہو جانا ناممکن سا تھا وہ دفتر والوں کو اس طرح کھلم کھلا سیاسی باتیں کرتا ہوا دیکھ کر خوفزدہ سا ہو جاتا کہ یہ سب کے سب ایک سنگین جرم میں مشغول نظر آتے لیکن وہ ان سب سے علیحدہ رہ بھی نہیں سکتا تھا اس لئے وہ بے تکے پن سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا اور بوکھلا بوکھلا کر لوگوں سے پوچھتا پھرتا ——— اب کیا ہوگا ہے ——— لیکن اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ عبدالعزیز اگرچہ ان سب کے ساتھ گفتگو میں برابر کا حصہ لیتا ہے۔ لیکن وہ بالکل اسی طرح سوچنے کا عادی نہیں ہے

جس طرح دوسرے سوچ رہے ہیں۔

"ریت کی دیوار مت کھڑی کرو" ——— عبدالعزیز اپنی باریک اور سنجیدہ آواز میں کہہ رہا تھا: "اس کا نچلا کٹا ہوا ہونٹ کپکپایا اور اس نے صیغہ دار کی پرجوش تقریر کو قطع کرتے ہوئے کہا تم آزادی کے محاذ پر ریت کے تھیلے بھیج رہے ہو حالانکہ وہاں مضبوط سیرت اور اونچے اخلاق والے نڈر انسانوں کی ضرورت ہے۔"

شرف الدین عبدالعزیز کی پوری بات سمجھ نہیں سکا۔ البتہ اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ الماری کے کھلے دروازے کو تھامے ہوئے یہ حقیر الجثہ انسان قہقہہ لگانے والے پورے کلرکوں سے زیادہ نڈر اور بے باک ہے۔

کچھ دیر تک عبدالعزیز کی بات صبر سے سننے کے بعد صیغہ دار جو ایک درشت چہرہ اور تلخ لہجہ والا آدمی تھا۔ بری طرح ابل پڑا اور جوش کے مارے اس نے عبدالعزیز کو غدار اور کانگریسی تک کہہ دیا۔ ——— عبدالعزیز کے سکوت اور ضبط کی وجہ سے بات آئی گئی ہو گئی اور لوگ کچھ ہی دیر میں سیاست کی بھول بھلیوں سے نکل کر روزمرہ کی دفتری الجھنوں میں گرفتار ہو گئے۔ لیکن دوسرے کمرے میں "مسکول" سے لدے ہوئے اونچے ریک کے پیچھے صیغہ کا وہ بڑا کلرک اور سب سے گھٹیا انسان اس بات پر افسوس کرتا رہا کہ اس نے عبدالعزیز کو اس سے زیادہ فحش گالی کیوں نہیں دی

حالات اور زیادہ سنگین ہو گئے بھپرے ہوئے عوام نے وزیر اعظم کی کوٹھی پر حملہ کر دیا اور کسی بیرونی ایجنٹ کے بجائے ملک کے وفادار آدمی کو حکومت کے اختیارات سپرد کر دینے کا مطالبہ زور پکڑ گیا رضاکار دل کے سائیکل سوار دستے موٹر سائیکلوں کے جتھے اور پیدل رنگروٹ چار مینار سے "دارالسلام" سے کنگ کوٹھی تک پھریرے اڑاتے نعرے لگاتے اور مرتعے لگنے پر دوسرے فرقہ کے گھرانوں سے اپنے اقتدار کا خراج وصول کرتے پھر رہے تھے۔ ——— نظام کو رضاکار دل کے مطالبات کے سامنے جھکنا پڑا اور ایک نئی وزارت برسر اقتدار آگئی۔

نئے حکمران ان کے اپنے پسندیدہ آدمی تھے۔ اس لئے دفتر کا سارا کام چھوڑ کر لوگ مٹھائی کھانے بالائی سے لبریز چائے کے "پیالے" پینے اور بڑے پتے کا پان کھا کر چار مینار سگریٹ کے مرغولوں میں ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگ گئے۔ عبدالعزیز بھی مسکرا مسکرا کر لوگوں سے بات کر رہا تھا۔ شرف الدین کو عبدالعزیز کی چیز جو سب سے زیادہ ناپسند تھی وہ اس کی یہی مسکراہٹ تھی جو اس کے بدنما ہونٹ پر بڑی کٹی پھٹی اور مکروہ سی لگتی تھی ——— لیکن صیغہ دار اس مسکراہٹ سے زیادہ عبدالعزیز کی اس تقریر پر جھنجھلا اٹھا۔ جو وہ نئی وزارت کے متعلق ایک مبلغانہ جوش کے ساتھ کرنے لگا تھا۔

صرف آدمیوں کے بدلنے سے کیا ہوتا ہے اصل چیز تو نقطۂ نظر اور طرز عمل کی تبدیلی ہے ہمارے نئے حکمرانوں کو چاہئیے ———! صیغہ دار صبر نہیں کر سکا اس نے بڑی زور سے میز پر مکا مارتے ہوئے گھورتے ہوئے کہا۔

"ان کو کیا کرنا چاہئیے، اور کیا نہیں، وہ خود بہتر سمجھتے ہیں۔"

"امور مملکت خویش"

جوش کے مارے اس نے اس فارسی محاورہ کو بجائے "خسرواں دانند" کے "خزاں دانند" کہہ کر پورا کیا۔

"خزاں" نہیں جناب "خسرواں" ——— عبدالعزیز نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا۔

"ہوگا ہوگا اس سے کیا فرق پڑتا ہے" وہ چلایا ——— "میں پوچھتا ہوں تم کو اس کا کیا حق ہے کہ تم اس طرح دفتر میں غداری کا زہر پھیلاتے رہو اور یہ محاورہ! یہ محاورہ! اس کی کوئی اہمیت نہیں، دس سال فارسی پڑھا سکتا ہوں سمجھے۔ دس سال نوکری کرنی ہو تو چپ چاپ دفتر کا کام کرو۔ سیاست میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔

نارا چار ازیں قصہ کر خرآمد کا در فت۔"

عبدالعزیز نے چاہا کہ وہ اس محاورہ کو بھی درست کر دے۔ لیکن اس سے کیا فائدہ تھا۔ صیغہ دار کے یہ غلط محاورے باہر کی دنیا میں کتنے صحیح اور برمحل تھے۔ وہ ان محاوروں کو درست کر سکتا تھا۔ لیکن وہ ان غلطیوں کی کس طرح اصلاح کرتا جو اس کے وطن کو ایک بھیانک خلا کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی تھیں۔

اس نے چار مینار سگریٹ جلایا اور اپنی کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ شرف الدین نے دیکھا کہ اس کا کٹا ہوا ہونٹ بری طرح پھڑک رہا ہے اور اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ حالات واقعی نازک ہیں اور ———

تشویشناک ہیں۔ وہ کچھ دیر تک عبدالعزیز کے پھڑکتے ہوئے ہونٹ کو دیکھتا رہا۔ اور پھر یکایک بول اٹھا۔

"اب کیا ہوگا"

کیا ہوگا، تمہارا سر، عبدالعزیز جھلا اٹھا اور پھر شرف الدین کو ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ تمہاری سائیکل کے بریک نہیں ہیں گھنٹی نہیں ہے، چین اتر جاتی ہے۔ چول چول ہل رہی ہے۔ پرزہ پرزہ بگڑا ہوا ہے۔ چلتی کم ہے۔ شور زیادہ مچاتی ہے ــــــــ میں تم سے پوچھتا ہوں اگر تمہاری یہ سائیکل کسی وقت ٹکرا جائے تو اس کا کیا انجام ہوگا ــــــــ بتاؤ کیا ہوگا؟۔

شرف الدین کوئی جواب نہیں دے سکا لیکن پہلی مرتبہ اسے عبدالعزیز کے خیالات کا بہتر اندازہ ہوا۔ اور اس نے بڑی عقیدت کی نگاہوں سے عبدالعزیز کو دیکھا۔

نئی وزارت نے آتے ہی تمام دفتروں سے ناپسندیدہ "عنصر" کو خارج کرنے کی مہم شروع کر دی۔ ان کی نگاہ میں ہر وہ شخص خطرناک تھا جو ان کے کاروں پر تنقید کرتا ہو ــــــــ لیکن ایسے لوگ بہت ہی کم تھے۔ اس لئے دفتروں کو پاک کرنے کی یہ مہم کچھ زیادہ سنسنی خیز اور پریشان کن ثابت نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کا عام طور سے چرچا ہو سکا مگر بیچارا عبدالعزیز!

شرف الدین نے اڑتی اڑتی سن لی تھی کہ صیغہ دار نے عبدالعزیز کے خلاف کوئی بھاری رپورٹ اوپر پہنچا دی ہے ــــــــ جب دفتر کے بعد دونوں سائیکلوں پر گھر لوٹ رہے تھے۔ تو شرف الدین نے "بندہ نواز ہوٹل" میں عبدالعزیز کو چائے کے لئے روک لیا دو ڈبل پونوں کا آرڈر دینے کے بعد شرف الدین نے بے معنی گفتگو کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا اور بزعم خویش بڑی خوب صورتی کے ساتھ اصل مقصد پر آتے ہوئے اس نے اپنے دوست کو مشورہ دیا کہ وہ دفتر میں سیاست پر بات نہ کیا کرے اور خاص طور سے صیغہ دار کی مخالفت نہ کرے ــــ

کیا فائدہ! ماچس سے کھیلتے ہوئے اس نے کہا ــــــــ وہ لوگ بلاوجہ تنگ کریں گے۔ تم کیوں "اونٹ کی پیٹھ پر بندر چڑھاتے ہو"۔ عبدالعزیز اس بے تکے محاورہ پر پہلے تو مسکرایا پھر وہ اچانک بھڑک اٹھا ان کے جی میں جو آئے کریں۔ اور اب تک انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ شرف الدین اگر تمہارے گھر آگ لگ جائے تو میں آگ بجھانے کے لئے نہ کہوں چپ چاپ تماشہ دیکھتا رہوں۔ صیغہ دار تو دوسروں کی آگ سے اپنے ہاتھ تاپنے کا عادی ہے۔ وہ آگ لگاتا ہے۔ لگانے دو ادر میں آگ نہیں لگا سکتا۔ بجھا تو سکتا ہوں ــــــــ یہ بھی نہیں شرفو یہ بھی نہیں اب تو ایسی آگ لگ رہی ہے کہ میں کیا کوئی بھی نہیں بجھا سکتا۔ کوئی بھی نہیں لیکن میں چپ کیوں رہوں یہ بھی نہ کہوں کہ آگ لگ رہی ہے۔ وہ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ یہی نہ کہ ملازمت سے نکال دیں گے۔ اللہ میری روٹی کے لئے کوئی دوسرا توا گرم کردے گا۔ کتنے بیوقوف ہیں۔ یہ لوگ ــ میرے خدا ــــــــ وہ فرط جوش سے بات پوری نہیں کر سکا اور شرف الدین کی نظریں اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ پر جم کر رہ گئیں۔ ان دنوں ویسے بھی وہ بڑا احساس اور جذباتی بن گیا تھا۔ اس کی روزمرہ کی باتوں میں بھی تقریر کا سا انداز پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سیاہ اور سفید کو الگ پہچانتا ضرور تھا۔ لیکن ابھی اس کے نوبالغ ذہن میں یہ بات پوری طرح صاف اور عیاں نہیں تھی کہ سیاہی کو کس طرح دھویا جائے اور اس کی جگہ سفیدی کس طرح پھیری جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ کسی کے چہرے پر لگی ہوئی سیاہی کو دیکھ کر خاموش رہ جائے منہ پر حق بات کہدینا کتنا کڑوا کسیلا ہے۔ یہ سوچے بغیر وہ بڑے پرجوش انداز میں سچائی کی تبلیغ کر کے ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا تھا۔ ایسے موقع پر اس کے پتلے پتلے ہاتھ۔ تیزی سے لرزتے اور اس کا کٹا ہوا ہونٹ بری طرح پھڑکنے لگتا۔ اس کی مثال اس آدمی کی تھی جو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گیلی لکڑیوں میں چنگاری رکھ کر پھونکیں مار رہا ہو۔ وہ دونوں وہاں دیر تک آہستہ آہستہ اور تیز تیز باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ رات بوجھل ہو گئی اور گفتگو بھی۔

اس دن ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی عبدالعزیز نزلہ اور بخار کی وجہ سے دفتر نہیں آسکا تھا۔ اس نے شرف الدین کے ہاتھ "رخصت اتفاقی" کی درخواست روانہ کر دی جب وہ درخواست پر صیغہ دار کے دستخط کرا کر لوٹنے لگا تو صیغہ دار نے اس سے کہا اب عبدالعزیز کو ہمیشہ کے لئے رخصت مل جائے گی۔

"ہمیشہ کے لئے" شرف الدین چونک گیا۔

ہاں ہمیشہ کے لئے اس نے شرف الدین کو کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"تم سات سال سے امیدوار ہو۔"

"ہاں صاحب پورے سات سال سے اور دو سال سے تو کوئی منصرمی بھی نہیں ملی۔"

"منصرمی" صیغہ دار نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اے میاں منصرمی کا چکر چھوڑو اب تو تمہارے مستقل ہونے کا وقت آگیا۔

"مستقل" شرف الدین کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ کچھ کہنے لگا تھا کہ صیغہ دار نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ —— ہاں "مستقل" مستقل اہلکار لیکن صرف ایک شرط پر" یہ کہہ کر وہ معنی خیز نظروں سے.... شرف الدین کو گھورنے لگا۔ شرف الدین کوئی جواب نہ دے سکا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اہلکاری کے لئے چار مینار سے بھی چھلانگ لگا دینے کے لئے تیار ہے۔

صیغہ دار نے ایک فائل نکالی اور ایک کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔

شرف الدین نے بڑی بے تابی سے جلدی جلدی وہ کاغذ پڑھا اور آہستہ آہستہ ایک سرد سی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ کاغذ اس کے ہاتھ سے میز پر لٹک گیا مگر...... لیکن یہ سراسر بہتان ہے اس کی اکھڑی اکھڑی پولی سی آواز سنائی دی.....

بہتان ہے یا نہیں اس کا فیصلہ کرنا تمہارا کام نہیں... بار ان جیڈ صیغہ دار نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تم کو صرف یہ سوچنا چاہیے کہ اہلکاری پر ترقی پانا صحیح ہے یا غلط۔

پھر اس نے گھنٹی بجائی اور دو ڈبل پونے اور توس لانے کے لئے چپراسی کو حکم دیا پھر لہجے کے مناسب اتار چڑھاؤ کے ساتھ شرف الدین کو، اہلکاری پر ترقی پانے کے فائدے سمجھانے لگا۔

اور یہ تمہاری کھٹارہ سائیکل یہ بھی کوئی سائیکل ہے۔ تین مہینہ کے اندر اندر نئی سائیکل خرید سکتے ہو۔ بالکل نئی رالے سائیکل —— پھر اس نے نئی سائیکل خریدنے کے امکانات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

شرف الدین نظریں جھکائے اپنے پائینچے کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس نامعقول سائیکل کی چین میں آکر پھٹ گیا تھا۔ اور جسے اس کی اس سے زیادہ نامعقول بیوی نے باوجود اصرار کے سی کر نہیں دیا تھا۔

کچھ دیر بعد جبکہ سوندھے سوندھے دو توس اور بالائی والا ایک پونا پینے کے بعد شرف الدین کے سرد جسم میں آہستہ آہستہ حرارت سرایت کر گئی اور پان کھا کر اس نے پائی کورٹ کے ڈبہ میں سے دوسرا بڑھیا سگریٹ جلایا تو اس کی نگاہ میں وہ کاغذ اتنا خطرناک نہیں رہا۔

"دستخط کر دو صیغہ دار نے ٹھیک وقت پر اس سے تحکمانہ انداز میں کہا اور اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ پر دستخط کر دیئے!

یہ عبدالعزیز کے خلاف ایک جھوٹی گواہی تھی۔

جب وہ باہر نکلا تو باوجود بارش کے نمی کے اس غریب آدمی کی پیشانی عرق آلود تھی۔ اور وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے گیلری کی ریلنگ پر ایک شکست خوردہ آدمی کی طرح جھک گیا۔ ریلنگ پر جھکا ہوا اس کا مجبور سراپا بلاشبہ یہ شکایت کر رہا تھا۔

"میں برا نہیں ہوں لیکن مجھے برا بننے پر مجبور کر دیا گیا۔"

عبدالعزیز کی بیماری کچھ اور دن کھنچ گئی۔ شرف الدین اس درمیان چاہتے ہوئے بھی اپنے محسن کی عیادت کے لئے نہ جا سکا۔ اہلکاری کے خواب اب اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ اس کے اندر کا معترض انسان تھک کر چپ ہو گیا تھا اور اسے کسی حد تک ذہنی یکسوئی حاصل ہو گئی تھی —— اور اس نے اپنی بیوی کو بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ وہ بس دو چار دن میں اہلکار بننے والا ہے۔ اس کی بیوی نے فوراً ہی "شاہ خاموش" کی درگاہ پر چڑھاوا دینے کی منت مانی اور عبدالعزیز کے پھٹے ہوئے پائینچے کو سینے کے لئے بیٹھ گئی۔ دوسرے دن جب وہ دفتر سے جانے لگا۔ تو صیغہ دار نے اسے بلا کر ایک حکم نامہ دیا۔

یہ عبدالعزیز کی برطرفی اور اس کی ترقی کا پروانہ تھا۔

شرف الدین صبح بہت جلد اٹھ گیا اور اس نے آج بڑے اہتمام سے اپنی سائیکل کو صاف کیا اور سات سال میں پہلی مرتبہ اس نے دفتر جانے کی اہمیت محسوس کی اب وہ امیدوار نہیں بلکہ باقاعدہ ملازم سرکار اور ایک اہلکار تھا۔ پان کھا کر اس نے بڑے اہتمام سے سگریٹ جلایا اور ذرا سا اچھل کر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ جب وہ "لودھے واڑی" کی گلیوں کے

چک سے نکل کر بڑی سڑک پر آیا تو بھونچکا سا رہ گیا۔ بازار میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی رضا کاروں کے جتھے سائیکلوں رکشوں اور لاریوں میں بھرے ہوئے "دارالسلام" کی طرف اٹے جا رہے تھے۔ چوراہوں پر کھڑے ہوئے لوگ پرجوش نعرے لگاتے جا رہے تھے۔

سرحدوں سے بھارتی حملے کی پیشقدمی کی خبر ہر طرف اڑ رہی تھی۔ ہجوم کی وجہ سے شرف الدین سائیکل سے اتر پڑا اور بمشکل وہ نکڑ کے چھوٹے سے چائے خانے پر پہنچ سکا جہاں وہ اور عبدالعزیز دفتر جانے سے پہلے چائے پیا کرتے تھے۔ چائے خانے میں محلّہ کے سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان میں عبدالعزیز بھی تھا۔ ریڈیو پرجوش انداز میں چیخ رہا تھا۔

اب کیا ہوگا؟ شرف الدین کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اب وقت آگیا ہے کہ ہم مل جل کر اس جنگ کو جیتنے کی کوشش کریں ریڈیو پر کسی رضا کار لیڈر کی پاٹ دار آواز آئی۔

"مل جل" کر عبدالعزیز زیر لب بڑبڑایا اب یہ جنگ لڑنی ہی پڑے گی۔ اس کا انجام خدا جانے کیا ہو لیکن ایک بہادر سپاہی کی طرح ہم کو اس جنگ میں کود پڑنا چاہیے۔"

لیکن تم تو اس کے مخالف تھے۔ شرف الدین کے لہجہ میں ہلکا سا استہزا شامل تھا۔

اب بھی ہوں ——— عبدالعزیز نے اطمینان سے جواب دیا لیکن شرف الدین اب کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب اپنی جان ہتھیلیوں پر لئے ہوئے دشمن کا مقابلہ پر جائیں اور ہم اپنا سر چھپاتے پھریں۔

کچھ دیر بعد سڑک پر مجمع چھٹ گیا اور شرف الدین گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا عبدالعزیز نے اسے اٹھتے دیکھ کر کہا کہ یار آج دفتر نہ جاؤ تو کیا ہوگا۔ اور تم تو امیدوار ہو تم سے کون پوچھتا ہے۔

شرف الدین دل ہی دل میں مسکرا دیا اور بات اس کی زبان پر گرہ بن کر رہ گئی۔ وہ کس طرح بتا دیتا کہ اب وہ امیدوار نہیں بلکہ اہلکار ہے۔ اور آج وہ اہلکاری کے رجسٹر میں اپنی حاضری کی دستخط کرے گا یہاں رہ کر کیا کروں دفتر میں وقت کٹ جائے گا اس نے ٹالنے کے لئے جواب دے دیا۔

دیکھو عبدالعزیز نے کسی خیال سے چونکتے ہوئے کہا ہمارا محلہ دوسے واڑی سے ملا ہوا ہے۔ اور ان لوگوں سے ہمیشہ ہماری چھڑ رہی ہے۔ اگر حملہ ہو گیا تو شہر میں دوسرے فرقہ والے اودھم مچا دیں گے۔ پھر نہ معلوم کیا ہو۔

شرف الدین کچھ دیر کے لئے خوفزدہ سا ہو گیا لیکن ادھر اہلکاری کی کرسی پر بیٹھنے کی خواہش اتنی طاقتور تھی کہ وہ یہ کہہ کر کہ میں جلد واپس آجاؤں گا تیزی سے باہر نکل گیا۔

جگہ جگہ ہجوم کی وجہ سے وہ بمشکل راستہ طے کر سکا۔ اور جب وہ دفتر کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

لیکن معلوم نہیں کیا بات تھی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ اور دفتر میں صرف اکا دکا آدمی نظر آ رہا تھا۔ اس کے اپنے صیغہ میں تو کوئی نہیں تھا۔ حسب معمول وہ اپنے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی زور سے گھنٹی پر ہاتھ مارا مگر خالی دفتر میں آواز گونج کر رہ گئی اور بس "عبداللہ" وہ پورے زور سے چیخا لیکن عبداللہ چپراسی وہاں کہاں تھا جو آتا، اس کو خود اپنی آواز منہ چڑھاتی ہوئی معلوم ہوئی۔

"کوئی نہیں، کمینے حرامی جلتے ہیں کہ میں اہلکار ہو گیا ہوں۔ آج ہی ان کو مزا تھا خیر دیکھ لوں گا اب میں امیدوار نہیں اہلکار ہوں۔ اہلکا کچھ سوچتے ہوئے اور کچھ بڑبڑاتے ہوئے اس نے حاضری کا رجسٹر کھینچا اور عبدالعزیز کے نام کے آگے سرخ نشان لگا کر اپنے نام کا اندراج کیا۔ اور بڑے نستعلیق انداز میں دستخط کئے۔ اور پھر عبدالعزیز کی برطرفی کے مراسلہ کا اندراج کر کے اس پر "مجاریہ" کا نشان لگا دیا۔ اور اہلکاری پر رجوع ہونے کی رپورٹ لکھ کر اسے باقاعدہ مثل بند کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ عبدالعزیز کی برطرفی کا مراسلہ جاری کر کے جلد از جلد اہلکاری کی کرسی پر بیٹھ جائے لیکن جب وہ برطرفی کے مراسلہ کو لفافہ میں رکھ کر اس پر عبدالعزیز کا نام لکھنے لگا۔ تو ملامت کی ایک تیز و تند لہر اس کے دل میں اٹھی اور اچانک اس کا جی چاہا کہ یہ مراسلہ پھاڑ کر پھینک دے اور عبدالعزیز کے گلے لگ کر خوب روئے سات سال بعد آج اس کی امیدواری کے خواب پورے ہو چکے تھے۔ لیکن یہ تعبیر کس قدر دردناک تھی۔ وہ بڑی الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ آیا اسے خوش ہونا چاہیے یا رنجیدہ مسرت اور ملامت کے دونوں جذبے

برابر کی قوت کے ساتھ مقابل تھے۔ اور وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ کس کو اپنائے اور کس کو چھوڑے کچھ دیر کے لئے اس پر عجیب طرح کی بے حسی اور خود فراموشی سی چھا گئی۔۔ رجسٹر کھلا ہوا تھا۔ کاغذ میز پر بکھرے ہوئے تھے اور دوات میں قلم ڈالے بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ ایک بھنبھناتی ہوئی مکھی کو اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس کی نگاہ عبدالعزیز کی خالی کرسی پر پڑی اہلکاری کا یہ قابل عزت مقام اب اس کے لئے مخصوص ہوگیا ہے۔ اب وہ تین پائے والے اس اسٹول کے بجائے اس بیت کی بنی ہوئی ٹیک دار کرسی پر بیٹھا کرے گا ــــــــــ آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کی خواہش نے اس کی پیٹھ میں سلسلاہٹ سی پیدا کردی اور اسے یوں معلوم دیا جیسے وہ سات سال سے بغیر ٹیک لگائے ایک ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ اور اس کی پیٹھ اکڑ کر رہ گئی ہے ٹیک لگانے کی خواہش اتنی تیز و تند تھی کہ وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا پیروں میں اسٹول کے الجھنے پر اسے ٹھوکر ماری اور عبدالعزیز کی کرسی پر اپنے آپ کو تقریباً گرا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی سات سال کی تھکن اور محرومی بھی گر پڑی کرسی کی پشت سے سر لگا کر اس نے پیر پھیلائے اور ایک آرام دہ احساس ایک فخر آمیز مسرت رہ رہ کر اس کو گرمانے لگی اور جب اہلکار کی ذمہ دارانہ حیثیت کو اس نے پوری طرح محسوس کرلیا تو ایک مرتبہ اور اس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر ہاتھ مارا لیکن کوئی نہیں آیا اور کافی دیر تک خالی دفتر میں گھنٹی کی آواز گونجتی رہی۔

بڑی دیر تک چپ چاپ ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی کو دیکھنے کے بعد اس نے میز پر پڑی فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا اسے بڑی بے چینی سی ہونے لگی اپنے رجوع ہونے کی رپورٹ پر وہ سررشتہ دار کے جلد از جلد دستخط کرا لینا چاہتا تھا۔ لیکن وہاں نہ تو منتظم آیا تھا اور نہ سررشتہ دار، نچلی منزل سے بوڑھے چوکیدار کی چابیوں کی کھنکھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ بس سررشتہ دار کے اجلاس کے دو چار چکر لگانے کے بعد وہ نڈھال سا ہو کر کرسی پر دراز ہوگیا۔ برسوں بعد ملنے والی اہلکاری کا یہ پہلا دن کس قدر منحوس اور ویران ویران سا تھا۔ نہ کسی نے مبارکباد کہی نہ کسی نے چائے مٹھائی کا مطالبہ کیا نہ ہی اسے عبداللہ چپراسی کو ڈانٹنے ڈپٹنے کا موقع ملا۔ ایک عجیب سنسانی اور ویرانی سی تھی جو چھائی ہوئی تھی اور وہاں اکیلے سرکار کے اس قدیم نمک خوار کی خوشی جلاتے بجھاتے بجھ سی گئی۔ اور وہ سامنے اسٹول پر پیر پھیلا کر تقریباً سو گیا

اس سے بےخبر کہ اس کی اپنی چھوٹی سی دنیا کے باہر کیا کچھ ہو رہا ہے۔

وہاں ــــــــــ کئی سڑکوں پرے عبدالعزیز بوکھلایا بوکھلایا سارے محلے میں پھر رہا تھا۔ اس نے عورتوں بچوں کو ایک حویلی میں جمع کردیا اور ہر گھر سے لکڑی، ڈنڈے، بھالے بندوقیں جمع کر کے لوہے واڑی کے رخ پر باقاعدہ مورچہ بندی کردی۔ اور محلے کے باقی ماندہ آدمیوں کو لئے ہوئے کسی بھی پیش آنے والے خطرہ کے مقابلہ کے لئے بیٹھ گیا پیشانی سے پسینہ پونچھتے اور بھرائی ہوئی آواز میں احکام دیتے ہوئے وہ کچھ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی مدتوں سے سوئی ہوئی کوئی آرزو جاگ اٹھی ہے اور وہ آج اپنے پورے حوصلے نکال لینے پر آگیا ہے ــــــــــ ظہر کی نماز کے بعد اس نے بڑی ولولہ انگیز پر جوش تقریر کی اور زندگی کے لئے موت کی اس بازی پر اپنا سب کچھ لگا دینے کی اپیل کی ــــــــــ سارے مجمع پر اس نے ٹٹولتی ہوئی نگاہ ڈالی کچھ ــــــــــ چہرے ایسے تھے جو جوش سے سرخ ہوتے جا رہے تھے اور کچھ خوف و دہشت سے سنولا گئے تھے۔ اور کچھ ایسے جو شک و شبہ کی نگاہ سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ اور چند ایک کی پیشانیوں کی سلوٹیں بتا رہی تھیں۔ جیسے وہ حالات کی اس مجبوری پر اندر ہی اندر کھول رہے ہیں۔ کہ ان کو ــ عبدالعزیز کی باتوں کی تصدیق اور اس کی ہدایات کی تعمیل کرنی پڑ رہی ہے۔ کچھ بڈھے بڑبڑا رہے تھے اور کچھ کھانس رہے تھے اور باہر عاشور خانے کے چبوترے پر سے بچوں کے لڑنے اور گالیاں دینے کا شور بلند ہو رہا تھا۔ حویلی سے عورتوں کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ ــــــــــ اور شہر کی آوازیں دور سے اس طرح آ رہی تھیں جیسے وہاں کوئی بھوکا اژدھا منہ پھاڑے سائیں سائیں کر رہا ہو اور پھر یک لخت ساری آوازیں بند ہوگئیں حویلی کی منڈیر پر سے شرف الدین کی بیوی جو شرف الدین کے راستہ پر ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی اور دل ہی دل میں اس اہلکاری کو کوسنے دے رہی تھی۔ اور اس نے اپنی پہلی منت کو شرف الدین کے سلامت پہنچ جانے سے مشروط کردیا تھا۔ بدحواس چیختی ہوئی صحن میں آگئی۔

"آگیا آگیا"۔ وہ چلائی! "کون آگیا ری"۔ عورتیں ادھر آکر پوچھنے لگیں ان کو جواب فوراً ہی مل گیا ــــــــــ گھر گھر کی خوفناک

آواز کے ساتھ ہوائی جہازوں کا سایہ ان کے سروں پر پڑا اور وہ بچوں کو گود میں لیے حویلی کے اندر دوڑ پڑیں ——— سارے گھر میں بھاگ دوڑ سی مچ گئی ریڈیو بند کر دیے گئے۔ چائے خانے کے کواڑ بھڑ گئے جس کو جہاں جگہ ملی گھس گیا ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ کہ نہ معلوم کیا ہو اور اپنی اپنی جگہ چھپے انہوں نے دیواروں پر لگے ہوئے پوسٹر پر نظر ڈالی جن میں تصویروں کے ذریعہ بمباری سے بچنے کے طریقہ بتائے گئے تھے۔ ہوائی جہازوں نے شہر پر ایک غوطہ سا لگایا اور لوگوں نے تن بہ تقدیر اپنے سر نیچے جھکا لیے لیکن بم گرائے بغیر ہوائی جہاز ان کے سروں پر سے اڑتے ہوئے نکل گئے۔

جب سورج اور نیچے جھک گیا اور اس کی ایک کرن شرف الدین کی بند پلکوں پر پڑی تو وہ کسمسا کر بیدار ہو گیا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ منہ کسیلے ہو رہے اور جوڑ جوڑ میں اٹھنے والی دکھن کو محسوس کر کے اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور بار بار نبض دیکھنے لگا۔ تیز بخار سے اس کا جسم پھنک رہا تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اور خالی دفتر اپنی الماریوں اور میزوں سمیت گھومتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد وہ اٹھا اور صراحی میں سے انڈیل کر ابھی وہ پانی پینے بھی نہیں پایا تھا کہ گھر رگھر رکی خوفناک آواز سے بدحواس ہو کر وہ بھاگا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس لٹک رہا تھا۔ جس میں سے پانی چھلک چھلک کر گر رہا تھا۔ اور وہ مختلف گیلریوں اور زینوں کے چکر لگاتا ہوا صدر دروازے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس حالت میں کہ کوئی دیکھتا تو بلا شبہ اسے مالگذاری کا بھوت سمجھتا۔ نچلے زینہ سے اترتے ہوئے شرف الدین چکرا کر پھسل گیا۔ صدر دروازہ باہر سے مقفل تھا اور اس سے ٹکرا کر شیشہ کا گلاس ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گیا اور شرف الدین کافی دیر تک بے ہوش پڑا رہا اور جب وہ ہوش میں آیا۔ تو سورج ڈوب چکا تھا۔ اور ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ شرف الدین دروازے کی جالی تھامے بڑی مشکل سے اٹھا اور بوڑھے چوکیدار کو چیخ چیخ کر بلانے لگا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں آیا۔ نقاہت کے مارے اس کی ٹانگیں.... لڑکھڑانے لگیں۔ اور وہ آہستہ آہستہ دروازے کے سہارے فرش پر گھسٹ کر بیٹھ گیا۔ ہوائی جہازوں کی گھر رگھر پھر ایک بار سنائی دی اور عمارت کے کارنس کے قریب سے غوطہ لگاتے ہوئے ہوائی جہاز اس کی جلتی اور جھپکتی ہوئی آنکھوں کو کچھ اس طرح نظر آئے جیسے موت کے سیاہ گدھ اس پر ٹوٹ پڑنے والے ہوں خوف کے مارے اس کی گھگھی بندھ گئی موت کے یہ گدھ جب نکل گئے تو اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں گھر رگھر دور ہوتی ہوئی آواز اور دفتر کے احاطے سے پرے کسی ٹرک کے گزرنے کا زناٹا اور خاموشی کو چیرتی ہوئی چیخوں سے ملی جلی بھنبھناہٹ اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اور اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب جا رہا تھا۔

یہ تیرے کمینے پن کا انعام ہے۔ شرف الدین ——— ایک چھوٹی سی آواز اس کے دل میں ہلکے ہلکے طنز بھرے قہقہے لگانے لگی۔ اور پھر بہت ساری چھوٹی چھوٹی آوازیں نہ معلوم کہاں کہاں سے نکل کر اس کے دل کے اسٹیج پر آگئیں۔ اور پن کشن میں لگی ہوئی پنوں کی طرح وہ اس کے دل پر دائرہ در دائرہ کھڑی ہو گئیں۔

شرف الدین امیدوار!

تو نے عبدالعزیز کو مار ڈالا!

یہ تیرا انعام ہے۔

"انعام، انعام" امیدوار امیدوار" اہلکار اہلکار"

اس کے کان سنسنانے سے لگے آوازیں دل سے نکل کر باہر پھیل گئیں اور دفتر کی ساری فضا میں دھیمی دھیمی اونچی اونچی ایک خوفناک سی گونج اٹھی مسلسل گونجتی رہی۔ اف میرے اللہ ——— اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا مجھے مار ڈال میرے خدا مجھے مار ڈال!

لیکن مرجانا اتنا آسان تو نہیں تھا۔ اس نے بے بسی کی [illegible] سے باہر صحن میں نظر ڈالی۔ مقابل کے شیڈ میں [illegible] وہ سائیکل کھڑی تھی اس کی واحد غمگسار بے رنگ و روغن جو سات سال سے اس کی رفیق، ہمدم تھی ——— بے جان اور خاموش لیکن ایسے گویا وہ شرف الدین کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہو اور پھر جیسے سائیکل میں جان سی پڑ گئی اس کے پہیے گھومنے لگے اس کا مڈگارڈ کھڑکھڑانے لگا۔ اور یہ کھڑ کھڑ بڑی جلدی چیخ پکار میں تبدیل ہو گئی اور وہاں شام کے دھندلکے میں اس کی بیوی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ بڑی زور زور سے ہل رہے تھے لیکن شرف الدین کو کچھ نہیں سنائی دیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

شرف الدین نے بھی بڑی کوشش سے اس کو کوئی جواب دیا اس کے لب ہلے سانس پھول گیا لیکن اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ خود اس کی آواز

بھی اس کو سنائی نہیں دی اس نے ڈوبتے ہوئے دل کو بڑے حوصلے سے سنبھالا اور کہنی پر ٹیک لگا کر ایک مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی مگر آہ .... گھر رگھوں گھر رگھوں اس کا دل ایک دم سے اچھل پڑا اس کا سر لوہے کے دروازے سے بڑی زور سے ٹکرایا باہر صحن میں تاڑ کے درختوں پر سے ابھرتے ہوئے چاند میں سے موت کے سیاہ گدھوں کا دل نیچے کود پڑا اور ان کا گذرتا ہوا سایہ لوہے کے بند کٹہرے کے پیچھے شرف الدین کے چہرے پر پڑا۔ گدھ گذر گئے لیکن وہ سیاہ سایہ اس کے چہرے پر ایک مکروہ جھلی کی طرح چپک کر رہ گیا بھیانک چاندنی میں مالگذاری کے مقفل دروازے کے پیچھے اس کی ڈھلکی ہوئی گردن دروازے پر ٹکی ہوئی تھی ۔ بے نور آنکھیں سامنے شیڈ میں کسی چیز کو گھور رہی تھیں ۔ اور منہ کھلا ہوا تھا ۔ اور ہونٹ کچھ اس طرح سکڑے ہوئے تھے جیسے مالگذاری کا سات سالہ امیدوار اپنی اہلکاری کا پہلا شاندار دن گذار کر پوچھ رہا ہو ۔

"اب کیا ہوگا ؟"

(بشکریہ "نہر نیم روز")

افسانہ ——————

آزاد خیال

—————— حمید اختر

مختار کی شخصیت اپنے دوست احباب میں کافی نمایاں تھی محفل میں وہ کچھ نہ کچھ ایسی بات چھیڑ دیتا جس سے سارے دوست ہنس پڑتے۔ یہی وجہ تھی کہ اگر وہ کبھی غیر حاضر رہتا تو محفل سونی سونی نظر آتی۔ خاکے اڑانے اور آوازیں کسنے اور راستہ چلتی لڑکیوں کو ستانے میں کافی مشاق تھا۔ ہر وقت اس کی زبان چلتی رہتی۔ دوسرے دوست ہمیشہ اس سے سنا کرتے۔ اور اگر کچھ کہتے بھی تو بہت مختصر، یا مختار کا موڈ لانے کے لئے۔

ڈی۔ ٹی۔ او۔ کا تھرڈ گریڈ کلرک جب واپس آفس سے گھر واپس آتا تو کم از کم دو تین احباب کو دیوان خانے میں منتظر پاتا۔ اور پھر بہت جلد ضروریات سے فراغت پا کر دوست احباب کی جلو میں شہر کے کسی گارڈن یا مشہور ہوٹل پہنچ جاتا۔ اور وہاں کئی کئی گھنٹوں کی بیٹھکیں رہتیں۔ بعض اوقات تو ہوٹل بند ہوتے وقت مجبوراً وہ باہر نکلتے۔ یار باش ہونے کے تعلق سے نئے نئے احباب سے اس کا ربط رہتا۔ وہ اتنا بے باک واقع ہوا تھا کہ اگر کوئی کم گو آدمی بھی اس کا دوست ہوتا تو تھوڑے دنوں میں بولنے لگ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دوستوں میں مستقل دو گروپ تھے۔ ایک وہ جو ہمیشہ اس کو سمجھایا کرتا کہ اس کی موجودہ روش انتہائی غلط ہے۔ چنانچہ ایک دن کی بات ہے کہ باتوں باتوں میں اس نے ایک لڑکی کا تذکرہ شروع کر دیا۔ اور اس کے ایک عضو کی تشریح کرنے لگا۔ کبھی اس کی گلابی باہوں کا ذکر کرتا۔ کبھی اس کی چال پر جھوم جاتا۔ کبھی اس کے آواز کی تعریف کرتا۔ اور کبھی گھٹا سی زلفوں میں الجھ جاتا۔ مختار نے کچھ اس انداز سے یہ تذکرہ چھیڑا کہ سارے دوست محو ہو گئے لیکن ارشد کو یہ بات بہت بری لگی کہ کسی کا تذکرہ کھلے بندوں اس بے باکی سے کیا جائے۔ اس نے مختار کو روکا، کہ یہ بات درست نہیں۔ آپ عمومی طور پر اگر کچھ کہیں تو اتنا غلط نہیں ہوتا۔ جتنا کسی مخصوص شخصیت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مختار نے جواباً کہہ دیا، کیوں جناب؟ وہ کوئی آپ کے رشتہ میں ہوتی ہیں کیا؟ جو آپ کو دکھ ہو رہا ہے۔ اور ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ اور بے چارہ ارشد خفیف ہو کر رہ گیا مختار کے اسی منہ پھٹ پن کی وجہ سے بعض ساتھی باوجود برا جاننے کے اس کے منہ لگنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ اور بادلِ ناخواستہ اس کو برداشت کر جاتے لیکن عام طور سے اس کے ساتھ وہی لوگ رہتے جو اس کے مزاج سے موافقت کر سکتے تھے۔ یہ گروپ پورے شہر میں نہ سہی اس محلے میں تو کافی آزاد خیال سمجھا جاتا تھا اور بعض حضرات ان لوگوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے گھبراتے تھے کہ کہیں کوئی آوازہ نہ کس دیں۔ اور ہوتا بھی ایسا ہی تھا۔ خصوصاً محلے کے بڑے بوڑھے تو کافی زد میں آجاتے۔ ایک دن ایک عمر رسیدہ بزرگ سامنے سے گزر گئے۔ اور مختار نے دیکھتے ہی کہا: "کافی متبرک ہے یہ داڑھی۔ محلے میں اگر کسی کے پیٹ میں درد ہو جائے تو اسے دھو کر پلایا جاتا ہے۔ یہ داڑھی بھی ہے اور اسٹمک کیور…… (stomach cure) کا کام بھی کرتی ہے۔ اور بیچارے بوڑھے حضرت سنی ان سنی کر کے چل دیئے۔ کوئی کچھ سمجھاتا تو اس کی اچھی خاصی ہجو ہو جاتی۔ کہا جاتا کہ حضرت یہ مسجد نہیں ہے۔ جو آپ بے کھٹکے خطبہ دینے کھڑے ہو گئے۔ کہیں تو پیش امامی کر لیجئے۔ اسی طرح یہ لوگ اپنے دن گزارتے رہے۔

صدیق جو اسی سال کسی دوسرے مقام سے بدل کر آیا تھا۔ بہت جلد اس کمپنی کا ممبر بن گیا۔ وہ بھی آزاد خیالی میں مختار کا ہم پلہ نکلا۔ اور بعض اوقات تو مختار بھی اس کے سامنے منمنانے لگتا۔ صدیق کے آنے سے یہ آزاد پارٹی —— "دو آتشہ" ہو گئی تھی۔ ایک روز ہوٹل میں بیٹھے، خوش گپیاں جاری تھیں۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا۔ سارے دوست آج موڈ میں تھے۔ قہقہوں پر قہقہے پڑ رہے تھے۔ ہوٹل کے بعض لوگ بھی اس پارٹی کی زندہ دلی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ یکایک صدیق نے سب کو سڑک کی طرف یہ کہتے ہوئے متوجہ کر دیا: "دیکھنا یار —— ؟ کیسی زہریلی ناگن جا رہی ہے۔ جانے کتنوں کو ڈسا ہوگا کم بخت نے آج تک —— اس کے کاٹے کا تو علاج نہیں بھائی"۔

سڑک پر ایک طالبہ جا رہی تھی ———— مختار نے مڑ کر دیکھا۔ اور ایک دم بھڑک کے رہ گیا۔ اس کے چہرے کی ساری رنگت سفید ہو گئی۔ صدیق متعجب تھا کہ آج ہمارا "ہیرو" خاموش کیوں ہے۔ وہ مختار سے خاموشی کا مطلب دریافت کرنا چاہتا تھا کسی نے بازو سے ہاتھ دبایا۔ ساری محفل سہمی ہوئی تھی اور مختار مشکل سے دو چار منٹ وہاں بیٹھ سکا۔ اس کے دوست بھی اس کے جانے کے بعد وہاں سے اٹھ گئے۔ مالک ہوٹل بھی حیران تھا کہ آج یہ لوگ اتنی جلدی اپنی محفل کیوں برخاست کر گئے۔

مختار سر جھکائے ہوئے گھر پہنچا۔ شام میں کھانا بھی نہیں کھایا۔ اسکی خاموشی سے گھر کے افراد بھی پریشان تھے۔ ساری رات کروٹیں بدلنے میں گزری اس کے سینہ میں ایک الاؤ جل رہا تھا ———— دوسرے روز مختار کی بہن جب اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ایک گرجدار آواز سے سہم کر رہ گئی۔

"محمودہ تم آج سے اسکول بے پردہ نہیں جاؤ گی۔"

(بشکریہ "دعوت")

افسانہ

"رونق"

نامعلوم

شام کا وقت تھا۔ گھر گھر کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ رونق صوفے پر نیم دراز سی ایک ناول کے صفحے الٹ رہی تھی۔ آج وہ کچھ اداس تھی، کچھ جذباتی سی ہو رہی تھی۔ مطالعے میں اس کی طبیعت نہیں لگ رہی تھی۔ اسی وقت حیدر آ پہنچا اور اسی صوفے پر بیٹھ گیا۔ رونق فوراً ایک طرف سرک گئی اور صفحے الٹنے لگی۔ آج حیدر نہایت مسرور نظر آ رہا تھا۔ سفید پتلون پر نیلی قمیض خوب پھب رہی تھی۔ اس کے گھنگریلے بال بڑے ترتیب سے سنورے ہوئے تھے۔ آج وہ رہ رہ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے ایک انگڑائی لیتے ہوئے کہا: "رونق! آج ایک گیت سناؤ۔"

"آج میرے سر میں بڑا درد ہے حیدر بھائی!" اس نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا اور کتاب پر جھک گئی۔

اس کے ہاتھ کی کتاب چھینتے ہوئے حیدر بولا: "سب ٹھیک ہو جائے گا، گاؤ بھی تو۔"

جھلا کر رونق بول پڑی: "آپ بھی عجیب ہیں حیدر بھائی! کہہ تو دیا آج میں نہیں گا سکتی۔" اور وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ متحیر سا حیدر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اسے کمرے میں آئے پانچ منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ وہ آرام کرسی پر لیٹا اداس آنکھوں سے چاند کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھ ہی رہا تھا کہ رونق اس کے کمرے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا: "حیدر بھائی گھومنے چلیں گے؟"

حیدر حیران تھا کہ کیسی عجیب لڑکی ہے، ابھی ابھی اس پر جھلا پڑی تھی اور اب پھر یہاں آکر ایسی کھڑی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"نہیں" حیدر نے سرد آواز میں کہا۔

"چلیے نا اب، اب میرے سر کا درد بالکل ٹھیک ہے، چلیے اٹھیے!" اور وہ حیدر کو ایک طرح سے زبردستی ہی کمرے سے باہر لے آئی۔

جب کار پہاڑی پر پہنچی تو رونق بے حد خوش تھی۔ نیچے جھیل کا پانی خاموش پڑا تھا۔ اس پر چاند کا عکس اپنے چاروں طرف روشنی کا ہالہ ڈالے جھلملا رہا تھا۔ رونق اور حیدر دونوں ایک بڑے پتھر پر جا بیٹھے۔ کتنی سادگی میں رونق کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ ہوا کی سرگوشیوں کے ساتھ ساتھ اس کے بالوں کی خوشبو حیدر کے ذہن کو معطر کئے جا رہی تھی۔ رونق خاموش بیٹھی شہر کی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی جو یہاں سے کافی دور تھا اور روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ حیدر کو اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے ذرا سا مڑ کر دیکھا، حیدر اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"ان روشنیوں کو تو دیکھئے حیدر بھائی! کتنی حسین لگ رہی ہیں یہاں سے۔" اپنی آواز میں رس گھولتے ہوئے رونق نے کہا۔

لیکن حیدر دور بہت دور راہ میں بھٹک گیا تھا۔ آج وہ رونق سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس نے سرگوشی کی: "رونق تم کتنی حسین ہو!"

"آہا! کتنا بڑا چاند نکلا ہے۔ کیا آج پورنماشی کی رات ہے" حیدر کی بات ان سنی کر کے رونق بول پڑی۔

حیدر کی باہیں رونق کی کمر سے گھر گئیں اور اس نے ایک بار پھر سرگوشی کرتے ہوئے کہا: "رونق!"

ایک جھٹکے سے رونق نے اپنے کو الگ کر لیا۔ اچھل کر وہ دور جا کھڑی ہوئی۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا: "چھی، آپ اتنے ذلیل ہیں۔ آپ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ آپ نے آزادی کے ساتھ ملنے کا یہی مطلب نکالا ہے؟"

حیدر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس نے بمشکل کہا: "رونق سنو تو...!"

رونق شیرنی کی طرح بپھر کر بولی: "بس بہت ہو چکی..... اگر ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں اس پتھر سے آپ کا سر پھوڑ دوں گی۔ میرا کوئی بھائی نہیں میں آپ کو بھائی جیسا تصور کرتی تھی جس روز آپ آئے اسی روز آپ کی آنکھوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں سب سمجھ گئی تھی، لیکن میں نے سوچا تھا کہ اپنے برتاؤ سے میں آپ کی غلط فہمی دور کر دوں گی لیکن..... لیکن..... اوہ! آپ لوگ کتنے بیوقوف ہوتے ہیں.... آپ..... مرد لوگ۔" اور وہ رو پڑی۔

حیدر سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ رونق جب کچھ دھیمی ہوئی تو سر اٹھا کر اس نے کہا: "آپ آج ہی چلے جائیے..... آج ہی۔" اور وہ پہاڑی پر سے تیزی سے نیچے اتر گئی۔ (بشکریہ "پگڈنڈی")

دیس بدیس ———

خطوں کا پلندہ

● ——— مارس جوکائی
● ——— (ترجمہ) سید ابوالانشا

پسینہ کے مشہور معالج ڈاکٹر ۔۔ کے یہاں ایک دن بہت سویرے ایک مریض آیا اور ان کے نوکر سے کہنے لگا کہ میں فوراً ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر ذرا بھی دیر ہوئی تو اس کا نتیجہ میرے لئے خطرناک ہوگا۔ خدا کے لئے تم جلدی جاکر انہیں بلا لاؤ۔

ڈاکٹر صاحب ڈریسنگ گون پہن کر اپنے مطب میں آگئے اور مریض کو اندر بلا لیا۔ مریض کی صورت، لباس اور اطوار سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شدید جسمانی اور روحانی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس کا داہنا ہاتھ گلے میں لٹکا ہوا تھا اور گو وہ ضبط کرنے کی بہت کوشش کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی کراہنے سے خود کو نہ روک سکتا تھا۔ اس نے بہت ہلکی اور کمزور آواز میں کہا "آپ ہی ڈاکٹر ۔۔ ہیں؟"

"جی ہاں، یہی میرا نام ہے۔"

"میں گاؤں میں رہتا ہوں۔ اب تک آپ سے ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر آپ کی شہرت بہت سنی ہے۔ میں سخت مصیبت میں مبتلا ہوں۔ خدا کے لئے میری مدد کیجئے۔ میرے سیدھے ہاتھ میں خدا جانے کیا ہوگیا ہے۔ کاربنکل ہے۔ یا کینسر ہے۔ یا کیا ہے! اور اب تو چند روز سے آگ سی لگی ہوئی ہے۔ اب یہ میری برداشت سے باہر ہے آپ نشتر لگا دیجئے اگر یہ تکلیف ایک گھنٹہ بھی اور رہی تو میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔"

ڈاکٹر نے کہا "آپ مطمئن رہیے۔ خدا نے چاہا تو دوا اور مرہم ہی سے آپ کی تکلیف دور ہو جائے گی۔ نشتر لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

مریض نے کہا: "نہیں ڈاکٹر صاحب! پلاسٹر یا مرہم سے مجھے فائدہ نہیں ہے۔ نشتر لگانا ضروری ہے۔ میں آپ کی خدمت میں اسی لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ اس جگہ کو کاٹ کر پھینک دیں، جہاں آگ لگی ہوئی ہے۔" ڈاکٹر نے ہاتھ کا معائنہ کیا۔ ہاتھ دکھلاتے وقت بھی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہے۔

"ہاں، ہاں، یہی جگہ ہے ڈاکٹر صاحب! میرا مرض بڑا عجیب ہے ممکن ہے آپ کو کچھ بھی نہ معلوم ہو لیکن آپ میرا کہنا مانیئے۔ اسے کاٹ کر پھینک دیجئے!"

ڈاکٹر نے کہا: "آپ کا مرض کیسا ہی عجیب کیوں نہ ہو، آپ اطمینان رکھئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا" مگر جب اس نے ہاتھ کا معائنہ کیا تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ تکلیف کیوں ہے۔ کوئی بات خلاف معمول نہیں تھی نہ کوئی زخم تھا۔ نہ پھوڑا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی خراش تک بھی نہ تھی جیسے اور سب تندرست ہاتھ ہوتے ہیں۔ ایسا ہی وہ بھی۔ آخر ڈاکٹر نے پوچھا، "خاص کس جگہ تکلیف ہے؟"

اپنے بائیں ہاتھ سے داہنے ہاتھ کی پشت پر مریض نے وہ جگہ بتائی جہاں تکلیف تھی اور جب ڈاکٹر نے اپنی انگلی سے اس جگہ کو چھوا تو مریض تکلیف سے تڑپ اٹھا اور کہنے لگا: "ڈاکٹر صاحب! اسے دبایئے نہیں میرا دم نکلے جا رہا ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔ مجھے تو اس جگہ کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی۔"

"بظاہر تو مجھے بھی کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی۔ مگر اس جگہ تکلیف اس بلا کی ہے کہ میرا ہی دل جانتا ہے۔"

ڈاکٹر نے ایک بار پھر ایک مکبر شیشے سے اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں مریض تکلیف بتا رہا تھا اور کہا "جلد بہت اچھی حالت میں ہے۔ خون کا دوران ایسا ہی ہے جیسا ایک تندرست آدمی کا ہونا چاہیئے۔"

مریض نے کہا "مگر تکلیف کی جگہ کچھ سرخ ضرور ہے۔"

"کہاں سرخ ہے؟"

مریض نے اپنی پاکٹ بک سے پنسل نکال کر تکلیف کی جگہ پیسے کے برابر ایک دائرہ بنا کر کہا، "اس جگہ"

ڈاکٹر نے غور سے مریض کے چہرے کو دیکھا اسے اب شبہ ہو چلا تھا کہ شاید اس کے دماغ میں کچھ فتور ہے۔

ڈاکٹر نے کہا: "اچھا آپ چند روز میرے یہاں قیام کیجئے۔ خدا نے چاہا تو آپ کی تکلیف دور ہو جائے گی۔"

"مگر ڈاکٹر! میں چند روز انتظار نہیں کر سکتا۔ یہ جو دائرہ میں نے آپ کے سامنے پنسل سے بنایا ہے۔ یہاں مجھے سخت جسمانی اور روحانی اذیت پہنچ رہی ہے۔ آپ اسے کاٹ کر پھینک دیجئے۔"

"یہ میں نہیں کر سکتا۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ کے ہاتھ میں کسی مرض کی علامت نظر نہیں آتی۔"

"شاید آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میرے حواس ٹھیک نہیں ہیں، یا میں آپ سے مذاق کر رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک ہزار فلورن کا ایک نوٹ نکالا اور اسے میز پر رکھ دیا اور کہنے لگا۔ "ڈاکٹر صاحب میں آپ سے مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ جو کام میں آپ سے لینا چاہتا ہوں وہ میرے لئے بہت اہم ہے اور اس کی تعمیل جلد سے جلد ہو جانا چاہیئے۔"

"دیکھئے جناب! اگر مجھے ساری دنیا کے خزانے بھی دیدیں تو میں ایک تندرست عضو کو بیمار عضو نہیں کہہ سکتا اگر میں اس جگہ نشتر لگا دوں تو دنیا مجھے بے ایمان قرار دے گی۔ لوگ کہیں گے کہ روپے کے لالچ میں اس نے ایک خاصے تندرست ہاتھ کا گوشت کاٹ ڈالا۔"

"اچھا خیر میں خود اس جگہ کو کاٹ کر پھینکے دیتا ہوں، گو ذرا مشکل ہی سے میں اس کام کو انجام دے سکوں گا۔ اس لئے کہ مجھے الٹے ہاتھ سے کاٹنا پڑے گا۔ آپ صرف اتنا کیجئے کہ جب میں اپنے ہاتھ پر آپریشن کر چکوں تو آپ مرہم پٹی کر دیجئے گا۔"

یہ کہتے ہی اس نے نشتر اٹھا کر تکلیف کی جگہ بھونک دیا۔

ڈاکٹر نے گھبرا کر کہا: "ٹھیرئیے، بے تکے پن سے کوئی اہم رگ نہ کٹ جائے گا۔ جب آپ آپریشن پر تلے ہی بیٹھے ہیں تو خیر لائیے میں اس کام کو انجام دیدوں۔" مریض کا ہاتھ آپریشن کرنے کے لئے اپنے ہاتھ میں لیکر ڈاکٹر نے اس سے کہا: "کہ آپ اپنا منہ اس طرف پھیر لیجئے۔ شاید آپ دیکھ نہ سکیں۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے آپریشن کرتے ہوئے دیکھنے دیجئے۔ میں آپ کو بتاتا جاؤں گا کہ ٹھیک کہاں سے کاٹنا چاہیئے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ آپریشن کرتے وقت وہ ذرا نہ گھبرایا، بلکہ بتاتا رہا کہ کہاں تک کاٹنا چاہیئے اور جب آپریشن ہو چکا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اسے بڑی تسکین ہوئی ہے۔

"اب تو تکلیف نہیں ہے؟"

مریض نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "نہیں ڈاکٹر صاحب اب مجھے بالکل کوئی تکلیف نہیں ہے۔ جو تھوڑی بہت کمزوری خون کے بہنے سے ہے بھی وہ ایسی ہے جیسے گرم لو کے جھونکوں سے نکل کر تازہ ہوائیں آ جائیں۔ خون بہتے ہوئے دیکھ کر میرے دل کو اطمینان ہوتا ہے اسے بہنے دیجئے۔"

لیکن ڈاکٹر نے اسے سمجھا بجھا کر پٹی باندھ دی۔ اب اس کا چہرہ اداس اور وحشت ناک نہیں تھا۔ بلکہ اس پر مسرت کے آثار جھلک رہے تھے اور چہرے پر سرخی آ گئی تھی۔ جب پٹی بندھ چکی تو اس نے بہت پرتپاک انداز میں اپنے الٹے ہاتھ سے ڈاکٹر سے مصافحہ کیا اور کہا: "ڈاکٹر صاحب! میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں، میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ معمولی سی رقم جو میں نے پیش کی ہے، اس اہم خدمت کے مقابلہ میں، جو آپ نے انجام دی ہے، کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔"

لیکن جب ڈاکٹر نے ایک ہزار فلورن کا نوٹ لینے سے قطعاً انکار کر دیا تو مریض یہ کہکر رخصت ہو گیا کہ آپ یہ رقم کسی ہسپتال کو دیدیجئے گا۔

زخم کے مندمل ہونے تک مریض کئی مرتبہ ڈاکٹر کے پاس آیا اور اس دوران میں ڈاکٹر کو اندازہ ہوا کہ وہ بہت سنجیدہ اور پختہ کار آدمی ہے اور اس کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بڑا مالدار آدمی ہے۔ زخم بھرنے کے بعد اس نے آنا جانا بند کر دیا۔ لیکن تین ہی ہفتے کے بعد ایک روز صبح کو وہ پھر آیا۔ اپنا داہنا ہاتھ وہ اسی طرح گل پٹی میں ڈالے ہوئے تھا جیسے پہلے دن ڈالے ہوئے آیا تھا اور اسی طرح اس کے چہرے پر وحشت اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور کراہنے لگا۔

ڈاکٹر نے حیران ہو کر پوچھا: "کیوں کیا بات ہے؟"

مریض بہت کمزور اور غم انگیز آواز میں بولا: "ڈاکٹر صاحب! آپریشن میں کسر رہ گئی۔ کچھ اور گہرا کاٹنا چاہیے تھا۔ اب تو پہلے سے بھی زیادہ آگ لگی ہوئی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ دوبارہ آپ کو تکلیف نہ دوں گا۔ میرا خیال تھا کہ یہ شدید درد بڑھتے بڑھتے میرے دماغ یا دل تک پہنچ جائے گا اور میری زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ درد ہاتھ کی پشت تک محدود رہتا ہے وہاں سے نہیں ہٹتا۔ مگر درد کی شدت کا جو حال ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر نے پٹی کھولی جس جگہ آپریشن ہوا تھا وہ بالکل مندمل ہو گئی تھی اور اس پر نئی کھال چڑھ گئی تھی۔ مریض کی نبض تیز ضرور تھی مگر بخار نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے کہا میں سخت حیران ہوں کہ یہ کیا بات ہے؟"

مریض نے کہا: "ڈاکٹر صاحب! اس عجیب و غریب عارضے کا سبب معلوم کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ آپ مجھے اس مصیبت سے نجات دیجئے پھر آپریشن کر دیجئے اور اب کے ذرا گہرا کاٹیے۔ صرف اسی طرح مجھے سکون نصیب ہو گا۔"

آخر ڈاکٹر کو پھر آپریشن کے کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا اور زیادہ گہرا کاٹنا پڑا اور ایک بار پھر اس نے دیکھا کہ وہ عجیب مریض اپنا خون بہتے ہوئے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اور جب پٹی بندھ گئی تو اس کے چہرے پر سرخی ضرور آ گئی۔ لیکن وہ پہلے کی طرح مسکرایا نہیں اور کہنے لگا: "ڈاکٹر آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ میری تکلیف بالکل جاتی رہی۔ چند روز میں زخم بھی مندمل ہو جائے گا ممکن ہے مہینہ بھر سے پہلے ہی آپ کو پھر پریشان کرنے کے لئے آ جاؤں۔"

"میرے دوست اس خیال کو بالکل اپنے دل سے نکال ڈالیے۔"

ڈاکٹر نے اس عجیب مریض کا حال اپنے کئی دوستوں اور ساتھیوں کو سنایا ہر ایک کی رائے اس کے مرض کے متعلق الگ تھی۔ مگر کوئی اس کا معقول سبب تشخیص نہ کر سکا۔ جب مہینہ ختم ہونے کو آیا تو ڈاکٹر کو اپنے عجیب و غریب مریض کا انتظار شروع ہوا۔ مگر مہینہ ختم ہو گیا اور وہ نہیں آیا۔ اور چند ہفتے گزر گئے۔ آخر اس کے پاس سے ڈاکٹر کو ایک خط موصول ہوا۔ بڑا لمبا چوڑا خط تھا۔ جو مریض نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ اس نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ مریض کے ہاتھ میں پھر تکلیف نمودار نہیں ہوئی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ ہاتھ میں قلم نہیں پکڑ سکتا تھا۔ خط کا مضمون یہ ہے:۔

ڈیئر ڈاکٹر!

میں یہ مناسب نہیں سمجھتا آپ کو یا طبی سائنس کو اپنے عجیب مرض کے راز کے متعلق کسی شبہ میں رکھوں۔ جو مجھے عنقریب ہی قبر میں پہنچا دے گا چنانچہ میں یہاں اپنے عجیب اور ہولناک مرض کا اصل سبب آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ پچھلے ہفتے سے اب تک تین مرتبہ یہ جان لیوا درد رونما ہو چکا ہے میں نے سوچ لیا ہے کہ اب میں کوئی علاج نہیں کروں گا۔ اس وقت میں ایک جلتا ہوا کوئلہ تکلیف کی جگہ اپنے ہاتھ پر رکھ کر یہ خط لکھ رہا ہوں جلتے ہوئے کوئلے سے جو تکلیف مجھے پہنچ رہی ہے۔ وہ اس شدید درد اور جلن کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے۔ جو میرے ہاتھ کے اندر ہے۔ کوئلہ رکھ لینے سے اس کی جلن کم محسوس ہو رہی ہے۔

اب سے چھ مہینے پہلے میں بہت خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا۔ مجھے وہ سب کچھ میسر تھا، جو ایک خوشحال اور فارغ البال زندگی کے لئے ضروری ہے۔ ایک سال پہلے میں نے ایک حسین نوجوان لڑکی سے شادی کی تھی۔ یہ بڑے اعلیٰ اخلاق کی لڑکی تھی اور بڑی فراخ حوصلہ اور خوش دل تھی۔ میرے گھر کے قریب کاؤنٹس رہتی تھی۔ یہ لڑکی ان کے یہاں معلمہ تھی۔ وہ بے چاری غریب تھی لیکن مجھ سے بڑی محبت کرتی تھی۔ ہماری زندگی بڑی خوشی اور مسرت سے گزر رہی تھی۔ ہر دن پچھلے دن سے زیادہ مسرت بخش تھا۔ اگر مجھے کسی کام سے باہر جانا پڑتا تھا تو اس کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہتی تھی اور جب میں واپس آتا تھا تو وہ گھر سے ایک میل فاصلے پر مجھے لینے کے لئے آتی تھی۔ اگر مجھے رات کو گھر واپس آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو اسے نیند نہ آتی تھی۔ جب کبھی میں ضد کر کے اسے کاؤنٹس کے یہاں بھیج دیتا تو دو تین گھنٹے سے زیادہ وہاں نہ ٹھہرتی تھی۔ کاؤنٹس اس پر بہت مہربان تھی اور اسے بہت چاہتی تھی۔ مختصر یہ کہ میری بیوی کو مجھ سے اس درجہ محبت تھی کہ میں نے آج تک کسی لڑکی کو کسی مرد سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا۔

خدا جانے شیطان نے میرے کان میں کیا پھونک دیا! میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ محبت دکھاوے کی ہو۔ مجھے دھوکا دیا جا رہا ہو اور یہ لڑکی ریاکاری سے کام لے رہی ہو! انسان کا خاصہ ہے کہ وہ اکثر انتہائی خوشی اور مسرت کی زندگی کے دوران میں اذیت و مصیبت کی تلاش شروع کر دیتا ہے میری بیوی کی ایک الگ میز تھی اس پر اس کی چند کتابیں اور

سینے پرونے کا سامان رکھا رہتا تھا۔ اس میز کی ایک دراز کو وہ ہمیشہ بند رکھتی تھی اور اس میں تالا لگا رہتا تھا۔ اس کی کنجی وہ بہت حفاظت سے اپنے پاس رکھتی تھی اور کبھی دراز کو کھلا نہیں چھوڑتی تھی۔ میں یہ بات بہت دن سے دیکھ رہا تھا اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس دراز میں ایسی کیا چیز ہے جس کو وہ اس قدر احتیاط کے ساتھ پوشیدہ رکھتی ہے۔ اب مجھے کرید لگ گئی طرح طرح کے شبہات ہونے لگے۔ مجھے اس کی معصوم صورت اور پاک صاف دل پر اعتبار نہیں رہا۔ اپنے لئے اس کی محبت بھی مجھے دھوکا اور فریب معلوم ہونے لگی۔ ایک روز صبح کو کاؤنٹس ہمارے یہاں آئیں اور میری بیوی سے کہنے لگیں کہ ہمارے ہاں کئی رشتہ دار عورتیں آرہی ہیں۔ تم بھی چلو۔ آج شام تک وہیں رہنا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نے کہا "مجھو ایک ضروری کام ہے میں تھوڑی دیر بعد آجاؤں گا"

جیسے ہی گاڑی مکان کے بیرونی صحن سے باہر ہوئی میں نے گھر کی ساری کنجیاں اکٹھی کرلیں اور دراز کے تالے میں ایک ایک کرکے لگانی شروع کیں۔ آخر ایک کنجی لگ گئی اور دراز کا تالا کھل گیا۔ یہ مجھ سے اپنی عمر کا پہلا جرم سرزد ہو رہا تھا۔ میں چور تھا۔ مجھے اپنی بیوی کا راز معلوم کرنے کی فکر تھی جب میں نے دراز کھینچی ہے تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ دراز کی چیزوں کو الٹا پلٹا، تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ کسی نے ان چیزوں کو چھیڑا ہے۔ میرا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ آخر میرا ہاتھ خطوں کے ایک پلندے پر پڑا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ایک بجلی کی رو میرے دل و دماغ میں دوڑ گئی ہو۔ یہ محبت کے خطوط تھے۔ انہیں کون نہیں پہچانتا۔ خطوط سرخ فیتے میں بندھے ہوئے تھے اور فیتے کے سروں پر چاندی کی گھنڈیاں تھیں۔

جیسے ہی میں نے فیتے کو چھوا۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ ان خطوں کو دیکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ ممکن ہے۔ یہ تمام خطوط اس وقت کے ہوں۔ جب میری بیوی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ میری نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت کے متعلق بدگمانی اور رشک و رقابت کا کیا حق حاصل ہے۔ جب وہ مجھے جانتی بھی نہ تھی۔ شیطان نے پھر میرے کان میں پھونکا "لیکن اگر یہ خطوط اس وقت کے ہوں۔ جب وہ تمہاری ہو چکی تھی؟" میں نے فیتہ کھولا اور ایک خط کھول کر پڑھا۔ پھر دوسرا پڑھا میں کیا بتاؤں میرا کیا حال تھا۔ میرے ساتھ نہایت شرمناک بے وفائی اور غداری کا برتاؤ کیا گیا تھا۔ یہ خطوط میرے ایک گہرے دوست کے تھے۔ ان میں شدید قسم کی محبت کا اظہار کیا گیا تھا اور بعض خطوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لکھنے والے کے پاس خطوں کے امید افزا جواب بھی پہنچتے رہے ہیں۔ قریب قریب ہر خط میں اس امر کی ہدایت تھی کہ خیال رکھنا کہیں خط کسی کے ہاتھ نہ پڑ جائے اور ہماری محبت کا راز فاش نہ ہو جائے اور یہ سب خط ان دنوں کے تھے جب ہماری شادی ہو چکی تھی میرے جذبات کی اس وقت کیا کیفیت تھی؟ اس کا اندازہ آپ خود کرسکتے ہیں۔ میں نے ہر خط کو شروع سے آخر تک پڑھا اور پھر ان کو اسی طرح فیتے میں باندھ کر رکھ دیا اور دراز میں تالا لگا دیا۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں دو پہر تک کاؤنٹس کے یہاں نہ پہنچا تو وہ سہ پہر تک ضرور واپس آجائے گی اور ایسا ہی ہوا بھی۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اتری میں سیڑھیوں پر کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہی محبت، وہی وارفتگی، جو ہمیشہ اس کا شعار رہا ہے۔ آج بھی تھی میں نے اپنے چہرے سے بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ میرے دل میں کیا طوفان برپا ہے ہم دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دونوں نے حسب دستور ساتھ کھانا کھایا۔ اور دونوں اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے۔ مگر میری آنکھ میں نیند کہاں! میں گھنٹے گنتا رہا۔ جب رات کا ایک بج گیا تو میں اٹھا اور سیدھا کمرے میں پہنچا۔ وہ غافل پڑی سو رہی تھی۔ اس کا خوبصورت سر سفید تکیے پر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مصور فرشتوں کی تصویریں سفید بادلوں میں دکھاتے ہیں۔ معصومیت کے روپ میں گناہ، قدرت کا کتنا خوفناک دھوکا ہے۔ میرا عزم ایک دیوانے کے ناعاقبت اندیشانہ ارادے کی طرح اٹل تھا۔ رشک اور بدگمانی کا زہر میری رگ رگ میں پوری طرح سرایت کر چکا تھا۔ میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ میں اسے قتل کردوں گا

میں یہاں تمام تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا مختصر یہ کہ وہ نہایت سکون کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوگئی۔ وہ کبھی مجھ سے برافروختہ نہیں ہوئی تھی۔ مرتے وقت بھی اس کی یہی کیفیت رہی۔ اس کے خون کا قطرہ میرے سیدھے ہاتھ کی پشت پر گرا تھا آپ کو معلوم ہی ہے یہ قطرہ کس جگہ گرا تھا۔ اس قطرے پر اگلے دن تک میری نظر نہیں پڑی تھی اور اگلے دن تک وہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ میں

نے اس کو دفن کر دیا۔ کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا۔ اس کے ماں باپ زندہ نہیں تھے اور کسی رشتہ دار کا بھی پتہ نہیں تھا۔ پھر کون مجھ سے پوچھتا اور میں نے اس کے مرنے کی کسی کو اطلاع کی نہیں، اس لئے کوئی وقت پر پہنچ نہ سکا۔ میں نے اپنے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ظلم ضرور کیا تھا مگر اس ظلم کی وہ مستحق تھی۔ اب مجھے اس سے نفرت نہیں رہے گی۔ میں اسے بھول جاؤں گا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اب اس کا بالکل خیال نہیں تھا۔ کسی کو قتل کرنے کے بعد قاتل کو کچھ پچھتاوا ضرور ہوتا ہوگا۔ مگر مجھے بالکل پچھتاوا نہیں تھا

دفن کرنے کے بعد جب میں گھر واپس آیا تو میں اسی وقت کاؤنٹس پہنچیں۔ میں نے اس ڈھنگ سے سب انتظامات کئے تھے کہ کاؤنٹس تک بر وقت نہ پہنچ سکیں۔ وہ کچھ اس قدر پریشان غم زدہ تھیں کہ مجھے تسلی دینے کے لئے بھی ان کے منہ سے جو لفظ نکل رہے تھے ان کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھیں وہ میں سن بھی رہا تھا، یا نہیں اور مجھے تسلی و تشفی کی ضرورت بھی تھی یا نہیں؟ سچی بات یہ ہے کہ مجھے بالکل رنج نہ تھا۔ کاؤنٹس نے بہت التفات کے ساتھ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہنے لگیں:۔

"مجھے آپ سے ایک راز کی بات کہنی ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کریں گے۔ میں نے آپ کی بیوی کو ایک خطوں کا پلندہ دیا تھا کہ وہ اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھے میں اس پلندے کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ مہربانی کر کے وہ پلندہ مجھے واپس کر دیجئے۔"

جب کاؤنٹس یہ بات کہہ رہی تھی تو کئی مرتبہ میرے دل پر دھچکا سا لگا۔ مگر میں نے بہت ضبط سے کام لیکر ان سے پوچھا کہ "وہ کس قسم کے خطوط ہیں کاروباری یا دوستانہ؟"

اس سوال پر کاؤنٹس کچھ جھلا سی گئیں اور کہنے لگیں "خطوں کا مضمون شاید آپ کے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ معاف کیجئے گا، آپ کی بیوی آپ سے زیادہ کشادہ دل اور بلند خیال تھیں۔ جب وہ خطوں کا پلندہ میں نے انہیں حفاظت سے اپنے پاس رکھنے کے لئے دیا تھا تو انھوں نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ یہ کس قسم کے خط ہیں۔ کتنی عالی ظرف اور شریف النفس تھی وہ عورت!"

میں نے کہا: "اچھا یہ تو بتلائیے، اس پلندے کی پہچان کیا ہے؟"

"وہ ایک سرخ فیتے سے بندھا ہوا ہے، جس کے سروں پر چاندی کی گھنڈیاں ہیں۔" میں نے اپنی بیوی کی کنجیاں اٹھائیں۔ گو مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ پلندہ کہاں رکھا ہوا ہے۔

لیکن میں نے یہ ظاہر کیا، جیسے وہ پلندہ مجھے کافی مشکل سے ملا ہے میں نے پلندہ کاؤنٹس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "کیا یہی ہے وہ پلندہ؟"

"جی ہاں یہی ہے۔ دیکھئے جس طرح میں نے فیتے میں گرہ لگائی تھی بالکل اسی طرح لگی ہوئی ہے۔" میں آنکھیں نیچی کئے بیٹھا تھا مجھے ڈر یہ تھا کہ اگر میں نے اس کی طرف دیکھا تو کہیں وہ میری آنکھوں سے یہ نہ معلوم کرلے کہ میں نے فیتے کی گرہ کو کھولا تھا اور میں کچھ اور بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ میں نے ایک نہایت ضروری کام کا بہانہ کر کے کاؤنٹس سے رخصت حاصل کر لی اور وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ خون کا قطرہ ہاتھ پر سے چھوٹ گیا ہے۔ درد کی کوئی ظاہری علامت موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود جس جگہ ہاتھ پر خون کا قطرہ گرا تھا وہاں پر انتہائی تکلیف ہے اور یہ تکلیف ہر گھنٹہ زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ مجھے کبھی کبھی نیند آجاتی ہے لیکن تکلیف کا احساس کبھی نہیں جاتا۔ آپ میری تکلیف کی شدت دیکھ چکے ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ دونوں مرتبہ کے آپریشن سے میری تکلیف کم ہوئی لیکن جیسے ہی زخم مندمل ہوا تکلیف پھر لوٹ آئی۔ اب تیسری مرتبہ وہی درد اور وہی سوزش موجود ہے۔ اب مجھ میں اسے برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ ہاں، ایک خیال سے مجھے کچھ تسکین ہوتی ہے۔ میری بیوی نے مجھ سے اسی دنیا میں بدلہ لے لیا اور شاید دوسری دنیا میں وہ مجھے معاف کر دے آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے میں اس کے لئے آپ کا بہت شکر گزار ہوں خدا آپ کو اس کی جزا دے۔" چند روز بعد اخباروں میں اس کی خودکشی کی خبر شائع ہوئی۔ بعض لوگوں نے اس خودکشی کا سبب بیوی کی موت کا غم قرار دیا دوسرے لوگوں نے ایک لاعلاج زخم کو اس کا سبب ٹھہرایا لیکن جو لوگ اس کے حالات سے زیادہ واقف تھے وہ کہتے تھے کہ بے چارہ مالیخولیا میں مبتلا تھا اور اس کے لاعلاج زخم کا وجود سوائے اس کے خیال کے اور کہیں نہیں تھا۔

(بشکریہ "ہمدرد صحت")

دیس بدیس ———

کراے کے آنسو

• ——— سمیرا عزام
• ——— ضیاء الحسن موسوی

یہ تو میں نہیں بتا سکتی کہ "خانم" نے بیک وقت "مرنے پیٹنے" اور "بال کھلنے" کا فن کہاں سے سیکھا تھا لیکن اس کو دیکھنے سے بہت پہلے ہی میں اس کے متعلق بہت کچھ سن چکی تھی اور جب ہمسائے میں ایک غمی ہو گئی تو مجھے خانم اور اس کے آرٹ کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔

گزرنے والا ہمسایہ ایک عرصہ سے بیمار تھا۔ پچاس برس کی عمر سے پہلے ہی اس کو بے شمار روگ لگ چکے تھے۔ اس لئے جب ایک صبح ہمسائی نے حسینہ کی اماں کو آواز دی: "حسینہ کی اماں کچھ سنا تم نے؟ جان سے دور ابراہیم گذر گئے" تو سننے والوں کو کوئی اچنبھا ہوا نہ کہنے والی کی آواز ہی میں کوئی تھرتھراہٹ

میں نے سوچا کہ چلو آج کا دن تو ملیا میٹ ہوا، پھر خیال آیا کہ چلو اچھا ہے۔ نہ اسکول نہ گھر کی چار دیواری، ہمجولیاں ہوں گی اور سیر گشت اور یہی ہوا کہ عائشہ کا ہاتھ پکڑ کے میں ہجوم میں گھس پل کے دروازے کے قریب جا پہنچی جہاں ہمارے ایسے اور بھی "ناسمجھ" جنازہ نکلنے کا تماشہ دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ ہم سب دور ہی سے گزرنے والے کا مومی چہرہ دیکھتے رہے۔ گھٹی گھٹی سسکیاں سنتے رہے اور موت کے متعلق اپنے طفلانہ فلسفہ کا مظاہرہ کرتے رہے کہ یکایک ایک بھونچال آگیا۔ خانم آگئی اور وہ دروازے میں گھستے ہی سیدھی میت کے سرہانے گئی۔ برقع اتارا جیب سے کالا رومال نکالا اور سر پہ باندھ کے اب جو ایک چیخ ماری ہے تو میرا تو دم ہی نکل گیا ——— پھر وہ عورتوں کو ہٹاتی گھر ڈیوڑھی کے پاس گئی دو چار چلو منہ پر مارے اور اب جو پلٹی ہے تو اس کے منہ پہ تیل، سرخی اور پوڈر ان سب نے مل کر عجیب سی قطع بنا دی تھی جیسے میلوں میں "تیجے" ملتے ہیں طرح طرح کے بھیانک چہرے جن کو منہ پر لگا کر بچے ایک دوسرے کو ڈراتے ہیں اور اب خانم نے سینہ کوٹ کوٹ کر اور زانو پیٹ پیٹ کر جو بین شروع کئے ہیں تو سننے والوں کے دل دہل گئے، معلوم ہوتا تھا کہ خانم صرف ابراہیم ہی کو نہیں بلکہ شہر کے تمام نیک آدمیوں کو پیٹ رہی ہے اس نے مرنے والے کے اعزا کو ان کا رشتہ یاد دلا کر مرحوم کی محبت کا ذکر کیا، صبر کی تلقین کی جزع فزع کی حرمت کا بھی ذکر کیا اور دھاڑیں مار مار کر روتی بھی گئی۔ منہ بھی پیٹا اور سینہ بھی، اس کی زبان تھی کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ اس کی آواز میں الوؤں کی سی خوفناک گونج تھی اگرچہ سب ہی یہی سمجھ رہے تھے کہ خانم کا رونا پیٹنا اس کے معاوضے کے مطابق ہوتا ہے جو اسے ملا کرتا ہے پھر بھی اس نے عجیب سوگوار سا ماحول پیدا کر دیا تھا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب اٹھانے والے آئے اور چارپائی لے چلے تو خانم چلائی، "ارے سنگدلو ایسے پیارے آدمی کو اتنی جلدی تو ہم سے جدا نہ کرو۔" حتیٰ کہ ایک اٹھانے والے نے اس کو دھکا بھی دیا اور جب کالے رومال کھل گئے اور اکثر لوگ پرسا دے کے واپس ہونے لگے تب بھی خانم کی آواز گلی سے آ رہی تھی جہاں وہ روتی پیٹتی جنازے کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی اور جب تھکے ماندے مہمانوں کے لئے دسترخوان بچھا تو منہ دھو لئے، آستینیں چڑھا لئے اور بسم اللہ کہہ کر لقمہ اٹھانے میں خانم سب سے آگے تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ پہلو میں رکھے ہوئے رومال میں کچھ جمع کرتی جاتی تھی اور خود ہی وہ کہنے لگی۔ "مسعود کے لئے لے جاؤں گی جب سے یہ خبر سنی ہے کھانے پکانے کا کسے ہوش تھا اور پھر اس کھانے میں ثواب بھی تو ہے۔"

اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اور عورتوں کی طرح خانم صرف ایک عورت نہیں، بلکہ وہ موت کے لئے "مرثیہ" سے بھی زیادہ اہم "ضرورت" ہے اور اس دن کے بعد جس غمی میں بھی جاتا ہوا میری نظر زیادہ تر خانم ہی پر رہی، کس غضب کا آرٹ تھا اس کا؟۔

کچھ دن کے بعد ایک شادی میں ہم لوگ مہمان گئے اور میں وہاں خانم کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کہیں میری نظریں دھوکہ تو نہیں دے رہی ہیں؟ وہی گھنیرے بال مگر پٹیاں جمی ہوئی۔ مینڈھیاں گندھی ہوئی رنگ برنگے

لپ گئے ہوتے۔ دہی بھدا چہرہ مگر سرخی پوڈر کی بدولت بھیانک نہیں وہی بڑی ای آنکھیں مگر بچھے ہوئے دیدوں میں کاجل لگا ہوا العبد نہالہ کھنچا ہوا گلے میں ؤ اور طوق، ہاتھوں میں ٹھونس کڑے، بازوؤں میں جوشن اور کانوں میں لیاں پتے (کون کہتا ہے کہ مردوں کا کاروبار مندا ہے ؟)

پینڈیوں کے ٹکڑے منہ میں ٹھونستے ہوئے، اس کا قہقہہ لگانا، اٹھنا رمہندی اور مانجھے کی رسموں کی تفصیلات بتانا، رسموں اور شگونوں میں آگے گے رہنا یہ سب میں حیرت سے دیکھتی رہی اور سمجھ گئی کہ خانم کا دلہنوں سے بھی بتوں جیسا رشتہ ہے۔

دلہن کے مانجھے بیٹھنے کے وقت سے اس کی ڈیوٹی شروع ہوتی تھی لہن کو اس نے سنوارا، مہمانوں کی خاطر مدارات کی اس نے، سواریوں کے کرایہ ے لئے کوچوانوں سے وہ لڑی۔ نان بائی سے روٹیاں اس نے گنوائیں، باورچی ، دیگوں کا نمک اس نے چکھا اور پھر آتے جاتے دلہن کو "شب عروسی کے لئے وہ سکھاتی رہی: "میری مانو گی تو خصم غلام بن کے رہے گا" اور پھر اٹھنا رمہندی اور سہاگ پٹے کی تجارت الگ۔ ہر قسم کا لچھے سے اچھا مال اس کے ں موجود۔ اب جیسی حیثیت اور ویسے ہی دام ہوں ؟

عین برات کے دن جب دولہا اندر آیا تو وہ مٹکتی چمکتی آگے آگے تھی رایسے ایسے مذاق کر رہی تھی کہ کنواریوں کو پسینے آئے جاتے تھے اور پھر اس کا نس، اس کے گیت اور اس کی نقلیں غرض ہر طرف خانم ہی خانم نظر رہی تھی اور جب دولہا حجلۂ عروسی میں گیا تو خانم چوکیدار کی طرح دروازے کھڑی رہی۔ اور . . . . . کراہنے کی آواز سنتے ہی وہ اندر گئی اور گھڑی ر میں وہ باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک سفید چادر تھی جس پر گہرے الی دھبے تھے اور عورتوں کی رسم کے مطابق وہ اس چادر کو لہرا لہرا کے رہی تھی "عصمت کا گیت" جس کو سن کے دلہن والے خوش ہو رہے تھے ر دولہا والے مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے اور دلہن کی اماں خانم کو مسعودہ ے پھلنے پھولنے کی دعائیں دے رہی تھیں۔ مگر یہ دعائیں قبول نہ ہوئیں رخانم مسعودہ کا سکھ نہ دیکھ سکی . . . . .

وہ گرمیاں مجھے خوب یاد ہیں۔ جب بستی میں میعادی بخار طوفان طرح پھیلا ہوا تھا اور اس کے جراثیم خانم کے لئے دولت مندی کا پیغام ہے تھے جیسے جنگ میں چور بازار والوں کی بن آتی ہے۔ کوئی دن ایسا نہ ہوتا جب خانم کا کوئی نہ کوئی گاہک نہ ہوتا کبھی کبھی تو سننے میں آتا کہ وہ تین تین دن گاہکوں کو رونے گئی تھی۔

مگر یہ جراثیم ایک دن خود خانم کے گھر پہنچ گئے اور مسعودہ کے خون میں سرایت کر گئے اور خانم کی ہزاروں منتوں اور مرادوں کے باوجود انھوں نے ایک رات دروازہ کھول کر چپکے سے موت کو اندر بلا لیا۔

صبح ہوتے ہی یہ خبر آگ کی طرح بستی میں پھیل گئی۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، دیکھیں خانم اپنی اکلوتی کا سوگ کیسے مناتی ہے؟

کہنے والوں کا خیال تھا کہ اس کی ایک چیخ زمین پر ہوگی اور دوسری آسمان پر، وہ کہرام ہوگا کہ یاد رہے گا میں بھی خانم کے ہاں پہنچی آج ہر ایک کو اس کا کچھ نہ کچھ قرضہ اتارنا تھا۔

کمرے میں بیس پچیس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی اس لئے اکثر مہمان باہر دالان اور صحن میں تھے۔ خانم کی آواز نہ سن کے میں بیتابی سے اسے تلاش کرنے لگی۔ آخر میں نے اسے ڈھونڈ نکالا کمرے کے ایک کونے میں وہ خاموش بیٹھی تھی، ہائیں؟ نہ سر پہ کالا رومال نہ گالوں پر نیلے دھبے، نہ آنکھ میں آنسو نہ لب پر نالہ، نہ کوئی چیخ۔

عمر میں پہلی مرتبہ میں نے ایک ایسے انسان کو دیکھا جو مجسم احساس ہی احساس تھا۔ نہ کوئی حرکت، نہ ردِ عمل فقط احساس فقط احساس ایک خاموش کرب ایک رکا ہوا نالہ، ایک گونگا طوفان۔ مگر بعض عورتوں نے بھول بھول کرکے رونے کی کوشش کی بھی تھی مگر خانم نے ان کو ایسی وحشت زدہ نظروں سے دیکھا کہ وہ شرمندہ سی ہو کے خاموش ہو گئیں اور جب اٹھانے والے آئے تو نہ اس نے چھاتی پیٹی نہ ان کو واسطے دے کے روکنے کی کوشش کی۔ بلکہ خاموش خود بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسی طرح خود فراموشی کے عالم میں وہ قبرستان تک گئی اور وہاں چپکی بیٹھی رہی جب سب فراغت کر کے واپس ہونے لگے تو وہ اٹھی لپکی اور قبر پر سر رکھ کر پڑ گئی جیسے وہ مسعودہ کو کھلا رہی ہو ـــــ لوگ پلٹے تو طرح طرح کی باتیں کرتے ہوئے ارے صدمہ سے وہ پاگل ہو گئی ہے پاگل! مگر پاگل بن کے وہ عقلمند ہو گئی ہے!

اس کے پاس آنسو باقی ہی کہاں تھے جو اپنی بچی پر صرف کرتی ؟ عائشہ کا خیال تھا کہ خانم کے آنسو تو کرائے کے لئے تھے۔ وہ گن گن کے ہر آنسو کا کرایہ وصول کرتی تھی اب یہاں کون بیٹھا تھا جو اس کو کرایہ دیتا۔

(بشکریہ نقش)

یادِ رفتگاں ——

- ——— بہادر یار جنگ
- ——— مولانا آزاد سبحانی
- ——— چراغ حسن حسرت
- ——— مجید لاہوری
- ——— سر آغا خاں

کیسے کیسے لوگ یہاں آئے!
آ کے چلے گئے!!

مرتبہ : محمود فاروقی

بہادر یار جنگ

اس سہ ماہی میں جن ممتاز شخصیتوں کی یاد منائی گئی ان میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کی یاد میں قوم خراج عقیدت پیش کرتی ہے لیکن یہ خراج عقیدت ان کی زندگی کے کسی نہ کسی گوشہ کی حد تک ہی محدود رہتا ہے کسی کے فنی اور ادبی کمال کو قوم سراہتی ہے تو کسی کی اجتماعی اور ملی خدمات کا اعتراف کرتی ہے بہت کم ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جن کے کسی روشن پہلو کا لوگوں کے دلوں پر اثر نہ ہو، بلکہ ان کی پوری پوری شخصیت قوم کے نزدیک تعظیم و احترام کے لائق سمجھی جائے اور مشکل ہی سے ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا ملے جس پر انگلی رکھی جاسکے ——— نواب بہادر یار جنگ ایسی ہی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ان کی زندگی ذاتی بھی اور اجتماعی طور پر ہر حیثیت اور ہر رنگ میں ایک مثالی زندگی تھی۔ اسی لئے ہر سال ۲۵ جون کو جب بھی ان کی یاد منائی جاتی ہے ان کی خدمات کو سراہا جاتا ہے تو صرف دماغ ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ دفورِ جذبات سے دل بھی بھر آتے ہیں۔

بہادر یار جنگ ——— ایک شخص نہیں ایک قوم تھے۔ حیدرآباد کے مسلمانوں کے ملی وجود کے لئے وہ گھڑیال کے پنڈولم کی مثال رکھتے تھے۔ جب تک ان کی سانس چلتی رہی اس ملی وجود میں زندگی کی رَو دوڑتی رہی اور زمانہ کی سوئی اس کی اہمیت اور وقار کے فاصلے طے کرتی چلی گئی اور جب یہ پنڈولم رُک گیا حیدرآباد کے مسلمانوں کا ملی وجود بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گیا۔

بہادر یار جنگ ——— ایک شخص نہیں بلکہ ایک دور تھے۔ ان سے پہلے حیدرآباد کے مسلمان جاگیرانہ تہذیب کی افسردگی، بے عملی اور بے خبری کا نشانہ بنے ہوئے تھے ان کو اپنی خبر تھی اور نہ دنیا کی ——— ان کے بعد حیدرآباد کے مسلمان اپنی قومی اور ملی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور غیر اسلامی تہذیب و سیاست کے سیلاب نے ان کو بہا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا ——— صرف درمیان کا دور ہی وہ دور تھا جس میں حیدرآباد کے مسلمان نے زندہ رہنا سیکھا، زندگی کے رموز سے آگاہی حاصل کی۔ سعی و جہد کے ذوق سے آشنا ہوا۔ زندگی کو برتنے کا سلیقہ حاصل کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ علم و عمل کی کئی منزلوں کو طے کر گیا۔ اور یہ دور بہادر یار جنگ کا دور تھا۔ یہ دور خود بہادر یار جنگ تھا جس نے سوتوں کو جگایا، جاگتوں کو دوڑایا۔ گرتوں کو سنبھالا اور زندگی کی راہ پر چلنے کی ایک چراغ کی طرح جلتا رہا۔

افغانوں کے قبیلہ سدوزئی کا یہ چشم و چراغ ۳ فروری ۱۹۰۵ء کو "مہدوی منزل" بیگم بازار شہر حیدرآباد دکن میں تولد ہوا اصل نام تو بہادر خاں تھا، نظام دکن کی طرف سے بہادر یار جنگ کا خطاب ملا۔ ان کے والد نواب نصیب یار جنگ ثالث حیدرآباد کے ایک ممتاز جاگیردار تھے لیکن

اجداد آخری مغل عہد میں ہندوستان آئے اور پہلے جے پور میں مقیم رہے بعد میں حیدرآباد منتقل ہو گئے اور یہاں فوجی مناصب پر فائز رہے
۳ ہزار کی نسلاً بعد نسل جاگیر پائی۔ نواب بہادر یار جنگ کی تعلیم و تربیت کسی مدرسہ کی مرہون منت نہیں بلکہ وہ فاضل اساتذہ سے گھر پر بھی پڑھے
اور بعد میں جو کچھ حاصل کیا وہ اپنے علمی ذوق اور ذاتی مطالعہ کی مدد سے حاصل کیا۔ مرحوم اردو، فارسی، عربی، پشتو، تلنگی زبانوں پر اچھی خاصی
ت رکھتے تھے۔ انگریزی لکھنے بولنے میں بھی ان کو کوئی دقت نہیں ہوتی تھی حجاز، فلسطین، شام، مصر، ترکی، ایران اور افغانستان کی سیاحت
ے تھے اور عالم اسلام کے مسائل سے بخوبی واقف تھے، اُنھوں نے سیاسی، سماجی خدمات کے سلسلہ میں قومی زندگی میں ایک نمایاں پارٹ انجام
یک عرصہ تک ریاستی مسلم لیگ کے صدر رہے اور آخر دم تک حیدرآباد کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم مجلس اتحاد المسلمین کے صدر رہے
کے علاوہ صدر مجلس تبلیغ، صدر کل ہند مہدویہ کانفرنس، معتمد مجلس جاگیرداران، رکن مجلس یونیورسٹی کورٹ، رکن کل ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
ست انجمن مسکرات کی حیثیت میں اہل وطن کی خدمات انجام دیں ۱۹۴۳ء میں عوامی تحریک کے تقاضہ پر خطابات و جاگیرات سے دستبرداری
ر کر لی اور ایثار و استغنا کی ایک مثال قائم کی۔ پاکستان کے ذہنی خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے اُنھوں نے جو کچھ کیا وہ ہر ایک پر
ن ہے مسلم لیگ میں وہ اس گروپ کے ممتاز فرد تھے جو اس قومی تنظیم کو سیکولرنیشنلزم سے بچانے اور اسے ایک خالص اسلامی تحریک میں ڈھالنے
یفہ انجام دے رہا تھا۔ اس سلسلہ میں انکی کراچی کی تقریر ان کی حق پسندی اور جرأت ایمانی کی واضح مثال ہے۔ تقریر و خطابت میں ان جیسا
ربیان لیڈر دوسرا کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ اپنے سراپا، اپنی شخصیت اپنے خیالات و افکار کے ساتھ ساتھ ہو بہو اقبال کے مرد مومن کی مثال
_____ " نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز"

یہ ساری خصوصیات ان میں موجود تھیں جو ان کو دوسرے تمام رہنماؤں کے مقابلہ میں ایک نمایاں مقام دیتی تھیں کہا جاتا ہے کہ ان کو کسی سازش
ت زہر دے دیا گیا۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ خواہ کوئی وجہ ہو ۳۹ سال کی عمر میں موت کے ظالم ہاتھ نے اس متاع بے بہا کو ہمارے ہاتھوں سے
جون ۱۹۴۴ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لیا ______ " خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را "

مولانا آزاد سبحانی

برعظیم پاکستان و ہند کے مسلمانوں کو حال میں جن عظیم مسلم رہنماؤں کی وفات کا صدمہ سہنا پڑا ان میں مولانا آزاد سبحانی منفرد شخصیت کے مالک
ن کا اصل نام عبدالقادر تھا ان کی پیدائش کی تاریخ سنہ ۱۸۸۲ء ہے اور وہ ۲۴ رجب سنہ ۷۵ء کی شب کو گورکھپور میں انتقال کر گئے لیکن
ت مولانا کا انتقال اس سے بہت پہلے ہی ہو چکا تھا عرصہ دراز تک ملک و قوم سے اپنی خطابت اپنی انشاپردازی مذہبی اور سیاسی رہنمائی کا
ولنے کے بعد دنیا کے نشیب و فراز نے ان کو نظروں سے اوجھل کر دیا اور جس شخص کے ہر قول و حرکت کی خبر جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا کرتی تھی
نام تک کسی کو یاد نہ رہا۔ قوم نے انھیں بھلا دیا اور وہ قوم سے مایوس ہو کر عرصہ تک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ مولانا کی سیاسی زندگی
ز مسجد مچھلی بازار کانپور کے مشہور تاریخی سانحہ سے ہوتا ہے مولانا اس وقت مدرسہ الٰہیات کانپور کے بانی اور پرنسپل تھے۔ یہ ادارہ دراصل
نے آریہ سماجیوں کے پہلے فتنہ ارتداد یعنی شدھی کی تحریک کے جواب اور مقابلہ کے لئے تیار کیا تھا جس میں ایسے مبلغین کو تربیت دی جاتی
غیر مذاہب کے عقائد و مزعومات کا مقابلہ کر سکیں۔ انگریزوں کے ہاتھوں مسجد کے انہدام پر مولانا درسگاہ سے اٹھ کر پلیٹ فارم پر آ گئے، مولانا
پر جوش تقریر کا اثر تھا کہ سینکڑوں مسلمان خانۂ خدا کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو گئے اور یہی وہ فائرنگ ہے جس نے متحدہ ہندوستان کے
ن کو خواب غفلت سے چونکایا اور اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سیاسی بیداری کی رو دوڑا دی۔ اور اسی حرکت و عمل نے تحریک خلافت
ل مسلم لیگ اور مسلمانوں کی دوسری عوامی تحریکوں کے نئے راستے کھول دیا۔ اس طرح مولانا آزاد سبحانی ہماری قومی اور ملی بیداری کے لئے
آغاز ثابت ہوئے۔ مولانا ایک عرصہ تک کانگریس کے ساتھ رہے۔ تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت میں بڑے زور شور سے

حصہ لیا اور بذات خود تحریک دعوت اور خلافت ربانی کے نام سے دو تنظیمیں چلاتے رہے۔ مطالبۂ پاکستان کے موقع پر مولانا مسلم لیگ کے پرجوش کارکنوں میں شامل تھے اور ان کی سحر بیانی نے پاکستان کے مقصد کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ تقسیم کے بعد مولانا کے خیالات میں پیرانہ سالی کی وجہ سے بڑا اختلال پیدا ہو چلا تھا اور وہ اسلام و سوشلزم کے ملے جلے تصورات کا ایک فکری آمیزہ سا بنائے بیٹھے تھے۔ اسی زمانہ میں الہ آباد میں میری ان سے دو تین بار ملاقاتیں ہوئیں۔ تبادلۂ خیال میں ایک دم پرجوش ہو جاتے اور دلائل کے بجائے جذباتی مظاہرے سے بات منوانے پر مصر ہو جاتے تھے ایک تو بڑھاپا۔ دوسرے قومی زندگی سے مایوسی اور بے زاری نے ان میں یہ جھنجھلاہٹ پیدا کر دی تھی لیکن مجھے ان کی جس بات نے متاثر کیا وہ ان کی سادگی تھی۔ ایک کرتا، ایک تہہ بند، کپڑے کی ٹوپی لکڑی کی کھڑاؤں اور کھدر کا تھیلا اور ان سب کے ساتھ ۲۰ سالہ سیاسی سماجی خدمات کا پشتارہ عالم اسلام کی سیاحت کا تجربہ ——— بس پورے کے پورے ایک مرد قلندر جو اپنی دھن میں چلتا رہا۔ دنیا کی پروا کی نہ اس سے ڈرا اور جب دنیا اسے بھول گئی تو اس نے بھی دنیا کو بھلا دیا اور آخر کار ۵ ۷ سال کی عمر میں اپنے رب سے جا ملا۔

چراغ حسن حسرت

اخباروں اور رسالوں میں سب سے زیادہ اہمیت طنز و مزاح کے کالم کی ہوتی ہے۔ پھکڑ بازی تو ہر ایک کر لیتا ہے لیکن سنجیدہ طنز اور شگفتہ مزاح لکھنا ہر ایک کے بس کا نہیں۔ اردو صحافت کا سب سے بڑا مرکز لاہور رہا ہے اور لاہور میں سب سے اچھا طنز و مزاح لکھنے والے مولانا چراغ حسن حسرت تھے جن کی عمر کا چراغ ۲۶ جون سنہ ۵۴ء کو گل ہو گیا۔ چراغ حسن حسرت ۱۹۰۴ء میں بارہ مولا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اردو اور فارسی کی تعلیم کے علاوہ بی اے تک باقاعدہ نصابی تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ شملہ میں مدرس رہے۔ ۱۹۲۵ء سے کلکتہ میں ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ کلکتہ کے مشہور اخبار عصر جدید میں کچھ عرصہ کام کیا۔ پھر ایک ادبی پرچہ آفتاب کے نام سے خود نکالا۔ جب یہ آفتاب ڈھل گیا تو کوچہ گرد کے نام سے " نئی دنیا میں لکھنا شروع کیا۔ نئی دنیا کا کالم " کلکتہ کی باتیں " چراغ حسن حسرت کی شوخیٔ تحریر کی وجہ سے بڑا مقبول ہوا چنانچہ مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علیخاں بھی اس کالم کے مداحوں میں تھے۔ اسی کالم کے تعارف سے وہ مولانا ابوالکلام کے جریدہ پیغام میں پہنچ گئے۔ یہاں ان کو مولانا ابوالکلام سے استفادہ کا خوب ہی موقع ملا۔ جب وہ لاہور پہنچے تو ان سے پہلے ان کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی چنانچہ زمیندار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کچھ عرصہ بعد انھوں خود انصاف کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا لیکن دنیا اس پرچہ کے ساتھ پورا پورا انصاف نہ کر سکی۔ اور حسرت مجنوں کے ——— پرچہ پھول اور عورتوں کے ماہنامہ تہذیب نسواں میں کام کرنے لگ گئے تحریک کشمیر کے دوران میں " احرار " نامی اخبار کے مدیر مقرر ہوئے اور پھر وہاں سے زمیندار واپس آ گئے۔ جب زمیندار سے دل بھر گیا تو روزنامہ احسان کے اجرا پر اس کو ممنون احسان کیا۔ دوسرے عالمگیر جنگ سے پہلے ایک روزنامہ شہباز جاری کیا کچھ عرصہ تک ڈاکٹر ستیہ پال کے روزنامہ نیشنل کانگریس سے بھی منسلک رہے ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو میں چلے گئے۔ پھر ہفت روزہ پنچایت میں پہنچے۔ اسکے بعد فوج میں ملازم ہو گئے اور " فوجی اخبار " مرتب کرنے کے بعد ملایا بھیج دئے گئے۔ جہاں دو روزناموں کے ایڈیٹر بنا دئے گئے جب فوج سے علیحدہ ہوئے تو " میجر " بن چکے تھے۔ حالانکہ انھوں نے صرف شمشیر قلم سے معرکہ آرائیاں کی تھیں۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا حسرت نے امروز کی ادارت سنبھالی، ۱۹۵۱ء میں امروز سے الگ ہو کر ریڈیو پاکستان کے نیشنل پروگرام کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اس سے الگ ہو کر کراچی میں درسی کتابیں لکھتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں لاہور واپس ہوئے اور روزنامہ نوائے وقت میں حرف و حکایت کا کالم لکھتے رہے، ۲۶ جون کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور حرف و حکایت لکھنے والا دنیا کے لئے حرف و حکایت بن گیا۔

حسرت کی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کسی شخص کے حالات نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ ایک بہت لانبا چوڑا

جہازی سائز کا اخبار پڑھ رہے ہیں۔ بلاشبہ حسرت ایک جہازی سائز کا ضخیم اخبار ہی تھے جس میں ہماری قومی زندگی کے ہر مرحلہ کی داستان مرقوم تھی۔ وہ ایک عظیم صحافی، بے مثل نثر نویس، زبردست نقاد اور نہایت ہی خوش کلام غزل گو تھے ان کی زندگی اس بات کو بھی واضح کرتی ہے کہ اگر لکھنے والے کا قلم کسی مستقل فکر اور زاویہ نگاہ کا پابند نہ ہو تو پھر ایسا "رخش تحریر" بن جاتا ہے کہ اس کے سوار کے ہاتھ نہ تو باگ پر رہتے ہیں اور نہ پا رکاب میں اور وہ ہر وادی میں جولانیاں دکھاتا رہتا ہے۔ اگر چراغ حسن حسرت جیسے عظیم صحافی کے لئے ایسا ماحول اور ایسے مواقع پیدا ہو جاتے کہ وہ کسی مستقل تعمیری فکر کے لئے اپنی ذہنی صلاحیتوں سے کام لے سکتے تو بلاشبہ ان کی رواں تحریر ملک و قوم کے بیڑے کو ساحل مراد تک پہنچانے میں بڑا کام کرتی۔ لیکن وا حسرتا کہ وہ کنارے لگ گئے اور ہماری کشتی ابھی منجدھار میں پھنسی ہوئی ہے

مجید لاھوری

اردو صحافت میں مجید لاہوری کا وہی مقام تھا جو کھانے میں نمک کا ہوتا ہے۔ مجید لاہوری دنیا سے کیا رخصت ہوئے، ہماری صحافت کا دستر خوان پھیکا پڑ گیا۔ طنز و مزاح کے کالم لکھنے والوں میں ان کا ایک مخصوص رنگ تھا جس میں فنی تکلف اور تصنع کے بجائے سادگی اور عام بول چال کا انداز تھا اور یہی وہ خصوصیت تھی جس کی وجہ سے مجید لاہوری عوام و خواص ہر طبقہ میں ہر دل عزیز ہو گئے تھے وہ عام ادیبوں کے دکھ درد سے بخوبی واقف تھے اسی لئے وہ پبلک کی مشکلات کو اونچے ایوانوں تک بڑی بے تکلفی اور جرأت کے ساتھ پہنچاتے رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ مجید ایک عام گھرانے میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تھوڑی بہت تعلیم پائی۔ اور اپنی ابتدائی زندگی میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور عملاً انھوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کو روزمرہ کی زندگی میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؛ ان کے والد کراچی میں ایک اوسط درجے کا ہوٹل چلاتے تھے۔ والد کے انتقال کے وقت مجید لاہوری کی عمر ڈیڑھ برس کی تھی اسی لئے ان کے بعض رشتہ داروں نے ہوٹل پر قبضہ کر لیا۔ اور مجید لاہوری کی والدہ نے بڑی مشکلوں سے ان کو میٹرک تک تعلیم دلائی۔ تعلیم کے بعد ان کی نوجوانی کا زمانہ زیادہ تر بے روزگاری اور بے کاری میں گذرا۔ لاہور میں نوکری کی تلاش کرتے رہے۔ سابق صوبہ پنجاب میں جب انتخابی مہم شروع ہوئی تو یونینسٹ پارٹی نے معمولی مشاہرہ پر انہیں ملازم رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ انقلاب، آواز، شہباز وغیرہ میں ملازم رہے اور یہیں سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد لاہور سے کراچی لوٹ آئے اور مقامی اخبارات کے کالم لکھ کر گذر بسر کرتے رہے قیام پاکستان کے بعد اخبار انجام میں مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد روزنامہ جنگ نے اپنے حرف و حکایت والے کالم کے لئے ان کی خدمات حاصل کر لیں جنگ کے اسی کالم سے ان کی شہرت کا آغاز ہوتا ہے۔ اپنے اسی کالم میں انھوں نے سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے لئے علامتی کردار تخلیق کئے۔ سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی، مولوی گل شیر خاں، سائیں سلیمان، رمضانی، چمن خاں اور بدھو ان کے کامیاب مزاحیہ کردار ہیں، جو اپنی بول چال، سمجھ بوجھ اور رویہ میں ہمارے مختلف طبقوں کی سیرت اور ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں ان کے قلم نے سربرآوردہ لوگوں کے سر سے مسلمہ ستارے والی ٹوپی اتار پھینکنے میں تامل کیا اور نہ "رمضانی" کے چاک گریباں کی نمائش میں کوئی جھجھک محسوس کی۔ بڑی بے باکی کے ساتھ وزیروں، حکومت کے سربراہ کاروں اور سرکاری افسروں، برخود غلط ملاؤں، خدا ناشناس سرمایہ داروں کی کج کلاہی اور غلط خرامی پر کڑا احتساب کیا۔ دوسری طرف انھوں نے ہمارے عوام کو بھی ایک بہتر زندگی کے رنگ ڈھنگ سے آگاہ کیا اور یہ ساری باتیں انھوں نے واعظ، مصلح بن کر نہیں نہ عالم فلسفی بن کر بلکہ ہر ایک کا خیر خواہ دوست بن کر اور وہ بھی بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہنستے بولتے۔ یہ بڑے ظرف و حوصلہ کی بات ہے اور مجید میں یہ ظرف و حوصلہ تھا ان کا دل بغض و کینہ حسد و دشمنی کے جذبات سے پاک تھا۔ اس لئے وہ ہر ایک کے دوست تھے اور ہر ایک ان کو اپنا دوست سمجھتا تھا۔ انھوں نے سات سال ہوئے ایک ہفت روزہ "نمکدان" بھی جاری کیا۔ یہ فکاہی جریدہ اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے بڑا مقبول ہوا۔ لوگ بڑے اشتیاق سے نمکدان کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ آواز کی دنیا یعنی ریڈیو کے پروگراموں میں بھی ان کی شرکت نے جان ڈال دی تھی۔ ان کا مخصوص پروگرام "وغیرہ وغیرہ"

ریڈیو سننے والوں کا پسندیدہ پروگرام تھا۔ مجید لاہوری جن کا اصلی نام عبدالمجید چوہان تھا، سراپا ایک مزاحیہ کالم تھے جس کو دیکھ کر ہی لبوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی تھی لیکن وہ محض مزاح نویس ہی نہیں بلکہ اچھے شاعر بھی تھے۔ ابتدا میں ان کی نظمیں اور غزلیں بڑی متین اور سنجیدہ ہوتی تھیں لیکن بعد میں ان کا رجحان نثر کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی مزاح کی طرف مائل ہوگیا اور اس رنگ میں اُنھوں نے بڑی اچھی مزاحیہ نظمیں لکھیں جو ان کی مزاحیہ نثر سے بڑھی چڑھی ہوتی ہیں۔ مرحوم اپنے شعری کلام کا ایک مجموعہ "دورِ آسماں" مرتب کر رہے تھے جو مرتب و شائع نہیں ہو سکا۔ اور اس سے قبل کہ وہ "دورِ آسماں" کو قابو میں لاتے "دورِ آسماں" نے اچانک ان کو اپنے قابو میں کرلیا۔ وہ وفات سے چند روز پیشتر انفلوئنزا میں مبتلا ہوئے اور اس دوران میں دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے ۲۶ رجون ۵۹ء کو رحلت فرما گئے ان کی عمر ۴۴ سال کی تھی اور وہ سنہ ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصلی وطن گوجرانوالا تھا۔

سر آغا خاں

سر آغا خاں جو لاکھوں اسمٰعیلیوں کے مذہبی پیشوا تھے ان کا شمار دنیا کے متمول ترین افراد میں ہوتا تھا۔ وہ گھوڑ دوڑ کے بادشاہ کہلاتے تھے۔ ان کی شخصیت دو تہذیبوں کا سنگم تھی جس میں مشرق و مغرب کے دھارے ایک ساتھ مل کر بہہ رہے تھے مغربی تعلیم و کردار اور مشرقی عقائد و روایات کے میل نے ان کو کسی ایک خطہ کا باشندہ نہیں بلکہ "عالمی شہری" بنا دیا تھا ایسی پہلودار ہفت رنگ اور ہمہ گیر شخصیت شاید ہی کسی کی ہو۔ ایک طرف ایک مخصوص مذہبی طبقہ کی پیشوائی، دوسری طرف گھوڑ دوڑ کے میدان کی تگ و تاز ایک جانب سیاست و تدبر کی سنجیدگی اور ایک جانب مقابلہ حسن کی سرپرستی ——— ایک گرداب بوقلموں جس میں ہر رنگ کے دھارے مل کر چکر کھا رہے تھے۔ اسماعیلیوں کے ادعا کے مطابق آغا خاں حضرت علی کے ۴۸ ویں بلا واسطہ جانشین تھے اور افریقہ، ہندوستان، پاکستان و عرب کے ایک کروڑ اسماعیلیوں کے مذہبی رہنما تھے۔ آغا خاں کا پورا نام آغا سلطان سر سلطان محمد شاہ تھا۔ وہ ۲ر نومبر سنہ ۱۸۷۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی رگوں میں ایرانی خون دوڑتا تھا۔ انقلاب ایران کے وقت ان کے آبا و اجداد انیسویں صدی میں ہندوستان آئے۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں جب وہ اپنے والد کی وفات پر ان کے جانشین بنائے گئے اور آغا خاں سوئم کہلائے تو ان کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ ان کی تعلیم پہلے ایٹن اور بعد میں کیمبرج یونیورسٹی میں ہوئی پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں اُنھوں نے اتحادیوں کی مدد کی۔ حکومت برطانیہ نے اس کے صلہ میں انھیں ہز ہائی نس کا خطاب دیا۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں انھیں جمعیت اقوام کی اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا اس سے قبل وہ سنہ ۱۹۳۴ء میں پریوی کونسل کے ممبر بھی رہے۔ ان کو اعلیٰ نسل کے گھوڑے پالنے کا بہت شوق تھا۔ برطانوی اور فرانسیسی ٹرف میں انھیں نمایاں شہرت حاصل تھی۔ اُنھوں نے اپنی زندگی میں پانچ مرتبہ ڈربی کی مشہور ریس جیتی اور چار شادیاں کیں پہلی شادی تو خاندان کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ دوسری شادیاں یوروپین خواتین سے ہوئیں۔ ہندوستان کی سیاست میں آغا خاں کا نام دور اول کے لیڈروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ اپنی سیاسی زندگی میں گاندھی جی سے سینئر تھے۔ گول میز کانفرنس لندن میں اُنھوں نے ہندوستانی وفد کی قیادت کی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد کے ہر نشیب و فراز میں آغا خاں کا تعاون و توسط شامل حال رہا ہے۔ مسلم لیگ کے قیام اس کی ترقی اور تحریک پاکستان کی اعانت میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا تعلیمی مسائل میں بھی ان کی دلچسپی بڑی مؤثر ثابت ہوئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام میں ان کی مالی اعانت نے بڑا کام کیا تھا۔ یونیورسٹی کے پہلے چانسلر وہی بنائے گئے تھے۔ مرحوم اپنی امامت کی کئی جوبلیاں منا چکے تھے سلور جوبلی، گولڈن جوبلی اور آخری پلاٹینم جوبلی کراچی میں فروری سنہ ۱۹۵۴ء میں منائی گئی تھی۔

آغا خاں صحیح معنوں میں بے تاج کے بادشاہ تھے ان کی کسی علاقہ پر حکومت نہیں لیکن وہ لاکھوں اسماعیلیوں کے بادشاہ بلکہ عقائد میں مظہر خدا تک تھے اپنی جماعت کے امام وقت کی حیثیت میں ان کا اثر و اقتدار بے پناہ تھا۔ نذرانوں سے ان کی آمدنی ساڑھے چار لاکھ پونڈ سالانہ تک ہوتی تھی۔ ان کی دولت کا مجموعی اندازہ ساٹھ کروڑ پونڈ تک کیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں جب وہ پاکستان آئے تھے تو ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔

سنہ ۱۹۵۴ء میں وہ مصر میں بیمار ہو گئے جبکہ وہ "اسوان" میں اپنے مقبرہ کا سنگِ بنیاد رکھنے گئے تھے. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِدھر اُنھوں نے زمین پر سنگ بنیاد رکھا اور اُدھر موت نے ان کی زندگی کے سنگِ بنیاد پر پہلی ضرب لگا دی اور برابر تین سال سے ان کی صحت گرتی چلی گئی تا آنکہ ۷۹ سال کی عمر میں جنیوا کے قریب اپنی قیامگاہ "برکات" میں ۱۱ جولائی سنہ ۵۷ء کو ۱۲ بجے حرکت قلب بند ہونے سے رحلت کر گئے.

اسمٰعیلیہ فرقہ اپنے عقائد اور روایات کے لحاظ سے ان تحریکوں کا ساختہ پرداختہ فرقہ ہے جو اسلامی مرکزیت کے خلاف خوارج، معتزلہ، حسن بن صباح اور قلعہ الموت کے فدائیوں کی صورت میں گذشتہ تاریخی ادوار میں سرگرم رہی ہیں اور جن کی وجہ سے اسلامی اجتماعیت کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا. زمانہ کے الٹ پھیر کے بعد ایسے تمام فرقے اپنی اپنی حدود میں سمٹ کر رہ گئے اور ان کی ایک علیحدہ مستقل حیثیت سی بن گئی. آغاخاں نے اپنے دورِ امامت میں جس تدبر سے کام لیا وہ یہی تھا کہ اُنھوں نے اپنے پیرووں کو مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے ٹکرانے کی بجائے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کا خوگر بنائے رکھا اور ملت اسلامیہ سے کسی نزاع کے پیدا ہونے کے امکانات باقی نہیں رکھے اور ذاتی طور پر مسلمانوں کے قومی مفادات کے لئے جدوجہد بھی کرتے رہے. قطعیت کے ساتھ یہ کہنا بہرحال بہت ہی مشکل ہے کہ ان کی دوستی ملت اسلامیہ سے زیادہ تھی یا انگلستان کے شاہی خاندان سے تاہم ان کی ذات سے آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کو جو فائدے حاصل ہوئے ان کا انکار حق ناشناسی ہوگا. ان کی وفات کے بعد آغاخاں چہارم کی حیثیت میں ان کے پوتے شہزادہ کریم اسمٰعیلیوں کے پیشوا تسلیم کر لئے گئے ہیں. دنیا کا کھیل یہی ہے ایک آغاخاں اٹھ گیا اور دوسرے آغاخاں نے اس کی جگہ سنبھال لی.

(بقیہ "سرگزشت" صفحہ ۱۹ سے آگے) :-

ایک مختصر سی مدت میں ان کو اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنی نصیب ہوئی بلاشبہ ان کے خواب جھوٹے نہیں تھے.

کھٹمنڈو اب "شہر ممنوع" نہیں ہے. اب نئی دہلی سے وہاں کے لئے روزانہ ہوائی سروس قائم ہے. ایک پختہ سڑک بھارت تک بن گئی ہے اور ایک فضائی کمپنی سیاحوں کو اس افسانوی سرزمین تک پہنچانے کی خدمات انجام دے رہی ہے. پروٹسٹنٹ عیسائی مبلغوں نے ایک اسپتال بھی وہاں کھولا ہے. یہ پہلا عیسائی ادارہ ہے جس کو ۱۷۷۰ء کے بعد نیپال میں کام کرنے کی اجازت ملی ہے.

آج جبکہ میں لندن میں اپنے روزمرہ کے کام پر جاتی ہوں تو کبھی کبھی میں اپنے آپ سے سوال کرتی ہوں

کیا واقعی اس دور دراز ۸۰ لاکھ عوام کی مملکت کی قسمت بنانے میں میں نے بھی کوئی کارنامہ انجام دیا ہے اس لمحہ میں کنگنوں کو اپنے ہاتھوں سے چھوتی ہوں اور مجھے یقین آجاتا ہے کہ ہاں یہ صحیح ہے!

مطالعہ کی میز پر ———

• مسئلہ حسن ——— مسعود جاوید

• آزاد نظم ——— بشیر انصاری

• جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا ——— پروفیسر ھمایوں کبیر

●

مسئلہ حسن

حسن دیسے تو محسوس کرنے کی چیز ہے۔ اسے ہر شخص محسوس کرتا اور محظوظ ہوتا ہے لیکن یہ کیا ہے اور اس کی خصوصیات کیا ہیں اس پہلو سے کم ہی لوگ اس پر غور کرتے ہیں۔ "ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے "روحِ اقبال" میں اس پر توجہ دی ہے۔ اگرچہ اسلوب بیان کچھ گنجلک ہو گیا ہے؟ مگر پھر بھی حقیقت گرفت میں آگئی ہے۔ حسن کیا ہے؟ بہت مشکل سوال ہے مگر اس کا جواب حیران کن حد تک سادہ ہے اور وہ یہ کہ حسن، اظہار کا دوسرا نام ہے۔ یہ اظہار پہلے تو داخلی ہوتا ہے اور پھر بعد میں خارجی شکل اختیار کرتا ہے۔ اظہار جس قدر بھرپور ہو گا حسن اسی قدر مکمل ہو گا۔ اظہار میں کوتاہی قبح یا بدصورتی بن جاتی ہے۔ بھرپور اور مکمل ایک حد تک اضافی صفات ہیں اس لئے اظہار یا حسن بھی ایک حد تک اضافی ہے اس میں معروضی اور موضوعی دونوں عناصر شامل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جو چیز آج حسین ہے کل حسین نہ رہے اور پھر حسن کا معیار، یہاں کچھ ہے تو وہاں کچھ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ یعنی ماحول، افتادِ طبع، عقائد وغیرہ کے اعتبار سے حسن کا معیار بدلتا رہتا ہے۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ زوال پذیری حسن کی اہم خصوصیت ہے اور یہ کہ زمانے کے ساتھ ساتھ یہ ماند پڑتا جاتا ہے۔

محمد نجات اللہ صدیقی نے اپنے مضمون "اسلام اور فنونِ لطیفہ" میں حسن کی اسی معروضیت پر زور دیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ حسن کی معروضیت ہی حسن کی روح ہے "لیلیٰ را باچشم مجنوں باید دید" اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ اگر جمالیاتی ذوق کی تشکیل و ترتیب صحیح خطوط پر کی جائے تو ذہن کو یہ محسوس کرنے میں دقت پیش نہ آئے گی کہ حسن اور صداقت ایک ہی شے کے دو مختلف نام ہیں۔ بلاشبہ کیٹس ایسے ہی داخلی تجربہ کی بنا پر پکار اٹھا تھا۔

"Beauty is truth, Truth beauty - that is all
Ye know on earth, and all ye need to know."

اگر کسی شخص کا احساسِ حسن اس حد تک تربیت پا جائے تو پھر اسے اخلاقی اور روحانی قدروں میں تڑپا دینے والی صباحت یا ملاحت دکھائی دے گی ——— نعیم صدیقی نے اپنے افسانہ "ایک عورت پیچھے ایک عورت آگے" میں اسی قسم کے تربیت یافتہ ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ یہ ذوق ایک حسن کار کا ذوق ہے جس کا کام موجود کی عکاسی کرنا نہیں ہوتا بلکہ آرزو کو مجسم کرنا ہوتا ہے لیکن اس حسن کے ڈانڈے صداقت سے جا ملے ہیں۔

"برہانی" ہمارا اپنا ثقافتی ذوق ہے۔ دوسروں کے ذوق کی بارگاہ میں جھکی پلکیں قبول ہوتی ہیں۔ دوسروں کو اڑتے آنچل پسند آتے ہیں ہماری ثقافت تو گھونگھٹ کو دیکھ کر مطمئن ہوتی ہے۔ دوسروں کے لئے کھلے گریبان بہترین منظر قرار پاتے ہیں۔ مگر ہمارا ذوقِ حسن ان سینوں

محبوب رکھتا ہے جن کو اوڑھنیوں کے مکمل پردے میں رکھتے ہیں۔ دوسروں کو بے محابا تکلم بھاتا ہوگا مگر ہماری تہذیب نسوانی ہونٹوں سے گل کی سی جنبش کا تقاضا کرتی ہے نسیم سحری کا سا تکلم چاہتی ہے۔ دوسروں کے نزدیک سونے اور ریشم کے انباروں سے لدکر حسن حاصل کرنا ہوگا۔ مگر ہمارے ہاں اس کی معراج سادگی ہے۔"

اسی کو تو حسن کاری کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر حسن کاری حسن اور صداقت میں مطابقت پیدا کرنے کا نام ہے!

اللہ جمیل و یحب الجمال

آزاد نظم

عبدالکریم صاحب عابد کا مشیر کے "اسلامی ادب نمبر" پر تنقیدی مضمون پیش نظر ہے۔ اگرچہ اس مضمون میں بہت سی چیزیں محل نظر ہیں یہاں صرف صاحب تنقید کا آزاد نظم سے متعلق نظریہ ہی زیر بحث ہے۔

عابد صاحب رقمطراز ہیں "کیا ہی اچھا ہوا اگر ہمارے اسلامی ادیب آزاد نظم کی "لغویت" سے پرہیز کریں جو کہ اردو شاعری میں ترقی پسندوں کی بدعت ہے۔" آزاد نظم کو لغویت سے تعبیر کرنا یقیناً ایک بہت بڑی زیادتی اور غلطی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی چیز کا غلط اور صحیح استعمال ہی اس کے اچھے یا برے نتیجے کا ذمہ دار ہوتا ہے اسیطرح اگر موجودہ آزاد نظم میں کچھ نقائص موجود ہیں تو یہ آزاد نظم کا قصور نہیں بلکہ اس ذمہ داری کہنے والوں پر عائد ہوتی ہے

آزاد نظم ایک تجربہ ہے اور ایسے تجربے ادب میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تجربے کرنا کوئی بری بات نہیں۔ کیونکہ بعض اوقات تجربوں کے بعد ہی چیزیں مکمل آتی ہیں۔ اس لئے آزاد نظم لکھنے والوں سے کسی قسم کے تعرض کی ضرورت نہیں۔ ان کو تجربہ کر لینے دیجئے۔

رہا بدعت کا معاملہ۔ تو جب سے کائنات عالم وجود میں آئی ہے۔ اس وقت سے دنیا جدت کی طرف مائل ہے۔ اس پر ہزاروں چیزیں شاہد ہیں جنھیں ہم ترقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسیطرح طرز فکر میں جدت کوئی بری چیز نہیں۔ بلکہ مستحسن ہے۔ شاعری میں ہمیشہ نئے نئے رستے نکلتے رہے اور مقبول عام بھی ہوتے رہے۔

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا

معاصر الجمعیۃ (دہلی) میں پروفیسر ہمایوں کبیر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اُنھوں نے ان ادبی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جنھوں نے انھیں حد متاثر کیا۔ یہاں اس مضمون کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر صاحب کہتے ہیں۔ کہ سب سے پہلے انھیں مدھوسودن دت کی تصنیف میگھ ناد بدھ" نے متاثر کیا۔ اس بنگالی نظم میں حب الوطنی کا پرجوش جذبہ اور بغاوت کا نغمہ ہر ہر مصرع میں سمویا ہوا ہے۔ اس کتاب نے مجھے اپنی ملک کی عزت اور آزادی وطن کے لئے لڑنے والوں کی عزت کرنا سکھایا۔ دوسری پسندیدہ کتاب ہومر کی "الیاڈ" ہے۔ اس میں بھی ایک کردار ہیکٹر ہے جو میگھ نادی کی طرح بے قصور اور بے گناہ ہے۔ مگر اسے بھی دوسروں کی غلطیوں اور گناہوں اور آزادی وطن کے لئے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ اس کے بعد ٹیگور کی کتابیں ہیں جن میں "کلپنا" اور "اسرگ" کا خاص طور سے ذکر مقصود ہے ٹیگور تارک الدنیا نہیں تھے انھوں نے بارہا اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں نجات بھرپور زندگی کے درمیان ہی حاصل کرنی چاہیئے۔ اور انسانی تعلقات میں حسن سچائی اور ایثار کی تلاش کرنی چاہیئے۔ عورت کے لئے مرد کی محبت۔ بچے کے لئے ماں کی محبت، بہن کے لئے بھائی کی محبت اور پھر تمام انسانوں سے محبت۔ اس جذبے میں بڑی بلندی اور عظمت پنہاں ہے اور یہی زندگی کا جادہ ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ہیوگو کی کتاب

"لامیزریبلز" ہے جس کے ہیرو" وال جین" کے ساتھ ایک دنیا نے ہمدردی کی ہے۔ وال جین مجرم نہیں تھا۔ مگر اس نے کچھ ایسے کام کئے جنہیں سماج جرم سمجھتا تھا۔ اس نے جرم کی قیمت تو چکادی، مگر سماج کی انگلیاں اس پر جب بھی اٹھتی رہیں۔ بہر حال اس نے ہمت نہ ہاری اور اس حقیقت کو عملی صورت میں پیش کیا کہ مقصد نیک ہو تو انسان کو سماجی روایات سے برعکس بھی کام کرنے کا حق حاصل ہے۔ بنکم چندر چٹرجی کی "کرشن چرتر" اور سید امیر علی کی "دی اسپرٹ آف اسلام" بھی ایسی کتابیں ہیں کہ ذہن انکے مطالعہ سے بے پناہ طور سے متاثر ہوتا ہے۔ بنکم کی کتاب میں کرشن ایک مافوق الفطرت ہستی کے بجائے انتہائی دانشمند اور مدبر انسان معلوم ہوتے ہیں اور سید امیر علی نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تصویر کھینچی ہے وہ کسی مافوق البشر کردار کی نہیں بلکہ ایک ایسے انسان کی ہے جن کی عظمت کا راز ان کی جرأت دلیری، صداقت اور استقامت میں پنہاں ہو۔

"جامِ نو" کا ساتواں سالنامہ

اس سال اپنی تمام تر روایتی خوبیوں کے ساتھ یومِ آزادی کے مبارک موقع پر پیش کیا جا رہا ہے یہ ضخیم نمبر جو مفید مضامین، اچھوتے افسانوں، دلچسپ کہانیوں اور روح پرور نظموں غزلوں کا بیش بہا مجموعہ ہوگا مستقل خریداروں کی خدمت میں مفت پیش کیا جائیگا اگر آپ "جامِ نو" کے مستقل خریدار نہیں ہیں تو جہاں تک جلد ممکن ہو، پاکستان کے اس مقبول ترین ماہنامہ کے مستقل خریداروں کی فہرست میں اپنے نام کا بھی اندراج کرا لیجئے

جو حضرات و خواتین ۱۴ اگست ۱۹۵۷ء سے قبل

مُستقل خریدار

بن جائیں گے اُن سے زرِ سالانہ بجائے پانچ روپے کے صرف چار روپے لیا جائے گا!

(سالنامہ بذریعہ رجسٹری منگانے کی صورت میں چار آنے مزید ارسال کرنے ضروری ہیں)

ایک خاص پیشکش

جو صاحبان ۱۴ اگست سے قبل "جامِ نو" کے تین مستقل خریدار فراہم کر دینگے ان کی خدمت میں بھی "جامِ نو" سال بھر کیلئے بالکل مفت جاری کیا جائیگا۔

منیجر "جامِ نو" 9/9 برنس روڈ لائن، صدر کراچی

تذکرے و تبصرے

تین سالنامے

• تعمیرِ انسانیت • فاران • معیار •

	تعمیرِ انسانیت	فاران	معیار
مرتب	کوثر نیازی - عبدالحمید شیخ	ماہر القادری	اصغر علی عابدی
چندہ	چھ روپے ؛ فی پرچہ ۸ آنے	چھ روپے	پانچ روپے ؛ فی پرچہ ۸ آنے
پتہ	موچی دروازہ - لاہور	کیمبل اسٹریٹ، کراچی	شاہ پیر گیٹ، میرٹھ بھارت

تعمیر انسانیت

کوثر نیازی کی ادارت میں تعمیرِ انسانیت علم و ادب کی جس طرح خدمت کر رہا ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ سالنامہ ہے اشتہارات سمیت سالنامہ ۲۰۰ صفحات کا ایک اچھا ادبی تحفہ ہے۔ ریڈرز ڈائجسٹ سائز میں ایک اچھا ادبی مواد اس طرح بند ہے جیسے سمندر کوزہ میں بند کر دیا گیا ہو۔ سرورق پر ایک اسٹیمر سمندر کو کاٹتا ہوا جا رہا ہے اور یہی وہ پہلا مقام ہے جہاں باذوق نگاہیں چونک جاتی ہیں۔ ایک تو پرچہ کا نام "تعمیرِ انسانیت" ہی ایک اچھے ادبی پرچہ کی شان میں بڑی بے ادبی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس اسٹیمر کو دیکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ آخر یہ ہے کیا کوئی جہاز راں کمپنی کی ڈائرکیٹری ہے یا سیاحوں کے لئے معلوماتی کتابچہ ویسے مطلب نکالا جائے تو دل کو یہ تسلی دی جا سکتی ہے کہ یہ ایک صحت مند فکر کا کارواں ہے جو مخالف ماحول میں راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ نیچے کوثر نیازی کا نام بھی ہے جو اس مطلب کی سفارش کر رہا ہے۔ ورنہ اس سرورق کی اس سالنامہ سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ لہٰذا جب کہ جلدی اداریہ ختم کر کے ایک پیغام پر نظریں رک جاتی ہیں مولانا مودودی نے تعمیری ادب کی وضاحت کرتے ہوئے اسلامی ادب کے حامیوں کو ایک اہم بات کی طرف توجہ دلائی ہے جو ادب برائے ادب کے تعلق سے ہمارے ادیبوں کے لئے لائق توجہ ہے۔ نظموں میں روشن صدیقی کی ایک بڑی اچھی نظم "ابھی منزل کہاں" شامل ہے۔ "کوئی دیوانہ آپہنچا" ——— نعیم صدیقی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے ایک گرجتی گونجتی لے میں فوج در فوج الفاظ کسی دیوانہ کو لئے ہوئے آ رہے ہیں اس نظم کے صرف آخری دو بند ایسے ہیں جہاں یہ دیوانگی کچھ سوچنے سمجھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لفظوں کے سانچوں میں معنی اور مقصد کا مکمل اظہار لطف دے جاتا ہے۔ فروغ احمد کی نظم "وادیٔ رادی کے مرغزار" اپنی ساخت و ہیئت کے لحاظ سے کوئی ندرت نہیں رکھتی لیکن اس کا موضوع شاعر کا خلوص اور درد اس نظم کے تاثر کو سنوارے بغیر نہیں رہتا اور یہی وہ — درد انگیزی ہے جو لفظی کرتبوں کے بغیر ہی فنی حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ اس درد بھرے اظہار میں کوئی غرور اور تصنع نہیں ہے سادگی ہے۔ معصومیت اور بھولپن ہے جو پڑھنے والے کے دل کو مرعوب نہیں کرتا بلکہ اپنا لیتا ہے۔

ابن فرید نے "چند بہترین افسانے" لکھے ہیں بلاشبہ انھوں نے افسانے ہی لکھے ہیں نہیں یہ افسانے نہیں بلکہ اسلامی ادب کے افسانوں پر تنقید ہے اسلامی افسانہ پر عملی تنقید کی بڑی کمی رہی ہے۔ جمیل احمد فاروقی اور حمید اللہ صدیقی نے اس سلسلہ میں کچھ کام کیا تھا لیکن یہ موضوع اتنا اہم اور وسیع ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں کی راہنمائی کے لئے جتنا بھی کچھ کیا جائے کم ہے ابن فرید کا یہ مضمون وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اس مقالہ کی تصنیفی ترتیب، دلچسپ زبان، متاثر کن انداز مخلصانہ اور بے لاگ نقد و جرح اس گمان میں ڈال دیتے ہیں کہ ابن فرید افسانہ سے تو مقالہ ہی اچھا لکھتے ہیں ہمارے افسانہ نگاروں کو یہ مضمون لازماً پڑھنا چاہیئے۔ ابن فرید کے مضمون

کے پیرایہ کا دوسرا مضمون "اردو میں تعمیری شاعری کا ارتقاء" ہے جسے افتخار اعظمی نے لکھا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے موضوع کا پورا حق ادا کیا ہے۔ اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اسلامی رجحانات رکھنے والے نمایاں شاعروں کے کلام پر یہ بڑی متوازن اور فکر انگیز تنقید ہے لیکن یہ مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے ابھی نامکمل ہی ہے ضرورت ہے کہ افتخار صاحب بیشتر دوسرے تعمیر پسند شعراء کو اپنی فہرست میں شامل کر کے اس مضمون میں مزید وسعت پیدا کریں۔ یہ بلاشبہ بڑا مفید کام ہوگا۔ اسلامی ادب اور جمود پر حمید اللہ صدیقی مسعود جاوید، ذکاء الرحمن کی تحریریں ایک مختصر سے مذاکرہ (سمپوزیم) کی ترتیب دیدیتی ہیں اس موضوع پر حمید اللہ صدیقی کا جائزہ انتہا پسندانہ اور جذباتی ہے البتہ مسعود جاوید نے بڑے ہی اختصار اور بڑے ہی توازن و اعتدال کیساتھ اپنے خیالات پیش کئے ہیں اور ان کا نکتہ نظر زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔

"ثقافت کی تلاش" نسیم حجازی کا تعارف ایک نئی حیثیت میں کراتی ہے۔ باور کرنا پڑتا ہے کہ نسیم حجازی نے ناول کا کوئی پلاٹ نہیں بلکہ ایک ڈرامہ لکھا ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں تو قاری کو کوئی کشش اور جاذبیت نہیں ملتی لیکن جیسے جیسے پلاٹ آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے نسیم ایک دم سے مایوس کر کے اپنے پڑھنے والے کو بہت زیادہ پرامید بنا دیتے ہیں۔ پاکستان میں تخریب پسندوں کا ایک گروہ یقیناً ایسا موجود ہے جو اندر ہی اندر ہماری ملی زندگی میں نقب لگانا چاہتا ہے انھوں نے بڑے ہی شائستہ انداز میں اس گروہ کا خاکہ اڑایا ہے انداز بیان سلجھا ہوا اور سنجیدہ ہے لیکن طنز و مزاح کی شیرینی کچھ اس طرح اس میں رچی بسی ہے کہ مسکراہٹ آخر تک لبوں پر کھیلتی رہتی ہے۔ پورا پلاٹ کونین کی ایسی گولی معلوم ہوتی ہے جس کی مٹھاس میں تلخی نہیں بلکہ تلخی میں مٹھاس گھلی ملی ہے۔ اپنے موضوع اظہار اور مقصد کے لحاظ سے بڑی کامیاب اور موثر چیز ہے البتہ فن اور تکنیک کے لحاظ سے اگر اسے ڈرامہ ہی کہا جائے تو اس میں بہت ساری خامیاں ہیں لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ نسیم حجازی اس صنف میں بھی کافی کمال حاصل کر سکتے ہیں اگر وہ اس طرف توجہ دیں تو تعمیری ادب میں بڑے اضافہ کی توقع ہے۔ غزل کا حصہ ہر اعتبار سے مکمل اور جاندار ہے ماہر، رازش، شبیق، محمر کوثر، عاصی، عزیز، انور صدیقی، شاکر تسلیم، شفقت، زاہد حسین عارف ان سب نے مل کر تعمیری غزل کا ایک ایسا گلدستہ سجایا ہے جس کا ہر پھول دیدہ زیب اور نکہت بیز ہے اور تعمیری غزل کے فنی اور مقصدی معیار کی بلندی پر شاہد ہے۔

سالنامہ کے آخر میں افسانوں کا حصہ ہے یہ حصہ ایک طویل ادبی نگارش سے شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے "ایک عورت پیچھے۔ ایک عورت سامنے"۔ عنوان پڑھ کر ایک دم سے لکھنے والے کا نام دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ عنوان کس کا دیا ہوا ہے۔؟ اس عنوان میں ایسا کھلا ہوا ذم ہے کہ بڑی حیرت ہوتی ہے کہ دوسروں کے لئے تضحیک و تمسخر کا یہ موقع کیوں فراہم کر دیا گیا۔؟ کسی نہ کسی طرح اس عنوان سے پیچھا چھڑا کر جب آگے بڑھتے ہیں تو زبان کی ناہمواری اور غلطیاں دامن تھام لیتی ہیں۔

مجموعی طور پر افسانہ کی زبان بڑی ملی جلی سی ہے کہیں پر تقریر ہے تو کسی جگہ ٹھوس مقالہ بن جاتا ہے اور کہیں نری "تبلیغ" افسانہ کا مخصوص طرز اور اسلوب جگہ جگہ مجروح ہوتا رہتا ہے

پلاٹ بڑا اچھا مرکزی خیال بہت ہی جاندار اور مقصد بڑا اہم کیا ہی اچھا ہوتا کہ اتنی اچھی بات اتنے ہی اچھے انداز میں کہی جاتی۔ اس موقعہ پر کوثر صاحب سے ان کے تعارفی جملوں کا حوالہ دیتے ہوئے عرض ہے کہ "مضامین" بلاشبہ غیب ہی سے آتے ہیں لیکن ان کی فنی ہیئت خود فنکار کو بنانی پڑتی ہے وہ غیب سے نہیں اترتی اور یہی وہ مقام ہے جہاں ایک فنکار کی حیثیت ایک مقرر، ایک فلسفی اور ایک مقالہ نگار کی حیثیت سے ممتاز اور نمایاں ہو جاتی ہے۔

"چاند، سمندر اور شہر" ابن فرید کے ان دو تین افسانوں میں سے ہیں جو ان کے عام رنگ سے ہٹے ہوئے اور نہایت ہی پسندیدہ افسانے ہیں۔ "سانتا کلاز" ابن فرید کا بہت ہی اچھا افسانہ تھا یہ افسانہ اس درجہ کا تو نہیں لیکن ان کے دوسرے افسانوں کی نسبت کہیں زیادہ خوبیوں کا مالک ہے۔ سنگاپور کی پینٹنگ میرے افسانہ "شاشن رتی" کی پینٹنگ سے زیادہ واقعاتی اور دلکش ہے۔ اس فرق کی مثال کچھ اس طرح ہے کہ شاشن رتی میں مقامیت "آبی رنگ" سے پینٹ کی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ابن فرید کے افسانہ میں مقامیت گہرے اور تیز رنگوں کے امتزاج سے نمایاں ہو رہی ہے۔ سنگاپور کے اس بگڑے ہوئے پورے ماحول میں ایک عورت کا بالکل ہی مختلف طرز عمل خواہ وہ اتنا ہی کیوں نہ ہو کہ اس نے سگریٹ منہ نہیں

لینا چاہا اور اس کے ماحول میں سنگاپور کی بیشتر عورتوں کے برخلاف اپنے آپ کو پیش کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بڑی خودداری کے ساتھ دو کیلے پیش کر کے اور جب دیکھا کہ کیلے قبول نہیں کئے جا رہے ہیں تو سگرٹ واپس کر دیا ایک لطیف اور موثر مقصدی اشارہ ہے جسے پورے فنی لوازم کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں کوئی ابہام بھی نہیں پیدا ہوتا البتہ اس لطیف اشاریت سے ان کا ذوق مطمئن نہیں ہو سکتا جو فن کی پڈنگ میں مقصد کی ہلکی ہلکی مٹھاس کے بجائے تیز شیرینی کے عادی ہیں۔

"کارزارِ حیات" ——— اسعد گیلانی کے اپنے مخصوص رنگ کا مظاہرہ ہے جس کا خطاب عام نہیں بلکہ ایک خاص تنظیمی حلقہ کے لئے مخصوص ہے اگر صرف اس حلقہ کی حدِ نگاہ میں رہ کر پڑھا جائے تو ایک بہت ہی اچھا افسانہ بن جاتا ہے اور اگر اس حد سے باہر رہ کر پڑھا جائے تو ایک تنظیمی رپورٹ بن جاتی ہے۔

"شہزادہ مسرت" اسکر وائلڈ کی مشہور کہانی ہے جو کورس کی کتابوں میں بھی پڑھائی جاتی رہی ہے اور کافی نقل ہوتی رہی ہے کوئی ترجمہ ہی دینا تھا تو بہت ساری اچھی سے اچھی چیزیں ہو سکتی تھیں ایک پرانی اور پامال سی چیز دینے کی کیا ضرورت تھی۔

ذکاء الرحمٰن سے بظاہر صرف اتنا ہی تعارف تھا کہ ان کو لوگوں کے انٹرویو لینے کا شوق ہے لیکن ان کے جو انٹرویو مطالعہ میں آئے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں افسانہ کی بڑی صلاحیت چھپی ہوئی ہے اور یہی خیال ہوتا تھا کہ اس شخص کے قلم سے افسانہ بس ٹپکنے ہی والا ہے۔ اسی لئے تعمیرِ انسانیت کے سالنامہ میں ان کا افسانہ "پھول" کم از کم میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا اور یہ بھی غیر متوقع نہیں تھا کہ وہ اتنا کامیاب افسانہ لکھیں گے "پھول" یہاں کی ماحول کی بڑی عمدہ عکاسی ہے۔ زبان انداز بیان فنی اظہار کردار نگاری ہر طرح سے مکمل اور امید افزا ہے۔ "رحما" کا سراپا اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور ہم اس کو اپنے سے دور نہیں پاتے بلکہ اس کے وجود کو ہم اپنے پاس محسوس کرتے ہیں اور یہی کردار نگاری کی کامیابی ہے اور اس معاملہ میں ذکاء الرحمٰن نے پوری پوری کامیابی حاصل کی ہے۔

"پھول" میں ذکاء الرحمٰن نے ہم کو رحما سے واقف کرایا ہمیں شاید وہ اس سے واقف نہیں ہونے دیں گے ان کا رحما آگے بڑھ کر خود ان کا تعارف ہم سے کرا رہا ہے کہ ——— "یہ ذکا ہے جی ساڈا اپنا سنگی" اور اس سادھے اپنے سنگی نے پھول میں بڑے سی پتہ کی باتیں کہی ہیں مگر آخری "زندگی اور موت" والی بات سن کر تجسس منہ تکتا رہ جاتا ہے بلکہ اس کا منہ لٹک جاتا ہے کہ بس یار یہی کچھ کہنا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ ڈھارس ضرور رہتی ہے کہ ذکا نے اگر اس وقت "بہت کچھ" نہیں کہا ہے تو وہ چوکنے والا نہیں اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ "بہت کچھ" کہے گا اور بڑے زور سے کہے گا کہ واقعی لوگ منہ تکتے رہ جائیں کہ اچھا یہ زور ہے جی۔ یہاں پہنچکر تعمیرِ انسانیت کا یہ سالنامہ ختم ہو جاتا ہے اگرچہ تبرکاً حسرت کے تین خط بھی آخر میں دیئے ہوئے ہیں۔ سالنامہ ختم ہونے کے بعد اس کی ضخامت کا وزن ہاتھوں میں اور اس کی افادیت کا اثر ذہن پر محسوس ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ہر ایک سے کہیں ——— "لیجئے اسے پڑھیئے" ——— مگر اس سفارش کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑے گا ——— "صاحب ذرا احتیاط سے اس کی جلد بندی بہت کمزور ہے ذراسی غفلت سے یہ گلدستہ بکھر کر رہ جائے گا۔"

(م۔ ف)

"فاران" کا توحید نمبر

چار سو صفحہ کا یہ ضخیم اور دیدہ زیب نمبر توحید کے موضوع پر ایک مختصر سی انسائیکلوپیڈیا کا کام دیتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے مشہور و معروف اہلِ قلم اور مفکرین کے مقالات اس نمبر میں شامل ہیں۔ ماہر صاحب کا ۸۵ صفحہ کا نقشِ اول بہت ہی دلنشین پیرایہ رکھتا ہے اور کافی فکر انگیز مقالہ ہے اس کے بعد دوسرے مشاہیرِ قلم کی نگارشات میں توحید کے مختلف پہلوؤں اور انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کے اثرات سے متعلق کافی تحقیقی معلومات موجود ہیں اور ایک ہی سلسلہ ترتیب میں پڑھنے والے کو اس موضوع پر بڑا مفید مواد مل جاتا ہے۔ لیکن اکثر مضامین میں موضوعات اور نکات بحث کی یکسانیت کی وجہ سے دلچسپی اور تجسس متاثر ہونے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ پورے نمبر میں ایک بھی ایسا مضمون نہیں ملتا جو جدید اسلوب میں توحید کی فلسفیانہ توجیہات پر روشنی ڈالتا ہو اور نہ مسئلہ توحید کے نفسیاتی تعینات اور فرد و اجتماع پر اس کے نفسیاتی

اثرات سے کہیں بحث کی گئی ہے۔ عبدالرحمن حماد کے مضمون "انسانی زندگی پر توحید کے اثرات" میں البتہ چند فلسفیانہ مباحث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ مضمون قدیم طرز استدلال پر مبنی ہے اور اس میں زیادہ وسعت اور گہرائی نہیں ہے۔ ایک اور کمی ایسے مضمون کی بھی ہے جس میں مختلف زمانوں میں توحید کے تحریکی عمل کو تاریخی پس منظر میں ظاہر کرنے کی ضرورت تھی یہ ایک دلچسپ اور معلوماتی حصہ ہوتا اگر مرتب اس جانب توجہ فرماتے ——

ان مباحث کی کمی کیساتھ پورا نمبر پڑھنے پر یہی احساس غالب رہتا ہے کہ یہ توحید نمبر سے زیادہ "رد بدعات نمبر" ہے کیونکہ بدعتوں سے متعلقہ مباحث پورے پرچہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور پھر لکھنے والوں کا وہ مخصوص انداز تحریر جو مبلغانہ اور مناظرانہ رنگ لئے ہوئے نئے ذہنوں کو ذرا کم ہی متاثر کرتا ہے ——

حصہ نظم بہت ہی مختصر ہے اور اس میں بھی زیادہ تر "مردہ جاہلیتوں" پر ہی زور قلم صرف کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس وقت ایک بہت بڑا زندہ اور توانا باطل توحید پرستوں کو دعوت مبارزت دیتا ہے۔ فاران کے اس مورچہ میں اگر اس زندہ باطل کو پریشان کر دینے والے کچھ ہتھیار ہوتے تو حق پسندوں کو بڑی نگران ملک ملتی۔ ابوالمجاہد زاہد اور شبنم رومانی کی نظموں میں بھی کوئی نمایاں جدت خیال سے کام نہیں لیا گیا ہے البتہ اظہار و ادا کے تیور تیکھے ضرور ہیں۔ سرورق سادہ لیکن نہایت ہی دلکش ہے کاغذ بھی نفیس استعمال کیا گیا ہے۔ کتابت اور طباعت بھی معیاری ہے اتنا ضخیم اور معلوماتی پرچہ ساڑھے تین روپیہ میں ادارۂ فاران کی سیر چشمی پر دلالت کرتا ہے یعنی نمبر اپنی بیشتر خوبیوں کی وجہ سے اس لائق ہے کہ مطالعہ کا صحیم ذوق اور علمی مناسبت رکھنے والے اصحاب کا کتب خانہ اس سے محروم نہ رہے۔ مختصر سے عرصہ میں اس ضخیم نمبر کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت اس بات کی ضامن ہے کہ نمبر کو عام طور سے پسند کیا گیا ہے۔

سالانہ چندہ فاران :- چھ روپے۔

پتہ :- دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی۔ (دم۔ ف)

معیار کا لکھنؤ کانفرنس نمبر

تعمیری ادب کے ترجمان رسالوں میں جس پرچہ نے ایک اعلیٰ معیار اور مثال قائم کی ہے وہ ماہنامہ معیار ہے۔ گزشتہ چھ سات سال میں معیار نے اسلامی ادب کے لئے بڑی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ افسانوں، نظموں اور مقالات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ معیار نے فراہم کر دیا ہے سب سے زیادہ قابل قدر خدمت معیار نے تنقید کے سلسلہ میں انجام دی ہے۔ صحیح تنقید کا ذوق پیدا کرنے، تعمیری ادب کی قدروں کو اجاگر کرنے ادب میں غیر اسلامی رجحانات کا مقابلہ کرنے میں معیار کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا

اس مرتبہ معیار نے "لکھنؤ کانفرنس نمبر" پیش کر کے اسلامی ادب کی تحریک کا ایک نیا سنگ میل نصب کر دیا ہے۔ ایک سو چار صفحات کا یہ پرچہ اسلامی ادب کے تعلق سے چند اہم اور ضروری سوالات پر قابل قدر اور قیمتی لٹریچر فراہم کرتا ہے۔

چند ماہ ہوئے لکھنؤ میں بھارت کے تعمیر پسند ادیبوں کی ایک شاندار کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں بھارت کے ممتاز اہل قلم اور شاعر شریک تھے۔ اس دو روزہ کانفرنس میں چند عام اجتماعات منعقد ہوئے جس میں لکھنؤ کے باذوق حضرات بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور انھوں نے اسلامی ادب کے متعلق مقالے افسانے اور نظمیں سنیں اور اسلامی ادیبوں انکے مقصد اور فن سے براہ راست واقفیت حاصل کی اس کے علاوہ چند اہم مسائل پر سمپوزیم منعقد ہوئے جس میں بھارت کے اسلام پسند ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا یہ سمپوزیم اسلامی ادب کے مسائل کو سمجھنے کے لئے بڑی راہ نمائی کرتے ہیں۔ ان میں جن مسائل پر مذاکرہ و مباحثہ ہوا وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اسلامی ادب کیا ہے؟

۲۔ اسلامی ادب کی تنقید و تخلیق میں مثبت قدروں کی اہمیت

۳۔ اسلامی ادب کی تخلیق کے لئے اسلامی کردار ناگزیر ہے؟

۴: اسلامی ادب کے فکری رجحانات ادب کی موجودہ ہیئتوں میں تبدیلی چاہتے ہیں؟

پانچویں سمپوزیم کا عنوان تھا: "اسلامی ادب مسئلہ جنس کے سلسلہ میں اسلامی قدروں کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہا ہے" لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے یہ منعقد نہیں ہو سکا مگر اس کی تلافی وہ مضمون کر دیتا ہے جو ابن فرید نے اس عنوان پر لکھا تھا اور جو پیش نظر نمبر میں شامل ہے۔

لکھنؤ کانفرنس نمبر میں اس کانفرنس کی پوری روداد انتہائی

سلیقہ اور عمدگی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ "نقش اول" میں اس کانفرنس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ارشادات کے عنوان سے ڈاکٹر سید عابد حسین کا خطبۂ صدارت ہے جسے موصوف نے جامعہ ملیہ دہلی کے اسلام پسند ادیبوں کے اجتماع میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ کانفرنس کے نام مولنا عبد الماجد دریاآبادی مدیر صدق اور جناب ضیا احمد بدایونی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے پیغامات ہیں۔ "سحر کے انوار دیکھتا ہوں" اس کانفرنس کی رپورتاژ ہے جسے ابن فرید نے لکھا ہے پھر نظموں کا حصہ ہے جو بہت ہی جاندار اور اسلامی قدروں کی توانائی کا مظہر ہے۔ بھارت کے مشہور شاعر حضرت شفیق جونپوری کا خطبہ صدارت ان کے خلوص اور اسلامی ادب سے دلی وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ کانفرنس کا افتتاح زین العابدین لکچرر شعبہ انگریزی مسلم یونیورسٹی کی تقریر سے ہوا ہے۔ پھر ان چار مجالس مذاکرہ کی روداد ہے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ "ادب اور اجتماعی شعور" پر پروفیسر معز علی بیگ مسلم یونیورسٹی کی تقریر کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ غزلوں کی حد میں شفیق جونپوری، عامر عثمانی مدیر ماہنامہ تجلی اور دوسرے اسلام پسند شاعروں کا کلام ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ "اسلامی ادب کے مزاج" پر نجات اللہ صدیقی، "اسلامی ادب میں نظریاتی شعور" پر سید اصغر علی عابدی کے مضامین شامل اشاعت ہیں۔ افسانوی ادب میں بشیر الحق بحری آبادی نے "بڑی بٹیا" اور م نسیم نے "جدھر دیکھتا ہوں" ابن فرید نے "داغ داغ اجالے" کے عنوانات سے افسانے اور احمد حسین انصاری نے "تو بہ کے بعد" ایک فیچر پیش کیا ہے۔ یہ ساری تخلیقات مقالات اور مذاکرے ان انتھک کوششوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو بھارت کے انتہائی ناموافق حالات میں اسلامی ادیبوں نے اب تک کی ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ مقصد کی لگن اور خلوص کس طرح وہاں اسلامی فکر و نظر کے لئے راستہ بنا رہا ہے۔ امید ملتی ہے کہ یہ راستہ بنتا رہے گا اور اس پر آہستہ آہستہ بھٹکنے والے مسافر جمع ہوتے رہیں گے اور منزل کی طرف یہ قافلہ پورے آہنگ و ولولے کے ساتھ چل پڑے گا۔ اس راستہ پر معیار کا "لکھنؤ کانفرنس" ایک نمایاں سنگ میل ہے جسے کوئی کسی وقت بھی بھلا نہیں سکے گا۔

(م۔ ف)

ماہنامہ سوداگر کراچی

اشاعتِ خاص

سنہ ۱۹۵۷ء

- "سوداگر" نے ہمیشہ پاکیزہ فکر و نظر اور تعمیری مقاصد کو پیشِ نظر رکھا ہے ــــــ
- "سوداگر" نے دینی و اخلاقی رجحانات کے احیاء کی سعیِ پیہم کی ہے ــــــ
- "سوداگر" نے روزِ اوّل سے سماجی و معاشرتی خرابیوں اور برائیوں کو مٹانے کے لئے قلمی جہاد کیا ہے ــــــ
- "سوداگر" نے انفرادی و اجتماعی سیرت و کردار کی تعمیر کی مسلسل دعوت دی ہے
- "سوداگر" ۵۵ء میں اصلاحِ رسوم نمبر، ۵۶ء میں خاتون نمبر اور ۵۷ء میں اشاعتِ خاص پیش کر کے ادبی دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔
- "سوداگر" اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں ۱۹۵۷ء کا خاص نمبر "اشاعتِ خاص" کے نام سے پیش کر رہا ہے۔ جس کی ضخامت ۲۰×۳۰/۸ کے ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہوگی اور جس کے ذریعہ معیاری مقالات و مضامین، افسانے، خاکے، ڈرامے، اور منظومات پیش کی جائیں گی۔ مستقل خریداروں کی خدمت میں یہ نمبر سالانہ چندہ میں پیش کیا جائے گا۔

سالانہ چندہ تین روپے ہے چار آنے خاص نمبر بذریعہ رجسٹری کُل تین روپے چار آنے بذریعہ منی آرڈر یا دستی بھیجکر اپنی کاپی محفوظ کرا لیجئے۔ "سوداگر" ایک سال میں اپنے مستقل خریداروں کی خدمت میں ۲۰×۳۰/۸ سائز کے ایک ہزار صفحات پر مشتمل مواد بشمول خاص نمبر پیش کرتا ہے۔

ماہنامہ "سوداگر" سرائے روڈ۔ کراچی ۲

باوقار تنظیم

اعلان ڈرائنگ ماہ جولائی ۱۹۵۷ء

ماہ جولائی کی ڈرائنگ ۲۱ جولائی بروز اتوار حسب معمول ... منعقد ہوئی۔ اس اجلاس کی صدارت جناب محمد حمید اللہ صاحب صدیقی ایم اے لیکچرار سندھ مسلم کالج، کراچی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں پانچ گروپوں کی ڈرائنگ عمل میں آئی۔ گروپ نمبر ۱ کی ساتویں، گروپ نمبر ۲ کی چھٹی، گروپ نمبر ۳ کی پانچویں، گروپ نمبر ۴ کی چوتھی اور گروپ نمبر ۵ کی تیسری ڈرائنگ ... تلاوت کلام پاک کے بعد صاحب صدر نے مقررہ طریقے کے مطابق حاضرین سے امداد طلب فرمائے، جن سے حسب ذیل کامیاب رول نمبر قرار پائے :-

(۱)	گروپ نمبر ۱	رول نمبر ۳۰۶	جناب عبد اللطیف صاحب، چوڑی بازار، سکھر
(۲)	گروپ نمبر ۲	رول نمبر ۱۵	جناب سید ارشاد علی صاحب بخاری، کمپونڈر سول ہسپتال اوچ شریف بھاولپور
(۳)	گروپ نمبر ۳	رول نمبر ۴۵۴	جناب محمد اقبال جاوید صاحب (نابالغ) بیرون پاک گیٹ، خونی برج ملتان
(۴)	گروپ نمبر ۴	رول نمبر ۱۹۶	جناب سردار نبی صاحب ۲/۱۴ لالوکھیت، کراچی
(۵)	گروپ نمبر ۵	رول نمبر ۲۷۹	جناب جمیل احمد صاحب جمالی۔ سعود آباد کالونی۔ ملیر کراچی

جلسہ صاحب صدر اور حاضرین کے شکریہ کے ساتھ برخواست ہوا۔ ادارہ باوقار تنظیم جناب محمد حمید اللہ صاحب صدیقی کا بیحد شکر گزار ہے کہ انھوں نے اس ڈرائنگ کی صدارت کے فرائض سر انجام فرما کر کارکنانِ تنظیم کا ہاتھ بٹایا۔

ادائیگی رقومات :- اس ماہ کی رقومات حسب ذیل ذرائع سے کی گئیں :-

(۱) گروپ نمبر ۱، کامیاب رول نمبر ۳۰۶ عبد اللطیف صاحب سکھر کو ادائیگی بذریعہ بنک ڈرافٹ حبیب بنک کردی گئی۔

(۲) گروپ نمبر ۲، کامیاب رول نمبر ۱۵ سید ارشاد علی صاحب بخاری اوچ شریف ضلع بھاولپور کی قسط ماہ جولائی ۵۷ء عدم ادائیگی کی وجہ سے روک لی گئی ہے۔ ان کی قسط کی وصولی کے بعد ان کو یہ رقم ادا کردی جائے گی۔

(۳) گروپ نمبر ۳، کامیاب رول نمبر ۴۵۴ محمد اقبال جاوید نابالغ کی ادائیگی انکے والد سرپرست کو بذریعہ بنک ڈرافٹ حبیب بنک کردی گئی۔

(۴) گروپ نمبر ۴، اور گروپ نمبر ۵ کے کامیاب رول نمبر ۱۹۶، ۲۷۹ بالترتیب چونکہ مقامی ممبر تھے۔ اس لئے ان ہر دو حضرات کو ادائیگی نقد رقم کی صورت میں صدر دفتر سے کردی گئی۔

ڈرائنگ کے نتائج کا اعلان روزنامہ "انجام" کراچی اور روزنامہ "تسنیم" لاہور میں کردیا گیا تھا۔ بیرونی ایجنٹ حضرات کو فرداً فرداً بذریعہ ڈاک اطلاع بروقت کردی گئی۔

اطلاع و ہدایات برائے ممبران تنظیم :-

۱ چھٹا گروپ مکمل ہوگیا ہے اس کی ڈرائنگ انشاء اللہ تعالیٰ اگست ۵۷ء میں ہوگی اور اس کی دوسری قسط ستمبر ۵۷ء سے واجب الادا ہوگی۔ چھٹے گروپ کی پاس بکیں انشاء اللہ اس کی پہلی ڈرائنگ تک جاری کردی جائے گی۔

۲ ساتویں گروپ کی بکنگ شروع کر دی گئی ہے آئندہ وصول ہونے والے ممبری فارموں کو ساتویں گروپ میں بک کیا جائے گا۔

۳ چھٹے گروپ کے ممبران کی فہرست ہم شائع نہیں کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مشیر میں شائع شدہ فہرست سے لاٹریاں وغیرہ ڈالنے والی کمپنیاں بے جا فائدہ اٹھا رہی ہیں اور ہمارے شائع شدہ پتوں پر لاٹری کے ٹکٹ اور دوسرا لٹریچر بھیجکر ہمارے ممبران کو پریشان کرتی ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ حضرات بیرنگ خط لکھتے ہیں اور ہمارے ممبر یہ سمجھ کر کہ یہ خطوط "باوقار تنظیم" کے دفتر سے آئے ہیں انھیں چھڑا لیتے ہیں جس سے نہیں خواہ مخواہ پریشانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔

۴ ہمارے ممبران نوٹ کر لیں کہ باوقار تنظیم کے دفتر سے کبھی بھی کوئی بیرنگ خط یا لٹریچر روانہ نہیں کیا جاتا۔ اگر انہیں ایسا بیرنگ خط یا لفافہ ملیں تو انکو واپس کر دیا کریں۔

۵ ممبران کے لئے ضروری ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر بھیجتے وقت اپنے رول نمبر اور گروپ نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان نہ رہے۔

۶ اگر ایجنٹ حضرات ممبران سے بروقت اقساط وصول نہ کریں۔ تو وہ براہ راست بذریعہ منی آرڈر صدر دفتر بھیج سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ منی آرڈر فیس اصل قسط سے وضع کر کے روانہ کر سکتے ہیں۔

۷ براہ کرم مراسلت کے وقت حتی الامکان اس کا خیال رکھئے کہ "باوقار تنظیم" اور ماہنامہ "مشیر" کے معاملات کے سلسلہ میں الگ الگ پرچوں پر خطوط لکھئے۔ ایک ہی کاغذ پر ہر دو اداروں کے متعلق تحریر کرنے سے تعمیل کرنے اور ریکارڈ رکھنے میں دقت بھی ہوتی ہے اور تاخیر بھی۔

ضروری اعلان :۔

آئندہ سے اقساط کی وصولی کی تاریخ ۱۲ سے بڑھا کر ۱۵ کر دی گئی ہے آئندہ ۱۵ تاریخ تک وصول ہونے والی اقساط پر کوئی لیٹ فیس وصول نہیں کی جائے گی۔ ۱۵ تاریخ کے بعد آنے والے اقساط پر لیٹ فیس عائد ہوگی اور آئندہ ڈرائنگ ہر ماہ کے تیسرے ہفتہ میں آنیوالی اتوار کو ہوا کرے گی۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں :۔

(۱) ہمیں یہ جان کر بے حد افسوس ہوا ہے کہ ہمارے بعض ایجنٹ حضرات ممبروں سے دو دو تین تین ماہ کی اقساط وصول کر لیتے ہیں مگر ان کی رقوم صدر دفتر بروقت روانہ نہیں کرتے۔ جب عدم ادائیگی اقساط کی وجہ سے تین ماہ بعد ممبران کو وارننگ لیٹر (WARNING LETTER) لکھا جاتا ہے تو بہت سے ممبر ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اپنی اقساط ایجنٹ کو باقاعدہ ہر ماہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال کمپنی اور ایجنٹ دونوں کے لئے بے اعتمادی کا باعث بن جاتی ہے جو بڑی افسوسناک بات ہے۔ اسلئے ایجنٹ حضرات کو چاہیئے کہ ہر ماہ کی وصول شدہ اقساط کو باقاعدگی کے ساتھ صدر دفتر ارسال کرتے رہا کریں۔ کسی ایجنٹ کا یہ طرز عمل اس کی ایجنسی کی فی الفور منسوخی کا باعث ہو سکتا ہے۔

(۲) ایجنٹ حضرات کمربستہ رہیں اور حسب سابق پرخلوص جوش و خروش کے ساتھ ممبر سازی جاری رکھیں، تاکہ آئندہ پروگرام اپنے وقت پر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

(۳) اقساط کی فراہمی میں کوتاہی نہ کریں اور ہر ماہ زیادہ سے زیادہ اقساط فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ آئندہ پروگرام کا دارومدار اقساط کی فراہمی پر ہی منحصر ہے۔

(۴) ماہ اگست ۱۹۷۵ء میں پانچوں گروپوں کی اقساط وصول کرنی ہیں جو ۱۵ اگست تک فراہم کر لینی چاہیئیں۔ جو ممبر دور ہوں انھیں ہدایت کریں کہ وہ اپنی اقساط بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دیا کریں۔ منی آرڈر فیس اصل رقم سے وضع کر لیں۔

(۵) بڑی رقومات حتی الوسع بنک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ ڈرافٹ باوقار کمپنی لمیٹڈ کے نام سے ہونا چاہیئے۔

(BAVAQAR COMPANY LIMITED, BUNDER ROAD, KARACHI.)

(۶) اپنے حسابات چھپے ہوئے فارموں پر روانہ کریں، جو صدر دفتر سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

رفتارِ کار

باوقار تنظیم، کراچی

۱۹۵۷ء

۶ ماہ کے قلیل عرصہ میں

۲۴ کامیاب رول نمبروں میں

۱۲۰۰۰ روپیہ تقسیم ہو چکا ہے!

	گروپ نمبر ۱	گروپ نمبر ۲	گروپ نمبر ۳	گروپ نمبر ۴	گروپ نمبر ۵	گروپ نمبر ۶	
جنوری	۷						
فروری	۲۶۷	۴۱۵					
مارچ	۱۸۹	۴۷	۴۷۶				
اپریل	۴۴۸	۲۸۱	۴۸۹	۸۵			
مئی	۳۸۷	۴۵	۳۷۵	۱۳۵	۳۹۹		
جون	۳۳۶	۲۶۵	۲۶۳	۴۰۷	۲۵۷	تکمیل شدہ گروپ	
جولائی	۳۸۶	۱۵	۴۵۴	۱۹۶	۲۷۹	ڈرائنگ ۱۸ اگست	(زیر تکمیل)

کامیاب رول نمبر

باوقار کمپنی لمیٹڈ - بندر روڈ، کراچی ۱

ٹیلی فون: 70725

کراچی

ماھنامہ

پاکیزہ ادب کا ڈائجسٹ

آٹھ لے

HE MUSHIR KARACH

نگاہ

سات گُناہ

ملایا کے "مسلم نوجوانوں کی کانفرنس" نے سات "کبیرہ گناہوں" کی ایک فہرست شائع کی ہے، جو حسب ذیل ہے:-

(۱) — سیاست، اصول کے بغیر
(۲) — دولت، محنت کے بغیر
(۳) — مسرت، ضمیر کے بغیر
(۴) — علم، عمل کے بغیر
(۵) — کاروبار، اخلاق کے بغیر
(۶) — سائنس، انسانیت کے بغیر
(۷) — عبادت، ایثار کے بغیر

پاکیزہ ادب کا ڈائجسٹ

ماہنامہ مُشیر کراچی

جلد — ۸
شمارہ — ۹

ستمبر سنہ ۱۹۵۷ء

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ٹیلی فون : 70923

نگارشے ———

سات گناہ ۱

سوچ بچار ———

چار بنیادی مقاصد — محمود فاروقی — ۳

فکر و نظر ———

نئے جام — سبط فاروق فریدی — ۷

قدم بہ قدم ———

آسٹریلیا میں اسلام ۱۲

انڈونیشیا میں قادیانی فتنہ ۱۳

جانوروں کی دنیا ———

جانوروں میں طبی شعور — حکیم مولانا فضل اللہ احا — ۱۴

برگِ گل ———

اگر اجازت دو...! — عالم اکبرآبادی — ۱۶

غزل — شفیق جونپوری — ۱۷

کیسے کیسے لوگ! — ماہر القادری — ۱۸

ذکر و فکر — اعظم ادیب — ۱۹

غزل — محمد نیاز — ۲۰

غزل (قطعات میں) — رشید کوثر فاروقی — ۲۱

غزل — کوثر نیازی — ۲۲

غزل — ابوالبیان حمّاد — ۲۲

غزل — شبنم سبحانی — ۲۳

غزل — عتیق تسنیم فاروقی — ۲۳

غزل — محمد یعقوب طاہر — ۲۴

غزل — رشید ارشد — ۲۴

افسانے ———

جونک — محمد حمید اللہ صدیقی — ۲۵

حسنِ تعبیر — فضل من اللہ — ۳۱

بیگم گلبدن — نینا کاش — ۳۵

زخم اور درد — شرون کمار ورما — ۴۴

طنز و مزاح ———

بے پرکی...! — فروغ احمد — ۵۱

الّو بولنے لگا — اقبال احمد محمودی — ۵۵

ادبی دنیا کی خبریں ——— ۵۷

مطالعہ کی میز پر ———

مشیر کا اسلامی ادب نمبر — سبط فاروق فریدی — ۵۹

اپنا خیال اپنی رائے ———

نجات اللہ صدیقی (گورکھپور) کا ایک مکتوب — ۶۱

تذکرے اور تبصرے ——— ۶۳

با وقار تنظیم ——— ۶۵

نگراں :
عبدالغفور بیگ

مرتّب :
محمود فاروقی

بدل اشتراک :

سالانہ : پانچ روپے
فی پرچہ : آٹھ آنے

(پرنٹر و پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا) عابد سعید کاتب

سوچ بچار

چار بنیادی مقاصد

مختلف سیاسی جماعتیں اپنے کردار کے آئینہ میں!

"مشیر" کے گزشتہ شمارہ میں ہم نے ایک ایسی سیاسی مرکزیت کو وجود میں لانے کی طرف توجہ دلائی تھی جو اسلام کے جامع اور عالمگیر طریقِ حیات پر یقین رکھتی ہو اور اپنے اس نظریہ کو وہ انسانی عقائد و افکار میں، اخلاق و عادات میں، علوم و فنون میں، ادب و آرٹ میں، تمدن و تہذیب میں، مذہب اور معاشرت میں، معاشی معاملات میں، سیاست اور نظمِ مملکت میں، بین الاقوامی تعلقات در وابط میں عملاً نافذ کر سکے۔ ظاہر ہے جب تک ایسی سیاسی مرکزیت وجود میں نہیں آتی۔ اس وقت تک ہمارے مصائب کا کوئی حل نہیں نکل سکتا اور اجتماعی نفاق کی وہ پالیسی ختم نہیں کی جا سکتی جس پر ہماری قیادت عمل پیرا ہے۔

اس وقت ملک میں متعدد سیاسی جماعتیں کام کر رہی ہیں اور پچھلی ششماہی میں تو کئی ایک چھوٹی چھوٹی جماعتیں وجود میں آچکی ہیں۔ ان تمام جماعتوں کے افکار و نظریات، ان کے وجود میں آنے کے محرکات و اسباب، ان کے بانیوں اور کارکنوں کے اقوال و اعمال کا جائزہ لیا جائے تو ہم ان کو چند علیحدہ علیحدہ زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

اوّل ——— ان میں سے بیشتر جماعتیں تو ایسی ہیں جو کسی مخصوص طرزِ فکر اور عملی نظریہ کی بنا پر وجود میں نہیں آئی ہیں بلکہ یہ چند طالع آزمائی کرنے والے سیاست دانوں کے ہوسِ اقتدار کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ ان کو عوام سے کچھ زیادہ مطلب نہیں ہے بلکہ یہ پارلیمانی جوڑ توڑ اور محلاتی سازشوں کے ذریعہ اقتدار پر قابض رہنا چاہتی ہیں۔

دوم ——— یہ چند ایک ایسی ٹولیاں ہیں جو پورے شعور کے ساتھ مغربی لادینیت اور اشتراکی استبداد پر ایقان رکھتی ہیں اور مختلف ناموں سے روپ بدل بدل کر یہ عوام کو دھوکہ دینے اور رائے عامہ کو اغوا کر لے جانے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔

سوم ——— تیسرے گروہ میں وہ اسلام پسند ادارے اور عوامی تنظیمیں ہیں جو اسلام کے لئے مخلص ہیں اور دیانت داری کے ساتھ اس ملک میں اسلامی نظام کا احیاء چاہتی ہیں اور اس کے لئے ایک باضابطہ لائحہ عمل پر رائے عامہ کی تربیت و تہذیب کا کام سرانجام دے رہی ہیں۔

تیسرے گروہ کو چھوڑ کر پہلے دو گروہ میں جو جماعتیں شامل ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ ان میں اپنے مخصوص نظریات کو کھل کر عوام کے سامنے پیش کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ ان کے لیڈر اور کارکن رائے عامہ سے ڈرتے ہیں۔ اسی لئے وہ ہمیشہ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر عوام کے سامنے آتے اور ان کو اسلام کے نام پر دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ اور اب جبکہ عام انتخابات کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ان کا یہ کاروبار اور بھی کہیں زیادہ زور شور سے

شروع ہوجائے گا اور ان بھانت بھانت کے نقارچیوں میں سے جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو اسلام کا ترجمان اور ملّتِ اسلامیہ کا سرپرست ظاہر کرتا ہے۔ ایسے گروہ اور ایسے اشخاص کو تمیز کرنا عام طور پر مشکل ہوجائے گا جو اسلام کے لئے خلوص و دیانت داری سے کام کرنا چاہتے ہوں اور عوام کے سچے ہمدرد و غمگسار ہوں۔

حق رائے دہی کے ذریعہ ایک ایسی قیادت کو برسر اقتدار لانے کے لئے جو پوری یکسوئی کے ساتھ اسلام کے اجتماعی مسلک کے مطابق پاکستان کے داخلی اور خارجی مسائل میں ایک صحت مند اور ترقی پذیر رویہ اختیار کرے، ضروری ہے کہ ہم ہر مدعی کے دعووں پر آنکھ بند کر کے ایمان نہ لے آئیں بلکہ اس کے سابقہ رویّہ کو پوری طرح جانچ پرکھ کر دیکھ لیں کہ اس نے اب تک ہمارے اجتماعی مسائل میں اسلامی مسلک کو رائج کرنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے؟

اگر ان جماعتوں میں سے کوئی جماعت اسلام کے اجتماعی مسلک پر سنجیدگی اور ذمہ داری سے کام کرنا چاہتی تو وہ اپنی ساری جدّ و جہد کی بنیاد حسب ذیل چار مقاصد پر رکھتی اور ان کو حاصل کرنے کے لئے رائے عامہ کو متحد و منظم کرتی۔

- اوّل یہ کہ اس مملکت کو ان تمام فکری و عملی رجحانات سے بچانے کی کوشش کی جاتی جو اسے اسلام کے راستہ سے منحرف کرنے والے ہیں۔
- دوم یہ کہ عوام کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح پر توجّہ کی جاتی، یہاں تک کہ ہمارا معاشرہ جاہلیت کی بنیادوں سے ہٹ کر اسلام کی صالح اور تعمیری قدروں پر قائم ہوتا اور بھلائیوں کے نشو و نما کے لئے سازگار ہوجاتا۔
- سوم یہ کہ تمام قوتیں اس بات پر لگادی جاتیں کہ اس نئی مملکت کی تعمیر اُن بنیادوں پر ہو جو قرارداد مقاصد میں متعین کردی گئی ہیں اور کسی ایسی تدبیر کو چلنے نہ دیا جاتا جو قرارداد مقاصد اور اسلامی دستور کو بے اثر بنانے اور غیر اسلامی طرز کے نظام حکومت کے لئے اختیار کی جاتی۔
- چہارم یہ کہ آئینی ذرائع سے اس مملکت کی ناکارہ قیادت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کرنے کے لئے جدّ و جہد کی جاتی اور ایسے بروئے کار لاکر قوانین، نظم و نسق، تعلیم، مالیات، معاشی نظام، فلاح عمومی، دفاع اور خارجی سیاست میں ایسی اصلاحات کی جاتیں جن سے پاکستان دنیا میں اسلام کی صحیح نمائندگی کا ذریعہ بن جاتا۔

یہی وہ چار بنیادی مقاصد ہیں جو مختلف جماعتوں اور لیڈروں کے طرز عمل کو جانچنے کے لئے معیار کا کام دے سکتے ہیں۔ اس کسوٹی پر ایک

ایک جماعت اور ایک ایک شخصیت کو پرکھ کر دیکھئے، اس نے کیا کیا۔

جہاں تک مقصد اول کا تعلق رہا ہے مسلسل ۱۰ سال سے یہی دیکھنے میں آرہا ہے کہ حلق پھاڑ پھاڑ کر اسلام کا نعرہ لگانے والے یہ سیاسی بازی گر یہاں ایسے رجحانات کو پھیلانے اور پس پردہ ان کی آبیاری میں مصروف رہے ہیں جو مادہ پرستانہ گمراہی، لادینی ضلالت اور مذہبی فتنوں کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ قادیانیت، انکار حدیث، آزادیٔ نسواں سے لے کر نیشنلزم، سیکولرازم، کمیونزم اور آمریت تک کونسا ایسا فتنہ ہے جس کو پروان چڑھانے میں ان لوگوں کا ہاتھ نہیں رہا۔

اب دوسرے مقصد کو لیجئے یہاں پہنچ کر تو ان سیاہ کارناموں کی فہرست بنانا محال ہو جاتا ہے جو اس پورے عرصہ میں صرف اس غرض کے لئے انجام دیئے گئے کہ عوام میں اخلاقی انتشار اور بے راہ روی جتنی زیادہ پھیل سکے، پھیل جائے تاکہ رائے عامہ اتنی کھوکھلی ہو جائے کہ عوام میں تنقید و احتساب کا حوصلہ ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ باقاعدہ منصوبے بنا بنا کر رقص و سرود کی محفلیں جمائی گئیں، مینا بازار لگائے گئے، بے پردگی کے مظاہرے کئے گئے، اسمگلنگ، منافع خوری اور حق تلفی اور بے انصافی کے ذریعہ معاشرہ کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا گیا اور قوم کی اخلاقی طاقت کو جان بوجھ کر کمزور کر دیا گیا۔

تیسرے مقصد کے بالکل ہی برعکس قرار داد مقاصد کو یکسر ختم کرنے کی کوشش کی گئی اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس میں رکھے ڈالکر اسلامی مفہوم کی جگہ اپنے اپنے پسندیدہ مفہوم کو اس میں بھرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا اور جب یہ کوششیں پھل نہ لا سکیں تو دستور سازی کو برسوں معطل رکھا گیا اور جب دستور بنا تو اس میں بھی یہی کوشش رہی کہ جتنا بھی ہو سکے وہ قرار داد مقاصد کی گرفت سے باہر رہے اور اس میں ایسے خلاء رہیں جن کے ذریعہ مناسب موقع پر کسی غیر اسلامی طرز کے نظام حکومت کو اس میں فٹ کر دیا جائے۔ جب عوام نے ان خطرناک منصوبوں کا ہر مرحلہ اور محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کیا تو عوام کو تنگ کرنے، لوگوں کو جیلوں میں ڈالنے، پھانسی کے تختے آراستہ کرنے، فائرنگ کرنے، تحریر و تقریر پر پابندیاں لگانے، مقدمے قائم کرنے میں ملک اور قوم کا وقت اور روپیہ برباد کیا گیا اور ظلم و استبداد کا کوئی حربہ باقی نہیں رہا جسے اس دوران میں آزمایا نہ گیا ہو۔

اب آپ آخری کسوٹی پر ذرا ان کے اعمال کو پرکھ لیجئے۔ عوام کے فائدے قوم کی فلاح اور ملک کی خیر خواہی کے لئے نہیں بلکہ محض چند اشخاص اور مخصوص اعلیٰ طبقوں کے مفادات کے لئے اس ملک میں دس سال کے اندر تین اسمبلیاں بنیں اور پانچ وزارتیں برسر اقتدار آئیں اور اس سیاسی قیادت نے بار بار روپ بدل بدل کر ایسا ننگا ناچ ناچا کہ پاکستان کا سیدھا سادھا آنگن ٹیڑھا ہو کر رہ گیا اور برابر یہ کوشش کی گئی کہ ان کے حرم سیادت میں کوئی ایسا شخص نہ آنے پائے جس میں شرافت و اخلاق کی ذرہ برابر بھی رمق باقی رہ گئی ہو۔ اگر کوئی شامت کا مارا داخل بھی ہوا تو اسے ننگوں کے اس حمام میں اپنے جسم سے آخری تار بھی اتار پھینکنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک ملک کے کسی شعبہ میں بھی کسی قسم کی اصلاحات بروئے کار نہیں آسکی ہیں اور سارے معاملات انتہائی حد تک الجھے ہوتے اور پراگندہ ہیں۔

ان جرائم میں وہ پارٹیاں اور اشخاص بھی شامل ہیں جو پہلے برسر اقتدار تھے اور اب نہیں اور وہ بھی جو اب برسر اقتدار ہیں پہلے نہیں تھے اور انھیں بھی ان سے علیحدہ نہیں رکھا جا سکتا جو اپنی بدقسمتی سے مسند اقتدار پر نہیں پہنچ سکے اور اب تک اس کے لئے تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں یہ سب لوگ فرداً فرداً اور اجتماعاً اپنی اپنی ٹولیوں کی شکل میں آپس میں چاہے کتنا ہی اختلاف ہو لیکن اس معاملہ میں ہمیشہ ایک دوسرے کے دمساز اور پشت پناہ بنے رہتے ہیں کہ اس ملک میں چاہے کوئی لعنت آجائے۔ اسلام کو تو بہرحال نہ آنا چاہیئے۔ ایسی جماعتوں اور ایسے اشخاص سے جن کا یہ حال رہا ہو بھلا کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پاکستان میں اس طرح کی سیاسی مرکزیت کو قائم کر سکیں گے۔ جس کا ذکر آغاز سخن میں کیا جا چکا ہے ——

ان کے ذہن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بجز ان منفی رجحانات کے کسی اور چیز کا عکس نہیں اتر سکتا۔ لیکن یہ ہمیشہ ایک نہ ایک سوانگ بھر کر عوام کے سامنے آتے رہے ہیں اور اب جبکہ حق رائے دہی کی میزان کھڑی ہونے والی ہے۔ یہ اسلام کے عشق میں ایسی ایسی اڑانیں لگائیں گے کہ دنیا عش عش کرنے لگے اور ان کو اسلام کا سب سے بڑا محافظ اور عوام کا خیر خواہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے لیکن ہر ہوشمند اور مخلص انسان کا فرض ہے کہ وہ اوپر بیان کئے ہوئے اصولی معیار پر پرکھ کر جانچ لے کہ ان میں سے کون کتنے پانی میں ہے؟

فاروقی

ادبی لوٹ کھسوٹ

تقسیم ہند کے بعد سے ہمارے کردار میں جہاں اور پستیاں آگئی ہیں وہاں ایک پستی یہ بھی آگئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی کتابیں بلا اجازت چھاپ رہے ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے ہر دلعزیز مصنفوں اور شاعروں کو بلا اجازت چھاپا جا رہا ہے اور یہی حالت پاکستان میں ہے جہاں ہم ہندوستان کے مشہور مصنفوں کی کتابیں بلا جھجک چھاپ رہے ہیں۔ جو شکایتیں ہم تک پہنچی ہیں ان میں یہ شکایت بھی ہے کہ بعض ناشر نام بدل کر فرضی ناموں سے کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اخلاقی اور دنیوی نقطۂ نظر سے نہایت مذموم ہیں اور ضرورت ہے کہ انکا استیصال کیا جائے۔

ایسا بھی ہو رہا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے بعض ناشر ایک دوسرے کی کتابیں اس طرح چھاپتے ہیں کہ ان پر اصل پبلشر کا نام، پتہ اور پریس چھپا ہوا ہوتا ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ کتابیں 'امپورٹ' کی جا رہی ہیں حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ بددیانتی کی یہ صورت نہایت خطرناک ہے۔ اس سے پریس ایکٹ کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

اگر ہندوستان میں یہ جرم ہو رہا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بھی اسی جرم کا ارتکاب کریں۔ ہمیں تو ایسی مثال پیش کرنی چاہیئے۔ جو دوسروں کے لئے باعثِ تقلید ہو ورنہ "جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان" ایک بے معنی چیز ہو کے رہ جائے گی۔

ہم پاکستان میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں قانون کی خلاف ورزی کا جذبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ روزانہ اخبارات کے کالم انہی باتوں سے پُر ہیں۔ اس کو دیکھتے ہوئے ضرورت ہے کہ ہماری حکومت سخت قدم اٹھائے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر یہ وبا بڑھتے بڑھتے خوفناک شکل اختیار کر لے گی۔

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل　　　چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

دنیا کے تمام شائستہ ممالک میں کاپی رائٹ ایکٹ موجود ہے لیکن اگر نہیں ہے تو ان دونوں نوزائیدہ مملکتوں کے درمیان۔ کیا حکومت اس سلسلہ میں مناسب اقدام نہیں کر سکتی؟ متعدد اخبارات عرصۂ دراز سے چلا رہے ہیں کہ ایسا کیا جائے لیکن حکومت ہے کہ وہ آسمان کی باتیں کرتی ہے اور اہل زمین کے معاملات کو نہیں دیکھتی۔

پاکستان میں چوری کے واقعات پاکستان بننے سے لیکر اب تک لاکھوں ہی ہو چکے ہیں لیکن آج ان واقعات میں ادبی چوری کے واقعات کا اضافہ ہو رہا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہمیں حکومت سے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ خواہ ہندوستان اس سلسلہ میں پاکستان کے ساتھ تعاون کرے یا نہ کرے، پاکستان میں سے کم سے کم اس لعنت کا خاتمہ ہونا ضروری ہے تاکہ بین الاقوامی کانفرنس میں ہم سرخروئی کے ساتھ کہہ سکیں کہ یہ جرم ہمارے یہاں نہیں ہوتا۔

حکومت کو جلد سے جلد مزید وقت ضائع کئے بغیر اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے تاکہ یہ ادبی لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے۔

(کتابی دنیا)

فکر و نظر

نئے جام

ایک ادبی جائزہ

سبط فاروق فریدی

ہمارے خیال میں اسلامی ادب کے وجود و وجوب کے لئے کوئی ثبوت بہم پہنچانا ایک عذر خواہانہ Apologetic رویہ ہے
محض احساس کہتری کا اظہار، اسلامی ادب ایک بدیہی حقیقت ہے اور اس سے انکار صداقت سے روگردانی، قطع نظر اس کے کہ تاریخی رو سے
ب خصوصاً شعر پیداوار ہے انسان کے جذبۂ عبودیت یا احساس عشق کی، عربی، فارسی یا اردو زبان کا کثیر یا وافر سرمایہ مذہبی یا اسلامی
ب ہے، قرآن کریم کی ادبی حیثیت، ادبی سند مسلم ہے، سچ پوچھیے تو انگریزی ادب میں بائبل Authorized Version
جو مقام حاصل ہے عربی ادب میں فرقان حمید کا مرتبہ اس سے بدرجہا زیادہ بلند ہے۔ مثال کے طور پر رب، احد، صمد یا حمد ایسے مفرد کلمات
یا جن کی ادائیگی سے دنیا کی دوسری زبانیں عاجز ہیں۔ انگریزی میں اگر "رب" کی تشریح کی جائے تو Evolver
nurturer, nourisher, Lord, Master, Producer
originator, protector, sustainer وغیرہ وغیرہ قبیل کے الفاظ یکجا کئے جائیں تب وہ من حیث المجموع
لفظ رب کے معانی کے اظہار سے قاصر و عاجز ہیں۔ "احد" کے لئے one, Alone اور Unique یہ سب مفرد
ات مل کر بھی ذات و صفات کی یکتائیت کی ادائیگی کی راہ میں ناکافی ہیں۔ عربی داں ہی حمد، ثنا، مدح، منقبت کے نازک فرق سے
گاہ ہیں، صمد کی توضیح eternal support a refuge کے ذریعہ کس قدر بھونڈی ہے اگر تراکیب کو لیا جائے
سجع، بحر رنگ کا جامع ترجمہ کسی غیر زبان میں کر کے دیکھ لیجئے۔ مضامین کی بلاغت اور اعجاز بیان تو اپنی جگہ آپ ہے۔

طوالت کلام مانع ہے ورنہ اس قسم کی صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، تفسیر، حدیث و فقہ خصوصاً بخاری اور ہدایہ میں خالص
ادب کا جو اتارہ کام ذہن موجود ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کتب اخبار و سیر یعنی تاریخی کتابوں کو لیجئے تو ان میں عربی ادب یا فارسی ادب کا بیشتر
مستند سرمایہ یہی ذخائر ہیں۔ اخلاقیات، فلسفہ اور منطق کہا جاتا ہے خشک موضوع ہیں مگر احیاء العلوم (غزالی) گلستان سعدی، اخلاق جلالی
اخلاق محسنی۔ رازی، طبری، ابن اثیر کی تفاسیر، شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ کی ادبی شان سے کون کوتاہ بین منکر ہو سکتا ہے؟ اسی طرح تصوف میں
غزالی، جامی، خسرو محمودی کے نام ہی کافی متعارف ہیں۔ خواہ نثر کے مرتب مجموعوں میں شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن کو شرف اولیت حاصل
ہے اور وہ اپنے وقت کا بامحاورہ ادب ہے۔

اگر ان تفاسیر اور حدیث و فقہ، اخلاق و فلسفہ اور تاریخی کتابوں کو عربی، فارسی یا اردو نثر سے خارج کر دیا جائے تو حیران ہوں کہ کیا
باقی رہ جاتا ہے۔

اب شعر کی طرف آئیے۔ بلاشبہ میدان مجاز میں عربی خصوصاً فارسی اردو شعر نے بہت گل کھلائے ہیں اور حقیقت کم کھیلے ہیں۔
اخلاقی اور دینی رو سے ان خرافات کی خواہ کچھ ہی قیمت کیوں نہ ہو ان کی ادبی حیثیت مسلم ہے خواہ وہ قصیدے اور غزل کی صنف میں ہو

یا مثنوی اور رباعی میں۔

مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ لفظ "مجاز" ہی اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ عشق حقیقی چیزے دیگر است۔ کلاسیکی ادب میں اصول مسلمہ ہی تھا کہ جمالیاتی حسن کا صحیح مظہر یا مرکز اظہار عشق حقیقی ہی ہے۔ تصوف کی شرعی حیثیت سے مجھے بحث نہیں۔ آپ کو اختیار ہے کہ وحدت وجود، وحدت شہود، فنافی الشیخ، فنافی الرسول، فنافی اللہ، بقا باللہ جیسے نظریوں کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ مگر تصوف خود مذہب رؤیدہ یعنی ایک مذہبی نمو ہے جس کے ڈانڈے اسلامی اخلاق اسلامی روحانیت اسلامی شریعت سے ملتے ہیں۔ متصوفین میں حافظ کو چھوڑ دیجئے، تب بھی سعدی، رومی، خسرو، جامی، فریدالدین عطار، سنائی اور ان سے بھی پہلے فارسی شعر کے موسس ابو سعید ابوالخیر کو لیجئے ان کے فلسفۂ اخلاقیات کو پرکھئے اور فرمائیے کہ آسمان شعر کے یہ سورج کیا آج پوری آب و تاب سے جلوہ گر نہیں۔

اچھا ذرا اس ادبی روایت پر بھی تو غور فرمائیے کہ ہر قدیم اردو فارسی شاعر (خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو) کے دیوان کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے، ظہیر فاریابی، انوری اور انشا جیسے بھاٹ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ میدان نعت میں، خاقانی، سعدی، جامی، قاآنی، خسرو، نظیری، غالب، مومن، محسن کاکوروی وغیرہ کی ادبی عظمت و شوکت کیا تعارف کی محتاج ہے؟

یہ ضروری ہے کہ شعر گوئی خصوصاً غزل میں رنگ مجاز ایسا چھایا کہ ترک شیرازی کے خال ہندوش پر سمرقند و بخارا نچھاور کر دیئے گئے۔ مجازی شراب و نغمہ کے کیف میں ناصح و واعظ کو ہدف ظرافت بنایا گیا۔ مگر اس خیالی نشاط انگیزی، اس تصوری طرب پروری کی حیثیت کلاسیکی ادب میں ہمیشہ نگارانہ رہی اور موجودہ رجحان کے خلاف تلذذ یا مادی نفس پرستی کبھی مطمح نظر نہ رہا۔ یوں کہہ لیجئے کہ مجاز ایک ادبی روایت تھا جس سے ثقہ شعرا بھی دامن نہ بچا سکے۔ سعدی، نظامی، حافظ، رومی، خسرو، جامی، مومن، محسن کاکوروی، امیر مینائی، اصغر گونڈوی وغیرہ اس قسم کی مثالیں ہیں۔ یہ میدان مجاز کے مرد ہیں۔ مگر کیا ان کے متعلق تصور کیا جا سکتا ہے کہ مجاز بہ حیثیت نظام زندگی کے آئیڈیل کے ان کے پیش نظر رہا ہو۔ یہ ثقہ ہستیاں تو درکنار، غیر ثقہ شعرا کے عقائد کا آئینہ بھی اسی وقت سامنے آتا ہے۔ جب وہ حمد و نعت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہیں ان کی حقیقت پسندانہ داخلی زندگی منکشف ہوتی ہے۔

اس لئے یہ سوال ہی لایعنی ہے کہ آیا مذہبی ادب کا شمار کلاسیکی ادب عالیہ میں ہے۔ مذہبی لٹریچر کو اگر اردو، فارسی، عربی سے خارج کر دیا جائے تو یہ زبانیں سراسر تہی مایہ ہو کر رہ جائیں اور یہی اس امر کی دلیل ہے کہ ادب عالیہ اور مذہب میں ایک حد تک چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔

یہ بھی درست نہیں کہ مذہبی ادب ایک تحریک کی صورت میں رونما نہ ہوا، الف لیلہ، داستان امیر حمزہ، قصۂ چہار درویش، فسانۂ عجائب وغیرہ داستانوں کو چھوڑ کر نثر میں جتنا کلاسیکی سرمایہ ہے وہ اکثر و بیشتر مذہبی تحریکوں کا مرہون منت ہے، خود شعر میں متصوفانہ تحریکیں پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہیں۔ البتہ یہ امر مسلمہ ہے کہ ماضی میں قرون اولیٰ کے بعد شرعی انداز پر کسی منظم اسلامی ادبی تحریک کا سراغ میدان شعر میں نہیں ملتا۔ اس کی وجہ ہمارے خیال میں مسلمانوں کا سیاسی اور معاشی استیلا ہے۔ حکمرانوں کی ذہنی برتری و غلبہ، ان کا تمدن و تہذیب محکوموں میں چھا جاتے ہیں، اٹھارہویں انیسویں صدی تک مخالف اسلام قوتوں نے مسلم ممالک یا مسلم معاشرہ کے خلاف مؤثر انداز میں سر نہ اٹھایا اسی لئے کسی کو احیاء اسلام کی فکر نہ ہوا یا کم ہوئی، ادھر دولت عثمانیہ پر کاری ضربیں پڑیں، مغل چراغ ٹمٹمایا اور ایران نرغے میں آیا، ادھر شاہ ولی اللہ، عبدالوہاب، سید احمد بریلوی، سنوسی، جمال الدین افغانی، مفتی عبدہٗ، اور سرسید جلوہ گر ہوئے ان میں سے ہر مفکر اور ہر مصلح نے اپنے اپنے انداز پر نشاۃ الثانیہ کی سعی کی، اور یہ تحریکیں شعر و ادب کے قالب میں ڈھل گئیں۔ زمانہ قریب میں حالی، شبلی، سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، اکبر الہ آبادی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور اقبال ان احیائی تحریکوں کے ادبی گل بوٹے ہیں۔

بیسویں صدی میں جہاں احیائی تحریکوں نے زور پکڑا وہاں نظریاتی تصادم بھی بڑھا۔ اس تصادم کی زد براہ راست شعر و ادب پر

پڑھی پڑھی۔ نظریات کی شدت میں فرائڈ اور مارکس کے متضاد و متصادم نظریات اپنی اپنی جگہ نام نہاد ترقی پسندی یا جدت پسندی
قیب اپنے ، ادب برائے ادب ، یا ادب برائے مقصد ۔ جمالیاتی حس یا معاشی حس کی اثر انگیزی ہیئت یا مواد ، تعمیر پسندی یا تخریب پسندی
ل پسندی یا حقیقت پسندی ، مادیت یا روحانیت ، اخلاق کی اضافیت یا مطلقیت وغیرہ مباحث سامنے آئے ۔ شدت پسندی سے
اد و تفریط میں تمیز نہ کی بغرض بھانت بھانت کی ایسی بولیاں بولی گئیں کہ ہر ساز بے آہنگ نظر آیا ۔ اس شدت پسندانہ دور میں خام ذہن
ت پسندی کے روپ میں تشکیک ، لا ادریت ، الحاد ، جنس نوازی یا بہیمانہ فلسفہ شکم کی زد میں بہہ گئے ۔ شکست و ریخت ان کا ایمان بن گیا اور
ق و مذہب کی حدود شکنی میں انہیں صداقت یا انسانیت کی راہ نظر آئی نتیجہ بے راہ روی ہوا اور گم کردہ راہ کی اتمام منزل حزن و یاس
غم گیری ، قنوطیت و اضمحلال سے ہم آغوشی اور اس کے ساتھ ہی خواب و خیال کی لال پری سے راز و نیاز بھی ہوا کرتی ہے ، پرانے شعراء
ء نا ہنجار کو کوسا کرتے تھے ۔ ہمارے نئے ادیبوں نے خود انسان کو کوسنا شروع کر دیا اور اس میں انہیں معرفت انسانیت کی تکمیل نظر آئی
تھے مادیت کی دیواریں استوار کرنے ۔ یہ کلیسا تو کیا بنتا ، پیدا ہونے لگی موقع پسندی یا تجرید پرستی کی ۔

یہ سب کچھ ہوا مگر ایک حقیقت بھی اُبھر کر ہوئی ، ہر شر میں خیر مخفی ہوتا ہے ۔ منفیت کی اس شعوری ابیل سے اتنا ضرور ہوا کہ رجعت پسندی
ایت پرستی اور جمود کے قلعوں میں شگاف پڑ گئے ۔ فیوڈل معاشرہ کی بے جانی ظاہر ہو گئی اور جمہوری عوامی قوتوں کی سرگرمی سے معاشرہ
ادب کے لئے نئی راہیں کھل گئیں ، خضر سا رہنما تو نہ ملا مگر قدموں کو جنبش تو ہوئی ۔ معاشرے اور ادب کو نئے میدان تو ملے ۔ کل تک ادب
ہوئی شمعیں محل سراؤں میں باد حوادث سے محفوظ و مستور تھیں اب ادب چراغ سر رہگذر تو بن گیا ، انیسویں صدی کے وسط تک ادب درباری
نیت تھا انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں احیائی تحریکوں کی مقصدیت کے طفیل وہ چوک اور بازار میں پہنچ گیا
پوری عوامی تحریکوں کی خارجی اور داخلی ، فکری اور عملی ، سیاسی اور ذہنی قوتوں کے باہم عمل اور رد عمل کے سبب اب ادب کو یہ موقع
میسر ہوا کہ وہ کارخانوں میں مزدوروں اور کھیتوں میں کسانوں تک پہنچ جائے ۔ اس طرح نچلے طبقہ پر ضیا پاشیوں یا ان طبقوں کی عکاسی
ے نئی صداقتیں ، نئی حقیقتیں اور ان کے نئے اسالیب فکر اور نئے ہیئتی دائرے دھندلکوں میں ظاہر ہوئے ان ٹمٹماتے چراغوں نے مسافر
و منزل کی دوری کا احساس تو دلا دیا ۔

کشمکش ابتلا اور آزمائش کے اس دور میں احساس منزل نے اسلامی احیائی تحریکوں کو بھی متاثر کیا اور اس تحریک کے لئے بھی ضروری
ہوا کہ نیا رخ ، نیا پہلو اختیار کرے اور نئی راہیں نکالے ۔ اسلامی مقصدیت کے رنگ میں پختگی آئی ، اب تک اسلامی احیائی تحریک کا طور طریقہ
تھا ایسا ہی تھا کہ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہ رو کے ساتھ مگر جہاں موڑ آیا معذرت خواہانہ apologetic طور پر قدم ڈھیلے پڑ گئے
تکان زیادہ ہوئی تو تھک ہار کر بیٹھ گئے ؎

حسرت پہ اس مسافر بے کس کی رو یئے
جو تھک کے رہ گیا ہو منزل کے سامنے

پھر ذرا جان میں جان آئی تو ناؤ کے لگو سیڑھ مارنے شروع کر دیئے ۔ مگر یہ حالت کب تک رہتی ، نظریات کے تصادم سے قبل احیائی
ادبی تحریک کے افکار مغرب ، روایت پرستانہ قدیم رنگ مجازیہ یا جدت پسندانہ جدید رنگ رومانیت سے تدریجی مصالحت پسندانہ روش
ہی رکھی ۔ نظریات کا تصادم کیا ہوا کہ مرنجان مرنجی ہلاکت آفریں نظر آئی ۔ اس نازک وقت میں ذرا قدم ڈگمگا نا موت کو دعوت دینے کے مراد
ثابت ہوا ۔ ایک طرف کنواں تھا اور دوسری طرف کھائی ، زیادہ نمایاں طور پر فرائیڈ اور مارکس دو متضاد خطرے سامنے تھے ۔
ان دونوں نظریوں میں تصادم تھا اس کے علاوہ افکار حاضرہ کے منبع و مخرج کے اندر عرف عام میں جدید اور قدیم ادب میں باہم گرد

تھا۔ ان مختلف کشمکشوں میں جانبین کے کمزور پہلو نمایاں ہوئے اور یہ بھی ظاہر ہوا کہ ہر خنجر کا جوہر زہرِ ناب سے قائم ہے۔ مادیت خواہ وہ مائل بہ جنس ہو یا راغب بہ شکم، خواہ وہ بطرزِ قدیم ہو یا بہ رنگِ جدید یعنی خواہ اس کا باوا آدم Adam Smith ایڈم اسمتھ ہو یا کارل مارکس Carl Marx جب اس مادیت کا تعلق سیدھے سادے الفاظ میں اخلاق و انسانیت سے منقطع ہو جاتا ہے تو سراسر بہیمیت و حیوانیت ہی رہ جاتی ہے خواہ وہ مرغ کی خواجگی میں مرغیوں کا جھرمٹ ہو یا جنگلی کتوں کا غول ہو یا ٹڈی دل کی قطار یا افزائشِ نسل ہو یا شارک مچھلیوں کا ریلا ۔

اس احساس نے ایک مثبت راہ دکھائی، اقبال کی جرأت رندانہ کام آئی۔ اس مردِ میدان نے اپنے شاہینی فلسفۂ رفعت و حرکت سے نئی معاشری اور اس کے ساتھ ہی ادبی راہیں متعین کیں۔ اقبال نے بہت جلد مدافعانہ مرحلے طے کر کے ضاربانہ طرز اختیار کیا اور ایک حد تک فکر و عمل کی راہ بدل دی۔

ان ہی بنیادوں کو ایک منظم اسلامی تحریک نے جسے عرفِ عام[1] میں مودودی تحریک بھی کہہ دیا جاتا ہے تشکیل و ترتیب اور استحکام بخشا، مقصدیت ہمہ گیر اصول حیات بن کر پیش ہوئی۔ نظریۂ حیات پرانا تھا۔ اسلامی تحریک نے زنگ خوردہ آئینہ کو صیقل کیا یا یوں کہہ لیجیے کہ دردِ تہہ جام سے مے کہنہ کو صاف پاک کیا اور نئے جام نئے پیمانے پیش کئے۔ اس تحریک پر حتمی رائے مستقبل کا مورخ ہی دے گا۔ مگر اس کے ٹھوس اور جاندار ہونے میں کلام کم ہے اس کے ساتھ صداقتِ نفس ہے اور اس کے پیشِ نظر حقیقت مقصود ہے۔ ممکن ہے جزئیات و فروعات یا اکثر لوازماتِ حیات میں اس کی نوک پلک ہنوز تشنۂ تکمیل و درستگی ہو۔ ایک تجدیدی تحریک فکری طور پر ہمیشہ مائل بہ نشو و نما رہتی ہے۔ ہماری دانست میں اربابِ تحریک کو بھی یہ دعویٰ نہیں کہ تحریک کا ذہن نقطۂ کمال پر پہنچ گیا ہے اور آئندہ ترقی مسدود ہے۔ مگر اتنی حقیقت واضح ہے کہ تحریک کا مقصدِ اولیٰ انسانی معاشرہ کو اخلاق میں سمو دینا ہے۔ تصورِ توحید کی عملی تشکیل ہی اخلاق و معاشرہ کو باہم مزدوج کر سکتی ہے اور یہی اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے ۔

اس حیات بخش مقصدیت کے زیرِ اثر شعر و ادب کے لئے بھی نیا دروازہ کھل گیا ہے۔ یہ مقصدی تحریک نظریاتی مصالحت پسندی سے لگاؤ نہیں رکھتی اور نہ موقع پرستی Opportunism سے آشنا ہے اور اس کسوٹی پر ہی تجرباتیت کو پرکھتی ہے۔ اکتسابِ فن سے اسے عار نہیں مگر نہ اسے مجاز و رومان کی متوازی تحریک سے کوئی واسطہ ہے اور نہ "سرخ ترقی پسندانہ" اسلوب کشی کی قائل۔ اس کی نظر ادبِ عالیہ پر ہے۔ ادبِ عالیہ کی تخلیق اسی وقت ہوتی ہے جب مواد اور ہیئت اس طرح باہم مزدوج، ہم رشتہ اور شیر و شکر ہوں جیسے صدف میں موتی کی تربیت ہو یا جیسے بلور، شورے کا قلم crystal بنتا ہے۔ اس تربیت اس crystallization کی توقع تحریک کے موجودہ تجرباتی دور میں ذرا بعید سی بات ہے صدفِ زبان میں درِ شاہوار کی تربیت وقت چاہتی ہے۔ تحریک نے ایک تجرباتی جمہوری عوامی دور میں جنم لیا ہے اور Democratization of litrature ادب کی عوامیت کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ شروع میں کیفیت quality کی جگہ کمیت quantity لے لیتی ہے اور پھر اسی کثرتِ تخلیق سے در ہائے یکدانہ خود بخود ابھر آیا کرتے ہیں۔ اس لئے موجودہ ابتدائی دور میں اسلوب کا جھول، فنی رطب و یابس اور تبلیغی طرزِ ادا ناگزیر ہیں۔ کسی زبان کا ہر لفظ حامل ہوتا ہے اپنی مخصوص جذباتی، حسیاتی، تخیلی اور فکری معنویت کا یا یوں کہہ لیجیے کہ ہر لفظ بیک وقت ایک علامت بلکہ ایک منہ بولتی تصویر ہوتا ہے جذبات، حسیات اور فکر کا طرزِ ادا میں بعض وقت حسی پہلو کمزور رہ جاتا ہے، کبھی فکری

---

[1] اسلامی تحریک کے لئے ہم نے آج تک مودودی تحریک کی اصطلاح استعمال ہوتے ہوئے نہیں دیکھی البتہ چند ایک مخالفین نے یہ اصطلاح اپنے مخالفانہ پروپیگنڈے میں استعمال کی تھی جو کبھی زبان زدِ عام نہ ہو سکی، اسی لئے اسے عرفِ عام کہنا سراسر زیادتی ہے (ادارہ)

وہ کبھی جذباتی پہلو نظر انداز ہوجاتا ہے اور کبھی تخیلی پہلو، اسی لحاظ سے تاثر میں کمی رہ جاتی ہے
ایک تجرباتی دور میں یہ سب کچھ تسلیم شدہ ہے مگر فنی کمزوری ہرگز ہرگز مقصدیت کا بطلان نہیں کرسکتی بلکہ یہ سمجھنا ہی خام کاری کی دلیل ہے۔

موجودہ اسلامی ادب کا مستقبل یقیناً روشن ہے کیونکہ اس کے پیچھے خلوص، صداقت نفس ہے، تفکر ہے، تحقیق و تدقیق ہے "پوت کے پیر پالنے میں" مشہور ضرب المثل ہے۔ اس ادبی تحریک کے روز افزوں تجرباتی نمونے ترقی پذیری کی جانب اشارہ کرتے ہیں ۔

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے :-

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ستمبر ۵۷ء کے اس شمارہ کے ساتھ ختم ہورہی ہے۔ براہ مہربانی آئندہ کیلئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہی سمجھیں گے کہ وی پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم :- منیجر "مشیر" کراچی۔

۲۰۵۲ جناب عبدالرؤف صاحب علوی (اے۔ ایس۔ ایم) اوڈیرو لال این ڈبلیو۔ حیدرآباد۔
۲۲۱۳ جناب حضرت مولانا مولوی احمد دین صاحب۔ مکھڈ شریف ضلع کیمبل پور۔
۲۳۸۸ جناب محمد کامل صاحب خلاقی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ آفس بنارس (کینٹ) یوپی۔
۲۳۹۹ محترمہ عابدہ سلطانہ صاحبہ۔ ۲۲۵۔ کلفٹن روڈ کراچی۔
۲۴۰۴ میسرز فاروق احمد برادرس۔ لیدر اینڈ شوز مرچنٹس۔ خیرپور۔
۲۴۰۵ مسز الیف شوکت صاحبہ معرفت پاک پیٹرولیم لمیٹڈ۔ جہلم۔
۱۵۱۵ جناب محمد صدیق صاحب۔ محلہ اسلام پورہ۔ نارووال ضلع سیالکوٹ
۱۵۱۷ جناب عبدالغفور صاحب۔ صدر انجمن مہاجرین۔ رام گڈھ۔ لاہور۔
۲۱۵۳ محترمہ اختری بیگم صاحبہ ضلع غازی پور۔ یوپی۔
۲۵۵۴ جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اسلامیہ ہائی اسکول۔ نواب شاہ۔
۲۵۵۵ محترمہ مس رخشندہ جبیں صاحبہ۔ منوڑہ۔ کراچی۔
۲۵۵۷ جناب آر۔ اے۔ صدیقی صاحب۔ ای۔ بی۔ ریلوے۔ چٹاگانگ۔

قدم بہ قدم ———

آسٹریلیا میں اسلام

آسٹریلیا میں اسلام کی کہانی خود آسٹریلیا کی کہانی سے کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔ اس برِ اعظم میں انسانی آبادی کا آغاز تو اٹھارویں صدی کے آخری دھائے ہی میں ہوگیا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط تک صرف ساحلی علاقوں ہی پر بستیاں بسائی جاسکیں۔ اندرونی علاقے اسی طرح غیر آباد اور انسانی دسترس سے محفوظ پڑے تھے۔ دھیرے دھیرے بسنے والوں نے ان علاقوں کی بادیہ پیمائی شروع کی اور اس سرزمین میں جو دولت چھپی ہوئی تھی اسے معلوم کرنے کی جد و جہد کی جانے لگی۔ علاقہ زیادہ تر پہاڑی کے گھنے جنگلات سے ڈھکا ہوا تھا۔ آمد و رفت کے ذرائع کا مسئلہ اہم ترین مسئلہ تھا۔ نو آباد کار نہ تو اس نوعیت کے علاقوں میں آمد و رفت کا تجربہ رکھتے تھے اور نہ ان کے پاس وسائل ہی اتنے تھے۔ کھوج لگانے والوں نے ان نو آباد کاروں کی مدد سے علتی کوششیں بھی کیں وہ محدود اور ناقابلِ اطمینان تھیں۔ آخر فیصلہ یہ کیا گیا کہ افغانستان کے شتربانوں اور برِ صغیر پاکستان و ہند کے شمالی علاقوں کے جفاکش باشندوں سے مدد لی جائے جن کے ذرائع آمد و رفت ایسے علاقوں میں آزمودہ ہیں چنانچہ جلد ہی یہ لوگ اپنے کنبے سمیت آسٹریلیا میں آکر بسنے لگے۔ یہ لوگ کھوج لگانے والی جماعتوں کو سامان رسد پہنچاتے تھے اور نئے نئے راستے دریافت کرتے تھے۔ یہی لوگ اپنے ساتھ اسلام لائے اور اس طرح آسٹریلیا میں جس گوشے میں بھی پہنچے ان کا مذہب ان کے ساتھ ساتھ وہاں پہنچتا رہا۔ ان میں سے بیشتر اپنے خاندانوں کو بھی لے آئے اور کنوؤں اور چشموں کے پاس آباد ہو گئے اور ان کے چھوٹے چھوٹے قصبے برِ اعظم کے سینے پر اُبھرنے لگے۔

آسٹریلیا کی چھ ریاستیں ہیں۔ ان میں اسلام کے آغاز کی تاریخ مختصر طور پر بیان کی جاتی ہے۔

جنوبی آسٹریلیا :-

سنہ ۱۸۸۵ء میں حاجی طاہر بین نامی ایک مسلمان نے جنوبی آسٹریلیا کے صدر مقام ایڈی لیڈ کے نواح میں ایک قطعۂ زمین کومن نامی ایک سوداگر سے خریدا۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں اسلام کا ایک مرکز کھولا جائے۔ اس زمانے میں ایڈی لیڈی میں صرف چند دکانیں اور چند مکان تھے اور مسلمانوں کی آبادی چار سو کے قریب تھی۔ حاجی صاحب نے تجویز پیش کی کہ مسجد تعمیر کی جائے جسے منظور کر لیا گیا۔ سب نے دل کھول کر چندے دیئے اور مسجد تعمیر ہو گئی جو آج تک آباد ہے۔ آج کل یہ مسجد اور اس سے متصل جائداد جو ایک قطعۂ زمین، ایک مسافر خانہ اور کچھ مکانات پر مشتمل ہے اسلامک سوسائٹی آف ساؤتھ آسٹریلیا کی نگہداشت میں ہیں۔ سوسائٹی تبلیغ و اشاعت کا کام بھی کرتی ہے۔ ۱۹۵۵ء کے اندازے کے مطابق اس ریاست میں تین سو مسلمان رہتے ہیں۔ آسٹریلیا کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کے پھیلتے رہنے کی وجہ سے یہ تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ۱۸۸۱ء میں اس ریاست میں پانچ ہزار کے قریب مسلمان تھے مگر اس کے بعد یہ تعداد گھٹنی شروع ہوئی اور سنہ ۱۹۵۵ء میں صرف تین سو رہ گئی۔ اب یورپین مسلمانوں کی آمد سے پھر کچھ بڑھنے لگی۔

مغربی آسٹریلیا :-

مغربی آسٹریلیا میں اسلام کا ظہور موجودہ صدی کے آغاز میں ہوا۔ ۱۳ نومبر ۱۹۰۵ء کو صدر مقام پرتھ میں مسجد تعمیر کی گئی جس سے ملحق ایک مسافر خانہ بھی ہے۔ یہاں بھی ایک سوسائٹی قائم کی گئی تھی لیکن دوسری ریاستوں میں مسلمانوں کے چلے جانے سے یہ سوسائٹی قائم نہ رہ سکی اس ریاست

ان زیادہ تر مسلمان وہ ہیں جو یورپ سے آئے ہیں۔

وکٹوریا اور تسمانیا :-

ان ریاستوں میں مسلمان ۱۸۵۴ء سے بھی پہلے سے آباد ہیں لیکن یہاں کسی دور میں بھی مسلمانوں کی کسی تنظیم یا مسجد کا ذکر نہیں ملتا ٹوریہ میں سنہ 1951 کے اندازے کے مطابق ۲۰۷ مسلمان بستے ہیں، یہاں کی تجارتی زندگی بالخصوص جہاز رانی میں مسلمانوں کا نمایاں حصہ ہے مورن یونیورسٹی میں متعدد مسلمان نوجوان تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

نیو ساؤتھ ویلز :-

اس ریاست میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز سڈنی ہے۔ یہاں مختلف ملکوں مثلاً پاکستان، قبرص، انڈونیشیا، لبنان اور ترکی کے مسلمان جمع ہیں۔ مگر ملبورن کی طرح سڈنی میں بھی کوئی مسجد نہیں ہے۔ البتہ بروکن ہل میں جو کالونی کا مرکز ہے ایک کافی پرانی مسجد ہے جو مسلمانوں کی لاپرواہی سے خستہ ہوتی جا رہی ہے۔

کوئنز لینڈ :-

اس ریاست میں زیادہ تر مسلمان برسبین میں رہتے ہیں۔ یہاں سنہ ۱۹۰۸ء میں مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ اس ریاست میں مسلمان موجودہ صدی کے آغاز میں آئے تھے جو زیادہ تر افغانی اور برصغیر کے باشندے تھے۔ اُنھوں نے یہاں کھیتی باڑی اور تجارت شروع کر دی۔ اس طرح ان کی مدد سے اس علاقے کی بہت سی زمینیں آباد ہو گئیں اور تجارتی مرکز قائم ہو گئے۔

(تسنیم)

انڈونیشیا میں قادیانی فتنہ

پاکستان کے عُلَمَا کے نام انڈونیشیا کے ایک مسلمان کا مکتوب

ذیل کا خط انڈونیشیا سے ایک صاحب نے جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر میں بھیجا ہے اس خط میں ان صاحب نے پاکستان کے علما اور اہل دین حضرات کو انڈونیشیا میں قادیانی فتنے کے اثر و نفوذ سے آگاہ کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ اس فتنے کی روک تھام کے لئے انھیں ایسا لٹریچر مطلوب ہے جو مرزائیت کی تردید میں لکھا گیا ہے تاکہ وہ اسے انڈونیشی زبان میں شائع کر کے وہاں کے مسلمانوں کو اسکے زہر سے بچائیں۔ خط کے آخر میں ان صاحب کا پورا پتہ درج ہے۔

پاکستان کے علما کے نام، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ——— اس مختصر عریضے کے ذریعے سے میں پاکستان کے تمام علما اور اسلام پسند حضرات کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ انڈونیشیا کے اطراف و اکناف میں مرزا غلام احمد قادیانی کی خود ساختہ نبوت و مسیحیت کا فتنہ وسیع پیمانے پر پھیلایا جا رہا ہے میں خدا اور رسول کے نام پر آپ حضرات سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اپنے ہاں کا وہ تمام لٹریچر بھیجیں جو اس نبوت کاذبہ کے ابطال و تردید اور مذہب مرزائیت کی حقیقت اور غرض و غایت کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم لوگ اس قسم کا تمام لٹریچر انڈونیشی زبان میں شائع کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس فتنے کی روک تھام ہو سکے اور انڈونیشیا کے مسلم عوام لاعلمی کی وجہ سے اسکے دام فریب کا شکار نہ ہوتے رہیں نیز اس سلسلے میں مرزا غلام احمد کی مندرجہ کتابیں بھی درکار ہیں: (۱) التبلیغ (۲) کرامت صادقین (۳) حمامۃ البشریٰ (۴) تحفہ بغداد (۵) انجام آتھم (۶) نور الحق ۲ حصے (۷) مواہب الرحمٰن (۸) اعجاز مسیح (۹) اعجاز احمدی (۱۰) استفتا (۱۱) الہامی خطبے (۱۲) اتمام حجت (۱۳) سر الخلافہ (۱۴) حجۃ اللہ (۱۵) سیرۃ الابدال (۱۶) تعلیم الاسلام اور دوسری وہ تمام کتابیں جن میں ان کے مذہب کی بنیادی چیزوں کا ذکر ہے۔ منتظر جواب: محمد معصوم جگجاوی

پورا پتہ: Jekjai Md Masoom Kauman 126 Jekjakarta (Indonisia)

جانوروں میں طبی شعور

حکیم مولانا افضل اللہ خان صاحب اجمیری

مدعائے تحریر حیوان ناطق سے نہیں جس کی صفات میں کتابت و ضحک شامل ہے۔ بلکہ غایت تحریر حیوان ناطق سے ہے جو ان صفات حسنہ سے معذور ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی صنعت پروردگاری سے حیوان ناطق کو عطا فرمائی ہیں۔ لیکن صحت و مرض کا تعلق ہر حیوان سے وابستہ ہے خواہ وہ ناطق ہو یا مطلق، مگر حیوان ناطق عقل و شعور، علم و فضل اور فراست سے امراض کی حقیقت و ماہیت سے واقف ہوا کرتا ہے اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ انسان ہی گوناگوں امراض کا شکار بھی ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی غذاؤں میں حیوانی اور نباتاتی دونوں قسم کی اشیاء شامل ہیں مگر حیوان مطلق صرف ایک قسم کی غذائیں استعمال کیا کرتے ہیں۔ مثلاً جو جانور کہ نباتات استعمال کرتے ہیں۔ وہ گوشت وغیرہ نہیں کھاتے اور جو جانور گوشت استعمال کرتے ہیں نباتات نہیں کھاتے۔ نیز ان میں یہی صلاحیت ہے کہ وہ مضر مزاج اور صحت غذائیں استعمال نہ کریں اور وہ مضر اشیاء کو جانتے پہچانتے بھی ہیں اس مشاہدہ اور تجربہ پر ہر وقت کہا جا سکتا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی مضر اور مہلک شے آتی ہے تو اس کو سونگھ کر چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی نہیں کھاتے۔ یہاں پالتو جانور مستثنیٰ ہیں کیونکہ انسان ان کو جو کچھ کھلاتے ہیں وہ بیچارے اسے کھانے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ خواہ وہ غذا ان کے لئے طبعی ہو یا غیر طبعی، انکی اسی قسم کی عادت بھی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کو کچھ ضرر نہیں ہوتا۔ مگر یہ حضرت انسان ہیں کہ ان کو دونوں قسم کی غذائیں ہضم ہو جاتی ہیں۔ اس کی طویل اور مہلک امراض اور مہلک امراض میں گرفتاری کے اسباب بھی یہی ہیں۔ باوجود عقل و شعور کے غذا میں اعتدال قائم نہیں رکھتا۔ مگر نوع حیوانی ایک ہی قسم کی غذائیں استعمال کرتے ہیں تو ان کے امراض کی نوعیت بھی جدا ہوتی ہے اور جب وہ کسی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان میں شعور پیدا فرما دیا ہے کہ وہ اپنا علاج خود کر لیا کریں بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک جانور دوسرے جانور کا علاج بھی معقول طریقے سے کر دیا کرتا ہے گویا جانوروں میں معالجہ کی اچھی خاصی قدرت موجود ہے، اور حکماء مفتشین نے ادویہ میں بہت کچھ اضافہ ان ہی حیوانات سے حاصل کر کے کیا اس کو حسب ذیل چند مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

وہ حیوان جو اپنا علاج خود کرتے ہیں :-

بہاؤالدین ابن نفاذہ کاتب اپنا ایک مشاہدہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ کرک کی طرف سفر کر رہا تھا راستے میں ایک جگہ قیام کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہم میں سے بعض آدمیوں نے اپنے گھوڑے چرنے کے لئے چھوڑ دیئے اور بعض نے باندھ دیئے جب شب گذری اور صبح کو ہم سو کر اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں جو گھوڑے بندھے ہوئے تھے وہ مرے پڑے ہیں اور جو کھلے تھے وہ صحیح و سالم جب ہم نے ان گھوڑوں کے مرنے کی تحقیق کی۔ تو یہ معلوم ہوا کہ اس مقام پر جہاں ہم نے قیام کیا ہے ایک زہریلی گھاس پیدا ہوتی ہے جس کو گھوڑوں نے کھایا اور وہ جانور جو کھلے تھے انھوں نے یہ گھاس کھانے کے بعد اس کا مصلح بھی وہاں تلاش کر کے کھایا جس کی وجہ سے وہ محفوظ رہے اور جو جانور بندھے ہوئے تھے وہ اس تریاق کو حاصل کرنے سے معذور رہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت ہے کہ جہاں زہر پیدا ہوتا ہے وہاں اس کا تریاق بھی موجود ہوتا ہے

ذلیقوریدس نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے کہ صحرائی بکرے کو جب شکاری شکار کرتے ہیں اور اتفاق سے وہ زخمی ہو کر شکاری کے

فوں سے نکل جائے اور تیر اس کے جسم میں پیوست ہی رہ جائے تو بکرا مشکطر آمشیع استعمال کرتا ہے اور اس کے استعمال کی وجہ سے وہ پیوست شدہ اس کے جسم سے باہر ہو کر زخم مندمل ہو جاتا ہے۔

قاضی نجم الدین عمر بن کرندی طبیب نے ایک ذاتی مشاہدے کی بنا پر لکھا ہے کہ لقلق کے جب کوئی زخم ہو جاتا ہے تو وہ صعتر کوہی استعمال یلاہے جس سے اس کے زخم اچھے ہو جایا کرتے ہیں۔

لقلق کا یہ خاصہ ہے کہ یہ اپنا گھونسلہ بہت اونچے درختوں پر بنایا کرتا ہے اور جب یہ انڈے دیتا ہے تو ایک قسم کا پرندہ اس کے انڈوں کو اجایا کرتا ہے۔ اس وقت لقلق ایک خاص قسم کی گھاس انڈوں کے نیچے بچھا دیا کرتا ہے۔ اس گھاس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ جب وہ پرندہ انڈے کھانے اہے تو اس کی بصارت غائب ہو جاتی ہے اور انڈے اس کو دکھائی نہیں دیتے۔ یہ گھبرا کر اڑ جاتا ہے پھر اس کی آنکھیں درست ہو جاتی ہیں ں طرح لقلق کے انڈے محفوظ رہتے ہیں گویا کہ جانوروں میں اللہ تعالیٰ نے یہ شعور پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنی حفاظت کی تدابیر بھی اختیار کر سکیں۔

کتے اور بلی ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ جب ان کو کوئی تکلیف پیدا ہوا کرتی ہے تو وہ ایک قسم کی گھاس کھا کر قے کر لیا کرتے ہیں جس سے ان کا مرض ل ہو جاتا ہے۔

سانپ موسم سرما میں بلوں میں پڑا رہتا ہے۔ مشاہدین کا بیان ہے کہ اس موسم میں یہ اندھا ہو جاتا ہے لیکن جب موسم سرما ختم ہوتے ہی بلوں ے باہر آتا ہے تو یہ اپنی آنکھوں کو بادیان کی جڑوں اور پتوں سے رگڑتا ہے جن کا یہ اثر ہوتا ہے کہ سانپ کی آنکھوں میں بصارت اور روشنی پیدا جایا کرتا ہے۔

شاہین کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو وہ ذرلسیفورس پرندے کا شکار کر کے اس کا کلیجہ کھا لیتا ہے اس کے تعمال سے اس کا مرض رفع ہو جاتا ہے۔

وہ جانور جو دوسرے جانوروں کا علاج کرتے ہیں:۔

بقراط نے حقنہ (انیمہ) کا عمل ایک پرندے سے حاصل کیا ہے وہ اس طرح کہ ایک روز بقراط سیر و تفریح کے لیے صبح کے وقت سمندر کے ارے پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک جانور پر پھیلائے ہوئے مضطرب و بے چین ہے اور بری طرح چیخ رہا ہے! اس پرندے کے چیخنے چلانے پر راط کی توجہ ادھر ہوئی اور وہ اس کی تکلیف کے متعلق کچھ سوچنے لگا۔ معاً اس پرندے کا جوڑا آ گیا اور چند بار اس پرندہ کے گرد گھوما۔ اس کے بعد اڑ کر گیا اور سمندر کا پانی اپنی چونچ میں بھر کر لایا اور اس بیمار پرندہ کی مقعد میں داخل کر دیا۔ اس پرندے نے یہ عمل چند ہی بار کیا ہوگا کہ مریض ندے کو ایک لانبا چوڑا دست ہوا۔ دست کے تھوڑی ہی دیر بعد مریض پرندے کو اس تکلیف سے نجات مل گئی اور اپنے جوڑے کے ساتھ اڑ گیا

بقراط نے جب یہ منظر دیکھا تو اس نے اس فضلے کو معلوم کیا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ پرندے کے پیٹ سے غیر منہضم بدبودار غلیظ قسم کی غذا ج ہوئی ہے۔ بقراط نے یہ سوچا کہ آنتوں کو صاف کرنے کے لئے یہ طریقہ بے ضرر اور مفید ہے۔ لہٰذا اس نے حقنہ ایجاد کیا اور ابتدا میں سمندر کا پانی ہی استعمال کیا جس سے اسے بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ پھر اس نے میٹھے پانی میں نمک ملا کر استعمال کیا اس کے بعد آج تک طب قدیم میں بہت امراض کے نسخے حقنہ کے موجود ہیں۔

اسی طرح ایک واقعہ جالینوس نے بھی لکھا ہے ایک مرتبہ ایک بندر کو سانپ نے ڈس لیا۔ اس نے شور مچا کر دوسرے بندروں کو ج کیا اس وقت اس بندر کی حالت نازک ہوتی جا رہی تھی۔ دوسرے بندر جو وہاں موجود تھے ان میں سے بہت سے بھاگ کر گئے اور ارنڈی ے پتے توڑ کر لائے اور پتوں کو چاب چاب کر مریض بندر کے منہ میں دیتے رہے اور بندر ان پتوں کا رس چوس چوس کر تھوک پھینکتا گیا تھوڑی دیر بعد وہ زہر زدہ بندر تن درست ہو کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

اسی ذیل کا ایک اور واقعہ حکیم معین اللہ خاں صاحب مرحوم کو ۱۸۸۲ء میں پیش آیا۔ وہ لکھتے ہیں ایک موسم سرما میں صبح کے وقت مشرق کی طرف منہ کئے ہوئے ہلکی ہلکی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہمارے مکان کی پشت پر ایک برگد کا درخت تھا اور اس کے داہنے ہاتھ کی طرف ایک قدیم زمانہ کا لانبا چوڑا مکان تھا۔ برگد کے درخت سے ایک حاملہ لنگورنی چیختی چلاتی اس مکان کی چھت پر اتر آئی۔ اجمیر شریف میں اس موسم میں عموماً تمام شہر میں لنگور اور بندر آزادانہ طور پر کوٹھے کوٹھے بھاگتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے یہ لنگورنی بچھڑ کر پیچھے رہ گئی تھی جو اس مکان پر بڑے ہی درد و کرب سے چیخ چلا رہی تھی ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ایک لنگور اس کی آواز کو سن کر وہاں آ گیا اور اس کے اضطراب کو دیکھ کر واپس چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک گھاس اپنے منہ میں دبائے ہوئے آیا۔ اور اس گھاس کو چبا کر لنگورنی کے پیٹ پر مل دیا جس سے لنگورنی کا اضطراب دور ہو گیا اور بچہ بسہولت پیدا ہو گیا۔

حکیم صاحب مرحوم نے جب یہ منظر دیکھا تو اس گھاس کو ملاحظہ فرمایا۔ جو وہاں گری پڑی تھی۔ یہ گھاس کنا گھاس تھی۔ جب تک موصوف حیات رہے تسہیل ولادت کے لئے اس گھاس کو استعمال کراتے رہے۔ یہ گھاس بارش میں پیدا ہوتی ہے اور سردیوں کے اختتام پر ختم ہو جاتی ہے حکیم صاحب مرحوم مغفور کے بڑے صاحبزادے حکیم محمد حمید اللہ خانصاحب مرحوم و مغفور اس کو اس موسم میں لیکر اس کا عرق نکال کر چکنی مٹی میں ملا کر ٹکیاں بنا کر خشک کر کے رکھ لیا کرتے تھے اور تسہیل ولادت کے لئے استعمال کرایا کرتے تھے۔ یہ ٹکیاں پاکستان بننے سے قبل تک استعمال ہوتی رہیں۔ پوشیدہ طریقے پر حکیم صاحب مرحوم نے اپنے ادویہ کے گودام میں ایک چمن لگا رکھا تھا جن میں بہت سے دوائی پودے لگے ہوئے تھے اور اس گھاس کو اس چمن میں ایک غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ جب تک یہ سرسبز رہتی تازہ استعمال کرائی جاتی اور جب موسم ختم ہونے لگتا تو مندرجہ بالا طریقہ سے ٹکیاں بنا کر رکھ لی جاتی تھیں۔

اس طرح کا ایک واقعہ حکیم حفیظ اللہ خاں صاحب شفائی بیان فرماتے ہیں کہ ہمارے گھر میں ایک بلی نے بچے دئے تھے ایک مرتبہ جب بلی حسب عادت کہیں باہر سے آئی تو دیکھا کہ اس کا ایک بچہ اپنی کمر زمین پر گھسیٹتا ہوا رینگ رہا تھا تو بلی نے اسے غور سے دیکھا اور سونگھا اس کے بعد بچے کی ایک ٹانگ کو منہ میں پکڑ کر ایک اچھا خاصا جھٹکا دیا اور پھر کمر سے پکڑ کر بچے کو کھڑا کیا تو بچہ بآسانی چلنے لگا۔ دوسرے دن ہم نے دیکھا تو بچہ بالکل ٹھیک حالت میں تھا قیاس کرنے پر معلوم ہوا کہ بچے کی ٹانگ یا کمر کی کوئی ہڈی کسی چوٹ لگنے کی وجہ سے اتر گئی تھی جو بلی نے صانع لاشریک کی دی ہوئی دانش سے درست کر دی۔　　　(جنگ)

عالم اکبر آبادی •

اگر اجازت دو......!

میں ایک بات کہوں تم اگر اجازت دو
کہ انقلابی جوانوں پہ پہرے بیٹھے ہیں
یہ کس نے کہہ دیا آزاد ہو گئے ہم لوگ
دلوں پہ اور زبانوں پہ پہرے بیٹھے ہیں

شفیق جونپوری •

انجامِ بہارِ اہلِ نظر دیکھ رہے ہیں
کانٹوں میں غرورِ گلِ تر دیکھ رہے ہیں

اپنے ہوں کہ بیگانے عجب وقت ہے ساقی
خونخوار درندے ہیں جدھر دیکھ رہے ہیں

ساحل پہ ہیں لیکن ہمیں غافل نہ سمجھئے
دریا کے نہنگوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

تصویر تو پردہ پہ دلاویز ہے لیکن
کچھ اور پسِ پردۂ در دیکھ رہے ہیں

اغیار کے سب قافلے پہنچے سرِ منزل
ہم لوگ ابھی گردِ سفر دیکھ رہے ہیں

اے اشکِ رواں آ تجھے دامن میں سلائیں
ہم راہ تری نورِ نظر دیکھ رہے ہیں

لائی تھی عنادل کے ترانوں کی تمنا
ہم شاخ پہ ٹوٹے ہوئے پر دیکھ رہے ہیں

تو بادِ بہار آئی تو کیا لائی چمن میں
ہر شاخ کو بے برگ و ثمر دیکھ رہے ہیں

کیا جانئے کیا حال رہا جوشِ جنوں میں
ہوش آیا تو اُجڑا ہوا گھر دیکھ رہے ہیں

پھر دادِ طلب ہے دلِ بیباک کی ہمت
پھر حوصلۂ برق و شرر دیکھ رہے ہیں

اللہ تمھیں ہر نظرِ بد سے بچائے
ہم تم پہ زمانہ کی نظر دیکھ رہے ہیں

پہنچے ہو شفیق آج درِ پیرِ مغاں تک
رفتار میں اندازِ دِگر دیکھ رہے ہیں

(نئی نسلیں)

ماہر القادری

کیسے کیسے لوگ

کچھ مصلحت شناس ہیں کچھ کشتۂ فرنگ
کچھ دیکھتے ہیں اپنے زمانے کے رنگ ڈھنگ

ان میں بہت سے لوگ سیاست گزیدہ ہیں
جن کے تخیّلات ابھی نارسیدہ ہیں

کچھ ہیں فسونِ شاہی و پیری کے پھیر میں
کچھ اس خیال میں ہیں کہ چونکیں گے دیر میں

کتنوں کو ربط ہی فقہی رخصتوں کے ساتھ
وابستہ کتنے لوگ ہیں کچھ نسبتوں کے ساتھ

کچھ بیخبر بھی ان میں کچھ اہلِ خبر بھی ہیں
کچھ سادہ لوح بھی ہیں کچھ اہلِ نظر بھی ہیں

کچھ صاحبانِ جبہ و دستار و دلق ہیں
جو اپنے آستانوں پہ "معبودِ خلق" ہیں

کچھ اس غرور میں کہ ہمیں "اہلِ ذکر" ہیں
آگاہ سرِّ دین ہیں اربابِ فکر ہیں

کتنوں کے ایک لفظ پہ تیور بگڑ گئے
کچھ اپنی شخصیت کے تصوّر پہ اڑ گئے

تہمت تراش انکیں ہیں اور کچھ ہیں بے یقیں
کچھ فطرتاً شریر ہیں کچھ ہیں مذبذبیں

کچھ چاہتے ہیں صرف دعاؤں سے انقلاب
کچھ کھا رہے ہیں آپ ہی بے وجہ پیچ و تاب

جو چاہتے ہیں راہ میں بکھرے ہوئے ہوں پھول
وہ آزمائشوں کے تصور سے ہیں ملول

مارے ہوئے ہیں ان میں بہت خانقاہ کے
سمجھے نہیں ہیں بھید ابھی لا الٰہ کے

آغا اعظم ادیب •

ذکر و فکر

او غمِ دِل اب بھی ہم کشتی خدا پر چھوڑ دیں	جس کو ہم ساحل سمجھتے تھے وہی ساحل نہ تھا
اک ملی لوحِ حوادث اک ملی اُم الکتاب	میں سمجھتا تھا کہ میں ظالم نہ تھا جاہل نہ تھا
پی گیا سُقراط جرمِ عشق میں آبِ حیات	سچ ہے ظالم تیرے ساغر میں سمِ قاتل نہ تھا
تو نے کیا پردہ اُٹھایا سب کو غارت کر دیا	ایک بھی اِس انجمن میں شاہدِ عادل نہ تھا
حسن بے پایاں برابر یاد کرتا تھا تجھے	اے دِل اس کی یاد سے تو جس گھڑی غافل نہ تھا

اے دِل اے دِل، ایسا بھی محبوب دیکھا تھا کہیں
سچ بتا چند آہیں تیری یاد کا حاصل نہ تھا

یا فریبِ آرزو تھا یا فریبِ آگہی	ذکر تیرا میری باتوں میں اگر شامل نہ تھا
کیا ٹھکانہ ہے تری پستی اے جذبِ دروں	ایک بھی کہسار تیری راہ میں حائل نہ تھا

قافلہ والو ــــــ کسی بیمار کی لینا خبر
اک مُسافر آخرِ شب ذکر میں شامل نہ تھا

محمد نیاز •

○

اللہ رے تاریکی ، اللہ رے تنہائی
اس حال میں بھی میرے ہونٹوں پہ ہنسی آئی

آنے کو تو خوب آئی ، کیا بادِ صبا لائی
یا اور مجھے چھیڑا یا کام نہ کچھ آئی

میں خلوتیٔ دل ہوں ، یہ عالمِ تنہائی!
تو جلوتیٔ دل ہے یہ انجمن آرائی!

اک منظرِ تازہ کا ہر لحظہ ہوں سودائی
یہ وحشتِ روز افزوں یہ بادیہ پیمائی

میں تجھ سے گریزاں ہوں تو میرا تمنائی
اے ذوقِ نموداری اے لذتِ پیدائی

یہ زیست کا ساغر بھی کیا زیست کا ساغر ہے
ساقی نے ملادی ہے تلخی میں گوارائی

اس انجمنِ گل میں ہنسنا بھی ضروری تھا
ہر چند کہ پھولوں نے ہنسنے کی سزا پائی

یوسف کے مقدر میں زنداں ہی سہی دو دن
جا دور ہو اے دنیا رکھ اپنی زلیخائی

دنیا ہے کہ صحرائے بے سبزہ و بے شبنم
دل ہے کہ سرِ صحرا اک لالۂ صحرائی

ہر سجدہ نیازؔ اپنا خالق کی امانت ہے
ورنہ درِ سلمےٰ پر کیا شے تھی جبیں سائی

انسان نسلیں

رشید کوثر فاروقی •

غزل

(قطعات میں)

کس نے سنوارے کس نے نکھارے — صبح و مسا کے گلگوں نظارے
پاکیزہ کرنیں معصوم تارے — منزل کی جانب مبہم اشارے

منظور ہم کو لاکھوں خسارے — معلوم ہم کو وہ ہیں ہمارے
جس کو انھوں نے ٹھکرا دیا ہو — وہ کس کے آگے دامن پسارے

اُنکی محبت اور خواب راحت — ندی کے باہم روٹھے کنارے
جس کی نگاہیں دنیا سے آگے — دنیا کا پھر وہ کیوں منہ نہارے

سرکش تھپیڑے گستاخ موجیں — صد ہا تلاطم پیہم طرارے
بہرِ تسلی دل کی صدائیں — طوفاں میں جیسے کوئی پکارے

ظاہر کے پیچھے مخفی حقیقت — پانی میں جیسے بجلی کے دھارے
جیسے کلی کے سینے میں نکہت — پتھر میں جیسے چنچل شرارے

آفات میں بھی موجود کوثرؔ — رعنا ارادے ، رنگیں سہارے
جیسے سحر کو پو پھٹتے پھٹتے — ابرِ سیہ کے روشن کنارے

کوثر نیازی ●

اپنوں کی شکایت ہے نہ غیروں کا گلا ہے
ہر حال میں خوش ہوں کہ یہی اس کی رضا ہے

اس دورِ زبوں کار میں کہتا ہوں "خدا ہے"
مجھ بندۂ عاجز کی فقط اتنی خطا ہے

سینے میں محبت ہے نہ آنکھوں میں حیا ہے
ہر کوئی یہاں شیفتۂ کذب و ریا ہے

بدلی ہوئی اُس دن سے زمانے کی ہوا ہے
جس روز سے وہ جانِ وفا مجھ سے خفا ہے

کیا طالعِ بیدار ہے کیا بختِ رسا ہے
کہتے ہیں سب مجھے لوگ یہ اس در کا گدا ہے

ہر رہزنِ مشاق جنھیں راہنما ہے
اُن قافلے والوں سے میری راہ جدا ہے

کیوں اس کی طرف نگہِ محبت نہیں ہوتی
کوثر بھی تو منجملۂ اربابِ وفا ہے

ابوالبیان حمّاد ●

کوچۂ یار سے جب بادِ صبا آتی ہے
بہ صد ہنگامۂ و انداز و ادا آتی ہے

اپنی فطرت سے وہ مجبور ہم اپنی خو سے
ہمیں آتی ہے وفا، ان کو جفا آتی ہے

نظمِ فرسودۂ عالم کو بدل، جلد بدل
مرے کانوں میں یہ رہ رہ کے صدا آتی ہے

ہم سزاوار، اس انعام کے ٹھہرے تو ہیں
اپنے حصے میں محبت کی سزا آتی ہے

سب کہاں واقفِ اسرارِ جنوں ہوتے ہیں
اہلِ دل ہی کو محبت کی ادا آتی ہے

ڈھونڈتی پھرتی ہے میرا ہی نشیمن ندیم
جب گلستاں میں کبھی برقِ بلا آتی ہے

روٹھ جاتی ہے جو حمادؔ کبھی مجھ سے حیات
میرے لینے کو بہ صد شوق قضا آتی ہے

شبنم سُبحانی

میں وہ رند ہوں کہ ساقی ترا نام چاہتا ہوں
جو نہ پی سکا زمانہ وہی جام چاہتا ہوں
کوئی حسن ہو نہ رسوا سرِ عام چاہتا ہوں
کوئی جلوہ اب نہ آئے لبِ بام چاہتا ہوں
جو مٹا دے میرے دل سے تری آرزو کا سودا
نہ وہ صبح چاہتا ہوں نہ وہ شام چاہتا ہوں
مرا سوزِ دل ہی دیگا اسے شانِ امتیازی
مجھے دردِ خاص مت دے غمِ عام چاہتا ہوں
میں مریضِ عشق اب تو نہیں اور جینے کا طالب
دمِ آخریں لبوں پہ ترا نام چاہتا ہوں
میرے عشق معتبر کو یہ زمانہ خود سمجھ لے
میں وفا کی رہ گذر پہ وہ خرام چاہتا ہوں
ترا غم ہو غم سب ہی کا تری پیاس پیاس سب کی
یہی میکدے میں ساقی میں نظام چاہتا ہوں
مجھے دے نجات شبنم جو خرد کے پیچ و خم سے
میں جہانِ آرزو میں وہ مقام چاہتا ہوں

عتیق تسنیم فاروقی

نہ جانے ہو چکا ہو گا ستم کس کس کے ارماں پر
نظر آتے ہیں سائے سے درو دیوارِ زنداں پر
قفس میں جسم و دل دونوں کی گنجائش نہیں ہوتی
مگر یہ راز کھلتا ہی نہیں ظالم نگہباں پر
ذرا میرے فریبِ شوق کی رنگینیاں دیکھو
گماں ہوتا ہے ساحل کا مجھے ہر موجِ طوفاں پر
قرینے سے نشیمن کی ذرا ترتیب ہو جائے
جبینِ برق جھک جائے گی دامانِ گلستاں پر
بہار آئی تو اے تسنیم یوں رنگِ چمن بدلا
کہ رونا آ گیا کلیوں کو گل کے چاکِ داماں پر

محمد یعقوب طاہر

جہاں قلب روشن بے چراغِ غم نہیں ہوتا
یہ غنچہ تازہ تر بے منتِ شبنم نہیں ہوتا

اگر دیدہ ہے، تو وہ دیدہ انساں نہیں ہرگز
تباہی پر جو انساں کی کبھی پُر نم نہیں ہوتا

چراغ اک ایسا سینے میں فروزاں ہر مرے ہمدم
جو صد ہا آندھیوں میں بھی کبھی مدھم نہیں ہوتا

مرے حق کو دکھاتا ہے تو کیا دار و رسن ناداں!
یہ وہ نشہ ہے جو ان نشتروں سے کم نہیں ہوتا

نکلتی ہے دعا جب قربتِ محبوب کی دل سے
ہوس کہئے اُسے، وہ عشق کا عالم نہیں ہوتا

جنوں میرا کچھ ان سے بھی پرے پہنچا ہر اب شاید
وہ دل میں بیٹھے ہیں پھر بھی تقاضا کم نہیں ہوتا

اگر حق ہو تو جھکتا ہے سر ادنیٰ سے اشارے پر
جو باطل ہو تو خنجر کے بھی آگے خم نہیں ہوتا

جہاں ابلیس غالب آدمی مغلوب ہو طاہر
وہاں خاموش رہنا کافری سے کم نہیں ہوتا

رشید ارشد

زندگی میں نہ رہا لطف و مزا میرے بعد!
رک گیا سلسلۂ صبر و وفا میرے بعد!

حسن بھی بھول گیا اپنی ادا میرے بعد
اُس کے ہاتھوں سے اڑا رنگ حنا میرے بعد

اب کوئی نام بھی اُس کا نہیں لینے والا
پیٹتی پھرتی ہے سر اپنا وفا، میرے بعد

جس کو کہتے ہیں ہوس اسکا چلن عام ہے اب
عشق اور مصلحتیں - یہ کیا ہوا میرے بعد

محفلِ زیست میں تھی روشنی میرے دم سے
دل کے بجھتے ہی بجھا غم کا دیا میرے بعد

بزم کی بزم ہے سونی پڑی ارشد کے بغیر
کوئی محفل میں نہیں نغمہ سرا میرے بعد

جونک

محمد حمید اللہ صدیقی

درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی کوٹھی کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ ساری فضا پر گہری گہری سیاہ چادر چھائی ہوئی تھی اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ بند دروازے کھولنے اور تاریک اور پر پیچ راستوں سے گذرنے میں اسے اتنی مہارت ہو چکی تھی کہ یہاں بھی اسے کوئی دقت نہ پیش آئی۔ وہ بڑی آسانی سے کوٹھی میں داخل ہو گیا اور کئی راہداروں سے گذر کر بالآخر اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں مکان کا نقشہ دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا تھا کہ تجوری یہاں ہوگی۔ اس کا اندازہ صحیح تھا اس نے دروازے کو اپنے پیچھے بھیڑ دیا اور تجوری کے پاس گیا لوہے کی وزنی تجوری کا دروازہ کھولا۔ اور رومال میں لپٹی ہوئی ٹارچ کی مدھم روشنی میں اندرونی خانوں کا جائزہ لینے لگا۔ جڑاؤ بند گلوبند، پازیب، ہار انگوٹھیاں، نوٹوں کے ڈھیر اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ تھوڑی دیر تک وہ قرینے سے رکھے ہوئے زیورات کو دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں جو بات نہیں آ رہی تھی وہ یہ تھی کہ ہر زیور کے ساتھ باریک دھاگے سے ایک کارڈ لٹکا ہوا تھا جس پر کوئی نام کوئی ہندسہ درج تھا۔ تھوڑی دیر یونہی دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اندر ہی اندر دانت پیسا۔ ہونہہ۔ اس کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ تو بڈھا بھی کسی جونک سے کم نہ تھا۔ وہ بالکل مناسب جگہ پر آیا تھا اس نے ایک نازک سی انگوٹھی اٹھالی معلوم نہیں کیا سوچ کر اس میں کوئی دھاگہ، کوئی کارڈ نہ تھا اور وہ اسے اپنی انگلیوں میں گھمانے لگا۔ انگوٹھی بڑی مشکل سے اس کے بائیں ہاتھ کی چھنگلی میں آسکی۔ مگر وہ بھی انگلی کی گرہ تک پہنچ کر پھنس گئی اور باوجود کوشش کے نیچے نہ اُتر سکی اور وہ اسے باہر کھینچنے لگا لیکن اب وہ باہر بھی نہ آ رہی تھی اور وہیں گرہ پر پھنسی ہوئی تھی اپنی اس حماقت بلکہ بچپنے پر اسے بڑا تاؤ آیا۔ یہ وقت انگوٹھیاں پہننے کا ہے۔ اس نے ڈر کر اپنے چمڑے کا بیگ اٹھایا۔ جسے اس نے تجوری کھولتے وقت وہیں زمین پر رکھ دیا تھا۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ وہ اپنے دل کی دھڑکن بخوبی سن سکتا تھا۔ کمرے میں ہر طرف سکوت تھا۔ دروازہ اسی طرح بھڑا ہوا تھا جیسے اس نے داخل ہونے کے بعد بھیڑا تھا۔ گرد و پیش سے اسے پورا اطمینان تھا۔ مکان کا بوڑھا مالک اس وقت تمام دن کام کر کے اطمینان سے سو رہا ہوگا۔ ابھی تک سب ٹھیک ہے، سن لیے بیگ کھول کر تجوری کا رخ کیا تاکہ نوٹوں اور زیورات سے اسے بھر لے بیگ کھول کر اس نے تجوری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

السلام علیکم۔ اور اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ وہیں رک گئے دسمبر کی اس سرد رات کے پچھلے پہر میں اس کے ہاتھ پر نمی سے پھیلنے لگی۔ مگر دوسرے لمحہ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آنے والے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے یکدم مڑا۔ مگر اسی لمحہ ٹارچ کی تیز روشنی نے جو براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اسے چندھیا دیا اور وہ کچھ نہ دیکھ سکا کہ سلام کرنے والا شخص کون ہے اور کس وضع قطع کا ہے۔

بھاگنے کی کوشش بالکل بیکار ہے۔ دروازہ بند ہے اور ہم مسلح ہوں۔ جہاں ہو وہیں کھڑے رہو اور اس کے قدم جو پاس ہی کھڑی ہوئی الماری کی طرف بڑھ رہے تھے جم کر رہ گئے۔ اور اس تحکمانہ لہجہ کا ایک ایک لفظ اس کے دماغ میں جلترنگ بجانے لگا۔ وہ جہاں تھا وہیں جا کھڑا رہا کھٹ کھٹ اور کمرے کی تمام بتیاں جل گئیں۔ اب اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے مکان کا بوڑھا مالک کھڑا بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا اس کی چھنگلی میں انگوٹھی

ابھی تک پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے جیسے تیسے اسے کھینچ کر بیگ میں گرادیا اور اپنے انجام کا انتظار کرنے لگا۔ وہی لگا بندھا انجام۔ ٹیلیفون، پولیس، گرفتاری، حوالات، مقدمہ، جیل۔ تین سال کے لئے یا شاید اس سے بھی زیادہ اور اس دفعہ تو اسے چھوٹے ہوئے محض ایک ہی ہفتہ ہوا تھا اور وہ چوری کی پہلی ہی کوشش میں دھر لیا گیا۔ ابھی گذشتہ تین سال کی مشقتیں اسے ایک ایک کر کے یاد تھیں۔ وہ نکل کر کچھ بھی تو نہ کر پایا تھا۔ کچھ پرانے ساتھیوں نے تھوڑی بہت مدد کر دی تھی جس سے اب تک کام چل گیا تھا۔ ابھی اس نے آزادی کی کوئی بھی راحت نہ اُٹھائی تھی۔ کوئی عیش نہ کیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ سارے کے سارے ارمان، ساری کی ساری امنگیں دل ہی دل میں کلبلا کر رہ جائیں گی۔ کیسے کیسے خواب اس نے دیکھے تھے، رنگین اور سہانے خواب سمندر کے کنارے عالیشان ہوٹل میں قیام، حسین و جمیل عورتوں سے محبت، شراب، بہترین غذا اور لباس اس کا پورا وجود ان پامال ہوتی ہوئی امنگوں کے تصور سے دُکھنے لگا چوری کرنے میں جہاں جیل اور اس کی سزائیں تھیں وہاں ایک تو فائدہ تھا کہ جیل سے چھوٹ کر پھر گرفتار ہوتے ہوتے بھی دو تین سال لگ جاتے تھے اور اس دوران میں ایک دو ہاتھ بھی اچھے صاف ہو گئے تو عیش ہی عیش ایسا عیش جو جیل کی جھیلی ہوئی صعوبتوں کو بھلا دیتا تھا۔ لیکن اس دفعہ لعنت ہے اس پر ابھی نکلا بھی نہ تھا کہ پکڑا گیا اور اس خیال سے کہ اب پھر اسے نہ جانے کتنی مصیبتیں بھگتنی پڑیں گی اس کے سارے بدن میں تشنج سا پیدا ہونے لگا۔

مکان کا بوڑھا مالک اسے اطمینان اور سکون سے دیکھ رہا تھا آخر یہ کچھ کرتا کیوں نہیں۔ نوکروں کو آواز کیوں نہیں دیتا۔ پولیس کو ٹیلی فون کیوں نہیں کرتا یا ممکن ہے وہ ٹیلیفون کر چکا ہو اور پولیس کی آمد کا منتظر ہو لیکن نہیں اس نے ٹیلیفون کرنے کی آواز ضرور سنی ہوتی۔ اور چند لمحے قبل کوئی ذرا سا کھٹکا بھی نہیں ہوا تھا پھر آخر اس طرح کیوں کھڑا ہے کیا سوچ رہا ہے اور اسے اپنی حالت بالکل اس چوہے کی سی نظر آئی جو سمجھ چکا ہو کہ ذرا سی حرکت پر بلی اُچھل کر اسے دانتوں میں دبا لے گی۔ وہ دم بخود کھڑا رہا۔ اس کے اعصاب کا تناؤ بڑھنے لگا۔ سخت سردی کے باوجود اس کے لب سوکھنے لگے اور حلق میں کانٹے سے پڑ گئے۔

"بیٹھ جاؤ" اس دفعہ لہجہ میں وہ پہلا سا تحکم نہ تھا بلکہ کچھ نرمی تھی۔ اس نے بڑے غور سے ایک بار پھر بڈھے کی طرف دیکھا جو ابھی تک اپنی جگہ پر بدستور کھڑا تھا۔ وہ پاس ہی پڑی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ گیا کھڑے رہنے سے تو یہ اچھا ہی ہے کہ اس سے ذرا سکون ملے گا مالک مکان آہستہ آہستہ اس کی طرف آنے لگا۔

"پانی۔ میں پانی پی سکتا ہوں۔" اس نے بدقت کہا۔ "ضرور۔" بڈھا آدھے راستے سے مڑ کر کمرے کے سرے پر رکھی ہوئی صراحی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے صراحی سے پانی انڈیلنا شروع کیا۔ اس وقت بڈھے کی پشت اس کی طرف تھی۔ کیوں نہ بھاگ جائے۔ بہترین موقع ہے بڈھے کو تو وہ ہاتھ کے ایک ہلکے سے اشارے سے خاموش کر سکتا ہے بس ایک سیکنڈ کا کام اور پھر سارا مال لیکر چند منٹ میں نکل جائیگا اس نے ابھی ملازمین کو بھی نہیں جگایا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کے پاس پستول ہوگا۔ اور پستول کا خیال آتے ہی پھر اس کی ساری اسکیم پر جیسے اوس پڑ گئی۔ بڈھا اب پانی گلاس میں انڈیل کر مڑ رہا تھا اب موقع نہیں رہا۔ وقت گذر گیا لعنت ہے اس پر جب تک بڈھا پستول اُٹھاتا۔ اس وقت تک وہ اسے خاموش کر دیتا۔ بس ایک جست لگانے کی بات تھی۔ اس نے یہ سب کچھ پہلے کیوں نہ سوچ لیا تھا۔ بس ایک سیکنڈ صرف ایک سیکنڈ کی چوک، یہ ایک سیکنڈ اس کی قسمت بدل سکتا تھا۔ اس نے سارا پانی ایک ہی سانس میں پی لیا اور گلاس رکھ دیا۔

"آدمی تم شریف معلوم ہوتے ہو،" بڈھے نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ کبھی تھا،"

"اب کیا ہو"

"جو آپ دیکھ رہے ہیں"

'یعنی'

'چور'

"کچھ پڑھا لکھا بھی ہے" معلوم تو پڑھے لکھے ہوتے ہو۔

"صرف گریجویٹ"

اچھا۔ شاید پہلی بار چوری کرنے نکلے ہو؟ کیا مصیبت آئی تھی؟"

اسے ان باتوں سے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ آخر ان سے فائدہ کیا۔ جب انجام معلوم ہے لیکن بڈھے کے چہرے پر شفقت اور لہجہ کی نرمی اس بات کا جواب دینے پر مجبور کر رہی تھی۔ یہ سن کر وہ نہ جانے کیوں ہنس دیا۔ "پہلی بار۔ ہونہہ میں ایک ہفتہ ہوا جیل سے پانچویں بار چھوٹا ہوں تین سال کی قید بامشقت کے بعد۔

"اچھا" بڈھے نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔ جیسے یہ بات اس کے لئے بڑی عجیب ہو۔

"پانچویں بار تین سال کی قید بھگت کر؟"

"جی ہاں"

"اتنی بار جیل جا کر بھی بری عادت نہ چھوٹی"

"نہیں"

"کیوں"

اب اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔

"بہت کچھ"

"مثلاً"

"کوئی نوکری کوئی کاروبار"

وہ پھر ہنسنے لگا۔ یہ بڈھا تو بالکل چغد ہے یا پھر محض اس سے کھیل رہا ہے، نہیں نہیں یہ اتنا سیدھا نہیں، بڑا گھاگ ہے اور وہ بھڑک اٹھا۔

"نوکری، کاروبار۔ پہلی دفعہ جیل میں جا کر میں نے یہی سوچا تھا۔ مگر باہر آ کر اتنی بڑی دنیا مجھ پر تنگ کی تنگ ہی رہی"

"کیوں"

"میرا اعتبار اٹھ چکا تھا میری ساکھ ختم ہو چکی تھی میں ایک دفعہ چوری کے جرم میں جیل جا کر ہمیشہ کے لئے چور ہو چکا تھا۔

یہ محض تمہاری عادت کا نتیجہ تھا۔ ورنہ کرنے والے کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

"ہاں ہاں میں عادی قسم کا چور ہوں۔ بیشمار چوریاں کی ہیں پانچ بار جیل جا چکا ہوں اور اب چھٹی بار جیل کے پھاٹک پر ہوں بس" وہ ضبط نہ کر سکا۔

بڈھا زیر لب مسکرایا۔ "اتنی عمر ہو جانے کے باوجود بڑے جذباتی معلوم ہوتے ہو۔"

وہ اس دفعہ کچھ نہ بولا۔ واقعی وہ بڑا جذباتی تھا۔ ایک بار جو بات دل میں آ گئی بس اسے کر گیا۔ بغیر سوچے سمجھے جیسے اس نے پہلی بار چوری کی تھی بس بات دل میں آ گئی تھی۔ اور اس نے کر ڈالی۔ کالج سے نکل کر۔ جب اس کے باپ اسے ولایت بھیجنے کی سوچ رہے تھے اور یکایک ان کا دیوالہ نکل گیا تھا۔ کاروبار تباہ ہو گیا تھا کوٹھی، بنگلہ، موٹر تک قرق ہو گیا تھا! اس کے باپ نے تو اسی رات مارے غم کے خودکشی کر لی تھی۔ ماں اس کے یوں بھی نہ تھی! اس بیچاری نے تو ادھر اسے جنا اور ادھر دم توڑ دیا تھا۔ اور وہ دنیا میں بالکل اکیلا اور قلاش رہ گیا تھا۔ وہ جس نے ہزاروں روپے اپنی طالب علمی کے زمانے میں پانی کی طرح بہائے تھے۔ اب لوگ اس سے کتراتے تھے اور اس کے چچا جنہیں اس کے باپ ہی نے بنایا تھا دنیا کو دکھانے کے لئے اسے سو روپے کی نوکری دے رہے تھے جی اس کا چاہا تھا کہ ان کی بھٹے جیسی گردن کو ایک ہاتھ سے چٹ سے توڑ دے مگر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ بڑا آیا تھا وہ رحم کھانے والا اور اسی رات وہ گھر سے بھاگ گیا تھا اور پھر وہ کیا کرتا۔ پردیس میں اس نے چوری شروع کر دی۔ کتنا آسان کام تھا بس ایک گھنٹے میں ہزاروں کے وارے نیارے۔ اور پھر وہی عیش لیکن عیش کا انجام جیل اور پھر وہ کانپ اٹھا

"کیا سوچ رہے ہو" بڈھے نے پوچھا

"کچھ نہیں"

"تم نے چوری کیوں شروع کر دی تم تو تعلیم یافتہ تھے جوان تھے۔ دنیا میں بڑے سے بڑا اور اچھے سے اچھا کام کر سکتے تھے"

"چوری کرنا کوئی آسان یا معمولی کام ہے؟"

"بالکل معمولی کام۔ بزدلوں کا کام جب سوئے ہوتے ہیں تو تم ۔۔ عمل کی نوبت محسوس کرتے ہو۔ ایک پتہ بھی کھڑک جائے تو تمہارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔"

اس دفعہ وہ لاجواب ہو گیا۔ یہ بات تو واقعی صحیح تھی۔ بھر کیا وہ بزدل تھا۔ اتنی سختیاں جھیلنے کے باوجود وہ تو خود کو بڑی ہمت والا سمجھتا تھا۔

"بولو چپ کیوں ہو گئے۔ دوسروں کی محنت سے کمائی ہوئی دولت پر ڈاکہ ڈالنے کا تمہیں کیا حق ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتنا ذلیل کام ہے۔"

"حق، محنت، دولت۔" اس دفعہ اس کے اعصاب میں بڑا تناؤ پیدا ہونے لگا۔ "غریبوں کا خون چوس کر تجوریاں بھرنا محنت ہے؟ میں نے کبھی کسی غریب کے گھر چوری نہیں کی۔ صرف ان کے گھر چوریاں کی ہیں جو ہر طرح کی بے ایمانیاں کر کے امیر بن گئے ہیں۔ بلیک مارکٹ کر کے، سود پر روپیہ چلا کر۔"

چوری پھر بھی چوری ہے۔ چاہے کہیں جائے۔" اور پھر کچھ لوگ اگر برائی کریں تو انھیں برائی سے روکنا چاہیے نہ کہ ان کی دیکھا دیکھی خود برائی کی جائے کیوں؟ اور پھر تمہیں کیا معلوم کس کی دولت کس طرح آتی ہے۔ تمہارا اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔

اس طرح کے لکچر سے تو اسے ہمیشہ چڑھ تھی ۔۔۔ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے خوشنما نقاب ۔۔۔۔۔۔ اور وہ چڑھ گیا۔

یہ بہت سے زیورات جو تجوری میں بھرے ہوئے ہیں، آپ نے محنت سے کمائے ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے کہ یہ کہاں سے آئے ہیں۔ اسی لئے میں نے پہلے اس گھر کو چوری کے لئے منتخب کیا یہ نماز، یہ روزے، یہ تقدس۔ اور پھر یہ دوسروں کے ضبط کئے ہوئے زیورات غصہ سے اس کے ہاتھ پیر کپکپانے لگے۔

"یہ زیورات" بوڑھے نے مسکرا کر تجوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو تم نے دیکھ لیا کہ یہ دوسروں کے ہیں۔"

ہاں۔ ہاں میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک کے ساتھ ایک کارڈ لگا ہوا ہے جس پر کسی نہ کسی کا نام اور پتہ درج ہے، مرے ہوئے لوگوں کا۔ غریب عورتوں اور مردوں کا جیسے نوادرات کے جمع کرنے والے فخریہ ہر چیز کے ساتھ اس کی تفصیل لکھتے ہیں۔ تاکہ موقع محل سے لوگوں کو دکھا سکیں کہ انھوں نے اسے فلاں ملک سے فلاں وقت اس طرح اتنی قیمت دیکر حاصل کیا ہے اور اب آپ اور آپکے نوادرات؟"

"ہاں ہاں کہو میں نے کس طرح جمع کئے، بوڑھے نے بڑی شفقت سے کہا۔

"کس طرح جمع کئے؟ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا، نام اور پتہ کے ساتھ یہ بھی تفصیل لکھ کر لگائی ہوتی کہ فلاں جڑاؤ بند کے عوض میں جس کی قیمت ایک ہزار تھی محض پچاس روپے قرض دیئے جس کی دوائیں کھا کر بھی بیمار نہ بچ سکا کتنی محنت کی کمائی ہے کتنی شرافت؟ اس کے لئے واقعی کتنی ہمت چاہیے" اس دفعہ اس نے طعنہ کا بھرپور وار کیا۔ کیونکہ بوڑھے کی مشفقانہ مسکراہٹ اور نرم لہجہ نے یہ بات اسے بالکل بھلا دی تھی کہ وہ محض ایک چور ہے جسے ان حالات میں اس طرح گفتگو نہ کرنی چاہیئے۔

"تمہیں غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے،" بڈھے پیشانی پر اس طنزیہ وار سے ایک شکن بھی نہ آئی تھی۔ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

اس کی اس مسکراہٹ اور نرمی سے اور چڑھ ہو رہی تھی وہ چاہتا تھا کہ بڈھا اسے گالیاں دے۔ اس سے لڑنے پر آمادہ ہو اس لئے اس کا پارہ اور چڑھ گیا۔

غلط فہمی! ہونھہ۔ تم جیسے رنگے سیاروں کو میں خوب سمجھتا ہوں۔ تم ایک جونک ہو جونک۔ جو خون چوس کر موٹی ہوتی ہے۔ تم بھی غریبوں کا خون چوس کر بڑھ رہے ہو میں بزدل ہوں لیکن دیکھو میں اس وقت بھی تمہیں وہی کچھ کہہ رہا ہوں۔ جو میں سمجھتا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ تم ایک ذرا سی کوشش سے مجھے پولیس کے حوالے کر سکتے ہو اور آخر کار کرو گے۔"

بڈھے نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں میں ملامت کی ہلکی سی جھلک آگئی تھی۔ جیسے وہ آنکھوں ہی میں کچھ کہہ رہا ہو کہ محض قیاس پر اتنی سخت باتیں کہہ دینا

سب نہیں ہوتا۔ وہ کچھ دیر یونہی خاموش بیٹھا رہا۔ جیسے کوئی سوچ رہا ہو۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھا اور اپنی کرسی سیف کے بالکل قریب کھینچ لے گیا۔

"آؤ تم بھی یہیں قریب آجاؤ۔"

اسے بوڑھے کے اس ردّعمل پر بڑی حیرت تھی۔ اتنا سخت سست کہنے کے باوجود بوڑھے کی آواز میں غصہ کا کوئی شائبہ تک موجود نہ تھا۔ اس نے بھی اپنی کرسی بوڑھے کے کہنے کے مطابق سیف کے قریب کرلی۔ بوڑھے نے سیف سے ایک گلوبند نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا

"دیکھو یہ کس کا ہے؟"

"انوری بیگم مرحوم زوجہ اکرم علی مرحوم۔ ۴" اس نے گلوبند سے لٹکے ہوئے کارڈ کی عبارت اور ہندسہ پڑھا "یہ ہم کیا ہے؟"

بوڑھے نے سیف کا دوسرا خانہ کھولا جس میں فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔

اس نے ایک فائل نکالا جس پر ۴ کا موٹا ہندسہ سیاہی سے لکھا ہوا تھا۔

"دیکھو" اس نے فائل کھولا۔

پہلے صفحہ پر زنانہ تحریر میں لکھا ہوا ایک خط تھا۔ اس نے پہلے لکھنے والی کا نام دیکھا۔ انوری بیگم زوجہ اکرم علی مرحوم سے نیچے تاریخ تھی جو سات سال پہلے کی تھی۔ یہ خط مرنے سے قبل لکھا گیا تھا وہ خط پڑھتا رہا۔ مرنے والی نے مرنے سے قبل اس خط کے ذریعے چند زیورات اور کچھ نقدی بڈھے کے حوالے کرتے ہوئے اس سے التجا کی تھی کہ وہ اس رقم سے اس کی اکلوتی لڑکی مریم کی تعلیم و تربیت اور پھر شادی بیاہ کا انتظام کردے۔ خط کے نیچے زیورات اور روپیوں کی تفصیل تھی وہ صفحے الٹتا رہا۔ ایک جڑاؤ بند کے فروخت کی رسید پھر اس کا سارا حساب، وہ ساری فائل بڑے انہماک سے دیکھتا رہا۔ گذشتہ سات سال میں "مریم" پر جو کچھ خرچ ہوا تھا اور اس کی ماں کے دیئے ہوئے زیورات کی فروخت سے جو رقم آئی تھی وہ سب کچھ درج تھا۔

"اب مریم کا کیا ہوا؟" اس نے فائل ختم کرتے ہوئے بڑے استعجاب سے پوچھا۔

"مریم۔ مریم نے اس سال میٹرک کرلیا ہے! اب اس کی شادی کرنی ہے۔ یہ گلوبند اس کی ماں کا آخری زیور ہے اس کی قیمت بیچنے پر زیادہ سے زیادہ دو سو ملے گی۔ یہ مسئلہ بڑا کٹھن ہے۔ بلا ماں باپ کے لڑکی۔ آجکل لوگ شادیوں میں جہیز بھی مانگتے ہیں۔ اس کا بھی انتظام کرنا ہے۔ میں آج رات یہی سوچ رہا تھا جس سے نیند نہ آرہی تھی۔" بوڑھے نے یہ کہتے ہوئے گلوبند اور فائل دونوں سیف میں رکھ دیئے اور پھر ایک ہار اس کی طرف بڑھا دیا۔

"دیکھو"

اس نے دیکھا، وہی کارڈ۔ کوئی نام، کوئی ہندسہ۔ بوڑھے نے پھر اسی ہندسے کی فائل اسے دیدی۔ وہ فائل دیکھتا رہا ایک باپ کا خط مرتے وقت لکھا ہوا کچھ زیور، کچھ روپیہ۔ لڑکے کی تعلیم و تربیت کے لئے کیونکہ باپ کو اپنے بھائی پر اعتماد نہ تھا۔ وہی حساب کتاب۔ صفحوں پر صفحے۔

بڈھا اسے متعدد زیورات اور فائلیں دیتا رہا اور وہ حیرت و استعجاب سے پڑھتا رہا۔ تقریباً ہر معاملے میں دی ہوئی رقم بتائے ہوئے کام کے لئے بالکل ناکافی تھی۔ اس لئے بڈھا اپنی جیب سے بھی اس طرح کے ہر کام میں صرف کرتا رہا تھا اور گذشتہ پندرہ بیس سال میں بے شمار دولت خود اس کی جیب سے خرچ ہوچکی تھی۔ اور وہ پڑھتے پڑھتے گھبرا گیا۔

"بس کیجئے۔ بہت دیکھ چکا۔" اس نے آخر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔

"میرا ایک چھوٹا سا کاروبار ہے کپڑوں کا! اس سے جو نفع ہوتا ہے اس میں سے ہر مہینے کا خرچ بیوی کو دیکر بقیہ اسی امانت میں ملا دیتا ہوں اور اسی طرح سارا کام چلتا رہتا ہے۔" بوڑھے نے فائلیں اور زیورات سیف میں بند کرتے ہوئے کہا

"لیکن آپ یہ سب بنک میں کیوں نہیں رکھ دیتے جہاں چوری کا کوئی خطرہ نہ ہو۔"

تم نکر نہ کرو۔ میں اس کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرتا ہوں۔ یہ دوسروں کی امانتیں ہیں۔ انھوں نے امین مجھے بنایا ہے۔ بینک کو نہیں ۔ اور ہاں دیکھو۔ اب صبح ہو رہی ہے۔ فجر کا وقت قریب ہے۔ تھوڑی دیر میں میرے بچے اور ملازم اُٹھ جائیں گے، تم خاموشی سے چلے جاؤ۔ ان باتوں کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میں تم کو بھی نہ بتاتا لیکن تمھارے جملوں سے مجھے دُکھ ہوا تھا۔

وہ کچھ نہ بولا ۔ وہ اٹھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے قدم جلیسے جواب دے چکے تھے۔

"اٹھو اٹھو۔ جلدی کرو کہیں تمہیں یہاں نکلتے دیکھ کر کسی کو شبہ نہ ہو جائے۔"

وہ بمشکل اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔ کیا واقعی اس کوٹھی سے آزادانہ نکل جائے گا۔ وہ چلتا ہوا کوٹھی سے باہر آیا۔ اور پھر چہار دیواری کے باہر کھلی سڑک پر نکل گیا۔ وہ جارہا تھا .... ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا ہوا۔ کچھ دور چل کر وہ رک گیا۔

"ارے انگوٹھی ۔ وہ انگوٹھی تو ابھی تک اس کے بریف کیس ہی میں تھی .... اس نے انگوٹھی نکالی۔ صبح کاذب پر غالب ہوتی ہوئی روشنی میں اس نے دیکھا ....

بڑی نازک سی .... خوبصورت سی ....

سونے کی انگوٹھی جس میں چھوٹا سا ہیرے کا نگینہ لگا ہوا تھا... ہوگی کوئی پانچسو روپے کی ...... اس نے دل میں سوچا ..... وہ کچھ دیر یونہی انگوٹھی کو دیکھتا رہا .... بوڑھا یقیناً اسے بھول گیا..... اسے یاد بھی نہ ہوگا......... وہ اسے لے کر جا سکتا ہے .... پانچسو...... چلا جائے .... اس نے ایک قدم آگے بڑھایا ..... لیکن پتہ نہیں یہ کس کی ہوگی ...... اس خیال کے آتے ہی وہ ایک دم مڑا اور بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا۔ پھر کوٹھی کے دروازے پر پہنچا

بوڑھا ابھی تک کوٹھی کے صدر دروازے پر کھڑا دور خلا میں دیکھ رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر چونکا۔

"یہ .... انگوٹھی ...... انگوٹھی میں غلطی سے لے جا رہا تھا۔ اس نے انگوٹھی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں میں اسے تمہاری انگلی میں اور پھر بریف کیس میں گرانے دیکھا تھا۔ یہ میری لڑکی کی ہے۔ میں نے تمہاری ضرورت کے خیال سے اسے واپس نہ مانگا۔ ویسے اس کی قیمت پانسو ہے۔ تمہیں اگر نقد روپیوں کی ضرورت ہو تو اس کے عوض لے سکتے ہو" اور یہ کہہ کر اس نے انگوٹھی لے لی اور سو سو کے پانچ نوٹ اپنے کوٹ کی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھائے اس کے ہاتھ سے بریف کیس چھوٹ گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ سکتے کے عالم میں لہراتا ہوا بڈھے کے پاؤں پر گر پڑا ــــــ

"تہذیب و ادب"

نسانہ ———

حسنِ تعبیر

فضل من اللہ

آج وہ کچھ زیادہ تھک گئی تھی۔ یا کم از کم اس کا یہی خیال تھا اور روزمرہ کے خلاف..... ہی تھکن کچھ زیادہ محسوس کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بہت سے کام ادھورے چھوڑ دیئے اور انہیں صبح پر ٹال دیا۔ برتنوں کا ایک ڈھیر تھا جنہیں اسے مانجھنا چاہیئے تھا۔ "سویرے ہی دیکھ لوں گی" کہہ کر اس نے برتنوں سے جان چھڑا لی تھی۔ پانی اور جلانے کی لکڑیاں بھی نہ سمیٹیں، ٹھیلے کے قریب ہی پڑے رہنے دیں سوچا خدا کی خدا جانے کونسی بارش ہو کر رہے گی۔ یہ ضرور تھا کہ ابر کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا آسمان پر آ ٹکتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ ہوا بھی پروا تھی اور ٹھنڈی، اور امی نے کہا تھا، "حمیدہ بیٹی! اپلے اور لکڑیاں سنبھال کر رکھ دینا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے پتہ نہیں کب بارش آجائے۔" لیکن تھکن، اور ٹھنڈ کے علاوہ ایک اور جذبہ بھی تھا جس نے اسے امی کے حکم کی تعمیل سے روکا۔ اس نے دل میں کہا: "ان ماؤں کو سوائے حکم چلانے کے کوئی کام ہی نہیں..." یہ لفظ اس نے کیوں کہے؟ ان کے پیچھے ایک تلخی ضرور تھی اگرچہ ان سب کا سبب کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

بستر پر آ گری تو نیند جیسے اس سے دور ہونے لگی، اور تھکن جیسے اس کے انگ انگ اور پور پور میں رچنے لگی اور وہ دیر تک پہلو بدلتی رہی۔ بے قراری کا یہ عالم اس پر دیر تک طاری رہا۔ وہ سوچنے لگی یہ کیا مصیبت ہے جو مجھ پر طاری ہے۔ کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ تھکی ماندی ہونے کے باوجود نیند اس کے لئے اپنی آغوش وا نہیں کرتی، پہلے تھکن رینگ کر اس کے انگ انگ اور پور پور میں رچ جاتی ہے۔ پھر دھیرے دھیرے نیند اس کی آنکھوں سے اڑ جاتی ہے اور پھر اس کا ذہن کچھ سوچنے لگتا ہے۔ اس کی دل کی مجلس بیتے دنوں کی یادوں سے گرم ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ یہ محفل جمتی ہے مگر پھر حال کا عفریت لپکتا ہے اور یہ مجلس درہم برہم ہو جاتی ہے اور وہ سوچنے لگتی ہے کہ ماں اسے اس کے شوہر کے پاس کیوں نہیں بھیجتی؟ کیا اس لئے کہ اسے اس طرح آرام ملتا ہے۔ مفت کی نوکرانی ہاتھ آئی ہے۔ جس کے سبب وہ خود عیش کر سکتی ہے اور یہاں پہنچ کر اس کے ذہن میں ماں کے خلاف تقریباً سوکناپے کے جذبات پیدا ہو جاتے اور اس کا جی چاہتا کہ اس کے ہاتھ میں ایک تیز چھرا ہو جسے وہ سب کے پیٹ میں بھونک دے اور خود پاگل ہو جائے۔ مگر یہ ممکن نہ ہوتا تھا۔ اور اس کے بجائے اس پر ایک کرب محیط ہو جاتا تھا اور وہ دیر تک جاگتی رہتی تھی حتیٰ کہ ارد گرد کے تین کمروں میں چارپائیوں کی چرچراہٹ سنائی دیتی اور اس کے جسم پر جیسے آرا چلنے لگتا۔ اور راتوں کے مقابلے میں جن میں بہت ہوا تو ایک آدھ ڈراؤنا خواب ہوتا جو صبح کو بھول جاتا اور وہ صبح تازہ دم اٹھتی یہ رات اس پر بہت کڑی گزرتی اور اس کی تلخی کو وہ صبح کو بھی محسوس کرتی۔

آج کی رات بھی ایسی ہی رات تھی۔

آج بھی اس کے ذہن میں پہلے ماں کے خلاف، پھر ابا کے خلاف پھر بھائی کے خلاف پھر ہمسائے کے خلاف غرض سب کے خلاف جذبات پیدا ہو کر کرب کی صورت اختیار کر رہے تھے نیند کا کہیں دور دور نام و نشان تک نہ تھا۔ تھکن پر اب اس کرب نے غلبہ پا لیا تھا اور وہ بے قراری کے عالم میں کروٹیں بدل رہی تھی اور رات بھیگ رہی تھی۔ چاروں طرف سکوت تھا لیکن ابھی ارد گرد کے تینوں کمروں میں روشنی تھی جس کا مطلب تھا کہ ابھی لوگ سوئے نہیں تھے۔ درمیان میں جہاں وہ تھی دالان تھا۔ اس کے مشرق میں دو کمرے تھے ایک میں اس کے ابا اور امی سوتے تھے۔ دوسرے میں مالک مکان اور اس کی بیوی اور تیسرے میں اس کا بھائی اور اس کی نو بیاہتا بیوی۔ ابا کے کمرے سے کبھی کبھی حقہ کی... گڑگڑاہٹ کی آواز آتی۔ مالک مکان کے کمرے سے کبھی کبھار مردانہ ہنسی کی

آواز جو چوہوں کی آواز سے مشابہ تھی آئی اور مسہرے کرے سے جوان بیٹا کر دن کے دھیمے دھیمے قہقہے۔

وہ حقہ کی گڑگڑاہٹ کے پیچھے چھپی ہوئی خاموش۔۔ زبان کو بھی تھی۔ وہ اس چوہوں کی سی آواز والی ہنسی اور دھیمے دھیمے قہقہے کے اسباب سے بھی بے خبر نہ تھی۔ اسی سے اسے یہ سمجھنے میں دقت پیش نہ آتی تھی کہ کرایہ دار کی بیوی اس کی امی اور اس کی بھاوج کیوں فوراً سو جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ سخت محنت بھی نہ کرتی تھیں۔ اس کو معلوم ہو جاتا کہ نیند سخت محنت کے سبب ہی نہیں آتی بلکہ پیار اور محبت کے سبب آتی ہے۔ اس سے اسے اپنی بھی گزری ہوئی زندگی یاد آنے لگی۔ اور اسے اپنے میاں کا فقط پیار یاد رہ گیا۔ یہ کہ وہ غنڈہ تھا۔ یہ کہ وہ نشہ باز تھا۔ یہ کہ وہ نکھٹو تھا۔ یہ کہ وہ اس کا زیور بیچ کر کھا گیا تھا۔ یہ کہ اس نے دھکے دے کر اپنے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ سب باتیں اسے بھول گئیں بعینہٖ جیسے کسی کو شہد کا مزا یاد رہ جائے اور مکھیوں کا ڈنک بھول جائے۔ یا جیسے بچے کو دہکتا ہوا انگارا پکڑنے کے تجربے کی مسرت تو یاد رہے مگر ہاتھ کا جلنا یاد نہ رہے۔ اور وہ کچھ دیر کھوئی ہوئی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

روشنیاں گل ہو گئیں۔

پھر روشنیاں گل اور وہ خیالات کے عرش سے حقائق کے فرش پر آ رہی جہاں اس سے پیار کرنے والے شوہر کی بجائے ایک کھڑی ہوئی چارپائی تھی۔ ایک بے ڈھب سا دروازہ تھا جس کے درزوں سے دسمبر کی یخ بستہ ہوا برف۔۔۔۔۔۔ کے تیروں کی طرح داخل ہو کر اس کے جسم کو جیسے چھید ڈالتی تھیں۔

روشنیاں گل ہو گئیں تو بار بار دہرائی ہوئی پھر داستان پھر دہرائی جانے لگی دہی جاتی تو بھی چارپائیوں کی چرچراہٹ اور اس پر رہی جاتا بوجھا کرب طاری ہو گیا وہ دیر تک اپنے روح و دل پر آ اچلتا ہوا محسوس کرتی رہی حتیٰ کہ نیند کو اس پر رحم آ گیا۔ اور خدائے رحیم نے اس کے زخمی جسم اور مجروح روح پر نیند کے مرہم کا میٹھا اور پرسکون پھایا رکھ دیا اور وہ سو گئی۔۔

چند لمحوں تک تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ بے یقینی کے عالم میں اس نے اپنے بازو پر چٹکی بھری اسے تکلیف ہوئی تو اسے یقین آیا کہ وہ خواب تھا۔ رات اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔

اور یہ خطرناک اور بھیانک خواب آہستہ آہستہ اس کے اعصاب پر چھانے لگا۔ نیند سے بیداری کے وقت وہ بید لرزاں کی طرح کانپ رہی تھی۔ نل پر منہ دھوتے وقت اس کا چہرہ ٹھنڈے پانی کی چھینٹوں سے فرحت محسوس کر رہا تھا مگر اس کی روح اور اس کے قلب و دماغ اس خواب کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ آٹا گوندھتے وقت، برتن مانجھتے وقت روٹیاں پکاتے وقت، برتن میں سالن ڈالتے حتیٰ کہ لقمہ توڑنے اور چبانے کے وقت، یہ خواب اس کے ذہن میں موجود تھا اور وہ چند لمحے سکون سے بیٹھتی کہ یہ خواب اسے متوحش کر دیتا اسے اپنی کیفیت یاد آتی کہ اس کے ہاتھ میں ایک چھرا ہے جس کی نوک سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں اور اس نے تین خون کئے ہیں ـــــــــــ وہ کام سے جلد فارغ ہو کر بڑی بی سے اس خواب کی تعبیر پوچھنا چاہتی تھی۔ بڑی بی محلہ کی ایک گرگ باراں دیدہ قسم کی بڑھیا تھی۔ تھی یوں تو ہر فن مولا مگر خواب کی تعبیر میں تو ید طولیٰ رکھنے کا دعویٰ رکھتی تھی۔۔ دن چڑھتا سورج بلند ہوتا چھت پر دھوپ آ جاتی تو مجلس جمتی، وہ چاہتی تھی کہ کام کا جنجال جلد ختم ہو۔ وہ مجلس جلد گرم ہو اور وہ وہاں اڑ کر پہنچ جائے۔

خواب کا آخری حصہ اسے یاد تھا۔ کہ اس نے اپنی ماں کو مالک مکان کی بیوی کو اور بھاوج کو قتل کیا تھا اور پھر اس کے ہاتھ میں چھرا تھا جس کی نوک سے خون کے قطرے گر رہے تھے۔ مگر اس سے پہلے کیا ہوا یہ اسے یاد نہ تھا۔ اس پر کچھ دہشت ہی ایسی طاری ہو گئی تھی کہ۔۔ سب کچھ بھول جاتی، جب اس کے ہاتھ میں چھرا تھا تو اس نے سنا کہ کوئی اسے آواز دے رہا ہے۔ اسے محسوس ہوا یہ اس کی امی کی آواز تھی اسے حیرت ہوئی کہ اسے تو وہ ابھی ٹھکانے لگا چکی ہے سوچا اس کی روح ہو گی۔ اس نے دیکھا کہ سامنے اس کی امی ہاتھ باندھے کھڑی ہے اور اسے کہہ رہی ہے: "حمید بیٹا۔ حمید بیٹا" یعنی بس کر وا ور خون خرابہ نہ کرو۔ پھر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اس کے ہاتھ جیسے پتھر ہو گئے ہوں اس کے پاؤں جیسے منوں وزنی ہو گئے ہوں وہ حرکت تک نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے محسوس کیا وہ آواز جو اسے پکار رہی تھی بلند

ہو رہی ہے .... پھر جیسے ایک دم روشنی ہو جائے اور تاریکی کافور ہونے لگے وہ ایک اور ہی دنیا میں تھی خواب کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور وہ تھر تھر کانپ کر جاگ اٹھی تھی اس کی پیشانی باوجود دسمبر کی سرد صبح کے پسینے سے تر تھی۔

خواب کا یہی حصہ اسے یاد تھا اس سے پہلے کیا ہوا اس کے ذہن پہ پردا چھایا ہوا تھا۔ ذہن پر زور دیا تو اسے یاد آیا کہ خواب میں اس نے اپنے شوہر کو دیکھا تھا لیکن وہ کیسے آیا تھا خواب کے نقشے اس کا کیا تعلق تھا یہ اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ ذہن پہ مزید زور دیا تو اسے یاد آیا کہ جب وہ سوئی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہو اور جب اس نے پوچھا کون تو کسی نے سرگوشی میں جواب دیا اور وہ فوراً سمجھ گئی کہ وہ اس کا شوہر تھا لیکن اس وقت وہ کیوں آیا تھا یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا بہرحال وہ اٹھی نہیں۔ مگر اس کی حیرت کی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ڈیڑھ سال بعد آیا تھا اس لئے اس کا روٹھنا قدرتی تھا۔ چنانچہ وہ روٹھ گئی اور اپنا منہ پھیر لیا۔

"چل جانے بھی دے بھاگ بھری۔"

"چل دفعان ہو مجھ سے کلام نہ کر جس ماں کے پاس اتنا عرصہ رہا ہے اب بھی وہیں جا۔" لیکن جلد ہی صلح ہو گئی اور اس کا شوہر کہنے لگا: "چل میرے ساتھ اس وقت پر کسی کو پتہ نہیں لگنا چاہیئے۔

تاکہ تیری آکڑ قائم رہے نوسرباز۔"

"بیٹا روٹی کو تو دیکھ جل کر راکھ ہو گئی ہے۔"

وہ ایک دم چونکی اور جلدی جلدی روٹی کا ساڑ دور کرنے لگی

"بیٹا کیا بات ہے صبح سے کچھ گم سم سی ہو رہی ہے۔"

"کچھ نہیں امی جان۔"

"نہیں بیٹا کچھ تو ہے۔"

"امی ...."

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ امی نے اسے گلے لگایا اور اسے پیار کیا تو اس نے خواب کہہ سنایا اور امی کہنے لگی: "جی ہلکان نہ کر بیٹیا خواب خیال ہوتے ہیں۔"

امی چلی گئی تو وہ پھر روٹی پکانے لگی۔ ادھر تخلیہ ہوا ادھر پھر خیالات کا لشکر اس کے دماغ پر حملہ ہوا اور پھر وہ سوچنے لگی کہ جب اس نے آ کر چلنے کو کہا تھا تو پھر کیا ہوا تھا۔ ایک دم جیسے کھٹکا ہوا اور اسے یاد آیا کہ اس موقع پر اس کی امی آ گئی تھی اور اسے یوں لگا تھا جیسے وہی اس کی دشمن تھی اور اس نے خدا جانے کہاں سے چھرا تلاش کر کے پہلا وار اسی پر کیا تھا پھر.....

چھت پر میٹھی میٹھی پیاری پیاری دھوپ تھی مجلس گرم تھی۔ بڑی بی تھی آپا تھی۔ دینی مزاج رکھتی تھیں۔ ثریا تھی انٹرڈنس میں پڑھ رہی تھی۔ حمیدہ بھی تھی اور حمیدہ کی وجہ سے خواب گفتگو کا موضوع بن گیا بڑی بی نے کہا: "میرا مولا کوئی چیز بے کار نہیں کرتا خواب یا سچے ہوتے ہیں یا ان کی تعبیر ہوتی ہے۔" ——— آپا کہنے لگیں "واری جاؤں اس پروردگار کے اس نے خواب بھی عجیب نعمت بنائے ہیں یہ نہ ہوں تو پہاڑ جیسی رات کیسے کٹے آدمی مردے کی طرح بستر پہ پڑا رہا کرے۔" حمیدہ نے اپنے بھائی جان کے حوالے سے کہا کہ خواب بدہضمی کی وجہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ ثریا کہنے لگی انسان کے دماغ میں ایک خانہ ہوتا ہے اس کی جو خواہش پوری نہ ہوں وہاں جا چھپتی ہیں اور خواب کے وقت انسان پر چھاپا مارتی ہیں بڑی بی ثریا پر حملہ کرنے کو پر تول رہی تھی کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ سنائی دی۔ حمیدہ کا دل دھک سے رہ گیا کہ اب خواب والا معاملہ گول سمجھتے۔ مگر اس کی امی نے آتے ہی گفتگو کا موضوع پوچھا جب معلوم ہوا کہ خواب موضوع گفتگو ہے۔ بس تو بڑی بی سے پوچھا کہ حمیدہ کے خواب کی تعبیر کیا ہے بڑی بی کے چہرے سے لاعلمی کی علامتیں دیکھ کر اس نے بیٹی کو کہا: "بتاؤ نا بیٹی آخر کیا حرج ہے۔" اور حمیدہ نے بمشکل خواب بیان کیا بڑی بی ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی: —

"بیٹی اس میں رونے کی کیا بات ہے تمہیں اپنے گھر والوں سے بے تحاشہ محبت ہے۔"

بڑی بی کی یہ تعبیر حمیدہ کو کچھ اچھی نہ لگی اور اس کے برعکس اپنی سہیلی کا یہ خیال کہ خواب دماغ کے ایک خانے میں پڑی ہوئی ناآسودہ خواہشوں کی وجہ سے ہوتے ہیں جاندار محسوس ہوا۔ اور پھر آناً فاناً رات کے خیالات آنا

کے دماغ پر چھانے لگے وہی رات والا کرب اس پر طاری ہو گیا۔ اور اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس کا جسم آرے سے چرا جا رہا ہو، اس کے چہرے پر کرب کے آثار ظاہر ہوئے مگر پیشتر اس کے کہ یہ کرب کوئی واضح صورت اختیار کرتا اس کی امی نے اسے گلے لگایا اور اس کے سر پر پیار دے کر کہنے لگی :۔

"کتنی اچھی تعبیر بتائی ہے مالی جی نے ، میری بیٹی کو ہم سے کتنی محبت ہے "۔

اور حمیدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ، امی سمجھیں کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں !

سائنز ——

بیگم گلبدن

● —— نیناکاش

۱۷۱۲ء عیسوی چل رہا تھا۔ سلطنت مغلیہ کی عظمت اور وسعت کا آفتاب قریب غروب ہو چکا تھا اور خاندان مغلیہ کی حکومت قصر قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ملک میں ہر طرف بدامنی کا دور دورہ تھا۔ شاہی طاقت آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ تخت طاؤس پر جہاندار شاہ جلوہ افروز تھا جس نے خود کو راگ رنگ اور شراب و عورت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ کیا دربار، اور کیا محل، ہر جگہ سیاسی اور جنگی مشورے ہونے کے بجائے ساغر و مینا کی قلقل اور رقاصاؤں کے پاؤں میں بندھے گھنگھرؤں کی آوازیں سنائی پڑتی تھی۔ چاروں طرف عیش و عشرت اور نفس پرستی کا غلبہ تھا۔ شراب اور عورت میں مست رہنے والا جہاندار شاہ صرف نام کو ہی بادشاہ تھا اصلی حکومت اور طاقت ملکہ گلبدن کے ہاتھ میں تھی جو حسن و شباب کا وہ لاثانی پیکر ہی درحقیقت شہنشاہ ہندوستان تھی۔ شہنشاہ جہاندار شاہ اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا تھا اور وہ اسی کی آنکھوں سے دیکھتا اور سنتا تھا۔

موسم بہار کی ایک حسین صبح تھی۔ ان گنت کشتیاں جمنا کے کنارے سینے پر پھسلتی ہوئی متھرا سے دلی جارہی تھیں۔ نیلے آسمان اور اس سے بھی زیادہ نیلے جمنا کے پانی میں سپید بادبانوں والی کشتیاں ایسی لگتیں تھیں گویا راج ہنس اپنے سپید اور حریری پروں کو پھیلائے پانی پر تیر رہے ہوں ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی جمنا نظام الدین کے پاس قدرے سیدھی ہو کر بہتی ہے اور نظام الدین کو پار کرتے ہی دلی کی ساری حشمت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے —— ہمایوں کا مقبرہ، اندر پرست، کلو کھڑی کوٹلہ فیروز شاہ، شاہ جہاں آباد، لال قلعہ وغیرہ سب اس طرح دکھائی دینے لگتے ہیں۔ گویا کسی پردے سے پرے کبھی ماہر مصور نے ان کو اتار دیا ہو جامع مسجد کے میناروں پر پڑتی ہوئی سورج کی کرنیں آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی تھیں۔

اور کشتیاں تو مسافروں سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن ایک کشتی میں صرف دو ہی انسان تھے۔ ایک تو دس بارہ سال کا ایک خوردسال بچہ تھا اور دوسرا ایک بوڑھا تھا۔ بچہ کا رنگ گورا پیشانی کشادہ آنکھیں بڑی بڑی اور پھول کی طرح ہنستا ہوا چہرہ بے اختیار دوسرے کا دل اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ بوڑھے کا چہرہ لمبا، ناک نوکیلی اور لمبی اور ڈاڑھی سپید تھی جو اس امر کی شاہد تھی کہ وہ بوڑھا کسی اعلی خاندان سے تعلق رکھتا ہے جب وہ بوڑھا ہنستا تھا تو معلوم ہوتا تھا گویا بادلوں میں بجلی ناچ رہی ہو۔ وہ فتح پور سیکری کی درگاہ کا مجاور اعلیٰ تھا۔ "بابا، بابا!" یکایک بچے نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ "دلی کتنی خوب صورت ہے بابا!" "چپ رہو بیٹا۔ بوڑھے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "جب تک تم اپنی امی سے نہیں مل لیتے اس وقت تک اپنا حال کسی کو نہ جاننے دینا۔" "دیکھو وہ ہے لال قلعہ! —— شہنشاہ شاہ جہاں کی یادگار!"

بچہ حیرت سے لال قلعہ کی طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔ "وہی ہے لال قلعہ؟ میری امی اسی میں رہتی ہیں نا؟"

"ہاں بیٹا!" بوڑھے نے ایک آہ کے ساتھ سنجیدگی سے جواب دیا۔ "تمہاری امی ملکہ گلبدن بیگم اور جہاں پناہ شہنشاہ عالم جہاں دار شاہ اسی قلعہ میں رہتے ہیں!" ماں کی یاد آتے ہی بچہ قدرے غمگین ہو گیا۔ "بابا!" اس نے بھی ایک آہ بھری۔ "کیا میری امی کو بھی میری یاد آتی ہوگی؟ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہونگی نا؟ —— مجھے پیار کریں گی نا؟"

بچے کے سوالات سے بوڑھا قدرے پریشان ہو گیا۔ لیکن اپنی پریشانی کو چھپا کر اس طرح سنجیدگی سے بولا۔ "کیوں نہیں بیٹا! ... لیکن ملکہ عالم کے حضور تک شرف باریابی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اگر ہم ان تک نہ پہنچ سکے تو بیٹا ہمیں واپس اپنی خانقاہ کو لوٹ جانا ہوگا

تو بابا، تم نے میری امی کو میرے آنے کی بات لکھ کیوں نہیں بھیجی؟"

"بیٹا ایسا کرنے میں خطرہ تھا۔ دربار کے امراء ہمارے راستے میں روڑے اٹکا دیتے ——— ملکہ عالم تمہاری امی ہونے سے انکار کر سکتی تھیں۔ ——— اور اسی کا نتیجہ ہوتا، ہم دونوں کا قتل یا قید! لیکن یکایک تمہیں سامنے دیکھ کر وہ ایسا نہیں کر سکیں گی، تمہاری آنکھیں اور تمہارا چہرہ انھیں ایک شخص کی یاد دلادے گا۔ جسے انھوں نے کسی وقت جی جان سے پیار کیا تھا۔ تمہیں سامنے پاکر ان کی مامتا جاگ اٹھے گی اسی لئے ہم چپ چاپ چل رہے ہیں ——— بیٹا یہ سچ ہے کہ حکومت آج تمہاری امی کے اشاروں پر ناچ رہی ہے اور شہنشاہ عالم تک میں ان کی کسی خواہش کو ٹھکرا دینے کی ہمت نہیں ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کل تخت کس کروٹ بیٹھے گا؟ شہنشاہ عالم ابھی تک لاولد ہیں۔ اس لئے مجھے تمہارا مستقبل بہت شاندار نظر آتا ہے۔ بیٹا اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے کامیابی عطا فرمائی تو غریبوں اور چھوٹے آدمیوں کو نہ بھول جانا جس وقت اس دنیا میں تمہارا کوئی نہ تھا۔ اس وقت انھوں نے ہی تم کو پناہ دی تھی۔

بچہ شاید بوڑھے کی یہ بات نہ سمجھا تھا اور وہ متحیر نگاہوں سے کبھی بوڑھے اور کبھی لال قلعے کی طرف دیکھ رہا تھا کشتی بدستور جمنا کی لہروں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف پھسل رہی تھی۔ بوڑھا اگرچہ سنجیدہ اور مطمئن سا نظر آرہا تھا۔ لیکن اس کے چہرے سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنی کامیابی میں شک ہے سیکری کی خانقاہ میں جو کام اسے آسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ اب اسے پہاڑ سے بھی زیادہ مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ اسے دس سال پہلے کی وہ رات یاد آرہی تھی جبکہ آندھی اور پانی کے طوفان میں ایک حور سی حسین عورت نیم بیہوشی اور دگرگوں حالت میں خانقاہ کے دروازے پر آپڑی تھی۔ وہ حسین عورت آگرہ کی مشہور رقاصہ سیما تھی جس کے حسن اور شباب کے تذکرے شاہی محلات سے لیکر جھونپڑیوں تک میں ہوتے تھے۔ لیکن جاٹوں کی بغاوت اور لوٹ مار میں اس کا سب کچھ لٹ گیا۔ اس کی دولت لٹ گئی۔ عالیشان مکان تباہ ہو گیا ——— اور اس کے پاس کچھ اپنی جان کے علاوہ صرف اس کا بچہ رہا جسے اپنی چھاتی سے چپکائے ہوئے وہ سیکری کی خانقاہ کے دروازے پر آپڑی تھی خانقاہ والوں نے اسے پناہ نہ دی۔ لیکن اس کے بے زبان بچے کو حفاظت میں لے لیا۔ وہی حسین رقاصہ سیما دربدر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی کسی طرح دلی جا پہنچی۔ جہاں شہزادہ جہاندار شاہ جوانی کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا چار آنکھیں ہوتے ہی شہزادہ گویا اس کے ہاتھوں بک گیا ———

پھر تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہوتے ہی اس نے سیما کو گلبدن کے نام سے سلطنت مغلیہ کی ملکہ کا اعزاز بخش دیا اور ملکہ ہندوستان گلبدن بیگم نے کچھ ہی دنوں میں اپنی ذہانت، قابلیت، غیر معمولی عقلمندی اور حسن کی سحر افزائیوں سے نہ صرف شہنشاہ ہی کو اپنا جانثار پروانہ اور غلام بے دام بنا لیا بلکہ سلطنت بھر میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ اس نے اپنی گزشتہ زندگی کو اس طرح فراموش کر دیا جیسے لہر پانی میں محلول ہو جاتی ہے۔ اب جو گلبدن بیگم سلطنت کے بہی خواہوں کے راستے میں آنکھیں بچھاتی تھی۔ وہی غداروں باغیوں اور بدامنی پھیلانے والوں کے سر پر قہر بن کر ٹوٹ پڑتی تھی۔ سارا ملک اس کے نام سے کانپتا تھا اور آج اسی ملکہ ہندوستان گلبدن کے حضور میں سیکری کی خانقاہ کا مجاور اعلیٰ اس کے فراموش شدہ فرزند کو لے جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ملکہ اپنے رتبے اور عظمت کو بھول کر اپنے بیٹے کو اپنائے گی یا نہیں۔

طلوع آفتاب کی سرخ و سنہری روشنی نے دلی کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ ہر طرف ایک سحر سا ہنس رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں کشتی شاہی گھاٹ پر آلگی اور معمولی تحقیقات اور باز پرس کے بعد ان کو شہر میں داخلے کی اجازت مل گئی۔ بوڑھا اس سے پہلے کئی مرتبہ دلی آچکا تھا اس لئے وہاں کی سڑکوں اور عمارتوں سے واقف تھا۔ آج جس جگہ پریڈ کا میدان ہے وہاں اس وقت دلی کا بڑا صراف بازار تھا۔ گھوڑوں، پالکیوں اور ہاتھیوں کی ریل پیل کو پار کرتے ہوئے دونوں لال قلعہ کے صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

"باخبر ہوشیار!" قلعے کے صدر دروازے پر پہنچتے ہی ایک فوجی نے انہیں ٹوکا اور اپنا نیزہ بوڑھے کی چھاتی پر لگا دیا۔

یہ دیکھ کر بچہ چونک پڑا اور ڈر کر بوڑھے سے لپٹ گیا۔

"مجھے خواجہ سردار رشیدی منصب سے ملنا ہے" ——— بوڑھے نے نہایت حلیمی سے کہا۔ منصور اس قلعے کے تمام خواجہ سراؤں کا سردار اور

شاہی محافظ دستے کا نگراں اور رکن اعلیٰ تھا۔ اس کے غیر معمولی اثر و رسوخ اور انسانیت سوز بے رحمی اور سنگدلی سے سارا دربار کانپتا تھا۔ درباری لوگ شاہی عتاب کا اتنا خوف نہیں تھا کہ جتنا کہ اس کے غصے کا۔ کیونکہ اسکی خوشنودی حاصل کرکے وہ شاہی عتاب سے تو بچ سکتے تھے لیکن اس کے غصے اور عتاب کا نتیجہ موت ہی ہوتا تھا۔

سبھی درباری اس کی خوشنودی اور نظرِ کرم حاصل کرنے کے لئے ہر وقت اس کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگے رہتے تھے اسی لئے سردار منصور کا نام سنتے ہی قلعے کے صدر دروازے کا محافظ و نگراں فوجی ڈر سا گیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو ان کے ساتھ کر دیا جو انہیں سردار منصور کے پاس لے گیا۔

کئی عالیشان اور آراستہ پیراستہ کمروں میں سے گزر کر وہ ایک کمرے میں پہنچے جہاں دنیا بھر کی خوب صورت چیزیں موجود تھیں جس کی فضا میں طرح طرح کے بادل سے اڑ رہے تھے اور جس کے چپے چپے پر جگمگاتے ہوئے ہیرے آنکھوں کو خیرہ کئے ڈالتے تھے۔ اس کمرے کو دیکھ کر بچے اور بوڑھے دونوں ہی پر ایک خوابناک کیفیت سی طاری ہو گئی اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

معاً سنہری بیل بوٹوں سے مزین کالی کمخواب کا پردہ ایک طرف سرک گیا اور بوڑھے نے اپنے سامنے خواجہ سرا سردار شیدی کو کھڑا پایا سردار ادھیڑ تھا۔ جوانی رخصت ہو چکی تھی لیکن اس کے بغیر ڈاڑھی اور داڑھی کے کٹھور چہرے سے بے رحمی ٹپکی پڑتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سیدھی نظر کو سہہ سکنا ہر ایک کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس میں بے پناہ نفرت اور بے رحمی بھری ہوئی تھی۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟" سردار منصور گہری اور متحیر نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا بوڑھے سے مخاطب ہوا:۔ "بغیر کسی وجہ کے کوئی بھی مجھ سے ملنا نہیں چاہتا۔ فرمایئے۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی؟" یہ کہہ کر وہ ایک مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ اس قدر بھیانک اور زہر آلود تھی کہ بچہ خوف سے کانپ اٹھا اور اپنا چہرہ بوڑھے کے لبوترے کرتے میں چھپا لیا۔ لیکن بوڑھے پر اس کی مسکراہٹ کا کچھ اثر نہ ہوا، اس نے بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا:۔

"جناب عالی! میرا کام واقعی اتنا ضروری ہے کہ میں نے جناب کو تکلیف دینے کی جرأت کی ہے۔ میں ملکۂ عالم گلبدن کے حضور میں شرف باریابی چاہتا ہوں۔ میرے کام کا تعلق انہیں سے ہے۔ اگر جناب کو تکلیف نہ ہو تو براہِ کرم ملکۂ عالم کے حضور میں میری آمد کی اطلاع کرا دیں۔"

ملکہ کا نام سنتے ہی سردار منصور کے چہرے پر شیطنت اور بربریت ناچنے لگی۔ اس نے قہر افزا نظروں سے بوڑھے کو بلایا اور سنجیدگی سے کہا:۔

"سائیں بابا، آپ کو علم ہونا چاہئیے کہ شہنشاہ عالم نے مجھ ناچیز کو یہ حق عطا فرمایا ہے کہ قلعے اور قلعے سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کی پوشیدہ سے پوشیدہ باتیں بھی میرے علم میں لائی جائیں! ——— آپ کی پوشاک سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کسی خانقاہ سے تشریف لا رہے ہیں۔"

"جی ہاں، درست خیال فرمایا آپ نے۔"

بوڑھے نے نگاہیں جھکا کر کہا:۔

"میں خانقاہ سیکری کا مجاورِ اعلیٰ ہوں۔ مجھے ایک نہایت ہی ضروری کام کے سلسلے میں ملکۂ عالم کے حضور میں باریابی حاصل کرنی ہے لیکن ان سے مجھے کیا کام ہے۔ یہ میں آپ کو بتانے سے قاصر ہوں۔"

بوڑھے کی آواز میں اس قدر سنجیدگی اور متانت تھی کہ سردار منصور ششدر سا رہ گیا۔ آج تک سبھی اس کی خوشامد اور چاپلوسی کرتے آئے تھے لیکن لوہے سے لوہا ٹکرایا تھا۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں لیکن اس نے آگے بڑھتے ہوئے مسکرا کر کہا:۔

"بوڑھے بابا ——— شاید تمہیں علم نہیں ہے کہ سلطنت مغلیہ کا کوئی بھی راز ایسا نہیں ہے جو مجھے نہ بتایا جا سکے شہنشاہ عالم اور ملکۂ زمانی سے تعلق رکھنے والی چھوٹی سے چھوٹی بات کا جاننا میرا فرض ہے۔ اگر تمہیں اپنے راز مجھے بتانے سے انکار ہے تو یہ یاد رکھو زندگی بھر کوشش کرنے پر بھی تم ملکۂ زمانی سے نہیں مل سکو گے۔ اپنے آنے کا مقصد بتانے پر ہی تم کو ملکۂ زمانی کے حضور میں باریابی

حاصل ہو سکے گی۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم ملکۂ عالم کو قتل کرنے کے ارادے سے نہیں آئے ہو؟ ــــ یاد رکھو شیر کے غار سے نکل جانا آسان ہے لیکن میرے چنگل سے صحیح سلامت نکل جانا ناممکن ہے! میرے ایک اشارے پر تم عمر بھر کے لئے قید کئے جا سکتے ہو! بولو کیا مرضی ہے تمہاری؟"

سردار منصور کی بات سن کر بوڑھا غصے سے سراپا تمتما اٹھا اس کی آنکھوں میں انگارے سلگ اٹھے لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا اور ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا:۔

"جیسی جناب کی مرضی! ــــ یہ خوبصورت بچہ ملکۂ عالم گلبدن کی اولاد ہے، آج سے دس سال پہلے تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہونے سے پیشتر انہوں نے ایک مہینہ کی اس ننھی سی ہستی کو ہماری خانقاہ کی حفاظت میں چھوڑ دیا تھا۔ اس مہر بند خریطہ میں اس واقعہ کا پورا حال لکھا ہوا ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اسے کھول کر پڑھ سکتے ہیں۔"

بوڑھے کی بات سن کر سردار منصور کی نظریں بچے کے چہرے پر جم گئیں جو ہو بہو ملکہ کا عکس تھا بچے کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کے چہرے پر ایک شیطانی اور پراسرار چمک سی عود کر آئی اور وہ اس عجیب واقعے سے فائدہ اٹھانے کی ترکیب لڑانے لگا۔ بولا:۔

"بڑے تعجب کی بات ہے! ــــ یہ تو ایک دم ملکۂ عالم کو پڑا ہے۔ شاید یہی دیکھ کر جناب نے ملکۂ عالم کو دھمکا کر قبضے میں کرنے کا ارادہ کیا ہے ہوں ــــ مولوی اور تارک الدنیا ہو کر ایسی چالاکی! شرم نہیں آتی یہ دنیا بھی کیسے پاجی لوگوں سے بھری پڑی ہے!"

"خاکسار کی تعریف پیچھے کیجئے گا جناب!"

بوڑھے نے اپنے غصہ کے طوفان کو دبا کر نہایت حلیمی سے کہا۔

"سچ اور جھوٹ کا فیصلہ خود ملکۂ عالم پر ہی کیوں نہ چھوڑ دیں۔ مہربانی فرما کر ملکۂ عالم سے عرض فرما دیں کہ امی کی یاد اس کے کلیجے کے ٹکڑے کو یہاں تک کھینچ لائی ہے۔"

بوڑھے کے نرم اور اطمینان آمیز لہجے، مہر بند خریطے اور بچے کے چہرے کو دیکھ کر سردار منصور کا شک بہت کچھ دور ہو گیا اور وہ اپنی صفا چٹ کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچنے لگا کہ اس راز سے کیسے فائدہ اٹھایا ہو جائے؟ کیا اس خبر کو سنا کر ملکۂ عالم گلبدن کو جنگل میں بلایا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا... بالآخر چند لمحے تک سوچنے کے بعد وہ بولا:۔

"آپ نے یہ راز اب تک اور کتنے اشخاص کو بتایا ہے؟"

بوڑھے نے سنجیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اور بے باکی سے جواب دیا:۔

"جناب عالی، اس راز کو میرے، اس بچے اور ملکۂ عالم کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا!"

"آپ کو اس کا پورا یقین ہے؟"

"بے شک!"

سردار منصور کو یقین ہو گیا کہ اس راز کے جاننے کے بعد ملکۂ عالم اس کے ہاتھوں میں موم کی پتلی بن جائے گی۔ وہ سوچنے لگا کہ شہنشاہ عالم اس راز سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ راز فاش ہونے پر ان کو صدمہ ہو گا اور ممکن ہے ملکۂ عالم کو شاہی قہر کا شکار ہونا پڑے۔ جی جان کی بازی لگا کر بھی ملکۂ عالم اس راز کو شہنشاہ سے چھپانے کی کوشش کریں گی اور اس طرح اس کی مٹھی میں آ جائیں گی۔

"دیکھئے" سوچتے سوچتے یکایک اس کے لب حرکت میں آئے: "آپ یہیں میری واپسی کا انتظار کریں" اور نہایت تکبر اور طمطراق سے پاؤں اٹھاتا ہوا پردے کے پیچھے چلا گیا۔

بوڑھا اور بچہ دونوں ہی انگشت بدنداں اس طرف دیکھتے رہ گئے تھوڑی دیر بعد پردے کو مقابل پھر حرکت ہوئی اور سردار منصور کمرے میں آ کر کسی آنے والے کے احترام میں زمین تک جھک کر کورنش بجا لایا اور بچے اور بوڑھے نے اسی طرح ٹھہری ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ سرتاپا ہیرے جواہرات سے لدی ہوئی نہایت نفیس اور قیمتی پوشاک زیب تن کئے ملکۂ عالم گلبدن پردے کے پیچھے سے جلوہ افروز ہو رہی ہیں

بوڑھے کا سر کچھ احترام میں جھک گیا۔ لیکن بچہ اسی طرح ملکہ
کی طرف دیکھتا رہا۔ جو سردار منصور اور بوڑھے کے کمرے میں موجودگی
سے بے نیاز نہایت لاپرواہی سے اور مست خرامی سے اس کی طرف بڑھ
رہی تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر ملکہ رک گئی اور ٹکٹکی باندھ کر اس کے چہرے
کو دیکھنے لگی۔ جس طرح بادلوں کو چیر کر سورج کی روشنی پھیل جاتی ہے۔ اسی
طرح ملکہ کے حسین چہرے پر چھائی ہوئی تکبر آمیز کٹھورتا اور سنجیدگی پگھلنے
لگی اور اس کی آنکھوں میں قہر و غضب کی جگہ اور رحم اور ممتا جھلکنے لگی۔

"امی! میری امی!" ان رحم اور شفقت مادری سے لبریز آنکھوں کو
دیکھ کر بچہ بے اختیار چلا پڑا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ملکہ سے لپٹ گیا۔

بچے کے جسم کا لمس محسوس ہوتے ہی ملکہ بھی خود کو بھول گئی اور
اس نے بچے کو چھاتی سے چپکا کر بے اختیار اس کی پیشانی چوم ڈالی۔ لیکن
اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر اس وقت ایک ایسا تاثر تڑپ اٹھا جس
سے ظاہر تھا کہ اس کے ذہن و شعور میں ایک ہنگامہ برپا ہے اور وہ کسی بڑی
الجھن کو سلجھانے کے لئے کوشاں ہے۔ احساسات شاہی اور شفقت مادری
میں ٹکر ہو رہی تھی جس میں شفقت مادری کو منہ کی کھانا پڑی اور ملکہ نے خود کو
بچہ سے الگ کرتے ہوئے سردار منصور کو اشارہ کیا جس کا مفہوم تھا کہ وہ
تخلیہ چاہتی ہے۔ سردار نے تالی بجائی اور ایک حبشی غلام بچے اور بڈھے
کو کمرے سے باہر لے گیا۔

ان کے جاتے ہی ملکہ ایک کوچ پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی اس کا دل گویا آنسو بن کر بہہ جانا چاہتا ہے۔ پھر کچھ لمحہ بعد یکایک
اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں اٹھا کر سردار منصور کی طرف دیکھا اور
چار آنکھیں ہوتے ہی وہ کانپ سی اٹھی۔ سردار کی آنکھوں میں شیطنت
اور بربریت ہنس رہی تھی اور ہونٹوں پر ایک پراسرار بھیانک مسکراہٹ
رقصاں تھی۔

"سردار منصور!" وہ گڑگڑائی:۔

"میں تمہارے قبضہ میں ہوں۔ شہنشاہ عالم کے کانوں
میں اس واقعہ کی بھنک تک نہیں پڑنی چاہیئے۔"

"ملکہ عالم، ناچیز تو حضور کی خاک پا ہے۔"
سردار منصور نے جھک کر کہا۔

"اگر حضور کی مرضی ہو تو اس کی کھال کی جوتیاں بنوا سکتی
ہیں۔ یہ راز مرتے دم تک میرے سینے میں دل کی طرح
بند رہے گا لیکن اس راز سے میرے علاوہ اور لوگ
بھی تو واقف ہیں حضور۔"

"اور لوگ سے تمہارا مطلب ان دونوں سے ہے نا؟"
ملکہ سنجیدگی سے بولی۔

"لیکن ان کا کیا کیا جائے؟"

"ان کا منہ بند کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے ملکہ عالم!"
ملکہ نے چونک کر سردار کی طرف دیکھا جو اپنے مینڈک کے پنجے
ایسے ہاتھ سے فرش کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جس طرح
چراغ کے نیچے اندھیرا رہتا ہے اسی طرح لال قلعہ کی شاہانہ آرائشوں
کے نیچے بھی ایک دنیا آباد تھی۔ قلعہ کے تہہ خانے ان قیدیوں سے بھرے
پڑے تھے جن پر شاہی عتاب نازل ہوا تھا۔ تنگ و تاریک راستوں
والی اور گونگے دبہرے تاتاری غلاموں سے بھری اس دنیا میں پہنچا ہوا
انسان دنیا کے لئے مر جاتا تھا۔ ان بدنصیبوں کی چیخیں تک بھی اوپر دنیا
تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ موت بھی گویا انہیں بھول سی گئی تھی۔ انہیں
تہ خانوں کی طرف سردار منصور اشارہ کر رہا تھا۔

سردار کی طرف دیکھتے ہی وہ کانپ سی اٹھی، اس کے دماغ
دماغ میں ایک ہلچل سی مچل گئی۔ شفقت مادری اور شہنشاہیت پھر
برسرپیکار ہو گئیں۔ اور ملکہ نے نڈھال سی ہو کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں
سے پکڑ لیا۔ اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بچہ اس کے ماضی اور...
چڑھتی جوانی کی یادگار ہے۔ اس کی رگوں میں بھی وہی خون ہے اس
کا جسم بھی اسی گوشت پوست سے بنا ہے اور سالوں بعد اسے دیکھ کر
ماں کی ممتا طوفان کی طرح امنڈ پڑ رہی تھی لیکن ———— ملکہ کو
شہنشاہ کی پسند کا بھی علم تھا وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے ماضی کو بھلا کر
ہی نوجوان جہاندار شاہ نے اسے اپنی ملکہ بنانے کا شرف بخشا تھا۔ شہنشاہ
بے اولاد تھا اور اسے خوف تھا کہ اس راز کو جان کر مبادا کہیں ان کا دل اس
سے پھر جائے اور اسے بھی شاہی عتاب کا شکار بننا پڑے۔ شہنشاہ کی نگاہ
سے گر جانے پر دنیا کی کوئی طاقت اسے شاہی عتاب سے نہیں بچا سکتی تھی

کی نظروں میں وہ جس قدر عروج کو پہنچ گئی تھی۔ اس بچے کو اپنا کہتے ہی وہ اسی قدر نیچے گر جائے گی اور اس کے زوال کا مطلب تھا، بے عزتی اور موت! لہٰذا ماضی کے پیچھے دوڑ کر ہاتھ کی دولت کیسے چھوڑی جائے؟ لیکن اکلوتے بیٹے کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے؟

وہ دیوانہ وار سوچ و تجسس کی چٹانوں سے سر دھن رہی تھی کہ یکایک اس نے سردار منصور کی آواز سنی اور وہ چونک پڑی۔

"ملکۂ عالم!" سردار غیر معمولی سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھا:۔

"گستاخی معاف! اس کا انتظام آپ اس ناچیز پر چھوڑ دیں۔"

"تو کیا تمہارا مطلب انہیں قتل کرنے کا ہے؟"

اس نے اپنے دل کی کیفیت کو چھپاتے ہوئے کہا:۔

"اس کے علاوہ اور چارہ ہی کیا ہے ملکۂ عالم!"

سردار نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا لیکن دوسرے لمحہ پھر سنجیدہ ہو گیا

"اگر ملکۂ عالم کو ان پر رحم کرنا ہی منظور ہو تو ان کی آنکھیں نکلوا کر زبان قلم کرا دی جائے!"

ملکہ کو ایسا محسوس ہوا گویا خود اس کی اپنی آنکھوں میں سرخ سلاخیں ڈالی جا رہی ہیں اور وہ لرزہ براندام سی ہو گئی اور اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر خوف زدہ لہجے میں بولی:۔

"نہیں نہیں! ایسی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے!"

"حکم ہوا!" سردار کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک عود کر آئی:۔

"۔۔ ملکۂ عالم کے حکم کی تعمیل ہو گی۔ موت ہی اس راز کو اپنے دامن میں چھپا سکتی ہے ورنہ چار کانوں میں بات ہوتی ہوئی بات نجانے کیا شکل اختیار کرے لہٰذا اسے جڑ سے اکھاڑ دینا ہی مصلحت ہے۔ ویسے جو ملکۂ عالم کی مرضی ہو؟"

ملکہ خاموش رہی۔

سردار منصور نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے تھے اس نے پھر چوٹ کی:۔

میں ملکۂ عالم کے دل میں اٹھنے والے طوفان کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ آپ صرف اشارہ ہی کر دیجئے ملکۂ عالم! آپ کے ہر فرمان کو بجا لانا غلام اپنا عین فرض اور خوش نصیبی سمجھتا ہے۔"

ملکہ اب بھی خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر ناچ رہا تھا کہ اس راز کے انکشاف کے ساتھ ہی اسے ذلت کے ساتھ لال قلعہ سے نکال دیا جائے گا اور شاید جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ اب جو لوگ اس کی جوتیاں اٹھانے کے لئے ترستے ہیں۔ ان کی نفرت، تضحیک اور بے اعتنائی وہ کیسے برداشت کر سکے گی؟ ———— اور اپنے مستقبل کا اندازہ کر کے اس کا چہرہ تمتما سا اٹھا۔

"سردار منصور!" اس نے تحکمانہ لہجے میں سردار منصور کو مخاطب کیا "ہم تم کو اجازت دیتے ہیں کہ تم اس راز کو صفحۂ ہستی سے مٹا دو!"

"جو حکم ہو ملکۂ عالم!" سردار منصور نے جھک کر سات بار کورنش کی اور موت کا پروانہ لے کر تیر کی طرح کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی ملکہ کٹے ہوئے درخت کی طرح کوچ پر گر پڑی اور اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی سی جھڑی لگ گئی۔

سردار منصور نے ایک لمحہ بھی ضائع کرنا ٹھیک نہ سمجھا اور پھر وہ دیر لگاتا بھی کیوں؟ بچے اور بوڑھے کی موت کے بعد ملکہ کے راز کو جاننے والا وہی تو رہ جائے گا اور اسی طرح ملکہ کو اپنی مٹھی میں کر کے وہ من مانا ناچ نچائے گا۔ دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی جہاں بچہ اور بوڑھا اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے رکے ہوئے تھے اس نے وہاں پر موجود حبشی خواجہ سراؤں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ پلک جھپکتے ہی آٹھ مضبوط ہاتھوں نے بچے اور بوڑھے کو پکڑ لیا۔ اور ایک تاریک برآمدے سے ہو کر انہیں گھسیٹتے ہوئے قلعے کے ایک سنسان گوشے کی طرف لے چلے۔ برآمدے کے اختتام پر ایک آہنی سلاخوں کا پھاٹک تھا جسے پار کر کے وہ ایک تاریک تہ خانے میں داخل ہوئے۔ تہ خانے کا فرش پتھر کا تھا اور وہاں بہت ہی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر گز کے فاصلہ پر کالے پتھر کے بھیانک اشکال کے بتوں کی طرح حبشی اور تاتاری غلام چپ چاپ کھڑے تھے۔

کئی چکر اور راستوں کو پار کر کے ان کو پھر ایک زینے کے ذریعہ زمین کے سینے میں اور نیچے اترنا پڑا تھا۔ نیچے بہت تری تھی اور ہوا میں بھی

نمی تھی اس سے پتہ چلتا تھا کہ قلعے کا یہ حصہ جمنا کی تہہ کے نیچے بنا ہوا ہے جگہ جگہ پر دیواروں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ جس سے چاروں طرف کیچڑ ہو رہا تھا۔ اس خوفناک بدبودار اور متعفن فضا میں ان بدنصیبوں کی دردبھری چیخیں سنائی دیتی تھیں جو شاہی عتاب کا شکار ہو جانے کی وجہ سے گھل گھل کر مرنے کے لئے یہاں بند کر دیئے گئے تھے اور جنہیں شاید موت نے بھی فراموش کر دیا تھا۔ سرنگ کے اختتام پر پھر ایک آہنی پھاٹک تھا جو ایک چھوٹے سے چوکور کمرے میں کھلتا تھا۔ کمرہ ایک دم خالی تھا۔ صرف فرش کے بیچوں بیچ لکڑی کا ایک بھاری تختہ آہنی زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا۔ یہ تختہ ایک اٹھتی ہوئی گول منڈیر پر جما ہوا تھا۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کسی پرانے کنوئیں کا منہ تھا۔

قیدیوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی آہنی پھاٹک جھنجھنا کر بند ہو گیا۔

سردار منصور نے ایک حبشی غلام کو موت کے کنوئیں سے تختہ ہٹانے کا اشارہ کیا۔ بوڑھا اب تک بالکل چپ ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ اسی طرح ہل رہے تھے۔ گویا وہ خدا سے نجات حاصل کرنے کے لئے دعا کر رہا تھا اور نیم بے ہوش بچے کو اپنے جسم سے چمٹائے ہوئے وہ اعتقاد اور اطمینان کی تصویر سا معلوم ہوتا تھا۔ پھاٹک بند ہونے کی جھنجھناہٹ اور زنجیروں کی کڑکڑاہٹ سے بچہ چونک پڑا اور چیخ کر بوڑھے سے لپٹ گیا۔ بوڑھا بھی گویا نیند سے جاگ اٹھا۔

"سردار منصور!" اس نے سردار منصور کو مخاطب کیا:۔

"مجھے اپنی کوئی فکر نہیں۔ جو خدا کی مرضی ہے ہو کر رہے گی! لیکن اس بچے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ فتحپور سیکری کی درگاہ کا مجاور اعلیٰ ہی حقیقی مجرم ہے اور گنہگار ہے؟ اس معصوم کا قصور ہی کیا ہے کیا تم اس پر ذرا بھی رحم نہیں کرو گے۔ قہر الٰہی اور عتاب شاہی تو مجھ پر نازل ہونا چاہیئے۔ تم بھی میری طرح قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو، آج مرے کل دوسرا دن۔ لیکن حسرت اس غنچہ پر ہے جو بغیر کھلے ہی کچل دیا جائے گا!

سردار منصور! اعلیٰ حضرت، عالی جاہ! براہ کرم اس بچے کی جاں بخشی جائے!"

یہ کہہ کر اس نے دو زانو ہو کر سردار منصور کا دامن چوم لیا۔

بچے نے بھی یہی کیا۔ لیکن پتھر کو بھی کبھی جونک لگتی ہے۔ سردار منصور نے ان کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دیا اور پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیا جو کنوئیں کی دیواروں سے ٹکراتا۔ سارے تہہ خانے میں ایک بھیانک آواز کی ——— بازگشت چھوڑتا ہوا پانی میں ڈوب گیا پھر اس نے حبشی غلاموں کو اشارہ کیا اور حبشی غلام بچے پر ٹوٹ پڑے اور اسے گھسیٹ کر بوڑھے سے الگ کر دیا۔ بچے کی دلدوز چیخوں سے سارا تہہ خانہ گونج اٹھا اور اس شور و غل میں کوئی بھی ملکہ کے دروازہ کھول کر اندر آنے کی آواز نہ سن پایا، ملکہ دیوانہ وار دوڑتی ہوئی بچے کے پاس پہنچی اور اسے سینے سے چپکا کر بار بار اس کا منہ چومنے لگی:۔

"نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا میرے بچے کسی کی اتنی مجال بھی نہیں کہ تیرا بال بھی بیکا کر سکے! میرے لعل میں پاگل ہو گئی، مجھ پر شیطان سوار تھا! ماں اور اپنے بچے کی قاتل! ——— کتنی عجیب بات ہے بیٹا! میرے لعل۔۔!"

سردار منصور کا چہرہ غصے سے کالا پڑ گیا اور اس کی پیشانی پر فکر و تجسس کی لکیریں ابھر آئیں...... اس کی امیدوں کا محل مسمار ہوا جا رہا تھا اس لئے اس کا غصہ سے بھر جانا فطری امر تھا۔

"ملکہ عالم!" اپنے غصہ کو دبا کر دل ہی دل میں ملکہ پر دانت پیستا ہوا وہ بولا:۔

"ان کی جان لینا کچھ ضروری نہیں ہے۔ اگر مزاج عالی میں آئے تو ایک چھری ایک دہکتی ہوئی سلاخ سے بھی کام پورا ہو سکتا ہے! غلام حکم کا منتظر ہے حضور!"

لیکن ملکہ نے اس کے الفاظ نہ سنے وہ تو اپنے جگر کے ٹکڑے کلیجے سے لگائے کسی اور ہی دنیا میں گھوم رہی تھی۔

"میرے بچے، میرے لعل!" بچے کے منہ کو دیوانہ وار چومتی ہوئی وہ کہہ رہی تھی۔

"مجھے ایک بار پھر امی کہہ کر پکارو!"

"امی! امی!" بچہ ماں سے اور بھی لپٹ گیا۔

"بوڑھے بابا" ملکہ نے بوڑھے کو مخاطب کیا۔

"تم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو۔ جھوٹ مت بولنا۔ کیا تم نے اس راز کو کسی اور کو بھی بتایا ہے؟"

"ملکۂ عالم!" بوڑھے نے سر جھکا کر نہایت عاجزی اور انکساری سے جواب دیا۔

"میں خدا اور رسول کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس راز کو میرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا!"

"بابا!" ملکہ قدرے گلوگیر لہجے میں بولی:۔

"تمہاری ملکہ تم سے التجا کرتی ہے کہ اس راز کو اپنے سینے ہی میں دفن رہنے دو! کیا تم مجھے اپنی ملکہ کو اس بات کا یقین دلا سکتے ہو کہ اس راز کو تم نے جس طرح ابھی تک چھپایا ہے آئندہ بھی چھپاتے رہو گے؟"

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں ملکۂ عالم کہ آپ کا راز میرے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو گا کسی اور کو اس کی ہوا تک نہ لگے گی۔"

بوڑھے نے اثبات میں گردن جھکا کر سنجیدگی و متانت سے کہا۔

میرے بچے۔ میرے لعل!" ملکہ بچے کو چوم کر بولی:۔

"میرے جگر کے ٹکڑے! کیا میں تم پر یقین کر سکتی ہوں، ماں ہو کر میں تم سے اس راز کو بھول جانے کی بھیک مانگتی ہوں؟ وعدہ کرو کہ اس راز کو تم کسی پر ظاہر نہ کرو گے! بولو کیا تمہاری امی تم پر یقین کر سکتی ہے؟ میرے بچے، تمہارے ایک لفظ سے ہی تمہاری امی ملکہ عالم کے رتبے سے گر کر ایک ذلیل ترین عورت بن جائے گی۔ اور شاید اسے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے وعدہ کرو اس راز کو کبھی بھی، کسی حالت میں بھی ظاہر نہ کرو گے! وعدہ کرو میرے لعل!"

"امی، امی!" بچے نے اپنے بازو ملکہ کی گردن میں ڈال کر کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں امی! میں رسول کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جان دے کر بھی اس راز کو پوشیدہ رکھوں گا!"

"مجھے تم دونوں پر یقین ہے بیٹا!" ملکہ نے اسکی پیشانی کو ایک طویل بوسہ دے کر نہایت شفقت اور مرغوبیت سے کہا۔

"اس کے بدلے میں شاہی فرمان کے ذریعے خانقاہ فتح پور سیکری کو کافی جائداد عطا فرمائی جائے گی ——— اور میرے بچے تمہارے لئے بھی شاہی خزانہ کا منہ کھول دیا جائے گا اچھا اب تم دونوں جا سکتے ہو مگر یہ خیال رکھو کہ آئندہ کبھی اس لال قلعے کی چہار دیواری میں آنے کی جرأت نہ کرنا اگر تم نے وعدہ خلافی کی اور اس راز کو کسی پر ظاہر کر دیا تو تم کو ایسی سخت سزا دی جائے گی کہ دیکھنے اور سننے والے بھی تھرا اٹھیں گے؟"

"ملکہ عالم!" بوڑھا قریب قریب زمین پر الٹا لیٹ کر بولا:۔

"میں اپنی اور اس معصوم بچے کی جانب سے آپ کو یقین دلاتا ہوں! مگر ملکہ عالم، سردار منصور، اور یہ حبشی غلام بھی تو اس راز سے واقف ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی غلطی کی وجہ سے عتاب شاہی ہم پر نازل ہو!"

"ایسا ہونا ناممکن ہے!" ملکہ کی آواز میں بے پناہ متانت تھی۔ "تمام حبشی غلام گونگے اور بہرے ہیں اس لئے اس راز کو کسی پر ظاہر کرنے کے ناقابل ہیں اور جہاں تک سردار منصور کا تعلق ہے۔ . . . !"

اتنا کہہ کر ملکہ نے حبشی غلاموں کو وہی اشارہ کیا جو کہ تھوڑی دیر پہلے سردار منصور نے کیا تھا۔

پلک جھپکتے ہی چار غلاموں نے سردار منصور کو اس طرح دبوچ لیا جیسے بلی چوہے کو دبا لیتی ہے۔

"عالی جاہ! ملکۂ عالم! اس کا مطلب کیا ہے حضور؟ کیسا منشا ہے آپ کا؟"

کہتے کہتے سردار منصور کی آنکھیں مارے خوف کے پھیل گئیں۔

"ملکۂ عالم۔ خادم بے قصور ہے اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟ عالی جاہ رحم! . . . . ملکہ عالم رحم!"

اور سردار نے جھک کر ملکہ کے دامن کو چوم لیا۔

"سردار منصور! ملکہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح تڑپ کر بولی۔

"تم اپنا قصور پوچھتے ہو......؟ خوب قربان جاؤں تمہاری معصومیت کے! کیا تم نے مجھے اپنے ہی کلیجے کے ٹکڑے کے خلاف تلوار اٹھانے پر مجبور نہیں کیا تھا؟ کیا تم نے ہی مجھے اپنے بچے کو قتل کرنے کی ترغیب نہیں دی تھی؟ کیا تمہارا ارادہ اس راز کو جان کر مجھے اپنے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنانے کا نہیں تھا......؟ تمہاری آنکھوں میں دھوکہ اور فریب تھا؟ تمہارے چہرے سے دغابازی ٹپکتی تھی ظالم......! جلاد......! اپنے اصل کرتوت کا مزہ چکھ جس طرح تو نے سینکڑوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں اسی طرح تو بھی جہنم رسید ہو! خدا کے انصاف میں دیر ہوتی ہے لیکن وہاں اندھیر نہیں ہوتا؟"

کہہ کر ملکہ نے حبشی غلاموں کو پھر اشارہ کیا۔

بچہ اور بوڑھا دونوں خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے، موت کا سایہ انکے اوپر سے ہٹ چکا تھا لیکن انکی آنکھوں کے سامنے اب بھی سردار منصور کا خوف اور غصہ سے تمتمایا ہوا چہرہ گھوم رہا تھا اور کانوں میں اس کی چیخیں رحم کی التجائیں اور گڑگڑاہٹیں گونج رہی تھیں۔

باایں ہمہ غلاموں کا اسے کنوئیں کی طرف گھسیٹنا اور اس کا موت کے منہ سے نکل بھاگنے کی کوشش کرنا بھی انھیں صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہ دونوں تنگ و تاریک سرنگ میں بے تحاشا بھاگے جا رہے تھے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینے پر بھی انہیں پیہم سردار کی دلدوز چیخیں سنائی دے رہی تھیں ——— اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد یکایک انھوں نے ایک دھماکے کی آواز سنی جیسے کوئی بھاری چیز کنوئیں میں.. پھینک دی گئی ہو۔

(بہ شکریہ "تہذیبِ ادب")

افسانہ

زخم ــ اور ــ درد

شرون کمار ورما

ہریش نالے کے پار اس مکان تک ہو آیا تھا جس میں شاداں رہتی تھی۔ شاداں کو اس نے گلاب سنگھ خیمے والے کی دکان پر بیٹھے۔ سامنے سے گذرتے دیکھا تھا۔ اور دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ اسے ایسی لگی تھی جیسے کوئی پھول پانی کی لہروں پر خراماں خراماں بہا جا رہا ہو جب اس نے گلاب سنگھ کی باتوں پر توجہ نہ دیتے ہوئے اس لڑکی کو دیکھا تھا اور ریلدر کے پل تک اسے دیکھتا رہا تو گلاب سنگھ نے اپنی گھنی ملگجی مونچھوں میں سے مسکراتے ہوئے کہا تھا "پھلگام کی بجلی ہے، کئی راکھ ہو چکے ہیں۔ بڑے بڑوں نے کوشش کی۔ لیکن ناکام رہے۔ اس کا بڑا بھائی بہت سخت ہے۔ چھوٹے موٹے کی تو اسے کبھی جرأت نہیں ہوتی شاداں کی طرف دیکھنے کی"

ہریش نے دل ہی دل میں گلاب سنگھ کا یہ چیلنج قبول کر لیا تھا اور اس طرح مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا، جیسے کہہ رہا ہو۔ سردار جی! تم خیمے لگوانا جانتے ہو، لڑکی پھانسنا نہیں۔ یہ بھی ایک آرٹ ہے۔ ہم دکھائیں گے ہاتھ"

اور اس نے اس مہم کو سر کرنے کی تجاویز پر غور کرنا شروع کر دیا تھا اور کئی دنوں سے شاداں کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن وہ پھر نظر نہ آئی تھی۔ شہروں میں یہ بیچھے خراب ہونے کا کام اس نے کبھی نہیں کیا تھا وہاں تک "ڈھلگے" اور "سرکار" کا رشتہ اٹوٹ تھا۔ وہاں لڑکیاں اسے ڈرائنگ روم کی گرم گرم فضا میں مل جاتی تھیں۔ جنہیں ڈرائنگ روم کی زبان میں وہ کمرن کہا کرتا ہے۔ انہیں وہ کیٹس، شیلے اور بائرن کی نظمیں سنا سنا کر اور فلمی غزلیں اور گیت گنگنا کر اپنی محبت کا یقین دلایا کرتا تھا شاداں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر نہ فلمی گیت سنتی تھی، نہ کیٹس اور شیلے کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ مکی کے کھیت میں کام کرتی تھی۔ بکریاں چراتی تھی، دودھ دوہتی تھی یا چیل کے جنگلوں سے چیل کی خشک ٹہنیاں جمع کر کے لاتی تھی ــــــ ہریش بھی اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ وہ پچھلے کئی سال سے کشمیر کی حسین و دلفریب وادیوں میں سیر و تفریح کے لئے آ رہا تھا اور پہاڑ کے دامن میں رہنے والی بھولی بھالی، جوان لڑکیوں کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ ہر سال اس کی شہری نمکین باتیں ان معصوم لڑکیوں کا دل لبھا لیتیں اور وہ اپنی تمام پاکیزگی شرافت اور معصومیت ہریش کے تجربہ کار ہاتھوں میں سونپ دیتیں

آج بھی وہ آدھ گھنٹہ شاداں کے مکان کے سامنے اخروٹ کے درخت کے سائے تلے، پتھر پر بیٹھ، اکتا کر لوٹ آیا تھا۔

سڑک کے کنارے، ایک پتھر پر بیٹھے بیٹھے ہریش چیل کی بھوری نکیلی پتیوں کے گچھے اٹھا کر ایک ایک پتی توڑ رہا تھا۔ اس کے قدموں میں بھوری بھوری چکنی پتیوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔ وہ آج بھی شاداں کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ کچے مکان کی چھوٹی سی کھڑکی کے سیاہ، بھدے کواڑ آج بھی بند رہے تھے وہاں پتھر پر بیٹھا وہ آدھ گھنٹہ نیچے متواتر چلتی ہوئی پن چکی کی گھوں گھوں گھر ڑ گھر ڑ سنتا رہا تھا۔ شاداں کے مکان کے باہر بندھے ہوئے میمنے بار بار کرتے رہے اور وہ انکا دلخراش نغمہ سنتا رہا تھا۔ لیکن شاداں مکان سے باہر نہ نکلی اسے امرتسر میں اپنی بغل والی کوٹھی میں رہنے والی اپما یاد آ گئی جسے اس نے ہارڈی کی نظم سنا سنا کر محبت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ گنگنانے لگا۔

لیکن شاداں اپنی کھڑکی سے نہ جھانکی۔ وہ دوڑی دوڑی اخروٹ کے پیڑ تلے، اس کی گردن میں باہیں ڈالنے نہیں آئی۔ ایک میمنے نے فقط اس کی طرف منہ اٹھا کر دیکھا، پھر زور سے پکارا "باںباں" ہریش کو سخت کوفت ہوئی اور وہ اٹھ کر چلا آیا۔ اسے اپما کا خیال آیا۔ ڈ لہے بوگن بیلیا کی بیل کے سرخ پھولوں اور ہرے ہرے خوب صورت

ہ کے سائے تلے گنگناتے سن کر اپنے کمرے کا ـــــــ جالی کا دروازہ
ں کر بھاگی آئی تھی اور راجہ کا بیٹا اس پریوں کی شہزادی کے ساتھ بہت
تک باتیں کرتا رہا تھا۔ لیکن اپما کے رخسار زرد تھے۔ آنکھیں خشک اور
رونق تھیں۔ جیسے سوکھے گڑھے ہوں۔ تمام جسم پر جیسے خزاں کا...
ط تھا۔ شاداں کو دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا جیسے نیاگرا فال پر
ہ مخواہ بند باندھنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اپما میں وہ طوفانی
دں کا سا جوش نہ تھا۔ رفتار میں وہ پہاڑی ندی کی سی تندی و تیزی
ی۔ وہ ان چھوٹی کلی کی سی لطافت نہ تھی ـــــــ وہ تو ڈرائنگ
م کے ایک کونے میں سجا کاغذی پھول تھی اور شاداں ـــــــ
رر بالا برفانی چوٹیوں کا ناز تھی۔ سیب کا وہ شگوفہ تھی جیسے مست ہوا
ر چھیڑ کر جگاتی ہو، البڑ کا نغمہ تھی۔ ایک ابدی نغمہ جیل کے جنگل میں
لے ہوئے گنگنانے والی ہوا تھی۔ بلندیوں پر بسنے والے برف کے
دنا کی پاکیزگی تھی۔ دودھ کی دھار تھی جو شفق کے حریری پردوں میں
رہی تھی ـــــــ اور ہریش بچہ کا تھا۔ جنگل کے ریچھ کی
ح جسے شہد کی خوشبو نے بیتاب کر رکھا تھا۔

تین لڑکیاں اس کے قریب سے ہنستی ہوئی گذریں وہ کسی فلم ایکٹر
تبصرہ کر رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے ہریش کی طرف دیکھا۔ ہریش نے
ے دیکھ کر نہایت بے نیازی سے سگرٹ سلگا لیا۔ وہ لڑکی بہترین
نی کپڑوں، خوبصورت سینڈلوں، کلائیوں میں بجتی ہوئی طلائی چوڑیوں
نوں میں جھولتے ہوئے طلائی حلقوں اور سر پر لپٹے قیمتی سفید مفلر
ے باوجود اس وقت شاداں کے تصور پر غالب نہ آسکی۔ شہر میں شاید
ہ اسے دیکھ کر دل تھام لیتا ـــــــ وہ شاداں کے بارے میں
؛ چپ تارہا۔ اس کے ذہن کے ہر گوشے میں شاداں کے رخساروں پر دہکتے
ے شعلے لرزاں تھے۔ اس کی نیلی نیلی آنکھوں پر جھکی جھکی ریشمی پلکوں کی
ماریں اپنے سائے پھیلا رہی تھیں ـــــــ ایک بار مل جائے کہیں
ہ تمام اس کی سانس کی خوشبو سے معطر ہو جائے گا۔ فضا مست ہو جائے
، وقت اس کے بدن کی میٹھی میٹھی آنچ سے لطف اندوز ہونے کے لئے
ہ جائے گا۔ وہ لمحہ کتنا حسین ہوگا۔ وہ ایک پل تمام زندگی کی قیمت ہوگا
ایک پل جاوداں ہو جائے گا۔ شاداں کی آواز کا رس، اس کے حسن کی تمام
چاندنی، اس کے شباب کی تیزی و تندی، اس کے مسکراتے ہوئے بدن کی
کنواری مہک، اس ایک پل کو لافانی بنا دے گی اور وقت کا بوڑھا دیوتا
اس ایک پل پر ہمیشہ ناز کرتا رہے گا۔

"ہیلو ہریش!" ایک جانی پہچانی آواز نے اسے چونکا دیا۔

ہریش نے سر اٹھا کر دیکھا ـــــــ سامنے جگل کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہی مسکراہٹ جو کہتی رہتی۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ پتلی پتلی مخروطی انگلیاں، ان میں اٹکا ہوا سگریٹ۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ جس کے پیچھے اس کی عقابی آنکھیں ہر گھڑی مسکراتی رہتیں جیسے دنیا کے نہ ہونے پر خندہ زن ہوں جیسے سب کو ہیچ سمجھتی ہوں ـــــــ جگل کی اسی سال ہریش سے واقفیت ہوئی تھی اور یہ واقفیت جلد ہی بے تکلفی کی حدوں کو پار کر گئی اور وہ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو گئے۔

کلب میں ایک شام بحث چل رہی تھی مسئلہ عورت کا تھا جگل کی آواز چھائی ہوئی تھی۔ وہ دبلی پتلی مس لوتھرا بمبئی کی مشہور ہیئر ڈریسر مس سلطانہ، باتلی والا اور ٹھنگنے قد والی موٹی بھدی مس سمتھ کی موجودگی میں کہہ رہا تھا ـــــــ "بیوی کا نام دے کر مرد عورت کو زندگی بھر کے لئے غلام بنا لیتا ہے۔ یہ دور غلامی کی ایجاد ہے اور یہی نہیں مرد خود تو جو چاہے کرتا پھرے لیکن بیوی بے چاری کے لئے گھر سے باہر نکلنا بھی معیوب ہے۔ یہ ادارہ شادی ہونا ہی نہیں چاہیئے۔ دوسرے بیوی مرد پر اگر چھا جائے تو اسے دنوں میں بوڑھا کر دیتی ہے جیسے نزلہ ہو گیا ہو۔ شادی کرنا بیوقوفی ہے۔ دونوں کے لئے۔ صرف عشق کرنا چاہیئے۔ ایسا عشق نہیں جو جنگلوں کی خاک چھنوائے یا کوہکنی کروائے۔ یہ صدیوں پرانی باتیں ہیں حالات کی تبدیلی کا اثر عشق پر بھی ہوا ہے اور اب ایسا عشق کرنا چاہیئے جو لبوں کو مسکرانا سکھائے، آنکھوں کو فرحت اور تازگی بخشے عورت کو اگر آپ دل ہی میں جگہ دیتے ہیں تو وہ محض خیال بن کر رہ جائے گی اس کی جگہ مرد کی باہوں میں ہے ـــــــ اور جو عورت کو دل میں جگہ دیتے ہیں بعد میں پچھتاتے ہیں...... عورت محض افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مرد تو خود کو بیتشے سے مار لیتا ہے اور عورت اپنے آپ کو چناب کی لہروں کے سپرد کر دیتی ہے۔ یہ مرد اور عورت دونوں کی توہین ہے سراسر توہین۔"

مس لوتھرا سینڈل فرش پر زور سے مار کر بولی "ہاں مسٹر! بالخصوص ان عورتوں کو زمانہ آج بھی یاد کرتا ہے۔ محبت کرنیوالے دل ان کی عزت کرتے ہیں، تم جانور ہو، تم عشق کی لطافت کو نہیں سمجھ سکتے۔"

محبت کرنے والوں کو اندھا بھی اسی لئے کہا جاتا ہے۔ اور میں سب کچھ سمجھ کر نا سمجھ بھی نہیں بننا چاہتا۔ میں خود کو دھوکا دینے کا سخت مخالف ہوں۔ ان اندھوں کے افسانے وہ لوگ دہراتے ہیں جو خود کچھ نہیں کر سکتے زندگی بھر کمال کرتے رہتے ہیں اور یہ ہم جانوروں کی بدولت ہے کہ دس عشق کرنے کے بعد بھی آجکل لڑکیاں اپنا تعارف کراتے ہوئے لفظ مس پر خوب زور دیا کرتی ہیں۔ کیوں مس باطلی والا؟ جگل نے لفظ مس پر زور دے کر سلطانہ باطلی والا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

مس سلطانہ کی بھنویں تن گئیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور میجر مکرجی کو ساتھ لے کر کلب سے چلی گئی۔

جگل نے مسکرا کر کہا: "یہ مکرجی پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر لائے گا اور یہ میرڈ لیسر کچا گھڑا لے کر دریا میں اتر جائے گی اور کل شام یہ دونوں پھر کلب میں آ بیٹھیں گے۔"

اس پر ایک زوردار قہقہہ گونجا اور بحث ختم ہو گئی۔

ہریش کے دل و دماغ پر جگل کی گفتگو گہرا اثر چھوڑ گئی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس سال پہلگام میں ہنسی خوشی دن گزارنے کے لئے جگل بہترین ساتھی ثابت ہوگا۔ اس نے جگل کو کافی پر مدعو کیا۔ کافی پینے کے بعد وہ دیر تک ایک ساتھ سیر کرتے رہے رات کے کھانے پر ہریش جگل کو اپنے ساتھ لے گیا۔

کہاں تنہائی اور کہاں جگل ایسے زندہ دل نوجوان کا ساتھ۔ ہریش ہر وقت اس کے ساتھ رہنے لگا۔ جگل بھی ہریش کو پسند کرنے لگا تھا۔۔۔ دونوں کے خیالات بہت حد تک ملتے تھے۔ عورتوں کے معاملے میں دونوں آزاد خیال واقع ہوئے تھے۔ محبت میں مجنوں بن جانا یا شراب پی کر نالیوں میں گرتے پھرنا اس کی نظر میں برابر تھا جس طرح شراب کبھی کبھی تھوڑی مقدار میں صحت کے لئے پینا چاہیئے اسی طرح محبت بھی صحت کے لئے کرنا چاہیئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے معرکے سنائے اور داد حاصل کی اور جب ایک شام سیر کرتے ہوئے ہریش نے سنجیدگی سے شاداں کا ذکر کیا تو جگل قہقہہ مار کر ہنس دیا اور دیر تک ہنستا رہا۔ ہو۔ ہو۔ ہی۔ ہی۔ ہا۔ ہا۔ ہو۔ ہو۔۔۔۔۔ کیا عشق ہے لڑکی سے محبت کرتے ہیں حضور، کوئی عجیب بات نہیں۔ ایک عام نوجوان اور کر بھی کیا سکتا ہے! جگل نے لفظ عام پر زور دیا اور مسکرایا۔

"کیا مطلب؟ ہریش نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اگر کوئی لڑکی تم سے محبت کرنے لگے تو بات بھی ہے۔ تم ایک لڑکی سے محبت کرنے لگے ہو، کونسا تیر مارا ہے؟"

ہریش نے سنجیدگی سے اسے سمجھایا کہ وہ حمیدہ، نوراں، اور ربانو والی فہرست میں شاداں کا نام بھی لکھنا چاہتا ہے اور جگل کو اس کی مدد کرنا چاہیئے۔ جگل نے پرخلوص دوست کی طرح وعدہ کر لیا تھا۔

اس وقت جگل کو سامنے دیکھ کر ہریش خوش ہو گیا۔

"تو کیا محبت کے نقشے بنا رہے ہو؟" جگل نے پوچھا۔

"تم مذاق کرتے ہو یار!"

"تم موقع ہی کیوں دیتے ہو اس بات کا؟"

"خیر چھوڑو آؤ چلیں۔"

ہریش اسے لیکر پھر شاداں کے مکان کی طرف بڑھ گیا۔

مکان کے قریب پہنچ کر جگل نے مصرع پڑھا ع

کھنچتے ہوئے ہم کوچہ دلدار میں پہنچے

وہاں سے ناکام لوٹ کر وہ کلب میں جا بیٹھے۔ رات کے لئے جدا ہوتے ہوئے ہریش نے جگل کو صبح دریا پہ نہانے کی دعوت دی اور اپنے خیمے کی طرف چلا آیا۔

رات بھر وہ شاداں کے ساتھ خوابوں کی حسین و دلکش وادیوں میں گھومتا رہا۔

صبح جب لوکرنے آکر جگایا تو دن کافی چڑھ آیا تھا خیموں کے باہر بچے شور مچا رہے تھے۔ سیلانی مندر سے لوٹ آئی تھی۔ بزرگ قسم کے لوگ تین تین، چار چار کی ٹولیوں میں، اوورکوٹ پہنے، سروں پہ صافے یا گرم ٹوپیاں پہنے، ہاتھوں میں چھڑیاں لئے، صبح کی سیر کر کے لوٹ رہے تھے۔ ہریش نے خیمے سے نکل کر آسمان کی طرف دیکھا نیلے کانچ کے ٹکڑے کی طرح آسمان بالکل صاف تھا۔ دریا کے پار، مندر کی طرف

جانے والی پگڈنڈی پر، مندر آنے جانے والوں کی بھیڑ تھی۔ سامنے چوٹی پر چیل کی ہری ہری چھتریوں پر سورج کی پہلی کرنیں گھل مل کر جیسے مچل گئی تھیں۔ پہاڑ کی ڈھلان سے اترتی ہوئی اس کی نگاہ دریا کے پل پر آکر ٹھہر گئی۔ شکارگاہ کی طرف جانے والے راستے پر چند لڑکیاں کھڑی دریا کچھ دیکھ رہی تھیں ——— وہ ان کی طرف دیکھنے لگا ——— پھر خیمے سے اس کی بہن لتا نائٹ گاؤن پہنے نکل آئی اور وہ لڑکیوں سے نظر ہٹا کر دریا میں پڑے جہاز نما پتھر کو دیکھنے لگا۔ جس پر اب ہلکی ہلکی دھوپ پھیل گئی تھی اور ایک چھوٹی سی چڑیا دھوپ میں بیٹھی اپنی قرمزی دم ہلاتے جا رہی تھی۔

"جی ذرا دیر ہو گئی اٹھنے میں۔"

"ہریش بھی دھوپ چڑھنے تک رضائی میں پڑا رہتا ہے۔"

ہریش نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے ماں جی اور جگل کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ لتا بھی ان کی طرف چلی گئی۔ جگل نے مسکرا کر اسے نمستے کہی۔ لتا نے بھی مسکرا کر ہاتھ جوڑ دیئے ——— ہریش بھی ان کے قریب آگیا۔

"چلتے ہو نہانے؟" ہریش نے جگل سے پوچھا۔

"دیکھئے ماں جی یہ مجھے مروانے پر تلا ہے۔ میں والدین کا ایک ہی بڑا لڑکا ہوں۔" اس نے نہایت معصومیت سے کہا اور مسکرا دیا۔

ماں نے اپنا کشمیری شال سنبھال کر کہا: "اس کا کچھ پتا نہیں چلتا کبھی تو دریا پر نہانے چلا جاتا ہے کبھی چار دن پانی کی شکل نہیں دیکھتا۔"

لتا جگل کے مذاق پر مسکرا رہی تھی اور ہریش کا چھوٹا بھائی کشور جگل کا ہاتھ کھینچ کر پوچھ رہا تھا: "بھیا کیا بڑے دو بھی ہوتے ہیں؟"

لیکن ہریش اسے جواب دینے کا موقع نہ دے کر اندر خیمے میں لے گیا

دریا میں بڑے بڑے چند پتھروں نے پانی کو کس قدر روک سا رکھا تھا اور اس طرح پل کے نیچے چھوٹا سا تالاب سا بن گیا تھا۔ تیرنے کے شوقین بچے پانی کو چیرتے ہوئے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جایا کرتے تھے پانی میں شرارتیں ہوتیں، ایک دوسرے پر چھینٹیں اڑائی جاتیں۔ کنارے پر بیٹھے دھوپ کھانے والے کو کھینچ کر پانی میں گرا لیا جاتا اور غوطے دیئے جاتے اور جب دریا کا برفانی پانی رگوں میں خون کی گرمی اور تیزی کم کرنے لگتا، دانت بجنے لگتے، ہاتھ پاؤں کے ناخن نیلے ہونے لگتے تو نہانے والے باہر نکل کر خیموں میں بھاگ جاتے ——— یہ تماشا وہاں روز ہوا کرتا۔ خیموں کے باہر دریاں بچھ جاتیں اور ناشتے کا سامان چن دیا جاتا۔ بچے ہری ہری مخملی گھاس پر قلابازیاں کھاتے پھرتے یا دریا کے کنارے بیٹھ کر صاف ستھرے گول گول پتھر چنتے۔ معمر عورتیں ایک جگہ جمع ہو جاتیں مرد نہانے چلے جاتے یا پچھلے دن کا اخبار پڑھتے جو وہاں شام کو دیر سے پہنچا کرتا تھا۔ جوان لڑکیاں، بڑی بوڑھیوں سے دور ٹولیاں بنا کر گھاس پر خراماں خراماں ٹہلتی رہتیں۔ کبھی کبھی کوئی قہقہہ اٹھتا۔ کوئی بھاگتی، بیٹھتی، دوپٹہ سنبھالتی اور نہاتے ہوئے نوجوانوں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر شرما جاتی اور آنکھوں میں پیار بھرا غصہ لا کر اپنی سہیلی سے کہتی ——— بے شرم ——— یا کسی دری پر بیٹھ کر نئی فلموں کے ریکارڈ سنتی۔ جو پیار و محبت کی تشریح کرتے اور پھر کوئی بھاگ اٹھتی۔ لبوں اور آنکھوں میں مسکراہٹ ناچ رہی ہوتی۔ جو دبلے پتلے اور بھی باغی ہو جاتی۔ نوجوان لڑکیوں کے قہقہے، دریا میں نہانے والوں کے جسموں میں بجلی پھیر دیتے، سب پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ جس میں خواہ مخواہ کچھ کرنے کو جی چاہتا۔ ایسا ہنگامہ، ایسی حرکت، جو سب سے الگ ہو۔ سرد پانی سے ڈرنے والے نوجوان جی کڑا کر کے دریا پار چلے جاتے اور منہ اٹھا کر لڑکیوں کی طرف دیکھتے ——— نہا کر نوجوان ناشتے کے لئے آجاتے۔ پاس کے دیہاتوں سے کشمیری عورتیں، کچے سیب ہرے بادام، ہرے اخروٹ وغیرہ فروخت کرنے آجاتیں۔ سینکڑوں کے حساب سے یہ چیزیں بکتیں۔ نوجوان فقرے کستے۔ "یہ اخروٹ ذرا سخت ہے۔ زور لگا کر توڑنے لگا۔" ——— "یہ سیب ابھی کچا ہے ذرا پک کر مزہ دے گا۔" پاس بیٹھی لڑکیاں سب کچھ سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کے سے انداز میں چائے کی پیالیوں میں چمچے ہلائے جاتیں اور لڑکوں کی نظریں بچا کر ایک دوسری کی طرف دیکھ کر مسکراتیں۔ پکڑی جانے پر دوپٹوں کے کنارے انگلیوں پر لپیٹنے لگتیں۔

جگل کا کبھی کبھی دریا پر نہانے کا شوق ہریش سے مل کر روز کی عادت ہو گیا۔ وہیں ناشتا کرتا۔ کشور کے لئے وہ ٹافیاں، چاکلیٹ اور بسکٹ لانا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ ناشتے کے دوران میں وہ انھیں ایسے ایسے لطیفے سناتا کہ ہنستے ہنستے سب کے پیٹ میں درد ہونے لگتا۔ ماں جی کو اس کے لطیفے

بہت پسند تھے۔ لتا کی فرمائش کبھی ختم نہ ہوتی۔ جب وہ ذرا سنجیدہ ہوتا تو ماں کے ساتھ بھگوان بھگتی کی باتیں کرتا۔ ہریش اکتا نے لگتا اور اسے چلنے کے لئے کہتا۔ ماں ناراض ہو جاتی۔ کبھی عقل کی باتیں ہی کیا کر، تو نے پڑھ لکھ کر بھگوان کو بالکل بھلا دیا۔ جگل بھی تیرے جیسا ہی ہے۔" ہریش جل بھن جاتا۔ اس کے دل میں آتا۔ ماں کو جگل کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔۔۔۔۔ یہ یہاں آپ کے سامنے بیٹھ کر بھگوان کی مہا گانے والا اول نمبر کا حرامی ہے۔

"لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکتا" جگل مسکرا مسکرا کر اپنی کتھا کہے جاتا جب لڑکیوں کی آزادی اور برابر کے حقوق کی بات چلتی تو جگل پورے جوش سے لتا کا ساتھ دیتا۔ وہ لڑکیوں کی آزادی کے حق میں ایسے ایسے ٹھوس دلائل پیش کرتا کہ ماں بھی مبہوت سی رہ جاتی۔ اور جب وہ جانے لگتا تو ماں کہتی :-

"جگل بیٹا کل ضرور آنا۔ یہ ہریش تو صرف سیر کرنا ہی جانتا ہے۔ نہ بھگوان کو مانتا ہے نہ دھرم پر یقین رکھتا ہے۔ کبھی دو منٹ میرے پاس بیٹھ کر کام کی بات نہیں کہتا۔"

لتا مسکرا دیتی۔ اور وہ کل آنے کا وعدہ کر کے اٹھ آتا۔

سیر کے دوران جب کبھی لڑکیوں کا ذکر آتا۔ ہریش شاداں کے لئے بیتابی ظاہر کرتا۔ جگل ہنس دیتا۔ ہریش کا خیال تھا کہ پہاڑ پر آ کر صرف پہاڑی لڑکی سے عشق کرنا چاہیے۔ دوسری لڑکیاں تو شہروں میں بھی مل جاتی ہیں اور یہ حسن شہروں میں مفقود ہوتا ہے یہ معصومیت الھڑپن، شہروں کی گھٹی گھٹی فضا میں دب کر رہ جاتا ہے یوں بھی ذائقہ بدلتے رہنا صحت کی نشانی ہے۔ لیکن جگل کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ وقت ہو، اور لڑکی ہو بس عورت کے لئے خواہ مخواہ خراب ہوتے پھرنا حماقت ہے، چاہے وہ پری ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں آسانی سے کام بنے نکال لو۔ کون سا زندگی بھر کا ٹھیکا ہوتا ہے اور پھر شہر کی لڑکی محبت کی ۹۵ فیصدی ضروریات سے پہلے ہی واقف ہوتی ہے اس کے برعکس ان پہاڑی لڑکیوں کو عشق کی، الف، بے پڑھانا پڑتی ہے اور محبت کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اور پھر بات ختم کرنے میں بھی دشواری ہوتی ہے جنہیں تم معصوم کہتے ہو گلے کا تعویذ بن جاتی ہیں اور شہر کی لڑکیاں تو ان باتوں کو شادی سے پہلے محبت کے تجربات کہہ کر بھول جاتی ہیں اپنا تو اصول ہے کہ جہاں موقع ہو وہاں عاشق ہو جاؤ۔ لڑکیاں سب ایک سی ہوا کرتی ہیں۔

ہریش نے گلاب سنگھ کا چیلنج قبول کر لیا تھا اور وہ اس مہم کو ہر قیمت پر سر کرنا چاہتا تھا۔ وہ جگل کی باتوں کو نظر انداز کر کے "شاداں" کے گھر کی طرف چلا جاتا اور جگل کلب میں جا بیٹھتا۔

ایک دن کھانے کے بعد ہریش کی ماں نے تاش کا پروگرام بنایا۔ ہریش تیار ہو گیا۔ لیکن جگل نے سخت مخالفت کی۔۔۔۔۔۔ "واہ آپ بھی خوب کرتی ہیں۔ تاش تو شہروں میں بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ میں تو کہوں گا کہ یہ کھیل ہی شہروں کا ہے۔ پہاڑوں پر تو تاش کھیلنا جرم ہونا چاہیے۔ باہر مہکی مہکی ہوا بہہ رہی ہے۔ جیسے بنفشے اور چیل کے جنگل کی خوشبو سے مست ہو۔ گھاٹیاں خوب صورت جنگلی رنگ برنگے پھولوں سے ڈھکی ہوں۔ ہر طرف ہریالی پھیل رہی ہو۔ سیب اور ناشپاتی کی لچکیلی ٹہنیوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں چہچہا رہی ہوں۔ ایک نیلا شفاف آسمان مسکرا رہا ہو پہاڑوں کی چوٹیوں سے پگھلی ہوئی چاندی سرمئی پتھروں سے لپٹ کر، وداعی بوسے دے کر، اپنا گھر چھوڑ رہی ہو۔ اس وقت خیموں میں بند ہو کر آدمی غلام، بیگم، بادشاہ کرتا رہے۔ کس قدر عجیب لگتا ہے۔ کتنی کم ذوقی ہے۔ تاش کھیلتے رہنا۔ پہلگام کی حسین وجمیل وادی کی توہین ہے "

رک کر اس نے لتا کی طرف دیکھا۔

وہ ٹکٹکی باندھے مبہوت سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ وہ شرما گیا۔

"چلئے سیر کرنے چلیں، چندن وادی چلیں گے، آپ کو تو ڈاکٹر نے سیر کرنے کو کہا بھی ہے۔ پہلگام کی یہ ہوا صحت کے لئے بہت اچھی ہے۔"

ہریش اب بیزار ہو گیا تھا۔ اسے جگل کی یہ دو غلی طبیعت سخت ناگوار گزرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہوتا تو وہ چائے، کافی، ہوٹل، سینما کی۔۔ باتیں کرتا اور اب یہاں شاعری کئے جا رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا۔

"ابے بس کر ورڈز ورتھ کے بچے۔"

"ہریش تجھے خود تو کچھ آتا نہیں۔ دوسروں کو بات نہیں کرنے دیتا۔ چلو۔ لتا تیار ہو جاؤ۔ ہم چندن وادی تک ہو آئیں۔

"میں تو نہیں جاؤں گا" ہریش نے کہا۔

"تیری مرضی" ماں نے کہا۔

اب دوسرے تیسرے دن پکنک کا پروگرام بنایا جاتا۔ ہریش

وہ ماں ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا۔ اسے شاداں کی طرف سے کچھ امید ہو چلی تھی۔ اس کی محنت پھل لا رہی تھی۔ لیکن ابھی وہ اس سے بات نہیں کر سکا تھا۔ لیکن وہ خود بھی جلدی نہیں کرنا چاہتا تھا جنگل مذاق کرتا —————— "میاں یہ پہاڑی لڑکیاں بادل کا ٹکڑا ہوتی ہیں۔ جھک گئیں تو کھل کر برس گئیں۔ ورنہ اتنی اونچائی سے گذر جاتی ہیں کہ بس دیکھتے رہ جاؤ۔"

ہریش مسکرا دیتا، کوئی جواب نہ دیتا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس بادل کے ٹکڑے کو جھکا لے گا اور نہا لے گا۔ اس نے جنگل کے مذاق پر ایک شام کہا: "تم نرے احمق ہو۔"

"جی ہاں، دنیا یہی سمجھتی ہے۔"

"مجھے اب وہ روز ملتی ہے۔"

"بات بھی ہوتی؟"

"آنکھوں سے۔"

"خوب!"

"دیکھتے جاؤ۔"

"یہ فانی بدایونی والا دیکھتے جاؤ تو نہیں۔ کہ بس دیکھتے ہی جاؤ۔"

ہریش نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

ہریش نے شاداں کو مندر سے اوپر جانے والی سڑک پر روز صبح آتے جاتے دیکھ لیا تھا وہ اوپر انگریز عورت کے خیمے میں انڈے پہنچاتی تھی۔ ہریش اب صبح جلدی اٹھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ شاداں کو دیکھ کر وہ مسکرا دیتا پہلے تو وہ گھبرا گئی۔ لیکن پھر اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آنے لگی اور وہی مسکراہٹ اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں بس جاتی۔ پھر جیسے اس کا تمام بدن مسکرانے لگتا، اور قدم بے قابو ہونے لگتے، جیسے نشہ میں ہو ——————

ہریش کا دل بڑھ گیا اور اس نے ایک صبح بات کر ہی لی۔

"کیا بیچتی ہو؟"

"انڈے۔"

"ہمارے خیمے میں بھی پہنچا دیا کرو۔"

"جی اچھا۔"

باتیں کرتا ہوا ہریش اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ اسے اپنے خیمہ کا صحیح ٹھکانہ سمجھا کر وہ لوٹ آیا۔ اس دن وہ بے حد خوش تھا۔ جنگل کو خبر سنائی، رات کو وہ سو بھی نہ سکا۔ ایسا لگتا جیسے شاداں خیمے میں آ گئی ہو وہ مسکرا رہی ہے، شرما رہی ہے، پھر تمام خیمہ بھینی بھینی خوشبو سے بھر گیا۔ وہ مسکراہٹ ہر طرف پھیل گئی۔ ہر ذرہ مسکرانے لگا۔ صبح وہ جلدی اٹھ بیٹھا اور کوٹ پہن کر باہر آ گیا نیلے آسمان پر ستارے ڈوب رہے تھے۔ اور چیل کے جنگل میں جنگلی مرغ، اور چکور بول رہے تھے۔ دریا اپنے متواتر شور سے فضا میں جھانجن سی بجا رہا تھا۔ کچھ دیر کھڑا وہ صبح کی تازہ ہوا سے اپنے پھیپھڑے بھرتا رہا۔ پھر شاداں کے گھر کی طرف چل دیا۔ دور سے کوئی آ رہا تھا ہلکی ہلکی دھندلی چادر میں لپٹا ہوا کوئی اس کی طرف بڑھ رہا تھا پھر اسے شاداں کا ہرا دوپٹہ نظر آیا اور اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ شاداں کے قریب جا پہنچا اسے دیکھ کر شاداں حیران سی رہ گئی۔

"میں نے سوچا کہیں تمہیں خیمہ تلاش کرنے میں تکلیف نہ ہو"

ہریش نے کہا۔

وہ خاموش رہی۔

دودھیا دھند میں شاداں کے گلابی ہونٹ، نیم وا سے ہونٹ اس گلاب کی طرح لگ رہے تھے۔ جیسے کانچ کے بھیگے ٹکڑے میں سے دیکھا جائے سفید موتیوں سے دانت، چنبیلی اور موتیے کی ہلکی زرد کلیوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ آنکھیں جیسے نیلی نیلی جھیلوں پر کہرا چھایا ہو۔ ہریش اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ اس کے اور بھی قریب ہو گیا۔ پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ خیمے کی طرف چلے آئے۔ ہریش نے باتیں کرنا چاہیں لیکن وہ "ہوں ہاں" سے آگے نہ بڑھی

صبح کی ہلکی ہلکی دھند اب ان دونوں کو اکٹھا دیکھتی۔ ایک دن ہریش نے جنگل کو لپٹ کر کہا: "ملاقات ہو گئی!"

"کب؟"

"آج"

"کہاں؟"

"یہ کل بتائیں گے۔"

جنگل مسکرا دیا۔

کھانے کے بعد ہریش تیار ہونے لگا۔ منہ ہاتھ دھو یا تنگی پوری

کی قمیص نکالی۔ دیکھا تو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ تیزی سے دوسرے خیمے میں ماں کے پاس پہنچا ——— "ماں! لتا کہاں ہے؟"

"کسی سہیلی سے ملنے گئی ہے۔ شام تک آنے کو کہہ گئی ہے ——— کیوں؟"

"اچھا تو یہ بٹن لگا دو" وہ بولا، "ذرا جلدی کرو" اور بے چینی سے خیمے میں ٹہلنے لگا۔ "لگ گئے" اس نے رک کر پوچھا۔

"یہ تم دونوں بہن بھائیوں کو اتنی جلدی کیا لگی رہتی ہے۔ جو آتا ہے کہ جلدی کرو۔ ابھی وہ گئی ہے تو نوکر پر برس کر، میرا کوٹ پریس کر دو ——— بھاگتا جا اور دوڑتا آ ——— نہ جانے کیوں تم لوگ اتنی جلدی مچاتے ہو ——— لو لگ گئے بٹن۔"

قمیص لے کر وہ تیزی سے اپنے خیمے میں پہنچا۔ کپڑے بدلے گالوں پر کریم ملی۔ بالوں کو بال کریم سے چمکایا۔ رومال پر عطر چھڑکا جوتا رگڑ رگڑ کر چمکایا اور کندھے پر کیمرہ لٹکا کر منزل مقصود کی طرف چل دیا۔ ہر بار گھڑی دیکھ کر وہ رفتار تیز کر دیتا ——— شاداں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ اس کی تصویر لے گا۔ بہت سے پوز اور شہر جا کر دوستوں کو دکھائے گا، اور انہیں یہ داستان عشق سنا کر جلائے گا۔

منزل مقصود پر پہنچ کر اس نے دیکھا۔ شاداں اس کا انتظار کر رہی تھی وہ ایک چیل کے تنے کا سہارا لئے بیٹھی شاید اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب جا پہنچا ——— شاداں مسکرائی۔ وہ بھی مسکرایا۔ چیل کا جنگل مسکرایا۔ اور اس نے شاداں کو اپنی بے قرار باہوں میں بھر لیا ——— شاداں اس طرح ان میں آگری، جیسے راستے میں اس نے کٹتے ہوئے درختوں کو گرتے دیکھا تھا۔

کسی کے قریب ہی چلنے کی چاپ سنائی دی۔ شاداں چونک پڑی "کوئی آ رہا ہے۔"

"ڈرو نہیں"

"میرا بھائی بڑا ظالم ہے۔"

"اسے ہماری محبت پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔"

"پھر بھی۔"

"میں اسے سمجھا دوں گا۔"

آواز اور بھی قریب آگئی۔ ایک نہیں دو آدمی چل رہے تھے۔

"نہ جانے کون ہیں؟" شاداں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

کوئی جوڑا ہے۔ ہماری طرح ان محبت بھری گھڑیوں کو دلوں کی دھڑکنوں میں بسا رہا ہے تاکہ وہ اس کی زندگی کا سہارا بن سکیں۔

وہ مسکرا دی۔

"مسکراؤ، بہار آجائے گی۔"

وہ شرما گئی۔

"شرماؤ تاکہ فضا تم سے کچھ سیکھ سکے۔"

اس نے ہریش کے سینے میں سر چھپا لیا۔

وہ جوڑا اب ان کی طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ ہریش نے پہچاننے کی کوشش کی۔ "جنگل تھا اس نے شادی والی لڑکی کو اپنی باہوں میں بھر لیا اور ہریش تڑپ کر رہ گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا: "لتا" اور شاداں کو ایک طرف دھکیل کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

شاداں گھبرا گئی۔

ہریش کی آنکھیں غصے سے جل رہی تھیں۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔

جنگل اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

لتا گھبرا گئی۔

"بدمعاش" ہریش چیخا۔ "دوست کے ساتھ دھوکا!"

وہ جنگل پر جھپٹا۔

"بکو مت" جنگل نے پیچھے ہٹ کر کہا۔

"میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ حرامزادے۔ تم انسان نہیں ہو۔ جانور ہو۔"

"اور تم؟"

ہریش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کود کر جنگل سے لپٹ گیا۔ اور وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

(بشکریہ "الحمرا")

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر تحریر کرنا نہ بھولیے (مینیجر)

طنز و مزاح ————

بے پَرکی...![1]

———— فروغ احمد بی اے (علیگ)

تحقیق کہ ایسی غلطی میں ہرگز نہ کروں گا کہ جناب حسین شہید سہروردی
طرح میں بھی اللہ تعالیٰ پر صلوٰۃ اور سلام بھیجنا شروع کردوں (موصوف
مشرقی پاکستان میں ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے "اللہ" کے ساتھ "صلی اللہ
علیہ وسلم" کا استعمال کیا) البتہ وہ بے نیاز تمام تعریفوں کے لائق ہے بلکہ
سچ تو یہ ہے، تمام تعریفیں اسی کے لئے ہیں۔ ہاں صلوٰۃ اور سلام ہم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجتے ہیں ———— کہ حق تعالیٰ نے ہمیں
آپ کی اُمّت میں پیدا کیا اور رمضان المبارک کی برکات اور عید
کی سوئیوں اور معانقوں کی سچی مسرت عطا فرمائی۔ یہ عاجز و ناتواں حیران
ہے کہ اپنے رب کی قدرتِ کاملہ بے پناہ ہے اور بندہ قدرت کے جلوؤں
کو اپنی صرف دو آنکھوں سے کہاں تک دیکھے ؎

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

لَمّا بعد! قبل اس کے کہ میں کچھ مضمون بیان کروں، یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی تقریر بشکل تحریر پیش کرنی مناسب تصوّر کی ہے کہ آج کل بڑے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ویسے میرے متعلق سامعین یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں "بڑا آدمی" ہوں....... خدانخواستہ حاشا وکلّا۔ بندے میں لاکھ بشری کمزوریاں سہی لیکن کم از کم "بڑا آدمی" بننے کا روگ مجھ میں نہیں ہے۔ ویسے ایک بڑی کمزوری میری یہ ہے کہ میں اپنی تقریر بھول جاتا ہوں، کیونکہ اکثر رٹی ہوئی ہوتی ہے۔ لہٰذا آج کہ موقع نہایت مبارک ہے۔ میں نے اسے مناسب نہیں جانا کہ تقریر کرتے کرتے بھول جاؤں کہ کیا کہنا تھا، لہٰذا یہ تقریر لکھ لی کہ سند رہے اور کام آئے۔

میری اس تقریر کا موضوع میرے رفقاء باتمکین نے انگریزی میں یہ قرار دیا ہے :-

"Something of everything and ultimetly nothing."

یہ عجیب بات ہے کہ موضوع انگریزی ہے اور تقریر اردو ہے لیکن اس سلسلہ میں بندہ عرض پرداز ہے کہ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اب کہ زمانہ ترقی کا ہے۔ ترقی کی ایک اہم شناخت یہ ہے کہ آدمی بات شروع کرے تو انگریزی سے، اور اپنی بات کو وزنی بنائے تو انگریزی سے اور جہاں اور کوئی نسخہ کارگر نہ ہو وہاں اپنی زبان کے سیدھے سادھے الفاظ کی جگہ انگریزی کے الفاظ اور اصطلاحات سے اپنے استدلال کو مضبوط بنائے۔ تاکہ معلوم ہو کہ سوچا انگریزی میں گیا ہے اور بدرجہ مجبوری اُردو بولنی پڑی ہے۔ قصّہ مختصر ———— خلاصہ کلام یہ کہ مجھے ہر شے کے متعلق کچھ نہ کچھ عرض کرنے کے لئے کہا گیا ہے تاکہ سوّیاں کھا کھا کر سوّیوں کی مٹھاس سے طبیعت جو اکتا چکی ہے اس میں کچھ شوریت پیدا ہو سکے میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ "یا آں شور اشوری یا ایں بے نمکی" ———— میں شور و غل اور شورائیت کے فرق کو بھی سمجھتا ہوں۔ حالانکہ اچھے اچھے اصحاب باتمکین شور و غل اور شورائیت میں کوئی خاص فرق تسلیم نہیں کرتے شعراء کرام کی بات اور ہے کہ مہذّب شور و غل کو شعر و سخن سے تعبیر کرتے ہیں اور تعبیر کرنا اپنا فرض جانتے ہیں کیونکہ مشاعروں میں "ٹھٹ" لگنے لگے ہیں اور لوگ بھانت بھانت کے شاعر دیکھنے جاتے ہیں اور ذوقِ سخن کی سیری سے زیادہ انہیں اس کی فکر ہوتی ہے کہ ان کے پیسے کا حق ادا ہو۔ لہٰذا شعراء جو اب ماشاء اللہ جمہوریت پسند ہو چکے ہیں اور محض رؤسا کو خوش کرنے کی بجائے عوام کو خوش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں بول کر عوام کو خوش کرتے ہیں اور ان کے پیسوں کا حق ادا کرتے ہیں۔

---

[1] ایک تقریر جو عید الفطر کے موقع پر مقامی رفقا کی ایک غیر رسمی بزمِ محفل میں کی گئی۔

کیا خوب شعر یاد آیا جو بالکل بے موقعہ ہے چونکہ یاد آگیا ہے، اور زیبِ سخن کے لئے بیچ بیچ ہی شعر پڑھنا ایک اچھی بات ہے لہٰذا عرض ہے کہ ؎

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائینگے

کہتے ہیں کہ آغا حشر کاشمیری کا یہ شعر ہے، ہو سکتا ہے کہ اسی کا شعر ہو لیکن اگر یہ شعر اسی کا ہے اور زیادہ قرینہ شاید اسی کا ہے کہ یہ اسکا شعر ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھا ڈرامہ نویس تھا۔ حالانکہ یہ بات یوں ہی ثابت شدہ ہے کہ وہ ایک ڈرامہ نویس تھا بلکہ اچھا ڈرامہ نویس تھا۔ ڈرامہ نویس اور اچھے ڈرامہ نویس میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر محض ڈرامہ نویس ہوتا ہے اور ثانی الذکر بقول T.S. Eliot یا Herbert Spencer کے نہ صرف ایک ڈرامہ نویس ہوتا ہے بلکہ اچھا ڈرامہ نویس ہوتا ہے۔ جیسا کہ ذیل میں Benjamin Franklin یا غالباً Abraham Lincoln مجھے ٹھیک یاد نہیں ہو سکتا ہے کہ David Hume Copernicus کا یہ قول ہو کہ

"In small states, the watchfulness of society penetrates into every part, and the spirit of improvement enters into the smallest details."

اس اقتباس میں "Smallest details" کے فقرہ سے معاً ذہن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول کی طرف جاتا ہے کہ "الانسان عالم الاصغر" ممکن ہے اس عربی کے قول کو نقل کرنے میں مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو کیونکہ میں عربی سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان ایک چھوٹی سی کائنات ہے، اسی کو "Micro-Cosmos" کہا گیا ہے۔ میرا مقصد اس اقتباس سے یہ ثابت کرنا تھا کہ سوسائٹی کی خصوصیات اس سوسائٹی کے ہر مثالی فرد کے اندر سرایت ہوتی رہیں یعنی ایک سوسائٹی کا مثالی فرد اگر چاہے تو اس سوسائٹی کی پوری عکاسی اپنے فن کے ذریعہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ آغا حشر کاشمیری چونکہ اپنی سوسائٹی کا ایک مثالی فرد تھا اس لئے اس نے اس کی اچھی عکاسی کی اور یہی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے، اس حقیقت کی سند ہمیں واقعہ سے بھی ملتی ہے۔ ایک مغربی مفکر یا شاید ادیب یا ماہرِ سیاست کے قول سے بھی ملتی ہے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول سے بھی ملتی ہے البتہ بحث اس سے ہو سکتی ہے کہ آیا آغا حشر اپنی سوسائٹی کا ایک مثالی فرد تھا یا نہیں تھا۔ ملا کہتا ہے کہ وہ شرابی تھا لیکن مُلا بھول جاتا ہے کہ یہ اشعار اسی رند کے ہیں ؎

رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا

یہ شعر اسی مناجات سے ماخوذ ہے جس کا ایک مشہور شعر یہ ہے ؎

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو، ہٹ جاؤ، دیدو راہ جانے کیلئے

اللہ اللہ کیا جذبات ہیں، میں تو کہتا ہوں کہ وہ بخش دیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرات! میں یہ عرض کرنا بھول گیا تھا کہ میری تقریر کے عنوان میں ایک ظاہری مغالطہ پایا جاتا ہے اور وہ مغالطہ خاص طور پر ان لوگوں کے لئے باعثِ خلجان ہے۔ جو ہر وقت ریاضی کے چکر میں رہتے ہیں۔ موضوع ہے:

"Something of everything and ultimately nothing."

اس کو اگر ریاضی کی قدروں یعنی Values کی شکل میں تبدیل کیا جائے تو یوں گا د

اگر Something = S
اور Everything = E
اور Nothing = 0

$$\frac{E}{S} = 0$$

یعنی E کو S پر تقسیم کیا جائے تو حاصلِ تقسیم صفر آئے اور یہ ممکن نہیں الا یہ کہ خود S = 0 ہو۔

یعنی Something = Nothing

یہ ہے ریاضی کے حساب سے وہ مغالطہ جو مجھ عاجز کو میرے

مخلص رفقاء نے بدنیتی سے نہیں بلکہ محض اخلاص کی بنا پر دیا ہے۔ یعنی مجھ سے کہا گیا ہے کہ تم سب کچھ کہو یعنی کچھ نہ کہو۔ بھلا آپ ہی بتائیں کہ یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ آدمی سب کچھ کہے اور پھر بھی کچھ نہ کہے۔

لیکن وہ جو فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ سوءِ ظن سے کام لو تو میرا یہ فرض ہے کہ میں اپنے رفقائے محترم کو محض اخلاص سراپا قرار دے کر رہ جاؤں بلکہ مجھے یہ بھی فرض کرنا چاہیئے کہ وہ دانش ور یعنی۔۔۔۔۔ Intelligentia بھی ہیں ؎

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

غرض یہ کہ جو موضوع مجھے ملا ہے اس میں کسی قسم کا مغالطہ ہرگز نہیں ہے۔ حتّٰی کہ ریاضی کے قاعدہ سے بھی کوئی شخص کسی قسم کا منطقی مغالطہ ثابت نہیں کر سکتا۔ واہ یہ بھی عجیب منطق ہے کہ استدلال ہو ریاضی کے قاعدے سے، اور ثابت کیا جائے ایک منطقی مغالطہ، یا رد کیا جائے ایک منطقی نتیجہ۔ گویا منطق نہ ہوئی دو اور دو چار کا حساب ہو گیا۔ بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ ریاضی کے قاعدے سے بھی میرے رفقاء کے متعین کردہ موضوع میں کوئی جھول نہیں نکالا جا سکتا اس کو میں ایک منٹ میں یوں بتا سکتا ہوں۔ ریاضی کے قاعدے سے بھی صفر یا zero بالکل نفی کی قدر نہیں ہے۔ وہ کچھ تو ہے جسے صفر یا zero کہتے ہیں۔ اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو اس کا نام و نشان ہی نہ ہوتا۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ : Something = Nothing
یا Nothing = Something

تو بات ایک ہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کیا پیچیدگی ہے۔ میں خواہ مخواہ موضوع کو پہلے پہل سن کر "گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل" کے اُدھیڑ بن میں پھنس گیا۔

لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ۔ بیچ تقریر میں پھر میں گھوم پھر کر اپنے موضوع کی طرف آ گیا حالانکہ وہ تقریر ہی کیا کہ پرکار کی طرح گھوم پھر کر موضوع پر پہنچ جائے۔

خیر میں آغا حشر کاشمیری کو ایک اچھا ڈرامہ نگار ثابت کر رہا تھا بلکہ کر چکا تھا۔ یہ یاد نہیں رہا کہ اس کی ضرورت کیا تھی اور کہاں سے یہ مضمون پیدا ہوا۔ اگر میں پھر پیچھے کی طرف جاؤں تو وہی خطرہ سامنے ہے کہ موضوع پر پہنچ جاؤں گا جس سے میں بچنا چاہتا ہوں اور آگے بڑھنا چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنا اور بڑھتے ہی رہنا زندگی ہے۔ خواہ سامنے غار یا خندق یا کوئی کھڈ ہو۔ بس آگے بڑھتے رہنا چاہیئے۔۔۔ غاروں اور خندقوں اور کھڈوں کی کیا حیثیت ہے۔ شرط یہ ہے کہ آنکھیں بند ہوں۔ کیونکہ یہ ظاہر بیں آنکھیں ہیں۔ باطن کی آنکھوں کو روشن رکھنا چاہیئے اور آگے بڑھتے رہنا چاہیئے۔ ہزاروں غاروں، خندقوں اور کھڈوں کو پار کرتے ہوئے یا پھر ان میں گرتے پڑتے ہوتے ہم بالآخر معراجِ کمال پر پہنچ جائیں گے۔ کیونکہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ ؎

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

واہ واہ واہ! اقبال نے سائنس کے اس عہد کی پوری تاریخ کو شعر میں سمو دیا ہے۔ اس عہد کو ہم Aviation age کہتے ہیں۔ کچھ لوگ Atomic age بھی کہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پرواز کئے بغیر آخر Atom bomb ایک ملک سے چل کر دوسرے ملک میں کیسے گرے گا۔ لہٰذا یہ دور بہرحال دورِ پرواز ہے، اور طیارہ اس کا بہترین Symbol ہے، جو اقبالؒ کے شاہین یا عقاب کے Symbol سے بھی ملتا جلتا ہے، جس کے بارے میں اس مردِ قلندر نے کہا ہے ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

خواہ شاہیں صفت طیارہ طیارچی کے قابو سے باہر ہو جائے اور کسی اڈہ پر اترنے کی بجائے، مٹر کے کھیت میں سر کے بل، مٹرگشتی شروع کر دے اور اپنی گرمیِ خون سے مشتعل ہو کر ایسا جل اٹھے کہ نہ وہ رہے اور نہ اس کا "کارفرما"۔ یہ "کارفرما" کی اصطلاح غالبؔ کی وضع کردہ ہے۔ غالباً عبدالرحمٰن بجنوری نے یا شاید میرے استاد محترم رشید احمد صدیقی صاحب نے غالبؔ کے مصرع ؎

اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ تیل ہی نہ رہا اب چراغاں کیا ہوگا لیکن اگر

نرات اس بات کو ملحوظ رکھتے کہ غالب بدہ سخنور تھا جو ایک ختم ہوتے
ے عہد اور دوسرے شروع ہوتے ہوئے عہد کی سرحد پر کھڑا تھا
اس کے فن پاروں میں عہدِ جدید یعنی عہدِ پرواز کی جھلک ہے تو
رفرما" کا مطلب طیارچی یا پائلٹ زیادہ صحیح ہوگا۔

معاف کیجئے گا پھر موضوع یاد آگیا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ
مع خراشی کر رہا ہوں اور تقریر کا طول شیطان کی آنت کے طول
مشابہ ہو گیا ہے۔ لاحول ولاقوۃ مجھے اس مقدس تقریب میں
ری تشبیہ دینی چاہیئے تھی۔ طولِ شبِ فراق کہہ لیجئے لیکن خوش
ق سے طولِ شبِ فراق کا دخل مجھے نہیں ہے۔ طولِ روزِ سیاہ کہہ
ا ہوں لیکن بدقسمتی سے یہ ادبی تشبیہ نہیں ہے، اور استادوں کی
کے بغیر ادب میں کوئی اختراع قطعی حرام ہے۔ جیسے مذہب میں جتہاد
ہے۔ واہ واہ، مذہب کا لفظ آتے ہی کیا عمدہ تشبیہ سوجھ گئی جو
ن کے کسی گوشے میں موجود تھی لیکن سوجھ نہیں رہی تھی۔ یعنی
ے دستارِ شیخِ فضیلت مآب۔ لیکن یہ اگر ادب ہے تو دوسری طرف
ادب بھی ہے! لہٰذا اس تشبیہ سے بھی باز آتا ہوں اور کفِ افسوس
ہوں کہ ذہن کام نہیں کرتا۔ البتہ یہ جو میں نے عرض کیا ہے کہ
ب کا نام آتے ہی نعوذ باللہ شیخِ فضیلت مآب کا تصور معاً ذہن میں
تو اس کی حقیقت بیان کر دینی ضروری ہے۔ ایک ماہر نفسیات یعنی
H.G. Wells ——— Psychologist
یا William James امریکہ یا انگلستان میں تھا
نے اپنی کتاب "Varieties of Experimental
Religions (مجھے یاد نہیں کتاب کا نام یہی
یا کچھ اور ہے؟) بہرحال اس کتاب میں لکھا ہے کہ آدمی کا ذہن
تیز و تند دھارے سے مشابہ ہے کہ بس رواں دواں ہے ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کہ آدمی اگر کسی لمحہ میں ایک بات کا یا نکتہ کا تصور بھی کر سکتا ہو تو معاً
رے لمحہ میں خود بخود وہ بات یا وہ نکتہ اچھل کر اس کے پردۂ تخیل
دار ہو جاتا ہے اور اس کو وہ لاشعور کا کرشمہ قرار دیتا ہے۔

میرے ایک دوست جو خیر سے اب لندن سے نفسیات میں پی ایچ
ڈی کی ڈگری لیکر آئے ہیں، ایک دن اپنا ایک مضمون "فیشن اور اسکی
نفسیاتی تعبیر" سے متعلق سنا رہے تھے۔ موصوف نے اسے ترقی پسندی
سے تعبیر کیا تھا اور اس کے ڈانڈے لاشعور سے ملاکر انسان کی فطرت
میں ترقی پسندی ثابت کرنی چاہی تھی۔ میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے
کہا کہ ترقی پسندی اگر لاشعوری کیفیت کا نام ہے تو بے شعوری اور کس
چیز کا نام ہے۔ اس پر ایک تلخ سا قہقہہ رہا۔ معلوم نہیں یہ قہقہہ شعور کا
کرشمہ تھا یا لاشعور کی گہرائیوں سے نکلا تھا۔ کہتے ہیں کہ تمام علوم و فنون
لاشعور کا کرشمہ ہیں لیکن تحریکِ اسلامی کے ملاّ اگر اسی بات کو یوں کہیں
کہ یہ علوم و فنون جن پر انسان کو اتنا ناز ہے کہ وہ وحیٔ الٰہی سے کوئی سروکار
نہیں رکھنا چاہتا، سراسر جاہلیت کی پیداوار ہیں، تو اس پر ہمارے
یہی ماہرین نفسیات ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ ان علوم و فنون کو جاہلیت
کی پیداوار کیوں قرار دیا گیا ع

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا......

جاہلیت اور لاشعور میں آخر فرق کیا ہے۔

قصہ مختصر! اس تقریر پر خواہ چوں چوں کا مربہ کی پھبتی کسی
جائے خواہ اسے معجون مرکب یا اصطلاحِ سیاست میں مخلوط نمائندگی
قرار دیا جائے، جو کچھ عرض کیا مجھے خود یاد نہیں کہ کیا کچھ عرض کیا،
اس لئے کہ بات میں سے بات نکلتی چلی گئی اور اتنی باتوں کو کوئی کہاں تک
یاد رکھے۔ لہٰذا اب صرف یہ دعا ہے کہ ؎

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

(چراغِ راہ)

طنز و مزاح

اُلّو بولنے لگا

اقبال احمد محمودی

انسانی آبادیوں پر میرے گذر کو جب نحوست قرار دیا گیا تو میں نے ویرانوں اور کھنڈروں کا رخ کیا۔ یہ مقامات میرے دل کو بھا گئے۔ میں یہیں رہنے بسنے لگا میری کئی نسلیں اسی ماحول میں پیدا ہوئیں اور مر گئیں لیکن پھر بھی میں نے ان مقامات کو نہ چھوڑا۔ انسانوں کا جب کبھی گذر ان ویرانوں پر سے ہوا وہ یہ کہکر گذر گئے کہ یہ تو وہ مقام ہے جہاں الو بولتے ہیں میں پھر بھی خاموش رہا۔ آج بھی میرا یہی حال ہے۔ اپنے دن کے اوقات تاریخی کھنڈرات، مقابر اور ان ویران مساجد میں گذارتا ہوں جن کے منبر و محراب زبان حال سے مرثیہ خواں ہیں کہ ان کو آباد کرنیوالے اب سینماؤں اور پارکوں میں قیام و رکوع، سجود بجالانے لگے ہیں۔ خصوصاً برگد کے پرانے سایہ دار گھنے درختوں پر میرے دن کے اوقات کا ایک بڑا حصہ بسر ہوتا ہے جب رات کی سیاہی پوری طرح عالم پر چھا جاتی ہے اور مجھے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ مجھے منحوس قرار دینے والے اب میٹھی نیند سو چکے ہیں میں سیر و تفریح کی غرض سے انسانی آبادی کے قریب آتا ہوں میری فطرت چونکہ سنسان پسند ہے اس لئے آبادی میں بھی انہی حصوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں جو زیادہ سنسان ہوتے ہیں میں خاموشی سے حالات کا مطالعہ کرتا ہوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ کس نے کس کو الو بنانے کی کوشش کتنی مرتبہ کی اور وہ اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیاب رہا۔ کسی نے اپنا الو سیدھا کرنے میں کیا کیا جتن کئے کیا کیا پالیسیاں بنائیں؟ جب میری نظریں انفرادی جائزے سے فارغ ہوتی ہیں تو میں اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اجتماعی جائزہ لیتا ہوں انفرادی جائزے کی حاصل شدہ چیزیں ایک اجتماعی صورت میں آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ دنیا کی تمام حکومتیں میری نظروں کے سامنے ہوتی ہیں لیکن میں دنیا کی دو بڑی طاقتوں کا قدرے تفصیلی جائزہ لیتا ہوں سب مجھے دنیا کی یہ دو طاقتیں ہمیشہ

الو بنانے کی فکر میں ہمدردیوں کا ایک جال بچھائے مصروف شکار نظر آتی ہیں اور یہ جال کبھی معاشی امداد کی صورت میں سبز باغ دکھا کر نہ صرف عوام کو بلکہ حکومتوں تک کو الو بناتا رہتا ہے آپ کو میری باتوں پر یقین آئے یا نہ آئے لیکن میری تو یہ بڑی بڑی آنکھیں یہ منظر شب و روز دیکھتی ہیں کہ کئی حکومتیں ان جالوں کے آگے دانستہ الو بن جاتی ہیں اور جب کچھ خیر خواہ انسان ان کے اس ... الوپن پر تنقید کرتے ہیں تو یہ حکومتیں اپنے اس الو پن پر پردہ ڈالنے کے لئے پروپیگنڈہ سے عوام کو الو بنا کر خیر خواہ انسانوں پر نت نئے الزام لگا کر ان پر مقدمہ چلاتی ہیں۔ کبھی ان کو نذر زنداں کر دیا جاتا ہے اور کبھی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور جہاں کوئی قانونی چارہ جوئی کی گنجائش نہیں ہوتی وہاں اکثر سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بندی کر دی جاتی ہے۔ یہ کارروائیاں بڑی طاقتوں کے چشم و ابرو پر ان کے زیر اثر ممالک میں جو کسی نہ کسی حیثیت سے ان طاقتوں سے متاثر ہیں آئے دن ہوتی ہی رہتی ہیں۔ بات سنانے کی تو یہ ہے کہ آج کل میری نمائندگی عالمی سیاسیات میں پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے اب تحفظ امن عامہ کے نام سے ملکوں کو الو بنانے کے کاروبار منظم طور پر انجام پاتے ہیں۔ اس کونسل کا ہر ممبر مسئلہ کو حل کرتے وقت ہمیشہ اپنا الو سیدھا کرنے کی فکر میں اجلاسوں میں ایسے ہی بیٹھتا ہے جیسے پرانے برگد کے درختوں پر مراقبہ میں اکثر میں بیٹھتا ہوں۔ اور جب طبیعت کو کچھ بولنے پر آمادہ پاتا ہوں تو اپنی چیخ سے پورے ویرانے میں فضا پر چھا جاتا ہوں غرضکہ دنیا میں امن کی بحالی کی سب سے بڑی انجمن میں میری زندگی کا حق ادا کرنے والے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ جو ہمیشہ عالمی جنگ کے خطروں کو ٹالتے رہتے ہیں لیکن پھر عالمی جنگ کے امکانات سے ایک خوف و ہراس فضا پر طاری ہو جاتا ہے اور ہر جگہ الو بولنے لگتا ہے میرے لئے کئی ویرانے بغیر

لسی محنت کے فراہم ہونے لگتے ہیں اور میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ اگر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے استعمال پر کبھی یہ انسان اتر آئے تو وہ دن دور نہیں جب کہ اس سرزمین پر الوؤں کا راج ہو جائے۔ اگر دنیا کی باگ ڈور ایسے ہی انسانوں کے ہاتھوں میں رہی تو بس سمجھ لیجئے کہ ہر جگہ الو بولنا شروع ہو جائے گا۔ اور اب آثار اس کا ہی پتہ دے رہے ہیں کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ایک عالمی جنگ کے طفیل یہ آبادی ایک بہت بڑے ویرانے میں تبدیل ہو جائے گی تو اس وقت میں خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔ جو انسان اس وقت پیدا ہوتے ہیں وہ میری اس آواز سے سہم جاتے ہیں اور توہم پرستی کا شکار ہو کر اپنی جان ہلکان کر لیتے ہیں۔ میں پوری شب اسی طرح گذارتا ہوں شب میرے لئے تخت شاہی ہوتا ہے جس پر میں جلوہ افروز ہوتا ہوں۔ اور اپنے نمائندوں سے جو اس دنیا میں میری طرف سے حق نمائندگی ادا کرتا ہے واقف ہوتا ہوں اس اعتبار سے یوں تو راتیں میرے لئے عید ہوتی ہیں لیکن سب میں بڑی عید میری اس دن ہوتی ہے جبکہ یکم اپریل کا دن ہوتا ہے۔ اس دن مجھے حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے مجھے فضاؤں کی بلاسکی سے ایک ایک منٹ کی اطلاع ملتی رہتی ہے کہ آج میرا یوم جو میری صفت خاص کو ظاہر کرتا ہے۔ دنیا کے کس حصہ پر کس پیمانہ کو منایا جا رہا ہے۔ وزراء، ایم۔ ایل اے۔ صحافی۔ پروفیسر، لکچرارس اور طالب علم غرض یہ کہ ہر طبقہ سے کون کس حد تک میری نمائندگی کر رہا ہے عام اندازے کے مطابق جو اعداد و شمار مجھے ملتے ہیں میں ان کو دو درجوں میں منقسم کرتا ہوں۔ ایک درجے میں انسانوں کے نام ہوتے ہیں جو الو بنانے میں اپنی صلاحیتیں صرف کرتے ہیں اور دوسرے درجہ میں ان انسانوں کے نام جو الو بنتے ہیں اور پھر ان دونوں درجوں میں درجہ بندی سے ناموں کا اندراج ہوتا ہے میری خوشی کی اس وقت کوئی انتہا نہیں رہتی جب مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم طبقہ کی جانب سے میری کامل نمائندگی کی گئی۔ میں اس دن بطور خاص اپنے اس یورپی انسان کا شکریہ بجالاتا ہوں جس نے میرے لئے یکم اپریل کی تاریخ مقرر کرکے میری صفات کو زندگی بخشی اب مجھے انسانوں سے کوئی گلہ نہیں چاہے وہ مجھے قیامت تک منحوس قرار دیں۔

میری ایک نسل جو میرے خون سے ہوگی وہ تو کھنڈروں اور ویرانوں میں رہے گی اور میری دوسری صفاتی نسل انسانی آبادیوں میں رہے گی جو علمی سیاسی اور معاشی دائرہ ہائے عمل میں میری صفات کی نمائندگی کرے گی۔

(بشکریہ "دعوت")

بیسٹ نیا کی خبریں ————

ادیبوں کی سرکاری امداد ———— ۵۷-۱۹۵۶ء

(۱) قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے اہل وعیال — مارچ ۱۹۵۶ء میں پانچ ہزار روپے دیے گئے (موقتی گرانٹ)

فنڈ کا قیام

۵۷-۱۹۵۶ء

(۲) بیگم سعادت حسن منٹو ———— موقتی گرانٹ ڈھائی ہزار روپے
دو سو پچاس روپے ماہوار (سو روپے بیوہ کے لئے اور ۱۵۰ روپے بچوں کی تعلیم کے لئے یکم نومبر سنہ ۱۹۵۶ء سے) مجموعی رقم تین ہزار پانچسو روپے۔

(۳) قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے اہل وعیال ———— تین سو روپے ماہوار (بیوہ کے لئے ۵۰ روپے ماہوار اور بچوں کی تعلیم کے لئے ۲۵۰ روپے ماہوار پہلی اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء سے) مجموعی رقم ایک ہزار پانچسو روپے

(۴) ڈاکٹر اعظم کریوی کے اہل وعیال ———— موقتی گرانٹ ڈھائی ہزار روپے
۳۵۰ روپے ماہوار کی گرانٹ (۲۰۰ روپے ماہوار پہلی بیوی اور بچوں کے لئے جو کراچی میں ہیں اور ۱۵۰ روپے ماہوار دوسری بیوی اور بچوں کے لئے جو لاہور میں ہیں) مجموعی رقم ۳۹۰۰ روپے

(۵) استاد بندو خاں کے اہل وعیال ———— موقتی گرانٹ ڈھائی ہزار روپے

۵۷-۱۹۵۶ء کے دوران میں میزان کل ———— ۱۴۴۰۰ روپے

۵۸-۱۹۵۷ء

(۶) مولانا غلام باری کے اہل وعیال ———— موقتی گرانٹ ڈھائی ہزار روپے

(۷) ڈاکٹر اعظم کریوی کے اہل وعیال ———— دوران سال میں ماہانہ امداد ۳۵۰ روپے کل رقم ۴۲۰۰ روپے

(۸) بیگم سعادت حسن منٹو ———— ۵۸-۱۹۵۷ء میں ۲۵۰ روپے ماہوار کی امداد کل رقم ۳۰۰۰ روپے

(۹) قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے اہل وعیال ———— ۵۸-۱۹۵۷ء میں ۳۰۰ روپے ماہوار کی امداد۔ کل رقم ۳۶۰۰ روپے

کبیر داس کا مقبرہ

کبیر کا جو خوبصورت مقبرہ تیار ہوا ہے اس میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ اس مشہور شاعر کے مقصد حیات کا اظہار ہو۔ کبیر کی شاعری میں توحید اور اعلیٰ انسانی اخلاقیات کا گہرا درس ملتا ہے۔ انھوں نے زندگی بھر اس کا پرچار کیا۔ ان کے مقبرہ کے ایک سرے پر مسجد نما گنبد اور دوسرے پر مندر نما کلس بنایا ہے کیونکہ وہ ان دونوں قوموں کی اچھی اور پاکیزہ روایات کے حامل تھے۔ یہ مقبرہ کبیر کے پیغام کی یاد ہمیشہ تازہ رکھے گا۔

بہادر شاہ ظفر کا رقعہ

دہلی کے ایک قدیم مہاجن خاندان کے پاس ..... سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا تحریر کردہ ایک رقعہ موجود ہے جو انھوں نے مئی ۱۸۵۷ء میں مذکورہ خاندان کے جد امجد کو ۳۲۰ روپے قرض لینے پر دیا تھا۔ یہ رقعہ فارسی میں ہے اور اس کا عکس مختلف اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ بہادر شاہ ظفر اس قرض کی ادائیگی نہ کر سکے تھے۔ اس لئے یہ رقعہ ابھی تک اس مہاجن خاندان کے پاس موجود ہے۔ شاہی خاندان کے ایک فرد مرزا خیر الدین نے جو آج کل پاکستان میں ہیں۔ اس رقعہ کے لئے ایک ہزار روپے کی پیش کش کی ہے۔ لیکن یہ خاندان اس رقعہ کو اپنے سے علیحدہ کرنے تیار نہیں ہے

نذر الاسلام کی سالگرہ

کراچی، ۲ر جولائی، امریکی مرکز اطلاعات میں مشرقی پاکستان کے مشہور شاعر نذر الاسلام کی ۵۶ ویں سالگرہ منائی گئی۔ پاکستان بیورو کمیشن کے صدر جناب میزان الرحمٰن نے شاعر کی زندگی کے مختصر حالات پیش کرتے ہوئے بتایا کہ نذر الاسلام کی حقیقی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء سے کراچی میں ہوا۔ جب کہ اٹھارہ سال کے تھے۔ وہ یہاں سے ۴۹ ویں رجمنٹ میں شامل ہو کر اپنے وطن گئے اور وہاں سے کلکتہ چلے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں باغی اور کمال پاشا نامی نظموں سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد وہ انقلابی نظمیں لکھتے رہے اور ۱۹۲۳ء میں بغاوت کے جرم میں انکو ایک سال کی قید کی سزا بھی بھگتنی پڑی۔ ۱۹۲۷ء میں بعض صدموں کی وجہ سے ان کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ میزان الرحمٰن صاحب نے آخر میں کہا کہ نذر الاسلام اپنی شاعری اور موسیقی کی بدولت زندہ رہیں گے

راجہ نرسنگ راج عالی کا انتقال

راجہ نرسنگ راج عالی حیدرآباد کے ایک ممتاز شاعر اور پرانی تہذیب اور وضعداری کے پتلے تھے۔ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ عالی تخلص فرماتے تھے۔ ۲۳ر جون کو ۷۰ سال کی عمر میں موصوف کا انتقال ہو گیا۔ اب ایسے بزرگوں سے جو جگہ خالی ہوتی جاتی ہے اس کے پر ہونے کی کوئی توقع نہیں۔ اب نہ وہ سانچے رہے نہ وہ مٹی۔

ادیبوں کا بین الاقوامی جلسہ

ادیبوں کی بین الاقوامی کانگریس (P. E. N.) کا انتیسواں سالانہ اجلاس اس سال ستمبر کے پہلے ہفتہ میں ٹوکیو میں منعقد ہو رہا ہے جس میں۔ ڈاکٹر محمود حسین، قرۃ العین حیدر اور سید علی احسن پاکستان کی نمائندگی کریں گے۔

اقبال اکیڈمی کو دو کتابیں پیش کی گئیں

کراچی۔ یکم اگست۔ علامہ اقبال کے کلام کے دو مجلد مجموعے "مسافر" اور "ضرب کلیم" بریگیڈیر حامد حسین افسر تقریبات وزارت امور خارجہ حکومت پاکستان نے اقبال اکیڈمی کو پیش کئے ہیں۔ ان کتابوں پر علامہ اقبال کے دستخط ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں پہلی بار شائع ہونے پر یہ مجموعے بریگیڈیر حامد حسین کے خسر نواب ذو القدر جنگ بہادر (حیدر آباد دکن) کو پیش کئے گئے تھے

(کتابی دنیا)

"مشیر" کا اسلامی ادب نمبر

میری نظر میں

سبط فاروق فریدی

موجودہ اسلامی ادب کا مستقبل یقیناً روشن ہے کیونکہ اس کے پیچھے خلوص، صداقتِ نفس ہے، تفکر ہے تحقیق و تدقیق ہے۔ "پوت کے پیر پالنے میں" مشہور ضرب المثل ہے، اس ادبی تحریک کے تجرباتی نمونے ترقی پذیری کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ یہ دیگر مختلف جرائد کے علاوہ اسلامی تعمیری ادب کے ڈائجسٹ "مشیر" کی شکل میں منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ماہنامہ شیر کراچی نے اپنے اسلامی ادب نمبر میں اسلامی یا اخلاقی فکر کی نمائندہ تحریریں پیش کر کے ایک ستھرے ذوق اور تازہ ادبی نکھار کا خوش سلیقہ نہ پیش کیا ہے۔ حصۂ نظم میں ذرا فیاضی سے کام لیا ہے، انتخاب کلام اکثر جگہ مجاز و رومان کی غمازی کرتا ہے شاید یہ فنی پہلو پیش نظر ہو۔ فن اور مجاز لازم و ملزوم تو نہیں نئے اور پرانے شعراء سب نے جگہ پائی ہے۔ بہرحال مجموعی تاثر اسلامی، اخلاقی اور تعمیری ہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"۔ فکر انگیز حصہ ظاہر ہے حصۂ مقالات ہے، "درحِ اقبال" سے اقتباس کی زیادہ ضرورت نہ تھی اس کے بغیر بھی پرچہ نمائندہ رہتا، اقتباس اگر وہ تلخیص نہ ہو تو مضمون کی صورت میں ناموزوں ہی رہتا ہے! "اسلامی ادب" ضرورت ذرا ڈھیلا مضمون ہے کسی ایسے اچھے مقالہ کو یہاں جگہ دی جا سکتی تھی جو چھپنے سے رہ گیا ہو۔ شاید مضمون کا اختصار جاذبِ نظر نہ ہو، تجرباتیت پسندی اچھی چیز ہے حسن عسکری اس کے شیدا بلکہ یوں کہئے مبلغ ہیں۔ آدمیت ان کی نگاہ میں مرکب ہے نشاط و الم سے اس لئے ان کی رائے میں اسے انسانیت پر فوقیت حاصل ہے، خیال کی تنوع پسندی یا جدت پسندی قابلِ داد ہے! نظر زندگی کے توازن پر ہے اور توازن کے لئے مثبت اور منفی یا متضاد عناصر کا وجود ضروری ہے، مگر توازن حیات خود نفسِ مطمئنہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور تمام تجزیہ میں مسرت ہی زندگی کی منزل ہے، ابدی ہو یا مادی۔ مقالہ کے آخر میں اسلام کا تذکرہ جس انداز پر کیا ہے وہ کچھ اوپری اوپری معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ایک ایسا احساس پیدا ہوا یہی کیا کم ہے تجرباتیت کو محض observation مشاہدہ تک محدود کرنا کچھ غیر متوازن یا یک جانبہ اور یک نگاہ معلوم ہوتا ہے "آرٹ اور اسلام" پرانی تقابلی ڈگر پر ہے مگر فنی تحقیق کا اچھا نمونہ ہے "اکبر کا مذہبی تصور" تشنہ ہے اور سطحیت سے بڑا نہیں۔ نجات اللہ صدیقی کے سنجیدہ مقالے "اسلام اور فنونِ لطیفہ" نے دقتِ نظر سے بڑھ کر موشگافی اور غیر ضروری تفصیل کا رنگ کہیں کہیں اختیار کر لیا ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ استنباطی اور استقرائی طرزِ منطق کو قریب قریب ہم وزن کر دیا جاتا۔ ذہن میں چند مفروضے قائم کر کے تعمیرِ استدلال کچھ زیادہ محکم نہیں ہوتی۔ اسی لئے اقداری تجزیہ کچھ تصور پسندانہ ہو گیا ہے ویسے فکر کی بلاغت ہر جگہ نمایاں ہے۔ "اقبال پر مارکسی تنقید" میں کہیں کہیں محاربی انداز غالب آ گیا ہے، جیسے کو تیسا جواب۔ بہرحال دلائل کو کسی قدم پر نہیں چھوڑا گیا۔ "اسلامی ادب کی بنیادیں" ایک صاف مضمون ہے۔ ذرا کاوش نظر کی ضرورت تھی ضخامت شاید اس کی متحمل نہ ہوتی۔ نکات زیادہ مختصر انداز میں پیش کئے جا سکتے تھے طوالتِ بیان بالالفاظ کے پھیلاؤ نے تاثر ذرا ہلکا سا کر دیا ہے۔

افسانوی حصہ تحقیقی اور فنی کاوشوں کا سراغ دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی آئینہ ہے ان تمام خوبیوں اور خامیوں کا جو تحریک کے

موجودہ دور کے لوازمات ہیں، نئے چراغ پالش کرنے نئی راہیں دکھانے کی ایک مستحسن سعی ہے یہ دوسری بات ہے کہ موضوع کا رچاؤ کم ہوا افسانے بحیثیت مجموعی معیاری ہی کہے جاسکتے ہیں "البتہ وہ دن آگیا" کچھ پیروڈی معلوم ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ توبۃ النصوح کا انداز پوری طرح نہیں نبھ سکا ہے۔

حمید اللہ صدیقی نے یہ نمبر مرتب کیا ہے اور صفحہ صفحہ سے خوش سلیقگی عیاں ہے۔ سرورق تجریدی آرٹ کا "منظر" معلوم ہوتا ہے طباعت اچھی ہے۔ پرچہ ہر پہلو سے معیاری ہے اور اسلامی تعمیری تحریک کا ایک مصفّا آئینہ ہے کیا اچھا ہوتا کہ Self criticism پر بھی توجہ مبذول ہوجاتی آخر تو Self criticism ترقی کا ضامن ہوا کرتا ہے نفسی جائزے کے بغیر پستی پر بیداری کا یقین ہوتا ہے اور کبھی پر راستی کا۔ تفکر کی گہرائی ہی صحیح راہیں متعین کیا کرتی ہے۔

• فنون لطیفہ
• فریب نفس
• قرآنی اسلوب اور کردار نگاری

نجات اللہ صدیقی (گورکھپور) کے ایک مکتوب کا خلاصہ

کیا فلم اگر ایک آرٹ ہے تو یہ اضافہ ہوا اور سائنٹفک ترقیوں نے اسے ممکن بنایا۔ مگر اسے ڈرامہ ہی کا بدلا ہوا فارم قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ خود ڈرامہ یا ناٹک در اصل رقص کی ترقی یافتہ تفصیلی شکل سمجھی جائے تو کوئی زیادتی نہ ہوگی .... تاریخی ارتقا کی تحقیق کی جائے تو شاید یہ مسئلہ طے ہو سکے۔

بات در اصل یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ہماری رائے صرف ظن و تخمین کی حیثیت رکھتی ہے۔ صالح انقلاب کے بعد تاریخ خود فیصلہ کرے گی کہ اسلامی سماج کے مزاج کو کیا گوارا ہے اور کیا ناگوار ہے۔ میرے پیش نظر صرف دو باتیں تھیں۔ ان شرعی حدود کا بیان جن کا لحاظ فنکاروں کو رکھنا ہے اور وہ ممکن خطوط جن پہ غالباً آئندہ فنون لطیفہ کا ارتقا ہو گا۔

آپ حضرات کی دعائیں اور فکری تعاون حاصل رہے تو کچھ نہ کچھ کرنے کی توفیق انشاء اللہ ہوتی رہے گی۔ مگر اس سلسلہ میں مجھے، آپ کو ان کو، سب کو مغالطوں اور خود فریبی سے بچنا چاہیئے کہ کیا کچھ تقاضائے ذوق، احباب کی مروت اور فضا کے زیر اثر کیا جاتا ہے اور ہم کس حد تک واقعی اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے اس کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر محنت مشقت برداشت کر کے خالصتہ لوجہ اللہ کرتے ہیں۔ نفس بڑا فریبی ہوتا ہے خاص کر ان لوگوں کا نفس جن کی 'خدمت دین' ان کو شہرت و مقبولیت سے بھی نوازتی ہو۔ ہم سب اسی کشتی میں سوار ہیں لہٰذا تنقید ان میں خود اپنے کو شامل کرتے ہوئے کر رہا ہوں کہ وہی تخلیق اللہ خدا کی نگاہ میں موجب اجر ہو گی جو اپنی پشت پہ تعلق باللہ، تقوے اور تقاضائے تقویٰ کی تکمیل بھی رکھتی ہو۔ باقی سب دنیاداری اور دین فروشی کے حساب میں جائے گا۔

برادر مکرم، رفیق محترم

سلام و تحیات!!

عنایت نامہ ملا، آپ کی عزت افزائی اور ہمت افزائی دونوں کا شکریہ۔ آپ نے جو خیال ظاہر کیا ہے اسے اگر مزید غور و فکر کے بعد مرتب شکل میں مشیر میں پیش کریں تو شاید اس گفتگو میں کچھ اور ساتھی بھی حصہ لے سکیں اور میں مستفید ہو سکوں۔ میں بھی مزید سوچوں گا۔ یہ موضوع کا حق ادا کرنا تو آپ کو معلوم ہے کہ میرا اصل موضوع تو معاشیات ہے ادب صرف مقتضائے طبیعت ہے، وہ بھی کسی حد تک۔ جو لوگ ادب کے سلسلہ میں یکسو ہیں ان پر اس موضوع کا زیادہ حق ہے۔

میں نے یہ رائے کہیں ظاہر نہیں کی کہ فنون لطیفہ کے سارے مروجہ فارم درست اور صالح مواد کے حامل بننے کے لائق ہیں بلکہ رقص کے سلسلہ میں تو صراحتہ لکھا ہے کہ یہ صالح مواد کا حامل بننے کی صلاحیت سے محروم فارم معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات کہ نئے تہذیبی اثرات کے تحت نئے فارم جنم لیتے ہیں۔ یہ بھی جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے لکھی ہے۔ البتہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ زیادہ تر جو عمل ہوا ہے وہ انہی چند فارموں میں ذیلی اصلاحات و ترمیمات کی شکل میں، یا بعض فارم ساقط ہو جانے کی شکل میں ہوا ہے۔ موجودہ فارم ـــ ادب و شعر، موسیقی، تصویر، سنگتراشی رقص و فن تعمیر قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں۔ بہت سے تہذیبی انقلابات ہوئے، مگر انہی فارمس میں نئی نئی شاخیں پھوٹتی رہیں اور پرانی شاخیں مرجھا کر گرتی رہیں۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا بعض فارمس متروک ہوتے رہے بعض زیادہ مقبول ہوتے رہے۔ دو تین ہزار سال کی تاریخ نے بھی ان پر کسی نئے مستقل بالذات فارم کا اضافہ نہیں

ن باتوں کے باوجود آپ کی دعا پر آمین ۔ خدا کی رحمت سے کچھ بھی بعید نہیں۔

قرآنی کردار نگاری کے سلسلہ میں ایک بات تو بہت واضح ہے
ر دہ یہ کہ یہ بہت مقصدی قسم کی ہوتی ہے ۔ فن کار اعلیٰ اور خالق جمال
دا نے جس کردار کو لیا ہے اس کے اس پہلو کو ابھارا ہے جو سیاق و سباق
مناسبت سے اس "سبق" سے مناسبت رکھتا تھا جسے انسانوں
اس کردار کے ذریعہ سکھانا مقصود تھا ۔ جدید حقیقت نگاری فنکاروں
اس سے بہت دور لے جا چکی ہے ۔ وہ بلغم تھوکنے سے لے کر
ھر مارنے تک، ہر حرکت کا احاطہ کرنا چاہتے ہیں ۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے
کردار کی زندگی کے زیر بیان لمحات کو پورا کا پورا منتقل کرنا فن کاری
کمال ہے اس وقت اس حقیقت نگاری کی معقولیت اور افادیت
کوئی رائے نہیں ظاہر کرنی ہے، صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ قرآن
کردار نگاری ایسی نہیں ہوتی ۔

یہی نہیں بلکہ ایک ہی کردار، مختلف سیاق و سباق مختلف
پہلوؤں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے ۔ بعض ایسے کردار جن کو قرآن نے
بار بار لیا ہے ۔ مثلاً شیطان، آدم، مختلف انبیاء، مرد مومن، مرد کافر
اس اصول کی تصدیق کے لئے زیر مطالعہ لائے جا سکتے ہیں ۔

چونکہ قرآن میں بجز سورۂ یوسف کوئی طویل کہانی نہیں ہے
(دوسری نسبتہ طویل کہانی حضرت موسیٰ کی ملتی ہے ۔ مگر وہ ایک پوری
قوم کی کہانی بن گئی ہے ۔ بہر حال سورۂ طٰہٰ وغیرہ پڑھیے) لہٰذا ناول
کے سلسلہ میں اس سے تفصیلی استفادہ مشکل ہے ۔ افسانوں کے لئے نسبتاً
زیادہ نمونے ملیں گے ۔

البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ ان قصص کے اسلوب میں بڑی
راہنمائی ہے لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان قصوں
کے اسلوب میں اس وقت کی عرب قوم کی روایات اور مزاج کو زیادہ
ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ لہٰذا اپنے دور کے مزاج و روایات کو سامنے رکھتے
ہوئے خود سوچنے اور تجربے کرنے کی ضرورت ہے +

(بنام ابوالخطیب کراچی ، مورخہ ۱۷ جولائی ۵۷ء)

تذکرے اور تبصرے

نگارشات

مرتبہ: اختر انصاری اکبرآبادی
صفحات: ۱۷۸ - قیمت دو روپے آٹھ آنے
ناشر: حلقہ ارباب فکر، پوسٹ بکس ۸۵، حیدرآباد، (پاک)

"نگارشات" مرکز اردو ادب حیدرآباد کی پیش کش ہے، یہ چند ادبی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جسے اختر انصاری اکبرآبادی نے مرتب کیا ہے۔ ان مقالات کا عام معیار اوسط درجے کا ہے۔ تاہم چند مقالات مثلاً ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا مقالہ "حالی کی اردو غزل" اور پروفیسر ارشد کاکوی کا مقالہ "شیفتہ کی اردو شاعری" کافی محنت سے لکھے ہوئے ہیں مقالات کے موضوعات میں اگرچہ کافی تنوع ہے تاہم نظریاتی نقطۂ نظر سے ان مقالات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ ایک طرف اگر پروفیسر عظیم عباسی کا مقالہ اقبال اور جواب شکوہ اسلامی رجحانات رکھتا ہے تو دوسری طرف "شعرستان اور منٹو کا سیاسی شعور" ترقی پسندانہ رجحانات کے آئینہ دار ہیں سندھی ادب کو اردو داں طبقے سے متعارف کرانے کے لئے اس مجموعے میں تین مقالات شامل ہیں، جو کافی معلومات افزا ہیں اس مجموعے میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ مثلاً صفحہ ۷ کے حاشیے پر شیفتہ اور غالب دونوں کے اشعار میں مصرعوں کی ترتیب غلط ہے صفحہ ۲۲ پر حالی کے ایک شعر میں اختلاط کی بجائے اختلاف لکھا ہوا ہے جس سے شعر کا مفہوم ہی غارت ہو جاتا ہے اس کے علاوہ کتاب کے سرورق پر اختر انصاری اکبرآبادی کے نام کے ساتھ کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ اس مجموعے کے مرتب ہیں بلکہ بادی النظر میں تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ نگارشات ان ہی کے قلم کی مرہون منت ہیں بحیثیت مجموعی مرکز اردو ادب حیدرآباد کی یہ کوشش حوصلہ افزائی کی مستحق ہے اور دوسرے حلقہ ہائے ادب کو کام کرنے کی راہ سجھاتی ہے۔

(ن - ع)

جریدۂ اہل حدیث (مجاہد نمبر)

مدیر: ابوالوحید عبدالمجید خادم
مقام اشاعت: سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ
سالانہ چندہ: چھ روپے، ششماہی تین روپے آٹھ آنے، فی پرچہ ۴ر

جریدہ اہل حدیث کے اس مجاہد نمبر میں حضرت سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے دیگر ساتھیوں سے متعلق مضامین شامل ہیں، اور ہندوستان میں جماعت اہل حدیث کی دینی خدمات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش اگر تاریخی حقائق کی روشنی میں منصفانہ طور پر ہوتی تو بہتر ہوتا۔ مگر معلوم نہیں کیوں تقریباً ہر مضمون میں غلو اور مبالغہ سے کام لیکر تاریخی حقائق کو مسخ کیا گیا ہے۔ فرنگی راج کے خلاف سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تمام ہندوستانیوں کی مشترکہ اور متحدہ جدوجہد تھی اور اس لڑائی میں ہندوستان کی سب ہی جماعتوں کے لوگ شریک تھے۔ اس تاریخی حقیقت سے آنکھ بند کرکے یہ کہنا کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی صرف جماعت اہل حدیث کا کارنامہ تھا۔ بالکل غلط ہے۔ اس طرح فوجی جدوجہد کو فرقہ وارانہ تنگ نظری کی عینک سے دیکھنا کوئی صحیح بات نہیں۔ پھر یہ دعویٰ بجائے خود مشکوک ہے کہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھی اہل حدیث تھے۔ دنیا جانتی ہے کہ خانوادہ ولی اللہی کے سارے بزرگ حنفی المسلک رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالعزیز دہلوی وغیرہ سب حنفی ہی تھے۔ علاوہ ازیں معرکہ بالاکوٹ کے شہداء کی جنگ براہ راست انگریزوں سے کبھی بھی نہیں ہوئی ان کے مدمقابل سکھ تھے۔ انگریزوں کے خلاف سب سے پہلی جدوجہد ٹیپو سلطان کی تھی نہ کہ سید احمد شہید کی۔

اس طرح کی تاریخی غلطیاں محض جذبات عقیدت کا نتیجہ ہیں اور ان غلطیوں کی وجہ سے زیر نظر پرچہ محض ایک طرح کی قصیدہ خوانی ہو کر رہ گیا ہے

جیسے تاریخی حقائق اور واقعات سے کوئی واسطہ نہیں رہا البتہ کہیں کہیں پر حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کے جذبۂ ایمان و سرفروشی کے واقعات ہمارے لئے سبق آموز ہیں۔

(س ع)

اسلامی نظام

مصنفہ حضرت علامہ تمنا عمادی

شائع کردہ: اسلامک سمپوزیم ڈھاکہ

پیشِ نظر کتاب میں علامہ تمنا عمادی نے ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، ایمان بالآخرت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کے لئے قرآن مجید اور سنت رسول کریم ہی ہر معاملہ میں رہنما ہے۔ علامہ تمنا عمادی صاحب نے مسلمانوں کو اسلامی نظام سیاست و معیشت کی جانب متوجہ کرنا چاہا ہے اور یہ نصیحت کی ہے کہ پاکستانی مسلمان اپنے آپ کو فرنگی ضابطۂ حیات سے محفوظ رکھنے کی فکر کرے اور جلد از جلد ملک میں اسلامی نظام کو عملی شکل میں لے آئے۔ علامہ صاحب نے مختصراً اسلامی نظام کے بنیادی اصولوں کی بھی وضاحت کی ہے اور رائج الوقت سیکولر جمہوریت اور اسلامی جمہوریت کے درمیان جو فرق ہے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کتابت و طباعت کا معیار اچھا خاصہ ہے

قیمت درج نہیں ہے۔

(ع۔ع)

اشتراکیت اور اسلام

مصنفہ: ڈاکٹر محمد صغیر الحسن معصومی ایم اے (ڈھاکہ)
ڈی فل (آکسن)

ناشر: اسلامک سمپوزیم ڈھاکہ

قیمت: درج نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد صغیر الحسن معصومی صاحب نے پیشِ نظر کتابچہ کے ذریعے اشتراکیت پر ایک تنقید کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اسلام ہر اعتبار سے اشتراکیت کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور صحت بخش نظام زندگی ہے

(ع۔ع)

اسلام کی قدریں اور ان کا اشتراکی نظام سے اجمالی تقابل

از ڈاکٹر سید اعجاز حسین جعفری پی، ایچ، ڈی (لندن)

ناشر: اسلامک سمپوزیم ڈھاکہ

جناب ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب نے ان اسلامی اقدار کی وضاحت کی ہے جو عام مسلمان فرقوں میں متفق علیہ ہیں اور ان اقدار کا اشتراکی اقدار سے ایک تقابلی مطالعہ کرکے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی اقدار، اشتراکی اقدار کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور اچھی ہیں۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے توحید، رسالت اور معاد کے عقائد کی تشریح کی ہے اور زندگی میں ان عقائد کی اہمیت و افادیت کو واضح کیا ہے

(ع۔ع)

حسین اور بیداری

مصنفہ: اعجاز خورشید کاشمیری

قیمت: چار آنے

مطبوعہ: یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ۔

حسینی مرثیہ سے متعلق اچھے اشعار کا مجموعہ ہے اس کے علاوہ اعجاز خورشید نے مرثیہ کی تاریخ کو مختصراً بیان کیا ہے جو معلومات افزا ہے پروفیسر مرتضٰے حسین کا تعارف بھی اس مختصر سے کتابچہ میں شامل ہے اس کا انتساب کچھ اس قدر پیچ در پیچ ہے کہ قاری ذہنی جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ شبہ ہوتا ہے کہ شاید مرد مجاہد امام حسینؑ ہیں۔ لیکن ذہن مارکس کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے! اور اس سے مصنف کی ذہنی مرعوبیت کا پتہ چلتا ہے۔ (ع۔ع)

تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے، ورنہ ادارہ تبصرہ سے قاصر رہے گا۔

(مینیجر)

باوقار تنظیم

اعلان ڈرائنگ ماہ اگست ۱۹۵۷ء

ماہ اگست کی ڈرائنگ مورخہ ۱۸ اگست ۵۷ء بروز اتوار حسب معمول ساڑھے تین بجے منعقد ہوئی۔ اس اجلاس کی صدارت جناب صاحبزادہ ضیا احمد صاحب صدیقی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں چھ گروپوں کی ڈرائنگ عمل میں آئی۔ گروپ نمبر ا کی آٹھویں، گروپ نمبر ۲ کی ساتویں، گروپ نمبر ۳ کی چھٹی، گروپ نمبر ۴ کی پانچویں، گروپ نمبر ۵ کی چوتھی، گروپ نمبر ۶ کی پہلی ڈرائنگ ہے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد صاحب صدر نے مقررہ طریقہ کے مطابق حاضرین سے اعداد طلب فرمائے حسب ذیل کامیاب رول نمبر قرار پائے :-

گروپ نمبر	رول نمبر	۱۹۰	جناب مولانا عبدالغفار صاحب سلفی، مدرسہ دارالسلام محمدی مسجد، برنس روڈ، کراچی
گروپ نمبر ۲	رول نمبر	۲۹۸	محمد نصیر الدین صاحب سٹار لکی ہاؤس، نیا بابو پاڑہ، سید پور ضلع رنگپور (مشرقی پاکستان)
گروپ نمبر ۳	رول نمبر	۲۳۰	کشور جہاں صاحبہ - ۳۳-سی بی - سادات کالونی، ڈرگ روڈ، کراچی
گروپ نمبر ۴	رول نمبر	۳۰	کلثوم بی صاحبہ۔ قصبہ بیر ٹھی، لانڈھی، کراچی
گروپ نمبر ۵	رول نمبر	۴۸۰	محمد انصر صدیقی صاحب گوہر بلڈنگ ۲/۲۳ فرسٹ فلور، موسیٰ جی اسٹریٹ، رامسوامی، کراچی
گروپ نمبر ۶	رول نمبر	۲۹۴	محمد ہارون صاحب محلہ خدا آباد، لانڈھی، کراچی

جلسہ صاحب صدر اور حاضرین کے شکریہ کے ساتھ برخاست ہوا۔ ادارہ باوقار تنظیم جناب صاحبزادہ ضیاء احمد صاحب صدیقی کا بیحد شکر گزار ہے کہ انھوں نے اس ڈرائنگ کی صدارت کے فرائض سرانجام فرماکر کارکنان تنظیم کا ہاتھ بٹایا۔

● **ادائیگی رقومات :-**

اس ماہ گروپ نمبر ا، گروپ نمبر ۳، گروپ نمبر ۴، گروپ نمبر ۵، گروپ نمبر ۶ کے کامیاب رول نمبر ۱۹۰، ۲۳۰، ۳۰، ۴۸۰ اور ۲۹۴ بالترتیب چونکہ مقامی ممبر تھے۔ اس لئے ان کامیاب ممبران کی ادائیگی نقد رقم کی صورت میں صدر دفتر سے کردی گئی۔

گروپ نمبر ۲ کے کامیاب رول نمبر ۲۹۸ - محمد نصیر الدین، سید پور کی امدادی رقم، عدم ادائیگی اقساط کی وجہ سے روک لی گئی ہے، اقساط کی وصولی کے بعد ان کو یہ رقم ادا کردی جائے گی۔

ڈرائنگ کے نتائج کا اعلان روزنامہ "انجام" کراچی اور روزنامہ "تسنیم" لاہور میں کردیا گیا۔ بیرونی ایجنٹ حضرات کو فرداً فرداً بذریعہ ڈاک اطلاع بروقت کردی گئی۔

● **اطلاع و ہدایات برائے ممبران تنظیم :-**

(۱) چھٹے گروپ کی دوسری قسط ستمبر ۵۷ء سے واجب الادا ہے اور ۱۵ ستمبر تک اس گروپ کی دوسری اقساط صدر دفتر میں وصول ہو جانی چاہئیں۔ چھٹے گروپ کی پاس بکیں بذریعہ ڈاک روانہ کردی گئی ہیں۔ جن حضرات کو وصول نہ ہوں وہ دفتر کو مطلع کریں۔

(۲) چھٹے گروپ کے ممبران کی فہرست کے متعلق بعض مصلحتوں کی بناء پر طے ہوا تھا کہ شائع نہیں کی جائے گی لیکن اس ضرورت کے پیش نظر کہ لوگ اپنے اپنے رول نمبروں سے آگاہ رہیں اور ان کے ناموں میں کوئی غلطی ہو تو صحت کرا دیں طے کیا گیا ہے کہ فہرست شائع کی جائے لیکن اس میں صرف رول نمبر، نام اور شہر درج ہو تفصیلی پتہ نہ ہو۔

(۳) ممبران کے لئے ضروری ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر بھیجتے وقت اپنے رول نمبر اور گروپ نمبر کا حوالہ ضرور دیں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان نہ رہے۔

(۴) اگر ایجنٹ حضرات ممبران سے بروقت اقساط وصول نہ کریں تو وہ براہ راست بذریعہ منی آرڈر صدر دفتر اقساط بھیج سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ منی آرڈر

سے اصل قسط سے وضع کر سکتے ہیں۔

۶) براہ کرم مراسلت کے وقت حتی الامکان اس کا خیال رکھیے کہ "باوقار تنظیم" اور ماہنامہ "مشیر" کے معاملات کے سلسلہ میں الگ الگ پرچوں پر خطوط لکھئے ایک ہی کاغذ پر دو اداروں کے متعلق تحریر کرنے سے تعمیل کرنے اور ریکارڈ رکھنے میں دقت بھی ہوتی ہے اور تاخیر بھی۔

● ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں :-

۱) ہمیں یہ جان کر بیحد افسوس ہوا ہے کہ ہمارے بعض ایجنٹ حضرات ممبروں سے دو دو تین تین ماہ کی اقساط وصول کر لیتے ہیں مگر ان کی رقوم صدر دفتر میں بروقت روانہ نہیں کرتے۔ جب عدم ادائیگی اقساط کی وجہ سے تین ماہ بعد ممبران کو وارننگ لیٹر لکھا جاتا ہے تو بہت سے ممبر ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اپنی اقساط ایجنٹ کو باقاعدہ ہر ماہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال کمپنی اور ایجنٹ دونوں کے لئے بے اعتمادی کا باعث بن جاتی ہے جو بڑی افسوسناک بات ہے اس لئے ایجنٹ حضرات کو چاہیئے کہ ہر ماہ کی وصول شدہ اقساط کو باقاعدگی کے ساتھ صدر دفتر ارسال کرتے رہا کریں۔ کسی ایجنٹ کا یہ طرز عمل اس کی ایجنسی کی فی الفور منسوخی کا باعث ہو سکتا ہے۔

۲) ایجنٹ حضرات کو لبستہ رہیں اور حسب سابق پُرخلوص جوش و خروش کیساتھ ممبر سازی جاری رکھیں تاکہ آئندہ پروگرام اپنے وقت پر پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے۔

۳) اقساط کی فراہمی میں کوتاہی نہ کریں اور ہر ماہ زیادہ سے زیادہ اقساط فراہم کرنے کی کوشش کریں کیونکہ آئندہ پروگرام کا دارومدار اقساط کی فراہمی پر ہی منحصر ہے۔

۴) ماہ ستمبر ۵۷ء میں چھ گروپوں کی اقساط وصول کرنی ہیں جو ۱۵ ستمبر تک وصول کر لینی چاہئیں۔ جو ممبر دور رہوں انھیں ہدایت کریں کہ وہ اپنی اقساط بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دیا کریں۔ منی آرڈر فیس اصل رقم سے وضع کر لیں۔

۵) بڑی رقومات حتی الوسع بنک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ ڈرافٹ باوقار کمپنی لمیٹڈ کے نام سے ہونا چاہیئے۔

(BAVAQAR COMPANY LIMITED, BUNDER ROAD, KARACHI.)

۶) اپنے حسابات چھپے ہوئے فارموں پر روانہ کریں جو صدر دفتر سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

آئندہ ڈرائنگ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۷ء بروز اتوار حسب معمول منعقد ہوگی۔

اعلان

مندرجہ ذیل کھاتے خالی ہیں۔ جو صاحب سابقہ گروپوں میں کھاتے لینے کے خواہشمند ہوں۔ وہ سابقہ اقساط کی رقوم بھیجکر یہ کھاتے اپنے نام الاٹ کرا سکتے ہیں :-

گروپ نمبر	کھاتہ نمبر	مطلوبہ رقم
۲	۳۲۲	= ۔۔۔۔ ۴۱ روپے ؛ ستمبر ۵۷ء تک
۳	۲۶۳	= ۔۔۔۔ ۳۶ روپے ؛ ستمبر ۵۷ء تک
۳	۴۲۷	= ۔۔۔۔ ۳۶ روپے ؛ ستمبر ۵۷ء تک
۳	۴۹۴	= ۔۔۔۔ ۳۶ روپے ؛ ستمبر ۵۷ء تک
۴	۲۹۴	= ۔۔۔۔ ۳۱ روپے ؛ ستمبر ۵۷ء تک
۴	۲۹۵	= ۔۔۔۔ ۳۱ روپے ؛ ستمبر ۵۷ء تک
۴	۴۳۵	= ۔۔۔۔ ۳۱ روپے ؛ ستمبر ۵۷ء تک

"مینجر"

باوقار تنظیم

باہمی بچت کی پرافٹ شیئرنگ سکیم نمبر۱ کے گروپ نمبر۶ کے ممبران کی فہرست

رول نمبر	نام و شہر	رول نمبر	نام و شہر	رول نمبر	نام و شہر
۱	سید امیر شاہ صاحب کراچی	۳۱	کرم خاتون صاحبہ ملتان	۶۱	ریاض احمد صاحب سکھر
۲	محمد ابوالخیر صاحب گوجرانوالہ	۳۲	ساجدہ سیمی صاحبہ منٹگمری	۶۲	نسیم البتول صاحبہ سکھر
۳	محمد علی صاحب راولپنڈی۔	۳۳	زاہدہ خانم صاحبہ رحیم یار خان	۶۳	سلمیٰ ریاض صاحب سکھر۔
۴	عبدالخالق بھٹی راولپنڈی۔	۳۴	عابدہ خانم صاحبہ رحیم یار خان	۶۴	عبداللطیف صاحب ڈھاکہ
۵	عبدالرزاق صاحب راولپنڈی۔	۳۵	عبدالمجید صاحب لاہور	۶۵	محمد عبدالسعید صاحب ڈھاکہ
۶	کنیز فاطمہ صاحبہ کراچی۔	۳۶	پروین اختر صاحبہ لاہور	۶۶	اجمل خاں صاحب ڈھاکہ۔
۷	محمد اسرائیل صاحب کراچی۔	۳۷	شاہدہ خاتون صاحبہ سکھر	۶۷	تصدق حسین خاں صاحب ڈھاکہ
۸	محمد عبدالشکور صاحب کوٹری	۳۸	محمد یعقوب صاحب نوابشاہ	۶۸	محمد عبدالحی صاحب ٹنڈو آدم۔
۹	محمد سمیع اللہ شریف صاحب سید پور	۳۹	محمد یعقوب صاحب نوابشاہ	۶۹	محمد عارف صاحب جیکب آباد۔
۱۰	عبدالخالق صاحب سید پور	۴۰	محمد عطاء الرحمٰن صاحب سلفی چکوال	۷۰	کوثر یاسمین صاحبہ ضلع سانگھڑ
۱۱	عبدالقیوم صاحب سید پور	۴۱	ملک قربان حسین صاحب بھاولپور	۷۱	ذکاء الدین صاحب ہارون آباد
۱۲	محمد فضل الدین صاحب سید پور	۴۲	ملک قربان حسین صاحب بھاولپور	۷۲	رسول خاں صاحب ہارون آباد
۱۳	عبدالغفور صاحب ڈیرہ غازی خان	۴۳	مستری برغ علی صاحب سبی۔	۷۳	سکینہ بیگم صاحبہ ہارون آباد
۱۴	محمد عبداللہ خاں صاحب ڈیرہ غازیخان	۴۴	امیر بیگ صاحب سبی۔	۷۴	کنیز فاطمہ صاحبہ کراچی۔
۱۵	سید رشید ہاشمی صاحب ہارون آباد	۴۵	بدرالدین صاحب اٹک	۷۵	محمد سعیدالدین صاحب کراچی۔
۱۶	ممتاز احمد صاحب فورٹ عباس	۴۶	عبدالحکیم صاحب اٹک	۷۶	اوصاف محمد فاروقی صاحب کراچی۔
۱۷	اہلیہ رشید ہاشمی صاحب ہارون آباد	۴۷	حفظ الرحمٰن صاحب کراچی۔	۷۷	آصفہ بیگم صاحبہ کراچی۔
۱۸	سید محمد امین صاحب ہارون آباد	۴۸	ثنیذہ بانو صاحبہ کراچی۔	۷۸	آصفہ بیگم صاحبہ کراچی۔
۱۹	شمشاد بیگ صاحب کراچی۔	۴۹	محمد ظفر صاحب کراچی	۷۹	علی مظہر نقوی صاحب کراچی۔
۲۰	عبدالستار خاں صاحب کراچی۔	۵۰	عبدالرحیم خاں سکھر	۸۰	ابرار شاہ صاحب کراچی
۲۱	سومار صاحب کراچی۔	۵۱	عبدالمجید صاحب شکارپور۔	۸۱	محمد انیس صدیقی گوہر صاحب کراچی
۲۲	داؤد صاحب کراچی۔	۵۲	محمد اسحاق صاحب سکھر۔	۸۲	شفیق حسن صاحب کراچی۔
۲۳	مقبول احمد صاحب لاڑکانہ	۵۳	نور محمد صاحب لانڈھی کراچی	۸۳	حسین الدین صاحب کراچی۔
۲۴	محمد اقبال صاحب لاڑکانہ	۵۴	سید میر بادشاہ صاحب مردان۔	۸۴	تشنیم الظفر صاحب کراچی۔
۲۵	ضیاء الاسلام صاحب لاڑکانہ	۵۵	عبدالقیوم صاحب پشاور۔	۸۵	شمیم فاطمہ صاحبہ کراچی
۲۶	احمد ظفر صاحب لاڑکانہ	۵۶	غلام عباس صاحب پشاور	۸۶	تنویر حسن زبیری صاحب کراچی۔
۲۷	عبدالمجید صاحب لاڑکانہ	۵۷	تاج محمد صاحب ضلع ہزارہ	۸۷	صبیحہ جمال زبیری صاحبہ کراچی
۲۸	اللہ بخش صاحب میاں رحیم یار خان	۵۸	محمد بشیر مستری صاحب ضلع ہزارہ۔	۸۸	عبدالقیوم صاحب سکھر۔
۲۹	محمد افضال صاحب رحیم یار خاں۔	۵۹	کوکب کاظم کاظمی صاحبہ سکھر	۸۹	بیگم جمیلہ عبدالجبار صاحبہ سکھر۔
۳۰	فاطمہ جبیں صاحبہ لاہور	۶۰	حبیب الرحمٰن صاحب سکھر	۹۰	عبدالصمد خاں صاحب سکھر۔

رول نمبر	نام و شہر	رول نمبر	نام و شہر	رول نمبر	نام و شہر
۹۱	عبدالرحمٰن صاحب سید پور	۱۲۶	عبدالرحمٰن صاحب سرگودھا۔	۱۶۱	عبدالحفیظ صاحب کراچی۔
۹۲	ثریا بانو صاحبہ رنگپور۔	۱۲۷	مسرت بیگم صاحبہ کراچی۔	۱۶۲	عبدالحفیظ صاحب کراچی۔
۹۳	رضیہ بانو صاحبہ رنگپور۔	۱۲۸	نصرت بیگم صاحبہ کراچی۔	۱۶۳	سیدہ خانم صاحبہ کراچی۔
۹۴	بیگم رضیہ اقبال صاحب بمبئی	۱۲۹	راشدہ بیگم صاحبہ کراچی۔	۱۶۴	نورالمرتضیٰ صاحب کراچی۔
۹۵	عبدالستار خاں صاحب کراچی۔	۱۳۰	محمد یوسف اختر صاحب منوڑہ کراچی	۱۶۵	اقبال جبیں صاحبہ گجرات۔
۹۶	محمد صدیق خاں صاحب کراچی	۱۳۱	غلام بی بی صاحبہ ضلع جھنگ	۱۶۶	خالد انصاری صاحب گجرات۔
۹۷	صغریٰ بیگم صاحبہ کراچی۔	۱۳۲	عبدالرحمٰن صاحب ملیر کراچی	۱۶۷	بیگم ثریا سلیم صاحبہ گجرات۔
۹۸	محمد لشیر تونسوی صاحب ڈیرہ غازیخاں	۱۳۳	امیر اللہ صاحب لانڈھی کراچی	۱۶۸	شاہجہاں صاحبہ کراچی۔
۹۹	عبدالحمید سوہانی کراچی۔	۱۳۴	محمد انور صاحب لانڈھی کراچی	۱۶۹	یاور علی خاں عباسی راولپنڈی۔
۱۰۰	محمد زبیر احمد صاحب پٹنہ	۱۳۵	نورالنساء صاحبہ لانڈھی کراچی	۱۷۰	واحد بخش صاحب کراچی۔
۱۰۱	رفیعن بیگم صاحبہ ڈھاکہ۔	۱۳۶	عبدالرحیم خاں صاحب لانڈھی کراچی	۱۷۱	سید وفادار حیدر صاحب چٹاگانگ۔
۱۰۲	قیوم سعادت خاں صاحب کراچی۔	۱۳۷	محمد یعقوب خاں صاحب لانڈھی کراچی	۱۷۲	سید محمد شمیم اللہ صاحب چٹاگانگ۔
۱۰۳	قیوم سعادت خاں صاحب کراچی	۱۳۸	صالح محمد لانڈھی کراچی	۱۷۳	سید مظفر امام صاحب چٹاگانگ
۱۰۴	قیوم سعادت خاں صاحب کراچی۔	۱۳۹	محمد یوسف صاحب کراچی۔	۱۷۴	سید ظفر امام صاحب چٹاگانگ۔
۱۰۵	سیدہ قمر بانو صاحبہ کراچی	۱۴۰	گل بہار اختر صاحبہ کراچی۔	۱۷۵	نجمہ پروین صاحبہ چٹاگانگ۔
۱۰۶	سید اقبال احمد زیدی کراچی۔	۱۴۱	نثار احمد صدیقی صاحب کراچی۔	۱۷۶	خورشید الزماں خاں صاحب کراچی
۱۰۷	عبداللہ خاں صاحب کراچی۔	۱۴۲	سید محمد انور جیلانی گوجرانوالہ۔	۱۷۷	اصغر علی صاحب کراچی
۱۰۸	صغیرالدین صاحب لانڈھی کراچی	۱۴۳	مختار احمد خاں صاحب کراچی۔	۱۷۸	محفوظ الرحمٰن صاحب کراچی۔
۱۰۹	سلامت اللہ صاحب لانڈھی کراچی	۱۴۴	عابدہ ظفر صاحبہ حیدرآباد سندھ	۱۷۹	نذیر احمد صاحب کراچی۔
۱۱۰	علی محمد صاحب ریڑھی کراچی	۱۴۵	محمد صادق صاحب کراچی۔	۱۸۰	شیخ رجب علی صاحب کراچی۔
۱۱۱	احمد صاحب ریڑھی کراچی	۱۴۶	لاں الحق خاں صاحب کراچی۔	۱۸۱	عبدالستار صاحب کیاڑی کراچی
۱۱۲	قاضی عبدالغنی صاحب لانڈھی کراچی	۱۴۷	عطاء الحق صاحب میانوالی۔	۱۸۲	پروین صالحہ صاحبہ کراچی
۱۱۳	زینب بی صاحبہ لانڈھی کراچی	۱۴۸	محمد صادق صاحب لانڈھی کراچی	۱۸۳	قمرالنساء صاحبہ کراچی
۱۱۴	زہرہ بی صاحبہ لانڈھی کراچی	۱۴۹	گلزار احمد صاحب کراچی۔	۱۸۴	عبدالرشید خاں صاحب کراچی۔
۱۱۵	محمد منیرالدین صاحب کراچی۔	۱۵۰	بیگم گلزار احمد صاحب کراچی۔	۱۸۵	انوری بیگم صاحبہ کراچی۔
۱۱۶	نواب محمد ابراہیم صاحب کراچی	۱۵۱	صلاح الدین صاحب لاہور	۱۸۶	محمد محمود سعید صاحب کراچی۔
۱۱۷	علی مرتضیٰ نقوی صاحب کراچی۔	۱۵۲	غالب سلام قدسی لاہور۔	۱۸۷	ق عبدالجبار خاں صاحب ہزارہ
۱۱۸	احمد حسین صاحب کراچی۔	۱۵۳	محمد اقبال صاحب کراچی	۱۸۸	فیض محمد صاحب بہاولنگر
۱۱۹	سلطان محمد صاحب سکھر۔	۱۵۴	مرزا عبدالرشید بیگ صاحب کورنگی	۱۸۹	عطا محمد صاحب بہاولنگر۔
۱۲۰	محمد یوسف صاحب سکھر	۱۵۵	مرزا عبدالرشید بیگ صاحب کورنگی	۱۹۰	عطا محمد صاحب بہاولنگر۔
۱۲۱	ارشاد محمد صاحب سکھر	۱۵۶	محمد حسین صاحب کراچی۔	۱۹۱	محمد خلیل صاحب کراچی۔
۱۲۲	رحیمہ بائی صاحبہ حیدرآباد۔	۱۵۷	انیس فاطمہ صاحبہ ڈرگ روڈ کراچی	۱۹۲	محمد خلیل صاحب کراچی۔
۱۲۳	ثناء اللہ صاحب حیدرآباد۔	۱۵۸	انیس فاطمہ صاحبہ ڈرگ روڈ کراچی	۱۹۳	زبیدہ بیگم صاحبہ ڈرگ روڈ کراچی
۱۲۴	ثناء اللہ صاحب حیدرآباد۔	۱۵۹	نصرت موسوی صاحبہ ڈرگ روڈ کراچی	۱۹۴	محمد سلیمان صاحب لاہور۔
۱۲۵	عبدالرحمٰن صاحب سرگودھا۔	۱۶۰	نصرت بانو صاحبہ کراچی۔	۱۹۵	محمد صادق صاحب لاہور

رول نمبر	نام اور شہر	رول نمبر	نام اور شہر	رول نمبر	نام اور شہر
۱۹۶	اللہ دتا صاحب ضلع جہلم	۲۳۲	زبیر بن عمر صدیقی صاحب سکھر۔	۲۶۷	رفیع احمد خان صاحب سکھر۔
۱۹۷	شیخ محمد ذکی صاحب کراچی۔	۲۳۳	قربان احمد صاحب سکھر۔	۲۶۸	حکیم سید حسین علی صاحب سکھر۔
۱۹۸	رقیہ بیگم صاحبہ کراچی۔	۲۳۴	بانو بنت عمر صدیقی صاحب سکھر۔	۲۶۹	زوجہ سید حسین علی صاحب سکھر
۱۹۹	ملقیس بیگم صاحبہ کراچی۔	۲۳۵	عقیل احمد صاحب سکھر۔	۲۷۰	یحییٰ یوسف صاحب کراچی
۲۰۰	صغیر انجم صاحبہ کراچی۔	۲۳۶	سید محمد یامین صاحب سکھر	۲۷۱	نور محمد صاحب چینگا ؤں۔
۲۰۱	مسعود حسین صاحب کراچی۔	۲۳۷	پروین یامین صاحبہ سکھر۔	۲۷۲	فضل داد خان صاحب پشاور
۲۰۲	حسینہ بیگم صاحبہ کراچی۔	۲۳۸	سید نور الحسن صاحب رضوی سکھر	۲۷۳	نور حسین صاحب پشاور
۲۰۳	سید عباس رضوی صاحب کراچی	۲۳۹	فرحت جمال بیگم صاحبہ سکھر۔	۲۷۴	محمد ولی اللہ صاحب پشاور
۲۰۴	عارف اسحاق صاحب کراچی۔	۲۴۰	مسرت جمال بیگم صاحبہ سکھر۔	۲۷۵	احمد الدین صاحب پشاور
۲۰۵	اشرف سلطانہ زبیری صاحبہ کراچی	۲۴۱	رحیم بخش صاحب سکھر۔	۲۷۶	محمد بشیر صاحب پشاور
۲۰۶	محمد یعقوب کراچی				
۲۰۷	اہلیہ عبد القدیر صاحب راولپنڈی	۲۴۲	عبد الرشید صاحب لاہوری سکھر	۲۷۷	جہان خان صاحب پشاور
۲۰۸	عبد المجید صاحب راولپنڈی	۲۴۳	اللہ رکھا صاحب سکھر۔	۲۷۸	محمد خان صاحب پشاور۔
۲۰۹	عبد الرشید صاحب راولپنڈی	۲۴۴	سید اکبر حسین صاحب زیدی۔ سکھر۔	۲۷۹	حافظ محمد اکبر صاحب پشاور
۲۱۰	محمد بشیر صاحب راولپنڈی	۲۴۵	سید مظفر شاہ صاحب راولپنڈی	۲۸۰	شائستہ بانو صاحبہ لائلپور۔
۲۱۱	راجہ محمد ایوب صاحب راولپنڈی	۲۴۶	اکرام الحق صاحب سیالکوٹ۔	۲۸۱	رشیدہ خانم صاحبہ لائلپور۔
۲۱۲	محمد حمید الدین صاحب راولپنڈی	۲۴۷	ممتاز علی صاحب سیالکوٹ۔	۲۸۲	چودھری محمد انور خورشید صاحب۔ اوکاڑا
۲۱۳	قاضی محمد صدیق قریشی صاحب راولپنڈی	۲۴۸	عبد الحمید صاحب جیکب آباد	۲۸۳	بشیر احمد صاحب نارووال
۲۱۴	عبد الخالق صاحب راولپنڈی	۲۴۹	نور الدین صدیقی صاحب جیکب آباد	۲۸۴	جناب امداد بخش صاحب ٹنڈو آدم
۲۱۵	شمس الحق صاحب راولپنڈی۔	۲۵۰	مستری محمد ہاشم صاحب جیکب آباد	۲۸۵	صابر علی صاحب ٹنڈو آدم
۲۱۶	چوہدری محمد شریف صاحب راولپنڈی	۲۵۱	مولوی بحر النعم صاحب کراچی۔	۲۸۶	محمد حیات صاحب لانڈھی کراچی
۲۱۷	ملک محمد امیر خان صاحب راولپنڈی	۲۵۲	جمیلہ خاتون صاحبہ ملتان۔	۲۸۷	غلام احمد صاحب لانڈھی۔
۲۱۸	عنایت شاہ صاحب راولپنڈی۔	۲۵۳	حکیم غلام احمد سلیم صاحب جہلم۔	۲۸۸	غلام احمد صاحب لانڈھی۔
۲۱۹	محمد ایوب صاحب راولپنڈی۔	۲۵۴	حکیم غلام احمد سلیم صاحب جہلم۔	۲۸۹	شیخ محی الدین صاحب لانڈھی
۲۲۰	عبد المجید صاحب راولپنڈی۔	۲۵۵	محمد اشرف صاحب ہارون آباد	۲۹۰	عثمان علی صاحب لانڈھی۔
۲۲۱	محمد رفیق صاحب راولپنڈی۔	۲۵۶	محمد اشرف صاحب ہارون آباد	۲۹۱	محمد علی صاحب لانڈھی۔
۲۲۲	مولانا جار اللہ صاحب کراچی۔	۲۵۷	محمد ارشد فاروقی صاحب بہاولنگر	۲۹۲	عبد الستار صاحب لانڈھی۔
۲۲۳	اعظم ہاشمی صاحب کراچی۔	۲۵۸	منور خان صاحب پشاور۔	۲۹۳	شیخ عثمان صاحب لانڈھی۔
۲۲۴	انوری بیگم صاحبہ ملیر کراچی	۲۵۹	عتیق الرحمٰن صاحب ہارون آباد	۲۹۴	محمد ہارون صاحب لانڈھی۔
۲۲۵	محمد بشیر احمد صاحب ملیر کراچی	۲۶۰	حافظ گل محمد صاحب ہارون آباد	۲۹۵	سید نعیم الدین حسن کراچی۔
۲۲۶	محمد عمر صاحب ملیر کراچی	۲۶۱	مقبول احمد صاحب ہارون آباد	۲۹۶	ثاقب احمد صاحب رحیم یار خان
۲۲۷	عبد العزیز صاحب سکھر۔	۲۶۲	سردار بخش صاحب ہارون آباد	۲۹۷	عنایت بیگم صاحبہ رحیم یار خان
۲۲۸	انتظار الاسلام صاحب سکھر۔	۲۶۳	سردار بخش صاحب ہارون آباد	۲۹۸	صالح محمد صاحب ڈیرہ غازیخان
۲۲۹	محمد اقبال صاحب سکھر۔	۲۶۴	بلیغ الرحمٰن صاحب سکھر۔	۲۹۹	میاں گل حسن صاحب ڈیرہ غازی خان
۲۳۰	عبد السلام صاحب سکھر	۲۶۵	محمد احمد جمالی صاحب سکھر۔	۳۰۰	مغفور خان صاحب ہری پور
۲۳۱	حسین الدین صاحب سکھر۔	۲۶۶	رشید احمد جمالی صاحب سکھر۔	۳۰۱	نجمہ شاہین صاحبہ ناروال

رول نمبر	نام اور شہر	رول نمبر	نام اور شہر	رول نمبر	نام اور شہر
۳۰۲	محمد رمضان ایوبی صاحب لاہور	۳۳۷	عبدالعزیز صاحب جہلم۔	۳۷۲	عبدالرؤف خاں صاحب کراچی
۳۰۳	محمد حسن رازقی صاحب سید پور۔	۳۳۸	عبدالرشید قریشی صاحب جہلم۔	۳۷۳	صفیہ اعجاز صاحبہ لاہور۔
۳۰۴	منظور عالم صاحب سید پور	۳۳۹	انیس خاں صاحب سردیا جہلم۔	۳۷۴	خالدہ اوصاف صاحبہ کراچی۔
۳۰۵	محمد اسرافیل صاحب سید پور	۳۴۰	الیس خاں صاحب سرقیا جہلم	۳۷۵	سید رضوان الرحمٰن صاحب کراچی۔
۳۰۶	محمد محفوظ الحق صاحب سید پور	۳۴۱	سید ممتاز علی صاحب سیالکوٹ	۳۷۶	طاہرہ مسعود صاحبہ کراچی۔
۳۰۷	اشفاق احمد کراچی۔	۳۴۲	محمودہ بیگم صاحبہ سیالکوٹ۔	۳۷۷	کوثر صاحبہ کراچی۔
۳۰۸	سید نعیم الدین حسن صاحب کراچی	۳۴۳	شائستہ بیگم صاحبہ سیالکوٹ	۳۷۸	جمیلہ خاتون صاحبہ کراچی۔
۳۰۹	صوفی محمد اکبر خاں صاحب کیمبلپور۔	۳۴۴	عبدالسمیع صاحب کراچی۔	۳۷۹	محمد رفیق صاحب کراچی۔
۳۱۰	دلی محمد صاحب کیمبل پور۔	۳۴۵	خلیق احمد قریشی صاحب کراچی	۳۸۰	جان محمد خاں صاحب راولپنڈی
۳۱۱	عنایت اللہ خاں صاحب لاہور	۳۴۶	انوار احمد قریشی صاحب کراچی۔	۳۸۱	اسحاق حسین صاحب سکھر۔
۳۱۲	محمد اکبر خاں صاحب پشاور	۳۴۷	غوثیہ محمود صاحبہ کراچی۔	۳۸۲	مشتاق علی خاں صاحب سکھر۔
۳۱۳	محمد خالد خاں صاحب مردان	۳۴۸	اللہ رکھی صاحبہ کراچی۔	۳۸۳	مستری شفیع اقبال صاحب سکھر۔
۳۱۴	محمد فاروق خاں صاحب مردان	۳۴۹	زبیدہ خانم صاحبہ کراچی۔	۳۸۴	اشرف حسین خاں صاحب سکھر۔
۳۱۵	ہاجرہ خاتون صاحبہ مردان	۳۵۰	خواجہ گلزار احمد صاحب کراچی۔	۳۸۵	عبدالمجید صاحب سکھر
۳۱۶	اللہ دتا صاحب جہلم	۳۵۱	عمر حیات صاحب میانوالی۔	۳۸۶	عبداللطیف صاحب سکھر۔
۳۱۷	اللہ دتا صاحب جہلم۔	۳۵۲	عمر حیات صاحب میانوالی۔	۳۸۷	محمد احمد صاحب سکھر۔
۳۱۸	سرذل بی بی صاحبہ جہلم۔	۳۵۳	محمد حفیظ صاحب سرگودھا۔	۳۸۸	صوفی شان الٰہی صاحب سکھر۔
۳۱۹	محمد یوسف صاحب جہلم۔	۳۵۴	محمد نذیر صاحب ماڑی پور۔	۳۸۹	نجمہ افضال صاحبہ سکھر۔
۳۲۰	غلام نبی صاحب	۳۵۵	محمد نذیر صاحب ماڑی پور۔	۳۹۰	صالحہ بی بی صاحبہ ہزارہ
۳۲۱	سید علی حسین ہاشمی صاحب شکارپور۔	۳۵۶	ظفر حسین صاحب لائلپور۔	۳۹۱	خالد لطیف صاحب ہزارہ۔
۳۲۲	شکیلہ بیگم صاحبہ شکارپور۔	۳۵۷	سید محمد ودود صاحب چٹاگانگ۔	۳۹۲	رشیدہ بیگم صاحبہ ہزارہ۔
۳۲۳	محمد یوسف قریشی صاحب کراچی۔	۳۵۸	ایس۔ ایم۔ نظام الدین صاحب چٹاگانگ	۳۹۳	ایم۔ ایم۔ احمد صاحب بہاولپور
۳۲۴	یحییٰ لدھانی صاحب نوابشاہ۔	۳۵۹	الطاف فاطمہ صاحبہ چٹاگانگ۔	۳۹۴	سید اطہر سعید صدیقی صاحب لاہور
۳۲۵	سید امین الدین حسینی صاحب نوابشاہ	۳۶۰	محمد نظام الدین صاحب چٹاگانگ	۳۹۵	نور حامدہ صاحبہ لاہور۔
۳۲۶	سید عزیز الحسن صاحب نوابشاہ	۳۶۱	آئی۔ اے۔ زین الحق صاحب چٹاگانگ	۳۹۶	امام الدین صاحب کراچی۔
۳۲۷	اعجاز نبی خاں صاحب کراچی۔	۳۶۲	محمد زاہد حسین صاحب چٹاگانگ	۳۹۷	محمد حسین صاحب کراچی۔
۳۲۸	سید مجیب الرب صاحب کراچی۔	۳۶۳	محمد خاں صاحب لانڈھی کراچی	۳۹۸	چودھری محمد حسین صاحب لانڈھی کراچی
۳۲۹	ثریا خاتون صاحبہ ڈھاکہ	۳۶۴	محمد نسیم خاں صاحب لانڈھی کراچی	۳۹۹	محمد افضال خاں صاحب لانڈھی کراچی۔
۳۳۰	حسین زبیری صاحب ڈھاکہ	۳۶۵	سلمہ بی بی صاحبہ کراچی۔	۴۰۰	خالد معین صاحب کراچی۔
۳۳۱	اکبر النساء صاحبہ کراچی۔	۳۶۶	زرینہ بی بی صاحبہ کراچی۔	۴۰۱	عبدالقیوم صاحب کراچی۔
۳۳۲	محمد ظہیر احمد قریشی صاحب کراچی۔	۳۶۷	سیدہ عارف النساء صاحبہ لانڈھی کراچی	۴۰۲	سید مختار علی صاحب کراچی۔
۳۳۳	محمد اقبال کمبٹی صاحب کراچی۔	۳۶۸	عبدالقیوم ظفر صاحب کراچی۔	۴۰۳	ظہور حسن صاحب کراچی۔
۳۳۴	اقبال حسینی صاحب کراچی۔	۳۶۹	محمد رفیق صاحب کراچی۔	۴۰۴	عبدالواحد صدیقی صاحب کراچی
۳۳۵	شکیلہ فاطمہ صاحبہ کراچی۔	۳۷۰	امجد علی خاں صاحب کراچی	۴۰۵	چودھری امیر احمد خاں صاحب جہلم
۳۳۶	وحیدہ خاتون صاحبہ کراچی	۳۷۱	منور حسین صاحب کراچی	۴۰۶	مولوی محمد قاسم صاحب بگوڑا۔

رول نمبر	نام اور شہر	رول نمبر	نام اور شہر	رول نمبر	نام اور شہر
۴۰۷	مولوی محمد قباد صاحب بگوڑا	۴۳۹	محمد یسین صاحب لائلپور۔	۴۷۱	نرمان علی صاحب کراچی۔
۴۰۸	بی بی اختر النساء صاحبہ کراچی۔	۴۴۰	مسماۃ بی بی زرتین صاحبہ مردان	۴۷۲	خلیل احمد خانصاحب کراچی۔
۴۰۹	حفیظ الرحمٰن صاحب کراچی۔	۴۴۱	عبد المنان صاحب ضلع مردان۔	۴۷۳	صوفی شاہ صاحب کراچی۔
۴۱۰	حافظ سید حسن صاحب کراچی۔	۴۴۲	بی بی فاطمہ صاحبہ مردان۔	۴۷۴	بنی حسین صاحب کراچی۔
۴۱۱	حسن فاروق صاحب کراچی۔	۴۴۳	عبد اللہ تونیہ صاحب نواب شاہ	۴۷۵	شاہدہ بیگم صاحبہ کراچی۔
۴۱۲	محمد عثمان صاحب کراچی۔	۴۴۴	محمد عبد الجبار قریشی صاحب نوابشاہ	۴۷۶	فرزانہ چمن صاحبہ کراچی۔
۴۱۳	کنور خالد اختر خاں صاحب سکھر	۴۴۵	محمد صالح صاحب حیدر آباد۔	۴۷۷	احسان علی صاحب کراچی۔
۴۱۴	محمد عمر صاحب ریڑھی لانڈھی کراچی	۴۴۶	محمد سرور صاحب کراچی۔	۴۷۸	ربیعہ رحمٰن صاحبہ کراچی۔
۴۱۵	اللہ داد خاں صاحب لانڈھی کراچی	۴۴۷	محمد حنیف صاحب کراچی۔	۴۷۹	اسامہ اسمٰعیل مراد صاحب کراچی۔
۴۱۶	فیروز خاں صاحب لانڈھی کراچی	۴۴۸	باز خاں صاحب کراچی۔	۴۸۰	اسامہ اسمٰعیل مراد صاحب کراچی۔
۴۱۷	امیر احمد صاحب لانڈھی کراچی	۴۴۹	حکیم امداد اللہ صاحب کراچی۔	۴۸۱	محمد نذیر صاحب کراچی
۴۱۸	میاں محمد صاحب لاڑکانہ	۴۵۰	حبیب ابوبکر صاحب باجڑہ پور	۴۸۲	شبیر احمد صاحب کراچی۔
۴۱۹	مریم خاتون صاحبہ لاڑکانہ	۴۵۱	عبد الغفار صاحب چلوی کراچی۔	۴۸۳	عزیمہ خانم صاحبہ کراچی۔
۴۱۹	نوراں خاتون صاحبہ لاڑکانہ	۴۵۲	میمونہ بیگم صاحبہ حیدر آباد۔	۴۸۴	رئیس احمد خاں صاحب کراچی۔
۴۲۱	عبد الحکیم صاحب لاڑکانہ	۴۵۳	طاہرہ بیگم صاحبہ حیدر آباد۔	۴۸۵	کشور جہاں صاحبہ ملیر کراچی
۴۲۲	حاجی عبد المجید صاحب لاڑکانہ	۴۵۴	ظفر علی صاحب حیدر آباد	۴۸۶	سعید الدین صاحب ملیر کراچی
۴۲۳	حاجی گلاب خاں صاحب لاڑکانہ	۴۵۵	عبد الغنی بیگ صاحب کراچی۔	۴۸۰	خدا بخش صاحب ڈھاکہ
۴۲۴	نیاز محمد صاحب لاڑکانہ	۴۵۶	منشی تفضل حسین صاحب لائلپور	۴۸۸	سلامت حسین خانصاحب کومیلا مشرقی پاکستان
۴۲۵	کریم بخش صاحب لاڑکانہ	۴۵۷	مس ریحانہ حق صاحبہ کراچی۔	۴۸۹	محمد اکرم صاحب میانوالی۔
۴۲۶	نصر اللہ صاحب لاڑکانہ	۴۵۸	محمد عبد السلام قادری صاحب کراچی۔	۴۹۰	مرتضیٰ بانو صاحبہ کراچی۔
۴۲۷	عبد البصیر صاحب لاڑکانہ	۴۵۹	گل رحیم صاحب ایبٹ آباد	۴۹۱	شہزاد احمد صاحب کراچی۔
۴۲۸	محمد اختر صاحب لاڑکانہ	۴۶۰	گل رحیم صاحب ایبٹ آباد	۴۹۲	عادل کامران صاحب کراچی۔
۴۲۹	ماسٹر قاضی محمد افضل صاحب لاڑکانہ	۴۶۱	ایم۔ اے۔ واسطی صاحب لاہور	۴۹۳	بیگم بدر مسعود صاحب کراچی۔
۴۳۰	عبد القادر صاحب لاڑکانہ	۴۶۲	چوہدری عبد الجبار صاحب لائلپور۔	۴۹۴	مقصود احمد اختر صاحب راولپنڈی
۴۳۱	سیدہ خاتون صاحبہ لاڑکانہ	۴۶۳	عترت نبیل صدیقی صاحب لاہور	۴۹۵	تسنیم الظفر صاحب کراچی۔
۴۳۲	محمد اقبال صاحب لاڑکانہ	۴۶۴	پی۔ یو۔ کٹی صاحب کراچی	۴۹۶	تحسین الظفر صاحب کراچی۔
۴۳۳	علی حیدر صاحب کراچی۔	۴۶۵	محمد عبد الخالق صاحب راجشاہی	۴۹۷	خالدہ انور صاحبہ رحیم یار خاں
۴۳۴	عائشہ خاتون صاحبہ کراچی۔	۴۶۶	مسعود احمد فاروقی صاحب کراچی	۴۹۸	ریحانہ خانم صاحبہ کراچی۔
۴۳۵	عبد المتین صاحب کراچی۔	۴۶۷	محمد ضیاء الدین صاحب واہ کینٹ	۴۹۹	معصوم بی صاحبہ لانڈھی کراچی
۴۳۶	شاہجہاں بیگم صاحبہ کراچی۔	۴۶۸	امت الحفیظ صاحب لائلپور	۵۰۰	ماہر القادری کراچی
۴۳۷	محمد یسین صاحب لائلپور۔	۴۶۹	سروری بیگم صاحبہ لائلپور		
۴۳۸	محمد یسین صاحب لائلپور۔	۴۷۰	خدیجہ سلطانہ راولپنڈی۔		

”بادِقار تنظیم“ سے خط وکتابت کرتے وقت اپنا رول نمبر اور گروپ نمبر تحریر کرنا نہ بھولیں ـــــــ ”مینجر“

رفتارِ کار

باوقار تنظیم، کراچی

۱۹۵۷ء

۸ ماہ کے قلیل عرصہ میں

۳۰ کامیاب رول نمبروں میں

۱۵۰۰۰ روپیہ تقسیم ہو چکا۔

مہینہ	کامیاب رول نمبر
جنوری	۷ (گروپ نمبر ۱)
فروری	۲۶۷، ۴۱۵ (گروپ نمبر ۱)
مارچ	۱۸۹، ۴۷، ۴۷۶ (گروپ نمبر ۳)
اپریل	۴۴۸، ۲۸۱، ۴۸۹، ۸۵ (گروپ نمبر ۴)
مئی	۳۸۷، ۴۵، ۳۷۵، ۱۳۵، ۲۹۹ (گروپ نمبر ۵)
جون	۳۳۶، ۲۶۵، ۲۶۳، ۴۰۷، ۲۵۷
جولائی	۳۸۶، ۱۵، ۴۵۴، ۱۹۶، ۲۷۹
اگست	۱۹۰، ۲۹۸، ۲۳۰، ۳۰، ۴۸۰، ۲۹۴ (گروپ نمبر ۶)

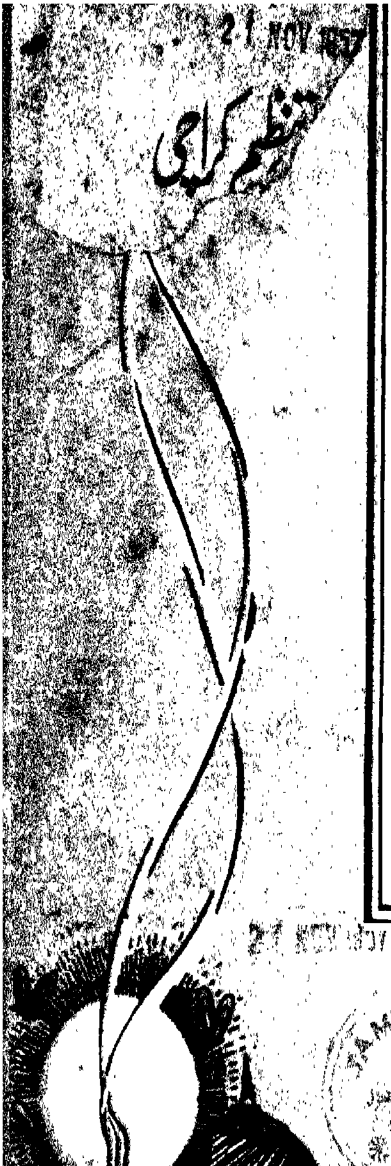
باوقار کمپنی لمیٹڈ، بندر روڈ، کراچی ۱

ٹیلی فون:- 923

Monthly "MUSHIR" Karachi

Mashhoor Press, Karachi.

ماہنامہ مشیر کراچی



پاکیزہ ادب کا ڈائجسٹ

قیمت آٹھ آنے
نومبر ۱۹۵۷ء

THE MUSHIR KARACHI

باوقار تنظیم

اعلان ڈرائنگ ماہ اکتوبر ۱۹۵۷ء

ماہ اکتوبر ۱۹۵۷ء کی ڈرائنگ مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء بروز اتوار حسب معمول تین بجے منعقد ہوئی۔ اس اجلاس کی صدارت جناب صاحبزادہ ضیا احمد صاحب نے فرمائی۔ اس اجلاس میں چھ گروپوں کی ڈرائنگ عمل میں آئی گروپ نمبر ۱ کی دسویں، گروپ نمبر ۲ کی نویں، گروپ نمبر ۳ کی آٹھویں، گروپ نمبر ۴ کی ساتویں، گروپ نمبر ۵ کی چھٹی، گروپ نمبر ۶ کی تیسری۔ ——— ڈرائنگ تلاوت کلام پاک کے بعد صاحب صدر نے مقررہ طریقہ کے مطابق حاضرین سے امداد طلب فرمائی، حسب ذیل کامیاب رول نمبر قرار پائے :-

(۱)	گروپ نمبر ۱	رول نمبر ۷۶	جناب چوہدری غلام محمد صاحب کراچی
(۲)	گروپ نمبر ۲	رول نمبر ۲۹۴	جناب نذیر احمد اعوان صاحب۔ میانی ضلع سرگودھا
(۳)	گروپ نمبر ۳	رول نمبر ۱۹۶	جناب عبدالستار صاحب، عقب لسبیلہ ہاؤس۔ کراچی۔
(۴)	گروپ نمبر ۴	رول نمبر ۴۴۷	جناب عبدالمجید صاحب۔ نارووال ضلع سیالکوٹ
(۵)	گروپ نمبر ۵	رول نمبر ۳۴۳	جناب محمد اسلم صاحب۔ سید پور (مشرقی پاکستان)
(۶)	گروپ نمبر ۶	رول نمبر ۷۹	جناب علی مطہر نقوی صاحب مارٹن کوارٹرز نمبر ۹۵/۴ کراچی

جلسہ صاحب صدر اور حاضرین کے شکریہ کے ساتھ برخواست ہوا۔ ادارہ باوقار تنظیم جناب صاحبزادہ ضیا احمد صاحب کا بے حد شکر گذار ہے انہوں نے اس ڈرائنگ کی صدارت کے فرائض انجام فرما کر کارکنانِ تنظیم کا ہاتھ بٹایا۔

ادائیگی رقومات :-

اس ماہ ابھی صرف گروپ نمبر ۶ کے کامیاب رول نمبر ۷۹، جناب علی مطہر نقوی صاحب نے صدر دفتر سے اپنی رقم وصول کی تھی کہ حکومت پاکستان کے ایک آرڈیننس نمبر ۳۴ مجریہ ۱۹۵۷ء کے تحت دوسرے کامیاب رول نمبروں کو امدادی رقم کی ادائیگی نہیں ہو سکی۔ جب تک تنظیم کا معاملہ طے نہیں ہو جاتا۔ اس وقت تک یہ ادائیگی نہیں ہو سکتی۔ انشاء اللہ اس معاملہ کے فیصل ہو جانے کے فوراً بعد یہ ادائیگیاں کر دی جائیں گی۔

ننگا رھے

قیمت

خیمہ کے فرش پر بیش بہا قالین بچھے تھے جن پر تین سو شراب سے لبریز طلائی صراحیاں اور انواع واقسام کے کھانے چنے تھے، تیمور لنگ کے پیچھے مغنّی بیٹھے تھے اور اس کے قدموں میں بادشاہ، شاہزادے اور سردار موجود تھے۔ اس کے پاس سمرقند کا حق پسند شاعر کرمانی کسی سوچ میں غرق تھا۔

"اگر مجھے فروخت کیا جائے تو تم کیا قیمت ادا کروگے؟"

فاتح عالم تیمور نے کرمانی سے پوچھا!

کرمانی نے جواب دیا "پچیس عسکر"

"یہ تو صرف میرے کمر بند کی قیمت ہے"

تیمور تعجب سے بولا ———————

کرمانی نے کہا!

"میں نے بھی آپ کے کمر بند ہی کی قیمت لگائی ہے، کیونکہ آپ کا مول تو ایک دمڑی بھی نہیں"

پاکیزہ ادب کا ڈائجسٹ

ماہنامہ مُشیر کراچی

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

جلد ـــــ ۸

شمارہ ـــــ ۱۱

نومبر ۱۹۵۷ء

نگاہیں ـــــــــــ
قیمت .... ""
سورج بچار ـــــــــــ
چھٹا وزارتی منصوبہ محمود فاروقی ۵
تذکرے اور تبصرے ۷
جنھیں بھلایا نہ جائے گا ـــــــــــ
ترکش دکن کا آخری تیر مرتبہ محمود فاروقی ۹
سرگزشت ـــــــــــ
ایک مسافر ـ ہزار راہیں ظفر آنحق انصاری ۱۵
نقش قدم ـــــــــــ
قطرۂ شبنم، خونِ جگر ڈاکٹر طٰہٰ حسین ۱۹
برگِ گل ـــــــــــ
غزل احسان دانش ۲۴
غزل ظفر اقبال ۲۵
غزل عشرت قادری ۲۶
غزل امجد قریشی ۲۶
غزل کامل بہزاد ۲۷
انتظار بہار خورشید احمد کانپوری ۲۷
غزل نصیر سروانہ صدیقی ۲۸
غزل فیروز نظر ۲۸
غزل اصغر مینائی ۲۹
تین شعر انوار افسری ۲۹
غزل انوار انجم ۲۹
معراج غزل احمر رنگونی ۳۰
کچھ دیر اسے رخصت کر ابن انشاؔ ۳۱
دو بہنیں شاہد احمد زماں ۳۲
سرخیٔ خیال خورشید خضر ۳۳
طنز و مزاح ـــــــــــ
مس چنبیلی کنھیالال کپور ۳۵
افسانے ـــــــــــ
آشیانہ حیدر جعفری سیّد ۳۹
زہریلی مکھی غلام عباس ۴۹
دیس بدیس ـــــــــــ
ابھی انسان زندہ ہے مترجمہ کچلو ۵۴
تاثر ـــــــــــ
جب صبح آئی محمود فاروقی ۵۷
کردار کے دو پہلو ابن فرید ۵۸
جامِ جم ـــــــــــ
ہمارا اپنا گھر حسین محمود ۶۱
علم و ادب کی دنیا میں ـــــــــــ
ادبی خبریں ۶۳

نگراں : عبدالغفور بیگ
مرتبہ ۔ محمود فاروقی

ٹیلی فون: 70923

بدل اشتراک :-
سالانہ : پانچ روپیہ
فی پرچہ : آٹھ آنے

پرنٹر و پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور افسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی ملا سے شائع کیا۔ (کاتب: عابد سعید)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوچ بچار

چھٹا وزارتی منصوبہ

ایسے وقت میں جبکہ ہمارے ہمسائے اپنے ترقیاتی کاموں کے پنج سالہ منصوبہ کی تکمیل کے بعد دوسرے پنج سالہ منصوبے کا آغاز کر رہے ہیں ہمارے ملک میں پانچویں وزارت کا تختہ الٹنے کے بعد چھٹی وزارت کا تخت بچھایا جا رہا ہے اور دس سال سے ہم وزارتی منصوبہ بندی ہی میں مصروف ہیں۔ ان وزارتوں کے مجموعی فائدے اور نقصان کا حساب لگانے بیٹھئے تو اندازہ ہوگا کہ ہر وزارت کی تبدیلی کے بعد فائدہ سے زیادہ ہم کو نقصان ہی ہوا ہے!

پہلی وزارت لیاقت علی خاں کی تھی۔ مرحوم کی پوری وزارت میں عوام نے ڈٹ کر بڑی تگ و دو کے بعد جو چیز حاصل کی تھی وہ صرف "قرار داد مقاصد" تھی۔ قطع نظر اس کے کہ یہ کس طرح اور کن کن مشکلات کے بعد منظور کرائی گئی ہم اسے کھلے دل کے ساتھ نفع کے کالم میں لکھ سکتے ہیں۔

دوسری وزارت خواجہ ناظم الدین کی وزارت تھی۔ خواجہ صاحب بذاتِ خود خواہ کیسے ہی رہے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے دور وزارت میں عوام کو سوائے پریشانیوں کے اور کچھ نہیں ملا۔ گرانی بڑھی، گولیاں چلیں، سازشیں ہوئیں، زبان کے جھگڑے اٹھے اور قومی زندگی دیوانہ کا خواب بن کر رہ گئی لیکن خدا کا فضل ہے کہ خواجہ صاحب کے دور وزارت میں نفع کا کالم کورا بھی نہیں گیا۔ اس کالم میں سب سے بڑا فائدہ جو درج کیا جا سکتا ہے، دستور کا وہ خاکہ ہے جو سب کا سب نہیں تو بہت کچھ ان مطالبات کے مطابق تھا جن کے لئے عوام قیام پاکستان کے بعد حکمران طبقہ سے برابر لڑتے رہے تھے۔ دستور کا یہ مسودہ اپنی منظوری کے آخری مراحل میں تھا کہ اچانک ایک اور ڈرامائی تبدیلی ہوئی اور خواجہ صاحب برخواست کر دیئے گئے، دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی اور ملک میں لاقانونیت اور آمریت کا دور دورہ ہو گیا۔

تیسرے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ محض ایک نمائشی وزیر تھے۔ اس وزارت میں نفع کا کالم بالکل ہی کورا رہا ہے سوائے اس کے کہ ہماری خارجہ سیاست کا جھکاؤ برطانیہ کے بجائے امریکہ کی طرف کچھ زیادہ ہو گیا۔ سب سے بڑا نقصان اس دور کا یہ ہے کہ دستور سازی کو قرار داد مقاصد کے محور سے ہٹانے کی پوری کوشش کی گئی اور ملک میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔

چوتھی وزارت چودھری محمد علی کی تھی۔ اس وزارت نے مختصر سی مدت میں جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا وہ مسودہ دستور کی منظوری تھی جس نے قطعی طور پر طے کر دیا کہ ہمارے ملک کا دستوری ڈھانچہ اسلامی نظام زندگی کے لئے سازگار رہے گا۔ یہی ایک بڑا فائدہ ہے جو چودھری محمد علی کے دور وزارت کو ایک ممتاز حیثیت دیتا ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہوا اس کا شمار کسی صورت نفع کے کالم میں نہیں کیا جا سکتا۔

پانچویں وزارت جناب سہروردی صاحب کی تھی یہ وزارت مشرقی پاکستان کے مرکز گریز اور تخریب پسند عناصر کے گٹھ جوڑ سے وجود میں آئی تھی۔ اس لئے اس دور وزارت میں مشرقی پاکستان کے اسلام دشمن عناصر نے جڑ پکڑ لی جو نہ صرف عام پاکستانیوں کے رجحانات کے خلاف ہیں بلکہ محب وطن بھی نہیں، کیونکہ ان کی وفاداری کے سرچشمے پاکستان سے باہر غیر ملکوں میں موجود ہیں۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں ایسے عناصر

کو فروغ حاصل ہوگیا جو ہمیشہ سے پاکستان کے مخالف رہے اور آج تک ان کی وفاداریاں مشکوک ہیں۔ البتہ اس وزارت کے دور میں دو کام ایسے ہوئے ہیں جو واضح طور پر نفع کے کالم ہی میں درج ہوں گے ان میں سے ایک تو مسئلہ کشمیر سے متعلق وہ جدوجہد ہے جو سہروردی صاحب نے کی اور بلاشبہ اس مسئلہ میں بین الاقوامی ہمدردیاں حاصل کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی دوسرے عام انتخابات کو جلد از جلد منعقد کرنے کے لئے اتنا کچھ ہوا جو اس سے پہلے کسی وزارت نے نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ سہروردی صاحب اس بات کے لئے بھی لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے پوری طرح نہیں تو بڑی حد تک مشرقی پاکستان میں اس مرکز گریز اور تخریب پسند ٹولے کا زور توڑا جو مسلم رائے عامہ سے اختلاف ہی نہیں بلکہ بغاوت پر بھی آمادہ ہو چلا تھا اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے خواب دیکھ رہا تھا۔

ان اہم کارناموں کی وجہ سے سہروردی صاحب رفتہ رفتہ عوام سے قریب ہوتے جارہے تھے لیکن ایک بڑی خلیج تھی جو ان کے اور عوام کے درمیان حائل تھی اور یہ مخلوط انتخاب کا مسئلہ تھا۔ اگر دستوری خاکہ میں یہ شاخسانہ پیدا نہیں کیا جاتا تو اس وزارت کے لئے عوام کے دل میں بڑی جگہ پیدا ہو جاتی۔

اب پاکستان وزارتی تجربوں کے چھٹے دور میں داخل ہو رہا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ دور عوام کے لئے کتنے دکھ اور کتنے سکھ اپنے پردے میں چھپائے ہوئے ہے۔ جہاں تک جماعتوں اور اشخاص کا سوال ہے یہ وہی ہیں جنھوں نے عوام کی بستی دنیا کو اجاڑا تھا اور بنتی تقدیر کو بگاڑا تھا۔ اس نئی وزارت سے یہی مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کچھ بنا نہیں سکتی تو کم از کم بگاڑے نہیں جو گتھیاں الجھی ہوئی ہیں انھیں سلجھا نہ سکے تو اس پر کوئی الزام نہیں اسے معذور سمجھا جائے گا لیکن کم از کم وہ عوام کو نت نئے الجھاؤں میں نہ پھنسائے، جیسا کہ اب تک ہر نئی وزارت کرتی آئی ہے وہ چاہے کچھ کرے یا نہ کرے اگر وہ صرف ایک کام کر دکھائے تو ملک اور قوم پر ایسا احسان ہوگا جسے ہمارے عوام فراموش نہیں کریں گے اور وہ ہے دیانتدارانہ عام انتخابات کا جلد از جلد انعقاد!

• ——— فاروقی

تذکرے اور تبصرے

ماہنامہ عفت کا سالنامہ

قیمت ایک روپیہ۔

پتہ:۔ دفتر ماہنامہ عفت اچھرہ لاہور

مرتب:۔ عبدالوحید خاں۔ حمیدہ بیگم۔

پاکستان بننے کے بعد کئی ایک ماہنامے جاری ہوئے لیکن جو توقع تھی کوئی ایسا ماہنامہ جاری نہیں ہوا جو پاکستان کے ان بدلتے ہوئے حالات میں عورتوں کی صحیح راہ نمائی کر سکے۔ یوں تو صرف عفت ہی ایک ایسا پرچہ نہیں جو اسپنے پرانے رنگ میں برابر جاری ہے لیکن عفت کے موضوعات اس کو خواتین اہل قلم اور روایتی انداز پاکستان کے اس نئے ماحول میں ہماری خواتین کی نئی نئی ذمہ داریوں کا لحاظ کرنے سے قاصر رہا ہے اسی لئے یہاں خواتین کے کسی ایسے پرچے کی شدید ضرورت ہے جو نہ صرف ظاہری محاسن کے ساتھ رہنمائی حقیقی تقاضوں کی بھی تکمیل کر سکے جو پاکستان میں از سر نو اسلامی معاشرے کے قیام کے سلسلہ میں درپیش ہیں۔ ادارہ خواتین لاہور قابل مبارکباد ہے اس نے زیر ترتیب پرچہ جاری کر کے وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ عفت دو سال سے نکل رہا ہے اور اس عرصہ میں اس نے ہر اعتبار سے اپنی خوش سلیقگی اور افادیت کو ثابت کر دکھایا ہے۔

عفت کا یہ سالنامہ [illegible] صفحات پر مشتمل ہے اور "نشیب و فراز" "تلخ و شیریں" "سوز و ساز" "زیب و زینت" جیسے موضوعات کے تحت چار حصوں پر مشتمل ہے جن میں مقالے، افسانے، منظومات اور خواتین سے متعلق ضروری مسائل پر مضامین پیش کئے گئے ہیں جن میں سے بیشتر خواتین کے لکھے ہوئے ہیں۔ پہلے حصہ میں بنت مجتبیٰ مینا پر ایک بہت اچھا تنقیدی مضمون ہے۔

افسانوں میں پلاٹ اور موضوع اور کردار کے اعتبار سے عمدہ افسانے ہیں۔ سلطان احمد المعروف کا ایک نمونہ "باورچی خانہ میں" بڑی ندرت لئے ہوئے ہے اور خاصا دلچسپ ہے۔ حصہ نظم ماہر القادری، بنت مجتبیٰ مینا، کوثر عظمی، عالم اکبرآبادی، شاد عارفی، مسز دہلوی کے کلام سے مزین ہے۔ آخری حصہ میں صحت، گھریلو ضروریات، کشیدہ کاری پر مزید معلوماتی مضامین شامل ہیں۔ بحیثیت مجموعی عفت خواتین کے لئے مفید اور پاکیزہ مطالعہ کے لئے بڑے اچھے ذخیرے کو پیش کر رہا ہے۔ اس کے تمام مضامین اور ترتیب میں زندگی کی رو دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور مطالعہ کرنے والوں کے ذہن کو تحریکی شعور برابر جلا دیتا رہتا ہے اور یہ عفت کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

(م۔ ف)

سالنامہ "جام نو" کراچی

قیمت:۔ ایک روپیہ

زر سالانہ۔ پانچ روپے

مرتب:۔ مظہر نیری۔ مسرت م خیری۔

پتہ:۔ ۹۹ بزنس مالاتن صدر کراچی۔

رسائل و جرائد کے سالنامے نکالنا ایک رسم سی ہو گئی ہے۔ آج کل تو یہ عالم ہے کہ رسالوں کے یہ خاص خاص نمبر ہی نظر آتے ہیں ہر دوسرے تیسرے مہینے میں جاری ہو کر منظر عام پر آ رہا ہے کہ ہے کوئی عید مقابل سالنامے نکالنے کا جو حقیقی فائدہ ہے وہ صرف یہی ہے کہ یا تو پہلے موجودہ ذخیرہ ادب کا کوئی اچھا سا انتخاب میسر آ جائے یا پھر اس میں ایسی نئی بلکہ شاہکار تحریریں رہیں کہ وہ ادب کے سرمایہ میں ایک نیا اضافہ بن سکے۔

اگر یہ دونوں باتیں کسی سالنامے سے حاصل نہ ہوں تو ادبی حلقوں کے لئے ایسا سالنامہ صرف ایک بوجھ ہے جو زبردستی پڑھنے والوں پر لاد دیا جاتا ہے

. . . .

اس وقت ہمارے سامنے جامِ نو کا سالنامہ ہے۔ ٹائیٹل اگرچہ چمکتا جھلکتا ہوا نہیں ہے لیکن اس کا فنی ذوق کی غمازی کر رہا ہے۔ دو چار سیدھے سادے خطوط ہیں۔ لیکن یہی خطوط جامِ دو آتشہ بنے ہوئے ہیں۔ نام کا نام اور جام کا جام اور جام بھی کیا کہ بادۂ سرخ سے چھلک رہا ہے۔ یہی سرخی اس پرچہ کا موضوع رہی ہے۔ ۲۹۰ صفحات کے مضامین میں افسانے بھی ہیں مقالے بھی اور نظمیں بھی لکھنے والوں میں ایک دو کے سوا کچھ معروف نام نہیں ملتے ان غیر معروف لکھنے والوں میں بیشتر کی تحریریں ایسی ہیں جو پرچہ کے صفحات پر تو ثبت ہو چکی ہیں لیکن وہاں سے وہ اٹھ کر قاری کے ذہن پر نقش نہیں ہو سکتیں۔ البتہ حمید جعفری سید کا افسانہ "آشیانہ" ہر لحاظ سے مکمل اور معیاری ہے۔ بچوں کی نفسیات پر بہت ہی دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے اور تربیت کے سلسلہ میں موثر رہنمائی کرتا ہے۔ ایک اور افسانہ "پڑوسی" انجم جمالی نے لکھا ہے مختصر لیکن ہمسایہ جو بھائی چارگی کے جذبہ کو بڑی عمدگی سے ابھارتا ہے۔ اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اعلیٰ مقصدیت ایک کم درجہ کے فنی اظہار میں بھی جان ڈال دیتی ہے۔

مینا کاشف آج کل ہر پرچہ میں نظر آ رہی ہیں۔ جامِ نو کے سالنامہ میں ان کی کہانی "انسانیت اور سیاست" شامل ہے عنوان انتہائی غیر افسانوی لیکن کہانی افسانہ کے معیار پر کسی ہوئی پلاٹ اور کردار ہر پہلو سے دلچسپ ہیں لیکن اس کہانی کی مقصدیت پاکستانی عوام کے جذبہ اور شعور سے کوئی لگا نہیں کھاتی البتہ اس کے فکری ڈانڈے ان مرکز گریز عناصر کے ذہن سے جا ملتے ہیں جو پاکستان کو ایک بدکارانہ جغرافیائی تقسیم کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسے ایک اصولی نظریاتی اور تہذیبی فیصلہ قرار نہیں دیتے مینا کاشف اس طرح لکھ سکتی ہیں اور انہوں نے نیک نیتی خلوص کے ساتھ انسان دوستی کے جذبے کے تحت ہی لکھا ہوگا لیکن پاکستان کا ایک ماہنامہ ایسی کہانی شائع کر کے درحقیقت پاکستان کے مقصد وجود اور اس کے دستوری تقاضوں کے خلاف ایک بڑی ذمہ داری کو اپنے سر لے رہا ہے۔ ان کے علاوہ دوسری کہانیاں یا تو پروپیگنڈہ ہیں یا پامال رومانی موضوعات پر ناپختہ فنی تجربے۔ مقالے

اور افسانوں کے مقابلہ میں منظومات کا حصہ بڑی حد تک نادر اور فکر انگیز ہے۔ اسد ملتانی اور ادیب سہارنپوری کی نگارشات حاصل ترتیب ہیں۔

(م۔ ف)

بقیہ مضمون صفحہ ۵۷ سے آگے :-

اس پر بڑا غصہ آیا اور اس نے اٹھ کر لحاف کھینچ دیا اور اس کے کان پکڑ کر کھینچنے لگی۔

اس حرکت پر باغ کا مالک غضبناک ہو گیا۔ اس نے گھوم کر ایک زور دار چانٹا صبیحہ کے منہ پر مارا۔

پپا ——— ایک تیز چیخ سنائی دی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

پلنگ کے قریب اس کی لڑکی کھڑی ہوئی تھی اس کی تمام آلودہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے گدگدے ہاتھوں سے اپنے گال کو سہلا رہی تھی۔ بھرے بھرے گال پر پانچ انگلیوں کے سرخ نشان ابھرے ہوئے تھے۔

صبو! کیا ہوا؟ اس نے بیقرار ہو کر اپنی بچی کو لپٹا لیا۔ بچی سسکیاں لیتے ہوئے باپ کے سینہ سے لپٹ گئی۔

وہ کہاں گئی؟ اپنے اس سوال پر وہ خود شرمندہ ہو گیا

التماس ہے کہ :-

اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے بغیر پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔

ادارہ مشیر ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے (مینیجر)

ترکشِ دکن کا آخری تیر

سیّد قاسم رضوی

مرتبہ : محمود فاروقی

میں پچپن سال کا جوان ہوں ؟

پانچ سو پچپن سگریٹ کے کش پر کش لگاتے ہوئے اگر وہ آپ سے یہ کہے کہ میں پچپن سال کا جوان ہوں تو آپ کو قطعاً حیرت نہیں ہوگی، چاہے اس کی سفید داڑھی اور کمر جھکی ہوئی اس کی عمر کتنا ہی جھٹلائے، کیونکہ اس کی گہری گہری مشتعل آنکھیں اس کو سچ ماننے پر مجبور کر دیں گی ــــــ اس کو میں نے پہلی مرتبہ گلبرگہ کی ایک محفل میں دیکھا تھا۔ دبلا پتلا سہرا پتلا جسم، گھنی داڑھی، لانبا چہرہ، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں، بے چین پتلیاں، اور سب سے بڑھ کر اونچی ناک اور ہاتھوں کی مضطرب حرکتیں ــــــ اگر عقاب انسان بن جائے تو ــــــ ؟ اسکا ہر جاننے والا پورے یقین سے بول اٹھے گا :-

" قاسم رضوی ــــــ !"

ہاں قاسم رضوی ــــــ جس کی ساری زندگی لہو گرم رکھنے کے لئے پلٹنے، جھپٹنے اور جھپٹ کر حملہ کرنے میں گزری۔ اس نے نظام سے لے کر نہرو اور پٹیل سب کو کنجشک فرومایہ ہی سمجھا۔ اور جس بات کو حق جانا اس کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیا اور جس کو اس نے باطل سمجھا اسکے آگے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

قاسم رضوی نو سال کی قید تنہائی کے بعد بھارتی جیل سے رہا ہوئے اور ۱۹ ستمبر سنہ ۵۷ء کو کراچی پہنچے۔ دارالحکومت پاکستان میں ان کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ ان کو سنہ ۱۹۴۸ء میں سقوط حیدرآباد کے وقت گرفتار کیا گیا تھا۔ ان پر کانگریس کی حکومت نے قتل کے ایک ہزار دو سو اور ڈاکہ زنی کے ساڑھے چار سو، اور آتشزنی کے چار ہزار الزامات لگائے تھے کہ اگر ان الزامات کے تحت قانونی حدود کے اندر کم سے کم سزائیں انہیں دی جاتی تو انہیں ڈیڑھ لاکھ برس تک قید رہنا پڑتا لیکن خود کانگریسی نیتاؤں کو اس کا یقین نہیں تھا کہ ان کی حکومت اتنے برس تو کیا اتنے مہینے بھی قائم رہ سکے گی۔ اسی لئے قاسم رضوی نو سال بعد ہی رہا ہو گئے۔ اس درمیان میں بھی ان کو بارہا اس شرط پر رہائی کی پیشکش کی گئی کہ وہ معافی نامہ داخل کر دیں لیکن اللہ کے اس غیور بندے نے ہمیشہ حقارت سے ان رعایتوں کو ٹھکرا دیا۔

قاسم رضوی کا خاندانی تعلق اودھ سے رہا ہے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی اسکول لکھنؤ سے پاس کیا۔ اور عربی فارسی کی تکمیل مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل سے کی۔ ان کا یہ تعلیمی دور سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ چلے گئے اور وہاں سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ رضوی علی گڑھ کے ممتاز کھلاڑیوں میں شامل تھے۔ تیز دوڑنے اور فٹ بال کھیلنے میں سب سے آگے رہتے تھے اسی کھیل کود کے زمانہ ہی میں ان کی شادی سنہ ۱۹۲۶ء میں ہو گئی لیکن ازدواجی زندگی کے باوجود ان کا کھلنڈرا پن جاری رہا یہاں تک کہ انھوں نے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر لی ـــ اور وہ حیدرآباد چلے گئے۔ تعلقہ لاتور ضلع عثمان آباد میں وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۳۸ء اور سنہ ۱۹۳۹ء کے دوران جب مرحوم بہادر یار جنگ نے مجلس اتحاد المسلمین کا سنگ بنیاد رکھا تو سید قاسم رضوی لاتور کی شاخ کے صدر چنے گئے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ریاست حیدرآباد کے مختلف حصوں میں تحریک شروع ہوئی کہ ریاست کے مفاد کی بڑی مخالفت کر دی جائے۔ اس تحریک کا سب سے زیادہ زور لاتور ہی میں تھا۔ وہاں تحریک کی قیادت سید قاسم رضوی کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ لاتور میں ٹیکس ادا نہ کرنے پر مظاہرے ہوئے۔ حکومت نے گولی چلائی جس میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ اس تحریک میں سید قاسم رضوی نے بڑی شہرت حاصل کی۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں قائد

بہادر یار جنگ نے وفات پائی تو پہلے سید ابوالحسن سید علی، ان کے بعد مولوی مظہر علی کامل اور آخر میں سید قاسم رضوی مجلس اتحاد المسلمین کے صدر منتخب ہوئے۔ حیدرآباد میں رضاکاروں کی تنظیم بھی سید قاسم رضوی نے کی۔ یہ جماعت غالباً ۱۹۴۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ مگر تھوڑی سی مدت میں اس نے بڑی قوت حاصل کر لی۔ چنانچہ حیدرآباد اور ہندوستان کی جنگ میں ریاستی فوج نے بہت تھوڑا حصہ لیا۔ اس لئے جنگ کا سارا بوجھ رضاکاروں کو اٹھانا پڑا اور سب سے زیادہ نقصان بھی انہوں نے برداشت کیا۔ سقوط حیدرآباد کے فوراً ہی بعد ۱۹ ستمبر سنہ ۴۸ء کو شام کو جب بھارتی سنسان سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے ... کی کوٹھی دارالسلام کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ اس میں سے چند سکھ فوجی افسر اترے۔ دارالسلام کی ... سنسان عمارت میں انہیں صرف ایک شخص ملا جو رضاکاروں کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ اور جس کے کندھوں پر رضاکار تحریک کے قائد اعلیٰ کا نشان لگا ہوا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر کہا۔

"——— میں بڑی دیر سے آپ لوگوں کا منتظر تھا ———"

اس کے استقلال اور اطمینان کو دیکھ کر بھارتی فوج کے یہ افسر دم بخود رہ گئے ——— یہ قاسم رضوی تھا ———!

کراچی آنے پر میں اور مرزا صاحب قاسم رضوی سے ملنے گئے۔ ان کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایمانی قوت اب بھی قاسم رضوی کے سراپا سے جھلک رہی ہے کہ جس کے سہارے وہ نو سال کی جان لیوا مصیبتوں کو پوری ہمت و استقلال سے سہار گئے۔

کراچی پہنچنے پر انھوں نے جو بیان دیا ہے وہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ قید تنہائی نے ان کی فکر و نظر میں بڑی گہرائی اور وسعت پیدا کر دی ہے اور کو بھی تدبر و احتیاط سے جانچنے اور پرکھنے کا ملکہ کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اگر قاسم رضوی جیسا مخلص اور باہمت رہنما پاکستان میں مثبت اور تعمیری انداز میں اپنا قدم اٹھائے تو ہزاروں اٹھتے ہوئے قدم اس منزل کو جا لیں گے جن کا راستہ اس ملک کے سیاسی پنڈارے روکے بیٹھے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قاسم رضوی اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالتے ہیں۔ ویسے ان کے تیور تو یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

سید قاسم رضوی اپنے آئینہ میں

سنٹرل جیل حیدرآباد سے سید قاسم رضوی کا خط اپنی شریک حیات کے نام۔

سنٹرل جیل حیدرآباد، ۲۹ اپریل سنہ ۵۲ء

نورِ چشم عزیزم، پیارے بچو! السلام علیکم

تم کیا میں تمہارے دل کی کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتا...؟ کر سکتا ہوں اور خوب کر سکتا ہوں۔ خود اپنے دل کی کیفیت سے اندازہ ہوں مگر اس کے باوجود تم کو منع کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یہاں آنے اور مجھ سے ملنے کا خیال بھی نہ کرو۔ لو! آ کر کسی نے کیوں ملنا ہے؟ اس لئے تاکہ دل کو تسلی ہو خوشی حاصل ہو۔ اور اگر تسلی کے بجائے تکلیف اور خوشی کے بجائے رنج ہو تو ایسے ملنے سے کیا فائدہ؟ ایسے ملنے سے تو نہ ملنا بہتر ہے کہ کم از کم حالات تو دل خوش کن کیا جا سکتا ہے۔ تم آؤ گی تو پہلے ایک بڑے سے قید خانہ میں داخل ہو گی اس کے بعد ایک بھیانک عمارت جس کے بڑے بڑے خوفناک ... ہوں گے حقیقت کی صورت تمہاری پیدا کریں گے۔ اس کے بعد ایک عجیب الخلقت انسان نما شخص سے ملاقات ہو گی جس کو اس لباس اور ہیئت کذائی میں دیکھ کر تم کیا ... ملنے کا خیال حاصل نہ ہو گی اور اس کے بعد بھی ملاقات کس طرح ہو گی۔ وہ آدمی سامنے بیٹھے ہوں گے اور گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہے ہوں گے۔ کیا تم کو یہ ملاقات گوارا ہے؟ مجھ کو گوارا نہیں۔ مجھے آخرت میں ملنے کی امید پر سے صبر کرنا گوارا ہے مگر اس قسم کی ملاقات گوارا نہیں۔ ...

رب نہیں تو فارغ تو ضرور ہوگا۔ اس کے تمہارے ملنے کے لئے یہ ملاقات کچھ آتی رہی ہوگی ان سب باتوں کے علاوہ جیل خانوں پر شریفوں کی صحت کچل کر آ جاتا ہے بندہ ہونے کیوں کر ہو؟ مہرکہ وہ جب ہمارا ایمان ہے کہ دوسری زندگی وہیں ہوتی ہے تو یہاں نہ سہی ..... یہی تو ہوگا نا کہ بے ملے مر جائیں گے۔ یہی سہی ... ہاں ملیں گے ..... تنگ بڑی طویل ہوگی۔ گھبراؤ مت۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور خدمت خلق سے دل بہلاؤ۔

تمہارا ..... انجم ہوگا۔ خدا اسے کامیاب کرے۔ سب بچوں کو پیار۔ فاروق کے بچے کو دعا۔ اقبال کو پیار۔ ابا جان کو آداب اور سب بھائی بہن سب کو دعائیں۔ دعائیں ..... عباس کے خط سے فاروق کے بچے کا حال معلوم ہوا۔ (نوٹ) دوسرا خط عباس کو دیدو۔ ..... کا خط پہلا پانچ روز ہوئے آیا تھا اس کی ..... کہ اس کے سابقہ خط کا میں نے جواب نہیں دیا۔ اس سے کہہ دو کہ اس کو وزیر کو اور بیٹوں کو خطوط لکھے تھے اور تمہارے خط کے ساتھ ..... کے بھیجے تھے جب تم کو کوئی خط نہ ملے تو ان کو کیا ملتے؟ سب کو دعائیں کہو اور شکریہ۔ خواجہ سے کہو سجاد، رضوی وغیرہ کے متعلق تفصیل سے لکھے کہ یہ سب کیسے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ اور پابندی سے بلا لحاظ رسید جواب خط لکھتے رہیں ——————

خدا حافظ و ناصر تمہارا ——— (قاسم رضوی)

میری پیاری نورجہاں اور بچو! جیو خوش رہو پھولو پھلو۔ میری بالکل فکر مت کرو۔ خدا پر چھوڑو۔ دنیا کی طاقتیں جو چاہیں چاہیں۔ ہوگا وہی جو ..... منظور ہوگا۔ میرے خطوط کا نہ انتظار کرو نہ توقع۔ میری تحریرات پر ہزاروں پابندیاں ہیں مگر تم لوگ وقتاً فوقتاً مجھے خط لکھا کرو۔

اب بتوسط حکومت حیدرآباد دکن میں نے تم سب کو خدا کے سپرد کیا۔ سب کو دعا سلام پیار۔ خدا حافظ۔

تمہارا بابا ——— قاسم رضوی

بھارتی پریس کے سامنے

حیدرآباد ۲۴ ستمبر۔ مولوی قاسم رضوی نے پرسوں یہاں نواب علی کامل کے مکان میں اخبار نویسوں سے ایک ملاقات میں کہا کہ اب جبکہ میں پاکستانی شہریت اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں، یہاں کے مسلمانوں کو کسی قسم کا مشورہ دینا نامناسب اور میرے لئے بددیانتی ہوگا۔

رضوی جیل کی نو سالہ زندگی کے بعد دبلے ہو گئے ہیں اب کچھ شکستہ نظر آتے ہیں لیکن ان کا وہ جوش اور اپنے نقطۂ نظر پر اڑے رہنے کا مخصوص انداز وہی ہے۔

اتحاد المسلمین

رضوی صاحب نے کہا کہ وہ اب بھی مجلس اتحاد المسلمین کے صدر ہیں۔ یہ تنظیم گزشتہ تیس سال سے قائم ہے اور ایک قانونی تنظیم ہے اس زمانہ میں کسی بھی سیاسی تنظیم کو رجسٹر کرانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ انھوں نے اظہار حیرت کیا کہ کیا کوئی سیاسی تنظیم بھی ..... رجسٹر کرائی گئی ہے۔

وہ نو سال کی طویل مدت جیل میں گزار کر آئے ہیں، جو ان کے لئے حبس دوام کے مترادف تھی۔ اس لئے ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنی تنظیم کے رفقاء سے ملاقات کریں اور نیز سیاسی صورت حال کے متعلق معلومات حاصل کریں۔

انھوں نے کہا کہ وہ مجلس اتحاد المسلمین کی مجلس شوریٰ کا جلسہ طلب کریں گے لیکن ارکان شوریٰ کہاں ہیں یہ معلوم نہیں اور وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ ارکان زندہ ہیں یا فوت ہو گئے یا پاکستان چلے گئے۔ مجلس شوریٰ کے ارکان کی تعداد ایک سو چالیس تھی۔ انھیں اندیشہ ہے کہ آیا وہ جلسہ کا کورم پورا کر سکیں گے یا نہیں تاہم ..... مجلس ..... جو ..... مجلس ..... شوریٰ کا جلسہ طلب کرنے کا حق ..... ہے اگر وہ ..... جلسہ طلب ..... کریں ..... ہوں گے۔

سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ حیدرآباد میں اتحاد کا قیام ... [illegible]

مجلس کی اس وسیع جائداد کے متعلق جو سابق ریاست حیدرآباد میں تھی، جناب رضوی نے کہا کہ یہ جائداد تنظیم کی ہے اور اگر اس پر انڈین یونین کی حکومت نے دارالسلام حاصل کر لیا ہے تو وہ نہیں سمجھتے کہ مجلس کو اس کا کرایہ ادا نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک عدالتی فیصلہ کا ذکر کیا جس میں انھوں نے مجلس کی جیب اور موٹر کاروں کے قبضہ کے لئے مقدمہ دائر کیا تھا اور ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا کہ یہ مجلس کی ملکیت ہے۔ جس کے صدر وہ ابھی تک قائم مقام ہیں۔

رضوی صاحب نے کہا کہ صدر کی حیثیت سے ان کی پوزیشن تسلیم کی گئی ہے۔

مسلمانوں کو مشورہ

اس سوال پر کہ وہ حیدرآباد کے مسلمانوں کو مشورہ دیں گے رضوی صاحب نے گرم جوشی سے کہا میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں جبکہ میں خود یہاں نہیں رہوں گا تو پھر مجھے کوئی مشورہ دینے کا کیا حق ہے کیا یہ دیانت داری ہوگی؟ اگر میں ان سے یہ کہوں کہ وہ ہندوستان کے وفادار رہیں اور یہیں پر زندگی بسر کریں۔ تو کیا لوگ مجھ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ میں خود بھی یہاں ہند کا وفادار بن کر کیوں نہیں رہتا؟ اور اگر میں ان سے یہ کہوں کہ وہ اپنے حقوق کے لئے لڑیں تو کیا وہ مجھ سے یہ نہ پوچھیں گے کہ جب میں یہاں نہ رہوں گا تو انھیں مشورہ دینے والا میں کون ہوں؟ اس لئے میری ایماندارانہ رائے یہی ہے کہ مسلمانوں کو میرا مشورہ دینا نہ صرف بددیانتی ہوگی بلکہ یہ نامناسب بھی ہے۔

جناب رضوی صاحب نے مزید کہا کہ وہ کسی جلسۂ عام کو خطاب کرنا نہیں چاہتے۔

عقیدہ

اس سوال پر کہ کیا اب بھی وہ وہی کام کرنا چاہتے ہیں جس پر انھیں کبھی عقیدہ تھا۔ رضوی صاحب نے کہا کہ میں بار بار دہرا چکا ہوں کہ مجھے اس پر فخر ہے میں اس مقصد سے کس طرح روگردانی کر سکتا ہوں جس کو میں درست سمجھتا ہوں۔؟

اس سوال پر کہ جب انھوں نے ایک دفعہ یہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا اب چھوڑ کر چلے جانا کیا غیر منطقی نہیں ہوگا۔ جناب رضوی نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ میرا مستقبل کیا ہے اور مجھ پر جو کچھ بیتی ہے اس کے باعث ظاہر ہے کہ میں پارلیمانی یا سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لے سکتا اور نہ میں اپنا قدیم قانونی پیشہ اختیار کر سکتا ہوں پھر میں یہاں رہ کر کیا کر سکتا ہوں۔ اگر میں یہاں رہنا چاہوں تو اپنے بیوی بچوں کو واپس لانے میں حکومت بخوشی میری مدد کرے گی۔ لیکن ان کے لئے ذریعہ معاش پیدا کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔

ایک نامہ نگار نے دریافت کیا کہ وہ اپنی سوانح لکھیں گے؟ رضوی صاحب نے جواب دیا کہ وہ کوئی مغل شہنشاہ نہیں ہیں کہ اپنی سوانح لکھیں۔ انھوں نے کہا کہ سوانح بجز خودستائش کے اور کیا ہوتی ہے۔ میں عوام کا ہوں ان ہی سے میرا تعلق ہے میں نے اپنے طریقہ پر جسے میں نے بہتر سمجھا اپنے اہل ملک کی خدمت کی ہے اس طرح میری خودنوشتہ سوانح یہی ہوگی کہ قاسم رضوی ولد احمد رضوی فلاں تاریخ کو پیدا ہوا اور زندگی بسر کی اور فلاں تاریخ کو انتقال کیا اور بس۔۔۔!

قرآن کی تفسیر

جیل کی زندگی کے متعلق رضوی صاحب نے کہا کہ انھیں تنہا کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ حیدرآباد سنٹرل جیل میں انھیں چرخہ کاتنے کے لئے کہا گیا۔ اور طبی مشورہ پر انھیں کوئی اور کام نہیں دیا گیا۔

یرواڈا جیل میں انھیں جیل کی حسب معمول غذا دی جاتی تھی۔ وہ پانچ وقت نماز پڑھتے تھے اور قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے تقریباً ڈیڑھ ہزار فل اسکیپ صفحات پر اردو میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے جسے وہ نظر ثانی کے بعد شائع کروانا چاہتے ہیں۔

★

کراچی پہنچنے کے بعد آج شام چار بجے سید قاسم رضوی نے اپنے مکان واقع ... [illegible] ... کا اندازہ لگا سکتے ہیں نو سال کی قید تنہائی کے بعد اب میں پاکستان پہنچا ہوں۔ ... [illegible]

دیہی پیش آمدہ مشکلات کی زندگی کے متعلق جب رضوی صاحب سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں ہندوستان کی جیل میں بی کلاس کے قیدی کی حیثیت سے تھا میں اس کے مطابق ہی قید میں تھا۔ ان کے آئندہ پروگرام کے متعلق انہوں نے کہا کہ فی الحال سیاست میں حصہ لینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت میرا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ ذریعہ معاش کے بغیر کسی شخص کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہئے۔ اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ دھوکہ باز ہے اور قوم کو کسی وقت بھی فروخت کر سکتا ہے۔ سیاست اسپاٹ ایماندار آدمی کا کام ہے ذرائع معاش کے بغیر سیاسی زندگی اختیار کرنا میں غلط سمجھتا ہوں۔ میں سیاست کو پیشہ نہیں سمجھتا یہ ایک ایثار و خدمت ہے۔ سیاست کو پیشہ قرار دینے والے لوگ ہندوستان میں ہیں۔ جو گاندھی ٹوپی اور کھدر کے کپڑے پہن کر سیاست کو پیشہ بنا لیتے ہیں البتہ حیدرآباد میں چند ایسے افراد ضرور ہیں۔ جو سیاست کو پیشہ نہیں سمجھتے۔ میں بحیثیت وکیل قانون کی پریکٹس کروں گا۔ اس عمر میں اس کے علاوہ کوئی اور پیشہ اختیار نہیں کر سکتا۔ ایک نامہ نگار نے پوچھا کہ کیا آپ پاکستانی قومیت اختیار کریں گے؟ قاسم رضوی صاحب نے فرمایا کہ آخر میں یہاں کس لئے آیا ہوں؟ ایک اور نامہ نگار نے پوچھا کہ کیا آپ اتنی طویل مدت قید کاٹنے کے بعد قانونی طور پر اس امر کے مجاز ہیں کہ بحیثیت وکیل پریکٹس کریں۔ رضوی صاحب نے جواب دیا کہ میں نے ہندوستان میں سزا کاٹی ہے قید بھگتی ہے نیز یہ کہ میں اخلاقی مجرم نہیں تھا۔ اگر بالفرض محال یہ تصور کر لیا جائے کہ قانون مجھ کو وکالت کرنے کی اجازت نہ دے گا تو میں افراد خاندان کے ہمراہ مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ چلا جاؤں گا۔ قاسم رضوی صاحب نے کہا کہ مجلس اتحاد المسلمین ایک سیاسی جماعت تھی اور رضاکار جماعت کی وہی حیثیت تھی جو مسلم لیگ میں نیشنل گارڈز کی ہے انھوں نے کہا کہ مجھے [illegible] نے جو یہاں مجھے ان کی جماعت میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ چونکہ میں بحالت موجودہ سیاسی زندگی میں داخل نہیں ہو رہا ہوں اس لئے کسی سیاسی جماعت میں شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میں نے اپنی آمد کے وقت اور تاریخ کو اس لئے راز میں رکھا کہ میں استقبال وغیرہ سے بچ سکوں۔ حیدرآباد ٹرسٹ کے متعلق سوالات کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں اس کے معاملات میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لوں گا۔ البتہ یہ ضرور معلوم کروں گا کہ میر لائق علی کا کتنا مقروض ہے۔ ایک نامہ نگار نے ان سے دریافت کیا کیا آپ نے بھارت میں حیدرآباد کے الحاق کو تسلیم کر لیا ہے تو انھوں نے کہا کہ اگر ایسا ہوتا تو میں نو سال جیل میں کیوں رہتا۔ حیدرآباد ٹرسٹ کے متعلق سوالات کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ٹرسٹ کو جو رقم ملی تھی اس پر حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے تمام اشخاص کا حق ہے یہ رقم نہ حکومت حیدرآباد کی تھی اور نہ حکومت ہند کی، بلکہ یہ رقم میر عثمان علیخاں کی تھی لیکن میں خاموشی اور سکون سے تمام حالات کا جائزہ لوں گا۔ اور حقائق کو معلوم کروں گا۔ حیدرآباد کے متعلق انھوں نے کہا کہ سابقہ حکومت حیدرآباد نے پاکستان کے راستے سے یو۔ این۔ او میں اپنا معاملہ پیش کیا تھا۔ جو ابھی تک یو۔ این۔ او کے زیر غور ہے میری تمنا ہے کہ حیدرآباد مجلس اتحاد المسلمین کے دستور کے مطابق ایک آزاد مملکت ہو اور اس سے بھی زیادہ میں نے اپنی روانگی سے قبل عبدالواحد اویسی کو اپنا نائب اور مجلس کا قائم مقام صدر مقرر کیا ہے۔ جو مجلس کی جماعت عاملہ کے آئندہ اجلاس تک فرائض صدارت انجام دیں گے۔ مجلس اتحاد المسلمین کوئی خلاف قانون جماعت نہیں ہے اس کے مقاصد میں آزاد مملکت حیدرآباد کا قیام شامل ہے۔ اب یہ اس کے کارکنوں کا کام ہے کہ اپنے مقاصد کو تبدیل کریں یا ان کے حصول کے لئے کوشش کریں اگر ان میں جذبۂ عمل اور اتحاد ہے تو اپنی جماعت کو زندہ رکھ سکتے ہیں آخر مدراس اور کیرالا میں مسلم لیگ زندہ ہے۔

ایک نامہ نگار نے جب ان سے یہ کہا کہ آپ بہت ضعیف معلوم ہوتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ نہیں میں پچپن سالہ جوان ہوں۔ رضوی صاحب نے کہا کہ میں نے قید میں ہزار صفحات پر مشتمل ایک تفسیر جیل میں لکھی ہے۔ لیکن فی الحال اس کی اشاعت کا سوال پیدا نہیں ہوتا میں اس پر نظر ثانی کروں گا۔ اس کے بعد اپنے ایک عالم دوست مولانا مظہر علی کامل کو دکھاؤں گا اور پھر اپنے ایک سائنسدان دوست ڈاکٹر رضی الدین کو بھی دکھاؤں گا۔ میں نے قدیم طرز پر تفسیر نہیں لکھی ہے۔

ایک نامہ نگار نے پوچھا کیا آپ پاکستان میں رہ کر ہندوستان کے لئے مشکلات پیدا کریں گے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں، ایک غیر ملکی شخص کو دوسرے ملک میں انتشار پیدا کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ کشمیر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان لڑائی کے بغیر نہیں رہ سکتے جنگ کے علاوہ پر امن طریقے سے دونوں ملکوں کے درمیان یہ مسئلہ طے ہو جانا چاہئے۔ اگر دونوں ممالک دوست نہیں ہو سکے تو دونوں تباہ ہو جائیں گے۔

حیدرآباد کے مستقبل کے متعلق انھوں نے کہا کہ میں پاکستانی قومیت اختیار کروں گا۔ اس لئے اس مسئلہ پر ایک پاکستانی کے نقطۂ نظر

سے سوچنا چاہیئے وہ تمام حیدرآباد کے باشندے جو پاکستان میں ہیں۔ انہوں نے پاکستانی قومیت اختیار کر لی ہے۔ ... کی حیثیت ہمیں غیر ممالک کے متعلق اظہار کرنا چاہیئے۔ حکومت پاکستان اس سلسلہ میں ... کرے گا۔

جیل کی زندگی کے متعلق انہوں نے کہا مجھ سے سی کلاس کے قیدی کا سلوک کیا گیا۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے بموجب مجھ سے مشقت لی جاتی تھی۔ جھاڑو دینا، زمین کھودنا، پتھر پھینکنا وغیرہ۔ دن میں کئی مرتبہ پولیس ہیڈ کوارٹر کا ٹیلیفون بند ہوا۔ ہزاروں افراد کا مجمع نعرے لگاتا اور ... صاحب برآمدہ میں آکر شکریہ ادا کرتے تھے۔

سرگزشت

ایک مسافر ہزار راہیں

ایک نومسلم کا سفرنامۂ حیات

محمد اسد لیوپولڈ ویس
ترجمہ: ظفر اسحٰق انصاری

یہ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ میں نے ایلسا سے شادی کر لی۔ اس دو سال کے عرصے میں جو عرصہ ہم نے ایک ساتھ گزارا تھا۔ ہماری محبت کی آگ دھیمی ہونے کے بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ اور جب ایلسا نے شادی کے سلسلے میں میری اور اپنی عمر کے تفاوت کا ذکر کیا تو میں نے ایک ناقابل بیان مسرت کے ساتھ اس کے خدشات دور کر دیئے۔

ایلسا نے اپنی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا:۔

"لیکن تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ ابھی تمہاری عمر چھبیس سال کی بھی نہیں ہے اور میں چالیس سال سے زیادہ کی ہوں۔ اس بات کو پیش نظر رکھو کہ جب تمہاری عمر تیس سال کی ہو گی تو میری عمر چوالیس سال کی ہو جائے گی۔ اور جب تمہاری چالیس سال کی ہو گی تو اس وقت میں بوڑھی ہو چکی ہوں گی۔"

میں نے ہنس کر کہا:۔

"اس سے کیا ہوتا ہے میں تمہارے بغیر اپنے مستقبل کا تصور بھی نہیں کر سکتا"

اور بالآخر وہ مان گئی۔

اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس میں ذرہ برابر کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا میں ایلسا کے بغیر اپنے مستقبل کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مجھے اس میں جو خوب صورتی اور اس کی فطرت میں جو حسن نظر آ رہا تھا اس نے ایلسا کو میرے لئے اس درجہ دل کش بنا دیا تھا کہ میں اس کے علاوہ کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہیں ... سکتا تھا ——— وہ میری زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کے معاملے میں اس درجہ فکر کی حس واضح ہوتی تھی کہ اس کی محبت خود میری آرزوئیں جگا اٹھیں۔ میری تمنائیں آہستہ آہستہ نکھر کر ٹھوس اور مادی پیکر اختیار کرتی اور روز بروز زیادہ واضح ہوتی گئیں ان سے زیادہ واضح جتنی کہ میری تنہا فکر سے ہو سکتی تھیں۔

یہ غالباً ہماری شادی کے ایک ہفتہ بعد کا واقعہ ہو گا کہ اس نے میرے بارے میں رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا: یہ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ تم جو مذہب کے معاملے میں تصوف و باطنیت کے شدید ترین مخالف ہو خود ایک صوفی منش ——— لیکن عیاں قسم کے صوفی منش ہو ——— تم اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی زندگی کی جانب دیکھتے اور روز مرہ زندگی کے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات جو لوگوں کے لئے بے حد غیر اہم ہوتے ہیں ——— تم ان کی باطنی حقیقت کو دیکھ لیتے ہو ——— لیکن جس وقت مذہب کا معاملہ آتا ہے تو تم بھی "عقل" بن جاتے ہو حالانکہ بیشتر لوگوں کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

لیکن ایلسا کا ذہن اس معاملے میں کسی انتشار و پریشانی میں مبتلا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جب میں اسلام کا تذکرہ کرتا تو اس میں کسی حقیقت کا متلاشی تھا ممکن ہے اس نے اس مسئلہ کی اتنی فوری اہمیت محسوس نہ کی جتنی کہ میں کر رہا تھا مگر میری محبت نے اسے اس تلاش و جستجو میں برابر کا شریک کیا۔

ہم اکثر مل کر قرآن پڑھا کرتے اور قرآنی تصورات کے بارے میں باہم گفتگو کرتے رہتے۔ ایلسا میری طرح بار بار قرآن کی اخلاقی تعلیم اور اس کی عملی ہدایت کے باہمی ربط سے متاثر و مرعوب ہوتی جا رہی تھی۔ قرآن کی رو سے خود انسان سے اندھی اطاعت کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ اس کے ذہن کو دعوت فکر دیتا ہے یہاں خدا کا تصور بہ تنہا کوئی انسان

اور اس کے تصور سے بے نیاز ہو کر کہیں دور بے فکری کے عالم میں بیٹھا ہوا ہے بلکہ اس کا تصور تھا وہ تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ قرآن نے ایک ایسے خدا کا تصور پیش کیا تھا جو ایمان اور انسان کے سماجی رویے کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے زندگی کو روح اور مادے کی مستقل کشمکش کے بارے بوجھل نہیں بنا دیا تھا۔ اور نہ اس کا تقاضا تھا یہ کہ اگر روشنی اور روحانی نجات کی تلاش ہے تو جسم اور جسمانی زندگی کے تمام بندھنوں سے اپنے کو آزاد کرنا ہوگا۔ اس کے برعکس رسول اکرمؐ نے اپنے متعدد اقوال مثلاً:- "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ" وغیرہ میں حیات بیزاری اور نفس کشی کے تمام رجحانات کی پر زور مذمت کی ہے نفس انسانی میں زندہ رہنے کی جو آرزو فطری ہے اسے نہ صرف یہ کہ تسلیم کر لیا گیا ہے بلکہ اس اہم اور نتیجہ خیز جبلت کو ایک اخلاقی اصول کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اس معاملے میں آپ کی تعلیم کو یوں بیان کیا جاتا ہے:-

"تم کو اپنی زندگی کو پوری طور پر بروئے کار لانے کی اجازت ہی نہیں ہے بلکہ اس کا بروئے کار لانا تمہارا کام ہے"

اسلام کی ایک مربوط اور مکمل تصویر اب میری ذہنی سطح پر ایک ایسے فیصلہ کن انداز میں ابھر رہی تھی جو اکثر مجھے ورطۂ حیرت میں غرق کر دیتی تھی اس عمل کے تمام عمل کو ہم ایک قسم کے ذہنی نفوذ سے تعبیر کر سکتے ہیں اسلام کے بارے میں گزشتہ ... عرصہ میں جو معلومات منتشر طریقہ پر میرے ذہن میں جمع ہوتی رہی تھیں۔ اب وہ تمام میری کسی ارادی کوشش کے بغیر ایک منظم اور مربوط سلسلہ میں منسلک ہوتی جا رہی تھیں۔ مجھے اسلام فن تعمیر کا ایک ایسا شاہکار نظر آ رہا تھا جس کے تمام حصے ایک دوسرے سے ہم آہنگی کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوں کہ ایک حصہ دوسرے کے لئے سہارے کا باعث ہو جس میں کوئی چیز زائد نہ ہو اور نہ کم جس میں ایسا توازن اور ایسی ہم آہنگی موجود ہو کہ آدمی یہ محسوس کرنے لگے کہ ہر چیز اپنے صحیح موقع و محل پر موجود ہے۔

آج سے تیرہ سو سال قبل ایک آدمی نے اٹھ کر یہ اعلان کیا تھا کہ میں صرف ایک فانی انسان ہوں، جسے خالق کائنات نے تم تک اپنی پیغام رسانی کے لئے مامور کیا ہو اس نے مجھے اس بات پر مامور کیا ہے کہ میں تم کو اس کے وجود اس کی قدرت کاملہ اور اس کے بے نیاز ہونے کی یاد دہانی کراؤں اور تمہارے سامنے زندگی کا ایک لائحہ عمل پیش کروں تاکہ تم خالق کائنات کے منصوبہ تخلیق سے ہم آہنگ ہو کر زندگی گزار سکو۔ اگر تم اس پیغام کو اور اس لائحہ عمل کو قبول کرتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو ــــــ یہ تھا محمد صلعم کا مشن!

آپ نے جو اجتماعی اسکیم پیش کی تھی اس میں وہ غایت درجہ کی سادگی پائی جاتی ہے جس کا دامن ہمیشہ حقیقی عظمت سے وابستہ رہا ہے۔

اس اجتماعی اسکیم کا نقطۂ آغاز اس حقیقت کے اعتراف سے ہوتا ہے کہ انسان اپنے طبعی وحیوانی وجود اور زندگی کے طبعی وحیاتی تقاضے رکھتے ہیں اور ان کے خالق نے ان کو ایک ایسی ساخت پر پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے تمام حیوانی واخلاقی اور ذہنی مقتضیات کو پورا کرنے کے لئے جماعتی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ باہم ایک دوسرے کے محتاج و دست نگر ہیں۔ خود ایک کافر کا روحانی ارتقاء جو کہ تمام مذاہب کا نصب العین ہے، اس کے اردگرد کے افراد کے تعاون ان کی ہمت افزائی اور برے اثرات سے محفوظ رکھنے پر منحصر ہے۔

افراد کے اس باہمی احتیاج کے شعور ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام نے مذہب کو سیاست و معیشت سے جدا نہیں کیا۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اسلام کے نزدیک سوسائٹی کا اصل فریضہ بھی یہ ہے کہ وہ انسانوں کے باہمی تعلقات کو اس طرح مرتب کرے کہ افراد کو اپنی شخصیت کے ارتقاء میں ... کم سے کم رکاوٹیں درپیش ہوں اور اس کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کا سامان موجود ہو۔ یہی لئے یہ ایک فطری امر تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تیئیس سالہ دور رسالت میں جو نظام پیش کیا تھا۔ وہ صرف روحانی امر سے متعلق نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں کے لئے بھی ایک موزوں نقشہ دیا تھا۔ اسلام نے صرف انفرادی نیکی کا تصور ہی پیش نہ کیا۔ بلکہ ایک عادلانہ سوسائٹی کا تصور بھی دیا ہے جو ــــــ اس نیکی اور پرہیزگاری کے نتیجے کے طور پر لازماً وجود میں آنی چاہیئے۔ اسلام نے سیاسی اجتماعیت کے بنیادی خدوخال بھی پیش کئے ــــــ لیکن صرف بنیادی خدوخال کے پیش کرنے پر اکتفا کی کیونکہ تفصیلات کا اصول

جو معاشرے کی بدلتی ہوئی سیاسی ضروریات کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اسلام نے انسان کے انفرادی حقوق اور سماجی ذمہ داریوں کی ایک ایسی اسکیم پیش کی جس میں انسان کی سماجی ترقیوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا تھا۔ اسلام نظام زندگی کے تمام گوشوں۔ حیواتی و اخلاقی۔ انفرادی و اجتماعی پر حاوی تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں تمام مسائل کو ان کا صحیح درجہ دیا گیا ہے۔ ——— ان میں آپ کو مسائل عبادات اور دینی نظریات کے ساتھ ساتھ انسان کے جسمانی مسائل بھی ملیں گے اور دماغی بھی جنسی مسائل پر بھی آپ کو روشنی ملے گی اور معاشی مسائل پر بھی۔ غرضیکہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے کسی مسئلہ کو اتنا حقیر نہیں سمجھا گیا۔ کہ اسے مذہب کے دائرے سے خارج کر دیا جائے یہاں تک کہ تجارت وراثت ملکیت جائداد اور ملکیت زمین جیسے خالص "دینوی" معاملات کو بھی مذہب سے الگ قرار نہیں دیا گیا۔

اسلامی قانون کی تمام دفعات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ان کا مقصد پیدائش نسل طبقہ سابقہ سماجی وابستگی سے بے نیاز ہو کر ملت کے افراد کو مجموعی اور یکساں نفع پہنچانا ہے یہاں تک کہ خود بانی ملت اور ان کی اولاد کے لئے بھی کوئی مراعات مخصوص نہیں کی گئیں۔ سماجی نقطہ نگاہ سے یہاں پست و بلند کا وجود ہی نہ تھا۔ اور نہ الگ الگ طبقات کا ہی کوئی تصور تھا!

اسلام پر ایمان لانے والے تمام افراد کے لئے یکساں حقوق یکساں مواقع اور ان پر یکساں ذمہ داریاں رکھی گئیں ہیں اور یہاں بندے اور خدا کے درمیان کسی پروہت یا کسی شیخ و برہمن کی وساطت کی ضرورت نہیں کیونکہ خدا عالم الغیب والشہادۃ ہے۔

پھر اسلام نے خدا اس کے رسول اپنے والدین .... اور حکومت ربانی کے قیام کا نصب العین رکھنے والے ملت کی وفاداری کے علاوہ کسی اور وفاداری کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا اس نے اس جاہلانہ عصبیت کی بھی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے جس کا انسان سے مطالبہ ہوتا ہے کہ قوم و ملک خواہ صحیح کر رہے ہوں یا غلط انسان کا ساتھ دینا بہر کیف لازمی ہے اس کی توضیح کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھل کر یہ اعلان کر دیا تھا۔

۱۔ جو شخص قبائلی عصبیت کی طرف دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں

۲۔ جو شخص قبائلی عصبیت کے لئے لڑے وہ ہم میں سے نہیں

۳۔ جو شخص قبائلی عصبیت کے لئے جان دے ..... وہ ہم میں سے نہیں۔

اسلام سے قبل تمام سیاسی نظاموں میں سے کبھی جو مذہبی یا ..... نیم مذہبی بنیادوں پر قائم تھے ——— قبائلی اجتماعیت کے تنگ نظریات میں جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں مصر قدیم کے الوہی تقدس رکھنے والے بادشاہوں کے ذہن کی پرواز وادی نیل اور اس کے باشندوں تک محدود نظر آتی ہے اور عبرانیوں کے ابتدائی دور کی مذہبی حکومت میں بھی جو اس نظریہ پر قائم تھے کہ خدا ہی حکومت کرتا ہے۔ خدا کا یہ تصور ملتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کا خدا ہے۔ لیکن قرآنی فکر کے نقشہ میں نسلی اور قبائلی وابستگیوں کے لئے سرے سے کوئی مقام ہی نہیں اسلام نے ایک ایسے سماج کا تصور پیش کیا جو قبیلہ اور نسل کے تمام تصورات کی زنجیریں کو کاٹ دیتا ہے اس معاملے میں بظاہر اسلام اور مسیحیت ہم مقصد نظر آتے ہیں کیونکہ دونوں کا نصب العین ایک ایسے انسانی سماج کی تعمیر ہے جس کی بنیاد مطمح نظر اور نصب العین کا اشتراک ہو لیکن یہاں بھی ان میں بڑا فرق ہے۔ مسیحیت نے اس اصول کی تلقین پر اکتفا کی اور اپنے پیروں کو ہدایت دے کر کہ "خدا کو اس کا حق دو اور قیصر کو اس کا" اس نے اپنے پیغام کو زندگی کے روحانی شعبے میں محدود کر دیا۔ لیکن اسلام نے دنیا کے سامنے ایک ایسے سیاسی نظام کا تصور پیش کیا جس میں خدا پرستی اور خدا ترسی انسان کی تمام عملی سرگرمیوں اور اس کے اجتماعی ارادات کی واحد بنیاد اور واحد سرچشمہ ہو اس طرح مسیحیت میں جو خلا رہ گیا تھا اس کو پر کر کے انسانی ارتقاء کی تاریخ میں اسلام نے ایک نئے باب کا آغاز کیا اس نے دوسرے قسم کے سماجوں کے برعکس جن کی بنیاد جغرافیائی اور نسلی وابستگیوں پر تھی۔ ایک ایسا اصولی سماج تعمیر کیا جس کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں۔

اسلام کے پیغام نے ایک ایسی تصویر کا تصور پیش کیا اور صرف تصور ہی پیش نہیں کیا۔ بلکہ اسے دنیا کے سامنے لباس مجاز میں لاکر جلوہ گر بھی کر دیا جس میں قوم پرستی مخصوص مفادات اور طبقاتی کشمکش کے لئے کوئی مقام نہ تھا جو کلیسا کا روادار تھا نہ پاپائیت اور معاشی اشرافیت کا جس میں دراصل وراثتی فرائض و مناصب کے لئے قطعی گنجائش ہی نہ تھی اس معاملے میں اسلام کا نصب العین یہ تھا کہ انسانوں پر صرف اس

معاملے میں جس طرح بادشاہت اور قبیلوں کے باہمی تعلقات میں جمہوریت کو قائم کیا جائے۔ اسلام کی جنم دی ہوئی اس نئی تہذیب کی وہ اہم ترین خصوصیت جو ہمیں تاریخ انسانی کی تمام تحریکوں میں اس کو ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ عملاً بھی اور نظریاتی اعتبار سے بھی یہ لوگوں کی آزادانہ اتفاق رائے سے وجود میں آئی تھی۔ اس تہذیب میں سماجی ترقی دوسری تہذیبوں اور قوموں کی طرح مختلف و متضاد مفادات کے باہمی کشمکش کا نتیجہ تھی۔ بلکہ اس تہذیب کی سرشت میں داخل تھی۔

دوسرے الفاظ میں یہاں فی الواقع تمام سیاسی امور کی بنیاد ایک معاہدۂ عمرانی پر نہیں ہے جسکی اقتدار یافتہ نسلوں نے اپنے اغراض کے تحفظ کیلئے دلفریب نعرے کے طور پر استعمال کیا ہو بلکہ ایک ایسے معاہدۂ عمرانی پر جو واقعی تاریخی طور پر اسلامی تہذیب کا سرچشمہ ہے۔

قرآن نے کہا تھا۔

"بیشک اللہ نے اہل ایمان سے ان کے جان و مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں ــــ پس تم اپنے اس سودے پر جو تم نے طے کیا ہے خوشیاں مناؤ کیونکہ یہی اصل کامیابی ہے"

میں جانتا تھا کہ یہ اصل کامیابی تاریخ کے اس واحد معاہدۂ عمرانی کے وجود میں لانے کے جلد ہی بعد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو گئی تھی سیاسیوں کہتے کہ ایک قلیل سی مدت میں ہی ایک بہت بڑے پیمانہ پر اس کے رو بہ عمل لانے کی ایک عظیم سعی کی گئی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تقریباً سو سال بعد اصل اسلام کی سیاسی ہیئت پر انحطاط اور بگاڑ کا عمل شروع ہو گیا۔ اور بعد میں آنے والی صدیوں میں اسلام کے اصل پروگرام کو آہستہ آہستہ..... پس پشت ڈال دیا گیا۔ جو سماج انسانوں کی آزادانہ مرضی سے وجود میں آیا تھا حصول اقتدار کے لئے قبائلی جھگڑوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اسلامی سماج پر جلد ہی ملوکیت کا منحوس سایہ پڑنے لگا۔ اگرچہ ملوکیت کو اسلام کے سیاسی تصورات سے اتنا ہی بعد ہے جتنا کہ اس کے توحید پسندانہ دینی تصورات سے شرک کو ہے۔ ملوکیت کے در آنے کے نتیجے میں شاہی خاندانی جھگڑے اور سازشیں، قبائلی امتیازات اور بے انصافیاں شروع ہو گئیں۔ اور مرکزِ سیاسی اقتدار کا کھلونا بن کر رہ گیا اور وہ تمام مفاد پرست طبقات جو

تاریخ میں ہمیشہ نظر آتے ہیں وجود میں آگئے۔ کچھ عرصے تک علماء کرام اس آئیڈیالوجی کو سربلند اور اسے آمیزش سے پاک رکھنے کی جدوجہد لیکن بعد کے علماء اتنے بلند نہ تھے اور وہ تین صدیوں کے بعد وہ توہم پرستی اور جمود کی دلدل میں پھنس گئے انہوں نے خود اپنے دماغ سے سوچنا چھوڑ دیا اور سابقہ نسلوں کے مردہ اقوال کو دہرانے پر ہی اکتفا کرنے اور یہ بھول گئے کہ انسانی آراء تو اضافی صداقت کی حامل ہوتی ہیں ا منزہ عن الخطا! اسی لئے ہمیشہ انکے تجدید و اصلاح کی ضرورت ہوتی

اسلام نے ابتداء میں انکے اندر عظیم حرکت پیدا کی تھی اس نے کو ایک عرصہ تک ایک بلند ثقافتی سطح پر قائم رکھا اور اسی کی وجہ مسلمانوں نے سائنس ادب اور فنون کے میدان میں وہ عظیم کارنامے انجام دیئے کہ ان کے اس دور کو مورخین اسلام کے عہد زریں کے نام یاد کرتے ہیں لیکن بعد کی چند صدیوں میں روحانی قوت و حرکت کا سوتا خشک ہوتا گیا اور مسلمان تہذیب روز بروز زیادہ جامد زیادہ بے جان اور تخلیقی قوتوں سے محروم ہوتی چلی گئی۔

قطرۂ شبنم — خونِ جگر

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

"یہ کہانی رسولِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدِ محترم حضرت عبداللہ کی زندگی سے متعلق ہے۔ عربی زبان کے انشاپرداز ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس کہانی کی ترتیب قدیم عربی ادب اور سیرت کی کتابوں سے کی ہے۔ یہ کہانی ڈاکٹر صاحب کی ضخیم تصنیف سیرت کے حاشیے سے ماخوذ ہے۔ مصنف نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے "یہ صفحات علماء کے لئے لکھے گئے ہیں نہ مورخین کے لئے۔ ان میں آپ کو کسی قسم کا تصنع یا مروجہ آداب و قواعد نہیں ملیں گے جو فنِ تصنیف کے لئے ضروری قرار دیئے گئے ہیں۔ یہ چند تصویریں ہیں قدیم عربوں اور...... حیاتِ طیبہ کی۔"

(مترجم)

قریش کا تجارتی قافلہ چند دنوں میں شام جانے والا تھا۔ مکہ کے گلی کوچوں میں بڑی گہماگہمی تھی۔ ہر کوئی سفر کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس وقت عبدالمطلب نے حرم کعبہ میں اپنے بیٹوں سے پوچھا:۔

"عبداللہ کہاں ہے"۔ "وہ تو اب دن چڑھے سو کر اٹھتا ہے" کسی نے کہا۔ اس آواز میں محبت بھری شرارت تھی۔ بھائی کی ازدواجی زندگی کا رشک تھا ایک طرح کی اپنی محرومی کی شکایت تھی۔ "بہت سست ہو گیا ہے۔" شیخ نے بڑے پیار سے رائے ظاہر کی اور پھر قافلے کی باتیں شروع کر دیں۔

اتنے میں ایک طویل قامت نوجوان چہرے پر شگفتگی اور آسودگی لئے حرم میں داخل ہوا۔ باپ کو جھک کر سلام کیا۔ شیخ نے اسے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا ہم سب آرام چاہتے ہیں۔ پیار کرنے والی بیوی کے قربت کے عزیز نہیں ہوتی کہ بانہوں میں چھپ کر ماحول کو بھول جاؤں نہیں چاہتا لیکن ... کسی ... ہوتے کی بیداری کا انتظار نہیں کرتا۔ میں تمہیں وقت ... سے پہلے بیدار کر دینا چاہتا ہوں۔

... ہے۔ تم تیار ہو جاؤ۔ قریش کے کسی نوجوان سے پیچھے نہ رہنا۔ تمہاری جیب سب سے بوجھل ہونی چاہئیے۔ میں نے اور تمہارے بھائیوں نے تجارت کا تمام سامان تیار کر لیا ہے۔ تم اپنے سسرالی قبیلہ بنو زہرہ کا سامانِ تجارت بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ اس طرح تمہارے پاس سب سے زیادہ مال ہوگا اور میرے بیٹے ہم میں سے کون شام نہیں گیا۔ یمن کس نے نہیں دیکھا۔ عراق کا سفر بھی سبھی نے کیا ہے۔ ہم میں سے بعض تو تجارت کا سامان لے کر مصر تک ہو آتے ہیں۔ سمندر عبور کر کے بلادِ حبشہ میں تجارت کی ہے اور کچھ نے تو بابل و فارس تک اپنا سامان پہنچایا ہے۔ لیکن تم اپنوں کا ساتھ چھوڑ کر دور نہ جانا۔ جاؤ اب سفر کی تیاری کرو اور آمنہ کو تسلی دو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آمنہ تمہاری جدائی کو برداشت نہ کر سکے گی جو زہرہ کی عورتوں کے دل بڑے نازک ہوتے ہیں۔ شیخ کی آواز میں رقت تھی لیکن ایسی نہیں کہ بیٹے کو جواب دینے کی جرأت ہو سکے۔

عبداللہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ اس کے گلے میں اٹک گئے پھر وہ خاموشی سے اٹھا اور سیدھا گھر کی طرف چل دیا۔ سورج آگ برسا رہا تھا اور گرمی کی شدت سے ریت جلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن عبداللہ کسی چیز کی پرواہ کئے بغیر تیر کی طرح سیدھا گھر کی طرف بھاگا

تھا کہ ایک نرم و نازک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی:۔

"سر جھکا کر چلنے والے! کیا تمہیں اپنے چاروں طرف صبح کی طرح شگفتہ اور بھیگے ہوئے چہرے دکھائی نہیں دیتے،

ہمارے پاس آؤ، ہمارے دروازے کی طرف رخ کرو۔ یہاں سکون و مسرت اور آسودگی کی ایک جنت آباد ہے"

عبداللہ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ فاطمہ بنت مرّ الخثعمیہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

"اس دھوپ میں کہاں جا رہے ہو؟ باپ اور بھائیوں کے پاس سے اتنی جلدی کیوں اٹھ آئے؟ ذرا سی دیر کے لئے یہاں آ جاؤ۔ اس گھر میں میرے گھر میں"

فاطمہ حسین تھی۔ دولتمند تھی۔ اس کے پاس ملک کی بہترین کنیزیں تھیں اور ایک گھر تھا جو صرف اسی کا تھا۔ امیر باپ کی اس اکلوتی بیٹی کے پاس وہ سب کچھ تھا جو مکہ والوں کے تصور میں آ سکتا تھا۔ اس نے عبداللہ کو ان ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا جو اس کے باپ کو جنت سے نکال کر زمین پر لے آئی تھیں اور جو عبداللہ کو فاطمہ کے گھر میں لے گئیں۔ فاطمہ کا گھر قریشی جوانوں کی نشست گاہ تھا۔ ان کی شامیں اس حسین دولت مند اور ذہین خاتون کے گھر میں گزرتی تھیں۔ لیکن عبداللہ ان محفلوں میں کبھی شریک نہ ہوا تھا

عبداللہ کو مکہ کی کئی لڑکیاں رشک کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ جب اس کا باپ عبدالمطلب اسے بیت اللہ میں لے گیا اور کاہنوں نے بتوں کی طرف سے اس کی قربانی مانگی تو قریش کی لڑکیوں نے اپنے گریبان چاک کر دیئے۔ فاطمہ کو وہ دن یاد تھا جب یہ حسین نوجوان موت کی آغوش میں جا رہا تھا اسے وہ مسکراہٹ یاد تھی جو موت کو دیکھ کر بھی اس کے چہرے سے جدا نہ ہوئی تھی۔ اور جب اس کا باپ اس کے بدلے اونٹ ذبح کر رہا تھا تب بھی اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ ہوتی تھی۔ یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کا ایک حصہ بن چکی تھی جس کے پیچھے صبر و استقامت کا طوفان موجزن تھا۔

اور اس دن سے یہ نوجوان فاطمہ کے دل پر شبنم کا قطرہ بن کر گرا۔ یہی قطرہ جو صبح کے طلوع ہونے پر پھول کے جگر پر گرتا ہے لیکن اس نے نہ دیکھا۔ دن اور مہینے گزر گئے وہ خاموش رہی اور ایک شام جب

اسے معلوم ہوا کہ عبداللہ کی منگنی آمنہ بنت وہب سے ہو چکی ہے تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور وہ اپنی سہیلیوں سے اپنا دردِ دل کہنے لگی۔ یہ میں نہیں کہہ رہا کہ عبداللہ فاطمہ کے دل پر شبنم کا قطرہ بن کر گرا۔ یہ تشبیہ خود فاطمہ نے استعمال کی ہے۔ فاطمہ اپنی سہیلی عاتکہ بنت سہم سے کہا کرتی تھی۔

"تم جانتی ہو جب صبح طلوع ہوتی ہے اور شبنم کا قطرہ پھول کے جگر پر گرتا ہے تو پھول کو کتنی لذت محسوس ہوتی ہے؟ جب سے مجھے اس نوجوان سے محبت ہوئی ہے میرا دل بھی وہ پھول ہے جس کے جگر کو صبح کی شبنم نے بھگو دیا ہے۔ تم جانتی ہو جب دوپہر قریب آتی ہے اور دھوپ میں شدت بڑھتی ہے تو پھول کا جگر شبنم کے قطرے کے لئے خون کے آنسو بہاتا ہے۔ جب اس نوجوان کی دوری کا صدمہ میرے دل کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو میرے پھول کا جگر عبداللہ کے لئے خون کے آنسو بہاتا ہے۔ آہ! عاتکہ تم جانتی ہو جب سورج ریت کا سینہ چیر کر اس میں چھپ جاتا ہے اور ریگستان کی وسعتوں پر رات کا پردہ تن جاتا ہے تو سحر کی قربت اور قطرۂ شبنم کی آمد کی نوید سن کر پھول کا کیا عالم ہوتا ہے؟ میں بھی صحرا کا نرم و نازک پھول ہوں جب صبح ہوتی ہے اور قریش حرم کی راہ لیتے ہیں یا دن ڈھلتا ہے اور وہ اپنے گھروں کو واپس لوٹتے ہیں تو محبوب کی ایک جھلک دیکھ لینے کی امید پر میرا دل میرے قابو میں نہیں رہتا۔"

عاتکہ اسے تسلی دیتی۔ اس کا جی بہلاتی لیکن بات کبھی تو بات مذاق تک پہنچ جاتی۔ فاطمہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہارا قبیلہ تو بڑا سخت جان اور سنگ دل ہے۔ قریش صحراؤں کے ہلاکت خیز سفر سے اتنا نہیں گھبراتے جتنا تمہارے قبیلہ خثعم سے ڈرتے ہیں۔ اگر انہیں تمہارے قبیلے کا خوف نہ ہوتا تو تمہارے باپ کے پاس اتنی دولت کہاں سے آتی۔ تمہیں یہ قابل رشک زندگی اور یہ عالیشان مکان کہاں سے ملتا۔ حیرت ہے کہ اتنے سخت جان قبیلہ میں یہ نرم و نازک پھول کہاں سے پیدا ہو گیا جس کا جگر شبنم کے قطرے کے لئے خون ہوتا رہتا ہے۔

فاطمہ کی بے تابیوں نے بالآخر اس کی سہیلیوں کو اس کی چارہ سازی پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے فاطمہ کو سمجھایا اگر وہ آج آمنہ کو بیاہ کر لا رہا ہے تو کل بنو خثعم کے ہاں بھی عبدالمطلب بیٹے کی درخواست لے کر پہنچ سکتا ہے؟

لئے قریش کا لڑکا ہے اور قریشیوں کی نرم دلی اور زندگی سے محبت کو کون جانتا۔ آج آمنہ کے حسن نے اسے موہ لیا ہے تو کل جب تم اس کے حرم جاؤ گی تو سب چراغ اس ماہتاب کے سامنے ماند پڑ جائیں گے۔ جو شمع سے بڑھ کر اور سحر کیا ہو سکتا ہے۔"

اور آج جب عبداللہ اس گلی میں سے گزرا تو اسے روکنے کی ترکیب فاطمہ میں سہیلیوں نے سوچی:۔

فاطمہ کی آنکھوں میں سے ٹھنڈی ٹھنڈی شعاعیں نکل رہی تھیں ان رغبت تھی، محبت تھی۔ درد تھا محرومی کا المناک احساس تھا۔ مجھے یوں نہ یہ نظریں مجھے ڈس رہی ہیں۔ تمہارے چہرے پر صبح کی تازگی ہے۔ آنکھوں جادو اور آواز میں وہ مٹھاس اور رس ہے جو دلوں کو پگھلا دیتا ہے۔ ری ہے، میں پھر آؤں گا۔"

"لیکن یہ لمحہ پھر نہیں آئے گا۔ اس کا رس صرف اسی وقت نچوڑا جا سکتا وقت ایک مسلسل حرکت کا نام ہے وہ کسی کی تمناؤں اور ارمانوں کے لئے رکتا۔ رک جاؤ۔ خدا کے لئے رک جاؤ۔ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ دامن میرے ہاتھوں سے چھوٹا جا رہا ہے۔ اسے پکڑ لو۔ میری مدد کرو۔ مضبوط ہاتھوں میں میرے ہاتھوں کو جکڑ لو۔ تم آمنہ سے بہت خوش ہو وہ کیا ہے جو میرے پاس نہیں۔ میرا نہ کوئی بھائی ہے۔ نہ بہن۔ یہ ساری میری ہے۔ میرے ہونے والے شوہر کی ہے۔ آخر وہ شوہر تم کیوں نہیں ۔ دیکھو! میری طرف دیکھو۔ تمہارے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے ہے۔ یہ گھر بالکل خالی ہے۔ یہاں کوئی نہیں۔ صرف زندگی اور اس کی بے لذتیں ہیں۔ جو ہماری راہ تک رہی ہیں۔ آؤ انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ میرے ساتھ آگے بڑھو! کیا سوچ رہے ہو؟"

لیکن عبداللہ کے دل پر خوف چھا رہا تھا۔ ایک نامعلوم موہوم سا ۔ وہ عبدالمطلب کا بیٹا تھا۔ اس نے زندگی کی ان لذتوں کی طرف نے سے انکار کر دیا۔

"مجھے تمہارے خاموش چہرے پر تمہارے باپ کا زہد اور تقویٰ نظر آتا ہے"

"نہیں یہ بات نہیں۔ میں شام کو آؤں گا۔"

"میں یقین کر لوں اس وعدے پر؟"

اور جب شام کو مالک نے فاطمہ سے عبداللہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"آمنہ نے شبنم کا قطرہ اپنے ہونٹوں سے چوس لیا ہے۔"

آمنہ کے چہرے پر وہی حلاوت اور طمانیت تھی جو اس کے شوہر کو صبح صادق کے وقت اس سے جدا ہوتے ہوئے نظر آیا کرتی تھی جب صبح ٹھنڈے ٹھنڈے گہرے سانس لیتی تھی اور جب اس کی نرم نرم انگلیاں مکہ کے گرد و پیش میں بکھری ہوئی ریت میں گڑ جاتی تھیں۔ آمنہ کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ اس کے ہونٹوں میں ٹھہراؤ تھا کہیں بھی آنے والے فراق کی کپکپی نہیں تھی۔ عبداللہ کے دل میں چھپا ہوا غم اس کی آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔ اور اس کی نگاہیں آمنہ کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ یہ طویل نظریں اس چہرے کو اپنے دل میں محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔ طویل اور مشقت آمیز سفر میں اس روشن چہرے کی یاد ہی سفر کی کلفتوں کو کم کر سکتی تھی لیکن آمنہ اپنے شوہر کو زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکی۔ اس کی نگاہیں اس جوان اور پژمردہ چہرے کی طرف اٹھتیں اور شرم و حیا کے بوجھ سے جھک جاتیں۔ جب وہ چپ چاپ گھر سے نکلا اور اپنے بھائیوں کے ساتھ قافلے کے پڑاؤ کی طرف چل پڑا۔ تب بھی اس کی بیوی خاموش رہی۔ اس کا پورا وجود خاموش تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں آہستہ آہستہ مدھم پڑ رہی ہیں۔ حیات قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے لیکن اس کی روح جسے غم نے جلا بخشی تھی رو رہی تھی، کانپ رہی تھی۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

قافلہ روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد مکہ کے لوگ مکانوں پر چڑھے دور صحرا کی وسعتوں میں گم ہوتے ہوئے قافلہ کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں وہ آنکھیں آمنہ کی بھی تھیں۔ اب ان خاموش آنکھوں میں آنسو تھے۔ بنو ہاشم اور بنو زہرہ کی عورتیں دلہن کو تسلی دے رہی تھیں۔ لیکن یوں کبھی تو ہوا ہے کہ لوگ تجارتی قافلوں کے ساتھ گئے۔ ہزاروں امیدیں اور آرزوئیں لئے ہوئے لیکن واپس نہ لوٹے۔ شروع کے دن تو موت و حیات کی کشمکش میں گزرے۔ جسم گھر میں تھا اور روح شام جانے والے قافلے کی تلاش میں صحراؤں میں بھٹک رہی تھی۔ زندگی کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اپنی اپنی جگہ پر بے چین اور مضطر ننھا سا گھر کا کام کر لیا۔ دعا رہائیں کرتیں اور پھر ایک جامد اور مہیب خاموشی جو اس چہرے سے جدا نہ ہوتی ساتھی کا تخیل عبداللہ کے

تو ساتھ شام کی طرف چلا جا رہا تھا لیکن کس راستے پر؟ اس نے یہ ہوئے موہوم راستے کب دیکھے تھے؟ صرف باتیں سنی تھیں ان باتوں کی سے وہ اپنے ذہن میں ایک تصویر بنالیتی اپنے شوہر کے سفر کا سے تیار کرتی اس میں رنگ بھرتی۔ لیکن یہ رنگ شام جانے والے راستے اڑتی ہوئی ریت کے گرم گرم ذروں میں چھپ جاتے۔ تب اس کا گھٹنے لگتا۔

ایک صبح جب وہ بیدار ہوئی تو ایک عجیب و غریب احساس اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ لذت ہے یا الم۔ اس خواب میں ایک دھندلی سی شبیہہ دیکھی۔ وہ نہ اس کی شکل دیکھ سکی اور نہ آواز سے اسے کچھ معلوم ہوا۔ یہ شبیہہ مرد کی تھی یا عورت کی ی تھی یا جوان؟ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ غیر مانوس نہیں تھی اس میں بڑا اپنا پن تھا۔ وہ شبیہہ اس کے قریب آئی اور جھک کر بڑے رازدارانہ انداز میں اس کے کان میں کہا:-

"تمہیں معلوم ہے تم ماں بننے والی ہو؟" میں کچھ نہیں سمجھی۔ "تم جانتی نہیں یہ معلوم ہے؟" "نہیں! مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔" "تم تو دنیا بزرگ ترین شخصیت کو جنم دینے والی ہو اس سے زیادہ مقدس انسان اس زمین پر قدم نہیں رکھا۔" اتنا کہہ کر یہ شبیہہ غائب ہو گئی۔ اس کی کھلی تو وہاں کچھ نہیں تھا صرف ایک عجیب سا احساس اور تفکر موجود۔ کیا وہ واقعی ماں بننے والی ہے؟ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ماں بننا آسان ہے اور اسی لئے وہ اس خواب کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی لیکن بنو ہاشم کی عورتیں اس شام آمنہ سے ملنے آئیں تو اس نے جھجکی ہوئی دل سے انہیں رات کا خواب سنایا اور جب انہوں نے آمنہ سے دو باتیں پوچھ کر اسے بتایا کہ خواب سچا ہے اور واقعی ماں بننے والی ہے تو عبداللہ یاد اس کے دل میں سوئیاں چبھونے لگی۔

لیکن اس دن سے اطمینان اور آسودگی کی ایک وسیع فضا نے اپنی محبت بھری آغوش میں لے لیا۔ اب وہ شوہر کی واپسی کا انتظار پہلے سے زیادہ بے تابی سے کرنے لگی۔ اف! جب وہ آئے الگ لیجا کر میں یہ نوید مسرت سنائے گی تو سفر کی تھکن کہاں باقی رہیں گی لیکن عبداللہ کو یہ خوشخبری سنائے گی کیسے؟ الفاظ کہاں سے آئیں گے؟ آمنہ

وہ تعویذ گلے میں لٹکاتے جو بنو ہاشم کی عورتیں انہیں دیتیں لیکن یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ کئی دفعہ جب وہ سو کر اٹھتی تو تعویذ اس کے گلے میں نہیں ہوتے۔ فرش پر بکھرے ہوئے ملتے ہیں اس نے چند دن بعد تعویذ باندھنے ہی چھوڑ دیئے۔ اس نے اپنی اس حالت کا بہت انتظار کیا جس سے ہر ماں بننے والی عورت کو ماں بننے سے پہلے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن اس نے اس طرح کی کوئی بات محسوس نہیں کی۔ اس کی سہیلیاں اس منفرد صورت حال سے سخت متعجب تھیں۔ کتنا سکون تھا ان دنوں۔ جب وہ بستر پر لیٹتی تو اس کی آنکھوں کے سامنے ان دیکھے مناظر گردش کرنے لگتے۔ اس کے کانوں میں نامعلوم میٹھی آوازیں رس ٹپکاتی رہتیں۔ اس کی راتیں انہیں خوابوں میں گذرتیں اور جب صبح کی جبیں چمک اٹھتی تو وہ تازہ دم بستر سے نیچے اترتی سستی اور تھکان کا تو وہ تصور ہی بھول گئی تھی اس کا جی چاہتا وہ کبھی راتوں میں ڈھل جائیں اور وہ خواب دیکھتی رہے۔ ان میں رنگ بھرتی رہے۔

پھر وہ وقت آیا جب لوگ قافلہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ قریش کی دوسری عورتوں کی طرح آمنہ کو بھی اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار تھا اور وہ اس کی تیاریوں میں مصروف تھی اسے عبداللہ کو ایک خبر بھی تو سنانی تھی۔ تنہائی میں چپکے سے۔ عبدالمطلب کو قافلے کا دوسروں سے کہیں زیادہ انتظار تھا۔ اس کا عزیز ترین بیٹا لوٹ رہا تھا۔ جب قافلے کے مکہ کے قریب پہنچنے کی بھی خبر ملی تو نوجوان قافلے کی طرف چل پڑے۔ بوڑھے شہر میں داخل ہونے والے راستوں پر جا کھڑے ہوئے اور بھائیوں بیٹوں اور شوہروں کی راہ میں آنکھیں بچھانے والی بہنیں، مائیں اور بیویاں گھر کے دروازوں پر جا کھڑی ہوئیں۔

ابھی قافلہ شہر سے دور تھا کہ عبداللہ کے بھائی واپس بھی آگئے۔ انکے چہروں پر خوشی کی جگہ ملال تھا۔ عبدالمطلب کی بوڑھی نگاہوں نے یہ سب کچھ دیکھا اور بیتابی سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔

"عبداللہ تو بیمار پڑ گیا ہے اور یثرب میں ننھیال والوں نے اسے روک لیا ہے۔" عبدالمطلب اور اس کے بیٹوں کے دل بیٹھے جا رہے تھے تو انہیں سارا قافلہ لٹا لٹا سا نظر آ رہا تھا اس قافلہ میں عبداللہ نہیں تھا شیخ کو آمنہ کی فکر نہ تھی اسے اس وقت صرف اپنا بیٹا یاد آ رہا تھا بیٹے کو اس نے اسی وقت یثرب روانہ کیا اور خود گھر کی طرف چل پڑے

اسے اپنے بیٹے کا بچپن یاد آیا، اور وہ دن یاد آرہا تھا جب اس نے حرم کعبہ میں اسے ہلکی سی سرزنش کے بعد قافلے کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہونے کو کہا تھا اسے وہ دن یاد آیا جب کعبہ میں بتوں کے سامنے عبداللہ کو قربان کیا جانے والا تھا۔ پھر اسے عبداللہ کی شادی کا دن یاد آیا اور اس کے ساتھ آمنہ کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

اس کے خوابوں کے محل ٹوٹ رہے تھے جب وہ اکیلی بیٹھتی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہتیں۔ اگر اس مسافر کو دیار غیر میں کچھ ہو گیا تو اس بچے کا کیا بنے گا؟ کیا یہ یتیم ہوگا؟ اسے باپ کی شفقت نہیں ملے گی؟ عبدالمطلب کے خاندان کے یہ دن آگ کے انگاروں پر لوٹتے ہوئے گذرے۔ اور ایک دن شام کو جب شیخ حرم کعبہ سے واپس گھر آرہا تھا تو اسے اپنا بیٹا ملا۔ وہ مکہ واپس پہنچکر سیدھا باپ کی تلاش میں نکل پڑا

میں اپنے بھائی کو تو نہ دیکھ سکا میرے بوڑھے باپ! میں نے بنو نجار کے گھروں کے قریب ایک قبر دیکھی ہے۔ مجھے اپنے ننھیال والوں نے کہا کہ بھائی سے مل لو۔ اب ہم سے تو وہ بولتا ہی نہیں۔

اور پھر ایک شام جب قریش کے نوجوان فاطمہ بنت مر الخثعمیہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو عبداللہ کے سفر اور مسافرت میں موت کی بات چل نکلی۔ فاطمہ کی درخشاں پیشانی پر دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے غم کی ہلکی سی تہہ بچھ گئی۔ ذرا سی دیر کے لئے اس کی پلکوں پر ایک آنسو لرزا اور کپکپاتے ہونٹوں کے گوشوں میں چھپ گیا۔ مالکہ! تم نے کبھی صبح کے وقت پھولوں کے جگر پر شبنم کا قطرہ گرتے دیکھا ہے؟...... ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے فاطمہ کی آواز بہت دور سے آرہی ہے۔

(بشکریہ "الجماعت")

اگر آپکا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے!

تو اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری نومبر ۶۰ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہی سمجھیں گے کہ وی پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم:۔ منیجر "مشیر" کراچی

۹۲۳۔ جناب خان محمد صاحب میاں چنوں

۲۲۲۳۔ جناب رحمت اللہ خاں صاحب لاہور

۲۳۱۱ جناب امان اللہ خاں صاحب تحصیل لیہ

۲۳۳۰ جناب وسیم الحق صاحب کراچی۔

۲۳۹۲۔ جناب غلام اسمٰعیل صاحب مجددی اڈیرہ لال

۲۳۳۰ محترمہ سجیہ تسنیم صاحبہ اوکاڑہ

۲۴۳۹ جناب محمد حمید صاحب قریشی کراچی

۲۴۹۲ جناب ایم اختر امام صاحب میمن سنگھ

۲۵۵ جناب محمود احمد چغتائی صاحب گوجرانوالہ

۲۵۶۱ جناب ملک عبدالقیوم فضل الٰہی صاحب سوہدروی طارق آباد

۲۵۹۲ جناب عبدالغفار آدم صاحب کھاکی کراچی۔

بتا کے ایسا رازِ خاص رازداں گذر گیا
دل و جگر سے ایک تیرِ بے اماں گذر گیا

جہاد سے ہی عارضِ حیات پہ شگفتگی
ترے یقیں سے اب یہ سودِ بے زیاں گذر گیا

یہ شاخ گل پہ زمزموں کی دھن تراشتے رہے
نشیمنوں پہ بجلیوں کا کارواں گذر گیا

ابھی تو دھوپ چڑھ رہی ہی دوپہر کے واسطے
ابھی یہ دو قدم پہ ہے جو کارواں گذر گیا

چلو کہ بج گیا گجر، اٹھو کہ صبح ہو گئی
بڑھو کہ وقت انتظارِ امتحاں گذر گیا

پیام دو کہ عصرِ نو کو چاہیے جواں لہو
پکار دو کہ وہ زمیں وہ آسماں گذر گیا

نفس نفس پہ مغفرت، قدم قدم پہ برکتیں
جدھر جدھر کو وہ شفیع عاصیاں گذر گیا

جہاں نظر نہیں پڑی وہاں ہے رات آج تک
وہیں وہیں سحر ہوئی جہاں جہاں گذر گیا

ظفر اقبال ظفرؔ •

کبھی چمن سے جو ہم ناگہاں گزرتے ہیں
ترے بغیر بہت سرگراں گذرتے ہیں

زبانِ برگ، گل و لالہ کے تبسم سے
چمن میں سن کے تیری داستاں گذرتے ہیں

وہ دِل کہ جس میں کبھی آپ تھے اُسی دل سے
غمِ حیات کے اب کارواں گذرتے ہیں

ہجومِ لالہ و گل، دورِ جام، آبِ رواں
جو تم نہیں تو یہ منظر گراں گذرتے ہیں

بچھے ہیں دیدۂ و دل فرشِ راہ جن کے لئے
نظر چُرا کے وہی مہرباں گذرتے ہیں

عجب نہیں کہ اُلٹ دیں بساطِ بزمِ جہاں
وہ سانحے بھی تہِ آسماں گذرتے ہیں

کِسی کے حُسنِ تصور کا فیض ہے کہ ظفرؔ
ہجومِ غم سے بھی ہم نغمہ خواں گذرتے ہیں

عشرت قادری

○

جو فلک سے تیر چھوٹا ہوا یوں خطا نشانہ
کہ چمن پہ برق ٹوٹی جلی شاخ آشیانہ

مجھے خوش نہ آئی الفت یہ ہے اور بات لیکن
کہیں دل سے چھوٹتا ہے ترے پیار کا زمانہ

ترے میکدے میں ساقی کوئی ایسا دن بھی آئے
ملے ساغرِ سحر میں مجھے بادۂ شبانہ

یہ ہے ایک خاص نسبت، تری زلف و رخ سے ظاہر
مری شام کی کہانی، مری صبح کا فسانہ

جو بہار اب کے آئے تو کچھ اس ادا سے آئے
کہ ہر ایک شاخ گل پہ بنے اپنا آشیانہ

تری انجمن سے باہر کئی مشغلے ہیں لیکن
دل سکون دل نے پایا نہ ملا کہیں ٹھکانہ

غم زندگی نے عشرت مجھے یہ بھی دن دکھائے
مجھے دیکھتی ہے دنیا بہ نگاہِ قاہرانہ۔

امجد قریشی

○

فروغ تیرہ شبی کا جو بول بالا ہے
نظام کہنہ کا یہ آخری سنبھالا ہے

ہمیں یہ حق ہے کہ حسن چمن سے دل بہلائیں
جگر کا خون بھی اشکوں میں ہم نے ڈھالا ہے

یہ اہل جور کا نازِ ستم گری کب تک
زمانہ اور ابھی کروٹ بدلنے والا ہے

بدل گیا ہے بظاہر نظام مے خانہ
وہی شراب ہے باقی وہی پیالہ ہے

مرا پیام ہو امجد کیوں نہ اُمید افزا
مری نظر میں اندھیرا نہیں اُجالا ہے

کامل بہزادی •

ترے مے خانے پہ ساقی جب گھٹا چھا جائے ہے
مجھ کو مایوسیٔ رفتہ کا خیال آ جائے ہے

تم نے دیکھیں ہمسفرو! باغباں کی سازشیں
آشیانہ آتشِ گل سے جلایا جائے ہے

جاگنے والا ہے شاید پھر جہاں میں انقلاب
پھر دلِ مظلوم انگڑائی سی لیتا جائے ہے

صبحِ نو پر پڑ رہی ہیں رات کی پرچھائیاں
خیر ہو یارب کہ دل رہ رہ کے بیٹھا جائے ہے

کتنے مجبوروں کی چیخیں پھیلتی ہیں کانپ کر
جب کوئی نغمہ ربابِ دل پہ لہرا جائے ہے

پھینک دو اُن مشعلوں کو پھونک دو ایسے چراغ
روشنی میں بھی اندھیرا جن کی پایا جائے ہے

بے بسوں کے آنسوؤں سے سج رہی ہیں محفلیں
آہ! اس انداز سے بھی ظلم ڈھایا جائے ہے

آج کیا سب آشیانے بجلیوں کی زد میں ہیں
تھرتھرا کر کیوں گلوں کا رنگ اڑتا جائے ہے

کچھ توجہ ہی نہیں کرتے اڑا دیتے ہیں وہ
حالِ دل ان کو اگر کامل سنایا جائے ہے

خورشید احمد •

انتظارِ بہار

زمانہ اُن کے تلطف سے سازگار رہا
خزاں کے دور میں بھی موسمِ بہار رہا

حریمِ دل پہ کھلے رازہائے سوزِ دروں
جنوں کی لوح پہ جب خارِ غم نگار رہا

کسی کی موجِ تبسم کی تلخیاں توبہ
حواس و ہوش پہ مجھ کو نہ اختیار رہا

بلا سے جان گئی امتحانِ الفت میں
مجھے تو ان کی وفاؤں کا اعتبار رہا

صنم کدوں میں گئے عرش سے بھی ہو آئے
ہر ایک سمت ترا جلوہ آشکار رہا

تمام رات کٹی داغِ دل جلاتے ہوئے
مگر نہ آئے مجھے جن کا انتظار رہا

اُجڑ گیا چمنِ آرزو مگر خورشید
مجھے بہاروں کے آنے کا انتظار رہا

نصیر پرواز صدیقی ●

O

چاندنی رات میں ٹھنڈی ٹھنڈی پون — مجھ کو ڈر ہے نہ سو جائیں اہلِ چمن
زندگی کو بنائیں گے جب ہم دُلہن — موت کو بھی پہننا پڑے گا کفن
خود سنبھالے ہوئے ہیں وہ دار و رسن — بڑھ نہ جائے کہیں میرا دیوانہ پن
آپ اور آپ کا حُسنِ توبہ شکن — جیسے شبنم کا منہ چومتی ہو کرن
اس میں کچھ سازشیں باغبانوں کی ہیں — ورنہ ناراض ہوتی بہارِ چمن؟
میکدے کی روایت پہ حرف آئے گا — پڑ گئی گر کسی کی جبیں پر شکن!
چاہیئے اور کچھ اب جنوں کو مرے — امتحاں عشق کا اور دار و رسن!
پھر یقیناً بہاروں نے انگڑائی لی — چاک ہونے لگے خود بخود پیرہن
قافلے والو ہشیار ہو کر چلو! — راہبر بن کے آئے ہیں کچھ راہزن
دل میں غم لے رہا ہے یوں انگڑائیاں — جیسے گھونگھٹ میں شرمائے کوئی دُلہن

ننگِ فن ہیں وہ فنکار پرواز جو
چند سکوں میں بیچ دیں اپنا فن

(چراغِ راہ)

فیروز نظر ●

O

منقطع ہو گیا وفا کا چلن — رشتۂ اعتبار ٹوٹ گیا
آپ کی بے رُخی ہے بندہ نواز — دل سا بھی غمگسار ٹوٹ گیا
آج ساقی کے دیکھ کر تیور — میکشوں کا خمار ٹوٹ گیا

اے نظر کیوں اُداس ہیں کلیاں
کیا فسونِ بہار ٹوٹ گیا؟

اصغر مینائی •

حادثۂ وقت سے ٹکراتے رہے ہیں
عزم جہانگیر کو چمکاتے رہے ہیں

ہر چند کہ ہم خار بدامن تھے ازل سے
ہر عہدِ خزاں رنگ کو مہکاتے رہے ہیں

سا ہے کہاں طالبِ اندوہِ محبّت
ہنس کے ترے درد کو اپناتے رہے ہیں

ملتی تھی جہاں لذّتِ تسکین تڑپ سے
اس دور میں کچھ ایسے مقام آتے رہے ہیں

لوگ سفینوں کا سہارا نہیں لیتے
ینۂ گرداب پہ لہراتے رہے ہیں

ہر رنگ میں مستور تھی تخلیق تجلّی
کچھ جلوے بہر گام نظر آتے رہے ہیں

رکی ہر ایک بات نہیں مضحکہ انگیز
نے کبھی ہوش میں بھی آتے رہے ہیں

انوار انجم •

مظالم میں کمی گرچہ نہیں اے آسماں اب بھی
مگر واللہ تجھ سے ہم نہیں ہیں بدگماں اب بھی

سنا ہے کہ بہار آئی ہے گلشن میں مگر اے دوست
نظر ہم کو تو آتا ہے وہی دورِ خزاں اب بھی

خدایانِ نظامِ نو سے ہم کو پوچھنا یہ ہے
ہر اک کے لب پہ آخر کیوں ہے فریاد و فغاں اب بھی

ہے جو باعثِ بربادیٔ گلشن حقیقت میں
انہیں کے ہاتھ میں انجم ہے نظمِ گلستاں اب بھی

انور افسری •

تین شعر

پہلے پہلے تو نشاطِ دل و جاں تک پہنچے
رفتہ رفتہ وہ مرے سوزِ نہاں تک پہنچے

کیوں محروم تمنائے سبو ایک ہمیں
زاہدِ خشک بھی جب پیرِ مغاں تک پہنچے

دور ہے دل سے ابھی روشنیٔ صبحِ نشاط
تیرگیٔ شبِ غم جانے کہاں تک پہنچے

احمرؔ رنگون

معراجِ تغزل

وفا کا شوق ہے معراج عاشقی کے لئے
اجل سے کھیل رہا ہوں میں زندگی کے لئے

سحر کا نور ہے پوشیدہ شب کی ظلمت میں
الم خوشی کے لئے گریہ ہے ہنسی کے لئے

اگر گلوں سے نوازا ہے تو نے اوروں کو
تو چند خار مرے دامن تہی کے لئے

کتاب دہر کا ہے صفحہ صفحہ غور طلب
سبق ہے اہل بصیرت کا آدمی کے لئے

تو اس جہان میں دادِ عمل بھی دے ناداں
دعا نہ مانگ فقط اوجِ برتری کے لئے

خیالِ یار کی رنگینیاں ہیں پیش نظر
اب اور چاہیئے کیا مجھ کو بیخودی کے لئے

بہار جھوم رہی ہے، پلا پلا ساقی
فضا چمن کی موافق ہے میکشی کے لئے

مقام دید بہت سطحِ عقل سے ہے بلند
نگاہ چاہیئے انوارِ سرمدی کے لئے

مطالعہ ہے حقائق کا رات دن احمرؔ
سرور و نور سے معمور شاعری کے لئے

(استقلال)

ابن انشاء

کچھ دے اسے رخصت کر

کچھ دے اسے رخصت کر کیوں آنکھ جھکالی ہے
ہاں در پہ ترے مولا! انشا بھی سوالی ہے

اس بات پہ کیوں اس کی اتنا بھی حجاب آئے
فریاد سے بے بہرہ، کشکول سے خالی ہے

شاعر ہے تو ادنیٰ ہے، عاشق ہے تو رسوا ہے
کس بات میں اچھا ہے کس وصف میں عالی ہے

کس دین کا مرشد ہے، کس کیش کا موبد ہے
کس شہر کا شحنہ ہے، کس دیس کا والی ہے

آداب کو اُٹھتے ہیں، یوں بزم میں دل والے
حضرت نے مشیخت کی اک طرح نکالی ہے

آوارہ و سرگرداں، کفنی بہ گلو پیچاں
داماں بھی دریدہ ہے، گدڑی بھی سنبھالی ہے

ارباب محبت میں، اصحاب ارادت میں
عزت بھی مٹا لی ہے، تمکیں بھی گنوالی ہے

آداب سے بیگانہ، در آیا ہے دیوانہ
نے ہاتھ میں تحفہ ہے، نے ساتھ میں ڈالی ہے

بخشش میں تامل ہے اور آنکھ جھکالی ہے
کچھ در پہ ترے مولا یہ بات نرالی ہے
انشا کو بھی رخصت کر، انشا کو بھی کچھ دیجے
انشا سے ہزاروں ہیں، انشا بھی سوالی ہے

شاہد احمد زماں صمدانی مرحوم •

دو بہنیں!

(اردو اور برمی زبان کا مخلوط نمونہ)

(۱)

قسم ہے اپنے بڑے بھیا کی کلا کی صحبت چما مچا[1] نی پھوٗ
اِدھر ہوئی شام اُدھر وہ پہنچا یہ اس کی عادت چما مچانی پھوٗ
تم اس میں چاہے تو قند گھولو، گلاب چھڑکو کہ دودھ اُنڈیلو!
پیوں گی اپنا ہی پیچھے لے[2] لے تمہارا شربت چما مچانی پھوٗ
پنھا کے شلوار اور کرتہ لپیٹا اوپر سے اک دوپٹا
اب اس پہ کہتے ہو اوڑھ برقعہ یہ اپنی درگت چما مچانی پھوٗ
نہ مجھ کو میلے میں لے کے جاؤ کبھی نہ پھو[3] سیں پوئے دکھاؤ
گزار دوں عمر قید میں رہ کے ایسی عزت چما مچانی پھوٗ

(۲)

قسم ہے اپنے خدائے واحد کی، عیش و عشرت چما مچانی پھوٗ
تلاش بودھ، خیال زیور، یہ زیب و زینت چما مچانی پھوٗ
ملے اگر علم دیں کا ساغر، ہو جس سے آسودہ روح اپنی
پلا سکو تو پلاؤ مجھ کو، تمہارا شربت چما مچانی پھوٗ
میں ہو کے عورت تماشا دیکھوں سنگار کر کے پوے[4] میں جاؤں
نظر ہو نامحرموں کی مجھ پر، یہ اپنی دُرگت چما مچانی پھوٗ
حیا کو بالائے طاق رکھنا، تمہارے ہمراہ سیر کرنا
کہوں گی یہ گر بُرا نہ مانو کہ ایسی عزت چما مچانی پھوٗ

[1] میں پسند نہیں کرتی [2] چائے [3] برما کے مشہور ناچنے والے کا نام پھوسیں ہے [4] ناچ ۔

(استقلال)

سُرخیٔ خیال

● ———— خورشید خضر

نوٹ: اس نظم کا اسلوب زبان وغیرہ خالص ترقی پسندانہ ہے۔ کوئی صاحب تنقید فرما کر رجعت پسندی کا ثبوت نہ دیں۔

میری محبوبۂ دلدار حسیں
تیری چپل پہ پسینے کی یہ ننھی بوندیں
جیسے مزدور کے ماتھے پہ کڑک دھوپوں میں
عرق ہو رقص کناں
اور مرے دل میں یہ رہ رہ کے خیال آتا ہے۔
میری محبوب کی چپل پہ پسینہ کیوں ہے!

○

جانِ من مجھ سے ملا کر تو جہانوں سے پرے
سُرخ پرچم کے تلے
دور ہی دور ستاروں سے بہت دور کہیں
ایسطالین و لینن کی جہاں روح ملے
جنّتِ سُرخ کے ارباب کا مسکن ہے جہاں
ہاتھ میں ہاتھ لئے ہم بھی وہاں جائیں گے
سُرخ آکاش کی کھڑکی سے کریملین کے میناروں کو
ہر صبح جھانک کر آنکھوں کو ضیا بخشیں گے
لیکن اے جانِ جہاں مجھ کو بتا دے یہ ذرا
تیری چپل پہ پسینے کی یہ ننھی بوندیں
بار میں جیسے کہ ہر شب کو مرے ہونٹوں سے
میز کے شیشے پہ گر جاتی ہے وسکی کی پھوار
اور میں سوچ میں پڑجاتا ہوں

میری محبوب کی چتون پہ پسینہ کیوں ہے!!

○

جانِ من مجھ سے ملا کر تو عطا رد کے دریچے کے قریب
جہاں مزدور کی چیخیں نہیں آہیں بھی نہیں
رقصِ رو بل نہیں ڈالر کا جہاں شور نہیں
گھن گرج بھی نہیں لوہے کی مشینوں کی جہاں
اے میری جانِ جگر، جانِ چمن، جانِ بہار
اس سے پہلے ہی کہ مزدور یہاں آ پہنچیں
اس سے پہلے ہی کہ دہقانوں کے بھوکے بچے
چیختے دھاڑتے، روتے ہوئے آجائیں یہاں
سُرخ گھوڑوں کی لگاموں کو چلو تھام بھی لیں
آگیا وقت سفر دوڑ چلو بھاگ چلو
ان کی چیخوں سے کہیں ان کی پکاروں سے کہیں
عزم دل بازی و جذبات مرے اُلفت کے
رُک بھی سکتے ہیں کہیں یہ بھی بھلا ممکن ہے؟
نہیں ممکن، نہیں ممکن، نہیں ممکن یہ کبھی

○

بکھری زلفیں یہ تیری، ہونٹ کی لالی یہ حسیں
سُرخیٔ پرچمِ مزدور کی مانند ہیں
ہمکو منزل کے نشانوں کا پتہ دیتی ہے
لیکن اے جانِ تمنّا تو بتا دے یہ ذرا
بارہا مجھ کو یہ رہ رہ کے خیال آتا ہے
مدتوں یونہی میں پھر سوچ میں پڑ جاتا ہوں
میری محبوب کی چتون پہ پسینہ کیوں ہے!!!
میری محبوب کی چتون پہ پسینہ کیوں ہے!!!

طنز و مزاح

مِس چنبیلی

کنھیا لال کپور

وہ جو شیخ سعدی نے کہا ہے "پیر شو بیاموز" بالکل بجا کہا ہے۔ برسوں ادبی رسائل میں مضامین لکھتے رہے۔ مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ ہم بھی ادیب ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہوا کہ دو چار ایڈیٹروں سے واقفیت ہو گئی۔ اور انکے تقاضوں نے ناک میں دم کر دیا۔ یا کچھ ادبی قسم کے لوگ جو ہمیں پہلے ہی سے جانتے تھے۔ اب ذرا اچھی طرح جاننے لگے اگر کسی ایسی مجلس میں مدعو کئے گئے جہاں شہر کے شرفاء و رؤسا بھی موجود تھے اور کسی شخص نے ازراہِ ہمدردی ہمارا تعارف ان سے کرایا۔ تو ہمارا استقبال اسی قسم کے کلمات سے کیا گیا۔

"مرزا ازبک ——— کون ازبک؟ ——— کہیں وہی تو نہیں جن کے پان بہت مشہور ہیں۔ اچھا کبھی جونا منڈی سے گذرنے کا اتفاق ہوا تو ضرور انکے پان کھائیں گے۔"

"اچھا۔ تو ہیں یہ مرزا ازبک! بخدا شکل و صورت سے بالکل ازبک نظر آتے ہیں۔"

"مشہور ادیب ہیں! ہم نے تو ان کا نام پہلی بار سنا ہے۔"

آخر ایک دن جو اپنی گمنامی کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ قصور اپنا ہی ہے۔ ادبی رسائل میں لکھنا پرلے درجے کی حماقت تھی۔ اول تو ادبی رسائل کی اشاعت ہی کتنی ہوتی ہے اور پھر انہیں خریدتا اور پڑھتا کون ہے۔ چند شعراء اور ادبا جنہیں رسالہ مفت بھجوایا جاتا ہے۔ یا کالج کے کچھ ذہین طلباء جنہیں غزلیں اور نظمیں پڑھنے کا شوق ہوتا ہے۔ لیکن جو ادبی رسائل سرے سے ہی نہیں پڑھتے۔ دراصل ادبی مضامین خشک بھی تو اتنے ہوتے ہیں کہ ان کے عنوانات پڑھنے کے بعد ہی لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ آئندہ صرف عوامی رسائل میں ہی لکھا کریں گے۔

اتفاق سے پتہ چلا کہ بمبئی کا مشہور فلمی رسالہ "فلم باز" اپنا "ایکٹرس نمبر" نکال رہا ہے۔ ہم نے فوراً ایک مضمون لکھا۔ عنوان تھا "مس چنبیلی سے ایک ملاقات" مضمون بہت پسند آیا۔ مبلغ ۵۰ روپے کا چیک بطور معاوضہ بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی "فلم باز" کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔ ہاں اپنی فوٹو بھجوا کر ضرور عنایت کیجئے گا۔

چیک کو دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔ اور بے اختیار منہ سے نکلا۔

"واللہ ہم بھی کتنے سادہ لوح تھے کہ ادبی رسائل میں لکھتے رہے۔ اگر شروع سے ہی "فلم باز" میں لکھتے تو آج خاصے مالدار ہوتے۔ ادبی مضامین سے جو موازنہ کیا تو پتہ چلا کہ جہاں ایک ادبی مضمون کے لئے گھنٹوں مغز پچی کرنا پڑتی ہے، وہاں ایک فلمی مضمون منٹوں میں لکھا جا سکتا ہے۔ "مس چنبیلی سے ایک ملاقات" کو ہی لیجئے۔ لکھا ہی کیا تھا ہم نے اس میں ...... یہی کہ ...... بڑا سا چھریرا بدن۔ خوب صورت ناک نقشہ۔ مس چنبیلی واقعی مس چنبیلی ہے ......

وہ ایک نہایت پر اسرار ایکٹریس ہے۔ اسے کالی بلیوں اور بھورے رنگ کے خرگوشوں سے والہانہ محبت ہے۔ وہ اپنی خوبصورتی برقرار رکھنے کے لئے دیسی گھی کا استعمال کرتی ہے۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید ہیں کیونکہ وہ ایک تیز چاقو سے انہیں ہر وقت کھرچتی رہتی ہے۔ اسے عطرِ حنا بالکل پسند نہیں۔ ایک دفعہ اس نے غلطی سے عطرِ حنا سونگھ لیا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے پتہ چلا کہ وہ عطرِ حنا نہیں تھا کلوروفارم تھا۔

مس چنبیلی صبح کا ناشتہ شام کا کھانا اور صبح کا کھانا شام کے وقت کھاتی ہے۔ ٹماٹر، گوبھی اور بینگن کے علاوہ اسے کوئی ترکاری پسند نہیں۔ اسے ہوائی جہاز چلانا بالکل نہیں آتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس شخص سے شادی کرے گی جو بہت اچھا ہوا باز ہو۔ کمرے کے ۔ خالی بوتلیں اور ٹین کے ڈبے اکٹھا کر کے کھلانے کا بے حد شوق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس مضمون کا چھپنا تھا کہ سارے شہر میں تہلکہ مچ گیا۔ جسے دیکھو "قومی ڈائجسٹ" کا ایکسپریس نمبر ہاتھ میں لئے، مبارکباد دینے چلا آ رہا ہے۔ "واہ ازبک صاحب واہ۔ خوب مضمون لکھا ہے۔ واللہ لطف آ گیا۔ کیا انکشافات فرماتے ہیں ـــــ سبحان اللہ۔ مضمون کیا لکھا ہے، قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔"

انہی دنوں کی بات ہے۔ کہ ایک شام ہم پان کھانے کے لئے کھتامل چوناملں کی دکان پر رکے۔ ہم نے دیکھا کہ دونوں پنواڑی ہمیں دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ ایک آدھ منٹ کے بعد کھتامل نے ذرا اونچی آواز میں کہا،

"تو تم ہی پوچھ لو نا۔ شرماتے کیوں ہو؟"

ہم نے پوچھا۔

"کیا بات ہے بھئی؟"

چوناملں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"جی ایک بات پوچھنا تھی۔"

"کہیے!"

"آپ مرزا ازبک ہیں نا؟"

"جی ہاں میں مرزا ازبک ہی ہوں۔"

"ہی ہی ہی۔ آپ کی فوٹو "قلم راج" میں دیکھی تھی۔ وہ مضمون (مضمون) چنبیلی پر۔۔۔۔۔ آپ نے لکھا تھا۔"

"ہاں صاحب۔ ہم نے لکھا تھا۔"

ہی ہی ہی۔ بہت اچھا مضمون ہے۔ ہم نے اسے پڑھا تھا۔ چنبیلی بہت اچھا کام کرتی ہے۔ جی۔ ہم نے اپنی دکان میں مس چنبیلی کی تصویریں لگا رکھی ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ اس کی دکان میں واقعی ـــ چنبیلی ہی چنبیلی نظر آتی ہے پیسے دینے کے لئے بٹوا نکالا ہی تھا کہ کھتامل نے ہمیں منع کرتے ہوئے کہا۔

"نا صاحب نا۔ ایسا نہ کیجیے۔ ہم آپ سے پیسے نہیں لے سکتے۔"

"لیکن کیوں؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اجی رہنے دیجیے۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ مس چنبیلی کو جانتے ہیں آپ سے بھلا کیسے۔"

بہت اصرار کیا لیکن وہ نہ مانا۔ بلکہ کہنے لگا۔ آئندہ بھی جب کبھی پان کا شوق فرماتا ہو۔ ہمیں یاد فرمایئے گا۔"

پان چباتے ہوئے سڑک پر چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک حوالدار نے پکار کر کہا۔

"اجی ازبک صاحب۔ ذرا ٹھہریئے تو۔"

حوالدار کو دیکھ کر ہمارا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ خدا خیر کرے کہیں اس کے پاس ہماری گرفتاری کا وارنٹ تو نہیں تھا۔ کہیں اسے ہم پر جیل سے بھاگے ہوئے کسی مجرم کا شبہ تو نہیں ہوا۔

حوالدار صاحب نے کہا۔

"میں برسوں سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ اچھا ہوا آپ اتفاقاً مل گئے۔"

"لیکن حوالدار صاحب ہم نے۔۔۔۔۔ ہمارا مطلب ہے۔۔۔ کہ"

"اجی ازبک صاحب۔ حوالدار صاحب نے ہماری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے تو کمال کر دیا۔ وہ مضمون جو آپ نے لکھا ہے تو میں پورا بخدا چار دفعہ پڑھ چکا ہوں۔ اور اتنی بار اور پڑھنے کا ارادہ ہے۔"

مضمون کا ذکر سن کر جان میں جان آئی۔ وہ فرمانے لگے۔

"آیئے نا۔ ذرا غریب خانہ تک۔ چائے پئیں گے۔ اور ساتھ ہی آپ سے مس چنبیلی کے بارے میں کچھ اور تفاصیل سنیں گے۔"

میرے انکار کے باوجود وہ مجھے اپنے ہاں لے گئے۔ چائے پینے کے دوران میں پوچھنے لگے۔

"ازبک صاحب۔ یہ جو آپ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ایک بار مس چنبیلی نے چور پکڑا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"جی ہاں۔ بالکل درست۔"

"لیکن وہ چور کون تھا؟"

"چور کہاں تھا قبلہ، وہ تو ایک فاقہ زدہ شاعر تھا۔"

"فاقہ زدہ شاعر؟"

"جی ہاں۔ بے چارہ گھر سے بمبئی آیا تھا۔ کہ فلموں کے گانے لکھے گا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ بمبئی میں واقفیت کے بغیر کہاں کام ملتا ہے۔ وہ ایک مہینے ہالی ووڈ کی خاک چھانتا رہا۔ اسی اثنا میں جو پونجی گھر سے لایا تھا ختم ہو گئی۔ آخر ایک دن اس نے چوری کرنے کی ٹھانی۔ ایک کمند تیار

لے کر رات کے ایک بجے مس چنبیلی کے کمرے میں داخل ہوا۔"

"پھر ؟"

"اچانک مس چنبیلی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور شاعر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی۔

"آپ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ شوق سے کیجیے۔ دیکھ

"سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"

دراصل یہ ایک فلم کا ڈائیلاگ تھا۔ . . . .

بس صاحب شاعر نے جب یہ ڈائیلاگ سنا تو غش غش کرنے لگا۔ تلوار اس کے ہاتھوں سے گر پڑی۔ اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مس چنبیلی نے کمال صفائی سے وہ کند تلوار اٹھائی۔ اور شاعر پر وار کیا بھوک سے تو وہ پہلے ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ فوراً زمین پر آ رہا۔ مس چنبیلی نے گھنٹی بجائی اور اس کے پٹھان ملازم نے شاعر کی مشکیں کس دیں۔ صبح اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

"خوب خوب۔ کمال کی دلیری دکھائی مس چنبیلی نے!"

"جی ہاں!"

"اچھا آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دفعہ مس چنبیلی نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ کیا قصہ تھا؟"

"صاحب یہ قصہ ذرا طویل ہے۔ پھر کبھی عرض کروں گا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔"

رات کے وقت جب گھر لوٹے تو ہمارے ـــــــ ڈاکٹر منور لال شریف لائے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے:۔

"قبلہ ازبک صاحب آپ تو چھپے رستم نکلے۔ یہ آپ نے لکھنا کب سے شروع کر دیا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ محض معلم ہیں۔ لیکن آپ تو اچھے خاصے ادیب بھی ہیں۔"

"قدر افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ ادیب تو کیا ہوں۔ یونہی مشغلے کے طور پر کبھی کبھار لکھا کرتا ہوں۔"

"اچھا ازبک صاحب! یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ مس چنبیلی صبح کا کھانا شام اور شام کا کھانا صبح کھاتی ہے۔ اس سے مس چنبیلی کو بدہضمی کی شکایت تو نہیں ہو جاتی؟"

"قبلہ۔ یہ سب عادت پر منحصر ہے۔ عادت اور مشق پر۔ ہمارا تو خیال ہے کہ اگر کوئی شخص تھوڑی سی مشق کرے۔ تو کچھ عرصہ کے بعد اسے صبح اور شام میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

"بہرحال میڈیکل نقطۂ نگاہ کو رہنے دیجیے۔ یہ فلم لائن ہے۔ اس میں سب کچھ چلتا ہے۔"

چند دنوں کے بعد ایک عطار کی دکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آداب بجا لانے کے بعد کرسی پیش کی اور کہنے لگے۔

"ازبک صاحب ہمیں معلوم نہ تھا۔ کہ آپ اتنے بڑے ادیب ہیں۔ ورنہ یہ گستاخی کبھی نہ ہوتی۔"

"کون سی گستاخی قبلہ!"

"پچھلے دنوں آپ شربت بنفشہ لینے آئے تھے اور ہم نے آپ سے پیسے لے لئے تھے۔"

"اس میں تو کوئی گستاخی نہیں۔ آخر پیسے تو آپ . . ."

"نہیں صاحب۔ یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ خیر آج اس کی تلافی . . کر دی جائے گی۔ شربت بنفشہ ہی چاہیے نا آپ کو؟"

"جی ہاں۔ چار تولے دے دیجیے۔"

"تولوں کا حساب چھوڑیئے ازبک صاحب آپ بوتل ہی لے لیجیے۔ ارے بھئی خیراتی لال۔ ازبک صاحب کو شربت بنفشہ درجہ خاص کی ایک بوتل لا دو۔"

"لیکن قبلہ مجھے بوتل نہیں چاہیے۔"

"اجی صاحب ہماری طرف سے ناچیز تحفہ سمجھ کر لے جائیے۔ واہ کیا مضمون لکھا ہے آپ نے!"

بوتل پیش کرنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ مس چنبیلی کے غائبانہ مداح ہیں۔ فلم بازی کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔ اور صرف یہی ایک رسالہ ہے جسے ان کی دکان پر پڑیا باندھنے کے کام میں نہیں لایا جاتا۔

ان کا شکریہ ادا کر کے پہنچا۔ تو چند فلم زدہ لڑکیاں وارد ہوئیں۔ بیچاری بے حد پریشان تھیں۔ اور میری رہنمائی چاہتی تھیں۔ ان میں سے ایک دریافت کرنے آئی تھی۔ کہ اگر میں ایک کالی بلی مس چنبیلی کو بھجوا دوں تو کیا وہ اسے قبول کر لیں گی؟

دوسری کے پاس کھوئے کا ذخیرہ تھا۔ وہاں سے سرقہ خیلی کی نذر کرنا چاہتی تھی تیسری یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ سرخ بیلی کو نسا دیسی صابن استعمال کرتی ہے؟ ان سب کو مناسب مشورے دیئے گئے۔ اور وہ خوش و خرم رخصت ہوئیں۔ اس دن ایک مشہور ادبی رسالہ کے ایڈیٹر صاحب کا خط ملا کہ وہ فانی بدایونی پر ایک خاص نمبر نکال رہے ہیں۔ اس لئے ہم انہیں ایک مضمون بعنوان "فانی کی شاعری پر تبصرہ" بار کاشت لکھ کر بواپسی ڈاک بھجوائیں۔ ہم نے جو انہیں جواب میں خط لکھا وہ سننے کے قابل ہے۔

"محترمی۔ غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ ادبی مضامین سے مدت ہوئی تائب ہو چکا ہوں۔ میرے خیال میں یہ سراسر تضیع اوقات ہے۔ نیز مالی لحاظ سے سخت خسارے کا سودا ہے۔ اگر میں آپ کے رسالے کے لئے مضمون لکھوں گا۔ تو زیادہ سے زیادہ آپ یہ کریں گے کہ ایک مضمون لکھ کر بھیجنے کے بعد آگر مجھے اپنا مضمون پڑھنے کا شوق ہوا تو میں خود ہی خرید لوں گا رسالہ بھی نہیں بھجوائیں گے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں صرف فلمی مضامین لکھا کروں گا۔ کیونکہ وہاں سے کچھ معاوضہ ملتا ہے کھانے کو پان اور پینے کو شربت بھی مفت مل جاتا ہے نیز ہمسائے سمجھتے ہیں کہ ہم واقعی بہت بڑے ادیب ہیں۔ صاف گوئی کے لئے معذرت چاہتا ہوں اگر مناسب سمجھیں تو میری طرف سے اپنے رسالہ میں یہ اعلان شائع فرمائیں کہ آئندہ کوئی ادبی رسالہ مجھ سے ادبی مضمون کا تقاضا نہ کرے"۔ فقط

"گل خزاں"

آشیانہ

حیدر جعفری سید

بیگم رحمٰن جب کلاس میں داخل ہوئیں تو ساجدہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی
ن سے اسے شدید نفرت تھی۔ ان کو دیکھ کر اسے نہ جانے کیوں غصہ آجاتا
ان کو دیکھتے ہی وہ سوچنے لگتی کہ جس طرح ہم لوگوں سے غلطیاں ہو جاتی
ی طرح اللہ میاں سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہوں گی۔ اگر اللہ میاں
ال نہ کرتے ہوتے تو بیگم رحمٰن کا رنگ کیوں گورا ہوتا۔ سارے گورے آدمی
ہوتے ہیں۔ بھیا، باجی، خالہ، امی، ابا سب گورے ہیں۔ تب ہی تو یہ
میرے دشمن ہیں۔ سارے گورے آدمی خراب ہوتے ہیں۔ ذرا سی کوئی
ہوئی تو "کالی کلوٹی" کہہ کر میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ امی بھی مجھے "کلو" یا
کلوٹی ہی کہتی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟ ہاں سچ ہی تو ہے۔ امی میری اصلی
ہیں ہیں، جب ہی تو وہ مجھ پر ہر وقت غرایا کرتی ہیں۔ میری اصلی امی
ر وہ سانولی ہوں گی۔ نہ جانے وہ اب کہاں ہوں گی؟ شاید دلی میں ہو۔
م دلی جائیں تو وہ مل جائے گی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اپنے سینے سے لگا لے گی
خوب پیار کرے گی۔ پھر وہ مجھ سے پوچھے گی:۔

"تجھے دال موٹ پسند ہے نا؟"

"جب میں کہوں گی "ہاں" تو وہ مجھے دال موٹ کا ڈبہ دے گی۔ ڈبہ!
ہ! وہ میری اصلی امی ہے نا! وہ مجھے دال موٹ کا پورا کنستر دلا دے گی۔"

"ساجدہ! کیا سوچ رہی ہے تو؟" کوے کی سی آواز سنائی دی۔

ساجدہ نے مڑ کر دیکھا بیگم رحمٰن کتاب کھول رہی تھیں۔ ساجدہ نے
ے کتاب کی طرف دیکھا۔ وہ شاعری کی کتاب تھی۔ ساجدہ کے جی میں
ہ وہ استانی جی سے کہے کہ آج ہمیں کوئی مزیدار کہانی سنائیے۔ چل کر
بھوک کی ... وہ چالاک بڑھیا کدو میں کیسے بیٹھ گئی تھی۔ پر سہما
لہ ... تو سہمے ہوئے کہا:۔

"امی ذرا کدو ہوشیاری سے کاٹیے۔ کہیں اندر بیٹھی ہوئی بڑھیا نہ کٹ جائے"
امی نے یہ سن کر کہا تھا:

"پگلی کہیں کی" اور سب بندروں کی طرح ہنسنے لگے تھے۔ وہ سب
بے وقوف ہیں۔ صبح میں نے لکھنے کے لئے بھیا کا فاؤنٹین پن اٹھا لیا تو
کونسا گناہ کیا لیکن انھوں نے میری پیٹھ پر کئی گھونسے جما دیئے۔ میں
نے امی سے شکایت کی تو الٹا مجھی پر غصہ ہونے لگیں۔ وہ میری اصل امی نہیں
ہیں اسی لئے تو ایسی باتیں کرتی ہیں۔ فاؤنٹین بھیا کا۔ ساڑھی خالہ کی کیرم
بورڈ خالد کا۔ گھر میں سب ہی کچھ ان لوگوں کا ہے۔ میرے لئے گھر میں کچھ بھی
نہیں۔ مجھے شاید امی نے آٹا دے کر خریدا ہے۔

اس دن میرے پاؤں میں چوٹ لگ گئی تو میں روتی ہوئی ابا جان کے پاس پہنچی
تو وہ مجھ پر ناراض ہونے لگے۔ میری چوٹ پر کوئی دوا بھی نہیں لگائی۔ حالانکہ وہ
دوسرے شہروں میں جا کر دوائیں بیچتے ہیں۔ ابا جان بھی میرے حقیقی ابا جان
نہیں ہیں۔

شاید لمبے لمبے بانسوں پر چڑھنے والا نٹ میرا باپ ہو۔ آج میں اگر اس
کے ساتھ ہوتی روزانہ کئی بار لمبے لمبے بانسوں پر چڑھتی۔ طرح طرح کے کھیل
دکھاتی۔ پھر کھیل ختم ہونے پر گھر گھر جا کر پیسے جمع کرتی ـــــ ایک ... پانچ
سات ـــــ اٹھارہ ـــــ سو ـــــ دو سو ......

یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے گندے بستے میں ہاتھ ڈال کر ایک اکنی
باہر نکالی۔ اور اسے مٹھی میں چھپا کر خود بخود دل ہی دل میں ہنسنے لگی۔ وہ اپنی
چالاکی پر بڑا فخر محسوس کر رہی تھی۔ پھر اسے صبح کا واقعہ یاد آگیا۔

صبح میں باجی کی ساڑھی پہننے کے لئے ضد کر رہی تھی۔ باجی کہنے لگیں
"تو جب میرے برابر ہو جائے گی تو تجھے بھی ساڑھیاں پہننے کو ملیں گی"

"بھلا میں ایک دن میں کیسے ان کی برابر ہو سکتی ہوں۔ میں بہت دیر ان کے برابر بننے کی ترکیب سوچتی رہی۔ پھر ایک ترکیب میری سمجھ میں آگئی میں چپکے سے ایک کرسی اٹھا لائی اور اس پر چڑھ گئی۔ اب میرے ہاتھ کھونٹیوں اور سامان لٹکنے کے تختوں تک پہنچنے لگے تھے۔ ایک تختہ پر امی جان پیسے رکھا کرتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ذرا دیکھوں کہ میرے ہاتھ بھی وہاں پہنچتے ہیں یا نہیں؟ پھر میرے ہاتھ اس تختے پر رکھے ہوئے پیسوں تک پہنچ گئے۔ نہ جانے کتنے پیسے رکھے ہوئے تھے۔ دل چاہا کہ سب پیسے لے لوں لیکن پھر خیال آیا کہ اللہ میاں دیکھ لیں گے، پھر وہ مجھ پر ناراض ہونگے۔ میں کرسی سے اترنے ہی والی تھی کہ مجھے حمیدہ کی شرارت یاد آگئی۔ کل چھٹی کے بعد اس نے امرود خریدے تھے اور مجھے دکھا دکھا کر چڑانے لگی، مجھے اس سے بدلہ لینا تھا میرا ہاتھ دوبارہ تختہ تک پہنچ گیا۔ اور میں نے ایک اکنی اٹھالی۔ شاید اللہ میاں نے دیکھا نہیں ہوگا۔ اگر دیکھا بھی ہے تو رات میں جب سب لوگ سو جائیں گے تو وہ میرے پاس آئیں گے۔ میں ان سے کہہ دوں گی کہ اکنی میں نے نہیں چرائی بلکہ ہاتھ نے چرائی ہے۔ اور امی کو معلوم ہو گیا.......... لیکن وہ تو بیمار رہتی ہیں ان کو کیا یاد ہوگا کہ پیسے رکھے ہیں۔

ساجدہ نے ایک دفعہ باغ میں تتلی پکڑی تھی۔ تتلی پکڑتے وقت اسے اس نازک گدگدی محسوس ہوئی تھی۔ اکنی کی گرفت سے بھی وہ کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔

وہ سوچنے لگی کہ اس لطف کا تذکرہ کس سے کرے۔ اسی درمیان میں اس کا خیال بیگم رحمٰن کی جانب چلا گیا وہ آہستہ آہستہ پڑھ رہی تھیں۔

"کوٹھری میں گائے بندھی ہے وہ اپنے بچھڑوں کو چاٹ رہی ہے"

ساجدہ نے سوچا کہ اس گائے کا گوبر اٹھانے کے لئے بیگم رحمٰن کو بھیجنا ہے۔

اس کے قریب بیٹھی ہوئی حمیدہ نے کوئی چیز اپنے منہ میں رکھی شاید املی۔ یہ دیکھ کر وہ بے چین ہو گئی۔ اس نے مٹھی کھول کر اکنی حمیدہ کو دکھائی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہنے لگی۔

"میں اس اکنی کا شام کو امرود لوں گی" اسی وقت بیگم رحمٰن کی بھاری آواز سنائی دی۔

"کیا ہو رہا ہے ساجدہ" ساجدہ کو سرکس کا شیر یاد آگیا۔

بیگم رحمٰن اس سے پوچھ رہی تھیں۔ "مطلب سمجھ گئی نا؟"

ساجدہ نے گردن ہلا دی۔

"اچھا تو "عالم" کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

"عالم ———— عالم ——— جس طرح شکاری کی آہٹ پاتے ہی چڑیاں درخت کی سب سے اونچی شاخ پر پہنچ جاتی ہیں اسی طرح ساجدہ "تحت الشعور" کی گہرائیوں میں پہنچ گئی۔ لیکن وہاں اسے "عالم" نام کی کوئی چیز نہیں ملی۔ اس نے گھبرا کر بیگم رحمٰن کی طرف دیکھا۔ شیر نے دم ہلا دی تھی۔ اچانک اسے کچھ یاد آگیا۔ جب اس کی امی کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی تھی تو وہ اسے لے کر ایک خانقاہ میں جایا کرتی تھیں وہاں ایک عالم رہتے تھے۔

یہ یاد آتے ہی وہ کہنے لگی:-

"عالم ——— یعنی سر منڈانے اور دعا تعویذ دینے والا آدمی"

اسے یقین تھا کہ اس کے جواب سے استانی جی خوش ہوں گی۔ اس نے بڑی شان سے استانی جی کی جانب دیکھا۔ شیر غصہ میں دکھائی دے رہا تھا۔

بیگم رحمٰن چلائیں:-

"بیوقوف، گدھی....... کھڑی ہو جا بنچ پر"

وہ بنچ پر چڑھنے لگی تو دس پانچ لڑکیاں ہنس دیں۔ ساجدہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کی ہنسی سے بیوقوف گدھی کی آوازیں نکل رہی ہیں گھر میں، اسکول میں، باہر، ہر جگہ ان آوازوں کے علاوہ کچھ نہیں سنائی دیتا:- "کالی کلوٹی ——— بیوقوف ——— گدھی ——— اس کی خوب پٹائی ہونی چاہئیے" امی، ابا جان، استانی جی، سہیلیاں، بھیا آپا، خالہ سب لوگ یہی کہتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں نے میرے خلاف مورچہ جمالیا ہے۔ مجھے ان سے انتقام لینا چاہئیے۔ اچانک اس کی نگاہ چھت کے اس کونے پر پہنچی جہاں ایک سوراخ تھا۔ اس سوراخ سے روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ اڑ کر نیچے گر رہے تھے زمین پر ان روٹی کے ٹکڑوں کے پاس ہی تنکے۔ سوت کے ٹکڑے۔ پر اور کپڑوں کی کترنیں پڑی ہوئی تھیں۔ سوراخ کے پاس بیٹھی ہوئی چڑیا اپنا سر اندر جھانک ڈال رہی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد چڑیا کے قریب دو ننھے ننھے

بچے مل جاتے ہیں گے۔

وہ سوچنے لگی کہ یہ چڑیا ان بچوں کی حقیقی ماں ہے۔ میری امی میری حقیقی امی نہیں ہیں۔ اگر وہ میری حقیقی امی ہوتیں تو ہر سال میری دوسالگرہ ہیں کیے مجھے بڑا نہ بناو یا ہوتا۔ وہ کہتی ہیں یہ لڑکی مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی ہے مجھے تو لڑکا پسند ہے۔ جب میں ان کے پیٹ میں تھی تو انھوں نے مجھے لڑکا کیوں نہیں بنالیا۔ ہو سکتا ہے کہ میں ان کے پیٹ میں نہ رہی ہوں۔ شاید مجھے آٹا اور پیسے دے کر مداری سے خرید اگیا ہے۔ اسی لئے تو میں کالی ہوں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ امی میری امی نہیں ہیں۔ وہ گھر بھی میرا نہیں ہے .... لیکن سب سے چھپ کے بورا اسکول جاکر؟........

چھٹی کی گھنٹی بجی۔ ساجدہ فوراً کود کر نیچے اتری اور بستہ اٹھا کر بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ اس نے سیدھے ہاتھ میں اکنی دبا رکھی تھی۔ پھاٹک کے قریب حمیدہ مل گئی۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچی۔ دونوں چپ چاپ اپنا اپنا منہ پھلائے ہوئے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ وہ دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے کو اس طرح دیکھتی تھیں جیسے مکان کی چھت پر بیٹھی ہوئی بلیاں ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں۔

گلی کے موڑ کے پاس امرود والا کھڑا تھا۔ خوشبودار اور خوش رنگ امرودوں کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے ایک بڑا سا اور چھانٹ کر اکنی امرود والے کے ہاتھ میں رکھ کر وہ حمیدہ کے قریب پہنچنے سے پہلے دوڑنے لگی۔ جب اس نے امرود دکھا کر حمیدہ کو چڑالیا تب اسے سکون حاصل ہوا۔

امرود بہت اچھا تھا۔ لیکن وہ امرود کھائے کہاں۔ سڑک پر لوگ جا رہے تھے پیچھے سے استانیوں کے آنے کا بھی خطرہ تھا۔ گھر میں امی، خالہ باجی بھیا تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ میرے چاروں طرف بھوتوں کا پہرہ ہے۔ گھر میں، اسکول میں، ——— باہر ——— ہر جگہ!

ریل کی تیز سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی سیٹی نے اسے پکارا ہے۔ وہ قلیوں کو دیکھ کر سوچنے لگی کہ یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں۔ انھیں ہر وقت والدین کی مار نہیں کھانی پڑتی۔ ادھر کا سامان ادھر رکھا۔ ہاتھ میں پیسے بجنے لگے۔ گر میں کبھی ابا جان سے پیسہ مانگتی ہوں تو وہ غضب ہو جاتے ہیں کہتے ہیں پیسے پیڑ پر نہیں لگتے........

ریل کی دوسری سیٹی سنائی دی۔ اسٹیشن پر لوگ دوبارہ دوڑنے لگے۔ ساجدہ امی کے پھاٹک کے پاس کھڑی رہی۔ ہر ڈبے کی کھڑکیوں سے مسافر جھانک رہے تھے۔ سب درخت پر بیٹھے ہوئے بندر یاد آگئے۔ پھر میلے میں لگنے والے جھولوں کا خیال آگیا۔ وہ سوچنے لگی کہ ہر ڈبہ ایک جھولا ہے اور اگر یہ گھومنے لگ جائیں تو ———

کسی نے ساجدہ سے پوچھا:۔

"یہ امرود کہاں سے لے آئی ہو؟"

ساجدہ کو لمحہ بھر کے لئے یہ یقین نہیں ہوا کہ یہ آواز بھیا کی ہے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ آواز بھیا ہی کی تھی۔ وہ شاید اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے آئے تھے۔

وہ فوراً دوڑنے لگی۔ اس نے اسٹیشن کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ "ارے چور کہیں کی" تانگے والا کرخت آواز میں چلا رہا۔ اس کا جسم پتے کی طرح کانپنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے بھیا اس کا تعاقب کرتے ہوئے آرہے ہیں وہ اور تیز دوڑنے لگی۔

وہ ہانپتی کانپتی نکمو شاہ کی مسجد میں جا پہنچی۔ مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر اس نے اپنا امرود ختم کیا۔ لیکن اب امرود لذیذ نہیں تھا اور نہ ہی اس میں خوشبو رہ گئی تھی۔

اسے گھر والوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بھیا گھر جاکر ضرور شکایت کریں گے اور پھر.......

کچھ دیر کے بعد وہ گھر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ لیکن جب وہ گھر کے قریب پہنچی تو اسے دوبارہ گھر سے وحشت ہونے لگی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کے دروازے کے قریب رک گئی اور کان لگا کے آہٹ سننے لگی:

"تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟ دن رات مر مر کے کماتا ہوں لیکن.... یہ ڈاکٹر کے بل ——— میں کل دورے پر جا رہا ہوں۔ مہینہ بھر لوٹوں گا۔"

شاید ابا جان چلا رہے تھے اور امی دھیمی آواز سے ان کی باتوں کا جواب دے رہی تھیں۔

وہ خیالات کے سمندر میں ڈوبنے لگی۔ ہر وقت ابا جان یہ کہتے رہتے ہیں

کر میں مرنے کا آتا ہوں۔ وہ اتنا جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔ آدمی کافی عرصہ بیمار رہتا اسپتال میں علاج کرانے کے بعد مرتا ہے۔ لیکن ابا تو ایک دن بھی بیمار نہیں پڑے۔ نہ ہی انھوں نے اپنا علاج کرایا۔ پھر وہ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟

دروازہ ایک دم کھٹاک سے کھلا۔ ابا جان باہر آئے وہ چونک پڑی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ابا جان اب اس سے پیار بھری پیاری باتیں کریں گے لیکن وہ تو خاموشی سے باہر چلے گئے۔ اسے ان پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ پھر وہ بھی خاموشی سے گھر میں چلی گئی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ امی سے دال موٹ مانگنے لگی۔ امی جان نے کچھ دیر پہلے ہی چنے منگوائے تھے وہی ایک طشتری میں لا کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ ساجدہ نے طشتری الگ سرکا دی اور دال موٹ کے لئے ضد کرنے لگی۔ بھیا کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بھی یہی کیا کرتے تھے آج اس نے بھی اسی ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

امی نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تو وہ ان سے جا کر لپٹ گئی اور رونے لگی۔ اس پر بھی انھوں نے کوئی خیال نہیں کیا تو اس نے اپنا سر ان کی بانہوں پر رکھ دیا۔

اچانک اس کی امی اس طرح چلائیں جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو پھر اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ چارپائی سے نیچے گر پڑی۔

"کلموہی، نصیبے پیٹی! کیا تو اندھی ہو گئی ہے۔ تجھے دکھائی نہیں دیتا کہ میرے بازو میں انجکشن لگا ہے۔" وہ اس پر برس پڑیں اور پھر ساجدہ کے بدن پر گھونسے، لاتیں، طمانچے پڑنے لگے۔ ساجدہ روتی رہی۔ اسی اثنا میں بھیا، امی جان سے سینما دیکھنے کے لئے پیسے مانگنے لگے۔ امی چارپائی سے اٹھ کر بخاری میں چلی گئیں۔ وہ گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی، سب کچھ دیکھتی رہی۔ جب امی نے پیسے گننے کے بعد پوچھا کہ اکنی کون لے گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بھیا نے ہنستے ہوئے کہا:

"امی ساجدہ سے پوچھئے وہ اسٹیشن پر کچھ دیر پہلے امرود کھا رہی تھی!"

بھیا آگ لگا کر سینما دیکھنے چلے گئے۔ آگ دھیرے دھیرے بھڑکنے لگی امی کے کئی بار پوچھنے کے بعد ساجدہ نے اکنی لینے کا اقرار نہیں کیا۔ پھر انہیں غصہ آگیا اور ساجدہ دوبارہ پٹنے لگی۔ امی جان عجیب کشمکش میں پڑ گئی تھیں۔ آخر انھوں نے ایک اور ترکیب سوچ لی۔

"چھٹی کے بعد تم کہاں گئی تھیں؟"

"اسٹیشن!"

"کیوں؟"

"اپنی سہیلی کے گھر گئی تھی!"

"کس لئے؟"

"سالگرہ میں!"

"اس کے بھائی کی!"

"نہیں تو؟"

"اس کی بہن کی....؟"

"اونہہ ہوں!"

"پھر کس کی....؟"

"گڑیا کے بچے کی۔"

ساجدہ نے کنکھیوں سے امی کے چہرے پر چھلکتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھا اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنے رخسار سہلائے لیکن یہ سوچ کر اس جنگ میں فتح اس کی ہوگی وہ اپنے رخسار سہلانا بھول گئی اور بدن کا درد بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ وہ کہنے لگی: "پروگرام ختم ہونے کے بعد ہم سب کو ایک ایک امرود ملا۔ میں امرود لئے گھر آ رہی تھی کہ اسٹیشن کے قریب بھیا دکھائی دیئے۔ میں نے سوچا کہ شاید ابا جان کہیں ریل سے جا رہے ہیں اس لئے میں اسٹیشن کی طرف چلی گئی۔"

اسے جھوٹ بولتے ہوئے ایک عجیب سا لطف محسوس ہو رہا تھا لیکن یہ لطف زیادہ دیر تک نہیں قائم رہا۔ جب اس نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد آئینہ دیکھا تو سیدھا رخسار بالکل نیلا معلوم ہو رہا تھا..... اور اس پر پانچ انگلیوں کے نشان بنے ہوئے تھے۔

روشنی و تاریکی کے کھیل میں تاریکی نے بازی جیت لی۔ بیرونی دنیا کی طرح ساجدہ کے دل میں بھی تاریکی پھیلنے لگی۔ کوٹھے پر جا کر اس نے حساب کی کتاب کھولی لیکن اس کی طبیعت بے جان ہندسوں میں نہ لگ سکی۔ اس نے کتاب اٹھا کر دور پھینک دی۔ دیوار پر امی اور ابا کا فوٹو لگا ہوا تھا اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک زوردار گھونسے سے فوٹو شیشہ

تو شاید وہ سوچنے لگی کہ اگر استانی جی کا فون بھی یہاں ہوتا تو میں اسے بھی پھاڑ دیتی۔

وہ اپنے گال سہلاتی ہوئی باہر چھت پر آگئی اور ریلنگ سے ٹیک کر سڑک پر آنے جانے والوں کو دیکھنے لگی۔ اس جیسی اور اس کی ہم عمر ایک لڑکی بڑی خوب صورت ساڑھی پہنے ہوئے ایک عورت کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس کی ساڑھی خاک کے طوطے کی طرح ہری تھی۔ اس لڑکی کو دیکھتے ہی وہ لاشعوری طور پر اپنے رخسار سہلانے لگی۔ امی کی پانچوں انگلیوں کے نشان رخسار پر ابھرے تھے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ کوئی اس کے دل کو سرخ انگاروں پر سینک رہا ہے۔ اس نے جھک کر نیچے دیکھا۔ اچانک اس کے دل میں ایک انجانی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ نیچے اور نیچے جھکتی چلی جائے۔

پھر وہ تصورات کی دنیا میں گم ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ جب میں دھڑام سے نیچے گروں گی تو لوگ دوڑتے ہوئے آئیں گے اور مجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔ پھر امی جان میرے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیریں گی۔ میرے سر سے خوب خون نکلے گا۔ اس عجیب تصور سے اس نے ایک انجانی خوشی محسوس کی راستہ پر چلنے والے آدمی دھندلے دھندلے دکھائی دینے لگے پھر اس کے کانوں میں یہ آواز آئی:۔

"ارے بچو! زیادہ مت جھک ورنہ نیچے گر جائے گی۔" یہ شاید اس کے ابا جان کی آواز تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اکیلی اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ خواب تھا۔ یہ معلوم کر کے اسے بہت خوشی ہوئی اس نے اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرا اس کا خیال تھا کہ امی جان نے رخساروں پر کوئی دوا لگائی ہو گی لیکن ان پر کسی قسم کا دوا نہیں لگی تھی۔ ذرا سی بھی نہیں۔

رات کو سوتے وقت اس نے سوچا تھا کہ امی جان کو مجھے مار کر افسوس ہوگا۔ وہ کام کاج سے نپٹ کر میرے پاس آ کر سوئیں گی۔ اگر میری آنکھ کھلی تو میں ان سے لپٹ جاؤں گی۔ اور جس طرح چڑیا کے بچے اس کے پروں میں اپنا سر چھپا لیتے ہیں اسی طرح میں بھی امی کے سینے میں سر چھپا لوں گی۔ پھر امی جان "میری بچی" کہہ کر مجھ سے چمٹ جائیں گی اس وقت میں ان سے پوچھوں گی کہ اب آپ کا بازو کیسا ہے؟ جب ڈاکٹر صاحب انجکشن لگاتے ہیں تو آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں ہوتی؟ کہ آپ کے بازو میں بہت درد ہو رہا ہے؟ چلئے میں گرم پانی سے سینک دوں!

ساجدہ نے آنکھیں مل مل کر ادھر ادھر دیکھا وہاں نہ اس کی امی جان تھیں اور نہ ابا جان! اس کے پاس کوئی بھی نہ تھا۔ کہیں سے بی کے غرانے کی آواز آ رہی تھی لیکن وہ تو بھیا کے خراٹے لینے کی آواز تھی۔ وہ بستر سے نیچے اتری اور غور سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بھیا، خالہ اور باجی سو رہی تھیں۔ انہیں اس بات کی فکر نہ تھی کہ ساجدہ کے رخساروں میں درد ہو رہا ہے اور انہیں ہی کیا۔ امی جان کو بھی فکر نہ تھی اگر انہیں میرا خیال ہوتا تو..

یہ امی میری حقیقی امی نہیں ہیں۔ امی جان گوری ہیں۔ ابا جی گورے ہیں۔ بھیا۔ خالہ اور باجی بھی گوری ہیں۔ صرف میں ہی کالی ہوں میرے ماں باپ کوئی اور ہونے چاہئیں۔ شاید اسی لئے یہ لوگ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ یہ گھر انہی لوگوں کا ہے میرا یہاں کچھ بھی نہیں ہے آخر میں اس گھر میں کیوں رہتی ہوں۔ وہ کافی دیر تک انہی خیالات میں ڈوبی رہی۔

پھر اسے رشید یاد آ گیا۔ اس نے رشید کو کسی سینما میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے محل سے نکل کر کہیں دور بھاگ گیا تھا مجھے بھی رشید کی طرح کہیں دور بھاگ جانا چاہیے۔ اس نے جیسے پکا ارادہ کر لیا ہو۔

یہ طے کرنے کے بعد وہ دروازہ کی طرف جانے لگی۔ اسی وقت چوکیدار کی پاٹ دار آواز سنائی دی "جاگتے رہو!" وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اس کا دل دھڑک رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ رشید جب گھر سے باہر نکلا تھا تو اس کا دل دھڑکا تھا یا نہیں "جاگتے رہو" کی آواز دوبارہ سنائی دی ———— وہ اپنے دل کو سمجھانے لگی کہ وہ چوکیدار ہے کوئی بھوت پریت نہیں لیکن اس کے دل کی دھڑکن کم نہیں ہوئی۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ دوڑ کر امی جان کے پاس جا کر لیٹ جائے وہ ڈرتی ڈرتی امی کے کمرے میں داخل ہوئی لیکن امی جان کے بستر پر کوئی نہ تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ امی کہاں گئی ہیں۔ اچانک اس کی نگاہ ابا جی کے کمرہ پر پڑی اس کا سارا خوف دور ہو گیا۔ اب خوف کی جگہ غصے نے لے لی تھی وہ غصے میں اپنے دل ہی دل میں کہنے لگی کہ ابا جان اب بچے نہیں ہیں اور نہ ہی امی جان نے انہیں مارا ہے اور نہ ہی ان کا گال سوجا ہوا ہے پھر آخر وہ کیوں ان کے پاس گئیں۔

وہ امی جان کی خالی چارپائی دیکھ کر اپنے کمرہ میں لوٹ آئی۔
کھڑکی کے قریب کوئی پرندہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ اور کمرہ میں تاریکی بڑھ گئی تھی وہ چادر سے منہ ڈھک کر پھڑپھڑاہٹ سننے لگی۔ اب اس کے رخساروں میں درد نہیں تھا۔ شاید کسی نے مرہم لگا دیا تھا پھر وہ سپنا دیکھنے لگی۔ اکیلی بالکل اکیلی۔ بجیا، آپا، خالہ کا منہ چڑاتی ہوئی۔
کتنا مزیدار تھا وہ سپنا۔ اس میں خالہ کی مونچھیں نکل آئی تھیں اور وہ انہیں کاٹ رہی تھیں۔ بجیا ایک کالی بلی کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ ایک بہادر لڑکی اس پر گولیاں چلا رہی تھی۔ وہ خالہ کے کیرم بورڈ کی پتنگ بنا کر اڑا رہی تھی...... پھر وہ پتنگ ایک درخت میں پھنس گئی۔
اس نے ابھی یہی فلم دیکھی تھی کہ امی جان کی آواز سنائی دی:۔
"کلموہی! بدبخت! آٹھ سال کی گھوڑی ہو گئی ہے لیکن ابھی تک پڑی کاٹ سو رہی ہے۔"

ساجدہ نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ سورج کی کرنیں کھڑکی سے اندر آکر اس سے کچھ کہہ رہی تھیں:۔
"اری بچگی تو ابھی تک سو رہی ہے۔" وہ ڈولتی ہوئی نیچے اتری اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد باورچی خانہ میں داخل ہوئی۔ ابا جان بھی تیار ہو کر آگئے۔ امی جان نے ایک کپ کافی اور تین بسکٹ ان کے سامنے لا کر رکھ دیئے۔ اسے صرف ایک بسکٹ اور کافی ملی۔ باجی نے غسل خانے جاتے وقت اسے تین انگلیاں دکھائی تھیں۔ ساجدہ کو یقین ہو گیا کہ سب کو تین تین بسکٹ ملے ہیں۔ اس کے رخساروں میں دوبارہ درد شروع ہو گیا۔ اس نے کافی کی پیالی اپنے سامنے سے الگ سرکا دی۔ اور امی سے بولی مجھے بھی تین بسکٹ دیجئے۔ پھر وہ رونے لگی۔ امی نے اسے بسکٹ کا ڈبہ دکھایا جس میں ایک بھی بسکٹ نہیں تھا وہ سوچنے لگی کہ بجیا، باجی، اور خالہ نے بسکٹوں کا پورا ڈبہ صاف کر دیا ہو سب لوگ مجھ سے جلتے ہیں۔ پھر اس نے غصہ میں ہاتھ پاؤں پٹخنے شروع کر دیئے۔
امی اسے سمجھانے لگیں لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا اس کے جی میں آئی کہ وہ پیالی کو میز سے ٹکرا دے اور تشتری کو زمین پر پٹک کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

پھر اس نے بسکٹوں کی تشتری اس کے سامنے رکھ دی۔ ابا جان باہر چلے گئے۔
امی بولیں:۔
"یہ لڑکی بڑی چالاک ہو گئی ہے۔ سب لوگ ہنسنے لگے......
بجیا اور خالہ ہنسنے لگے۔ ساجدہ کے دل میں بیک وقت تین سوئیاں چبھ گئیں امی جان جب کمرے سے چلی گئیں تو وہ بولی:۔
"مجھے ایک مزیدار بات معلوم ہے۔ کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی ہاں خیرن آئے گی تو اسے....."
کچھ دیر بعد خیرن آگئی۔ ساجدہ اسے اکیلا دیکھ کر اس کے قریب جا بیٹھی اور اس کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ خیرن ہنسنے لگی۔
خیرن کو ہنستے ہوئے دیکھ کر اس کی امی جان کو تعجب ہوا وہ ہنسنے کی وجہ پوچھنے لگیں لیکن خیرن نے انہیں کچھ نہیں بتایا وہ ہنستی رہی۔ امی جان اس کی مسلسل ہنسی بہت ناگوار معلوم ہو رہی تھی۔ وہ غصہ میں بولیں
"بتاتی کیوں نہیں؟ پاگلوں کی طرح ہنسے جا رہی ہے۔"
خیرن بولی:۔
"آپ ساجدہ سے پوچھ لیجئے نا!"
ساجدہ نے سوچا کہ اگر وہ خاموش رہے گی تو امی جان کو اور غصہ آجائے گا۔ پھر اسے مار کھانی پڑے گی۔ وہ بہت آہستہ سے بولی:۔
"کل رات کیا آپ ابا جان کے بستر پر نہیں گئی تھیں؟" امی جان سنتے ہی سکتہ میں آگئیں۔ پھر وہ اسے گھسیٹتی ہوئی باہر لے گئیں اور اسے خوب مارا۔ پھر اسے دروازے سے باہر دھکیل کر بولیں:۔
"نکل جا کلموہی اس گھر سے آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔ ورنہ ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔"
دروازہ کی کنڈی اندر سے بند ہو چکی تھی۔

ساجدہ نے پر نم آنکھوں سے بند دروازہ کو دیکھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لے رہی تھی کہ وہ دوڑ کر دروازہ کھلوائے اور امی کے گلے لپٹ کر خوب روئے۔ ان سے معافی مانگے لیکن یہ خواہش نہ جانے کہاں غائب ہو گئی اس نے آنسو پونچھے اور آنکھوں میں آئندہ

بجائے [illegible] تھے۔ اور ان انگاروں سے نکلنے والی چنگاریاں کہہ رہی تھیں۔

"تمہیں ہرگز نہیں! ایسی بری ماں کا منہ اب کبھی بھی نہیں دیکھنا چاہیے"

اس نے بند دروازہ کی طرف دیکھا۔ یہ جیل کے دروازے میں بیس سال جیل سے رہا ہو گئی۔

وہ تیزی سے چلنے لگی۔ اس کے دل نے پنکھ پھیلا دیئے۔ وہ آزاد تھی جہاں جی چاہے جائے جو دل میں آئے کرے۔ کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہ تھا

سینما گھر کے قریب بہت سے راہگیر تصویریں دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی تصویریں دیکھنے لگی۔ ایک تصویر میں بہت خوب صورت عورت بنی ہوئی تھی جو اپنے چار پانچ سالہ بچے کا منہ چوم رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ میری ماں اتنی خوب صورت نہیں ہے۔ اسی لئے وہ مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔

وہ اپنی امی کو برا بھلا کہتی ہوئی وہاں سے چل دی۔

سینما گھر کے قریب ہی ایک ہوٹل تھا۔ کافی لوگ ہوٹل میں آ جا رہے تھے۔ ریڈیو گرام پر ریکارڈ بج رہا تھا۔

"میرا دل یہ پکارے آ جا"

اسے یہ گانا بہت پسند تھا۔ اس کا دل گانے کی دل کش دھن میں گم ہو گیا پھر اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ریڈیو گرام کی آواز کم ہو گئی ہے۔

لیکن ریڈیو گرام کی آواز کم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی ناک کافی کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔

یہ یاد آتے ہی کہ آج اس نے کافی نہیں پی ہے۔ اس کے دل میں کافی پینے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ لیکن اس کی جیب میں پیسے نہیں تھے۔ کل کی اکنی اسے بہت یاد آئی۔

آج کافی نہیں ملی تو کیا ہوا پانی پی لوں گی ——— اس نے اپنے دل کو تسکین دی پھر وہ پانی پینے کے لئے ندی کی طرف چل دی۔

جب وہ گھاٹ پر پہنچی تو اس نے کافی تھکاوٹ محسوس کی۔۔۔

ساجدہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

کچھ عورتیں ندی کے پانی میں کپڑے دھو رہی تھیں۔ کپڑے پٹخنے کی آواز سن کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے امی چانٹے مار رہی ہیں۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ چھپاک چھپاک کا شور بڑھنے لگا۔ کہیں بارش سے کالی [illegible] گئی تھی۔ پتھر کے ٹکڑے مار رہے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا

پھیل رہا تھا ——— اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچی۔ ندی کا پانی موجیں مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اس نے پینے کے لئے چلو میں پانی لیا۔ لیکن پی نہ سکی۔

"ارے بچی!" کوئی اسے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے چلایا۔

وہ ایک پوپلے منہ والی بڑھیا تھی: "آگے کہاں جا رہی ہے۔ ڈوب جائے گی۔ تیرے ماں باپ نہیں ہیں کیا؟"

اس کے جی میں آیا کہ وہ بڑھیا کے گلے لگ کر خوب روئے۔ اور اسے اپنا دکھڑا سنائے۔ لیکن بڑھیا کو اتنی فرصت کہاں تھی۔ وہ دوبارہ اپنے کپڑے دھونے میں مصروف ہو گئی۔

ساجدہ پانی پی کر گھاٹ پر آئی۔ گاؤں کے کچھ لوگ، برگد کے درخت کے نیچے کھانا کھا رہے تھے۔ ایک کتا زبان نکالے ہوئے دسترخوان پر رکھی ہوئی جلی بھنی روٹیاں گھور رہا تھا۔

کاش یہ لوگ اسے بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیتے۔ پھر اسے اپنے گھر کی اصلی گھی سے بگھری ہوئی دال ——— نازک نازک میٹھی چپتی چپاتیاں، قورما یاد آ گیا۔ اصلی گھی کی خوشبو اس کی ناک میں بسنے لگی۔

کیا رشید کے محل میں اس سے زیادہ لذیذ کھانے نہیں پکتے تھے۔ وہ بھی تو ایسے لذیذ کھانے، اور دنیا بھر کے ساز و سامان کو چھوڑ کر جنگل کی طرف چلا گیا تھا۔ بس اسی طرح میں بھی ——— میری ریاضت کو اللہ میاں خوش ہوں گے میں ٹیلہ والی مسجد میں بیٹھ کر اس وقت تک ... اللہ اللہ کرتی رہوں گی۔ جب تک کوئی بزرگ میرے سامنے نہیں آئیں گے۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں داخل ہوئی۔ مسجد میں ایک چڑیا تک نہ تھی۔ یہ ویران مسجد اسے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے لئے مسجد کا ایک تاریک گوشہ منتخب کر لیا اور وہیں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگی۔ لیکن اس کا دل بار بار پرندہ کی طرح اڑتا ہوا گھر کی طرف چلا جاتا ابا جان گاؤں چلے گئے ہوں گے۔ جمیا کی چھٹی بارہ بجے ہوتی ہے وہ اس وقت کیا کر رہے ہوں گے۔ ببیا کی چھٹی ۱ بجے ہوتی ہے وہ اس وقت کیا کر رہے ہوں گے۔ خالہ اور باجی کیرم کھیل رہی ہوں گی۔ اور امی کیا کر رہی ہوں گی۔ امی! امی!

پھر وہ یہ سوچتی ہوئی سو گئی کہ امی اس کی حقیقی امی ہیں یا نہیں۔

جب وہ سو کر اٹھی تو سورج ڈھل چکا تھا۔ پھیلی ہوئی دھوپ پھیکی پڑ رہی تھی۔ وہ فوراً مسجد سے نکل کر باہر آگئی۔

ایسی گری! میں کہاں جاؤں؟

کہاں؟

گھر؟

اور نہ؟ پھر؟

وہ دوبارہ مسجد میں لوٹ جانا چاہتی تھی۔ لیکن آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ جسم کی تھکن، دل کی جلن، وہ سب کچھ بھول گئی۔ اسے کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو چاہئے تھا۔ بسکٹ، ڈبل روٹی، چاء، کافی، رولی چنے...... وغیرہ۔

لیکن یہ سب چیزیں کہاں ملیں گی۔ کون دے گا۔

گھر جاؤں؟ معافی مانگوں؟

نہیں اچھی! گھر نہیں جاؤں گی۔ تو کیا کسی سہیلی کے جاؤں۔ حمیدہ کے گھر جاؤں تو...... لیکن اسے تو میں نے کل چڑایا تھا۔ پھر کہاں جاؤں۔ ہاں ٹھیک ہے باغ میں مالی دادا رہتے ہیں۔ ایک بار اس کی بیمار لڑکی کو امی نے میری پرانی فراکیں اور شلواریں دی تھیں۔ وہ مجھے کتنے پیار سے "ساجدہ بیگم" کہتا ہے۔

انہی کے پاس چلوں۔ وہ مجھے ضرور کچھ نہ کچھ کھلائیں گے۔ ان کے ہاں کھانا کھا کر اسٹیشن چلیں اور پھر ریل میں بیٹھ کر کہیں دور........

بہت دور......

اسے یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ کب اسکول پہنچی؟

اس نے سوچا تھا کہ وہ دوڑتی ہوئی مالی دادا کی جھونپڑی میں جائے گی۔ لیکن اس وقت اس کے قدم مالی کی کوٹھری کی طرف نہیں اٹھ رہے تھے۔ اس وقت اس کے سامنے دو اہم سوال تھے۔ مالی دادا سے کیا کہے؟ ان سے کھانا کیسے مانگے؟

وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ اس نے اپنی کلاس کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا بلا اپنی مونچھیں صاف کر رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں بلے پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کر بلے کو مارا۔ لیکن پتھر وہاں تک پہنچا ہی نہیں۔ مونچھیں صاف کرنے کے بعد بلا کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا۔ وہ دبے پاؤں اس کے قریب پہنچی اور غصے سے چلائی۔ بلا چونک گیا۔ وہ وہاں سے اس طرح کود کر بھاگا کہ ساجدہ کو ہنسی آگئی۔

اچانک اس کی نظر کلاس کی چھت پر جا رکی۔ چڑیا اپنے گھونسلہ کے قریب پھڑ پھڑا رہی تھی۔ ساجدہ یہ نہیں سمجھ سکی کہ وہ اپنے بچوں کے پاس کیوں نہیں جا رہی ہے۔

فرش پر نہ جانے کتنی ہی چیزیں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں۔ قسم قسم کے تنکے، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، روئی ــــــ رسی، سوت کے ٹکڑے اور نہ جانے کیا کیا۔

"اے بچی!" کسی نے آواز دی۔

ساجدہ نے مڑ کر دیکھا۔ مالی کھڑا تھا۔

"ارے ساجدہ بیگم ہیں!"

ساجدہ اسے کھڑکی کے قریب پکڑ لائی۔ اور کہنے لگی۔

"مالی دادا! یہ چڑیا گھونسلہ میں کیوں نہیں جاتی؟"

"اس کے بچے چلے گئے ہیں بیٹی!"

"چلے گئے؟"

"ہاں!"

"اڑ کر چلے گئے؟"

"ہاں!" مالی چڑیا کو پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھ کر بولا

"کیا چڑیاں اڑتے اڑتے یونہی چلی جاتی ہیں؟"

مالی دکھ بھرے لہجہ میں بولا۔

"بے چاری اپنے بچوں کے کھانے کا بندوبست کرنے گئی ہوگی۔ ادھر بلے نے بچوں کا صفایا چٹ کر دیا۔"

ساجدہ کی آنکھوں میں دکھ اور خوف کی پرچھائیاں دکھائی دینے لگیں۔ وہ سوچنے لگی کہ چڑیا کے بچے خود اوپر سے نیچے گر پڑے یا لڑکیوں نے انہیں نیچے گرا دیا۔ یا بلا خود اوپر چڑھ گیا۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی۔ چڑیا کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز سن کر اس کا جلد تجسس خاموش ہو گیا۔ چڑیا بار بار گھونسلہ کے قریب جا کر درد بھری آواز میں کچھ کہتی اور پھر چمگادڑ کی طرح کمرے کے چکر کاٹنے لگتی۔ اچانک اسے کچھ یاد آ جاتا اور وہ دوبارہ گھونسلہ کے قریب پہنچ جاتی۔

یہ سن کر ساجدہ کا دل تڑپنے لگا۔ وہ روندھی ہوئی آواز سے بولی۔

"مالی دادا! کیا چڑیا کو یہ نہیں معلوم کہ اس کے بچے مر گئے ہیں؟"

"معلوم ہے بیٹی!...... لیکن ......" ساجدہ مالی کو گھور رہی تھی۔ مالی کہہ رہا تھا۔

"ماں کی ممتا دیوانی ہوتی ہے بیٹی!" وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"ہاں! میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا۔ کہ تم آج دن بھر کہاں رہیں؟ تمہارے بھائی، بہن اور خالہ تمہیں ڈھونڈنے یہاں آئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے تمہاری امی بھی تمہیں تلاش کرنے آئی تھیں۔"

"امی! میری امی! امی مجھے تلاش کرنے یہاں آئی تھیں؟ مجھے تلاش کرنے؟"

مالی نے گردن ہلائی۔

ساجدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مالی کی انگلی پکڑے ہوئے وہ گھر آ رہی تھی تو اس نے دور سے دیکھا دروازے سے ٹیک لگائے باہر کھڑی ہوئی پریشانی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ ساجدہ کو پھڑپھڑاتی ہوئی چڑیا یاد آ گئی اس نے جھٹکے سے اپنی انگلی مالی کی گرفت سے چھڑائی اور گھر کی طرف بھاگنے لگی اسے دیکھتے ہی اس کی امی نے اپنے ہاتھ پھیلا کر زور سے آواز دی "ساجدہ!" آواز کتنی میٹھی اور پیاری تھی۔ جیسے کوئی گائے اپنے بچھڑوں کو بلا رہی ہو اور اس کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

ساجدہ امی کی قمیص سے آنسو پونچھتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی باورچی خانہ میں صبح کے بسکٹ اور پیالی اسی طرح رکھے ہوئے تھے۔ خالہ کے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل پر باجی کی نئی ساڑھی رکھی ہوئی تھی اور اسی ساڑھی پر کاغذ، قلم اور پن رکھا ہوا تھا۔ وہ کافی سوچنے کے بعد بھی نہیں سمجھ سکی کہ یہ تینوں چیزیں ایک جگہ کیوں اکٹھی ہو گئیں۔ وہ ان چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ امی نے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تیرے بھیا، خالہ، باجی سب تجھے ڈھونڈنے گئے ہیں۔ انہوں نے ہی یہ سب چیزیں تیرے لئے لا کر رکھی تھیں۔"

ساجدہ نے باورچی خانہ کی طرف دیکھا۔ برتن اپنی جگہ پر رکھے ہوئے تھے۔ شاید کسی نے کھانا نہیں کھایا؟"

اس نے درد بھرے لہجے میں پوچھا۔

"امی! کیا آپ نے کھانا نہیں کھایا؟"

امی ہنس دیں۔ پھر کہنے لگیں۔

"تیرے ابا جان نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ ریل فیض آباد ڈیڑھ بجے پہنچتی ہے نا! کل ان کے سر میں درد تھا۔ اس لئے انہوں نے رات میں بھی کھانا نہیں کھایا۔ میں رات میں بہت دیر تک ان کا سر دباتی رہی۔"

جب ساجدہ کی نگاہ تشتری میں رکھے ہوئے تین بسکٹوں پر پڑی تو وہ سوچنے لگی کہ میری ضد کی وجہ سے ابا جان صبح ناشتہ بھی کر پائے نہیں صرف چائے پی کر جانا پڑا۔ کل رات بھی وہ بھوکے سو رہے تھے۔ ان کی ریل ڈیڑھ بجے فیض آباد پہنچے گی۔ جب تک وہ بھوکے ہی رہیں گے۔

ان خیالات سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ جیسے وہ برابر غوطے کھاتی ہوئی سمندر میں ڈوب رہی ہو۔

"چل! تجھے کافی پلاؤں!" امی نے کہا۔ لیکن ساجدہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ دوڑ کر دوسری منزل پر چلی گئی ...... اس نے امی ابا کے فوٹو کے سامنے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھ کانپنے لگے ساجدہ زیادہ دیر تک اس کمرہ میں نہیں رک سکی وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔

دوسری منزل کے .... وہ شاید پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ کمرے کی ہر شئے پر اسے والدین کی محبت کی چھاپ دکھائی دے رہی تھی۔

وہ جھولا ——— جب وہ بہت چھوٹی تھی تو اسے بخار آیا تھا۔ اور اسے ابا جان رات بھر جھولے میں جھلاتے رہے تھے

وہ کونہ میں رکھی ہوئی سائیکل ——— اس کے ابا جان سائیکل پر بٹھا کر اسے پھول باغ لیجایا کرتے تھے۔

اس کے دماغ میں گذشتہ واقعات گھومنے لگے تھے۔ مٹھائی، کھلونے، گڑیاں، دوائیں، کپڑے، کتابیں سب بولنے لگے تھے۔ یہ سب چیزیں، ناچتی، گاتی، تھرکتی اس کے دماغ میں جمع ہونے لگیں۔ سینما کی

طرح منتظر رہنے لگے۔ کرسیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے۔ گھوڑوں کے بچے بن گئے۔ گڑیوں کی روئی لٹانے لگی ——— اور بکسوں میں رکھے ہوئے کپڑے ——— نہیں ——— وہ تو سوت کے ٹکڑے تھے۔

ساجدہ اس وقت گھر میں نہیں تھی۔ بلکہ وہ ایک چڑیا کے گھونسلے میں تھی۔ اور اسی گھونسلے کے پاس اس کی امی بار بار آ کر پر پھڑپھڑا رہی تھیں۔

وہ دوڑتی ہوئی امی اور ابا کے فوٹو کے قریب آئی۔ اس کا ننھا سا جسم کانپنے لگا۔ وہ فوٹو کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"ابا جان! میں اس فوٹو کو کبھی نہیں پھاڑوں گی۔"

"ارے پگلی! کیا بڑبڑا رہی ہے" اسے امی کی آواز سنائی دی۔ وہ کافی کی پیالی لئے ہوئے کھڑی تھیں۔ انھوں نے پیالی میز پر رکھی اور ساجدہ کو سینہ سے لگا کر بولیں :-

"یہ فوٹو کہاں پھٹا ہوا ہے بیٹی؟"

ساجدہ ان سے لپٹ گئی۔

"امی! میں پگلی نہیں ہوں۔ بلکہ بری ہوں۔ بہت بری ہوں۔ میری ہڈی پسلی ایک کر دیجیے امی!"

"بھی! اتو آپ نے تو نہیں ہو گئی ہے" امی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے بولیں :-

"امی! آپ مجھے خوب ماریئے۔ میں نے ہی کل تختے کی تھی" ——— اس نے اپنا سر ان کے سینہ میں چھپا لیا۔ امی نے اس کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اور اس کا سر اوپر اٹھا کر گالوں پر ایک بوسہ لیا۔ ساجدہ کا سارا دکھ۔ ساری تکلیف، تمام درد ا لمحہ میں غائب ہو گیا۔ اب اس کے رخساروں میں درد نہیں تھا۔ جسم کی تھکاوٹ ختم ہو چکی تھی اور بھوک بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ ا رنگ اب کالا نہیں تھا بلکہ دودھ کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ پھر امی نے اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دیئے۔ ساجدہ کو وہ چڑیا یاد آ گئی جو بچے کے منہ میں اپنی چونچ ڈال رہی تھی۔ وہ ان سے لپٹی ہوئی بولی :

"امی! اب کبھی بھی میں آپ پر غصہ نہیں کروں گی۔ اور آپ جتنا بھی چاہے ماریں میں اس گھر سے کہیں نہیں جاؤں گی۔"

(بشکریہ "جام نو" دہ مرکزی تخیل خو

افسانہ

زہریلی مکّھی

غلام عبّاس

دو نوجوان دیہاتی جوتیاں بغل میں دبائے بھاگا بھاگ گاؤں میں داخل ہوئے۔ ان کے کپڑے گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ پنگھٹ کے پاس سے گزرے۔ عورتیں جو وہاں پانی بھرنے آئی تھیں۔ پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں۔

ایک ادھیڑ عمر دیہاتن نے ہاتھ سے آنکھوں پر چھاؤں کر کے ان کی طرف دیکھا اور بولی :۔

"اے یہ تو اپنے خیرو اور فتا ہیں۔ مرج دین کے بیٹے۔ پرانہیں ہوا کیا ہے یہ بھاگے کیوں جا رہے ہیں؟"

چھوٹے بھائی فتے کا سانس سینے میں نہ سماتا تھا۔ اس نے ذرا دم لینے اور ان عورتوں کو اپنی بپتا سنانے کے لئے رکنا چاہا۔ مگر بڑا بھائی خیرو اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لے چلا۔

"ہمارے پھوپا کا بیٹا ــــــ علیا ــــــ بری حالت ہے بے چارے کی" فتے نے چلتے چلتے بڑی مشکل سے کہا:۔

ہمدردی اور تعجب کے ملے جلے کلمات عورتوں کی زبان سے نکلے۔

"مار پیٹ ہوئی کچھ؟" ایک عورت نے پوچھا۔

"نہیں مار پیٹ نہیں ہوئی" فتے نے دور سے چلا کر کہا۔ "اللہ کی طرف سے ہے۔"

دونوں بھائی تیز تیز قدم اٹھاتے گاؤں کے اس طرف چل دیئے۔ جہاں حکیم اللہ جوایا کا گھر تھا۔

حکیم صاحب گھر پر ہی تھے۔ وہ فقط ایک نیلا تہمد باندھے گھر کے آنگن میں پھر رہے تھے۔ کندھے پر ایک زرد رنگ کی بچی کو بٹھا رکھا تھا جو بیماری سے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ بچی کی عمر نو برس سے کم نہ ہوگی۔

حکیم صاحب کی داڑھی کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ سینے پر بالوں کا ایک گپھا تھا۔ جو پسینے میں تر، پٹ سن کے ریشوں کی طرح چمک رہا تھا۔

حکیم صاحب کی بیوی کو چارپائی پر پڑے گیارہ مہینے ہو چکے تھے بیمار بچی کے علاوہ۔ جسے وہ کندھے پر بٹھا کر بہلا رہے تھے۔ گھر میں چار بچے اور تھے۔ مگر بیمار بچی سے عمر میں چھوٹے۔ وہ سب کے سب ننگ دھڑنگ مٹی اور کیچڑ میں لت پت آنگن میں کھیل رہے تھے۔ گھر میں غل غپاڑہ مچا ہوا تھا۔ جب سے حکیم صاحب کی بیوی نے مطب میں اپنا پلنگ بچھا لیا تھا گھر کا انتظام ہی درہم برہم ہو گیا۔ ہر طرف بے ترتیبی نظر آتی تھی۔ کہیں خربوزوں کے چھلکوں اور بیجوں کے ڈھیر لگے تھے۔ کہیں ٹوٹی ہوئی چارپائیاں پڑی تھیں۔ کہیں گنڈ ولنے، کہیں مٹی کی صراحیاں جن کے پیندے میں سوراخ ہو گئے تھے۔ کہیں بے سر کی گڑیا۔

گھر میں صرف ایک چیز سلامت رہی تھی۔ یہ سنہرے فریم کا ایک چوکھٹا تھا جس میں ایک سہرا سنہری روشنائی میں لکھا تھا۔ اسے آج سے دس بارہ برس پہلے حکیم اللہ جوایا کی شادی پر ایک مریض نے کسی کاتب سے خوش خط لکھوا کر تحفے میں پیش کیا تھا۔ مکھیوں نے بیٹھ بیٹھ کر فریم کو میلا کر دیا تھا مگر اس کا شیشہ ابھی تک صحیح و سالم رہا تھا۔ اور وہ اس وقت سے برابر ان کے مطب والی کوٹھڑی میں دیوار سے لٹک رہا تھا۔

حکیم صاحب نے ان دیہاتیوں کو دیکھا تو برس پڑے۔

"کیوں کیا کام ہے؟"

"حکیم صاحب" خیرو نے ہاتھ جوڑ کر بڑی عاجزی سے کہا۔

"ہمارے پھوپھا کا بیٹا مر رہا ہے"

"اچھا ہے بے چارہ مصیبت سے چھوٹ گیا"

"نہیں حکیم صاحب وہ ابھی مرا نہیں آپ چاہیں تو اسے بچا سکتے ہیں وہ اچانک ہی بیمار پڑ گیا۔ اللہ جانے اسے کیا بیماری لگی ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"سید پور کے قریب ایک طبیلے میں پڑا ہے۔" —

"سید پورہ؟" حکیم صاحب نے پھر آنکھیں نکالیں۔

سید پور اس گاؤں سے سات کوس پر تھا۔ کچی سڑک خیرو نے کہا "حکیم جی۔ ہم وہاں فصل کاٹنے گئے تھے۔ بس ایک دم طبیلے میں لیٹے لیٹے اسے کچھ ہو گیا۔ اس کا رنگ کالا پڑ گیا ہے۔ جیسے کلیجی کا رنگ ہوتا ہے۔ جسم بھی پھول گیا ہے۔ دیکھنے سے ڈر لگتا ہے خدا کے لئے جلدی سے چلئے۔ شاید بچ جائے۔"

"مگر کس طرح؟ پیدل؟" حکیم صاحب نے پھنکار کر کہا:۔

"دس میل پیدل۔ سر تو نہیں پھر گیا ہے تمہارا۔ گھوڑا لائے ہو؟"

"ابھی جاتا ہوں۔" خیرو نے جلدی سے کہا۔

"کسی سے مانگ لاؤں گا۔"

"اور میں اتنے ڈاڑھی منڈے لیتا ہوں۔" فتے نے کہا۔

حکیم صاحب نے اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا۔ جیسے کچا چبا ڈالیں گے۔

"مہر چنن دین نے مجھے بلایا ہے۔" فتے نے جلدی سے عذر کے طور پر کہا:۔

"خدا جانے کیا کام ہے؟"

"مہر چنن کون؟" حکیم صاحب نے پوچھا۔

"میرے ہونے والے سسر ہیں۔" فتے نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تو ابھی شادی نہیں ہوئی تمہاری؟"

"نکاح پڑھایا جا چکا ہے۔ مگر ابھی رخصتی نہیں ہوئی۔" اور فتے نے مسکرا کر گردن جھکالی۔

"اچھا تو لے ذرا سنبھال اسے۔" یہ کہکر حکیم صاحب نے بیمار بچی کو اپنے کندھے سے اتار کر فتے کے کندھے پر بٹھا دیا

اتنی سی دیر میں ایکے دوسرے بچے بھی آکر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئے تھے۔

"اور اس بچی کو بھی پکڑ۔ اس نامراد کو بھی۔ اس بدمعاش کو بھی اس کو بھی ——— اس کو بھی۔"

وہ دہلیز سے مڑے۔ اندر جانا چاہتے تھے کہ پھر ٹھہر گئے۔ بیمار بچی کو فتے سے واپس لے لیا۔ اور دونوں آدمیوں سے چلا کر کہا:

"جاؤ دفع ہو جاؤ۔ جلدی سے گھوڑی لے کر آجاؤ۔ میں کپڑے پہنتا ہوں۔"

خیرو اور ان کے پیچھے پیچھے فتا وہاں سے چلے آئے۔ فتے کے ہونٹوں پر ابھی تک مسکراہٹ تھی۔ اس کی عمر بیس سال تھی۔ اور اس کی بیوی کی سولہ برس۔ وہ ایسی تھی جیسے گلاب کا پھول فتے کو اس سے بہت امیدیں تھیں۔ وہ اس کا گھر اولاد سے بھر دے گی۔ وہ ان سب کے لئے محنت کرے گا۔ اللہ نے اسے مضبوط بازو دیئے ہیں۔ وہ ان کی خاطر دن بھر کام کرے گا اور رات کو ماہیا گائے گا۔ کام اور گانا۔ بس یہی تو اس کے دو شوق تھے اس نے بڑا رسیلا گلا پایا تھا۔ گاؤں والے کیا چھوٹے کیا بڑے۔ سب اسکی آواز پر لٹو تھے۔ وہ بڑا چھیل چھبیلا اور ہنس مکھ نوجوان تھا۔ دھوپ نے ابھی اس کا رنگ کالا نہیں کیا تھا۔ بال سنہرے تھے بڑوں کا ادب کرتا تھا۔ آنکھوں میں لحاظ تھا۔ کوئی اسے جو بھی کام کہا وہ بڑی خوشی کر دیتا تھا۔

فتے کو اپنے پھوپا کے بیٹے علیا کی بیماری کی تو اتنی فکر نہ تھی جتنی اس بات کی پریشانی کہ اس کے سسر مہر چنن نے اسے کیوں بلایا ہے۔ کہیں وہ رخصتی کی تاریخ کو ملتوی تو نہیں کر دیں گے وہ ابھی تک ان سے مل نہیں سکا تھا۔ مل لیتا تو شاید برکت بی بی کی بھی ایک آدھ جھلک دیکھنی نصیب ہو جاتی۔ مگر علیا کی خبر گیری بھی تو ضروری تھی۔ وہ تایا چاہی تھا عمر کبھی کیوں نے اسمرا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

بے چارہ علیا اس کے نکاح کی رسم بھی ادا ہو چکی تھی۔ مگر ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ خیال تھا کہ دونوں کی دلہنیں ساتھ ساتھ گھر آئیں گی۔ کتنی صدمے کی بات تھی کہ وہ یوں ایکا ایکی بیمار پڑ گیا۔

علیا اور یہ دونوں بھائی چودھری بشیر علی کے کھیتوں پر فصل کاٹنے گئے تھے۔ یہ پچھلے بدھ کی بات تھی۔ آسمان پر بارش کے آثار تھے۔ چودھری خیر علی کو فکر ہوئی کہ کہیں تیار فصل بوندا باندی سے خراب نہ ہو جائے

لہٰذا اس نے جلدی سے آدمیوں کو بلا کر کٹائی شروع کرا دی تھی۔ انھوں نے جمعرات کی دوپہر تک ساری فصل کاٹ کے رکھ دی تھی۔ پولے باندھنے کے لئے عورتوں کو بلوا لیا گیا تھا۔ جب فصل کٹ چکی تو چودھری نے سب کسانوں سے کہا۔

"تم سب کی ڈیڑھ ڈیڑھ دن کی مزدوری ہوئی ہے۔ اگر تم کام جاری رکھنا چاہتے ہو تو عورتوں کے ساتھ مل کر تم بھی پولے باندھنا شروع کر دو!"

اس پر علیا نے کہا تھا:۔

"اچھی بات۔ مگر مزدوری تو پوری ملے گی نا سوا روپیہ؟"

چودھری نے جواب دیا۔

"نہیں عورتوں کو جو دس دس آنے ملتے ہیں۔ اسی حساب سے تم کو بھی مزدوری ملے گی۔"

"نہیں چودھری صاحب مجھے منظور نہیں۔" علیا نے کہا۔

"میں مرد ہوں مجھے عورتوں کے برابر مزدوری کیوں ملے۔ آپ میرے ڈیڑھ دن کے ایک روپیہ چودہ آنے میرے حوالے کریں۔ میں کام بند کرتا ہوں۔"

"تمہارے بھائی بندا بھی تو اسی حساب سے کام کر رہے ہیں۔"

"وہ اپنے مختار آپ ہیں۔ چاہے مفت کام کریں۔ پر مجھے منظور نہیں۔"

اجرت لے لی مگر وہیں ٹھیرا رہا کہ شام کو جب اس کے میرے بھائی کام ختم کر لیں گے۔ تو سب مل کر گھر چلیں گے۔ وہ کچھ دیر انکے پاس ہی کھڑا ان کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ مگر بے کار کب تک کھڑا رہتا۔ آخر اکتا کر ایک بدبودار طویلے میں جو قریب ہی خالی پڑا تھا۔ جا کر سوکھی گھاس پر لیٹ رہا۔ خیرا اور فتے سے کہہ دیا کہ جب تم چلنے لگو تو مجھے بھی ساتھ لے لینا۔

شام ہو گئی۔ مگر پولوں کی بندھائی ختم نہ ہوئی۔ عورتوں نے کہا کہ ہم رات بھر کام کریں گی۔ خیرا اور علیا نے بھی رات بھر کام کرنا منظور کر لیا۔ تنگ دستی کی وجہ سے وہ پیسے کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔

چاندنی رات تھی چودھری شیر علی نے ہر ایک کو باجرے کی روٹی پر سرسوں کا ساگ رکھ کر دے دیا۔ سب کھا پی کر کام پر لگ گئے اور کوئی بارہ بجے تک سارے پولے باندھ لئے۔ اس کے بعد چاندنی میں عورتیں ایک طرف مرد ایک طرف گھاس پر لیٹ گئے۔ کسانوں نے فتے سے کہا۔

"لے اب دو چار بولیاں ہو جائیں ماہیا کی۔" اور فتے نے گانا شروع کر دیا تھا۔

تھی تو چاندنی رات مگر کبھی کبھی آسمان پر کالے کالے اور سفید بادل بھی منڈلانے لگتے تھے۔ چاند کبھی ان کے پیچھے چھپ جاتا کبھی نکل آتا۔ چاند کو دیکھ دیکھ کر فتے کو برکت بی بی کا چہرہ یاد آ جاتا اور وہ گاتے گاتے آہیں... بھرنے لگتا۔

علیا رات بھر طویلے ہی میں پڑا رہا۔ علی الصبح خیرا اسے جگانے آیا تو دیکھا کہ اس کا سارا جسم سوجا ہوا ہے۔ رنگ کالا پڑ گیا ہے اور وہ بخار سے پھنکا جا رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھی تھی کہ دونوں بھائی بھاگے بھاگے حکیم صاحب کو لینے چل دیئے۔

فتا یہ واقعہ جیدو کو سنا رہا تھا۔ وہ سننے میں ایسا محو ہوا کہ اس نے ڈاڑھی مونڈتے مونڈتے فتے کے گال پر تھوڑی کے قریب استرے کا ایک چرکہ لگا دیا۔ زخم معمولی سا تھا۔ فتے نے کچھ زیادہ خیال نہ کیا۔ اتنے ہی میں مہر چنن بھی خط بنوانے جیدو نائی کی دکان پر آ پہنچا۔ فتے نے پھر سے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اور وعدہ کیا کہ شام کو ضرور گھر آؤں گا۔

وہ جیدو کی دکان سے رخصت ہونے ہی کو تھا کہ مائی جیواں اسے مل گئی۔ علیا کا نکاح اس کی بیٹی حشمت بی بی سے پڑھا جا چکا تھا... بڑھیا نے علیا کی بیماری کی خبر سن پائی تھی۔ اور مارے غم کے پچھاڑیں کھانے لگی تھی۔ فتا نے اسے دلاسا دیا۔ اور بڑی مشکل سے اس سے رخصت ہوا۔

سید پورہ کو جو سڑک جاتی تھی بڑی اونچی نیچی تھی۔ بیل گاڑیوں کے پہیوں نے اس میں گہرے گڑھے ڈال دیئے تھے۔ جو میلوں تک چلے گئے تھے۔ خیرا اور فتا حکیم اللہ چیڑا کو گھوڑی پر بٹھائے اسی سڑک پر لئے جا رہے تھے۔ گھوڑی بار بار بدکتی تھی اور حکیم صاحب بار بار اچھل پڑتے تھے۔ اس پر فتے نے ایک طرف سے اور خیرے نے دوسری طرف سے گھوڑی کی لگام پکڑ لی اور یوں ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگے۔

گرد دھوپ اور گرمی نے حکیم صاحب کا مزاج اور بھی چڑچڑا کر دیا تھا۔ بار بار گھوڑی اور اس کے مالک کو بے نقط سناتے تھے۔ خیرا اور فتا انہیں تسلیاں دیئے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر کی اور تکلیف کے

میں اب بچنا ہی چاہتے ہیں۔ حکیم صاحب کو سب سے زیادہ یہ خیال ستا رہا تھا کہ اگر اس سفر نے انہیں بیمار ڈال دیا تو انکے بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ حکیم صاحب کا دھیان بٹانے کے لئے دونوں بھائی راستہ بھر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ یہ سال بہت برا رہا ہے گیہوں نام کو نظر نہیں آتی۔ مکئی کا بھی پتہ نہیں ادھر پھلوں کا بھی یہی حال ہے۔ پچھلے سال آموں پر خوب بور تھا۔ آموں کی وہ کثرت تھی کہ جدھر جاؤ ٹوکرے کے ٹوکرے بھرے نظر آتے تھے مگر کوئی دیکھتا نہ تھا۔ مگر اس سال آم تو ایسے غائب ہوئے کہ جیسے آموں کا موسم بھی نہیں آیا۔ بھینسوں نے بھی دودھ دینا کم کر دیا ہے۔ مہنگائی نے ناک میں دم کر دیا ہے۔

"جبھی تو میں نے کہا تھا۔" حکیم صاحب آخرکار بولے:۔

"کہ مرتا ہے تو مرنے دو۔ غریب مصیبتوں سے چھوٹ جائے گا۔"

آخر جوں توں کر کے دو گھنٹے کے بعد وہ نسید پور پہنچ ہی گئے۔ مگر گرمی نے برا حال کر دیا تھا۔ ادھر گھوڑی بھی پسینے پسینے ہو رہی تھی۔

علیا اس بدبودار طبیلے میں سوکھی گھاس پر پڑا تھا۔ جس طرح کہ وہ اسے چھوڑ گئے تھے۔ اس کی خبرگیری کے لئے کوئی بھی اس کے پاس نہ تھا اس کا سارا جسم پھول کر کپا ہو رہا تھا۔ خاص کر چہرہ تو ایسا مسخ تھا کہ پہچانا ہی نہ جاتا تھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ طبیلے کی ایک سلاخوں والی کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی اور اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کا چہرہ انسانوں کا سا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ گالوں کے سوج جانے سے ناک بالکل غائب ہو گئی تھی۔ ہونٹ پھول گئے تھے ان کا رنگ کالا پڑ گیا تھا۔ انہیں دیکھ کر ڈر لگتا تھا سانس کی دھونکنی کی آواز انہی ہونٹوں سے نکل رہی تھی۔ یہ آواز ایسی تھی کہ جیسے کوئی کتا تکلیف سے غرا رہا ہو۔ اس کے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں سوکھی گھاس کے تنکے الجھے ہوئے تھے۔ جو دھوپ میں چمک رہے تھے۔

حکیم صاحب اور یہ دونوں بھائی یہ حال دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ خیرو بڑھ کر اس کے پاس پہنچا۔ اور بڑے محبت بھرے لہجہ میں کہنے لگا۔

"علیا۔ علیا۔ ہم حکیم صاحب کو لے آئے ہیں۔"

فتا بھی گھوڑی کو طبیلے کے اندر ایک کھونٹے سے باندھ علیا کے پاس آ گیا۔ دو تین مرتبہ علیا کا نام لے کر پکارا گیا۔ تو اس کے نرخرے کا بولنا بند ہو گیا۔ اس نے اپنی سرخ گھناؤنی اور بہت تنگ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اس کے خوفناک ہونٹ کھلے۔ اس نے بڑی مشکل سے کراہ کر کہا:۔

"میں مر رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔" خیرو نے بڑے دکھ کے ساتھ مگر جلدی سے کہا۔

"دیکھو ہم حکیم صاحب کو لے آئے ہیں۔ وہ تمہیں اچھا کر دیں گے ذرا آنکھ کھول کر تو دیکھو۔"

"مجھے میرے گاؤں لے چلو۔" علیا نے بڑی مشکل سے گڑگڑا کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔" خیرو نے کہا:۔

"ہمارے پاس گھوڑی ہے۔ ہم تمہیں گھوڑی پر لے چلیں گے۔ اگر گھوڑی نہ ہو تو بھی میں تمہیں پیٹھ پر لے چلوں گا۔"

علیا نے فتح کی آواز سن کر گردن پھیری اور اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول دیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے اپنا بازو پھیلا کر اس کے تہمد کو پکڑ لیا۔

"فتے تم آ گئے۔"

"ہاں میں آ گیا۔ تم رو رہے ہو علیا۔ روؤ نہیں۔ تم اچھے ہو جاؤ گے۔"

یہ کہہ کر فتے نے اپنا ہاتھ علیا کے سینے پر رکھ دیا۔ جو ہچکیوں کی گھٹن سے اچھلا پڑتا تھا۔ اس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا اپنا ہاتھ اٹھایا۔ اور فتے کے گلے میں ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا:۔ "ہم دونوں کے نکاح ایک ہی دن پڑھے گئے تھے۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"اور رخصتی بھی ایک ساتھ ہوگی۔" فتے نے کہا اور اپنی گردن علیا کے بازو سے نکالنے کی کوشش کی۔ جس نے اسے بری طرح بھینچ رکھا تھا۔

اس اثنا میں حکیم اللہ جوایا بڑے غور سے مریض کو دیکھتے رہے تھے۔ مرض ان کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

"تم کو کسی کیڑے نے تو نہیں کاٹا؟" انہوں نے علیا سے پوچھا۔

علیا نے سر سے نہیں کا اشارہ کیا۔

"کیڑے کے کاٹنے سے ایسا ہو جاتا ہے؟" خیرو نے پوچھا۔

"کیڑا نہ ہوگا کوئی اور شے ہوگی۔" حکیم صاحب نے کہا اور پھر تفصیل سے مرض کی نوعیت بیان کرنے لگے:۔

"اس طویلے میں ضرور کوئی مویشی زہر باد سے مرا ہوگا۔ اور کسی کیڑے وغیرہ کے کاٹنے سے اس بیماری کے جراثیم علیا کے جسم میں پہنچ گئے ہوں گے۔"

جب حکیم صاحب یہ کہہ رہے تھے تو علیا نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ عین اس وقت ایک مکھی دیوار پر دکھائی دی۔ وہ کبھی اپنی چھوٹی سی سونڈ باہر نکالتی کبھی اسے چاٹتی۔ کبھی لگتی کی وہ مہین مہین ٹانگوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتی۔ وہ بڑی مگن معلوم ہوتی تھی۔

ممکن ہے اسی مکھی نے اسے کاٹا ہو۔ حکیم صاحب کے پوچھنے پر اب اسے یاد آرہا تھا کہ کل جب وہ کھیت سے لوٹ کر اس طویلے میں سویا تھا تو ایک مکھی نے اسے بہت تنگ کیا تھا۔ کہیں وہ یہی مکھی تو نہیں۔

علیا نے دیکھا وہ مکھی اچانک دیوار سے اڑی۔ وہ اپنی نظروں سے اس کا تعاقب کرنے لگا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے وہ مکھی ہوا میں ادھر ادھر گھوم کر فتے کے گال پر جا بیٹھی۔ گال سے وہ آہستہ آہستہ تھوڑی کی طرف بڑھی۔ جہاں داڑھی مونڈتے وقت استرے سے چرکا لگ گیا تھا مکھی بڑی للچاہٹ سے اس چرکے پر بیٹھ گئی۔ علیا کچھ دیر غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے کھوکھلی آواز میں پوچھا:۔

"مکھی کے کاٹنے سے بھی بیماری ہو سکتی ہے؟"

کیوں نہیں۔ حکیم صاحب نے جواب دیا۔

علیا نے اس کے بعد کوئی اور بات نہ کی۔ وہ برابر غور سے مکھی کی طرف دیکھتا رہا۔ ادھر فتا حکیم صاحب کا جواب سننے میں ایسا محو ہوا کہ اس کا دھیان اس مکھی کی طرف گیا ہی نہیں۔ جو اس کے گال پر بیٹھی تھی۔

علیا خوش تھا کہ حکیم صاحب سے سوال کر کے اس نے اپنے میرے بھائی فتے کا دھیان حکیم صاحب کی طرف ہٹا دیا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ فتا جیتا جاگتا ہے اس خیال سے علیا کو فتے سے سخت حسد پیدا ہو گیا تھا اگر یہ وہی مکھی تھی تو پھر مجھ شادی بیاہ ہی نہیں جیسے مرنے میں بھی ان دونوں کا ساتھ رہے گا

یکبارگی فتا مکھی کے کاٹنے سے چونک اٹھا مکھی تو اڑ گئی، اور وہ انگلیوں سے تھوڑی کو سہلانے لگا۔ جہاں جبر ونائی کے استرے سے چرکا لگا تھا۔ ساتھ ہی اس کی نظر علیا پر پڑی۔ علیا کے سپید ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کو دیکھ کر اسے بڑا اچنبھا ہوا۔ دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر علیا نے اپنی ساری طاقت جمع کر کے رک رک کر کہنا شروع کیا۔

"جو مکھی ابھی ابھی تم کو کاٹ گئی ہے۔ اسی مکھی نے مجھے کاٹا تھا۔" فتا اس کی بات نہیں سمجھا۔ خیر وا اور حکیم صاحب بھی مستفسرانہ نظروں سے علیا کی طرف دیکھنے لگے۔

علیا نے بڑی مشکل سے کہا۔

"تمہاری ٹھوڑی پر جو زخم ہے میں نے اپنی آنکھوں سے اس مکھی کو اس پر بیٹھتے دیکھا ہے۔"

اب وہ سمجھ گئے۔ فتا کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی حکیم صاحب کو دکھلا کر کہا۔

"مجھے یہاں کھجلی ہو رہی ہے۔"

"طویلے سے باہر چل کر روشنی میں دکھاؤ۔" حکیم صاحب نے فکرمندی سے کہا۔ اور وہ اسے طویلے میں سے باہر لے گئے۔ خیرو بھی گھبرایا ہوا اس کے پیچھے ہو لیا۔

علیا طویلے میں اکیلا پڑا رہا۔ کچھ دیر اس کے کانوں میں گڈمڈ سی آوازیں آتی رہیں۔ مگر وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔

اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ خیرو طویلے میں آیا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے گھوڑی کو کھونٹے سے کھولا اور علیا پر نظر تک ڈالے بغیر زور زور سے چیختا ہوا باہر نکل گیا۔ "ہائے۔ میرا فتا۔ ہائے میرا فتا۔" تو پھر یہ سچ تھا؟ اور وہ علیا کو پیچھے چھوڑے جا رہے تھے۔ جیسے کوئی کتے کو مرنے کے لئے چھوڑ جائے۔ اس نے کہنی کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی اور دو دفعہ پکار کر کہا:۔ "خیرو۔ خیرو!" طویلے میں اس کی آواز گونجی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اور اس نے اپنے سر کو پھر گھاس پر گرا دیا اور کراہنے کی کوشش کرنے لگا۔ تاکہ اس سکوت کو توڑ سکے جو اسے خوفزدہ کر رہا تھا۔ یکایک اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہیں میں بخار کی بیہوشی میں کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ جیسے ہی اس نے دیوار کی طرف منہ پھیرا اسے وہی مکھی دکھائی دی۔ وہ پھر دیوار پر آ بیٹھی تھی۔ وہ کبھی اپنی چھوٹی سی سونڈ کو باہر نکالتی۔ کبھی اسے چاٹتی۔ کبھی لگتی کی وہ مہین مہین ٹانگوں کو رگڑتی۔ وہ بڑی مگن معلوم ہوتی تھی۔

(بشکریہ "ماہ نو")

ریسٹ بلریڈ

ابھی اِنسان زندہ ہے

ایک دلچسپ وسبق آموز واقعہ

اتوار ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۶ء کی رات کو میامی ہیرلٹ کا پرچہ پریس میں جاچکا تھا۔ کہ میری میز پر پڑی ہوئی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رلیسیور کان سے لگایا تو ایک مدہم مگر غم زدہ نسوانی آواز سنائی دی۔

"کیا آپ ازراہ کرم .... میری امداد فرمائیں گے۔ میرا خاوند بہت سا خون نکلنے کے باعث بہت نڈھال ہو گیا ہے"۔

میں نے دریافت کیا۔

"آپ کے خاوند کو کیا شکایت ہے"، وہی افسردہ اور پژمردہ آواز پھر سنائی دی وہ بیکیں ہسپتال میں پڑا ہے۔ اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ صبح تک مر جائیگا کیونکہ جو تازہ خون اس کے لئے درکار ہے وہ اس وقت تک میسر نہیں آسکا۔ اور نہ بظاہر اس کے ملنے کی توقع ہے"۔

میں نے رلیسیور پر ہاتھ رکھکر اپنی اسسٹنٹ مس میگی کو کہا کہ وہ دوسرے ٹیلیفون سے بیکیں ہسپتال کو ملائے۔ جب وہ میرے حکم کی تعمیل کر رہی تھی۔ تو میں نے پھر اس خاتون سے پوچھا:۔

"آپ کے خاوند کا کیا نام ہے؟"

اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے جواب دیا:۔

"روڈی کودرک ہم ڈیر بورن واقع ریاست مشیگن کے رہنے والے ہیں۔ اور بغرض سیر و تفریح سفر کر رہے تھے۔ کہ یہاں پہنچکر میرے خاوند کو ایک حادثہ پیش آگیا"۔

میں نے پھر دریافت کیا۔

"ہسپتال کے ڈاکٹر کا کیا نام ہے؟" جواب ملا:۔

"اس ہسپتال میں دو ڈاکٹر ہیں۔ ایک کا نام ڈاکٹر میڈونے ہے۔ اور دوسرے کا نام ڈاکٹر ڈیوڈ ہے"۔

اس گفتگو کے دوران میں ہسپتال سے ٹیلیفون کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا اور ڈاکٹر ایڈورڈ میڈونے نے "اس امر کی تصدیق کی کہ فی الواقع روڈی کودرک کو تازہ خون کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کس قسم کے خون کی ضرورت ہے۔ جواب ملا:۔

"اے۔ بی۔ آر/ ایچ منفی (A.B.R. H. MINUS) انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس قسم کا خون لوکل بلڈ بینک میں موجود نہیں۔ اور نہ کسی اور ذریعہ سے میسر آسکتا ہے۔ اور اگر فوراً اس کا انتظام نہ ہو سکا تو مریض کے جانبر ہونے کی بہت کم امید ہے۔

میں یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ کہ اب کیا کروں؟ اور کس طرح مصیبت زدہ خاتون کی امداد کروں؟ کسی اخبار کے ایڈیٹر کی زندگی کے ان لمحات میں سے یہ بھی ایک تھا۔ جب وہ یہ چاہتا ہے۔ کہ کاش اسے وہ قدرت اور امتیاز حاصل ہو جائے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ اسے حاصل ہے۔ جب میں اپنی قیام گاہ سے دفتر کی طرف آتا ہوں تو ان عام آدمیوں سے مختلف نہیں ہوتا۔ جو سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جب میں دفتر کی میز پہ بیٹھتا ہوں۔ تو میرے ملنے والے اور ٹیلیفون پر گفتگو کرنے والے یہی سمجھتے ہیں۔ کہ میں غیر معمولی قابلیت اور وسائل کا مالک ہوں۔ اور میرے ایک ادنیٰ اشارے میں ہر ایک مشکل کا حل موجود ہے۔ یہ باتیں سن سن کر بعض اوقات مجھ میں خود ستائی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن آج رات مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا اور مجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس ستم زدہ خاتون کے خاوند کو ایک خاص قسم کا تازہ خون کیسے بہم پہنچاؤں جو اسے حیات تازہ بخشے؟

میرے دفتر کے ساتھ ہی ریڈیو کا کمرہ تھا جس کے دروازے پر ایک ... ہوا تھا۔ اس کی سوئیاں آٹھ بجکر بارہ منٹ کا وقت بتا رہی ...

[illegible] کے ٹھیک بجے ایک خیال آیا اور میں نے فوراً ہی طے کیا کہ ریڈیو اسٹیشن کو [illegible] مجھے معلوم تھا کہ اس وقت ریڈیو اسٹیشن کے ایک کمرے کی ایک میز پر جو مائیکروفون، تار کی جالیوں، کاغذ، پنسل اور خبروں کی کاپیوں سے لدی ہوئی ہے، ایک آتش بیان شخص والٹر ونچل بیٹھا ہوا اتوار کی رات کے نو بجے والی قومی نشریات کو شروع کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ایک زنانہ آواز نے کہا۔

"گڈ ایوننگ میں ریڈیو اسٹیشن سے بول رہی ہوں۔ فرمائیے کیا ارشاد ہے"

میں نے کہا۔

"دیکھو ایک غیر معمولی حادثہ پیش آگیا ہے اور میں اس کے متعلق ونچل سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

جواب ملا۔

"یہ ناممکن ہے۔ مسٹر ونچل ابھی آج کی قومی نشریات شروع کرنے والے ہیں۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ کہ وہ تمہارے ساتھ والے کمرے میں بیٹھا ہوا ہے اسے کہو کہ ہیرلٹ اس کی نشریات کے لئے ایک بے حد ضروری خبر کا اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک شخص کے متعلق ہے۔ جو مر رہا ہے پھر میں نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا اس لڑکی سے کہا۔

"یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس لئے میرا پیغام اسے ضرور پہنچاؤ"

چند لمحہ کا وقفہ ہوا۔ اور دوسرے کمرے سے ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔ یہ شخص پال شیفل تھا۔ جو امریکن براڈ کاسٹ کمپنی میں بطور ونچل کے اسسٹنٹ کے کام کرتا تھا۔ جو پیغام میں براڈ کاسٹ کروانا چاہتا تھا۔ وہ میں نے اسے لکھوا دیا اور مسٹر شیفل نے وعدہ کیا کہ یہ پیغام وہ ابھی ونچل کے حوالے کر دے گا۔ پانچ منٹ سے کم عرصہ میں یہ سب کچھ ہو گیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے پھر مسز گوورک سے بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ ابھی تک ٹیلیفون کو تھامے ہوئے سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں اسے تسلی دینا چاہتا تھا۔ لیکن جس عورت کا خاوند موت کے چنگل میں ہو۔ الفاظ سے اس کی تشفی کہاں ممکن ہو سکتی ہے۔ ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کر کے میں [illegible] لیکن [illegible] پر نظر پڑی جس کی سرخ سوئی [illegible] آگے بڑھ رہی تھی۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کمرہ میں جو بیرونی پیغامات وصول کرنے کے لئے مخصوص ہے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی مسلسل بجنے لگی۔ مس کیٹی نے جس ڈیوٹی اس روز پر تھی مجھے کہا۔

"دفعتاً پیغامات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی ہے۔ دیکھئے کوئی صاحب آپ کو پولیس ہیڈ کوارٹر سے بلا رہے ہیں۔"

ایک صاحب جن کا نام ڈیولیوس تھا۔ اور جو اس وقت ہیڈ کوارٹر آفس میں ڈیوٹی پر تھے۔ بولے۔

"کیوں صاحب یہ کیا قصہ ہے ہمیں ہر طرف سے پیغام موصول ہو رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"کس کے متعلق؟"

ڈیولیوس نے جواب دیا۔

"اس شخص کے متعلق جس کو ونچل کہتا ہے۔ کہ تازہ خون کی ضرورت ہے۔ ہمیں ابھی ابھی ایک پیغام ملا ہے۔ کہ ایک شخص آگسٹا واقع جارجیا سے ایک خاص ہوائی جہاز کرایہ پر لے کر یہاں آ رہا ہے۔ ایک پیغام روما سے آیا ہے کہ جس قسم کے خون کی ضرورت ہے۔ وہ یہاں کے بلڈ بینک میں موجود ہے۔"

میں نے اپنی دوسری اسسٹنٹ مس ہیگی سے کہا کہ یہ پیغام نوٹ کرے لیکن وہ بھی ٹیلیفون کے ان پیغامات کا جواب دینے میں مصروف تھی۔ جو باہر سے براہ راست ہمارے دفتر میں موصول ہو رہے تھے۔ میامی کے قریب جوار کے لوگ جو کسی وجہ سے لنکن ہسپتال سے ٹیلیفون کا سلسلہ قائم نہ کر سکتے تھے وہ ہیرلٹ کو فون کر رہے تھے۔ ادھر پولیس ہیڈ کوارٹر میں لیوس کو بیسیوں پیغامات مختلف مقامات سے مل رہے تھے۔ یہاں تک کہ واشنگٹن سے بھی پیغامات آ رہے تھے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ مسٹر ونچل نے اپنا نو بجے رات والا براڈ کاسٹ ان الفاظ سے شروع کیا تھا۔

"روڈی گوورک عمر ۲۳ سال ڈیلیون واقع ریاست میچیگن کا رہنے والا۔ ابھی ابھی میامی پہنچا ہے۔ کسی حادثہ کے باعث اس کا بہت سا خون ضائع ہو گیا ہے"

لئے زندہ رکھنے کے لئے اسے بی۔ آر ایچ منفی خون کی فوراً ضرورت ہے مزید تفصیلات کے لئے ڈاکٹر میڈورز بیکس ہسپتال سے رجوع کریں۔

منجانب ٹومی سلیمان میامی ہیرلڈ"

اس نے یہ پیغام دو دفعہ نشر کیا تھا اور ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ یہ پیغام فلوریڈا کے ان احباب کے لئے ہے جو مریض کو اپنا خون دینا پسند فرمائیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام امریکہ میں اس پیغام نے ایک آگ سی لگا دی ہے۔ اور احساس فرض کا ایک طوفان امڈ آیا ہے۔ سان فرانسسکو سے لبیک کی آوازیں آرہی تھیں۔ سوانا واقع جارجیا سے دو ایسے شخص جو بخوشی اپنا خون پیش کرنا چاہتے تھے ایک خاص ہوائی جہاز پر میامی آرہے تھے۔ اٹلانٹا سے چار اور چارلسٹن واقع جارجیا سے تین آدمیوں نے اس غرض کے لئے ہوائی جہاز میں نشستیں حاصل کی تھیں۔ نیویارک میں ایسٹرن ایرلائنز نے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص اپنا خون دینے کے لئے میامی جانا چاہتا ہو اس سے آمد و رفت کا کرایہ نہیں لیا جائے گا۔ غرض دس بجے رات تک دو سو پچاس اس نوعیت کے عطیات پیش کش مختلف اطراف سے ہسپتال میں موصول ہو چکے تھے۔

مقامی لوگوں کا ہسپتال جانے کے لئے تانتا بندھا ہوا تھا اور ہسپتال کے تمام برقی برآمدے لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ شہر کے مضافات سے پرائیویٹ کاریں ایسے اشخاص کو لیکر آرہی تھیں۔ جو خون دینا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ ہسپتال پہنچنے کے تمام راستے گاڑیوں کی کثرت سے تقریباً بند ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ بائیسکلوں پر آنے والے معلی اپنی بائیسکلیں سڑک پر پھینک کر ہسپتال کی طرف بھاگے آرہے تھے۔

امریکن براڈکاسٹنگ کمپنی نے ونچل کو ہدایت کی تھی کہ رات گیارہ بجے پھر مائیکروفون پر آکر اپنی اپیل کے نتیجہ سے لوگوں کو آگاہ کرے۔

مسٹر ونچل نے مائکروفون پر آکر جو کہا اس کا ماحصل یہ ہے:۔

"برادرانہ محبت اور ایثار و ہمدردی کا ایک ایسا مظاہرہ میں نے دیکھا ہے جس کا مجھے پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ ہر شخص اس مریض کی امداد کے لئے بیتاب نظر آرہا تھا۔ کسی شخص نے یہ سوال نہیں کیا کہ مریض کی قومیت کیا ہے۔ حبشی ہے۔ یا سفید فام۔ یہودی ہے یا عیسائی یا لامذہب ہے۔..... رومن کیتھولک عقیدہ کا پیرو ہے۔ یا وہ پروٹسٹنٹ ہے۔ صرف یہی ایک

صد آر ایچ منفی قسم کے خون کی ...... مریض کو جس کے لئے ضرورت ہے۔ وہ میرے جسم میں موجود ہے اور میں بخوشی اس خون کی پیش کش کرتا ہوں۔"

ہزاروں آدمیوں نے رات کے گیارہ بجے کا یہ براڈکاسٹ سنا ہوگا لیکن اگر نہیں سنا تو مسز گوڈرک نے۔ جو رالف پر مسز ... اپنے خاوند کی چارپائی کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی لیکن خاوند کے حواس بجا تھے۔ اور حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ اسی کمرہ میں ایک سیاہ فام تھین ڈیلش، جو نیویارک کا رہنے والا تھا بھی موجود تھا۔ حسن اتفاق سے وہ بیکس ہسپتال کے قریب سے گزر رہا تھا تو اس نے اپنی کار کے ریڈیو سے ونچل کا اعلان سنا۔ مسٹر ڈیلش کا بیان ہے:۔

"یہ اعلان سن کر میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اتفاق سے اس میں ملٹری کا وہ پرانا کارڈ موجود تھا جس میں بلڈ ٹسٹ وغیرہ کے نتائج لکھے ہوئے تھے۔ میرا خون صحیح وہ تھا جس کی مریض کو ضرورت تھی۔ اس کے پانچ منٹ بعد وہ ہسپتال میں داخل ہوا اور پکارا:۔

"وہ مریض کہاں ہے جس کو اے۔ بی۔ آر۔ ایچ منفی خون کی ضرورت ہے"

اور اس کے چند منٹ بعد وہ ڈاکٹر کی امداد سے براہ راست اپنا خون گوڈرک کے جسم میں داخل کر رہا تھا۔ بیکس ہسپتال کی لابی میں لوگوں کا جم غفیر موجود تھا۔ جب انہوں نے یہ اعلان سنا کہ گوڈرک کا مطلوبہ خون مل گیا ہے اور وہ رو بہ صحت ہو رہا ہے۔ تو حاضرین نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ اور کئی ایک والنٹیئر جو خون دینے کے لئے آئے تھے کچھ ناامید سے ہو گئے۔ آخر انہیں ہدایت کی گئی۔ کہ وہ لوکل بلڈ بینک میں اپنا خون جمع کرا دیں۔ اور کئی ایک نے ایسا کیا۔ اس واقعہ کے چند ہفتہ بعد جب اخبار میں ایک دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ تو ایک شخص مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ اور اپنا نام رونڈی گوڈرک بتایا جب میں نے اس سے مصافحہ کیا تو ہم دونوں کے چہروں پر ہنسی کھیل رہی تھی اور ہم دیر تک گرم جوشی سے مصافحہ کرتے رہے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔

مترجم کھوکھر

بشکریہ ہفت روزہ ...

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا ضروری ہے

جب صبح آئی!

محمود فاروقی

ستارے بڑی دیر سے جاگ رہے تھے لیکن جیسے ہی رات نے واپس جانے کی تیاریاں کیں ان کو اونگھ سی آگئی ——— ان کو اونگھتے دیکھ کر صبح چپکے سے نکل بھاگی اور دبے پاؤں زمین پر اترنا شروع کیا ——— پہلے وہ مرغ کی منڈیروں پر ٹھہری پھر وہاں سے نازبو کی کلیوں پر اتر ی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے شبنم کے ننھے ننھے قطروں سے سرگوشی کرنے لگی ان سرگوشیوں سے نازبو کی کلیاں انگڑائی لے کر جاگ اٹھیں اور اپنی خوب صورت انکھڑیوں سے انھوں نے صبح کو برہم ہو کر دیکھنا شروع کیا۔ شریر صبح کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بلبل کے جھنڈ میں چلی گئی جہاں بلبل پروں میں سر چھپائے سو رہے تھے۔ صبح نے ان کو ہولے ہولے گدگدایا اور وہ پر جھٹکتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور حسب عادت بیٹھے بیٹھے گیت گانے لگے۔ ان کی سریلی تانوں پر سنگ مرمر کے حوض میں سرخ مچھلیوں نے رقص شروع کر دیا سرخ پگڑی والے مرغ بھی دیوار پر چڑھ گئے اور اپنی ککڑوں کوں سے باغ کو سر پر اٹھا لیا۔ ادھر مور بھی مست ہو کر ناچنے لگا۔ مدن مست اور گلاب بھی چونک کر کھل گئے۔ اس دلچسپ تماشہ کو دیکھنے کے لئے مینائوں، کبوتروں، مرغابیوں اور چکوروں کے جھنڈ چہچہاتے ہوئے باغ میں اتر پڑے۔ کوؤں نے بھی کائیں کائیں شروع کر دی۔ پھر جب آسمان کے کنارے آخری ستارے نے نیلے نیلے لحاف میں اپنا منہ چھپا لیا تو سب مل کر خدائے قدوس کے گیت گانے لگے۔

"تو ہی تو ہے پالن ہار"

صبح باغ کا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی... اچانک وہ عشق پیچاں کی بیل پر چڑھ گئی اور وہاں سے خواب گاہ کی کھڑکیاں جھانکنے لگی پھر ایک سوراخ کے ذریعہ وہ خواب گاہ میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوئی ——— باغ کا مالک گہری نیند سو رہا تھا صبح نے آہستہ سے اس کو ہلا کر جگایا۔ باغ کے نوجوان مالک نے ایک انگڑائی لی اور پھر چادر صبح لپٹ کر دوسری طرف کھسک گئی لیکن باغ کے مالک نے آنکھیں نہیں کھولیں وہ مست نیند سو رہا تھا آخر تنگ آ کر اس نے اس کے نیند سے بھرے ہوئے پپوٹوں کو اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی گالے جیسی ہتھیلیوں سے مسل دیا۔ باغ کے نوجوان مالک نے لحاف اس زور سے کھینچا کہ بے چاری صبح دوسری طرف منہ کے بل گر پڑی وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے کہا۔

"اٹھو میرے دوست آنکھیں کھولو دیکھو میں آگئی ہوں۔ میں نے تم تک پہنچنے کے لئے بڑی مصیبت اٹھائی۔ آسمان کے چوکیداروں کو اونگھتا دیکھ کر نسیم کے جھونکوں کا سہارا لئے ہوئے آسمان سے نکل بھاگی۔ تمہارے باغ میں مجھے دیوار پھاند کر آنا پڑا۔ وہاں میں نے سب کو جگا دیا ہے۔ ذرا اپنے دریچے سے دیکھو نازبو کی کلیوں کو میں نے جگا دیا ہے۔ بلبلوں کو بیدار کر دیا ہے تمام پرندے جاگ اٹھے ہیں خوب صورت نرگس کی متوالی آنکھیں کھلتی ہی نہ تھیں۔ میں نے اس کو اتنا گدگدایا کہ اسے آنکھیں کھولنا ہی پڑیں۔ سبزہ زمین پر پیر پھیلائے سو رہا تھا اب دیکھو کس طرح جھوم رہا ہے لیکن تم کیوں نہیں اٹھتے۔ میرے دوست! میں بڑی مشکل سے تم کو جگانے آئی ہوں۔ ذرا عشق پیچاں کی بیل ہی سے پوچھ لو۔ تمہارے پاس آنے کے لئے میں نے کتنی مصیبت اٹھائی ہے۔ اٹھو باغ کے نوجوان مالک اٹھو۔ جاگ جاؤ۔ میرے اچھے دوست، باغ میں پرندے پھول پھلواریاں سب اپنے آقا کو یاد کر رہے تھے۔ دیکھو خاموش سڑکوں پر اللہ کے سپاہیوں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ وہ پہلی حاضری کے لئے جلد جلد قدم اٹھا رہے ہیں۔ تم نہیں اٹھو گے بتاؤ میرے دوست تم نہیں اٹھو گے۔

باغ کے نوجوان مالک نے لحاف کھینچ کر کروٹ بدل لی۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ شریر صبح کو

کردار کے دو پہلو

انسان خود اپنی شکل اُس آئینے میں دیکھنے کی پروا نہیں کرتا جس میں وہ دوسروں کی شکل دیکھتا ہے

ابن فرید

پہلا رخ

جب میں احمد بھائی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ غصے سے کانپ رہے تھے۔ ان کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ اور وہ فیضو کو سخت سست کہہ رہے تھے اور فیضو مسکین صورت بنائے کھڑا تھا۔ ذ زمین کی طرف تکے جا رہا تھا جیسے وہ ابھی شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے گا۔ میں بے حد متردد ہو گیا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ احمد بھائی نے اور احمد بھائی ایک دم پھٹ پڑے۔

ہو نا گیا دیکھتے ہو اس ذلیل کی حرکت! ذرا سی کام چوری کی خاطر جھوٹ بول گیا۔ درزی کی دکان بند ہے حالانکہ میں ابھی دیکھتا چلا آ رہا ہوں اس کی دکان کھلی ہوئی ہے۔

میں خاموش ہو گیا۔ غلطی واقعی فیضو ہی کی تھی۔

دوسرا رخ

فیضو درزی کے پاس جا چکا تھا۔ میں احمد بھائی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ احمد بھائی نے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو...... راشد؟........... اخاہ السلام علیکم، کہو بھئی کیا بات ہے؟........ عظمت سے ملنا ہوگا؟........ کیوں؟........ اچھا سفارش کے لئے........ ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن بھئی اس وقت تو مجبوری ہے سر میں اس قدر سخت درد ہو رہا ہے کہ کمرے سے باہر بھی نکلا نہیں جاتا۔ اس وقت تو معاف کرو۔ پھر کسی دن۔ پھر کسی وقت۔

احمد بھائی نے فون رکھ دیا۔

"احمد بھائی خیر تو ہے کیسی طبیعت ہے آپ کی؟

"اچھا ہی ہوں" اتنے میں فیضو درزی کے ہاں سے سوٹ لیکر آ گیا احمد بھائی کپڑے بدلنے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو کہیں جانے کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔

"کہاں جا رہے ہیں احمد بھائی؟"

"ذرا کلب" اور میں سوچنے لگا کیا یہ دوسرے فیضو نہیں؟

پہلا رخ

ان دنوں دفتر میں بڑی مصروفیت تھی جب گھر سے خبر آئی کہ خالو صاحب آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا اس قدر اشتیاق تھا۔ کہ میں مصروفیت کے باوجود چند دنوں کی چھٹی لے کر ملنے گیا۔ ابھی مجھے آئے مجھے ایک دن بھی نہ گزرا تھا کہ خالو صاحب بیمار پڑ گئے اور تین دن کے اندر ہی انہوں نے آخری رخت سفر باندھا۔ مجبوراً مجھے رخصت بڑھوانی پڑی میں نے افسر کو تار دے دیا اور پریشان سا بستر پہ پڑا رہا۔ گھر کے تمام افراد پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے پورا ماحول نوحہ کناں تھا۔

یونہی تین دن گذر گئے۔ تیسرے دن میرے نام سرکاری رجسٹری آئی۔ افسر نے مجھ سے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تھی اور کارروائی کی دھمکی دی تھی۔ پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔ میں فوراً ہی روانہ ہو گیا افسر کے پاس گیا۔ صورت حال سمجھائی مگر وہ اپنی جگہ اڑا رہا۔ بڑا لمبا چوڑا لیکچر فرائض کی اہمیت پر دے ڈالا اور نہ معلوم کیا کیا۔ میرے تمام عذرات اس کے لئے معمولی تھے۔ اور فرائض اس کی نگاہ میں ماں باپ کی موت سے فوقیت رکھتے تھے۔

دوسرا رُخ

ابھی چند سال پہلے اسی مصروفیت کے دوران افسر کے ایک دوست کے رشتہ دار کا انتقال ہو گیا۔ اس نے فوراً چھٹی لی اور کام کو بے ترتیب چھوڑ کر چلا گیا۔ میں حیران تھا......... کیا وہ اپنا اس دن کا لمبا چوڑا لیکچر بھول گیا؟......... یا انسان خود اپنی شکل اس آئینہ میں دیکھنے کی پرواہ نہیں کرتا جس میں وہ دوسروں کی شکل دیکھتا ہے۔

پہلا رُخ

جب انسان کسی بالاتر ہستی کے سامنے جوابدہی کا تصور اپنے دل میں رکھتا ہے تو اس کی اپنی معمولی سے معمولی لغزش اس کو بے انتہا مضطرب کر رکھتی ہے اور وہ اپنے کئے پر کافی پچھتاوا محسوس کیا کرتا ہے۔

مجھ سے بھی چند ایک ایسی ہی لغزشیں ہو گئیں اور میرے نگران نے مجھ کو تنبیہہ کی آخر آپ اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے اور یہ تصور کر کے میں لرز اٹھا۔

دوسرا رُخ

ابھی یہ زخم تازہ تھا کہ میں نے اپنے نگران کو انہی لغزشوں میں بار بار اور دانستہ گرفتار پایا۔

اور میں ایک بار پھر لرز اٹھا......... یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔

پہلا رُخ

بڑی بیگم کا یہ طریقہ تھا کہ ذرا سی چیز ضائع ہو جانے پر بھی وہ بے انتہا غضبناک ہو جاتیں ان کا کہنا تھا کہ یہی تو ذرا ذرا سی چیزیں مل کر بہت بڑی رقم بنا دیتی ہیں بہرحال ان کا کہنا بھی کیا غلط تھا۔

اس دن بھی جب آٹا ڈالتے ہوئے کٹوری سے ایک چٹکی آٹا گر گیا تو وہ خفا ہو گئیں اور بڑی دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔ ——— یہ ان کے ایک بھیجی تھی۔

دوسرا رُخ

مگر میں نے اکثر دیکھا کہ ان کے یہاں تمام بتی ہمیشہ اکثر صبح سورج نکلنے تک روشن رہا کرتے تھے ایک دن پوچھ ہی میں نے ان سے سوال کر دیا۔ بڑی بیگم بجلی کا بل آپ کے یہاں مہینہ میں کتنے کا آتا ہوگا۔

"بھیا وہ تو مالک مکان ہی ادا کرتا ہوگا۔ ہم تو کرایہ ہی کرایہ دیتے ہیں جی"

ٹھیک ہے جب بجلی مفت ہے تو پھر کیوں بڑی بیگم اس پر اپنا اصول چسپاں کریں۔

پہلا رُخ

بھیا تم نے تو بچوں کے بارے میں بہت کچھ لکھ ڈالا ہے ذرا اپنے ان بھانجے کی بھی سدھار کی کوئی سبیل بتاؤ۔

اس دور کی عزیزہ بہن نے کہا اور اس کے لئے ناشتہ تیار کرنے چلی گئیں۔

دوسرا رُخ

وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ پڑوسن کا لڑکا بہن کے پاس آیا۔ "چچی دو انڈے دے دیجئے، پھر واپس ہو جائیں گے۔"

"بچے انڈے تو ہیں ہی نہیں۔ کئی دنوں سے مرغیوں نے دیئے ہی نہیں" لڑکا واپس چلا گیا۔ اور بہن نے ناشتہ اس کے سامنے لا کر رکھ دیا ایک پلیٹ میں انڈے کا خاگینہ بھی تھا۔ وہ چونک پڑا۔

"آپ نے تو لڑکے سے کہا تھا انڈے ہیں ہی نہیں۔"

"ارے وہ تو میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔"

اور پھر سوچنے لگا۔ کہ اس کی تربیت سے زیادہ موثر تربیت وہاں پہلے سے ہی ہو رہی ہے۔

پہلا رُخ

بھائی صاحب ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کاش دنیا پھر ایک بار نیک آدمیوں سے بھر جائے تو یہ سارے دکھ دور ہو جائیں۔"

پرچون فروش نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

دوسرا رُخ

اس لمحہ ایک نوجوان شخص نے اس کی ہتھیلی پر چاول رکھتے ہوئے کہا:—

"بھائی میں نے ایک کا نوٹ دیا تھا پانچ کا نہیں۔"

پھر خوش سے مسکراتے ہوئے نوٹ رکھ لیتا اور زیر لب کہا۔
"بہر وقت گرے کر پھر بھی جاتا۔ تو کس کو پتہ چلتا۔ اچھی خاصی رقم
مفت ہاتھ لگ گئی"

پہلا رُخ

عشرت کے چہرہ پر ہم نے کبھی بھی بشاشت نہ دیکھی۔ جب بھی وہ ابا
جی کے سامنے آئے تو شکوہ سنج سے ...... آج یہ نہیں ہے کل وہ نہیں ہے
فلاں سوٹ خراب ہے۔ فلاں کپڑا بہت پرانا ہو گیا ہے فلاں نے اتنا اچھا جوتا
خریدا ہے میرے پاس اس سے کم تر بھی نہیں اس کی گھڑی بڑی خوبصورت
ہے ہمیں کوئی کیوں لے کر دیتے لگا۔ غرض وہ دنیا جہان سے اپنا موازنہ کرتے
بہت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے لئے سب کا جینا اجیرن کئے رہتے۔

دوسرا رُخ

ایک دن میں نے مذاقاً ان سے کہہ دیا "عشرت تم نعمت کو جانتے ہو؟"
"ہاں ہاں کیوں نہیں؟ وہ تو میرا کلاس فیلو ہے"
"دیکھو وہ پڑھنے میں کتنا تیز ہے اور اخلاق کا تو اتنا اچھا ہے کہ
سب ہی اس پر فریفتہ ہیں اور تم ......؟"
"لیکن دنیا میں اور دوسرے بھی تو ہیں جو مجھ سے بھی بڑے ہیں اس
سے قبل کہ میں اپنا جملہ مکمل کروں عشرت بول اٹھے۔
لیکن عشرت! پھر بھی تم دوسرے معاملات میں کیوں نہیں سوچتے
"اونہہ عجیب منطق ہے آپ کی؟"
اور میں غور کر رہا تھا کہ منطق حقیقتاً کس کی عجیب ہے۔

پہلا رُخ

جمعدار نے انگڑائی لے کر دامن سے ہوا جھلتے ہوئے کہا۔
"اُف بڑی تیز دھوپ ہے" اور ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھڑا
ہو استانے لگا۔

دوسرا رُخ

دو ایک پیڑوں کے نیچے چند مزدور سائے میں بیٹھ گئے تھے۔
"کیوں حرام خورو! ...... اتنی سی دھوپ تم سے برداشت
نہیں ہوتی؟" جمعدار غرایا۔ (بشکریہ "سوداگر")

ہمارا اپنا گھر

حسین محمود

کائنات ہمارا گھر ہے۔

ہماری کوششوں اور نئی تحقیقات نے مل ملا کر ہمارے سامنے کائنات کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ حیران کن ہے۔ ہماری دوربینیں ابھی اس کے تہائی فاصلہ کو بھی نہ دیکھ سکیں لیکن ابھی تک جو دیکھا گیا ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے۔ ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آ سکتا نہیں

ہم ایک معمولی سیارے یعنی زمین پر آباد ہیں ہمارے سورج جیسے لاکھوں کروڑوں سورج اس نظام میں موجود ہیں جس کو کہکشانی نظام کہتے ہیں ستارے ایک دوسرے سے اس قدر زیادہ فاصلہ پر ہیں کہ قریب ترین ستارے کی روشنی کو ہم تک پہنچنے میں سوا چار سال لگ جاتے ہیں اور خود ہمارے نظام میں بعض ستارے اس قدر دور ہیں کہ ان کی روشنی کو ہم تک پہنچنے میں ہزاروں سال لگ جاتے ہیں یہ نظام اس قدر وسیع ہے کہ روشنی کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں لاکھوں سے اوپر سال تک لگ جاتے ہیں۔

ہمارے اس کہکشانی نظام کی شکل قرص یا چکی کے پاٹ جیسی ہے ممکن ہے کہ مرغولہ دار ہی ہو کیونکہ ستاروں کے بہت سے نظام مرغولہ دار بھی ہیں۔ ستاروں کا جھرمٹ مرکز کے گرد چکر کھا رہا ہے اس طرح جیسے کمہار کا چاک گھومتا ہے اس کی گردش کی رفتار بڑی زبردست ہے اس نظام میں کوئی ستارہ ساکن نہیں ہے سب ایک دوسرے کے مقابل میں حرکت کر رہے ہیں خود ہمارا [illegible] ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ستارہ [illegible] کی طرف جا رہا ہے۔

ہمارے کہکشانی نظام پر کائنات ختم نہیں ہو جاتی ہمارے نظام کے مانند لاکھوں سحابیے فضائے بسیط میں موجود ہیں جو ایک دوسرے سے بڑے زبردست فاصلے پر ہیں ہم سے قریب ترین مرأۃ مسلسلہ کا سحابیہ ہے یہ ہم سے چھ لاکھ اڑسٹھ ہزار نوری سال دور ہے یہ قریب ترین سحابیہ ہے اندازہ لگائیے کہ دور ترین سحابیہ کہاں پر ہو گا؟ اس سحابیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ شکل اور جسامت میں یہ ہمارے کہکشانی نظام سے ملتا جلتا ہے اور برج مرأۃ مسلسلہ میں خالی آنکھ سے بھی دھندلا سا نظر آتا ہے۔

بہت سے سحابیے ہمارے کہکشانی سحابیے کی طرح ستاروں کے بنے ہوئے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن میں ستارے الگ الگ نہیں دکھائی دیتے۔ خیال ہوتا ہے کہ ابھی بالکل لطیف گیس کی حالت میں ہیں اور کیا عجب ہے کہ آئندہ زمانے میں یہی گیس جمنا شروع ہو جائے اور اس سے ستارے بنیں۔

یہ سحابیے متحرک ہیں اور بڑی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ اور دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پرانا فلکی آفتاب کو متحرک اور زمین کو ساکن مانتا تھا۔ بعد کا فلکی آفتاب کو ساکن اور زمین کو متحرک تصور کرنے لگا اور جدید فلکی قدرت کے کارخانے کو دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کیا مانے اور کیا نہ مانے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ سیارے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں سورج نسر واقع کی طرف میں جا رہا ہے۔ کہکشانی نظام کے سارے ستارے حرکت کر رہے ہیں اور دور ہوتے جا رہے ہیں تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

جدید فلکی اپنے خیالات کو اور آگے بڑھاتا ہے کہ سحابیے ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں تو کوئی وقت ایسا ضرور ہو گا جب یہ سحابیے

قریب ہوں گے اور آسمان سے بھی آگے کوئی وقت ایسا مفقود ہو گا کہ یہ بالکل ملے ہوئے ہوں گے یعنی ان کا سارا جسم گیس کا بنا ہوا ہو گا۔

جب یہ بالکل ملے ہوئے ہوں گے تو ساری کائنات گویا ایک نہایت ہی لطیف مادے سے یکساں طور پر بھری ہوئی ہو گی کہ یکایک انگشتِ غیب نے اس کے سکون میں خلل ڈالا لطیف مادہ سمٹ سمٹ کر کچھ حصے بن گئے ان سے سحابیے بنے جب سحابیوں کا مادہ تو سمٹا تو اس کے حصے وجود میں آئے ان ستاروں سے پھر مادہ الگ ہوا تو سیارے بنے اور ان سیاروں میں سے ایک پر ہم آباد ہیں۔

(بشکریہ "ضرب کلیم")

ادبی خبریں

ہنگری کے ادیب دامِ بلا میں

(اسٹار) یہاں سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا ہے کہ دانشور طبقہ کی بڑی اکثریت حکومت سے تعاون کرنے سے انکار کر رہی ہے اور مبصروں کا خیال ہے کہ آئش اعتراف کے مطالب ہیں۔ کہ ہنگری کے دانشوروں کی صفوں میں تطہیر ہونے والی ہے۔ ان پر پہلے ہی سے کڑی پابندیاں لگ چکی ہیں بعض کو پھانسی کی سزا دی جا چکی ہے اور بعض جیلوں میں بند ہیں۔ یہ اعتراف چند دن ہوئے وزیر ثقافت گیولا کلائی نے اپنے ایک مضمون میں کیا جو کمیونسٹ پارٹی کے سرکاری اخبار میں شائع ہوا ہے کلائی نے کہا ہے کہ بعض ادیبوں اور فنکاروں کے خلاف سخت کارروائی کی جا چکی ہے۔ اور انتباہ کیا کہ اگر یہی صورت قائم رہی تو آئندہ ہم بھی ایسا ہی کرنے پر مجبور ہوں گے۔

اب تک جو سزائیں دی جا چکی ہیں ان میں روس کے خلاف اشتہار لکھنے اور سرد یز کی سزائے موت جسے عالمی احتجاج کے بعد عمر قید میں بدلا گیا اور کیولا ہے۔ تبور تارڈوس۔ تبور ڈیری اور زولتن زاک جیسے ممتاز کمیونسٹ مصنفین کی سزائے قید بھی شامل ہے۔

بین الاقوامی جغرافیائی کانفرنس

ڈھاکہ ۔ ڈھاکہ اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ کے صدر ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد اور ڈاکٹر نفیس احمد کو جاپان کی سائنس کونسل نے بین الاقوامی جغرافین کی پہلی علاقائی کانفرنس میں شرکت کے لئے مدعو کیا ہے۔ یہ کانفرنس ٹوکیو میں ستمبر کے پہلے ہفتے میں ہوگی۔ ڈاکٹر نفیس احمد فلپین اور انڈونیشیا بھی جائیں گے۔

پانچ بڑوں کی مراسلت

واشنگٹن (رپ) سرکاری مورخوں کا بیان ہے عنقریب وہ خفیہ خط و کتابت شائع کر دے گا جو روس کے وزیر اعظم اسٹالن اور امریکہ کے سابق صدر مسٹر روزولٹ اور مسٹر ٹرومین کے ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا ہے کہ وہ خط و کتابت بھی شائع کر دی جائے گی جو اسٹالن اور برطانوی وزرائے اعظم مسٹر چرچل اور مسٹر اٹلی کے ساتھ ہوئی ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ دستاویزات بہت ہی دلچسپ ہوں گی۔

پارکوں میں دارالمطالعے

کراچی کارپوریشن نے پارکوں اور باغوں میں کھلی فضا کے مفت دارالمطالعہ قائم کرنے کی اسکیم بنائی ہے کام کا آغاز عنقریب ہو جائے گا۔ جب چھ منتخب پارکوں میں اس قسم کے دارالمطالعے قائم کر دیئے جائیں گے۔ (اپ)

ادبی ڈائرکٹری

انجمن دانشوران ادب (رجسٹرڈ) کراچی، پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں کے ایسے ادبا، شعرا، اور مصنفین کی جو کم از کم بیس سال سے علمی و ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں ایک ادبی ڈائرکٹری مرتب کر رہی ہے لہٰذا بذریعہ اعلان ہٰذا ایسے جملہ حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ براہ کرم اپنا نام، مکمل پتہ، تازہ تصویر، مختصر حالات زندگی، موجودہ مشاغل، تصانیف مطبوعہ وغیر مطبوعہ اور دیگر ضروری تفصیلات سے جلد مطلع فرمائیں کار کنان

…سبو بکھریں گے

…۔ وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے جب اخبارات پڑھے ہی نہیں جائیں گے بلکہ سونگھے بھی جائیں گے کیونکہ ان کی خوشبو سے فضا معطر ہو جائے گی۔ لاس اینجلیس کی پرنٹنگ ایسوسی ایشن نے کہا ہے کہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ایسے غذائی کاغذ چھاپے جائیں جن سے بھنے ہوئے مرغ کی خوشبو نکلے اور ایسے شادی کے اعلانات شائع کئے جائیں جن سے پھولوں کی خوشبو نکلے۔

غلط جواب پر بھی پورا انعام

لندن۔ ٹیلی ویژن کے ایک انعامی مقابلہ میں ایک …جی کو دو سو پچاس پاؤنڈ کا انعام اس لئے مل گیا کہ جواب کی فہرست …رکرنے میں ٹائپسٹ نے املا کی غلطی کر دی تھی۔ مقابلہ میں حصہ لینے …لے ۲۱ سالہ نوجوان نے ایک لفظ کا املا غلط بتایا لیکن جواب کی فہرست …ادہی املا تھا۔ اس لئے مہتمم نے کہا: "ٹھیک ہے" ادھر سینکڑوں …ںیوں نے سٹوڈیو کو ٹیلیفون کرنا شروع کیا اس کے باقی سارے جواب …ٹھیک اور اسے پورا انعام ملے گا۔

…صیدہ یا نظم؟

…فرینڈ گارڈن پارٹی میں اعلان کیا گیا کہ ایک شاعر سہروردی کی شان… …قصیدہ پڑھیں گے ——— شاعر نے کہا کہ "یہ قصیدہ نہیں …ہے" اور نظم کو پڑھنا شروع کر دیا اور جب نظم کا اختتام ہوا تو اناؤنسر …نے کہا کہ ابھی جن شاعر صاحب نے سہروردی کی شان میں قصیدہ پڑھا ہے …منظور الحق صاحب سہروردی کی خدمت میں پیش کریں گے۔

…پانی کا ہندی ترجمہ

نئی دہلی …۔ لوک سبھا میں ایک کمیونسٹ ممبر مسٹر سرجو …شاد پانڈے نے ایک مثال پیش کر کے بتایا کہ ہندی کے حامی کس طرح …سے ہندی کو مشکل بناتے ہیں انھوں نے بتلایا کہ جس طرح ایک …ہندی اخبار نے لفظ چائے کا ترجمہ کیا ہے کہ "دو گدھا شرکرا درشٹ …پیدا اور پانا درشیلا پانی" (ایک پینے والی چیز جو دودھ شکر اور ابلتے ہوئے پانی میں پہاڑوں میں اگنے والی ایک چیز ملا کر تیار کی جاتی ہے) مسٹر پانڈے نے کہا کہ ہندی میں چائے کا یہ ترجمہ انتہائی عجیب و غریب اور لغو ہے۔ ہندی کے جنونی حامیوں میں اس قسم کے رجحان کو روکنے کی سخت ضرورت…

ایڈیٹر کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ

ملتان …۔ روزنامہ کارزار … کے ایڈیٹر اور پرنٹر و پبلشر مسٹر محمد ظفر محزون کے خلاف سکرٹری بلدیہ ملتان مسٹر فیض اللہ … مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی کی سماعت ۱۹ ستمبر کو ملتوی کر دی گئی ہے (اے۔ پی۔ پی)

بنگالی ادیب کی وفات

ڈھاکہ۔ مشرقی پاکستان کے ایک ممتاز ادیب فرید الدین خاں ساٹھ سال کی عمر میں آج صبح انتقال کر گئے۔ وہ ایک درجن بنگالی کتابوں کے مصنف تھے۔ آنحضرت صلعم کی زندگی پر ان کی کتاب بہت مستند سمجھی جاتی ہے ان کے پسماندگان میں بیوی اور ۶ بچے ہیں…

جناب احسن پھپھوندوی کا انتقال

پھپھوندا۔ مورخہ ۸ اگست سنہ ۵۰ء کو ۸ بجے شب جناب محمد مصطفےٰ خاں صاحب مداح احسن پھپھوندوی کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم طویل عرصہ سے گٹھیا و اختلاج قلب کے مریض تھے۔ آپ کے انتقال سے ادبی حلقوں میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اللہ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ مرحوم کی عمر باسٹھ سال تھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی تیرھویں برسی

کراچی۔ جامعہ تعلیم ملی ملیر کراچی میں زیر صدارت جناب ڈاکٹر محمود حسین صاحب صدر جامعہ تعلیم ملی مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی تیرھویں برسی منائی گئی اساتذہ و طلبہ کی قرآن خوانی کے بعد جناب پرنسپل حمید الدین صاحب و مولانا عزیز احمد صاحب و مولانا عبد العزیز صاحب نظامی نے مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ آخر میں ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے موصوف کے مجاہدانہ کارناموں کو پر اثر تقریر سے واضح کیا۔